



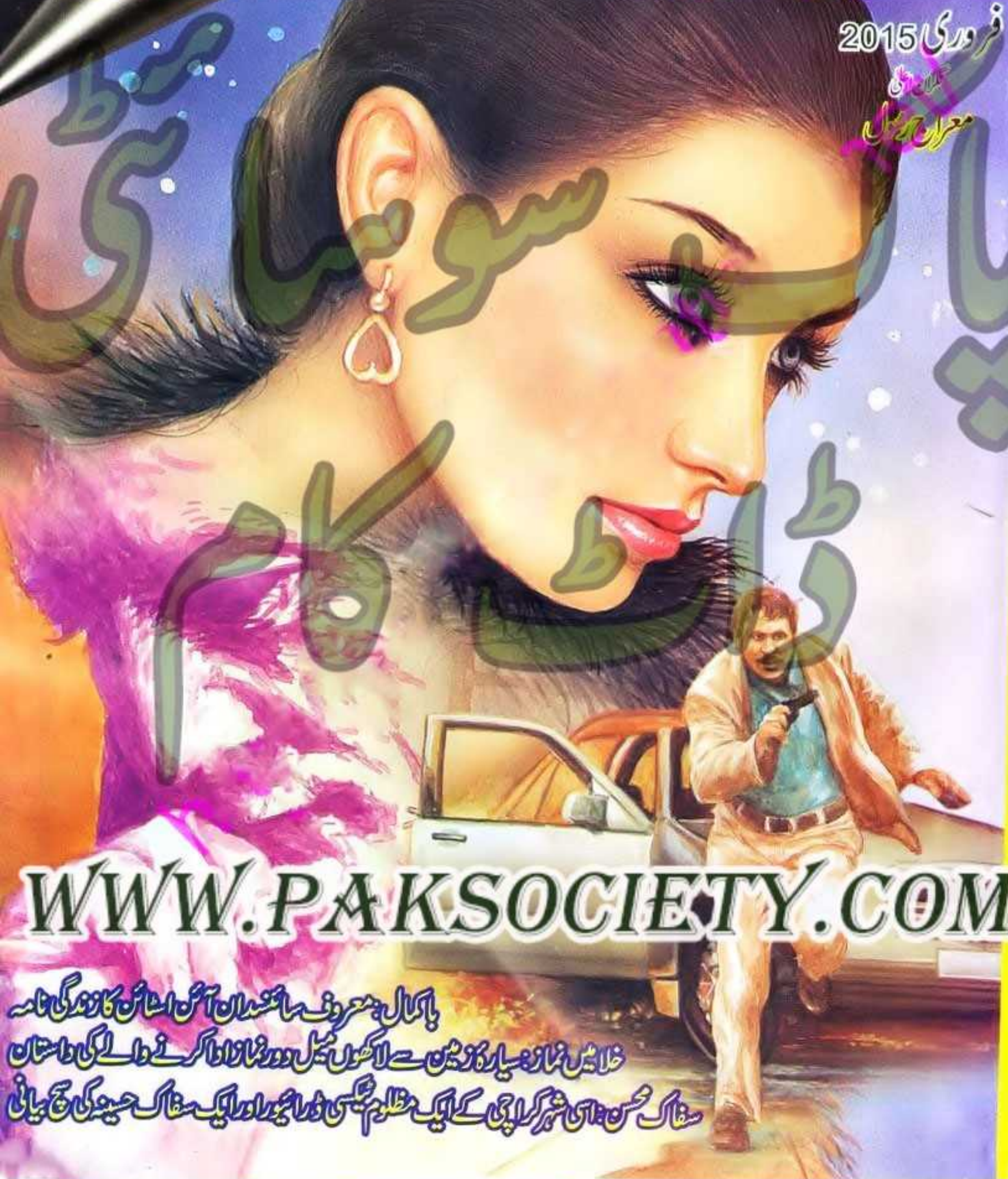
جنگی کہانیاں آپ بیتیوں جگ بیتیوں

سنگرز سوسائٹی

ماہنامہ

فروری 2015

معارف اور تعلیم



دنیائے بھر سے اپنے وطن سے منتخب جی کہانیاں، آپ بیتیاں جگ بیتیاں اور سفر نامے =/60 Rs

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاکستان کے معروف ماہنامہ آگے اٹھانے کا اور کی نامہ
خلا میں نماز سیرا کے نام سے لاکھوں نکل دوزخا لانا کرنے والے کی داستان
سفاک محسن ہاں شہر کر لاپچی کے ایک مظلوم گھسی ڈھانچہ اور ایک سفاک حیدر کی جہانیاں



محبوبوں کے حسین رنگ فروری 2105ء کے پاکیزہ کے سنگ

کراچی

پاکیزہ



نگہت اسیمما اور رفاقت جاوید کے قلمی ہنر کے شاہکار ناول نئی اقساط کے ہمراہ

ذیاب جیلانی کے فن کا عروج ... ترک وفا کا بھرپور اختتام

زاہدہ پروین کے قلم سے محبوبوں سے گندھامنی ناول ... جنگل کا پھول

اسما قادری کی متاثر کن آمد ... ایک بھرپور مکمل ناول کے ساتھ

عظمیٰ آفاق سعید کے پرلطف سفر نامے کا مزید احوال

شمعِ ہدایت کے سلسلے میں

اختر شجاعت کا لکھا پر عقیدت اور

روح پرور مضمون ذکر ... قرب الہی

اس کے علاوہ

ان مایہ ناز قلم کاروں کی تازہ ترین تحریریں پڑھیے جن میں ناہید سلطانہ اختر، عالیہ چرا، سیما سراج، رضوانہ پرنس، غزالہ جلیل راؤ و دیگر شامل ہیں

اس کے ساتھ ساتھ مستقل متنوع سلسلوں کا دلکش اور دلربا امتزاج صرف آپ کی اعلیٰ ذوقی کی نذر

24

شخصیت

باکمال

ڈاکٹر ساجد امجد

اس سلسلے میں اس کا زندگی نامہ جس نے کمال کر دکھایا

79

معلومات

پڑھنا منع ہے

منظر امام

ہر کتاب انسان دوست نہیں ہوتی

107

جہاز بیسی

الوداع

حسن رزاقی

پی آئی اے کے ایک ریٹائرڈ افسر کی خود نوشت

150

معاشرت

سراب

کاشف زبیر

بلند حوصلوں اور بے مثل ولولوں سے گندھی تہلکہ خیز داستان

گفت و شنید

16

شہر خیال

مدیر اعلیٰ

آپ کی باتیں آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

ایمان افروز

خلا میں نماز

ابن کبیر

کرہ زمین سے دور خلا میں روزہ رکھنے کی روداد

فلم و صحافت

فلمی الفتیلہ

علی سفیان افاقی

فلم صحافت کی کہانیاں فلم نگری کی باتیں یادیں

حقائق

سمندر کے بھید

عائشہ جونجیو

کرہ ارض پر خشکی سے زیادہ سمندر پھیلنا ہوا ہے

15

سرگزشت

بابائے فارسی

ادارہ

ایک صفحہ میں مکمل، مختصر، مختصر ایک۔ نادر روزگار کا تعارف

57

اظہار عقیدت

خون کے آنسو

انور فرہاد

اس سانحے پر نیا بھر میں سکتے چھٹا گیا

88

روداد

سمندگی لٹیرے

مشتاق عطاری

ستے دھلے پر موت کے پیامبر بن جانے والوں کا ذکر

177

جرم و سزا

عیارِ عظیم

سید احتشام

یورپ میں تہلکہ مچا دینے والے انوکھے مجرم کی روداد

ماہ نامہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں، کسی بھی فرد یا ادارے کے لئے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔
• تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کئے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح سے ذمہ دار نہ ہوگا۔

184 پہلی سچ بیانی

سفاک محسن

تنویر حسن

اس کی حباں بخشی کرانے
والا سفاک ترین شخص تھا

211 چوتھی سچ بیانی

آسیت محبت

صائمہ اقبال

محبت کے جذبے کی انوکھی
فسون خیزی کا ماخبرہ

260 ساتویں سچ بیانی

شیطان فرشتہ

فرخ جمال

زماں خراب ہے والدین چھوٹے
بچوں کو اغوا ہونے سے بچائیں

300 سوغات

پارچے

قارئین / ادارہ

دنیا بھر سے مختلف موضوعات
پر معلومات انگلشافی پارچے

192 انعامی مقابلہ

علمی آزمائش

ادارہ

ذہن قارئین کے ذوق جستجو کی
تسکین کے لیے منفرد انعامی سلسلہ

219 تیسری سچ بیانی

سوکن

ثنا

عورت کی بے وقوفی ہی
گھر برباد کرتی ہے

253 چھٹی سچ بیانی

خاندوش

انور ذکی

وہ بیک وقت دوپہری
زندگی گزار رہی تھی

279 نویں سچ بیانی

ساحر

مہر النساء مہرو

وہ عورتوں کو سرزوہ کر
دینے کا فن بنانتا تھا

189 شعر و ادب

بیت بازی

قارئین

شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے
والوں کے لیے ایک دلچسپ سلسلہ

209 دوسری سچ بیانی

قسمت

خورشید اختر

اس نے جواں مردی
کے اپنی قسمت بدل لی

241 پانچویں سچ بیانی

سنہری دھوپ

آصفہ ضیا احمد

ایک معمولی سی چوک
لڑکیوں کی زندگی تباہ کر رہی ہے

271 آٹھویں سچ بیانی

حوادث زمانہ

ڈاکٹر عبدالحمید

حوادث زمانہ کی حشر
سامانی کی دلچسپ داستان

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور
تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر
آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمانی سے محفوظ رکھیں۔

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

16 دسمبر ہماری تاریخ کا ایک المناک دن۔ اسی تاریخ کو 1971ء میں ہمارا ایک بازو قطع ہوا اور اسی تاریخ کو 2014ء میں ہمارے مستقبل پر حملہ ہوا۔ ننھے ننھے پھولوں کو بے رحمی سے انتہائی ظالمانہ انداز میں گولیوں سے بھون ڈالا گیا۔ ایسے انداز میں ان پھول جیسے بچوں کو شہید کیا گیا ہے جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان معصوموں کی شہادت نے ہر محب وطن کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ دشمنان وطن کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور الحمد للہ یہی جذبہ نظر آ رہا ہے۔ 1965ء میں دشمن نے حملہ ہماری سرحد پر کیا تھا اور اس حملے نے ہمارے جذبوں کو بیدار کر دیا تھا۔ وہی جذبہ ایک بار پھر سے بیدار ہو گیا ہے۔ اس بار دشمن ہماری صفوں میں اہل وطن کا طمع اپنے چہرے پر چڑھا کر سامنے آیا ہے۔ دہشت گردی کا سہارا لے کر ہمارے اتحاد کو پارہ پارہ کرنا چاہتا ہے مگر وہ بھول رہا ہے کہ ہماری محافظ فوج جو اقوام عالم میں اپنی تیزی و طراری کے لیے مشہور ہے، پوری طرح جاگ رہی ہے، دہشت گردی کے خلاف عزم کا اظہار کیا ہے۔ ہم خود بھی اپنی فوج سے یہی توقع رکھتے ہیں کیوں کہ ہرگز بے وقت پر فوج نے ہی ملک کو عزم و استقلال سے بھرا ہے۔ سزایافتہ دہشت گردوں کو دھڑا دھڑا بھانسی پر لٹکایا جا رہا ہے۔ ایسے وقت میں کچھ مظلوموں کی سزا کے التوا اور تعطل نے ابہام پیدا کر دیا ہے۔ یاد رہے کہ عدلیہ کو شکایت رہی ہے کہ تفتیشی ادارے جس طرح عیس بنا کر بھیجتے ہیں وہ ناقص ہوتا ہے۔ ورنہ عدلیہ نے ہی سزائے موت کے منتظروں کو سزا میں سنائی ہیں۔ پھر یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ جج صاحبان و دیگر متعلقہ عملے کو دہشت گردوں کی طرف سے شدید خطرات لاحق رہے ہیں۔ اس لیے عدلیہ کو اپنا کردار ادا کرنے کے لیے تحفظ بھی فراہم کیا جائے۔ ہمارا کہنا یہی ہے کہ اس اتفاق رائے کو لا حاصل بحث و مباحثے میں ضائع نہ کر کے ملک دشمن قوتوں کی جڑیں ہمیشہ کے لیے کاٹ دی جائیں ورنہ دوبارہ اتفاق رائے پیدا کرنا بہت مشکل ہوگا۔ بقول کینی اعظمی

اٹھ بھی سکتی ہیں دفعتاً لاشیں
جن پر مند سجا کے بیٹھے ہو

معراج رسول

شعبہ اشتہارات

نیو اشتہارات محمد نواز خان 0333-2256789

نمائندہ کراچی محمد صفوان خان 0333-2168391

رائٹ محمد سعید 0323-2895528

نمائندہ لاہور فراز علی بٹ 0300-4214400

قیمت فی پرچہ 60 روپے، زر سالانہ 700 روپے

پبلشرز و پرائنٹرز: عذرا رسول

مقام اشاعت: C-63، فیز 11 ایکس ٹیشن

ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ

کراچی 75500

جمیل حسن

پرائنٹرز

ابن حسن پرنٹنگ پریس

مطبوعہ:

باکی اسٹینڈنگ کم کراچی

خط اشاعت کا پتہ: پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone: 35804200 Fax: 35802551
E-mail: jdpgroup@hotmail.com



بابائے فارسی

سرگزشت

ابھی وہ ٹریجویشن کی تیاری کر رہے تھے کہ سیاسی افق گدلا گیا اور دیگر بہت سے مسلمانوں کی طرح انہوں نے بھی ہجرت کرنے کی نعمان لی۔ یہ کوئی چھوٹا موٹا خاندان تو تھا نہیں کہ سامان لپیٹنا اور چل پڑے۔ تیاری تیاری میں ہی کئی سال گزر گئے۔ پاکستان آنے کے راستے میں حادثات رونما ہوتے تھے ان میں بھی کئی آگئی۔ بالآخر 1951ء میں خاندان کے منتخب افراد کا قافلہ تیار ہوا اور انہیں میر کارواں کی ذمہ داری سونپ دی گئی۔ اس کارواں میں ان کے والدین، ماموں، ممانی، خالائیں اور بہن بھائی تھے۔ سب کی اولادیں بھی تھیں۔ خود ان کا رشتہ بھی طے ہو چکا تھا۔ ان کے ساس سرودیکر سسرالی رشتے دار بھی ساتھ ہو گئے تھے۔ اس طرح پوری ٹرین اس قافلے میں شامل افراد سے بھر گئی تھی۔ یہ قافلہ براستہ کھوکھرا پار پاکستان میں داخل ہوا۔ اس قافلے میں نو عمر لڑکیاں بھی تھیں۔ حالات اب بھی کشیدہ تھے۔ اس لیے ان لڑکیوں کا جلدی جلدی اسٹیشنوں پر ہی نکاح کر دیا گیا تاکہ لڑکیاں کنواری نہ کہلائیں پھر ٹرین سے یہ قافلہ جانب کراچی بڑھا۔ کراچی پہنچ کر ان لڑکیوں کی رخصتی کی تیاری ہونے لگی۔ کچھ لوگ کراچی پہنچ کر حیدرآباد، سکھر اور کوئٹہ کی طرف قسمت آزمانے کو چل دیے۔ ”میر کارواں“ جو ابھی فقط تیس چوبیس سال کے تھے مگر ان پر ذمے داریاں ڈھیروں ڈھیر تھیں، اپنے بچھلے بہنوئی آغا محمد حیدر (احمد میاں) کی تین کم سن بھانجیوں کو اپنی بیٹیاں بنا کر لائے تھے۔ ان کی ذمہ داری، سرالیوں کی ذمہ داری۔ دو برادر بہتی آغا صفر مرزا اور آغا الیاس مرزا جو ابھی کم سن تھے، ان کی ذمہ داری ایک سالی صاحبہ مع کم سن بچوں کے ہمراہ تھیں ان کی ذمہ داری گویا ذمہ داریوں کا سمندر تھا اور وہ تھے۔ ان کی ایک بہن زوجہ مہدی حسین پہلے سے ہی راولپنڈی میں رہ رہی تھیں۔ سب سے بڑی بہن اور ان کے شوہر مرزا اسد رضا بھی پہلے آچکے تھے اور میواہ ہسپتال لاہور میں ملازمت کر رہے تھے۔ کبھی سوچا راولپنڈی منتقل ہو جایا جائے اور کبھی لاہور جانے پر غور کیا پھر سکھر چلے گئے۔ 1951ء میں پاکستان آئے اور 1952ء میں ازدواجی زندگی کی ابتدا ہو گئی۔ 1955ء میں پہلی اولاد ہوئی۔ گھر خوشیوں کا گہوارہ بن گیا۔ فارسی ادب میں خاصہ دخل تھا۔ اس استطاعت کو وہ بڑھانے لگے۔ پاکستان پہنچ کر زندگی میں ٹھہراؤ سا آ گیا تھا۔ اسے مہیز کی ضرورت تھی۔ اسی سلسلے میں وہ ایران کا دورہ بھی کر آئے تھے اور پی ایچ ڈی کی تیاری بھی کرتے جا رہے تھے۔ سکھر جیسے چھوٹے شہر میں رہ کر وہ اپنی منزل کو پانہیں سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے کراچی منتقل ہونا زیادہ مناسب سمجھا اور دیگر رشتے داروں سے آٹے۔ کراچی آ کر ایرانیان ٹیکنیکل اسکول کھارادر کی بنیاد رکھی۔ آغا مرتضیٰ بویا کے والد آغا بویا کی سرپرستی میں انہوں نے جہد مسلسل کا آغاز کر دیا تھا۔ تدریسی امور کے ساتھ ساتھ ریڈیو اور ٹی وی پر بھی علم کی ترویج جاری رکھی۔ P.T.V پر عرصہ دراز تک بصیرت اور فرمان الہی کے پروگرام کرتے رہے۔ ریڈیو پاکستان پر Talks بھی لکھیں اور صداکاری بھی کی۔ پاکستان نیشنل سینٹرز میں فارسی کی کلاسز کا اجراء کیا۔ خانہ فرہنگ ایران میں بھی فارسی کی تدریس میں مشغول رہے۔ فارسی کی ترویج و اشاعت میں انہوں نے انتھک محنت کی۔ ان کی کاوشوں کو مد نظر رکھ کر صاحب مقدر ایرانیوں نے انہیں ”بابائے فارسی پاکستان“ کے خطاب سے نوازا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہوں نے اردو اور انگلش کے ساتھ فارسی میں مقالوں کا انبار لگا دیا تھا۔ تراجم کے ذریعے فارسی ادب کو اردو میں اور اردو ادب کو فارسی میں منتقل کرنے میں شب و روز لگے رہتے تھے۔ وہ علم کے سپاہی تو تھے ہی اور اہل علم کی قدر بھی خوب کرتے تھے۔ سوادبی و سماجی شخصیات کے جلسہ ہای تحلیل و پذیرائی کا خوب خوب اہتمام کرتے۔ دبستان انیس و دہیر کے ذریعے اردو ادب کی خاص الخاص صنقب، سخن ”مرثیہ“ سے نئی نسل کو روشناس کرانے کے لیے محافل منعقد کراتے۔ ہر اتوار کو اہل فکر و ادب کے ہاں باری باری نشست رکھواتے۔ دیگر شہروں سے بھی شعراء کو بلواتے۔ گویا وہ فکرو فن کی قد آور شخصیت مشہور ہو چکے تھے۔ علم کی آبیاری کے لیے ان کی قائم کردہ درسگاہیں آج بھی ان کی یاد دلاتی ہیں۔ فارسی ادب کے اس پاکستانی معمار کا نام پروفیسر ڈاکٹر سید سبط حسن رضوی ہے۔

فروری 2015ء

15

ماہنامہ سرگزشت

Copied From Web

شہر خیال



☆ رانا محمد سجاد کا مکتوب خاص۔ "السلام علیکم، وسیر کی تاریخیں..... بہت سے حادثات، واقعات اپنے ساتھ لیے ہم سے بچھڑ چکا ہے۔ نئے سال کی آمد ہو چکی ہے۔ دبیر کا مینا اپنے وسط میں ایسا دکھ دے گیا جو تاحیات ہر حساس، وردمند پاکستان کو ترپاتا رہے گا، رلاتا رہے گا۔ مراطہ مستقیم سے بھٹکے ہوئے چند آدم خور انسانیت کا روپ بدلے معصوم بچوں پر ٹوٹ پڑے۔ خدا انہیں غارت کرے، نہ جانے کیا کیا کچھ کہنے کو دل کر رہا ہے۔ بس اللہ تعالیٰ ان معصوم پھولوں کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے، آمین۔ "شہر خیال" میں اس المناک سانحے کے شہر باسی شاہد جہانگیر صاحب صدارت پر فائز تھے۔ حکومت کو اپنے پرف پر لیے تھے۔ جامع تبصرہ تھا۔ فلموں کے حوالے سے آپ بیتی پر ان کا تبصرہ واقعی قابل غور ہے۔ سدرہ بانو ناگوری صاحبہ کراچی سے آئیں۔ سلور جوبلی نمبر کی خوش خبری آپ کے خط کے توسط سے ملی۔ شدت سے انتظار رہے گا۔ ملک رحمت میا نوالی سے آئے۔ جناب ہم آپ کے شہر کچھ دن پہلے ہو کر آئے ہیں۔ شہر خیال کی دیرینہ قاری بشری افضل بہاولپور سے

آئیں۔ اتنی غیر حاضری کیوں؟ قیصر عباس کافی دنوں بعد حاضر ہوئے۔ محمد سلیم قیصر اللہ تعالیٰ آپ کی مشکلات کو دور فرمائے، آمین۔ اعجاز حسین شٹار صاحب کا تبصرہ پڑھنے کو ملا، جناب آپ نے سلطان راہی کے لیے وحشت زدہ چہرہ کہا، معذرت ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ بہر حال مجموعی طور پر تبصرہ بہترین تھا۔ عمران جوانی آپ کو بھی نیا سال مبارک ہو۔ نواد خان کی مقبولیت کے بارے میں آپ نے کہا۔ "زندگی گنزار ہے" کیا انہی کا ڈراما؟ (جی ہاں)۔ سید انور عباس کا تبصرہ بھی خوب تھا۔ پسند آیا۔ طاہرہ گنزار پشاور سے حاضر تھیں۔ وحید ریاست بھٹی صاحب، تجزیے لے کر آئے۔ آپ نے تو ہمایوں دین پوری خان پور کنورا کی یاد دلا دی۔ کیا زبردست تجزیہ لے کر آئے۔ ہمارے پاس تو الفاظ بھی نہیں کہ کس منہ سے تعریف کریں، بس یہی کہہ سکتے ہیں کہ شاندار، جوں جوں پڑھتے گئے ان کی سرگزشت سے محبت کے قائل ہوئے، چلے گئے۔ میرے خیال میں جہاں تک سرگزشت کے حوالے سے ہے یہ اعزاز یعنی تجزیہ، کا اعزاز کسی اور کو حاصل نہیں۔ بہت خوب ہوئی۔ آئندہ اپنے پسند کے کسی مضمون کو پڑھنے کے لیے آپ کے تجزیے کی طرف دیکھنا پڑے گا۔ ڈاکٹر ساجد امجد "شکوہ سخن" میں میر شکوہ آبادی کا تذکرہ لے کر آئے۔ بہت اچھا لگا۔ ہم جیسے ادب کے قارئین کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا تحفہ ہو سکتا ہے۔ "ہم پلہ" خوب صورت تحریر تھی۔ آپ سے گزارش ہے کہ "مسٹر مین" پر بھی کوئی تحریر دیں۔ جیمز بونڈ کے حوالے سے راجرمور ایک اچھا انتخاب ہے۔ "آکٹوپس" انتہائی فضول تحریر تھی۔ صفحات ضائع کیے۔ منظر امام کی تحریر بھی کسی حد تک ٹھیک تھی۔ "الوداع" جہاز رانی کے حوالے سے کافی معلوماتی تحریر ہے اگر کوئی بہت غور سے پڑھے تو کافی حد تک جہاز اور اس کے تکنیکی مسائل سے واقف ہو سکتا ہے۔ "لی مان" ایک در فضول تحریر ثابت ہوئی۔ پتا نہیں کیا سوچ کر آپ نے یہ تحریر شائع کی۔ "اشتہار اجل" بے وقوفی سے اپنے لیے ایسے راستے کا انتخاب کر لیا جو اسے زندگی سے دور لے گیا۔ "فلمی الف لیلہ" میں اب کی بار علی سفیان آفاقی صاحب جالب کو لے کر آئے۔ قبرستان کے حوالے سے آفاقی صاحب سے ہم پوری طرح متفق ہیں لیکن پھر وہی بات جب زندوں کو وہ سہولیات حاصل نہیں تو قبرستان کو خاک حاصل ہوں گی۔ "سراب" انتہائی شاندار طریقے سے آگے بڑھ رہی ہے۔ سچ بیانی "مایا" بہت خوب صورت تحریر تھی۔ ایاز نے اللہ کی مخلوق پر احسان کیا تو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کے دل میں اس کے لیے رحمت ڈال دی۔ واقعی المل زمین پر مہربانی کی تو عرش والا بھی مہربان ہو گیا۔ "فاصلوں کا کرب" آج کے جدید دور کے حالات کی عکاسی کرتے ہوئے نظر آتی ہے۔ ماں باپ کے جھگڑوں کا اولاد پر کتنا اثر ہوتا ہے۔ "آخری ملاقات" میں حریم نے انتہائی غلط طریقہ اختیار کیا اور پھر اس کی سزا بھی پائی۔ علی کی خوشیاں تو اسے مل ہی گئیں لیکن تمام عمر کی معذوری اس کا مقدر بن گئی۔ اس کا مداد ادا کیسے ہوگا؟ "فساد عشق" علی ایک ایسے مسئلے کا حصہ بن گیا جو

اس کا نہیں تھا۔ رمشا بھی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ محض ایک احمقانہ انتقام کی بھینٹ چڑھ گئی۔ ”جیسے کوتیسا“ ہلسی ہلسی میں ایک تلخ اور شجیدہ بات کہنے کی کاوش ہے۔ ایسے لوگوں کی فطرت کو بے نقاب کیا گیا ہے جو اپنے ہی خیالات کا پرچار کرتے ہیں اور انہیں اس بات کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ دوسروں کو کتنی تکلیف ہوگی۔ ”پراسرار حویلی“ ایک انتہائی خوب صورت تحریر ثابت ہوئی۔ ”اکیلی عورت“ میں ہمارے آج کے معاشرے کی عکاسی ہے۔ شاہینہ کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کی ذمہ دار خود اس کے والدین ہیں جنہوں نے بغیر دیکھے بھالے اپنی بیٹی کو فیصل کے حوالے کر دیا۔ اس پر بہتر تبصرہ طاہرہ گلزار ہی کر سکتی ہیں۔ ”غم دل“ پر بالکل تبصرہ نہیں ہوگا کیوں کہ یہ کہانی آپ پہلے کسی شمارہ میں شائع کر چکے ہیں اور اب پھر دوبارہ شائع کی ہے۔ (حیرت انگیز انکشاف ہے۔ پلیز اس کہانی کی فوٹو کاپی ارسال کر دیں نوازش ہوگی)۔“

(ابھی ابھی خبر آئی ہے کہ مہر خیال کے ہر دل عزیز باسی پورے والا کے رانا محمد شاہد کی والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا۔ ان کے غم میں ہم سب شریک ہیں۔ تمام احباب سے التماس ہے سورہ فاتحہ کی تلاوت کر دیں۔)

☆ ملک محمد ظفر اللہ نے راجن پور سے لکھا ہے۔ ”میری سمجھ کے مطابق ماہ دسمبر 2014ء میں شائع شدہ کہانیوں میں سے اول، دوم اور سوم آنے والی کہانیاں درج ذیل ہیں۔ پہلی ”کرب“، دوسری ”آزمائش“، تیسری ”دوسری موت“ باقی کہانیاں بھی اچھی تھیں۔“

☆ محمد انور، باڑی جم ہوتی، مردان سے رقم طراز ہیں۔ ”لکھتا مجھ جیسے نالائق اور کند ذہن کو زیب نہیں دیتا کہ من آنم من دائم لیکن آڑی ترجمی لکیر کھینچنا تو باز پچھلے اطفال میں اکثروں کا دستیر ہوتا ہے۔ اس ملک سو چا خراب کی کون سی شے ہے۔ کون سی قدر ہے جو اپنی جگہ پہ ہے۔ وہ چند گھنٹوں اور لمحے اچھے گزرتے ہیں جب آپ کا سرگزشت، جاسوسی یا سسپنس ہاتھوں میں ہو کر نہ بہت جھس جھس بہت ناگفتنی ہے۔ سراب و آئین سراب ہے۔ شہباز خان چاؤ باز ثابت ہو رہے ہیں۔ سچ بیٹاں پڑھ کر بچپن کی یادیں ہی یاد آ جاتی ہیں۔ آپ کے شہر خیال کے سب باسیوں کو سلام و دعا۔ خصوصاً ڈاکٹر روبینہ نفس، شاہد جہا نکیر اور طاہرہ گلزار۔ ان کی شمولیت بہت اچھی لگتی ہے۔ ادارہ پسند آتا ہے، اسے جاری رہنا چاہیے۔ کچھ ڈھارس بندھتی ہے کہ ابھی اچھے اور بھلے لوگ موجود ہیں۔“

☆ سہیل احمد عباسی کی تعریف آوری ساآں، بنوں عاقل سے۔ ”دسمبر کا سرگزشت اپنی روایتی خوبیوں اور سلسلوں کے ساتھ مطالعہ کیا۔ اس دفعہ جس چیز نے خط لکھنے پر مجبور کیا وہ ناصر حسین رند کی محبت بھری آواز تھی ”کہاں گم ہو آ بھی جاؤ“۔ اب اس طرح کوئی محبت سے بلائے تو اپنے دل کو کوئی کیسے روکے۔ سرگزشت سے اپنے تعلق کو ریلج صدی ہو گئی اب سوچتے ہیں تو حیرت ہوتی ہے کیوں کہ ہم خود بھی ابھی 40 سال کے ہوئے ہیں۔ اتنی چھوٹی عمر میں ایک شجیدہ رسالے کی محبت سرگزشت کے معیار کی نشانی ہے اور ہمارا سب سے پہلا خط 1991ء کے خواکشی نمبر میں شائع ہوا تھا۔ پھر دہڑاتا ہے کہ ہمایوں دین پوری صاحب کے سالانہ تذکرے میں تب تک سرگزشت کو مجموعی طور پر سب سے زیادہ خطوط لکھنے والوں میں ہم بھی شامل ہوا کرتے تھے لیکن پھر آہستہ آہستہ مصروفیات بڑھتی گئیں اور ہم اس کے گلاب آگئی لمس سے بھی محروم ہوتے گئے۔ دیکھتے ہیں اب بات کہاں تک پہنچتی ہے۔ دریائے نل کا تذکرہ نہایت معلوماتی اور بہترین تھا۔ طاہرہ گلزار صاحبہ کے خط میں چار بیویوں کی شرعی اجازت کا نہایت نامناسب انداز میں ذکر ہوا ہے۔ طاہرہ صاحبہ اگر چار بیویوں کی اجازت ہے تو ان میں برابری کا سخت حکم بھی ہے۔“

☆ محمد عمران جبرانی کا تجزیہ کراچی سے۔ ”بنوری کی ایک منجھی سرگزشت سرفراز خان نیازی کے تعارف برہنی ہے۔ اوپر والے کا کرم، تیز دماغ اور اعلیٰ ذوق کجا ہوں تو ایسے ہی شاہکار جنم لیتے ہیں۔ خالد قریشی کی ”آکٹوپس“ تفسیر ہے کہ ایک غلطی چھپانے کے لیے انسان دس غلطیاں کرتا ہے۔ ایک قصہ کو تحریر کے ذریعہ فلم کی صورت سامنے لا کر اکر کرنے کا کام عموماً سے کیا گیا۔ منظر امام نئے سال کے ساتھ ہی امتگیں سجاتے نظر آئے۔ غیر ضروری طوالت سے گریز نے ”کیسے کیسے لوگ“ کی افادیت میں اضافہ کیا۔ جی جی جناب درست فرمایا۔ ”ملٹن کیوں اندھا ہو گیا تھا“ والا بورڈ میرا دیکھا ہوا ہے۔ کراچی کے انجمن اے جناح روڈ پر مولوی مسافر خانہ اردو بازار کے اسٹاپ پر ہے یہ بینک سازی وکان ہے چونکہ ہم خود بینک لگاتے ہیں چنانچہ ان الفاظ کی افادیت خوب سمجھتے ہیں۔ ابن کبیر کے ”پراسرار گمشدگی“ ایسی قیمتی تحریر نے معلومات میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ ویسے وزراء تو ہمارے بھی غائب ہو جاتے ہیں اور نہ ہوں تو انہیں غائب کیا بھی جاسکتا ہے۔ آفاقی صاحب نے ہالب صاحب کا جو انٹرویو نقل کیا ہے وہ بار بار پڑھنے کے قابل ہے۔ اس کے بعد لاہور کے قبرستانوں اور باغات کا ذکر ہے۔ لاہور ایسا سمندر جس کی بار بار سیر کرنے پر بھی کھل سیرابی نہیں ہوتی اس ضمن میں کراچی کے میوہ شاہ قبرستان کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا جو ایشیا کے چند بڑے قبرستانوں میں سے ہے لیکن بے ہنگم پھیلاؤ کا یہ عالم ہے کہ قبروں کے اوپر قبریں بھی بنی ہوئی ہیں۔

خبروری 2015ء

17

ماہنامہ سرگزشت

Copied From Web

جرائم کی کثرت کی بناء پر اکیلے جانے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ مریم کے خان حسب معمول وقفے کے بعد نہایت معلوماتی تحریر کے ساتھ نظر آئیں۔ رزاقی صاحب نے پہلے امریکی پڑاؤ کا مختصر حال بیان کیا پھر فیلا کی مرطوب آب و ہوا میں گھماتے رہے اور اختتام فرانس کے دلقریب سفر تازے پر ہوا۔ ”ہم پلہ“ کی شکل میں شیل اور لیس نے درد دل رکھنے والے اداکار راجرمور کا زندگی نامہ کاغذ پر تھل کیا۔ ساجد صاحب کی ”شکوہ سخن“ کو معلومات کی کسوٹی پر رکھا جائے تو بات بن سکتی ہے ورنہ یہ مضمون دل میں گھرنہ کر سکا۔ ”شہر خیال“ میں ملک رحمت کا پُر خلوص نامہ اچھا لگا۔ بشری افضل اور سدہ بانو کے نوک جھوک سے بھر پور خطوط بھی پسند آئے۔ عمدہ انداز ہے۔ سلیم قیصر و علیکم السلام۔ آپ کی ساتھیوں سے تفصیلی علیک سلیک بہت خوب ہے۔ اعجاز شمار کا تبصرہ حسب معمول بہت جاندار ہے۔ فقیر حسین نے خوب صورتی سے سچ بیانیوں پر تبصرہ لکھا۔ طاہرہ گلزار کا خط حسب معمول شہر خیال کے آخر میں بہار دکھلا رہا ہے۔ اس رواں زبان میں خط لکھنا باہمی گل ہی کا خاصہ ہے۔ سب سے بڑھ کر وحید ریاست بھی کا خط قابل قدر شاہ پارہ ہے۔ نہایت خوب صورتی سے پورے سال کا نچوڑ پیش کیا اور قابل قدر قلم کاروں کو کھل کر سراہا خاص کر آخر میں دی گئی تقریباً تمام ہی تجاویز ایسی ہیں جن کے بارے میں ہمارے بھی دل سے ”ہاں ہاں“ نکل رہی ہے۔ قیصر عباس نے بہترین خط لکھا لیکن کرب کے حوالے سے آپ لکھتے ہیں کہ ”انعام صاحب“ سنجیدہ کو لے آتے لیکن انہوں نے اس کی جوان بہن کو ترجیح دی۔ صاحب عرض یہ ہے کہ اس طرح انعام صاحب نے اس لڑکی کا مستقبل محفوظ کر کے اپنے محبوب کی خواہش کا احترام کیا ہے۔ محبوب کا مان رکھ لینا اس کی خواہش پر اپنی چاہت قربان کر دینا محبت پالینے سے بڑا عمل ہے۔ ایاز سومرو کی ”مایا“ نے سرورق کا حق ادا کر دیا۔ زندگی کے اتار چڑھاؤ نہایت خوب صورتی سے بیان کیے۔ ایاز نے بلاوجہ فون کرنے کی بجائے ہن کھن کو اس کے مقام پر پہنچا دیا اور اوپر والے نے اس کے بچے کی زندگی کو نادی۔ علی صاحب نے ”فساد عشق“ میں خوب دھوکا کھایا۔ جناب آج کے دور میں کوئی کسی کو بائیک پر لفٹ نہیں دیتا اور آپ ایک عزت دار گھر سے بھاگی ہوئی جوان لڑکی کو پناہ دینے چلے تھے۔ ویسے پھر بھی سستے میں چھوٹ گئے۔“

☆ بشری افضل نے بہاولپور سے لکھا ہے۔ ”2 جنوری کو سرگزشت موصول ہوا۔ اپنی محفل میں پہنچے۔ شاہد جہانگیر شاہد کو کرسی صدارت مبارک ہو۔ تبصرہ اچھا تھا۔ دیکھ لیں وحید ریاست بھی نے واقعی عمل کر ڈالا اور سالانہ تجزیے کے ساتھ حاضر ہو گئے۔ صوبہ شاہ پسندیدگی کا شکر یہ! طاہرہ گلزار جی لوگوں کو تو میرا میگزین میں لکھنا بھی پسند نہیں ہے۔ میرا لکھنے کا شوق لوگوں کو حسد میں مبتلا کر دیتا ہے۔ کوئی میری تعریف نہیں کرتا۔ ہاں جو لوگ بیرون ملک رہتے ہیں وہ مجھے ضرور پڑھتے ہیں اور کہتے ہیں آدمی ملاقات ہو جاتی ہے اور آپ کے تبصرے کو تو شون سے پڑھتے ہیں۔ خدا کرے تو تین سال سب لوگوں کے لیے مبارک ہو۔ وحید ریاست بھی کا سالانہ تجزیہ 2014ء مختصر اور جامع تھا۔ کیا خوب تجزیہ کیا ہے۔ محمد سلیم قیصر آپ کا اندازہ غلط بھی تو ہو سکتا ہے نا! اعجاز احمد شمار کا تبصرہ اچھا تھا۔ عمران جوانی نے بھی اچھا لکھا۔“

☆ اولیٰ شیخ نے نوپہ فیک سنگھ سے لکھا ہے۔ ”اس دفعہ ادارہ یہ نہیں بلکہ اک نوحہ ہے۔ سانحہ پشاور میں وحشت اور بربریت کی جوئی داستان رقم کی گئی ”زمین ہنسی نہ آسمان گرا“ ایک حقیقی ٹیچر کو ”انکارا“ بنا دیا گیا۔ ظلم کی انتہا کر دی۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ سانحہ پشاور کے تمام مرحومین کو جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین۔ سائنس دان پاکستان کا تذکرہ ٹھیک تھا۔ ”شہر خیال“ کی جانب گامزن ہوئے۔ ملک رحمت کا جواب دینے پر شکر یہ۔ شاہد جہانگیر صدارت کی کرسی مبارک ہو۔ عزیز مئے سے اسی خلوص کی توقع تھی۔ اس دفعہ فقیر حسین ضیاء کا مکتوب میرے دل کی آواز تھا۔ انکل! یقین مانیے ”کرب“ ایک ایسی سچ بیانی تھی جسے میں پڑھ کے اس رات ایک طریقے سے سو نہیں پایا تھا۔ میرے خیال میں انعام انصاری صاحب نے ”کرب“ نہیں ایک ”قرض“ لکھا جسے ہمارے حکمرانوں کی ابے حسی نے اب تک نہیں چکایا۔ وہ چکائیں بھی کیسے؟ انہیں صرف وہی چیزیں عزیز ہیں ایک اپنا سفاد اور دوسرا اپنے غیر ملکی آقاؤں کو خوش رکھنا۔ رہی ثبوت کی بات تو بنگلہ دیش میں پاکستان کے حمایتی لوگوں کی پھانسیوں پر حکومتی خاموشی کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ وحید ریاست ہنسی کا تجزیہ ان کی قابلیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ”شکوہ سخن“ ڈاکٹر صاحب آپ کی تحریر کی تعریف و توصیف کے لیے الفاظ نہیں ہیں۔ ”ہم پلہ“ جیسی تحریریں میرے مزاج کی نہیں اس لیے نہیں پڑھیں۔ ”آکٹوپس“ سے واقف تو تھے مگر ساتھ ”عظیم“ کا لفظ دیکھ کر حیرت ہوئی۔ ”کیسے کیسے لوگ“ منظر امام کی یہ کاوش پڑھنے والوں کے لیے تھکتی تھی۔ میں ان میں سے بیشتر شخصیات کا مطالعہ کافی بار کر چکا ہوں۔ سفر نامہ اس دفعہ کچھ سنجیدہ سا تھا جو اوپر سے گزر گیا۔ ”پراسرار گمشدگی“ نے حیران کر دیا۔ کسی بھی ملک کے وزیر اعظم کا یوں لاپتا ہونا اچھے بچے کی بات ہے۔ ”فلمی الف لیلا“ اس مرتبہ علم و ادب سے بھر پور کاوش تھی۔ ”آپ حیات“ پر تحریر پہلی بار پڑھی۔ کافی محفوظ ہوا۔ ”درست فیصلہ“ مختصر مگر جامع تحریر تھی۔ مریم کے خان صلیبہ آپ میری پسندیدہ لکھاریوں میں شامل ہو چکی ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ ”فلسفہ“ مضمون کے متعلق کچھ لکھیں آپ کا ممنون رہوں گا۔ سچ بیانیوں میں ”مایا“ قرآن مجید کی اس آیت کا زندہ معجزہ تھی

کہ جس میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ”میں اپنے بندوں کو ایسی جگہ سے رزق دوں گا کہ اس کے وہم و خیال میں بھی نہ ہوگا۔“ ”فاصلوں کا کرب“ شادی شدہ لوگوں کے لیے مکمل سبق تھا۔ ”بھینٹ“ پڑھی تو میں احسن صاحب سے پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ نے عامر کا شاکستہ سے تعارف کروا تو یا مگر آپ بعد میں عامر سے سچ کہہ بھی سکتے تھے کہ مجھے وہ پسند ہے آخر آپ کا سچا دوست تھا۔ ”آخری ملاقات“ پڑھی۔ پسند کے اور لڑکی کا بنیادی حق ہے مگر ہمارے نوجوانوں کی عقل پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ دل کی سنتے ہیں مگر دماغ سے نہیں سوچتے۔ سو اس کا انجام کبھی بھار ”آخری ملاقات“ سے بھی بدتر ہوتا ہے۔ (اتفاق کی بات ہے جس شمارے کی بات آپ نے کی ہے وہ شمارہ ہمارے پاس بھی نہیں ہے۔)

☆ قیصر خان کا خلوص نامہ بھکر سے۔ ”اور یہ میں جس علم ناک یا سائخ کی بات کی ہے وہ سانحہ تقسیم پاکستان کے دن رونما ہوا۔ بہت الفاظ لکھ سکتا ہوں پر سب الفاظ چھوٹے ہیں۔ معلوم نہیں خدا کے نام پر فل و غارت کرنے والے لوگ کون ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو برباد کرے۔ ”شہر خیال“ میں نئے سال کے پہلے شمارے میں کرسی صدارت پر بہت پیارے خوب صورت اور جاندار تبصرے کے ساتھ شاہد جہا تکیر صاحب جلوہ افروز تھے۔ بہت مبارک باد۔ محمد سلیم قیصر سے درخواست ہے کہ وہ محل کر بتائیں وہ کس وجہ سے اتنے بڑے جرم میں پھنسے۔ حاجی اعجاز صاحب ہم آپ کے سنجیدہ اور معلوماتی تبصرے کے بہت شوقین ہیں۔ سید انور عباس شاہ ملک، محمد عزیز، عمران جوانی، ملک رحمت، محمد اشفاق اچھے تبصروں کے ساتھ حاضر تھے۔ وحید ریاست بہت ہی اچھے تجزیہ کے ساتھ بہت ہی مفید رائے سے حاضر تھے۔ آپا سدرہ بانو صاحبہ شہر خیال میں پورا سال جلوہ افروز رہیں۔ مبارک باد اس کے بعد آپا بشری افضل صاحبہ 11 خطوط کے ساتھ دوسرے نمبر پر رہیں۔ مبارک باد اور ساتھ بہت سی دعائیں آپا جان، آپ کے دشمن بھی کامیاب نہ ہوں، آمین۔ جنوری کے پرچے میں آپا طاہرہ گلزار اور باجی گل صاحبہ اپنے پرانے انداز سے حاضر تھیں اور شہاب نامہ پر رائے دی جو کہ بہت اہم بات کی ہے اللہ تعالیٰ سلامت رکھے، آمین۔ کہانیوں میں ”مایا“ بہت اچھی تھی اس میں ایک بات یا جملہ تھا کہ میں نے اس کی مخلوق کا خیال کیا تھا۔ بے شک آپ نے خیال کیا اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس کا اچھا نم البدل عطا کیا۔ شاہ زیب D.S.P کا بیٹا تھا اور بہت مشہور اور بڑے زمیندار کے بیٹوں کے ہاتھ مل ہوا تھا۔ ”فاصلوں کا کرب“ بہت اچھی کہانی تھی اگر ماں باپ ایسے ہوں تو زلت بالکل ایسا لگتا ہے۔ ”بھینٹ“ احسن صاحب واقعی آپ کو اللہ تعالیٰ نے بہت آزمائش دی ہے۔ پہلے محبت کی دوسری دوست کی اور اس کے ساتھ آپ کو ممبر بھی دیا ہے۔ ”آخری ملاقات“ شہر خیال میں لکھنے والی آپا عظمیٰ شکور کی لاجواب کہانی تھی۔ حریم صاحبہ اور اس کا بھائی دونوں نفسیاتی پاگل تھے اور علی صاحب جان نہ سکے اللہ نے حریم کو اس کے کیے کی سزا دی ہے اور پتا نہیں بھائی۔ ساتھ کیا ہوا ہوگا۔ ”فساد عشق“ پروفیسر صاحب اپنے شاگرد کی چال میں پھنس گئے۔ واقعی کچھ لوگ ناسور ہوتے ہیں۔ پروفیسر صاحب ایک تھپڑ کے بعد سچ گئے میرا بہت تجربہ ہے۔ پولیس سے اللہ بچائے اور پروفیسر کے ساتھ سب سے التجا ہے وہ لڑکی کے کیس میں امداد نہ کریں۔ چاہے بھائی ہو۔ ”عم دل“ خواہشات جب وسائل سے بڑھ جائیں تو ایسا ہوتا ہے اور رشدی خان واقعی ایک عظیم انسان ہیں جنہوں نے شیطان کی نہیں سنی اور پاگل لالی نہ سمجھ سکی۔“

☆ سید انور عباس شاہ کا مکتوب۔ ”پنا اور کے 16 دسمبر والے سانحے کو مدتوں بھلا یا نہیں جاسکتا۔ اس سلسلے میں جناب شاہد جہا تکیر شاہد اور باجی گل طاہرہ گلزار ضرور اپنی خبریت سے مطلع کریں کہ ان کے کوئی عزیز یا ان کے بچے اس اسکول میں پڑھتے تو نہیں تھے (وہ تمام بچے ہمارے، آپ کے ہم سب کے عزیز تھے)۔ ”شہر خیال“ میں ایک دفعہ پھر شاہد جہا تکیر شاہد بازی لے گئے۔ ماضی کی قلم انڈسٹری اور فنکاروں کے بارے میں معلومات دل کو بہت بھلی لگیں۔ شاید حبیب اور اعجاز کے علاوہ بھی ماضی کے اور فنکار زندہ ہوں اور گمنامی کی زندگی بسر کر رہے ہوں۔ ہم ان کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔ کچھ عرصہ قبل آقائی صاحب ”قلبی الف لیلہ“ میں وقتاً فوقتاً ماضی کی معروف ہیروئن شمیم آراء کا تذکرہ کرتے رہتے تھے کہ وہ آج کل امریکا میں اپنے بیٹے کے پاس ہیں اور تادم تحریر کو ماکہ کی حالت میں ہیں۔ اس کے بعد ہمیں ان کے بارے میں نہیں معلوم۔ اسی طرح موسیقار سہیل رعنا کے بارے میں ان کے امریکا کینیڈا سیٹل ہونے کے بعد ہمیں نہیں معلوم، (سہیل رعنا کینیڈا کی مٹی میں مدفون ہو چکے ہیں) شکر یہ سسر سدرہ بانو ناگوری دیگر بہن بھائیوں کی طرح آپ نے بھی میری سلور جوبلی والی تحریر کو پسند کیا اور معراج انکل نے بھی اس تجویز کو منظور کر کے تیاری شروع کر دی ہے ان کا تو اچھا عمل ہے۔ اسی تجویز کی تھوڑی سی منتی باقی اس طرح رہ گئی کہ قابل احترام اور محترم شخصیت شاہد جہا تکیر شاہد صاحب نے اس بارے میں اپنی رائے نہیں دی جو کہ بہت ضروری تھی۔ قیصر عباس خان اپنے خوب صورت تبصرے کے ساتھ شہر خیال کی زینت بنے۔ انہوں نے بھی میری سلور جوبلی والی تجویز کے بارے میں اپنا ووٹ دیا۔ صوبی شاہ نے گو کہ مختصر لکھا لیکن خوب لکھا۔ آتی رہا کریں۔ محمد سلیم قیصر کے لیے ہم تہہ دل سے دعا گو ہیں کہ خداوند کریم ان پر اپنی رحمتوں کی برسات عطا کرے اور ان کے دکھ دور و دور فرمائے، آمین۔ ویسے کیا حالات اور وجوہات تھیں جن کی وجہ سے آپ اس مقام تک پہنچے۔ اعجاز حسین شمارہ خوب صورت مولیٰ پروئے ہوئے ”شہر خیال“ کی زینت بنے۔ پڑوسیوں سے محبت کا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

اظہار کیا اس والہانہ ہند بے کا بے حد شکر یہ۔ عمران جوانی اور فقیر حسین نسیا کے خط بھی شاندار تھے۔ ہر دلعزیز بہن طاہرہ گلزار عرف باجی گل آپ کا خط سبق آموز اور شاندار تھا۔ وحید ریاست بھٹی کا سالانہ تجزیہ پڑھنے کے قابل تھا۔ یقیناً اس پر بہت محنت ہوئی، ہم ان کو داد دیتے ہیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد کو تو ہم ملی طور پر یہاں سے پھولوں کے ہار نہیں پہنا سکتے، یہ عمل لفظوں کے ذریعے ہم ان تک پہنچا سکتے ہیں۔ ان کی تحریر شکوہ سخن سبق آموز اور معلومات سے بھر پور تھی۔ ”ایلی عورت“ ایک دکھ بھری تحریر تھی۔ شوہر کے انتقال کے بعد جب شاہینہ نے بچوں کی خاطر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تو ماں باپ نے اس کی شادی بغیر سوچے سمجھے فیصلے جیسے بے غیرت شخص سے کر دی۔ نتیجتاً شاہینہ کو اذیت ناک دن دیکھنا پڑے۔ ”پراسرار حویلی“ نام کی طرح پراسرار تحریر تھی۔ ”جیسے کو تیسرا“ ایک دلچسپ تحریر تھی یہ حقیقت ہے کہ ہاں اس کو ہوتا ہے جس کے دل پر گزرتی ہے۔ عظمیٰ شکور کی کہانی ”آخری ملاقات“ ایک بہترین، سبق آموز اور ان لوگوں کے لیے حوصلہ افزا تحریر تھی جو تھوڑی سی پریشانی یا مصیبت آجانے پر ہمت ہار بیٹھتے ہیں۔ ”بھینٹ“ ایک بے مثال تحریر تھی۔ اللہ تعالیٰ عامر اور شائستہ کو اپنے جو ارحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ منظر امام کی تحریر ”کیسے کیسے لوگ“ نے تو اس شمارے کو چار چاند لگا دیے۔ مشہور شخصیات کے بارے میں معلومات معد ان کی تصاویر کے مضمون قابل حسین تھا۔ اس کے علاوہ ہم پلہ، آکنو پلہ، الوداع، پراسرار کشمکشی اور آب حیات جاوید اثر تحریریں تھیں۔“

☆ رانا محمد شاہد کا خلوص نامہ بورے والا سے۔ ”دسمبر کا سرورق اچھا لگا۔ معراج صاحب کا ادارہ ایک صحیح حقیقت کو اجاگر کر رہا تھا۔ غربت کی ہلکی میں پستی عوام ہمیشہ سے سیاستدانوں اور پیسے والوں کے ہاتھوں ایسے ہی بھیا تک مذاق و دھوکے کا شکار ہوتی آئی ہے۔ ”شہر خیال“ میں شاہد جہا تکیر کا تبصرہ اچھا لگا۔ اسی لیے پہلے نمبر پر تھا۔ سید انور عباس کی سلور جوہلی نمبر میں سرگزشت کی تاریخ پر تفصیلی مضمون والی تجویز معقول لگی۔ ڈاکٹر قرۃ العین، اویسے میرے خیال میں پراسرار نمبر سے بہتر ہے روحانی نمبر نکالا جائے۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی! نوٹیل نعام یافتہ مسلمانوں کے متنازعہ ہونے پر آپ کی معلومات حقیقت کے بہت قریب لگیں کہ مسلمانوں کو نوٹیل نعام بھی اپنے مفادات کو مد نظر رکھ کر دیا جاتا رہا۔ اس ساری بات کا مطلب مسلمان نعام یافتگان کی کوششوں و صلاحیتوں کو نظر انداز کرنا ہرگز نہیں ہے۔ قیصر خان بھائی! تبصرے کے لیے وقت نکال ہی لیتے ہیں لیکن ساتھ ساتھ کوشش کرتے ہیں کہ تبصرہ مختصر ہوتا کہ سبھی لکھنے والے شامل ہو سکیں۔ اشرفی افضل مبارک باد کا شکر یہ۔ صحافت کے پیشے کے اسرار و رموز کو اجاگر کرتی مریم کے خان کی تحریر دلچسپ تھی۔ شمارے کا سب سے خوب صورت، دلچسپ اور معلوماتی مضمون ”دریائے نیل“ طارق عزیز خان کا تحریر کردہ تھا۔ مجھے دریائے نیل پر تفصیلی و تحقیقی مضمون درکار تھا۔ یہ تشنگی و تلاش بھی دور ہوئی۔ سرگزشت کے چھوٹے کٹ پیس اب دلچسپ و معلوماتی ہوتے جا رہے ہیں۔ یقیناً اس طرف آپ نے توجہ کی ہے۔ منظر امام صاحب نے جنوری ناو کسبر معلومات کا بہت مفید سلسلہ جاری رکھا۔ ان سے گزارش ہے کہ نئے سال پر معلومات کا کوئی اور منفرد سلسلہ شروع کر دیں۔ مثلاً مینے میں پیدا اور وفات پانے والی شخصیات پر مختصر مختصر یا مینے میں ہونے والے اہم ترین واقعات پر وغیرہ۔“

☆ منشی محمد عزیز مئے کا خلوص نامہ لندن سے۔ ”سرورق کے اد پر والے ایک کونے میں غالباً شکوہ سخن منیر شکوہ آبادی ہیں (جی نہیں راجرمور ہے) چھپکلی کو دیکھ کر بہت حیرت ہوئی لیکن جب سرورق کی کہانی ”مایا“ پڑھی تب بات سمجھ میں آگئی۔ بے شک اللہ تعالیٰ کے نوازانے کے نرا۔! طریقے ہیں۔ ”فاصلوں کا کرب“ زویا اعجاز کی یہ تحریر پڑھ کر مجھے تو لالہ کے والدین بلکہ بے غیرت والدین پر شدید غصہ آیا۔ یقیناً میاں بیوی کی آپس کی ہمہ وقت لڑائی جھگڑے اور چپقلش کے نتائج بد سے بدتر انداز میں ظاہر ہوتے ہیں۔ احسن فاروقی کی ”بھینٹ“ اسرودہ کر گئی۔ یقیناً آج بھی بہت سے لوگ عموماً اور عورتیں بالخصوص نام نہاد عالموں کے ہاتھوں لٹتے رہتے ہیں۔ عظمیٰ شکور کی ”آخری ملاقات“ منفرد قسم کی آپ بیتی تھی۔ یقیناً حریم نفسیاتی مریض تھی جس نے اپنے محبوب کے ساتھ نرالا برتاؤ کر ڈالا۔ ”فساد عشق“ کا نام فساد کا رو بار ہونا چاہیے تھا کیوں کہ بات بظاہر ارسلان کی نظر میں تو کاروباری رقابت ہی تھی ناں۔ بے چارے پروفیسر صاحب اپنے شاگرد کی مدد کے چکر میں مفت بے عزت ہوئے۔ ”پراسرار حویلی“ پڑھتے ہوئے میں خود بھی ڈر گیا کیوں کہ باہر شدید دھند، سردیوں کا موسم، ہوکا عالم اور کمرے میں اکیلا میں۔ ایسے میں یہ کہانی پڑھتے ہوئے بجلی چلی گئی تھی تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسے میں مجھے تو خود ایسے محسوس ہوا جیسے عباد اور یاسر کے ساتھ میں بھی اسی پراسرار حویلی میں ہوں۔ بہر کیف ایک آدھ ایسی پراسرار کہانی ہر ماہ ہونی چاہیے۔ ”ایلی عورت“ میری نظر میں اس ماہ کی بہترین سچ بیانی تھی۔ جس میں شاہینہ ثانی نے زبردست ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے درندے نما شوہر سے بالآخر نجات حاصل کر لی۔ نہ جانے کیسی وہ ماں تھی جس نے اپنی اولاد کی اولاد کے بارے میں ذرا سا بھی نہیں سوچا۔ اس ماہ کی آخری اور طویل ترین آپ بیتی ”غم دل“ ایک مصور اور آرٹسٹ کی داستان حیات جس کی زندگی میں اس کی شادی سے پہلے دوا کیاں آئیں مگر ان کے فلسفہ محبت عجیب تھے۔ خصوصاً لالی کا وہ انداز بہت ہی بے ہودہ اور لغو تھا۔ وہ یقیناً ظاہری چکا چوند کی ولدادہ تھی اور اسی وجہ سے ایک بازاری عورت بن گئی۔ ”شکوہ سخن“ ڈاکٹر ساجد امجد کا بہترین مضمون تھا۔ ”درست فیصلہ“

مریم کے خان عالمی سیاست کے موضوع پر تحریر مائی تھیں جس میں روسی لیڈروں کے غلط اور چین کے درست فیصلے کا ذکر تھا۔ یقیناً ایک چھوٹی سی غلطی بھی ریاست کو کئی صدیاں پیچھے دھکیل دیتی ہے۔ شیراز خان "آب حیات" کے موضوع پر مختصر مگر مفصل تحریر لائے جس میں ہر مذہب کے حوالے سے آب حیات کا ذکر تھا۔ "ہم پلہ" میں محترم شکیل ادریس صاحب نے راجرمور کے حالات زندگی کا بڑا خوب صورتی سے احاطہ کیا ہے۔ "کیسے کیسے لوگ" منظر امام صاحب دنیا کے مشہور لوگوں کی خامیوں اور معذوریوں سے متعلق ہمیں آگاہ کر رہے تھے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں کہ ہمت مردان مدد خدا۔ "الوداع" میں حسن رزاقی صاحب کا اثر ہوسنس کو دیا گیا مشورہ پڑھ کر بہت لطف آیا۔ کیا خوب مشورہ دیا ہے رزاقی صاحب نے۔ ادارہ پڑھ کر ایک بار پھر دل غموں کے سمندر میں ڈوب گیا۔ میرے خیال میں یہ پوری دنیا کی تاریخ کا انتہائی افسوس ناک اور دل دہلا دینے والا واقعہ ہے جسے پڑھ اور سن کر انتہائی دھاڑیں مار مار کر رونے کو جی چاہتا ہے۔ میرے خیال میں شاید ہی کوئی ایسا سنگدل انسان ہوگا جس نے اس افسوسناک واقعے بلکہ سانحے کا اثر نہ لیا ہو۔ خود میرے بچے نی وی پر ان معصوموں کے جا بجا گم ہونے ہوئے خون آلود جوتے اور کتا میں دیکھ کر نفسیاتی مریض بنتے جا رہے ہیں۔ ایک دن بیٹے نے مجھ سے کہا۔ "پاپا! میں اسکول نہیں جاؤں گا۔" میں نے پوچھا۔ "کیوں؟" تو کہنے لگا۔ "وہ ظالم لوگ ہمارے اسکول میں بھی نہ آجائیں۔" اور میں نے بیٹے کو دلہا نہ بھی نہ دے سکا۔ ایک سچی داستان میں پاکستانی سائنسدان سرفراز خان نیازی کے حالات زندگی سے مختصر اور مکمل آگاہی حاصل ہوئی۔ لیجی جی! یہ ہے محبتوں اور چاہتوں کا شہر جسے "شہر خیال" کہا جاتا ہے۔ شہر خیال کی صدارت ایک بار پھر محترم شاہد جہانگیر شاہد کے نام تھی۔ بہت بہت مبارکباد محترم کو۔ 2014ء میں بھی وہ "شہر خیال" میں چھائے رہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اپنی حفظ و امان میں رکھے تاکہ ہم ان کے خوب صورت خطوط سے مظلوظ ہوتے رہیں۔ پشاور ہی سے ایک صاحب انور اعجاز خان آف ایک توتہ ہوا کرتے تھے۔ ان کے خطوط کو معنی اسٹوری کہا جاسکتا ہے کیوں کہ وہ بھی بہت مطلوباتی اور اصلاحی خطوط بھیجتے ہیں۔ سدرہ بانو اور بشری افضل! آپ دونوں خواتین بھی خصوصی مبارکباد کی مستحق ہیں۔ سرگزشت سے آپ کی محبت قابل تعریف ہے۔ ملک رحمت! بالکل درست کہا آپ نے سلور جوبلی نمبر یقیناً خاص الخاص شمارہ ہوگا اس کے لیے آپ لوگ ڈٹ جائیں اور صفحات اور قیمت ڈبل کر دیں۔ بشری افضل! ہمارا دوٹ بھی آپ کا ہوا، بنا کسی لالچ کے۔ محمد اشفاق! میرے خیال میں اب خود کو بھی معاف کر دیں اور "اس" کو بھی۔ ویلڈن وحید ریاست یعنی! بہت محبت کی ہے آپ نے اور بڑی باریک بینی کے ساتھ سرگزشت کا سال 2014ء کا تجزیاتی جائزہ پیش کیا ہے۔ ویسے ایک بات "جوانوں" سے کہنا چاہوں گا کہ دیکھیے۔ "شہر خیال" میں 2014ء میں مجھ ناتواں بوڑھے نے ہی مرد حضرات کی لالچ رکھی تھی۔ بارو! آپ کیوں پیچھے رہتے ہیں۔ آئیے ناں ذرا شہر خیال کی طرف بھی۔ یعنی صاحب! انکل سے یہ سفارش کریں کہ مستقل طور پر بھی سرگزشت کی قیمت دس روپے بڑھا کر صفحات 340 کر دیے جائیں تو بہتر رہے گا۔ "علی آزمائش" میں آپ نے انعام یافتگان کا تذکرہ نہیں کیا۔ خیر آپ کی مرضی۔ آخر میں یہ بتادوں کہ محترم رانا محمد شاہد کی والدہ محترمہ اللہ کو پیاری ہو گئی ہیں۔ مرحومہ کے لیے مغفرت کی دعا کر دیجیے گا۔

☆ ناصرہ احمد کا خلوص نامہ نیویارک امریکہ سے۔ "سرگزشت باقاعدگی سے پڑھتی ہوں۔" "فلمی الف لیلہ" تو ہمیشہ کی طرح قابل ستائش ہے۔ حسن رزاقی صاحب کا سفر نامہ "الوداع" بھی بہت عمدہ اور دلچسپ ہے۔ دسمبر کے رسالے میں اور تو سب اچھا تھا۔ صرف "خونخوار" پر مجھے تو ڈر سا اعتراض ہے۔ لکھنے والے نے تو اپنا کمال دکھا دیا لیکن فی زمانہ اتنے بے شمار خونی درندے دندناتے پھر رہے ہیں جو عورتوں کی بے حرمتی کر رہے ہیں اور مردوں کے گلے کاٹ رہے ہیں معصوم بچوں کو قتل کر دیتے ہیں اور وہ یہ سب نی وی پر دکھانے پر خوش ہوتے ہیں۔ میرے خیال میں اس ماحول میں ایسا خونی قصہ ان ظالم لوگوں کو قلم کرنے کے نئے طریقے سکھا سکتا ہے۔ اب آئیے پاکستانی بچوں کی تعلیم کی طرف۔ اس کی کسمپرسی کے حالات کے بارے میں بار بار پڑھ رہی ہوں لیکن حکومت کی طرف سے تو کوئی توقع نہیں ہے۔ آپ کا روالہ پڑھنے والے ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ کیا ہی اچھا ہو کہ یہ مہبران مل جل کر بچوں کی پڑھائی کے لیے کچھ ہمت کریں۔ اگر صرف دس مہبران اپنے محلے یا کنگھی کے تئیں چار بچے اکٹھے کر کے ان کو اپنے گھر کی ڈیوڑھی میں بٹھا کر پڑھانا شروع کر دیں تو ایک سال میں 40 بچے اسکول کے لیے تیار کیے جاسکتے ہیں۔ پڑھانے کے لیے اردو اور انگریزی۔ ذاتی صفائی، ماحول کی صفائی اور اچھے شہری بننے کے طریقے سکھائے جائیں۔ دینیات مولویوں پر چھوڑ دیں۔ اگر ممکن ہو تو اپنی زکوٰۃ کی رقم میں سے کچھ حصہ ان بچوں کے لیے چھوٹی چھوٹی کتابوں پر استعمال کریں اور اگر ہو سکے تو بیٹے میں ایک دن ان کو سادہ سا کھانا کھلائیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ پروگرام چل سکتا ہے۔ اگر آپ مہربانی فرما کر میرا یہ پروپوزل شائع کر دیں تو پھر معلوم ہو جائے گا کہ کتنے لوگ واقعی قوم کے دردمند ہیں اور آگے بڑھ کر کچھ کرنے کو تیار ہیں۔ (آپ کی تجویز واقعی بہت عمدہ ہے۔)

☆ فقیر غلام حسین ضیاء بھکر سے رقمطراز ہیں۔ "جناب معراج صاحب آپ کی وسیع القلمی ہے کہ تنقید پر کبھی نفا نہیں

فوری 2015ء

[21]

ماہنامہ سرگزشت

ہوئے۔ عمر ذہنی جا رہی ہے مگر ذہن کھلتا جا رہا ہے ہر شمارہ خوب سے خوب تر کہلانے کا حق رکھتا ہے۔ صد تے جاواں۔ ڈاکٹر مساجد امجد صاحب کا ”ظہور سخن“ ایک ادبی اور تحقیقی مقالہ ہے۔ ایسے عظیم لوگ جو زمانے کی گرد میں اب گم نام ہیں ان کو نئی نسل تک لانا بلاشبہ بڑی عرق ریزی کا کام ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی طرف سے نئے نئے مسائل کا بہترین تجربہ ہے۔ منظر امام صاحب نے ”کیسے کیسے لوگ“ کے عنوان سے انگریز سائنس دانوں کا تعارف اور ان کی جسمانی معذوریوں کا تعارف خوب کرایا ہے۔ کیا ہی بہتر ہوتا کسی مسلمان سائنس دان کا بھی ذکر فرما دیتے۔ علی سفیان آفاقی صاحب کا شکر یہ انہوں نے حبیب جالب سے ملا دیا۔ کاشف زبیر صاحب کی تہلکہ خیز کہانی ”سراب“ اللہ کرے یونہی چلتی رہے۔ ایاز احمد سومر کی سچ بیانی ”مایا“ پر سرگزشت کے اپنے تجربہ پر مزید کچھ کہنے کی حاجت نہیں۔ زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اسباب کیسے بنتے اور بگڑتے ہیں۔ یہ سب مسبب الاسباب کی قدرت کاملہ کے انداز کریمانہ ہیں۔“

☆ خالد شفیق ملک نے بھکر سے لکھا ہے۔ ”سرگزشت میگزین اپنی نوعیت کا الگ میگزین ہے جس میں ایک دنیا سہائی ہوئی ہے۔ اس کے تمام مضامین رنگا رنگ ہیں۔ جب ایک قاری پڑھنا شروع کر دے تو پڑھنے کے دوران میں تمام دنیا سے کٹ کر سرگزشت کی دنیا میں کھو جاتا ہے۔ جنوری 2015ء میں ”کیسے کیسے لوگ“ پڑھا جو کہ بہت اچھا ہے تمام یورپین، امریکا کے نامور لوگ شامل ہیں۔ بے شک انہوں نے بہت کام کیا ہے لیکن ہمارے ذہنوں میں یورپ اور امریکا کے لوگ چھا گئے ہیں اور ہم اپنے اسلاف کو بھول گئے ہیں۔ شاید ہماری یادداشت کمزور ہے۔ ہمارے مسلمانوں نے جو کام کیے ہیں وہ یادگار ہیں اور یورپین یونیورسٹیوں میں اب بھی محفوظ ہیں۔ مثلاً جابر بن حیان نے گندھک کا تیزاب سب سے پہلے بنایا۔ البیرونی نے سب سے پہلے زمین کا رداس معلوم کیا اور خطوط طول بلد عرض بلد کا جال نقشے پر فٹ کیا۔ ابن ماجہ، بحر ہند میں جہاز رانی کے متعلق کتابیں لکھیں۔ بوعلی سینا نے پہاڑوں میں معدنیات اور طب پر کافی کتابیں لکھیں۔ ”القانون طب“ کتاب یورپ کی یونیورسٹیوں میں اٹھارہویں صدی تک پڑھائی جاتی تھی۔“

☆ احمد خان توحیدی کراچی سے مرقوم ہیں۔ ”نئے سال کا پہلا شمارہ جنوری 31 دسمبر راولپنڈی سے ملا۔ وجہ موسم سرما کی چشیاں ہیں ہم چنڈی میں ہیں۔ 16 دسمبر پہلے ہی کیا کم جگر خراش ہے جو پھر کاری زخم لگا دیے گئے۔ معصوم بچوں اور پولیو قطرے والی ٹیم کا کیا جرم ہے؟ اللہ تعالیٰ معصوم کلیوں کی قربانیاں رایگاں نہ فرمائیں۔ سائنسداں پاکستان سرفراز نیازی کے بارے میں قبل بھی پڑھا ہے تفصیل کا شکر یہ۔ یکہ صفحہ کو کتابی شکل دے دیں یہ ایک اہم دستاویز ہے۔ شاید جہانگیر پھر کرسی صدارت پر جلوہ افروز تھے ڈبل مبارک۔ تبصرہ گڈ تھا۔ واقعی اس عمر میں بھی آفاقی صاحب کے سوا کسی نے فلمی دنیا کے بارے میں نہ لکھا۔ اہمیت کو داد دیتے ہیں۔ بھائی سلیم قیصر میں آپ کی رہائی کے لیے روزانہ سورہ قمر پارہ 27 حضرت نوحؑ والی دعا آیت نمبر 10 پڑھتا ہوں۔ آپ بھی اول آخر 11 بار درود شریف پھر 313 بار پڑھیں اللہ آزادی دیں گے۔ سسٹر طاہرہ گلزار پشاور، آپ جیسی بے بی گڑیا بہن سے کون ناراض ہو سکتا ہے۔ بھائی انور عباس بھکر، تبصرہ گڈ تھا جس قوم میں ایسی دھمکیاں جیسے لوگوں کی خیر نہ ہو ہمارا اللہ نبلی ہے۔ وحید ریاست بھٹی کلر سیداں، بھائی میں آپ کا بہت قریبی ہمسایہ دریائے سواں کی زرخیز مٹی چٹری کا سپوت ہوں۔ منظر امام صاحب بارہ ماہ کے حالات کے بعد ”کیسے کیسے لوگ“ مع تصاویر لانے پر شکر یہ۔ ”فلمی الف لیلہ“ آفاقی صاحب نے ڈاکٹر کے سامنے کلمہ حق کہنے والے حبیب جالب اور فیض احمد فیض جیسے عظیم شاعروں کا تذکرہ کیا۔ اب آتے ہیں سچ بیانیوں کی طرف۔ ”مایا“ میں بن کمن کے بارے میں پہلی بار پڑھا۔ قدرت کے کارخانے میں کوئی چیز ناکارہ نہیں ہے۔ لی وانگ نیر مسلم ہونے کے باوجود انسانیت کا درس دے گیا۔ ”فاصلوں کا کرب“ لائیب اور علی کی شادی اچھی بات۔ والدین کا خلا والدین ہی پُر کرتے ہیں۔ ”بھینٹ“ جعلی عالموں کی دکان، جاہل و احمق لوگوں سے چلتی ہیں۔ ”آخری ملاقات“ علی کی معذوری، نگینہ بہت عظیم ہے۔ حریم کو اپنے خاوند اور بچوں کے ساتھ پیار سے رہنا چاہیے۔“

☆ عزیز اللہ لکھتے ہیں۔ ”2015ء کی ہر دل عزیز کہانی ”مایا“ ٹاپ کی سچ بیانی ہے۔ کروڑوں سلام محترم معراج رسول صاحب کو۔ سو سلام ایاز سومر کو، سچ کہا ہے کسی نے پیرا ساتھ ہو تو وقت کا ہے کی۔ میں تو کہتا ہوں پاکستان سونا ہے سونا۔ دور جانے کی ضرورت نہیں ہر سال عرب شہنشاہوں کے سندھ میں تائب بچوں کا شکار کرتے ہیں۔ سنگاپور سے وانگ لی مان بن کمن کے عشق میں مرا جا رہا ہے۔ بن کمن بھٹنا زہر پلا ہوتا ہے اتنا مہنگا بھی ہے اور قیمتی بھی ہوتا ہے۔ اپنی روح کی تسکین کی خاطر اور شرمندگی سے بچنے کے لیے یہ بوڑھے دولت مند سیاست دان اپنے جسم کو ٹائٹ اور چست رکھنے کی خاطر بن کمن کو استعمال کرتے ہیں۔ وانگ لی مان نے یہ بات ثابت کر دی کہ درو مند دل غیر ملکیوں میں بدرجہ اتم پایا جاتا ہے۔ پہلی سچ بیانی ”مایا“۔ ”بھینٹ“ دوسرے نمبر پر۔ ”فساد عشق“ تیسرا نمبر۔ ”پراسرار

حویلی“ چوتھا نمبر اعجاز مٹھار آپ کے جسم میں اتنی ڈھیر ساری بیماریاں پل رہی ہیں حیرت ہے یا تو آپ کے گھر کا ماحول صحیح نہیں یا تو آپ کے ہاں کھانا پینا صحیح نہیں۔“

ہم محمد ثواب نے کورنگی کراچی سے لکھا ہے۔ ”خوب صورت آرٹ کے نمونہ والی کرسی کے ساتھ ایک بڑی پھپھکی دیکھ کر جبر جبر اہٹ ہوئی یہ کیسی مناسبت ہے لیکن کہانی ”مایا“ پڑھ کر حقیقت سامنے آئی۔ معراج رسول صاحب! آپ کے ادارے میں ایک ایک لفظ سے لہو کی بوندیں چمکتی نظر آئیں۔ اسکول کے معصوم پھولوں کو گولی مارنے والے حیوان سے بھی بدتر ہیں۔ وہ انسان ہی نہیں تھے تو مسلمان کہاں سے ہوئے۔ شاید خوشخوار درندہ اور مہلک سانپ بھی بچوں کی معصوم شکل دیکھ کر بغیر نقصان پہنچائے گزر جاتا۔ لیکن آہ اس کے بعد شاید ایسی درندہ دنیا میں کہیں دیکھنے میں نہیں آئے گی۔ ان کے لیے موت بھی کم سزا ہے۔ سرگزشت کو کیا کہوں کہ یہ موتیوں کی مالا ہے یا رنگ برنگی پھولوں کا گلستا۔ شخصیات کا تعارف نن میں بڑے بڑے شاعر، سائنسدان، اداکار۔ غرض زندگی کے ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے ہر فن سولہ کے زندگی کے حالات اور کاوشوں کا سلسلہ اس قدر مطوماتی ہوتا ہے جو ہمیں شاید ہی کسی درسگاہ میں بتایا جاتا ہو۔ معلومات کا ایک خزانہ جو ذہن اور دل پر اثر انداز ہو جاتا ہے۔ ”آکٹوپس“ خالد قریشی کی تحریر ایک بوڑھے سے ہو جانے والی انجانی غلطی کو اس نے حماقت سے تیسرا نقل کر کے بجائے اپنے بچاؤ کے خود ہی موت کے منہ میں جا پہنچا۔ یہ انسانی نفسیات کی ایک عجیب اور عبرت ناک کہانی ہے۔ ”الوداع“ حسن رزاقی ایک انٹرنیٹ کے ساتھ بہت عمدہ مصنف بھی ہیں۔ ان کی تحریر انتہائی مطوماتی ٹیکنیکل کا مطوماتی خزانہ ہے۔ انٹرنیٹ سے دلچسپی ہر شخص رکھتا ہے لیکن جو معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں وہ بہت ہی تعریف کے لائق ہیں ساتھ ہی سفر نامہ اور چھوٹی چھوٹی باتوں کو کجا کر کے جو مزہ پیدا کیا گیا وہ واقعی ان کی تحریر کا کمال ہے۔ میں سب سے پہلے اسے پڑھتا ہوں۔ آپ کا رسالہ شکاریات کا قصہ تحریر کرتا تو مزہ دو بالا ہو جاتا۔ آپ شکاریات کو بھی ضرور رسالے میں شامل کریں۔ یہ ایک ایڈوٹجری ہے تو ہے۔ ”مایا“ ایک بہت ہی عجیب اور اسرار سے بھرپور ہے۔ من کھن کا پہلی بار پڑھا۔ یہ ہمارے سندھ میں ہوتی ہے اور اتنی قیمتی اور زہریلی بھی بڑی حیرت ہوئی، ہاں کالے بچھو کو دیکھا ہے اور پڑھا بھی ہے کہ باہر ممالک کو بیج دیے جاتے ہیں بہت مہنگی قیمت پر۔ ”فاسلوں کا کرب“ بڑی دل دوز آپ جیتی اور نصیحت آمیز۔ یقیناً زندگی میں کچھ خلا بھی نہیں کیے جاتے۔ چاہے کچھ بھی نعم البدل مل جائے۔ ”بھینٹ“ دو دوستوں کی لازوال محبت اور قربانیوں کی داستان حسرت۔ بہت اچھی کہانی تھی۔ ”آخری ملاقات“ ایک مختصر آپ جیتی۔ ”پراسرار حویلی“ بہت ہی پراسرار کہانی جس میں ایڈوٹجری بہت ہی دل گردہ کی عکاسی ہے۔ آخری کہانی ”ایکلی عورت“ بہت گہری اور حقیقی کہانی۔ ہمارے معاشرے میں ایسے ہی واقعات ہیں۔ بیٹی، ماں باپ کے لیے ایک سبق آموز کہانی۔ جن کی ایک جلد بازی اور غلط فیصلے ہمارے معاشرے کی بہو بیٹیوں کو جہنم میں دھکیل دیتی ہے۔“

ہم رانا فیصل جاوید کی علی پور شہر سے آمد۔ ”کانی تھل کے بعد ایک مرتبہ پھر شہر خیال میں حاضر ہوں۔ اس مرتبہ سرگزشت کو بھی غم و اداسی کا لہاؤہ اڑھے پایا وجہ تو سب کو ہی پتا ہے۔ انسانیت سوز دہشت گردی کا واقعہ جو پشاور کے ایک کینڈا اسکول میں ہوا۔ اس واقعے نے پوری قوم کو ٹم کے آنسو دیے۔ دہشت گردوں کے عزائم کا پردہ چاک کرتے ادارے نے دہشت گردوں کے لیے نفرت میں اضافہ کیا۔ انشاء اللہ پاکستان آرمی ان کو برباد کرے گی۔ یک ٹھی داستان پڑھ کر کچھ حوصلہ ملا کہ پاکستان میں لاتعداد ہر فن سولہ ہیں۔ بس ان کی صلاحیتوں کو صرف کرنے کی ضرورت ہے۔ ”شہر خیال“ میں وحید بھٹی کے تجزیے نے متاثر کیا۔ ”شکوہ سخن“ میں ڈاکٹر ساجد امجد نے قارئین کو خوب ادبی رنگ میں رنگا۔ حادثاتی کہانی ”آکٹوپس“ میں جو نیٹر ہائیڈ کے ساتھ ہونے والے خوفناک حادثے نے دل میں درد کی ٹیسوں کو بڑھا دیا۔ ”تحریر“ ”کیسے کیسے لوگ“ اس فقرے کی تفسیر لگی کہ ہم مردان مدد خدا سفر نامہ ”الوداع“ انٹرویو کا حامل رہا۔ آسٹریلیوی وزیر اعظم کی تشدد کی واقعے نے چ نکا دیا۔ ”ہم پلہ“ میں جیمز ہائڈ 007 کا تذکرہ ہوا۔ ”فلمی الف لیلہ“ پڑھنے کو دل نہیں کیا۔ آفاقی صاحب، موجودہ فلم انڈسٹری پر بھی کچھ لکھیں۔ مریم کے خان نے درست فیصلہ لکھتے ہوئے حقائق کا درست تجزیہ کیا۔ حقائق دل نے تسلیم کیے۔ ”بیت بازی“ اچھی رہی۔ سچ بتیوں پر تبصرہ کیا تو خط طویل ہو جائے گا۔ اس لیے صرف نظر کرتے ہوئے میری چند گزارشات ہیں اب کوئی نئی سلسلہ وار کہانی شروع ہونی چاہیے۔ جیسا کہ دہشت گردی، قومی سلامتی اتحاد وغیرہ۔ قومی سلامتی کے اداروں پر لکھا جائے۔ اس کہانی میں ان دشمنوں کا گھناؤنا چہرہ اجاگر کیا جائے جو ہمارے پیارے ملک کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ ایسی کہانیاں قوم اور قوم کے سپاہیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے ضروری ہیں۔“

تاخیر سے موصول خطوط

آفتاب احمد نصیر، اشرفی، لاہور۔ حکیم سید محمد رضا شاہ، نورنگہ میانوالی۔ امتیاز ثار فاروقی، کوئٹہ۔ نیاز احمد سومرو، سکھر۔ محمد احباب، ناصر حسین خان منگلی، کراچی۔ فصیح خانم، حیدرآباد۔ نیاز لکھانی، کوٹ ڈیجی۔ ارشاد حسین، کوٹ ادو۔

فروری 2015ء

23

لالہ سائمن سترگزشت

باکمال

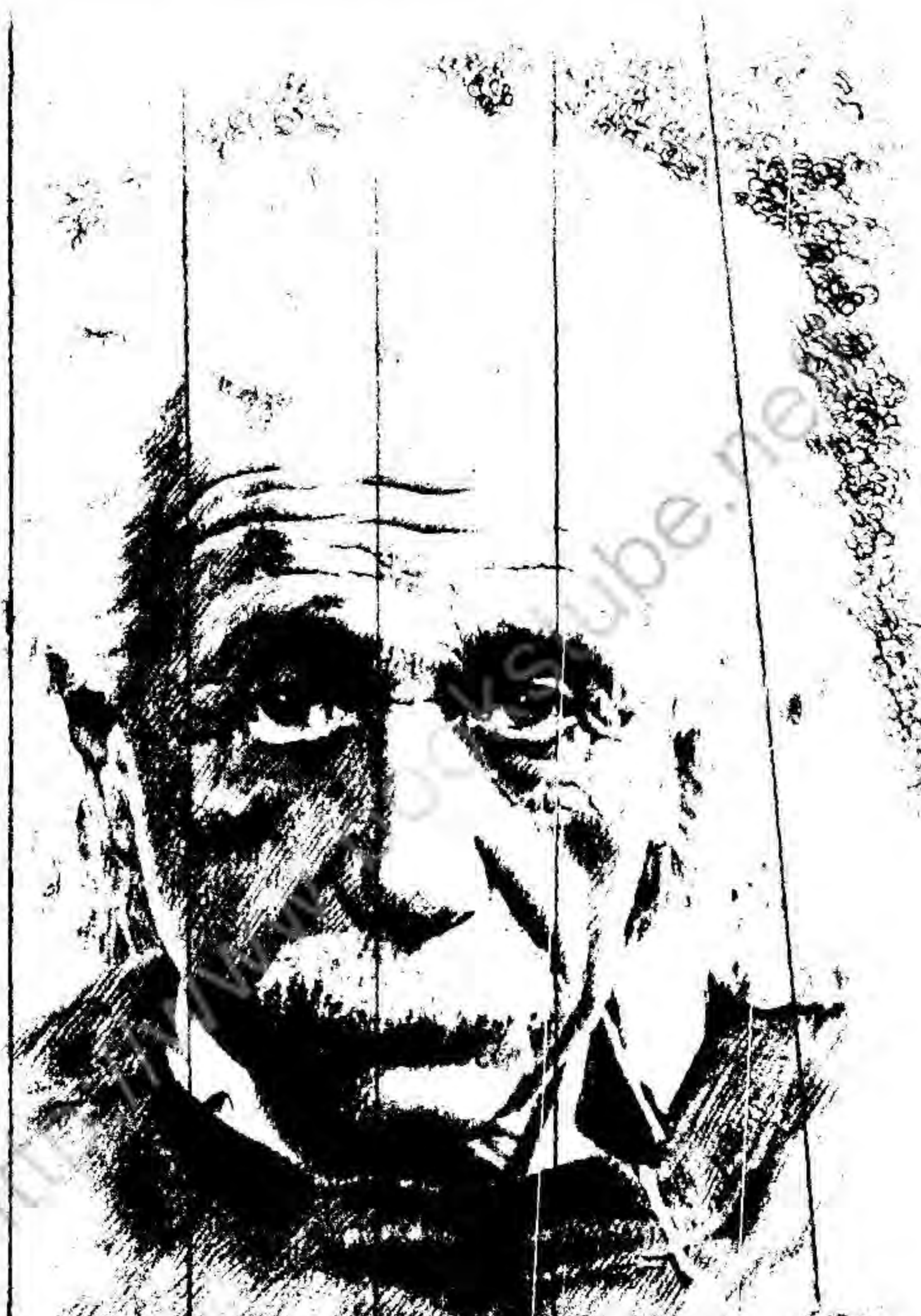
ڈاکٹر ساجد امجد

کمال کی لال کندوری میں لپٹی ہوئی بھوک اس کی ماں جانی تھی، بہن ہی کی طرح ساتھ ساتھ تھی۔ روح کے راگ میں ایک چیخ سمائی ہوئی تھی زندگی آہ و فغاں کا مرکب بن چکی تھی۔ پھر بھی وہ صبر و شکر کی سولی پر جیتے کے لیے مسیحات وقت بننے کا ارادہ رکھتا تھا اسے نہ تن کا ہوش تھا اور نہ پیت میں دہکتے تندور کا۔ وہ بس ایک ہی سوچ میں ہمہ وقت غلطان نظر آتا کہ کسی طور سائنس کے ان نظریات کو غلط قرار دے دے جو غلط ہوتے ہوئے بھی رائج ہیں۔ یہ اندازِ تفکر، ہمہ وقت فکر میں ڈوبے رہنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔ بچپن ہی سے وہ فکر میں ڈوبا ہوا نظر آتا اسی لیے اساتذہ اسے غبی سمجھتے۔ وہ سست الوجود سمجھا جاتا۔ لوگ اس کے تاریک مستقبل کی پیش گوئی کرتے مگر جب اس کی سوچ و فکر نے دنیا کو نئے زاویے عطا کیے تو سب انگشت دندان رہ گئے۔

دنیاے سائنس میں سب سے مشہور سائنس دان کا ذکر خاص

جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔
 ”تم کس قدر سست اور غبی ہو۔ میں پچھلے دو دنوں سے ایک ہی سوال تم سے کر رہا ہوں اور تم میرا منہ چڑاتے رہتے ہو۔ آج میں تمہیں ضرور سزا دوں گا۔“
 بچوں کے ہاتھوں میں گدگدی ہونے لگی۔ البرٹ آج پھر پٹنے والا ہے۔ اس سردی میں بید کھائے گا تو مزہ آئے گا۔
 بچے کچھ اور توقع کر رہے تھے۔ استاد نے کوئی اور سزا تجویز کی۔ اس نے آج کے موسم کو مد نظر رکھتے ہوئے یہی سزا مناسب سمجھی ہوگی۔
 ”باہر ہال میں چلے جاؤ اور دوپہر تک وہیں کھڑے رہو۔“
 البرٹ یہ حکم سن کر بھی اپنی جگہ پر جما ہوا تھا جیسے استاد کے منہ سے نکلے ہوئے لفظوں کو تول رہا ہو۔ پھر جیسے سب کچھ اس کی سمجھ میں آ گیا ہو۔
 پچھلی نشستوں سے آواز آئی۔ ”ست کہیں کا۔“ اس

موٹی گردن اور چھوٹے سرو والا بھاری بھر کم شخص کلاس روم میں داخل ہوا۔ اسے دیکھتے ہی تمام بچے کسی مشینی پرزے کی طرح تن کر کھڑے ہو گئے۔ صرف ایک بچہ تھا جو غالباً سوچ رہا تھا کہ اس موقع پر کیا کرنا چاہیے حالانکہ یہ روز کا معمول تھا جب مدرس کلاس روم میں داخل ہوتا تھا، بچوں کو کھڑا ہونا پڑتا تھا اور یہ موٹی گردن چھوٹے سرو والا مدرس ہی تو تھا۔ اس بچے کو یاد آیا کہ اس موقع پر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ وہ اس وقت کھڑا ہوا جب تمام بچے بیٹھ چکے تھے اور استاد بلیک بورڈ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اسے اکیلا کھڑا دیکھ کر کلاس میں قہقہے گونجنے لگے۔ استاد نے ہنسی کی آواز سن کر پلٹ کر دیکھا لیکن اس وقت تک وہ بچہ گھبرا کر بیٹھ چکا تھا۔ ہنسی کا طوفان بھی ختم چکا تھا۔ استاد نے بلیک بورڈ پر بہت آسان سا کوئی لفظ لکھا اور اس سست لڑکے کی طرف متوجہ ہوا۔
 ”البرٹ تم بتاؤ میں نے کیا لکھا ہے؟“
 البرٹ اس طرح چونکا جیسے کسی نے اسے تیند سے اٹھا دیا ہو۔ استاد نے اپنا سوال پھر دہرایا۔ البرٹ کا حال یہ تھا



E = MC²

Copied From Web



اندر آنے کی اجازت دے دی۔ البرٹ اس پیشکش کو جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ وہ سر جھکائے اندر آ گیا اور اپنی نشست پر چپ چاپ بیٹھ گیا۔ اس کے دونوں ہاتھ گود میں رکھے ہوئے تھے۔ گردن اب بھی جھکی ہوئی تھی۔

چھٹی کے بعد وہ گھر پہنچا تو حسب معمول اس کی بہن نے اس کا استقبال کیا۔ ماں اسے دیکھتے ہی باورچی خانے میں چلی گئی۔ وہ سردی سے بچنے کے لیے باورچی خانے میں چلا گیا۔ ماں نے وہیں اس کے سامنے کھانا رکھ دیا۔ مایا بھی اس کے پاس ہی آ کر بیٹھ گئی۔ اسے اب تک اسکول میں گزری ہوئی تکلیف یاد تھی۔ وہ سوچ بھی رہا تھا کہ ماں سے نہیں تو بہن سے ضرور کہے گا کہ اسکول ماسٹر نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے کھانے کے دوران میں اس نے سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کا باپ اسکول جا کر کہہ دے کہ البرٹ کو سزا دے لیا کرو لیکن اسے کمرے سے باہر نہ نکالا کرو۔ وہ بیمار پڑ گیا تو کیا ہوگا۔ ماسٹر کی طرف سے دی گئی جسمانی سزا سے اسے بہت ڈر لگتا تھا۔ اس نے یہی بہتر سمجھا کہ کسی کو کچھ نہ بتائے۔ اس نے خاموشی سے کھانا ختم کیا اور اپنے کمرے میں چلا گیا۔ مایا اس کے پیچھے پیچھے چلی آئی تھی۔ وہ چاہتی تھی البرٹ اس کے ساتھ کھیلے لیکن وہ ہمیشہ کی طرح بستر پر لیٹ کر بے حس و حرکت ہو گیا۔

”البرٹ تم کیسے بھائی ہو۔ میرے ساتھ کھیلتے ہی نہیں ہو۔“

”مایا، تمہیں معلوم ہے کھیل کود مجھے پسند نہیں۔ پھر بھی روز ہی ضد کرتی ہو۔“

”تمہیں کھیل کود کیوں پسند نہیں۔“

”یہ مجھے نہیں معلوم۔ بس نہیں ہیں پسند۔“

”کھیلنے کے لیے ہاتھ پاؤں چلانے پڑتے ہیں۔ اس لیے تمہیں پسند نہیں۔“

”میں کچھ سوچ رہا ہوں۔ مجھے سوچنے دو۔“

”بس تم سوچتے ہی رہنا۔ چچا روڈی کے بچے آئیں گے تو میں ان کے ساتھ کھیلوں گی۔“

”ہاں کھیل لیتا۔“ البرٹ نے کروٹ بدل کر آنکھیں بند کر لیں۔

یہ ایک دن کا قصہ نہیں تھا۔ مایا کو روز اسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ پھر وہ گھر کے اندر لگے ہوئے باغیچے میں اکیلی ہی شہتہ رہتی تھی۔ کوئی خوش نصیب دن ہی ہوتا تھا کہ وہ البرٹ کو منا کر باغیچے میں لے آتی تھی۔ یہاں بھی وہ

نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کا نام نہیں لیا گیا تھا لیکن وہ سمجھ گیا تھا کہ یہ اسی کو کہا جا رہا ہے۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور کلاس روم سے نکل کر باہر ہال میں آ گیا۔ باہر نکلتے ہی اسے احساس ہوا کہ یہاں تو بے انتہا سردی ہے۔ دوپہر تک یہاں کھڑے رہنا مشکل ہو جائے گا لیکن یہ سوچ کر اطمینان بھی ہوا کہ استاد کے بید کھانے سے بہتر ہے کہ وہ یہاں سردی میں کھڑا رہے۔ یہاں نہ کوئی سوال پوچھنے والا تھا نہ جواب مانگنے والا۔ یہ خوشی الگ تھی۔

پہلی جماعت کے چھ سالہ بچے کی بساط ہی کیا۔ وہ جلد ہی سردی کی شدت سے کانپنے لگا۔ اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اس سے تو اچھا تھا استاد کے بید کھالیتا، گرم کمرے میں تو رہتا۔ پھر اس نے وہی کیا جو وقت گزاری کے لیے کیا کرتا تھا۔ وہ کچھلی باتیں سوچنے بیٹھ گیا۔ وہ اپنی ماں کی زبانی سنی ہوئی باتیں دل ہی دل میں دہرا رہا تھا۔

”میں چھ سال قبل 14 مارچ 1879ء کو میونخ سے پچاس میل مغرب میں واقع قصبہ الم میں پیدا ہوا تھا۔ میں ابھی ایک سال کا تھا کہ میرے والدین اس بڑے شہر (میونخ) میں منتقل ہو گئے۔ میونخ جنوبی جرمنی کے اس علاقے میں واقع ہے جس کو ”بورییا“ کہتے ہیں۔ میری پیدائش سے چند سال قبل بورییا اپنی آزادی سے دست کش ہو گیا تھا اور پروشیا اور دیگر ریاستوں کے ساتھ مل کر نئی جرمن سلطنت کا حصہ بن گیا تھا۔ نئے نظام کے تحت اسکول فوجی مشینوں کی طرح چلائے جا رہے تھے۔ نظم و ضبط اتنا سخت تھا جتنا سخت کسی فوجی بیرک میں ہوتا ہے۔“

اسی نظم و ضبط کا مظاہرہ وہ دیکھ رہا تھا کہ سخت سردی میں کلاس روم سے باہر کھڑا ٹھہر رہا تھا۔

اس سردی کو برداشت کرتے ہوئے اسے گھر کی پرمسرت زندگی یاد آئی۔ گھر کی تو بات ہی اور تھی۔ وہ گھر پہنچتا تو اس کی بارہ سا۔ بہن مایا گرم جوشی سے اس کا استقبال کرتی تھی اور ماں اس کا جواب ہی نہیں تھا۔ باورچی خانے میں بٹھا کر اسے گرم گرم کھانے کھلاتی تھی۔ گھر کی یاد آئی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے دل میں تہیہ کر لیا کہ وہ گھر پہنچے ہی ماں سے کہہ دے گا کہ اسے اس اسکول میں نہیں پڑھنا۔

ابھی ایک گھنٹا گزرا تھا کہ اس کے استاد کو غالباً اس پر رحم آ گیا۔ اس نے سوچا ہوگا کہ شدید سردی میں کہیں وہ بیمار ہی نہ پڑ جائے۔ اس نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا اور اسے

ضرورت نہیں۔“

”میں مذاق نہیں اڑا رہا ہوں۔ میں تو یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ ذہین ترین طلبہ ہی اس معزز عہدے تک پہنچتے ہیں۔“

”تمہیں میرے بیٹے کی ذہانت پر کوئی شک ہے؟“

”ذہین تو وہ ہے لیکن کسی عہدے تک پہنچنے کے لیے ہاتھ پاؤں چلانے پڑتے ہیں۔ اس کی ست روئی اسے کیسے آگے بڑھنے دے گی۔“

”یہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ اس کی ست روئی سے تو ہم سب ہی پریشان ہیں۔ اسے تو کھلونوں تک سے دلچسپی نہیں ہے۔ جب ذرا بڑا ہو جائے گا تو ٹھیک ہو جائے گا۔“

”ہاں ہو تو جائے گا۔“ چچا نے کہا اور بات ختم کر دی۔

ابھی وہ زیادہ بڑا نہیں ہوا تھا۔ صرف ایک سال گزرا ہوگا۔ وہ سات سال کا تھا کہ سخت بیمار پڑ گیا۔ وہ ویسے ہی ہلنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ اب تو بیمار تھا بالکل بستر سے لگ گیا۔ اس کی ٹھکی ہوئی آنکھیں اور زیادہ تھک گئیں۔ دن بھر تکیے پر سر رکھے کھڑکی سے نظر آنے والے باغ کو دیکھتا رہتا۔ مایا نے اسے کھلونے دے کر بہت چاہا کہ وہ ان سے کھیلے لیکن اسے ان کھلونوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

اس کے ایک چچا کا نام جیک تھا جو اس کے باپ کے ساتھ مل کر مشترکہ کاروبار کرتے تھے۔ دونوں بھائیوں کی بجلی کے سامان کی ایک چھوٹی سی ورکشاپ تھی۔ ہر من آئن اسٹائن کاروبار کی دیکھ بھال کرتے تھے اور جیک آئن اسٹائن ٹیکنیکل کاموں کے انچارج تھے۔ دکان پر کچھ سامان کم پڑ گیا تھا۔ ہر من آئن اسٹائن یہ سامان لینے قریبی قصبے میں گئے۔ انہوں نے ایک دکان میں چھوٹا سا قطب نما رکھا دیکھا۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتے رہے پھر انہیں البرٹ کا خیال آیا۔ اسے کھلونوں سے دلچسپی نہیں ہے لیکن یہ قطب نما اسے ضرور پسند آئے گا کیوں کہ یہ کھلونا انہیں سے البتہ کھلونے جیسا ضرور ہے۔ کم از کم البرٹ اسے کھلونا ہی سمجھے گا۔ اس نے وہ قطب نما خرید لیا۔

وہ گھر پہنچا تو البرٹ اپنے بستر پر لیٹا چھت کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”دیکھو البرٹ، میں تمہارے لیے کیا لایا ہوں۔“

”کیا ہے یہ؟“

”جادو کی سوئی والی ڈبیا۔“

”جادو کی ڈبیا؟“

اس کے ساتھ کھیلنے کی بجائے درختوں کے پتے توڑ کر ان کی باریک باریک شریانوں پر غور کرنے لگتا تھا۔ مایا کو ان باتوں سے کیا سروکار۔ وہ اسے بیکار بیکار کر تھک جاتی اور پھر اسے اکیلا چھوڑ کر چلی آتی۔ کمال نہیں کا۔

اس کی یہ ست روئی پورے خاندان میں مشہور ہو گئی تھی۔ اس کے ماں، باپ اس کی طرف سے فکرمند رہنے لگے تھے۔ اس نے بولنا بھی بہت دیر سے سیکھا تھا۔ ہر کام میں دیر لگا دیتا تھا۔ ابھی تو وہ بچہ تھا لیکن اس کے بڑے سوچا کرتے تھے کہ اگر اس کی یہ عادت نہیں بدلی تو وہ اپنی زندگی کیسے گزارے گا۔

کبھی گھر میں کوئی تقریب ہوتی یا مہمان جمع ہوتے تو وہ اچھا خاصا تماشا بن کر رہ جاتا۔ سب بچے کھیل کود میں مگن ہو جاتے مگر وہ تو ایک طرف چپ چاپ بیٹھا رہتا۔ اسے ہم عمر بچوں اور ان کے کھیلوں سے کوئی دلچسپی نہ ہوتی۔ ہاں اس وقت اسے خوش دیکھا جاسکتا تھا جب اس کے خاندان والے کسی ویک اینڈ پر قریبی پہاڑیوں پر چلے جاتے اور جھیلوں پر سیر و تفریح کرتے اور دیہاتی ڈھابوں میں ٹہرتے۔ اسے جھاڑیوں کے درمیان چلنا بہت اچھا لگتا تھا۔ اس کی خوشی اپنی جگہ لیکن یہاں بھی وہ دوسرے بچوں سے مختلف ہی نظر آتا۔ جھیل کی سطح آب پر ننھی ننھی لہروں پر نظریں جمائے پہروں بے حس و تزکت بیٹھا رہتا یا طرح طرح کے پتوں کو توڑ کر ان کی ساخت پر غور کرتا رہتا۔

ایک مرتبہ وہ ایک ندی کے کنارے پنک منار ہے تھے۔ البرٹ حسب معمول ندی کے پانی پر نظر جمائے بیٹھا تھا۔ اس کے چچا روڈی بہت دیر سے اسے دیکھ رہے تھے۔ آخر انہوں نے البرٹ کی ماں کی توجہ اس طرف دلائی۔

”تم اپنے بیٹے کو دیکھ رہی ہو۔ سب بچے یہاں آ کر خوش ہیں۔ ایک دوسرے کو چھیڑ رہے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ کھیل رہے ہیں لیکن البرٹ خوش نہیں ہے۔ سب سے الگ اداس بیٹھا ہے۔“

”وہ اداس نہیں ہے۔“ اس کی ماں نے کہا۔ ”وہ اس لیے خاموش ہے کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔“

اس کی ماں سی طرح اپنے بیٹے کی صفائیاں پیش کیا کرتی تھی۔ اس کی یہ بات سن کر اس کے چچا اٹھ ہی آ گئی۔

”ہاں لگتا تو مجھے بھی ہے کہ البرٹ بڑا ہو کر پروفیسر بنے گا۔“

البرٹ کی ماں اس طنز کو نظر انداز نہ کر سکی۔ اس نے اپنے دیور کو سرزنش کی۔ ”تمہیں البرٹ کا مذاق اڑانے کی

”اس ڈبیا کر چاہے تم سیدھا کر لو یا الٹا یا پھر ترچھی کر لو اس کی سوئی ہر حالت میں ایک ہی طرف اشارہ کرے گی، ہوئی نا جادو کی سوئی؟“

البرٹ نے وہ ڈبیا اپنے ہاتھ میں لے لی اور ہتھلی پر رکھ لی۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ جو کچھ اس کے باپ نے کہا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں ایک طرف پلٹا پھر دوسری طرف۔ ہر بار سوئی اسی جگہ اسی سمت، واپس آگئی جس پر کہ وہ پہلے تھی۔

یہ پہلا موقع تھا جب البرٹ نے کسی چیز میں اس قدر دلچسپی لی تھی۔ اس کی تمکلی ہوئی آنکھیں روشن ہو گئی تھیں۔ بچھا ہوا چہرہ دیکھنے لگا تھا۔ وہ حیران تھا کہ ڈبیا کا رخ کسی طرف بھی موڑ لو۔ سوئی کا رخ ہمیشہ ایک ہی طرف کیوں رہتا ہے۔

”ڈبئی، سوئی کا رخ ہمیشہ ایک طرف کیوں رہتا ہے؟“

”میں تمہیں سمجھا نہیں سکتا، بس اتنا کہہ سکتا ہوں کہ یہ سب جادو سے ہوتا ہے۔“

”جادو کچھ نہیں ہوتا۔ میں یہ نہیں مانتا۔“

”چچا جیک سے پوچھ لینا۔ ان چیزوں کو وہ اچھی طرح جانتے ہیں۔ وہی تمہیں بتا سکیں گے۔“

اس کا باپ جاچکا تھا۔ وہ بدستور سوئی کی حرکت پر غور کر رہا تھا۔ وہ صرف اتنا کر سکا کہ ایک جھٹکے سے سوئی کو دوسری طرف لے جاتا لیکن سوئی گھوم کر پھر شمال کی طرف آجاتی۔ اس کی حیرانی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ صرف اتنا جان سکا کہ بیرونی فضا میں کوئی چیز ایسی ضرور ہے جو سوئی کو گھومنے پر مجبور کر رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ فضا میں کوئی قوت ضرور موجود ہے۔

اس کی ماں کب کمرے میں آئی اور کب اس کے سر ہانے آ کر کھڑی ہو گئی اسے کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔ وہ اس طرح ساکت بیٹھا ہوا تھا جیسے پتھر کا بن گیا ہو۔ اس کی ماں پریشان ہو گئی تھی کہ اس کھلونے نے اس کے بیٹے پر کیا جادو کر دیا ہے۔ ماں کے کہنے پر اس نے قطب نما ہاتھ سے رکھ دیا اور بستر پر لیٹ گیا لیکن بہت دیر تک اسے نیند نہ آئی۔ اس کا ذہن یہی سوچے جا رہا تھا کہ وہ کون سی قوت ہے جو ”سوئی“ کو حرکت دے رہی ہے۔

سائنس کی دنیا سے یہ اس کا پہلا تعارف تھا۔ اسکول کی دنیا میں وہ اب بھی اجنبی مسافر کی طرح تھا۔ اس سے جب کوئی سوال پوچھا جاتا، جب تک وہ اس پر

اچھی طرح غور نہیں کر لیتا جواب دینے سے گریز کرتا۔ غور کرنے کا یہ عمل بعض اوقات اتنا طویل ہو جاتا کہ استاد یہ سوچ کر آگے بڑھ جاتا کہ اسے جواب نہیں آتا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جو کچھ وہ کہے غلط ثابت ہو۔ جب تک اسے یقین نہیں ہو جاتا کہ اس کا جواب بالکل درست ہے اس وقت تک وہ اسے زبان پر نہ لاتا۔ جب کہ دوسرے بچے برق رفتاری سے کھڑے ہوتے اور جو منہ میں آتا کہہ دیتے۔ استاد کا کہنا بھی یہی تھا کہ جواب ضرور دینا چاہیے خواہ غلط ہی کیوں نہ ہو۔ البرٹ کے غور کرنے کی عادت کو یہ سمجھا جاتا تھا کہ اسے کچھ نہیں آتا۔

وہ پرائمری اسکول کے سب سے اونچے درجے میں آ گیا تھا اور نو سال عمر ہو گئی تھی مگر اس کا حال اب بھی وہی تھا۔

پرائمری پاس کرنے کے بعد اسے ایک ایسے ادارے میں داخل کر دیا گیا جہاں وہ لڑکے کے تعلیم پاتے تھے جو کسی قسم کا پیشہ اپنانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ یونیورسٹی میں داخلے کے لیے ایسے اسکول سے ڈپلوما حاصل کرنا ہوتا تھا۔

اس کے والدین کو اس کے مستقبل کی طرف سے سخت تشویش تھی کیوں کہ پرائمری اسکول میں وہ سب لڑکوں سے کمزور تھا۔ یوں بھی آگے بڑھنے کی جستجو اس میں نظر نہ آتی تھی۔

اس کے بارے میں جو اندیشے تھے وہ درست ثابت ہو رہے تھے۔ یہاں اسے لاطینی اور یونانی زبانیں پڑھنی ہوتی تھیں۔ اسے اپنی زبان بولنے ہی میں دقت ہوتی تھی غیر ملکی زبانیں کیسے بول سکتا تھا۔ گرامر کے لگے بندھے اصول یاد کرنے سے اسے سخت نفرت تھی۔ تاریخ کے مضمون میں بھی وہ نالائق تھا۔ یہ بات اس کی سمجھ ہی میں نہیں آتی تھی کہ جو واقعات کتابوں میں پہلے ہی سے موجود ہیں انہیں یاد کرنے کا کیا فائدہ۔ ضرورت پڑنے پر کتابوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

استادوں کی یہ ضد تھی کہ جو بات جس طرح ہے اسی طرح یاد کر لو جب کہ وہ اس پر بھند رہتا تھا کہ ایسا کیوں ہوا؟ ایسا نہ ہوتا تو کیا ہوتا وغیرہ۔ اس کے یہ سوالات اس کے استادوں کے لیے پریشان کن تھے۔ اس نالائق کے باوجود ”الجبرا“ اس کے لیے دلچسپ ترین مضمون تھا۔ اس نے بہت جلد اس میں مہارت حاصل کر لی تھی۔ اس مرحلے پر اس میں ایک اور قابل ذکر تبدیلی آئی۔ گھر کا ماحول ایسا

اٹلی کے شہر میلان چلے جائیں۔ وہاں میرے کچھ رشتے دار ہیں۔ وہ میرا نیا کاروبار جمانے میں میری مدد ضرور کریں گے۔“

”اٹلی تک جانے کا کرایہ بھی تو ہو۔“

”ہم یہ مکان فروخت کر دیں گے۔ کچھ رقم ہمارے پاس ہوگی کچھ رشتے دار مدد کر دیں گے۔“

”یہ تو بڑی حماقت ہوگی۔ ہمارے بیٹے البرٹ کا کیا بنے گا۔ جب تک وہ ڈپلوما حاصل نہیں کر لیتا اس کا یہاں رہنا ضروری ہے۔“

”اسے بھی ساتھ لے جائیں گے۔ وہاں بھی تو اسکول ہوں گے۔“

”اس کا پڑھائی میں دل نہیں ہے۔ اس اسکول سے تو وہ پھر بھی کچھ مانوس ہو گیا ہے۔ نئی جگہ جا کر تو اس کا دل بالکل ہی اچاٹ ہو جائے گا۔“

”پھر کیا ہو سکتا ہے۔“

مسٹر آئن اسٹائن کے لیے یہ بڑا مشکل سوال تھا کہ البرٹ کا کیا کیا جائے۔ انہیں کوئی جواب نہیں سوچ رہا تھا۔ وہ کمرے میں بے چینی سے کھل رہے تھے۔ پھر وہ کسی نتیجے پر پہنچ گئے۔

”البرٹ کچھ دنوں کے لیے بورڈنگ ہاؤس میں رہ سکتا ہے۔ اس کا یہ آخری سال ہے۔ امتحان دینے کے بعد وہ ہمارے پاس میلان چلا آئے گا۔ وہ اب پندرہ سال کا ہو گیا ہے اپنا خیال خود رکھ سکتا ہے۔“

”میں البرٹ کے بغیر کیسے رہ سکوں گی۔ تم یہ جانتے ہی ہو کہ وہ کتنا بے پروا لڑکا ہے۔ وہ اکیلے رہ سکے گا۔“

”یہ قربانی تو تمہیں دینی پڑے گی۔ زیادہ سے زیادہ ایک سال کی بات ہے اس کے بعد تمہارا بیٹا تمہارے پاس ہوگا۔ ڈپلوما اس کے پاس ہوگا۔“

البرٹ کی ماں اب بھی تیار نہیں تھی لیکن اسے ماننا پڑا۔ مسٹر آئن اسٹائن نے مکان فروخت کر دیا اور البرٹ کو بورڈنگ ہاؤس میں داخل کر دیا گیا۔ احتجاج کرنا تو اس نے سیکھا ہی نہیں تھا۔ اس نے باپ کے حکم کو تسلیم کر لیا۔

آئن اسٹائن اپنے خاندان کے ساتھ میلان چلے گئے اور البرٹ بورڈنگ ہاؤس میں رہنے لگا۔

گھر والوں کے چلے جانے کے بعد البرٹ بے سہارا رہ گیا۔ وہ سدا کا ست اور کال تھا۔ اس کی ماں اس کی دیکھ بھال کرتی تھی اور اب وہ اس کے پاس نہیں تھی۔ اس تنہائی

نہیں تھا لیکن اس میں مطالعہ کا شوق پیدا ہو گیا۔ مطالعے کا یہ شوق اسے سائنس کی طرف لے گیا۔ سائنس کے متعلق کتابوں کا ایک مقبول عام سلسلہ اس کے ہاتھ لگ گیا۔ یہ کتابیں جانوروں، پودوں اور آتش فشاں پہاڑوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان کتابوں کو پڑھ کر اسے یہ محسوس ہوا جیسے وہ سراغ رساں ہے اور قدرت کے چھپے ہوئے رازوں کو دریافت کرتا پھر رہا ہے۔ اس نے ان کتابوں کو تقریباً حفظ کر لیا۔ یہ حیرت اس کے لیے خوش کن تھی کہ اس نے ان کتابوں کو حفظ کیسے کر لیا۔

درسی کتب اس کے لیے ہمیشہ اچھی بنی رہیں۔ وہ امتحانوں میں پاس تو ہوتا رہا لیکن وہ کلاس کا نالائق ترین لڑکا سمجھا جاتا تھا جو سبق کو الٹا الٹا کر پاتا کرتا تھا۔ اس وقت کوئی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ عظیم سائنس داں بننے والا ہے۔

☆.....☆

وہ رات نہایت اندھیری اور اس سے بھی زیادہ تشویش ناک تھی۔ مسٹر آئن اسٹائن دو دن کی غیر حاضری کے بعد اسی رات گھر پہنچے تھے۔ ان کی بیوی کو معلوم تھا کہ وہ دن میں کہاں رہے اور اب یہ اندازہ بھی ہو رہا تھا کہ وہ کامیاب نہیں ہوئے ہیں۔ وہ بہت دیر تک خاموش رہیں لیکن جب شوہر کو بھی خاموش دیکھا تو پوچھے بغیر نہ رہ سکیں۔

”آپ کی خاموشی مجھے یہ بتا رہی ہے کہ جس کام سے آپ گئے تھے وہ کام پورا نہیں ہوا۔“

”تم نے ایک اندازہ لگایا۔ برے وقت میں کوئی کام نہیں آتا۔ میں نے ایک ایک دروازہ کھٹ کھٹا کر دیکھ لیا۔ کوئی مدد کرنے کو تیار نہیں۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ دکان بند کرنا پڑے۔“

”دکان بند پڑی رہے گی تو گھر کے اخراجات کیسے پورے ہوں گے۔“

”یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔ جیک بھی پیچھے ہٹ گیا ہے۔ رقم تو اس کی بھی ڈوبی ہے لیکن اب وہ مزید کچھ لگانے کو تیار نہیں۔“

”پھر تم نے کیا سوچا۔“

”سوچنا کیا ہے۔ دکان کا کرایہ اپنی جیب سے تو دینے سے رہا۔“

”یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ اب ہوگا کیا۔“

”میرے پاس ایک تجویز ہے اگر تم اتفاق کرو۔ ہم

نے اسے چڑچڑایا۔ اس کا غصہ اپنے استادوں پر اترا۔ وہ پڑھنے میں ذرا دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔ استادوں کو سوال و جواب میں الجھائے رہتا۔ اس کے سوالوں کے جواب دیتے دیتے اساتذہ ناجز آگئے۔

”تمہیں جو کچھ پڑھایا جا رہا ہے وہ پڑھا کرو۔ بے تحاشے سوال مت کیا کرو۔“ ایک روز ایک استاد نے اس سے کہا۔

”میں جب تک پوری طرح مطمئن نہ ہو جاؤں آگے کیسے بڑھوں۔“

”کلاس میں ایک تم ہی تو نہیں ہو اور کسی طالب علم کو یہ شکایت کیوں نہیں۔“

”وہ سب کند ذہن ہیں۔ طوطے کی طرح رتے رہتے ہیں۔ میں ہر مضمون کی گہرائی تک جانا چاہتا ہوں۔“

”تم اگر سب سے قابل ہو تو یہ اسکول چھوڑ دو۔“

”اب مجھے یہی کرنا پڑے گا کیوں کہ آپ کے پاس میرے سوالوں کے جواب نہیں۔“

”تم نے ٹھیک کہا۔ میرے پاس ان سوالوں کے جواب نہیں تم یہ اسکول چھوڑ دو۔ یہ دوسرے طلبہ کے لیے بھی اچھا ہوگا۔“

اس کے یہ جھگڑے بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ طلبہ بھی اس کے خلاف ہو گئے تھے کہ وہ اساتذہ کو اپنے سوالوں میں الجھائے رہتا ہے اور اس طرح ہمارا نقصان ہوتا ہے۔

اس صورت حال میں البرٹ نے بھی یہی مناسب سمجھا کہ اسکول چھوڑ دے اور ماں کے پاس ”میلان“ چلا جائے۔ اس نے اپنے اناکڑے سے یہ شوقیت لے لیا کہ اس کی صحت خراب ہے اور اسے آرام کرنے کی ضرورت ہے۔ اسکول انتظامیہ اس سے اتنی تنگ تھی کہ فوراً اسے چھٹی دے دی۔

چھ مہینے بعد ہی وہ اپنی ماں کے پاس تھا۔ اٹلی کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی وہ مسحور ہو گیا۔ اس لیے بھی کہ اس کی شفیق ماں اور محبت کرنے والی مایا اس کے سامنے تھی اور اس لیے بھی کہ میلان شہر قدرتی مناظر سے بھرپور تھا۔

اسے دیکھتے ہی ماں کی بے چین بانہوں نے اسے بھینچ لیا اور پھر گھبرا کر جیسے ہٹ گئی۔

”البرٹ، تو کتنا دہلا ہو گیا ہے۔ رنگ زرد پڑ گیا ہے اور آنکھیں دیکھ، اندر کی طرف دھنس گئی ہیں۔ خیر تو فکر مت

کر یہاں کچھ دن رہے گا تو کبیر و جوان بن جائے گا۔“ وہ صرف ایک رات اس پرسکون ماحول میں سو کر اٹھا تو میونخ میں گزرے ہوئے چھ ماہ کی بے کئی ٹیکسٹ غائب ہو گئی۔ اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ اسی توجہ کی تلاش میں تھا جو اسے یہاں ملی تھی۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ صبح اٹھتے ہی نئے مکان کے ایک ایک گوشے کو دیکھنے کے لیے بھاگا بھاگا پھرتا۔ باپ کے پاس بیٹھ کر اس نئے ملک اور نئے شہر کے بارے میں سوالات کرتا لیکن اسے تو گرد و پیش سے جیسے کوئی سروکار ہی نہیں تھا۔ اس نے تو ان مصائب کا ذکر بھی نہیں کیا جو چھ مہینے میونخ میں اکیلے رہ کر اس پر گزرے تھے۔ اسے تو بس یہ خوشی تھی کہ وہ اپنوں میں آ گیا ہے۔ گویا اسے انسانوں سے غرض تھی ایشیا سے نہیں۔ آخر کار مسٹر آئن اسٹائن ہی نے اس کی سابقہ زندگی کے بارے میں ذکر چھیڑا۔

”ہمارے آنے کے بعد تم نے بڑی مشکل میں دن گزارے ہوں گے؟“

”مجھے بورڈنگ کے اکیلے کمرے سے غرض نہیں تھی لیکن میرے ارد گرد جو لوگ تھے وہ ٹھیک نہیں تھے۔ انہوں نے میری روح کو بہت تکلیف پہنچائی۔ میری مراد ان اساتذہ سے ہے جو کچھ نہیں جانتے۔ ان کے درمیان رہ کر میں اپنا وقت ضائع کر رہا تھا۔“

”اس کا مطلب ہے تم اب واپس نہیں جاؤ گے؟“

”پھر تم نے کیا سوچا ہے۔“ آئن اسٹائن نے کہا۔

”خیر چھوڑ دو۔ یہ کام ہمارا ہے کہ ہم سوچیں۔ فی الحال تو میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم کچھ دن کچھ نہ کرو صرف آرام کرو۔“

مسٹر آئن اسٹائن نے اسے آرام کا مشورہ دے تو دیا تھا لیکن وہ اس کے مستقبل کی طرف سے فکرمند ہو گئے تھے۔ اس رات جب وہ سونے کے لیے لیٹے تو انہوں نے ضروری سمجھا کہ بیوی سے البرٹ کے بارے میں بات کریں۔

”میرا خیال ہے البرٹ! اب جرمنی واپس نہیں جائے گا۔ اس کی تعلیم ادھوری رہ گئی ہے۔“

”اچھا ہی ہوا وہ واپس آ گیا۔ دیکھتے نہیں وہ کتنا کمزور ہو گیا۔ میرے ہاتھ کے کپے ہوئے کھانے کھائے گا تو کچھ جان پکڑے گا۔“

”تم بھی غلط نہیں کہتیں لیکن وہ کب تک تمہارے

مند ہیں۔ میں تمہارے بھائی سے خود دوستی رکھنا چاہتی ہوں لیکن اس نے کبھی میری حوصلہ افزائی نہیں کی۔“

”ہاں وہ سدا کا ایسا ہی ہے۔ بے حد شرمیلا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ لڑکا نہیں۔“

”ایسی بھی کیا شرم۔“

”کوشش کرتی رہو۔ شاید کسی دن وہ تمہارے قابو میں آجائے۔“ مایا نے شرارت سے کہا پھر وہ دونوں ہنسنے لگیں۔

مایا نے بھی البرٹ کی توجہ کئی مرتبہ اس طرف مبذول کی۔ لڑکیوں کی فرمائشیں اس تک پہنچائیں۔ ان کی پسندیدگی کے پیغام اس تک لے جاتی لیکن اس کی کھوئی کھوئی شکل میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

آرام کرتے کرتے وہ اکتا چکا تھا اور ابھی تک اپنے لیے اسے کوئی منزل نظر نہیں آرہی تھی۔ ایسے خیالات اس کے دل میں کم ہی پیدا ہوتے تھے لیکن ایک دن اس کے دل میں یہ خیال آیا۔

”ماں، میں آرام کرتے کرتے تھک چکا ہوں۔ میرا خیال ہے اس ملک کو اچھی طرح دیکھنے کے لیے مختصر سا دورہ کروں کیوں کہ یہاں دیکھنے کو بہت سی چیزیں ہیں۔“

”مجھے خوشی ہے کہ تم آرام کرتے کرتے تھک گئے ہو اور گھومنا پھرنا چاہتے ہو۔ یہ خوش آئند تبدیلی ہے لیکن میرے ننھے البرٹ ہمارے پاس اتنے پیسے کہاں جو تمہارا یہ شوق پورا کریں۔“

”ماں، میں نے یہ کب کہا کہ مجھے پیسے در۔ میں اکیلا پیدل سفر کروں گا۔ کسی بھی سڑک کے کنارے سو جایا کروں گا۔ اتنے پیسے تو میرے پاس ہوں گے کہ معمولی کھانا کھا لیا کروں گا۔“

”میں یہ کب چاہوں گی کہ تو بے آرامی کے دن گزارو۔“

اس کی ماں کے پاس جو تھوڑی بہت رقم تھی وہ اس نے البرٹ کے حوالے کر دی اور وہ سیاحت کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ وہ جنوب کی طرف چلتا ہوا جینوا پہنچا اور پھر اطالوی ساحل کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا ”پیسا“ جا پہنچا۔ وہاں سے اندرونی ملک کا رخ کر کے اونچی پہاڑیوں پر آباو قدیمی دیہات میں گھومتا رہا۔ کھلے میدانوں میں سوتا رہا۔ زمین پر سوتے سوتے اس کا بدن گھٹایا اور کھردرا ہو گیا۔ دھوپ کی تمازت نے اس کا رنگ گہرا کر دیا۔ فلورنس پہنچا تو آرٹ کے خزانے دیکھ کر خوشی اس کی روح تک اتر گئی۔

ہاتھ کے پٹے ہوئے کھانے کھاتا رہے گا۔ اس کے مستقبل کے بارے میں کچھ تو سوچنا پڑے گا۔ میرے پاس اتنے پیسے نہیں کہ وہ آرام کرتا رہے اور ہم اس پر خرچ کرتے رہیں۔“

”ابھی اسے آئے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں اور آپ اس کی بے کاری سے تنگ آگئے۔“

”میرا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ پیسے نائے لیکن اسے آئندہ کیا بننا ہے، یہ بھی تو سوچنا ہوگا۔ مجھے تو نہیں لگتا کہ وہ کوئی کام سیکھ سکے گا۔ بجلی کے سامان کی دکان میں بھی اسے کوئی دلچسپی نہیں۔“

”ریاضی میں تو وہ بہت ہوشیار ہے۔“ مسز آئن اسٹائن نے اس کا دفاع کرتے ہوئے کہا۔

”اگر تم یہ بہنا چاہتی ہو کہ مستقبل میں اسے اچھے متر بنایا جائے تو محض ریاضی میں مہارت سے کام نہیں چلتا اور بھی مضامین پڑھنے پڑھتے ہیں۔ کوئی ٹیکنیکل کام سکھایا جائے تو بھی یہ معلوم ہو کہ اسے رغبت ہے یا نہیں۔“

”اس سے کمال کر بات کیوں نہیں کر لیتے۔“

”ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ میں چاہتا ہوں وہ کچھ دن آرام کر لے، جب تک اس کی صحت کچھ اچھی ہو جائے گی۔ ابھی تو یہ ضروری تھا کہ ہم خود کس نتیجے پر پہنچ جائیں۔“

البرٹ کو کھلی چھٹی مل گئی تھی۔ اب وہ جی بھر کے آرام کر سکتا تھا۔ سیر و تفریح میں مشغول رہ سکتا تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ اپنی پسندیدہ کتابیں پڑھ سکتا تھا۔ اسکول کی مصروفیات اسے اتنا وقت نہیں دیتی تھیں کہ وہ مطالعہ کر سکے۔ وہ ہر وقت مطالعہ میں مصروف رہنے لگا۔ وہ جہاں جاتا کوئی نہ کوئی کتاب اس کے ہاتھ میں ہوتی۔

وہ تھا ہی انوکھا۔ اب اس عمر میں داخل ہو چکا تھا کہ لڑکیوں میں دلچسپی لے لیکن اسے ان سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ مایا کی کئی اطالوی سپیلیاں تھیں جو البرٹ کے آجانے سے خوش تھیں اور چاہتی تھیں کہ وہ ان کے ساتھ کچھ وقت گزارے۔ سیر و تفریح کے لیے اسے ساتھ لے جانے کی خواہاں رہتی تھیں لیکن وہ سب کی دل شکنی کر رہا تھا۔

”مایا، تمہارا بھائی تو جیسے لڑکا ہی نہیں ہے۔“ ایک دن ایک لڑکی نے کہا۔

”تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو۔“

”کتنے ہی لڑکے ہیں جو مجھ سے دوستی کے خواہش

وہ اس طویل سیاحت کے بعد گھر پہنچا تو ایک بری خبر اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے باپ کا کاروبار ایک مرتبہ پھر ناکام ہو گیا تھا اور وہ ”میلان“ چھوڑ کر کہیں اور جانے کی تیاری کر رہا تھا۔

البرٹ کا باپ اب اس سے سخت ناراض بلکہ مایوس تھا۔ اس کے خیال میں اگر اس کا جوان بیٹا اس کا ہاتھ بنا تا تو کاروبار میں ناکام ہرگز نہ ہوتی۔ اس کے خیال میں جو بیٹا اس کا ہاتھ نہ بنا سکتا ہو اس کے لیے اس کے دل میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ جو کچھ کرنا تھا، آئن اسٹائن کو اب خود کرنا تھا۔ ان دنوں وہ سخت پریشان تھا۔ اسے نئی دکان تلاش کرنی پڑے گی نیا گھر ڈھونڈنا پڑے گا۔ وہ اٹلی سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اٹلی ہی کے ایک ”شہر پادیا“ جانے کا ارادہ کر لیا۔

پادیا پہنچنے کے بعد مسٹر آئن اسٹائن نے اپنے بیٹے سے صاف کہہ دیا کہ البرٹ کو تعلیم دلانے کے لیے اب اس کے پاس پھونی کوڑی بھی نہیں، لہذا اب وہ کوئی کام دھندا کرے، اپنے خرچ کے لیے اپنی روزی خود پیدا کرے۔ یہ بڑا بے درد فیصلہ تھا لیکن آئن اسٹائن نے اس کے حق میں یہی بہتر سمجھا۔

اس نے باپ کے کہنے کے مطابق جب اس پر غور کیا کہ وہ کس پیشے کو اپنا سکتا ہے تو وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ لے پناہ دولت کا حصول اس کے مزاج کا حصہ ہی نہیں۔ اسے کسی ایسے پیشے کا انتخاب کرنا چاہیے جو اس کی روح کی تسکین کا باعث ہو۔ اسے سوچنے کی درس گاہ یاد آئی جہاں سزا دے کر زبردستی تعلیم دی جاتی تھی۔ مجھے اسکول ماسٹر بننا چاہیے تاکہ میں طلبہ کو اسی انداز سے تعلیم دے سکوں جو مجھے نہیں مل سکی۔

اس کے باپ کا خیال تھا کہ اسے کسی ٹیکنیکل شعبے میں اپنا مستقبل بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ البرٹ نے ڈپلوما حاصل نہیں کیا تھا جس کی بنیاد پر اسے یونیورسٹی میں داخلہ مل سکتا لیکن یہ اُمید کی جاسکتی تھی کہ ریاضی میں غیر معمولی مہارت کی وجہ سے داخلہ مل جائے گا۔

یہ مشکل آسان ہوئی تو ایک اور مشکل آگئی۔ البرٹ نے صاف کہہ دیا کہ ٹیکنیکل کالج کیسا بھی ہو جرمنی میں نہ ہو۔ ایک مرتبہ پھر سب سر جڑ کر بیٹھ گئے اور یہ طے ہوا کہ زیورچ کی سوس فیڈرل پالی ٹیکنیک یونیورسٹی میں داخلے کی کوشش کی جائے۔

آئن اسٹائن کے خاندان کا ایک متمول گھرانہ سوئٹزر لینڈ میں رہتا تھا۔ مسٹر آئن اسٹائن نے انہیں خطوط لکھے۔

اپنی کم آمدنی اور البرٹ کی تعلیم میں پیش آنے والی مشکلات کا تذکرہ کیا۔ ان کے اس رشتے دار نے اسے ایک سو سو فرانک ہر ماہ دینے کا وعدہ کیا ہر چند کہ یہ ایک قلیل رقم تھی لیکن کچھ نہ کچھ سہارا ہو گیا۔

اب البرٹ کو داخلے کے لیے مقابلے کے امتحان میں بیٹھنا تھا۔ وہ ایک صبح سوئٹزر لینڈ کے لیے روانہ ہو گیا۔ اسے بھروسہ تھا کہ ریاضی میں مہارت کی وجہ سے وہ کامیاب ہو جائے گا۔ فکر تھی تو علم الحیات اور علم النبات کی۔ اس نے خوب محنت کی اور امتحان میں بیٹھ گیا جس کا ڈر تھا وہی ہوا۔ ڈائریکٹر نے اسے بتایا۔

”تمہاری قابلیت دیکھ کر یہ نتیجہ سامنے آیا ہے کہ تمہیں اس اسکول میں داخلہ نہیں مل سکتا۔“

”مجھے افسوس ضرور ہوا لیکن میں کیا کروں میری قسمت ہی ایسی ہے۔ آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے مجھے امتحان میں بیٹھنے کا موقع دیا۔“

زیادہ افسوس کی ضرورت نہیں ہے۔ فزکس اور ریاضی میں تمہاری قابلیت قابل رشک ہے۔ میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ تم کالج میں داخلے کی تیاری کرنے والے اسکول میں داخل ہو جاؤ۔ ”آراؤ“ کے اسکول میں کوشش کرنا۔

آراؤ زیورچ سے 35 میل دور ایک قصبہ تھا۔ اس کا جی تو یہی چاہ رہا تھا کہ اسکول میں قید ہونے سے بہتر ہے وہ آزاد پھر تار ہے لیکن روزی پیدا کرنے کے لیے بھی تو کچھ کرنا تھا۔ روزی کمائے بغیر اس کے لیے گھر میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ باپ نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ اتنے بڑے لڑکے کو گھر بیٹھ کر نہیں کھلا سکتا۔ وہ اسکولوں کی حالت سے بہت تنگ تھا۔ بچپن میں اس پر جو گزری تھی۔ جس طرح سردی کے باوجود اسے ہال میں کھڑا کر کے اسے سزا دی جاتی تھی اس کے برے اثرات ابھی تک اس کے ذہن پر قائم تھے۔ اس کے باوجود ”آراؤ“ کے اسکول چلا گیا۔

اسکول پہنچ کر اسے خوش گوار حیرت ہوئی۔ یہاں کا ماحول بہت اچھا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی اسکول اتنا اچھا بھی ہو سکتا ہے۔ یہاں کوئی بات زبردستی نہیں ٹھوسی جاتی تھی۔ سوالات پوچھنے پر اساتذہ خوش ہوتے تھے بلکہ پہلی مرتبہ اس کی طرف کسی نے دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ پروفیسر وٹلر کو یہ خاموش طبع نوجوان اتنا پسند آیا کہ انہوں نے اسے کھانے کی دعوت دے دی۔

طے کر لیا تھا کہ آئندہ زندگی میں فزکس ہی اس کی زندگی کا دلچسپ موضوع ہوگا۔

اس کی محنت نے رنگ دکھایا اور ایک سال سے بھی کم عرصے میں اس نے ڈپلوما حاصل کر لیا۔ اب وہ زیورچ جا کر پالی ٹیکنیک یونیورسٹی میں داخل ہو سکتا تھا۔ اس نے اپنے میزبانوں سے اجازت طلب کی۔ پروفیسر وگلر بھی اب اسے روک نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے اس وعدے کے ساتھ اسے رخصت کیا کہ وہ ان سے ملنے کے لیے جلد ہی آئے گا۔

وہ پولی ٹیکنیک یونیورسٹی میں داخلہ لینے پہنچا تو ڈائریکٹروں نے ایک بدلہ لیا جو ان کو اپنے قریب کھڑا دیکھا۔ بال بکھرے ہوئے کاغذ آگے کو جھکے ہوئے۔ بالکل اجڑا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اپنی عمر سے زیادہ سنجیدگی تھی۔ اس کے پاس ڈپلوما تھا اور شاندار نمبر تھے اس لیے محض ظاہری ہیئت کو جواز بنا کر اسے داخلے سے محروم نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ اسے داخلہ مل گیا۔

اسے اس کے رشتے داروں کی طرف سے ایک سو سوس فرانک ماہانہ مل رہے تھے جو نا کافی تھے اور اس کی عمر کے نوجوان کے لیے تو بالکل ہی نا کافی تھے کیوں کہ اس کی عمر کے نوجوانوں کے بہت سے شوق ہوتے ہیں۔ اتنی رقم تو صرف لباس پر ہی خرچ ہو جاتی لیکن اس کے شوق ایسے نہیں تھے کہ زیادہ رقم کی ضرورت پڑتی۔ خوراک اس کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ لباس کے معاملے میں وہ ہمیشہ کا بے پروا تھا۔ ہمیشہ پیدل چلتا تھا لہذا سواری کا کوئی خرچ نہیں تھا۔ صرف سر چھپانے کے لیے چھت درکار تھی۔ اس نے یونیورسٹی کے قریب ہی سستا سا ایک کمرہ کرائے پر لے لیا اور خود کو پوری طرح کتابوں کے سپرد کر دیا۔

اس کی شخصیت میں کوئی جاذیبیت نہیں تھی جو کوئی اس کے قریب آتا۔ اس کی کم گوئی کو دوسرے لڑکے غرور سے تعبیر کرتے تھے۔ اس کا عالم تو یہ تھا کہ دو وقت کھانا نہیں کھاتا تھا کسی سے دوستی کیا رکھتا۔ دوستی رکھنے کے لیے پیسے خرچ کرنا پڑتے ہیں اور اس کے پاس پیسے اتنے ہوتے ہی نہیں تھے۔ صرف ایک لڑکا مارسل اس کے قریب آنے کی جسارت کر سکا تھا۔ وہ اس کا مداح ہو گیا تھا۔ اس کے کمرے میں آکر بیٹھ جاتا تھا۔ ارد گرد کتابوں کا ڈھیر لگا رہتا تھا۔ دونوں سائنس کے موضوعات پر تبادلہ خیال کرتے رہتے تھے۔ کبھی یہ بھی ہوتا کہ البرٹ کسی مسئلے میں الجھا ہوتا اور مارسل آجاتا۔ یہ بڑا

”آج رات کا کھانا میرے ساتھ کھانے کے لیے میرے گھر آتا۔ مجھے اُمید ہے تم میرے بچوں سے مل کر خوش ہو گے۔“

البرٹ نے انکار کرنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے اسے یہ موقع ہی نہیں دیا۔

”شاید تم وعدہ کر کے بھی نہ آؤ اور میں انتظار کرتا رہوں۔ اسکول ختم ہونے کے بعد میرے ساتھ ہی چلنا۔ ہم دونوں اکٹھے ہی پیدل گھر چلیں گے۔“

وہ ان کے ساتھ گیا۔ پوری فیملی ایسی خوش اخلاق تھی کہ پہلی ملاقات ہی میں وہ ان کا گرویدہ ہو گیا۔ وہ بھی سب گھر والوں کو اتنا پسند آیا کہ پہلی ملاقات ہی میں انہوں نے اسے کرائے کے مکان سے اپنے گھر منتقل ہونے کی دعوت دے دی۔

”ہمارے گھر میں بہت جگہ ہے۔ تم یہاں منتقل ہو جاؤ۔ تم کرائے سے بچ جاؤ گے اور ہم تمہیں گے ہمیں ایک بیٹا اور مل گیا۔“

پروفیسر وگلر کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ وہ شرمیلا اور تنہائی پسند لڑکا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے بھی اس پر زور نہیں دیا کہ وہ آداب مجلس کا خیال رکھے اور ان کے پاس آکر بیٹھا کرے۔ البرٹ یہی چاہتا تھا کہ کوئی اسے سمجھے۔

اس پر بے جا پابندیاں عائد نہ ہوں۔ یہ سہولت اسے یہاں مل رہی تھی۔ آہستہ آہستہ اس میں خوشگوار تبدیلیاں آنے لگیں۔ وہ ان کے بچوں کے ساتھ کھل مل گیا۔ ان کے ساتھ چمک منانے کے لیے بھی جانے لگا۔ البتہ روزانہ کی چہل قدمی کے لیے وہ کسی کو ساتھ لے جانا پسند نہیں کرتا تھا کیوں کہ اس چہل قدمی کے دوران میں ہی وہ سائنس کے مسائل پر غور کر سکتا تھا جو اس کے ذہن پر چھائے ہوئے تھے۔

یہاں رہ کر اسے مطالعہ کا بھی خوب موقع مل رہا تھا۔ پروفیسر وگلر نے اپنا لائبریری کے دروازے اس پر کھول دیے تھے۔ فارغ اوقات میں وہ اسے پڑھانے بھی بیٹھ جاتے تھے۔

جب وہ لائبریری چاٹ چکا تو اس پر یہ عذر دیا کہ اس کا اصل میدان فزکس ہے۔ ریاضی کی دنیا محدود تھی۔ وہ کسی فارمولے کو اپنی مرضی کے مطابق تبدیل نہیں کر سکتا تھا جب کہ اس کا ذہن نئی نئی چیزیں تلاش کرنا چاہتا تھا۔ قدرت کے اسرار کی نقاب کشائی چاہتا تھا اور یہ گنجائش فزکس میں تھی۔ اس نے ریاضی کی طرف سے منہ موڑ لیا۔ اس نے

سنجیدگی۔ البرٹ نے بھی اسے دیکھا اور پھر خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ بات اس وقت تو آئی گئی ہوگئی۔ دو چاروں مزید گزر گئے۔ وہ کلاس میں تو آتا ہی نہیں تھا۔ ایک روز کوریڈور میں مل گیا۔ میلو امریش نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کرایا۔

”جہاں تک میرا خیال ہے تم میری ہی کلاس میں پڑھتے ہو۔“

”ہاں پڑھتا تو ہوں۔“

”میں نے صرف ایک دو مرتبہ ہی تمہیں کلاس میں دیکھا ہے۔“

”میں بہت کم آتا ہوں۔“

”کیا تم یہ تو نہیں سمجھنے لگے ہو کہ تمہیں بہت کچھ آتا ہے۔“

”میں زیادہ بیٹھ کر لیکچر نہیں سن سکتا۔“

”عجیب آدمی ہو۔ پھر پاس کیسے ہو جاتے ہو۔“

”تم کچھ دن یہاں رہو گی تو خود جان لو گی۔“

”مجھے تم عجیب سے لگے ہو۔“

”اور بہت سے لوگ بھی یہی کہتے ہیں۔“ البرٹ نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

وہ اس کی اس بد تمیزی پر حیران رہ گئی اور اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اس کی چال بھی عجیب سی تھی جیسے دبے قدموں سے ٹلی فرش پر چلتی ہے۔ وہ اپنی آواز ہی نہیں چھپاتا اپنے قدموں کی چاپ بھی چھپاتا ہے۔ وہ مسکرا دی۔

وہ گئی دن تک اس کا تعاقب کرتی رہی۔ اس کے بارے میں معلومات جمع کرتی رہی۔ اسے معلوم ہوا کہ اس کے دوستوں کا ایک گروپ ہے جو اس کے گھر جمع ہوتے ہیں اور معلومات کا تبادلہ کرتے ہیں۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ فزکس کے بارے میں استادوں سے زیادہ معلومات رکھتا ہے۔ میلو امریش کا فزکس سے دم ٹکنا تھا۔ اس نے سوچ لیا کہ وہ فزکس کے مضمون میں اس سے مدد لے گی۔ وہ ایک روز کلاس روم میں آ نکلا تھا۔ میلو امریش اپنی جگہ سے اٹھی اور اس کے برابر جا کر بیٹھ گئی۔

”تم تو کلاس میں آتے نہیں ہو آج کیسے آ گئے۔“

”بس آ گیا۔“

”تم مجھ سے باتیں کرنے کے لیے کچھ وقت نکال سکو گے۔“

”شاید نہیں، یہاں اور بہت سے لڑکے ہیں تم ان

یک طرفہ وقت ہوتا تھا۔ مارسل بولتا رہتا اور البرٹ خاموش اپنے خیالوں میں غرق رہتا۔ مارسل کو جب احساس ہوتا کہ جو کچھ وہ بول رہا ہے، البرٹ شاید سن بھی نہیں رہا ہے۔ وہ کسی اور ہی دنیا میں گم ہے۔ تو مارسل خاموشی سے اٹھ کر چلا جاتا لیکن اس کی عدم توجہی پر مارسل کبھی ناراض نہ ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہ کہتا۔ ”دیکھو دوست آج تم گفتگو میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہے ہو پھر کسی وقت بات کریں گے۔“

یہی حال اس کا لیکچر سننے کے بارے میں بھی تھا۔ وہ بڑی بے قاعدگی سے لیکچر سننے جاتا تھا۔ اس کا زیادہ وقت فزکس کی لیبارٹری میں گزرتا تھا۔

اس کو اپنی اس خامی کا احساس اس وقت ہوا جب امتحان سر پر آئے۔ اس نے لیکچر تو سنے ہی نہیں تھے۔ نوٹس بھی اس کے پاس نہیں تھے۔ اس وقت مارسل اس کے کام آیا۔ وہ تمام لیکچروں میں شریک ہوتا رہا تھا۔ ان لیکچروں کی خاص خاص باتیں اس کی مختلف کاپیوں میں درج تھیں۔ اس نے وہ سب کا پتلا البرٹ کے حوالے کر دیں۔

”دوست گھبراتے کیوں ہو۔ میں نے یہ نوٹس بنائے ہوئے ہیں۔ ان سے تیاری کرو اور امتحان میں بیٹھ جاؤ۔“

البرٹ کے لیے یہ بھی مشکل تھا۔ پھر بھی اس نے دل پر پتھر رکھ کر انہیں رٹنا شروع کر دیا۔ ان نوٹس کو رٹتے ہوئے یہ خوشی اس کے لیے کم نہیں تھی کہ وہ لیکچر سننے کی کوفت سے بچ گیا ہے۔

وہ پہلے سال ہے امتحان میں کامیاب ہو گیا۔

مارسل اور اس کی دوستی پروان چڑھتی رہی۔ اس کی زبانی البرٹ کی تعریف سن کر چند اور لڑکوں نے البرٹ کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔ وہ زیادہ دوستیوں کا قائل نہیں تھا اس لیے صرف چار لڑکوں کو اس نے اپنے قریب آنے کی دعوت دی۔ یہ ایک گروپ سا بن گیا جو البرٹ کے کمرے میں آ کر سائنسی موضوعات پر بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے۔

وہ اپنی تعلیم کے تیسرے سال میں تھا کہ سربیا سے آئی ہوئی ایک لڑکی اس کی جماعت میں داخل ہوئی۔ اس کا نام میلو امریش تھا۔ اس کے بال سیاہ اور چہرہ کسی قدر چوڑا تھا۔ وہ بھی کم پلٹی تھی۔ ایک پراسرار سی خاموشی اس کے گرد پہرہ دیتی رہتی تھی۔ یہی حال البرٹ کا بھی تھا۔ وہ تو کلاس میں جاتا ہی کم تھا۔ میلو امریش نے آتے ہی بھانپ لیا کہ البرٹ نامی لڑکا اسی کے مزاج کا ایک حصہ ہے۔ اول جلوس ساء اچھے کپڑوں سے بے نیاز، چہرے پر خوف ناک

”میں وہ لڑکی ہوں جو ماں کی ممتا سے محروم رہی ہے۔ میرے باپ نے اسے طلاق دے دی تھی اور مجھے زبردستی اپنے پاس لے آیا تھا، مجھے یہ بہت بعد میں معلوم ہوا کہ اسے مجھ سے محبت نہیں تھی وہ تو صرف میری ماں کو ستانے کے لیے مجھے اپنے پاس لے آیا تھا۔ میری ماں بے چاری مجھے یاد کرتے کرتے مر گئی۔ میرے باپ نے دوسری شادی کر لی اور مجھے بالکل نظر انداز کر دیا۔ میں خود بخود بڑی ہوتی رہی۔ میری نئی ماں میرا وجود ذرا برداشت نہیں کرتی تھی۔ میرے باپ نے مجھے خود سے اپنی امداد کے لیے یہاں پڑھنے بھیجا ہے۔ اس لیے نہیں بھیجا کہ وہ میرا اچھا مستقبل چاہتا ہے۔ میں نے بھی سوچ لیا ہے کہ اب اس کے پاس لوٹ کر نہیں جاؤں گی۔ گریجویشن کرنے کے بعد اپنا راستہ اپنی زندگی خود بناؤں گی۔“

”مجھے تمہارے حالات سن کر تم سے ہمدردی ہے۔“

”اب تم اپنے بارے میں کچھ بتاؤ تم بھی کچھ کم الجھے ہوئے نظر نہیں آتے۔“

”میرے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہے۔ مجھ سے سب محبت کرتے ہیں۔ بس اتنا ہے کہ میرا باپ مجھے بے روزگار دیکھنا نہیں چاہتا۔ اس نے کہہ دیا تھا کہ ایک گھنٹوں کی اس کے گھر میں جگہ نہیں۔ جب پڑھ لکھ کر کوئی ہنر سیکھ لو اور کمانے لگو تو میرے پاس چلے آنا۔“

انجی یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ مارسل آ گیا۔ اس نے میلو کو اس کے پاس بیٹھا دیکھا تو ایک معنی خیز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر ابھرائی البرٹ نے بھی اسے محسوس کر لیا تھا۔

”دوست تم جیسا سمجھ رہے ہو ویسا نہیں ہے۔ میلو میرے پاس اس لیے آئی ہے کہ ہم اسے اپنے گروپ میں شامل کر لیں۔ میرے خیال میں یہ فیصلہ کر لینا چاہیے کہ وہ یہاں آیا کرے۔ ایک لڑکی کی موجودگی میں ہم مہذب بھی ہو جائیں گے اور یہ کافی بھی بہت اچھی بناتی ہے۔“

مارسل کو اس سے زیادہ سروکار بھی نہیں تھا جو وہ کچھ پوچھتا۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد اسے بھی یہ اچھا لگا کہ ان کے درمیان ایک لڑکی موجود ہے۔ وہ بہت کم ہنس رہی ہے لیکن وہ البرٹ کو بھی تو برداشت کر رہا ہے۔

میلو امریش نے وہاں باقاعدگی سے آنا شروع کر دیا تھا۔ وہ بہت کم بولتی تھی لیکن سستی توجہ سے تھی۔ البرٹ کی طرح بار بار غیر حاضر نہیں ہو جاتی۔ البرٹ کے گروپ کے

سے بات کر سکتی ہو۔“

”مجھے لڑکے سے نہیں البرٹ سے باتیں کرنی ہیں۔“

”تم بھی مجھے دوسروں سے مختلف نظر آتی ہو اس لیے میرے گھر چلی آؤ، وہاں چند اور طالب علم بھی آتے ہیں باتیں تو وہیں سن سکتا ہوں۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں لیکن میں نے تمہارا گھر تو دیکھا ہی نہیں ہے۔“

”یہ کلاس ختم ہو جائے پھر میرے ساتھ چلنا۔“

لیکچر شروع ہو چکا تھا۔ وہ دونوں لیکچر سنتے رہے۔ لیکچر ختم ہوا تو اس نے میلو امریش کو ساتھ لیا اور گھر پہنچ گیا۔

”تم بیٹھو میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں۔ کون کس طرف ہے؟“

”میں کافی پڑا ہوں۔“

”میں کافی بنائے دیتی ہوں۔ تم اتنا سوچتے ہو تھک جاتے ہو گے۔“

البرٹ کو اپنی ماں یاد آگئی جو اس کے اسکول سے آتے ہی کچن کا رخ کرتی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر بھی یہی الفاظ ہوتے تھے کہ تو کتنا دبلا ہو گیا ہے کچھ کھایا کر۔ وہ سلیقے سے کافی بنا کر لائی تو اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ ایک عورت کا گھر میں رہنا کتنا ضروری ہوتا ہے۔ کافی بنانے کے دوران میں ہی اس نے گھر میں پڑے واحد بیڈ کی چادر تبدیل کر دی تھی اور کتابیں سلیقے سے جماد کی تھیں۔

”تم میری عادتیں کیوں بگاڑ رہی ہو۔ تم نہیں ہو گی تو پھیلا ہوا گھر مجھے کتنا برا لگے گا۔“

”میں کہاں جا رہی ہوں۔ اب تو روز ہی آتی رہوں گی۔“

”میلو! ایک بات پوچھوں؟“

”شکر ہے تم کچھ پوچھ تو رہے ہو۔“

”تمہاری آنکھوں میں اتنی اداسی کیوں ہے۔ ایک تھکنی ہے جو دیکھنے والے کو بھی پیاسا بنا دیتی ہے۔ کون سا دکھ ہے جو چھپائے پھر رہی ہو۔“

”تم کافی پوچھو میرے دکھوں سے کیا کام۔“

”دیکھو، دوستی اتنی وقت پر وان چڑھتی ہے جب ہم ایک دوسرے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانتے ہوں۔“

”تو پھر تمہیں اسے بارے میں بتانا چاہیے۔“

”میں بھی بہت کچھ بتاؤں گا پہلے تم اپنے بارے میں

دوسرے دن بعد میں اس سے ملاؤں ہوئے تھے۔
 میلو امریش فزکس میں بہت کمزور تھی لہذا وہ البرٹ
 کے ساتھ فزکس لیبارٹری میں بھی جانے لگی۔ یہاں پہنچ کر
 اس کا بھی وہی حال ہوا جو دوسروں کا ہوتا تھا۔ وہ اس سبکیٹ
 میں البرٹ کی قابیلیت دیکھ کر حیران رہ گئی۔

”تم تو بعض اساتذہ سے بھی زیادہ جانتے ہو۔“
 ”میں نے جو کچھ سیکھا ہے اساتذہ ہی سے سیکھا ہے
 اس لیے یہ نہ کہو کہ میں ان اساتذہ سے زیادہ جانتا ہوں۔“
 ”یہ اچھی بات ہے کہ تم اساتذہ کا احترام کرتے ہو
 لیکن حقیقت یہی ہے۔“
 ”شاید ایسا ہی ہو۔“ البرٹ نے کندھے اچکاتے
 ہوئے کہا۔

”مجھے تو یہ خوشی ہے کہ مجھے مفت کاشیورٹل گیا۔“
 ”مجھے یہ خوشی ہے کہ مجھے تمہاری صورت میں ایک
 سننے والا مل گیا ہے۔ میں اپنے خیالات کا اظہار اس کے
 سامنے کر سکتا ہوں۔ میں بولتا رہتا ہوں اور تم ٹکٹکی باندھ کر
 میری طرف دیکھتی رہتی ہو۔“

”جانتے ہو کیوں؟ اس لیے کہ میں تمہیں اپنی
 آنکھوں میں محفوظ کر لینا چاہتی ہوں۔ ہمیں آخر کو چھڑنا ہے
 اس طرح تم میری آنکھوں میں تو رہو گے۔“
 ”پلیز میلو، میں ایسی باتوں کا تحمل نہیں ہو سکتا۔ تم
 میرے لیے دوست ہو دوست رہو گی اور دوست ہوتے ہی
 اس لیے ہیں کہ چھڑ جائیں۔ آدمی صرف اپنے ساتھ ہمیشہ رہ
 سکتا ہے۔“
 ”تم اگر سائنس داں نہ ہوتے تو شاعر یا فلسفی ہو سکتے
 تھے۔“

”تم اگر مجھے نہ ملی ہوتیں تو میں کچھ بھی نہ ہوتا نہ شاعر
 نہ فلسفی نہ سائنس داں۔ تم میرا یقین ہو۔“ البرٹ نے کہا اور
 اپنا کھردرا ہاتھ اس کے نرم ہاتھ پر رکھ دیا۔

”میں بھی تم سے مل کر بہت سے دکھ بھول گئی ہوں۔“
 میلو امریش نے اپنا دوسرا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔
 اس دن وہ لیبارٹری سے نکلے تو ایک دوسرے کے
 بارے میں بہت کچھ جان چکے تھے۔ کم از کم میلو نے اتنا
 جان لیا تھا کہ پتھر کی طرح سخت نظر آنے والا البرٹ اندر
 سے کتنا نرم ہے۔ وہ بھی کسی سے محبت کر سکتا ہے۔ اس سے
 بھی زیادہ خوشی کی بات ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرتا ہے۔
 البرٹ اس رات سونے کے لیے لیٹا تو اس کی

آنکھیں میلو امریش کے تصور سے خالی تھیں۔ وہ خود
 حیران تھا کہ کوئی شخصیت ایسی بھی ہو سکتی ہے جو سائنسی
 موضوعات کی طرح اس کے ذہن میں آباد ہو گئی ہے۔ وہ
 اس کے بارے میں غور کر رہا ہے۔ اس کی حسین مسکراہٹ
 یاد آ رہی تھی جو ہر ایک کے لیے نہیں تھی۔ اس کے ہاتھوں کا
 لمس یاد آ رہا تھا۔ وہ سماجی رشتوں سے دور تھا لیکن یہ کیسا
 رشتہ تھا جو اسے جاگنے پر مجبور کر رہا تھا۔

اس دن کے بعد سے وہ دونوں ایک دوسرے سے
 قریب ہوتے چلے گئے۔ وہ میلو کو لے کر چہل قدمی کے لیے
 نکل جاتا۔ اس سے پہلے وہ چہل قدمی کے لیے اکیلے نکلتا
 تھا۔ اس طرح وہ سائنس کے مسائل پر غور کر سکتا تھا۔ وہ
 اپنے کام کے سوا کسی اور چیز پر توجہ نہیں دیتا تھا لیکن اب میلو
 اس کی امیدوں کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ وہ سائنس کے علاوہ
 کچھ اور بھی سونے لگا تھا۔ اس نے اپنی بہن مایا کو خط بھی لکھ
 دیا تھا کہ ایک لڑکی سے میری دوستی ہو گئی ہے۔ اس کا جواب
 بھی آ گیا تھا۔

”تم وہی البرٹ ہو۔ نہیں ہرگز نہیں۔ تم وہ ہو ہی نہیں
 سکتے۔ تمہاری اور کوئی لڑکی دوست! اگر تم مجھ سے مذاق نہیں
 کر رہے ہو اور محض یہ بتانا چاہتے ہو کہ تم اب بڑے ہو گئے
 ہو تو یہ مذاق مت کرو اور اگر واقعی ایسا ہے تو دیر مت کرو اس
 سے فوراً شادی کر لو۔ ایسی لڑکیاں روز روز نہیں ملتیں جو تم
 جیسے گدھے کو اپنا دوست بنا سکیں۔“

اس نے وہ خط میلو امریش کو بھی دکھایا۔ دکھانے کا
 مقصد ہی یہ تھا کہ وہ اپنی بہن کی زبانی اسے یہ سنانا چاہتا تھا
 کہ وہ اس سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ اتنا شرمیلا تھا کہ یہ
 بات اپنے منہ سے نہیں کہہ سکتا تھا۔ میلو جانتی تھی کہ وہ شرمیلا
 ہے لیکن لڑکی ہونے کے ناتے وہ بھی اپنی زبان سے نہیں کہہ
 سکتی تھی۔

وقت گزرتا رہا اور ان دونوں کی تعلیم کا آخری سال
 آ گیا۔ امتحان نزدیک آئے البرٹ کو فکر ہوئی کیوں کہ تعلیم
 مکمل کرنے کے بعد وہ اپنے گھر واپس جا سکتی تھی۔ وہ اس
 سے پہلے اس کی رضا مندی لینا چاہتا تھا۔

”میلو امتحان دینے کے بعد تمہارا کیا پروگرام ہوگا۔“
 ”مجھے جانا ہوگا۔“

”اسی باپ کے پاس جو تم سے نفرت کرتا ہے؟“
 ”میں سا تبیر یا کی بات کر رہی ہوں۔ ضروری نہیں
 کہ اپنے گھر جاؤں۔“

”میں کیوں نہیں رہ جاتی۔“

”میرے پاس یہاں کی شہریت نہیں ہے۔“

”اگر تم مجھ سے شادی کر لو تو شہریت مل سکتی ہے۔“

”تم مجھے شہریت دلانے کے لیے شادی کرو گے یا واقعی شادی کرنا چاہتے ہو۔“

”میں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ گرجیوٹ بننے کے بعد ہم شادی کر لیں گے۔“

وہ دونوں امتحان کی تیاریوں میں مشغول ہو گئے۔

اب البرٹ ایک نئے جذبے کے ساتھ تیاری کر رہا تھا۔ وہ

ہرگز یہ نہیں چاہتا تھا کہ امتحان کا نتیجہ اس کے حق میں نہ نکلے

اور اس کی شادی کھنائی میں پڑ جائے۔ اس نے مارسل کے

بنائے ہوئے نوٹس لے لیے اور جو کچھ وہ سن نہیں سکا تھا اس

کی خوب اچھی طرح تیاری کی۔

رزلٹ آؤٹ ہوا تو بیسویں صدی کا پہلا سال اس کا

استقبال کر رہا تھا اور اس کی چار سالہ تعلیم مکمل ہو گئی تھی۔ اب

وہ میلو امریش سے شادی کرنے کے لیے آزاد تھا۔ نئی صدی

کی نئی زندگی۔

وہ خوش تھا اور سوچ رہا تھا کہ سب سے پہلے یہ خوش

خبری مایا کو سنائے گا۔ سوچنا یہ تھا کہ وہ کچھ دنوں کے لیے گھر

جائے یا خط لکھ کر خوش خبری سنا دے۔ اپنے باپ سے کہے کہ

اب تو وہ کمانے کے لائق ہو گیا ہے۔ اب تو گھر میں اس کے

لیے جگہ بن جائے گی۔ وہ کسی نیچے پر نہیں پہنچ سکا تھا کہ گھر

والوں کی طرف سے ایک خط اسے ملا۔ خط پڑھتے ہی اس

کے خیالوں کی ہر عمارت ڈھیر ہو گئی۔ اس نے تو یہ سوچا تھا کہ

وہ میلو سے شادی کر لے گا۔ سو فرامگ جو اسے ملتے ہیں ان

میں گزارہ کر لے گا اور سائنس کے متعلق جو اس کے نظریات

ہیں ان کو مزید وسعت دیتا رہے گا لیکن اس خط میں تو کچھ

اور ہی لکھا تھا۔ خط میں لکھا تھا چونکہ اس کی تعلیم مکمل ہو گئی ہے

اس لیے جو ماہانہ الاؤنس اسے ملتا تھا وہ اب نہیں ملے گا۔

وہ اچانک چھاؤں سے دھوپ میں آ کر کھڑا ہو گیا۔

میں ہرگز شاندار زندگی گزارنے کے حق میں نہیں لیکن کھانا

پہننا تو پڑتا ہی ہے۔ سوائز ایک قلیل رقم تھی لیکن تھی دسویں۔

شادی کے بعد اخراجات میں کچھ نہ کچھ اضافہ تو ضرور ہو

جائے گا۔ کوئی نہ کوئی ذریعہ معاش تو ضرور ہونا چاہیے۔

وہ اس فکر میں غلط تھا اور میلو شادی کے لیے اصرار

کر رہی تھی۔ ایک خطرناک خیال اس کے ذہن میں آیا۔ وہ

اپنی پریشانیوں میں میلو کو شریک کیوں کرے۔ میلو کسی دولت مند آدمی سے شادی کر کے زیادہ خوش رہ سکتی ہے۔ وہ سوئٹزر لینڈ چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے میلو سے کوئی رابطہ نہ رکھے۔ وہ مایوس ہو کر لوٹ جائے گی۔ وہ اگلے دو دنوں تک غور کرتا رہا۔ میلو اس سے ملنے بھی آئی تو وہ اپنے آپ میں نہیں تھا۔ میلو یہ سوچ کر لوٹ گئی کہ وہ کسی سائنسی مسئلے پر غور کر رہا ہے۔

دونوں مسلسل غور کرنے کے بعد وہ کسی نتیجے پر پہنچ چکا

تھا۔ اس نے ایک ورمیان کا راستہ تلاش کر لیا تھا۔ اس نے

طے کر لیا کہ وہ میلو کو اعتماد میں لے گا۔ میلو اس سے ملنے آئی

تو اس نے بات چھیڑ دی۔

”میلو! مجھے گھر والوں کی طرف سے جو سو فرامگ

ملتے تھے وہ اب نہیں ملیں گے۔“

”میں یہ نہیں پوچھوں گی کہ کیوں لیکن یہ ضرور کہوں گی

کہ سب کے گھر والے ایسے ہی ہوتے ہیں۔“

”میں ایک مفلس آدمی ہوں جس کے پاس چند

نظریات کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ نظریات بھی وہ ہیں جو ابھی

دنیا پر ظاہر نہیں ہوئے ہیں بلکہ ابھی مجھ پر بھی پوری طرح

منکشف نہیں۔“

”اگر تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں تم سے دولت مند بننے

کا تقاضا کروں گی تو یہ تمہاری بھول ہے بلکہ غلطی ہے۔ تم مجھ

پر اعتماد کرو میں تمہارے ساتھ ہر حال میں گزارہ کر لوں

گی۔“

”میرے پاس اتنا بھی نہیں ہے کہ ہم دو وقت کی

روٹی کھا سکیں۔“

”تم کہیں نوکری کر سکتے ہو۔“

”میں نے بھی یہی سوچا ہے لیکن اس میں کچھ دن لگ

سکتے ہیں۔ تم کچھ دن کے لیے اپنے گھر چلی جاؤ۔ میں یکسوئی

سے کوئی ملازمت ڈھونڈ لوں گا۔ ملازمت ملتے ہی ہم شادی

کر لیں گے۔“

”البرٹ! یہ سمجھ لینا کہ اگر تم نے مجھے نہیں بلایا تو میں

کہیں شادی نہیں کروں گی۔“

”میں بھی یہ نہیں سوچ سکتا کہ تمہارے سوا کسی اور

سے شادی کروں۔“

میلو امریش اس ساعت کا انتظار کرنے اپنے گھر چلی

گئی۔

البرٹ اب کسی ملازمت کی تلاش میں تھا۔ اس نے

پچھلے چار برسوں میں بہت سے مضامین کا علم حاصل کیا تھا۔ سائنس کے متعلق اپنے نظریات کو بے پناہ وسعت دی تھی۔ فزکس کے بارے میں اس کی معلومات کی تو کوئی انتہائی نہیں تھی۔ پولی ٹیکنیک کے پروفیسر تک اس کی قابلیت کے معترف تھے۔ اسے یقین تھا کہ اسے فزکس کے پروفیسروں کے اسٹنٹ کے طور پر ملازمت مل جائے گی۔ معاوضہ بہت کم ہوگا لیکن آئندہ پروفیسر بننے کے لیے اسے تربیت مل جائے گی۔ اس نے درخواست دی لیکن اسے حوصلہ افزا جواب نہیں ملا۔ ٹال مٹول سے کام لیا جاتا رہا۔ آئندہ کے موہوم وعدے کیے جاتے رہے۔ یونیورسٹی کی انتظامیہ کے اس رویے نے اسے بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا۔ کہیں یہ لوگ مجھے غیر ملکی تو نہیں سمجھ رہے ہیں۔ اس کے پاس شہریت کی دستاویزات موجود تھیں۔ اس نے وہ پٹن کر دیں۔ اس کے بعد بھی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ اب وہ یہ سوچنے میں حق بہ جانب تھا کہ شاید وہ یہودی ہے اس لیے اس کے حق میں فیصلہ نہیں ہو رہا ہے۔ انہی دنوں اس کے ایک مداح پروفیسر نے اس پر یہ انکشاف کیا کہ بعض پروفیسر اس اندیشے میں مبتلا ہیں کہ یہ غیر معمولی طور پر ذہین طالب علم کہیں ان سے آگے نہ نکل جائے، اسی لیے اس کی مخالفت کی جا رہی ہے۔

اس انکشاف کے بعد اس کے سوا کیا ہو سکتا تھا کہ وہ ان پروفیسروں کی ذہنیت پر افسوس کرتا ہو راستے سے ہٹ جائے۔ میری وسیع معلومات سے دیگر طالب علم کو جو فائدہ پہنچ سکتا تھا وہ اب نہیں پہنچے گا۔ اس نے کہا اور اخبارات میں اشتہارات دلچہ کر درخواستیں بھیجنے لگا۔ آخر اسے ایک اسکول میں عارضی ملازمت مل گئی۔ ایک پروفیسر چھٹی پر گیا ہوا تھا۔ البرٹ کو اس کی جگہ رکھا گیا تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ پروفیسر واپس نہ آئے۔ اس صورت میں اس کی ملازمت مستقل ہو سکتی تھی۔

وہ اپنے حلیے اور شکل سے بے وقوف ہی لگتا تھا۔ جب تک وہ بولنا شروع نہ کر دے کوئی اس کی قابلیت کا معترف نہیں ہو سکتا تھا۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ معمولی لباس پہنے ہوئے شرماتا ہو ایک نوجوان آدمی کلاس روم میں داخل ہوا۔ شرماتے ہوئے اس نے کہا ”گڈ مارنگ“ جو اب میں قہقہے سنا کی دیے۔ کسی طرف سے کاغذ کا ایک گولا آیا اور اس کے قدموں میں آکر گرا۔ بہت سے لڑکوں نے فرش پر پاؤں مارنے شروع کر دیے جس سے عجیب قسم کا شور پیدا ہوا۔ اس نے طلبہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھری تھیں کہ چالو

جتنا شور مچانا ہے جب میں فزکس کے کسی نکتے کی وضاحت کرنا شروع کروں گا تو تم میں سے کوئی بھی نہیں بول سکے گا۔ یہ وقت وہ ہوگا کہ اگر میں تشریح چھوڑ کر کلاس سے باہر جانا بھی چاہوں گا تو تم جانے نہیں دو گے۔ اس نے چاک اٹھایا اور بلیک بورڈ کی طرف گیا۔ کلاس میں طرح طرح کی آوازیں پیدا ہو رہی تھیں۔ اس نے بلیک بورڈ پر ایک شکل کھینچی اور اس کی تشریح کے لیے لیکچر دینا شروع کر دیا۔ آہستہ آہستہ شور دب گیا۔ اب وہ دھیمی آواز میں بول رہا تھا لیکن خاموشی اتنی تھی کہ اس کی آواز طلبہ تک یہ آسانی پہنچ رہی تھی۔ پیریڈ ختم ہونے تک پوری دلچسپی پیدا ہو چکی تھی۔

دوسرے دن وہ کلاس روم میں پہنچا تو طلبہ نہایت عقیدت سے اس کے احترام میں کھڑے ہو گئے۔ اس نے لیکچر دینا شروع کیا تو کلاس میں سانس لینے تک کی آواز نہیں تھی۔ پھر یہ روز کا معمول بن گیا۔ طلبہ اس کی آمد کا انتظار کرتے رہتے تھے۔ وہ معلومات کے خزانے لٹا تار ہا اور طلبہ جھولیاں بھرتے رہے۔

ایک دن اس کی بجائے پرانا پروفیسر کلاس میں آیا معلوم ہوا وہ چھٹی گزار کر واپس آگئے ہیں اور نئے پروفیسر کی چھٹی ہو گئی۔ طلبہ نے کئی دن تک احتجاج کیا کہ البرٹ کو واپس لایا جائے لیکن بے سود!

وہ پھر بے روزگار تھا۔ اس کی جیب میں چند فرانک تھے اور لمبی سڑکیں، لاتعداد فاقے تھے۔ اس نے پیسے بچانے کے لیے ایک وقت کا کھانا چھوڑ دیا۔ ایک وقت وہ بھی آیا جب اسے دونوں وقت بھوکا رہنا پڑتا۔ پھر اسے ایک بورڈنگ اسکول میں دو لڑکوں کی ٹوشن مل گئی۔ دونوں لڑکے نہایت ذہین تھے۔ البرٹ نے سوچا کہ اگر وہ ان لڑکوں کو اپنے طریقوں کے مطابق تعلیم دے تو ان کا مستقبل نہایت شاندار ہوگا۔

”آپ ان لڑکوں کو پوری طرح مجھے سونپ دیں۔ میں انہیں جو تعلیم اور جس طریقے سے دوں مجھے آزادی ہو۔“

اس کے اس مطالبے کو بغاوت سمجھا گیا۔ اسے فوراً برطرف کر دیا گیا۔

وہ پھر بے روزگار ہو گیا۔ وہ بھوک سے نڈھال تھا۔ کئی کئی دن کھانا نہ ملنے سے بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ اس کو دینے کے لیے دنیا کے پاس کچھ نہیں تھا۔ وہ

وہ اپنے حلیے اور شکل سے بے وقوف ہی لگتا تھا۔ جب تک وہ بولنا شروع نہ کر دے کوئی اس کی قابلیت کا معترف نہیں ہو سکتا تھا۔ یہاں بھی یہی ہوا۔ معمولی لباس پہنے ہوئے شرماتا ہو ایک نوجوان آدمی کلاس روم میں داخل ہوا۔ شرماتے ہوئے اس نے کہا ”گڈ مارنگ“ جو اب میں قہقہے سنا کی دیے۔ کسی طرف سے کاغذ کا ایک گولا آیا اور اس کے قدموں میں آکر گرا۔ بہت سے لڑکوں نے فرش پر پاؤں مارنے شروع کر دیے جس سے عجیب قسم کا شور پیدا ہوا۔ اس نے طلبہ کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھیں کھری تھیں کہ چالو

وہ پھر بے روزگار تھا۔ اس کی جیب میں چند فرانک تھے اور لمبی سڑکیں، لاتعداد فاقے تھے۔ اس نے پیسے بچانے کے لیے ایک وقت کا کھانا چھوڑ دیا۔ ایک وقت وہ بھی آیا جب اسے دونوں وقت بھوکا رہنا پڑتا۔ پھر اسے ایک بورڈنگ اسکول میں دو لڑکوں کی ٹوشن مل گئی۔ دونوں لڑکے نہایت ذہین تھے۔ البرٹ نے سوچا کہ اگر وہ ان لڑکوں کو اپنے طریقوں کے مطابق تعلیم دے تو ان کا مستقبل نہایت شاندار ہوگا۔

”آپ ان لڑکوں کو پوری طرح مجھے سونپ دیں۔ میں انہیں جو تعلیم اور جس طریقے سے دوں مجھے آزادی ہو۔“

اس کے اس مطالبے کو بغاوت سمجھا گیا۔ اسے فوراً برطرف کر دیا گیا۔

وہ پھر بے روزگار ہو گیا۔ وہ بھوک سے نڈھال تھا۔ کئی کئی دن کھانا نہ ملنے سے بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اس کے کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ اس کو دینے کے لیے دنیا کے پاس کچھ نہیں تھا۔ وہ

سوچ رہا تھا خدا یا! میں دولت کے انبار کب چاہتا ہوں۔ میں تو اپنے لیے اور میلو کے لیے چند ضروری چیزیں چاہتا ہوں۔ یہ کنبوں دنیا مجھے کچھ بھی دینے کو تیار نہیں۔ میں کسی اعلیٰ عہدے کا طلب گار نہیں، میں تو موچی کا کام بھی کرنے کو تیار ہوں۔

وہ اسی عالم پریشانی میں اپنے پرانے ہم جماعتوں کے پاس گیا۔ اپنی شریلی طبیعت کے باوجود ان سے کھل کر کہا کہ اس کے لیے کیا باعزت روزگار کا انتظام کر دیں لیکن کوئی اس کے کام نہ آتا۔

وہ ایک سڑک کے کنارے کنارے چلا جا رہا تھا۔ بھوک کی شدت نے اس کی آنکھوں تلے اندھیرا طاری کر دیا تھا۔ اس کے جوتے پھٹ گئے تھے اس لیے احتیاط سے قدم اٹھا رہا تھا۔ ارد گرد کا کوئی ہوش نہیں تھا۔ اپنی ذہن میں چلا جا رہا تھا کہ اس کا پرانا دوست مارسل اس کے سامنے آ گیا۔

”البرٹ! یہ تم ہو؟ اف میرے خدا تم نے یہ کیا حالت بتائی ہے۔“ مارسل نے کہا۔ ”میں کچھ دنوں سے سوئٹزرلینڈ میں نہیں تھا اور نہ تمہاری یہ حالت کبھی نہ ہوتی۔“

”کیا ہوا میری حالت کو۔ میں تو سدا کا ایسا ہی ہوں۔“

”نہیں میرے دوست نہیں، تم ایسے تو نہیں تھے۔ ضرورت تم سے میلو نے بے وفائی کی ہے۔“

”تم نے بالکل غلط اندازہ لگایا۔ اسے الزام مت دو۔“

”پھر کیا بات ہے۔“ مارسل نے اس کے الجھے ہوئے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ”اچھا چلو کسی کیفے میں بیٹھ کر گرم گرم کافی پیتے ہیں۔ باقی باتیں وہیں ہوں گی۔“

وہ دونوں ایک کیفے میں چلے گئے۔ یہاں پہنچ کر مارسل کو خیال آیا کہ البرٹ نے نہ جانے کب سے کچھ نہیں کھایا ہوگا۔ اس نے کافی کے ساتھ گوشت اور آلوؤں کا آرڈر بھی دے دیا۔

وہ نہ جانے کب کا بھوکا تھا۔ خود فراموشی کے عالم میں پوری پلیٹ چٹ کر گیا۔ مارسل اسے کھاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ البرٹ نے کچھ کہنے کے لیے پلیٹ سے نظریں اٹھائیں۔ اس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جیسے دوبارہ دیکھنے کے قابل ہوئی ہوں۔

کافی پینے کے دوران میں مارسل نے اس سے پوچھا

کہ وہ کس پریشانی میں ہے۔ البرٹ نے وہ کہانی لفظ بہ لفظ دہرا دی جو اس پر گزری تھی۔

”مجھے اپنی پروا نہیں لیکن میلو مجھ سے شادی کے انتظار میں بیٹھی ہوئی ہے۔ اگر کچھ دن اور مجھے ملازمت نہیں ملی تو وہ مجھے بے وفا سمجھے گی۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی مجھے بے وفا کہے۔“

مارسل کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر اس نے البرٹ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

”تم فکر مت کرو۔ میں تمہارے لیے کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔ میرے والد کا سرکاری حلقوں میں بہت اثر رسوخ ہے۔ میں ان سے کہوں گا کہ وہ کہیں نہ کہیں تمہاری ملازمت کا بندوبست کر دیں گے۔ تم کل اسی وقت اسی کیفے میں ملنا۔ میں تمہیں خوش خبری ضرور سناؤں گا۔“

البرٹ دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ ایسے وعدے وہ بہت سن چکا تھا۔ پھر بھی وہ مارسل کا شکر گزار تھا کہ اس نے میرا پیٹ تو بھر دیا۔ اب کل تک مجھے کوئی فکر نہیں ہوگی۔

اسے یقین نہیں تھا کہ مارسل اتنی جلدی کوئی خوش خبری سنا دے گا۔ پھر بھی وہ دوسرے دن اس کیفے میں پہنچ گیا۔ مارسل اس سے پہلے وہاں پہنچ چکا تھا۔

”آؤ دوست، پہلے کچھ کھا لو پھر میں تمہیں خوش خبری سناؤں گا۔“ اس نے کہا اور البرٹ کی پسندیدہ ڈش کا آرڈر دے دیا۔ جب وہ کھانا کھا چکے اور کافی آگئی تو مارسل نے اسے خوش خبری سنائی۔

”میں نے والد صاحب سے بات کی تھی۔ تمہاری نوکری سمجھو پکی ہے۔ یہ اسامی ایجادات کو رجسٹرڈ کرانے کے دفتر میں ہے۔ تمہیں وہاں کے ڈائریکٹر سے ملاقات کرنی ہوگی باقی کام وہ خود کر لیں گے۔“

”وہاں انٹرویو ہوگا؟“

”ایک رسمی کارروائی ہوگی۔ والد صاحب نے بات کر لی ہے۔ جہاں سفارش ہو وہاں کوئی رکاوٹ نہیں ہوتی۔“

البرٹ کو اب بھی یقین نہیں تھا لیکن وہ مارسل کا دل رکھنے کے لیے ڈائریکٹر سے ملاقات کے لیے پہنچ گیا۔ وہ اسی صلیبے میں تھا جس میں وہ عام طور پر رہتا تھا۔ بہت پرانا ڈھیلا ڈھالا سا سوٹ اس کے بدن پر تھا۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ اچھا خاصا ہونق لگ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر ڈائریکٹر کو مایوسی ہوئی تھی۔ روزگار کے مسئلہ شای نوجوان تو

دے سکتا ہوں۔“

ایک بے روزگار نوجوان کے لیے یہ ایک خطیر رقم تھی لیکن البرٹ کے چہرے پر خوشی کے کوئی آثار ظاہر نہیں ہوئے۔ حد تو یہ ہوگئی کہ اس نے ڈائریکٹر کو خوش کرنے کے لیے لمبے چوڑے نقرے بھی استعمال نہیں کیے۔ اس نے ملازمت کی نوید اس طرح سنی جیسے یہ اس کا حق تھا جو اسے مل گیا۔

اس ملازمت کی نوید سنتے ہی اس نے میلو امریش کو خط لکھ دیا کہ وہ سوئٹزر لینڈ کے شہر ”برن“ چلی آئے جہاں ایک دفتر میں اس کی ملازمت بطور کلرک ہوگئی ہے۔

اس نے میلو امریش سے شادی کر لی اور ایک عمارت کی چوتھی منزل پر آباد ہو گیا۔

اس نے اپنے کام کو سمجھنے کے لیے محض چند روز مشقت کی اور پھر اس نتیجے پر پہنچنے میں اسے دیر نہیں لگی کہ وہ اتنی اہلیت رکھتا ہے کہ سارے دن کا کام دو تین گھنٹوں میں ختم کر سکتا ہے۔ یہ بات ڈائریکٹر کو بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ یہی ظاہر کرتا رہا کہ کام بہت محنت طلب ہے۔ دن بھر گزار جاتا ہے اور سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملتی۔ وہ دفتر کا کام زیادہ سے زیادہ تین گھنٹے میں مکمل کر لیتا باقی وقت سائنس کے ان مسائل کو حل کرنے میں گزارتا جو ہمیشہ اس کے ذہن میں موجود رہتے تھے۔ اپنی میز کی دراز میں اس نے ایک فائل رکھی ہوئی تھی۔ وہ دفتر کا کام ظاہر کر کے اپنا کام کرتا رہتا اور جونہی کوئی شخص اس کی میز کی طرف آتا وہ اس کاغذ کو جلدی سے فائل میں چھپا دیتا تاکہ کوئی یہ نہ جان سکے کہ وہ بھی کوئی ایجاد کرنے میں مشغول ہے۔

روزگار کا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ اس کی ضروریات پوری ہو رہی تھیں۔ اب اس کے پاس اتنی ذہنی فرصت تھی کہ وہ سائنس کے ان مسائل پر بھرپور توجہ دے سکتا تھا جو کانی عرصے سے اس کے ذہن میں جگمگاتا رہے تھے۔ یہ نظریات، روشنی، حرکت اور بیرونی خلا سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ نظریات اب تک کسی کے ذہن میں نہیں آئے تھے اس لیے ان کا کوئی نام بھی نہیں تھا۔ اس نے ان نظریات کو فلسفہ اضافیت کا نام دے دیا۔

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا وہ فلسفہ منافیت پر زیادہ سے زیادہ غور کرتا گیا۔ ان نظریات کو مرتب کرنے لگا۔ اس کی اس دیوانگی نے چند اور دیوانوں کو اس سے ملوا دیا۔ ان میں ایک انجینئر، ایک طالب علم اور ایک ریاضی داں تھا۔ چوتھی

بڑی ٹیپ ڈپ سے دفتر میں آتے ہیں۔ یہ تو اسی طرح اٹھ کر آ گیا ہے جس طرح گھر میں بیٹھا ہوگا حالانکہ نوکری کا ضرورت مند معلوم ہوتا ہے۔

”آپ کو یہ تو بتا دیا ہوگا کہ یہاں کیا کام ہوتا ہے۔“

”کچھ بتایا تو تھا لیکن میں نے ٹھیک سے سنا نہیں۔“

البرٹ نے کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا۔ اس کا لہجہ سپاٹ اور بے اثر تھا۔

”مہٹر میں آپ کو بتا دوں تاکہ آپ یہ فیصلہ کریں کہ آپ کو یہ کام کرنا بھی ہے یا نہیں۔ بات یہ ہے کہ جب کوئی شخص اپنی کئی ایجاد کو پینٹ کرانے کے لیے درخواست دیتا ہے تو وہ اس کے بارے میں دفتر کو ایک ٹیکنیکل رپورٹ بھیجتا ہے۔ یہاں کام یہ ہوتا ہے کہ درخواست پر غور کیا جائے۔ دیکھا جائے کہ وہ ایجاد واقعی قابل عمل ہے۔“

البرٹ ان کی باتوں کو سن ضرور رہا تھا لیکن خاموش تھا۔ اس کے چہرے سے قطعی یہ ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ان سے متفق بھی ہے، کوئی اور ہوتا تو درمیان ہی میں بول پڑتا کہ جناب آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس سے مجھے کامل اتفاق ہے لیکن اس کے چہرے پر تو کوئی تاثرات ہی نہیں تھے۔

ڈائریکٹر جھنجھایا تو ضرور لیکن سفارش مضبوط تھی اور پھر یہ بھی سن چکے تھے کہ امیدوار ایک غیر معمولی سائنس داں ہے۔ اس لیے اس کی عدم توجہی کو نظر انداز کرتے ہوئے دو ٹوک انداز میں پوچھا۔

”جو کچھ میں نے کہا کیا آپ اس کام کو کر سکیں گے؟“

”میں یہ کام توقع سے بڑھ کر کر سکوں گا۔“

”میں آپ کو یہ عہدہ پیش کرنے سے پہلے ایک دو

باتیں اور پوچھنا چاہتا ہوں۔“

البرٹ کا دل زور سے دھڑکا۔ اب ضرور یہ پوچھا جائے گا کہ میں یہودی تو نہیں ہوں۔ جیسے ہی میں کہوں گا میں یہودی ہوں یہ نوکری میرے ہاتھ سے چلی جائے گی لیکن اس کا یہ اندازہ غلط نکلا۔ انہوں نے اس کی شہرت کے متعلق سوال کیا تھا۔

”کیا تم سوئٹزر لینڈ کے شہری ہو۔ میرا مطلب ہے شہرت ہے آپ کے پاس۔“

”جی ہاں جناب میں جرمن نژاد سوئس شہری ہوں۔“

اس نے دستاویز نکال کر ڈائریکٹر کے سامنے رکھ دی۔

”میں آپ کو شروع میں تین ہزار فرانک سالانہ تنخواہ

منزل پر واقع اس کا ٹیکٹ ان ملاقاتوں کا مرکز بن گیا۔ وہ اور اس کے دوست خاموشی سے ان نظریات کی چھان بین کر رہے تھے۔ اس کا اہن ایسی لیبارٹری بن گیا تھا جس میں ہر وقت تجربات ہوتے رہتے تھے۔

اس کے دو بچے ہو گئے تھے۔ وہ ان کی دیکھ بھال میں مصروف ضرور تھا لیکن وہ ایک غائب دماغ سائنس دان تھا جو دنیاوی معاملات میں بے ڈھنگا لیکن سائنسی معاملات میں نڈر اور دھن کا پکا تھا۔ وہ اپنے نظریات میں ایسے خیالات کی تردید کرتا جا رہا تھا جن کو اب تک مقبولیت مل چکی تھی۔ ان مقبول خیالات کے خلاف آواز اٹھانا کوئی مذاق نہیں تھا۔

آخر 1905ء میں دن رات کی انتھک محنت کے بعد اپنے غور و فکر کے نتائج کو کاغذ پر منتقل کر چکا تھا۔ اس رپورٹ میں وہ خیالات درج تھے، جو اس نے خلاء، وقت اور آکات کے متعلق قائم کیے تھے۔ یہی اس کا نظریہ اضافیت تھا جس نے مستقبل میں سائنس کے راستے کو یکسر بدل کر رکھ دیا۔

اس نے کاغذ کے اس پلندے کو ایک بڑے افانے میں بند کیا اور ڈاک خانے پہنچ گیا۔ اس لفافے پر جرمنی کے سائنسی جریدے "انالین ڈرفزک" کا پتا درج تھا۔ اس نے لفافے پر مطلوبہ قیمت کے ٹکٹ لگائے اور لفافہ سپروڈاک کر دیا۔

اس کے نظریات شائع ہوئے تو سارے یورپ کے سائنس دانوں نے اس مقالے کو بڑھا۔ یہ بات عرصے سے طے شدہ تھی کہ روشنی برقیات متناظری شعاعوں پر مبنی ہوتی ہے۔ آئن اسٹائن کے مفروضات نے اس کلاسیکی نظریے کو بری طرح رد کر دیا۔

سائنس دان حیران تھے۔ ایک بالکل جدید نظریہ ان کے سامنے تھا۔ فزکس کی دنیا میں ایک انقلاب برپا ہو گیا تھا۔ حیرت کا یہ حصار ذرا ٹوٹا تو سائنس دانوں کو یہ جاننے کی فکر ہوئی کہ آخر یہ البرٹ سے کون۔ اس نے کس انسٹی ٹیوٹ میں تعلیم حاصل کی ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جس نے اتنا عظیم نظریہ پیش کر دیا اس کا نام اس سے پہلے کسی نے سنا ہی نہیں۔ سائنس دانوں میں سے بہت سوں کو اشتیاق ہو رہا تھا کہ اسے تلاش کیا جائے اور اس سے ملاقات کی جائے۔ برلن یونیورسٹی میں فزکس کے ایک شہرہ آفاق پروفیسر نے بہل کی اور اس سے ملاقات کے لیے طویل مسافت طے کر کے برلن پہنچ گیا۔

پروفیسر اس سے ملاقات کرتے وقت اسی حیرت سے دوچار ہوا جس حیرت کا شکار اس سے ملنے والے ہوا کرتے تھے۔ اس کا لباس بے حد معمولی تھا۔ بال بے ترتیب اور بکھرے ہوئے تھے۔ چہرے پر ابھی تک لڑکپن کے آثار تھے اور سب سے حیرت ناک بات یہ کہ وہ ایک کلرک تھا۔ پروفیسر راستے بھر یہ سوچتا آیا تھا کہ آئن اسٹائن کسی شاندار تجربہ گاہ میں اس کا استقبال کرے گا۔ اس کے جسم پر شاندار کپڑے ہوں گے لیکن اس کا تو گھراتا چھوٹا تھا کہ کسی مہمان کو بٹھا بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے ریسٹوران میں اپنے مہمان سے ملاقات کر رہا تھا۔

اس کے نظریات نے اسے اتنی شہرت دی کہ تھوڑے عرصے بعد ہی اسے یورپ کے عظیم سائنس دانوں کی ایک کانفرنس میں تقریر کرنے کی دعوت دی گئی۔ یہ کانفرنس آسٹریلیا کے شہر سائڈبرگ میں ہونی تھی۔ یہ خیال ہی اس کے لیے پُرسرت تھا کہ وہ سائنس دانوں کے اجتماع میں تقریر کرے گا۔ اس کی زندگی میں یہ پہلا عظیم لمحہ تھا جب اس نے مقررین کے لیے بنائے گئے پلیٹ فارم پر قدم رکھا۔ اس کے جسم پر جھولتا ہوا پرانا کوٹ سب کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ ان میں سے بہت سے زمانے کی ناقدری پر افسوس کر رہے تھے جس نے ایسے عظیم سائنس دان کو اس حال پر رکھا ہوا ہے۔ اس کی تقریر نے سب کو مسحور کر دیا۔

تقریب کے اختتام پر ہر زبان پر ایک ہی سوال تھا۔ وہ اب تک کلرک کیوں ہے۔ یہ نوجوان پولی ٹیکنیک یونیورسٹی کا گریجویٹ ہے۔ اسے تو اسی ادارے میں پروفیسر ہونا چاہیے تھا۔ زیورچ میں نوجوان سڑکوں پر نکل آئے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ اسے پروفیسر مقرر کیا جائے۔

اسے زیورچ یونیورسٹی کی طرف سے پیشکش کی گئی لیکن اس میں شرط یہ رکھی گئی تھی کہ پہلے وہ روانج کے مطابق بطور معاون لیکچرر کام کرے اس کے بعد اسے پروفیسر شپ مل سکتی ہے۔ وہ شاید یہ پیشکش قبول کر لیتا لیکن مشکل یہ تھی کہ معاون پروفیسر کو کوئی تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ دو بچوں کی ذمہ داری اس پر تھی وہ یہ خشک پیشکش کیسے قبول کر سکتا تھا۔

وہ پینٹ دفتر میں بدستور کلرک کی کرتا رہا۔ زیورچ یونیورسٹی اسے ضائع کرنا نہیں چاہتی تھی۔ آخر کچھ عرصہ بعد میں اسے پروفیسر شپ کی باقاعدہ پیشکش کر دی گئی۔ یہ ایسا عہدہ تھا جو برسوں کی محنت کے بعد حاصل ہوتا تھا اور البرٹ آئن اسٹائن ابھی پورے تیس سال کا بھی

نہیں ہوا تھا۔

تھے۔ یہاں طلبہ بھی وہ آتے تھے جنہوں نے سائنس کو اپنا
اوڑھنا بچھونا بنا لیا تھا۔

یہاں اسے وہ علمی ماحول ملا جس کا وہ متلاشی تھا۔ اس
کی بیوی بھی زیورچ سے پرگ کر بہت خوش ہوئی۔ اس
لیے بھی کہ یہاں رومان پرور اور قدرتی مناظر کی بہتات تھی
اور اس لیے بھی کہ اس کا شوہر اب ایک بھاری تنخواہ اس کے
ہاتھ میں دے رہا تھا۔ اس کے برعکس البرٹ کو اپنی تنخواہ کی
کمی بیشی سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ اس لیے خوش تھا کہ
یہاں تحقیقی کام کرنے کے بہت مواقع تھے۔ اس کے
زرخیز ذہن کی ساخت کچھ ایسی تھی کہ وہ کہیں بھی ہو ارد
گرد کی چیزوں کو نظر انداز کر کے مسائل پر غور کر سکتا تھا۔
اپنے نظریات کی خامیاں تلاش کر کے انہیں درست کر سکتا
تھا۔ اس کے غور و فکر کرنے کی عادت ہی اس کی تجربہ گاہ
تھی۔ وہ اپنے خیالات میں غرق رہتا کوئی طالب علم کچھ
پوچھنے کے لیے اسے مخاطب کرتا تو وہ ہرگز ناراض نہ
ہوتا۔ طالب علم کا مسئلہ حل کرنے کے بعد وہ واپس اپنے
خیالوں کی دنیا میں پہنچ جاتا۔

وہ یہاں اتنا خوش تھا کہ اسے یورپ کے دوسرے
حصوں کی یونیورسٹیوں میں بھی پیشکش ہوئی لیکن اس نے
اس جنت کو خیر باد نہیں کہا اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یورپ
کے سیاسی حالات کچھ اچھے نہیں تھے۔

یہ سیاسی حالات گمبھیر ہونا شروع ہو گئے۔ وسطی
یورپ کے سیاسی حالات کا اثر پرگ پر بھی پڑنے لگا۔ پہلی
جنگ عظیم دروازے پر دستک دینے لگی تھی۔ انہی دنوں اس
کے پرانے اسکول فیڈرل پالی ٹیکنیک نے اسے باقاعدہ
پروفیسر کے عہدے کی پیشکش کی۔ اس نے یہ خبر میلو کو بھی
سنائی۔ میلو کی آنکھوں میں چمک آگئی۔

”اس پیش کش سے مجھے خوشی ہوئی ہے۔“

”لیکن مجھے زیورچ واپس جانے کا کوئی جواز نظر نہیں
آتا۔ میں یہاں بہت خوش ہوں۔“

”میں زیورچ کے سوا کہیں خوش نہیں رہوں گی۔“

”یہ بھی تو سوچو ہم کتنی مشکلوں کے بعد یہاں آئے
ہیں۔“

”کچھ بھی ہو۔ جب ایک موقع ملا ہے تو میں زیورچ
جائے بغیر نہیں رہوں گی۔“

وہ ہمیشہ کی جذباتی اور ضدی تھی جو کہہ دیتی تھی وہ کر
کے رہتی تھی۔ البرٹ نے سمجھ لیا کہ اب وہ نہیں مانے گی۔

یہ خیال کہ وہ پروفیسر ہے اس کے لیے قابل فخر نہیں تھا
خوشی تھی تو یہ کہ اب وہ اپنا تمام وقت اپنے پسندیدہ موضوع
فزکس پر صرف کر سکے گا۔

میلو امریش اس کے ساتھ رہتے ہوئے بہت سارے
سخت دن گزار چکی تھی۔ ذرا سی سہولت ملی تو اس نے ہاتھ
پاؤں نکالے۔

”تم اب پروفیسر ہو۔ اس چھوٹے سے مکان میں
رہتے ہوئے کیا اچھے لگو گے۔ کوئی بڑا مکان لو۔“

سماجی زندگی کے ہمراہ چلنے کا اہل نہیں تھا۔ اسے اپنے
سائنسی کاموں کے مقابلے میں ہر کام غیر اہم معلوم ہوتا تھا۔
اس کی بیوی ضد کر رہی تھی کہ وہ نئے سوٹ خریدے۔ اس
طرح کی زندگی گزارے جو دوسرے پروفیسر گزارتے ہیں۔
اسے بڑا مکان بھی لینا پڑا اور بیوی کی خوشنودی کے لیے نئے
سوٹ بھی سلوانے پڑے۔

اس کے دماغ میں اپنے نظریے سے متعلق جو
خیالات پیدا ہو رہے تھے انہیں عملی شکل دینے کے لیے اسے
وقت درکار تھا اور زیورچ یونیورسٹی میں مصروفیت بہت تھی۔

اسے فکر کی کا زمانہ یاد آتا تھا جب اس کے پاس وقت ہی
وقت ہوا کرتا تھا۔ اس کا فلسفہ اضافیت ابھی محض ایک خاکہ
تھا اسے مکمل کرنے کے لیے ابھی بہت وقت درکار تھا۔ وہ

چاہتا تھا اسے تنہا چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ اپنا کام جاری رکھ
سکے۔ اس کی بیوی نے اخراجات اتنے بڑھالے تھے کہ وہ
پریشان رہنے لگا تھا۔ یہ پریشانی اس کے کام پر اثر انداز
ہو رہی تھی۔ دوسری طرف اس کی شہرت معیبت بن گئی تھی۔

اسے مختلف کانفرنسوں میں بلایا جا رہا تھا جہاں اسے تقریریں
کرنی پڑتی تھیں۔ ان تقریروں کی تیاری میں بھی اس کا
بہت سا وقت ضائع ہو جاتا تھا۔ وہ اب سنجیدگی سے سوچنے لگا

تھا کہ دوبارہ اپنی پرانی ملازمت پر چلا جائے جہاں وہ فکر کی
کرتا تھا اور خوش تھا لیکن اس سے پہلے ہی قسمت نے اس
کے دروازے پر دستک دے دی۔ پرگ۔ یونیورسٹی نے

اسے مکمل پروفیسر شپ کی پیشکش کر دی (زیورچ یونیورسٹی
میں وہ معاون پروفیسر تھا) اس عہدے میں معمول کے
فرانٹس سے زیادہ آزادی تھی۔ تنخواہ بھی زیادہ تھی۔ اس نے
اس پیشکش کو قبول کر لیا۔

پرگ یونیورسٹی یورپ کی قدیم ترین یونیورسٹی تھی اور
علم کے ہر شعبے کے نامور ماہرین اس کے عملے میں شامل

نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی تھی۔ والد کی وفات ہو چکی تھی۔ مایا کی شادی ہو چکی تھی لیکن وہ ماں کے ساتھ ہی رہ رہی تھی۔

ماں کا خط آیا تھا جس کے ذریعے اسے یہ تمام تفصیلات معلوم ہوئی تھیں۔ انہوں نے یہ ہدایت بھی کی تھی کہ تمہارے چچا روڈی برلن ہی میں رہتے ہیں ان سے ضرور ملا کرو۔ خط میں ان کا پتا بھی لکھا تھا۔

وہ لاتنا ہی تہائی سے اتنا اکتا چکا تھا کہ اس نے چچا روڈی سے فوراً رابطہ کیا۔ چچا کے لیے یہ خوشی کی بات تھی کہ ان کا بھتیجا برلن آ گیا ہے۔ وہ اس کی شہرت سے بھی خوش تھے۔ انہوں نے ایک رات اسے کھانے کی دعوت دی۔ خاندان کے دوسرے لوگوں کو بھی دعوت دی تاکہ سب سے اس کی ملاقات ہو سکے۔ وہ سب بھی بچپن کے خاموش طبع البرٹ سے ملنے کے مشتاق تھے۔ سب جمع ہو گئے۔ ہرزبان پر اس کی تعریف تھی۔ سب کے سر فخر سے بلند تھے کہ ان کا رشتہ دار اتنا بڑا سائنس دان بن گیا ہے۔

اس کی چچا زاد بہن ایلسا بھی وہیں تھی۔ اس نے بچپن میں اسے دیکھا تھا یا اب دیکھ رہا تھا۔ اب وہ لڑکی سے عورت بن چکی تھی۔ اس کا خاندن مرچکا تھا اور وہ دو چھوٹی بیٹیوں کے ساتھ باپ کے گھر رہ رہی تھی۔ وہ دونوں دیر تک بچپن کی یادوں کو تازہ کرتے رہے۔

بہت دن بعد اس نے وہ کھانے کھائے جو اس کی ماں بنایا کرتی تھی۔ کھانے کے بعد کافی کا دور چلا اور دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ بہت دن بعد ہنسا ہے۔ جب رات گئے وہ وہاں سے رخصت ہوا تو ایلسا اسے دروازے تک چھوڑنے آئی۔

”البرٹ کیا میں اُمید کروں کہ تم دوبارہ بھی آؤ گے۔“

”ایلسا تم جانتی ہو تمہارا البرٹ کہہ کر پکارنا مجھے کتنا اچھا لگا ہے۔ اب تو میں سب کے لیے آئن اسٹائن ہو کر رہ گیا ہوں۔ تم وعدہ کرو کہ ہمیشہ البرٹ کہہ کر پکارو گی تو میں بار بار آیا کروں گا۔“

”البرٹ۔“ وہ صرف اتنا کہہ سکی اور البرٹ نے اس کا ہاتھ تھام کر اسے شب بخیر کہا۔

البرٹ نے اپنا وعدہ یاد رکھا اور جلد ہی چچا روڈی کے گھر پہنچ گیا۔ ایلسا کی آنکھوں میں اپنائیت کی چمک پیدا ہوئی جسے وہ نظر انداز نہ کر سکا۔

البرٹ نے پریگ یونیورسٹی چھوڑ دی اور زیورچ پہلا آیا۔ یہ وہی پرانا اسکول تھا جہاں اسے اسٹنٹ کی اسامی دینے سے بھی انکار کر دیا گیا تھا۔ اب اس کا احترام کیا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں فخر یہ چمک آگئی۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ اس کا دوست مارسل وہیں تھا۔ اسے ایک قابل اعتماد مددگار مل گیا۔ ریاضی کے سوال حل کرنے میں مارسل کی قابل اعتماد صلاحیت کی وجہ سے آئن اسٹائن کی بہت سی محنت بچ گئی۔

پریگ میں قیام کے دوران میں اس نے تفتیق کے مزید نتائج شائع کیے تھے۔ اس نے اس کام کو اور آگے بڑھایا اور ایک اور رپورٹ شائع کی۔

وہ یہاں مطمئن تھا لیکن ابھی اس اطمینان کا ایک ہی سال گزرا تھا کہ اسے برلن میں پروٹیسٹنٹ اکیڈمی آف سائنس کی ممبر شپ کی پیش کش ہوئی۔ وہاں طلبہ کو پڑھانے کے سوا اور کوئی کام نہیں تھا۔ وہ اپنا سارا وقت تحقیق پر لگا سکتا تھا۔ یہ اس کے لیے آئیڈیل صورت حال تھی لیکن میلو نے اس کی خوشی میں زہر گھول دو۔ وہ زیورچ چھوڑنے پر تیار نہیں تھی۔

”میری آئندہ ترقی کے لیے بھی نہیں۔“
”مجھے اپنی خوشی عزیز ہے۔ تمہیں جانا ہے تو چلے جاؤ۔“

”تمہارے بغیر۔“
”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

اس کی تلخ مزاجی نے البرٹ کو کچھ اور کہنے کا موقع نہیں دیا۔

وہ اکیلا روانہ ہو گیا۔

برلن پہنچ کر اس نے ایک کمرہ کرائے پر لیا جو برلن یونیورسٹی کے قریب ہی تھا۔ یونیورسٹی کے حکام نے اسے خوش آمدید کہا۔ وہ پہلا دن ضائع کیے بغیر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

میلو اور بچوں کے بغیر رہنا دشوار تھا۔ اس نے اس کا علاج یہ ڈھونڈا کہ خود کو بے انتہا مصروف کر لیا۔ کوئی لمحہ ایسا چھوڑا ہی نہیں کہ بیوی بچوں کو یاد کر سکے۔ وہ اپنی طرف سے بالکل ہی غافل ہو گیا۔ اب اس کے پاس ثانی پانچھنے، ہیٹ پہننے یا بال ترشوانے جیسی فضول باتوں کے لیے وقت ہی نہیں تھا۔

اس کی ذاتی زندگی میں کئی انقلاب آچکے تھے۔ اس

”تمہیں یاد ہے چچا روڈی نے کہا تھا صرف ذہین طلبہ ہی پروانسر بنتے ہیں۔ اس وقت انہیں میری ذہانت پر شک تھا۔“

”تم نے واقعی سب کی زبانیں بند کر دیں۔“
”تمہیں وہ بھی یاد ہو گا کہ جب ہم پنک پر گئے ہوئے تھے۔ تم خوب کھیل رہی تھیں اور میں چپ چاپ ہندی کی لہریں گن رہا تھا۔ چچا نے تمہاری مثال دے کر میری تنہائی کی طرف اشارہ کیا تھا۔“

”ہاں یاد ہے۔ وقت ایسا بدلا کہ ہم دونوں ہی تنہا ہو گئے۔ گھر کی خوشی نہ تمہیں ملی نہ مجھے۔“ ایلسا کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

”ارے میں نے تمہیں ادا اس کر دیا۔“ البرٹ نے آگے بڑھ کر اس کے آنسو پونچھے۔ ”ہم بہت جلد پنک پر جائیں گے اور ہم دونوں بچوں کی طرح کھیلیں گے۔ چلو اب تو بس دو۔“

وہ کھل کھلا کر ہنس پڑی۔
”اس نے چچا سے کہہ کر پنک کا پروگرام بنایا اور واقعی ایلسا کے ساتھ اس طرح کھیلتا پھر جیسے بچپن لوٹ آیا ہو۔“

وہ پابندی سے چچا کے گھر جانے لگا تھا۔ ایلسا نے ضد کر کے اس سے اس بات پر رضامند کر لیا کہ وہ اپنا ہر کھانا یہیں کھایا کرے گا۔ اس قربت نے ایلسا کو اس کے مزید قریب کر دیا۔ اچھے کھانوں نے اس کی صحت، بڑے اچھے اثرات مرتب کیے۔ وہ اپنی غذا کی طرف بہت کم دھیان دیتا تھا لیکن اب ایلسا اسے بچہ تصور کر کے زبردستی کھلاتی تھی۔ وہ کوشش کرتی تھی کہ وہ اچھا اور موزوں لباس پہنا کرے خاص طور پر اس وقت جب وہ کسی تقریب میں شرکت کرے یا کسی اہم شخصیت سے ملنے جایا کرے لیکن وہ ایسا بے پروا تھا کہ پھر بھی بغیر پالش کے جوتوں کے ساتھ ہی تقریبات میں پہنچ جاتا تھا۔

ایلسا کی محبت اور توجہ نے اس کی عادتوں میں خاطر خواہ تبدیلیاں پیدا کر دی تھیں۔ وہ میلو اور ایلسا کے درمیان موازنہ بھی کرنے لگا تھا لیکن اپنا زیادہ وقت ان خیالوں پر ضائع نہیں کر سکتا تھا۔ اس کی زیادہ تر کوششیں تحقیق پر مرکوز تھیں۔ اس نے ایک سال کے اندر اندر اپنے فلسفہٴ اضافیت کے متعلق ایک اور مقالہ ترتیب دے لیا۔ یہ مقالہ زیادہ بیجان انگیز ثابت ہوتا لیکن جب تک اس کا وقت آتا

جرمنی نے فرانس اور بیلجیئم پر حملہ کر دیا اور پہلی جنگ عظیم شروع ہو گئی۔ اس کی ساری سرگرمیاں ماند پڑ گئیں۔ حالات غیر یقینی ہوتے جا رہے تھے۔ وہ گھنٹوں بیٹھ کر جنگی معاملات پر بحثیں کیا کرتا تھا۔ تمام مجلسی سرگرمیاں بند کر دی تھیں۔ زیادہ وقت ایلسا کے ساتھ گزرتا تھا۔ اب وہ اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ ایلسا اس کی مزاج داں ہے۔ ایک دن اس کے دل میں دبا ہوا سوال اس کے ہونٹوں پر آ ہی گیا۔

”ایلسا مجھ سے شادی کرو گی؟“

”میں تمہارے لائق نہیں ہوں۔ تم اپنی خدمت کا موقع دو یہی بہت ہے۔“

”یہ خدمت تو شادی کے بعد بھی کر سکتی ہو بلکہ زیادہ بہتر طریقے سے کرو گی۔“

”میں تو انکار کی جرأت بھی نہیں کر سکتی۔“

”میں چچا روڈی سے بات کر لوں گا۔“

اس نے اپنی بہن مایا کو خط لکھا اور مایا نے چچا کو خط لکھ کر انہیں راضی کر لیا۔ اس نے ایلسا سے شادی کر لی۔ اس کی دونوں لڑکیاں بھی اس کی سرپرستی میں آ گئیں۔

جنگ زور و شور سے جاری تھی۔ جنگ شروع کرنے کا الزام جرمنی پر آ رہا تھا۔ جنگ اس الزام کو دھونے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے لیے سرکردہ جرمنوں نے دانش وروں، فنکاروں اور سائنس دانوں کو جمع کر کے ان سے ایک بیان پر دستخط کرا لیے۔ اس بیان میں جرمنی کے فوجی اقدامات کو جائز قرار دیا گیا تھا۔ جب یہ بیان آئن اسٹائن کے پاس آیا تو اس نے دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔

حکام کو اس سے یہ توقع نہیں تھی۔ وہ تو یہ سمجھ رہے تھے کہ دنیا کا عظیم سائنس داں ان کے ساتھ ہے لیکن وہ جنگ کو خلاف انسانیت سمجھتا تھا پھر اسے جائز کیسے قرار دے سکتا تھا۔ اس کے اس جرأت مندانہ اقدام نے جرمنی کو دہلا کر رکھ دیا۔ وہ شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔

سوئزر لینڈ کے شہری خوش تھے کہ وہ ان کا ہے۔ اس کے پاس سوئس شہریت تھی۔

☆.....☆

البرٹ کی دوسری تھیوری شائع ہو چکی تھی۔ اس کے نظریات رائج سائنسی نظریات سے اس قدر مختلف تھے کہ بہت سے سائنس داں اس کے نظریات کو درست مانتے ہوئے بھی عملی ثبوت چاہتے تھے۔ عملی ثبوت یہ تھا کہ آفتاب

کی طرح نظر آنے والے ستارے اپنے اصلی محور سے قدرے ادھر ادھر نظر آنے چاہیے تھے لیکن آفتاب کے چمک دار سرے کے اتنے نزدیک ہونے کی وجہ سے انہیں کیسے دیکھا جاسکتا تھا۔ یہی ہو سکتا تھا کہ پورے سورج گہن کا انتظار کیا جائے۔ آفتاب کی تیز روشنی کے ہٹ جانے کی وجہ سے تاریک آسمان پر یہ ستارے دیکھے جاسکتے تھے۔

1918ء میں جنگ ختم ہو چکی تھی۔ اس کے اگلے سال سورج کو مکمل گہن لگا۔ اس سے پہلے انگلینڈ کی رائل سوسائٹی نے اس گہن کا مشاہدہ کرنے کے لیے ماہرین سیارگان کو افریقا و برازیل کی طرف بھیجا تا کہ گہن کے دوران میں آسمان کی تصویریں لی جاسکیں۔ گہن پندرہ منٹ ہی رہا جہاں ماہرین نے اس قلیل عرصے میں سیکڑوں تصاویر بنالیں۔

ان تصاویر نے ثبوت فراہم کر دیا کہ اس کا نظریہ اضافیت درست تھا۔ آفتاب سیاہ مکیہ کا منظر پیش کر رہا تھا اور اس کے گرد روشنی کا ہالہ تھا۔ یہی وہ ستارے تھے جو ادھر ادھر بکھرے ہوئے تھے۔ تمام دنیا کے سائنس دانوں نے اس کے نظریے کو

درست تسلیم کر لیا۔ اخبارات اس کے بارے میں خبریں چھاپنے لگے۔ اس کی شہرت آسمان کو چھو رہی تھی۔ بچوں کے نام اس کے نام پر رکھے جانے لگے۔ سٹار تیار کرنے والے ایک ادارے نے اپنے سٹار کا نام ہی اضافیت رکھ دیا۔ دنیا بھر سے لیکچر دینے کے لیے اسے دعوت نامے موصول ہونے لگے۔ خطوط کے بھرے ہوئے تھیلے اس کے نام آنے لگے۔

شہرت آئن اسٹائن کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ اس کے شب و روز میں کوئی بھی تبدیلی نہ آئی۔ وہ اس تماشے کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے یہ سب تعریفیں کسی دوسرے شخص کے لیے ہیں۔ اس نے بھی یہ نہ چاہا کہ اسے اہم ہستی سمجھا جائے۔

وہ تو یہ بھی بھول جاتا تھا کہ اسے کہاں سے دعوت نامہ آیا ہے اور اسے کب جانا ہے۔ پیرس کی رسد گاہ نے اسے دنیا کے ممتاز ترین سائنس دانوں کے سامنے تقریر کرنے کی دعوت دی تو وہ دعوت نامہ میز کی دراز میں رکھ کر بھول گیا۔ ایسا ایسی باتیں خوب یاد رکھتی تھی۔ اس نے ایک دن پہلے اسے یاد دلایا۔ اس نے بے توجہی سے سنا اور دوسرے دن خاموشی سے اسٹیشن پہنچ گیا۔ ریل کے تیسرے درجے میں بیٹھ کر گیا اور پیرس کے ریلوے اسٹیشن پر اتر کر

فروری 2015ء..... ماہِ محبت کا چھوٹا انداز

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ
سیرہ دلچسپ
ماہنامہ سیرہ دلچسپ

مزید
خطوط کی محفل
محفل شہر و سخن
اور
ملک سندر حیات کی تہنیں

برعکس

جب رفاقتیں رسوائیوں کا لبادہ اوڑھ لیں تو زندگی عجب دورا ہے پر آکھڑی ہوتی ہے۔ آخری صفحات پر کاشف زبیر کا دلچسپ شاہکار

درماندہ عشق

مذبح کے باورق سے ایک لوریادگار داستان..... الیاس سیتا پوری کا سحر انگیز انداز

سودائے جنوں

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کے قلم سے ملت اسلامیہ کے مہم ارادوں اور دشمنان اسلام کی سازشوں کا عبرت ناک انجام

ماروی

ایک، اتار اور سو بیمار..... محاورہ کے رد و بدل کے ساتھ دو محبوب کی بے ہوشیوں کا احوال۔ محی الدین نواب کے خیالات کی روانی

منظر امامہ، تنویر ریاض، سلیم انور اور
ڈاکٹر شبیر شامسید کی دلچسپ کہانیاں

اس کی جلدارہ

فروری 2015ء

45

ماہنامہ سرگزشت

تھی جو یہ سمجھ بھی نہیں سکتے ہوں گے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ وہ تو بس اس عظیم انسان کو دیکھنے چلے آئے تھے۔

ہٹلر کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد اس کا جرمنی میں رہنا دو بھر ہو گیا تھا۔ کیوں کہ وہ یہودی تھا۔ اس کو فٹ سے بچنے کے لیے وہ طویل دورے کرتا رہا تھا لیکن کب تک!

وہ ہمیشہ سے جمہوریت کا حامی اور آمریت کا دشمن رہا تھا۔ اسی لیے امریکا کا مداح تھا۔ اب جو اپنے ملک میں سیاسی آمریت کا دور دورہ ہوا تو اس نے امریکا کو اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہا۔ ایسا تو اس کے حکم کے تابع تھی۔ جو وہ کہتا تھا اسے کوئی اعتراض نہیں تھا اور پھر امریکا کا دورہ تو اس کے لیے بھی دل خوش کن تھا۔

اس کی طرف سے اجازت ملتے ہی آئن اسٹائن نے خط کتابت کے ذریعے حکومت امریکا سے اس دورے کی اجازت لے لی۔ تیاری مکمل ہونے کے بعد دونوں میاں بیوی پانی کے جہاز کے ذریعے امریکا کے لیے روانہ ہو گئے۔

اس کی بے پناہ مقبولیت نے اس کے دورے کو خفیہ نہیں رہنے دیا تھا۔ نیویارک میں اس کی آمد کے اشتہار لگ گئے تھے اور اس کے استقبال کی تیاریاں کی جا رہی تھیں۔ وہ لہریں گننے کا ہمیشہ سے عادی تھا۔ جہاز کے عرشے پر کھڑے ہو کر تو اسے یہ موقع خوب ملا۔ ایسا بھی اس کی دل جوئی کے لیے اس کے ساتھ کھڑی رہتی ورنہ اسے کیمپن میں رہنا زیادہ پسند تھا۔ زیادہ دیر تک سمندر پر نظریں جمائے رکھنے سے اس کا سر چکرانے لگتا تھا۔

پکتان نے اسے بتایا کہ جناب اب ہمارا جہاز خلیج نیویارک میں سفر کر رہا ہے اور بہت جلد ساحل پر ہوگا۔ ”جناب! اخباری نمائندے جہاز کے عرشے پر ہی آپ سے ملاقات کریں گے اور آپ سے گفتگو کریں گے آپ تیار رہیں۔“

آئن اسٹائن اس قسم کی ملاقاتوں سے بہت گھبراتا تھا لیکن وہ انکار بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے رضا مندی ظاہر کر دی۔ پکتان نے عرشے کے ایک حصے میں رسیاں باندھ کر ایک جگہ بنا دی تاکہ اخباری نمائندے وہاں بیٹھ سکیں۔ ساحل نے جہاز کا منہ چوما۔ جہاز نظر انداز ہو گیا۔ رپورٹراڈورنو ٹوگرافر جہاز پر چڑھ آئے۔ کیمروں کی روشنیاں حرکت میں آئیں وہ فوٹوگرافروں کی ہدایت پر عمل کرتا رہا۔ بڑے لوگوں کی طرح اس کے چہرے پر بیزارگی نہیں تھی۔ وہ

بیدل ہی طویل فاصلے طے کر کے رسد گاہ پہنچ گیا۔ استقبالی کمیٹی کے ارکان اسے فرسٹ کلاس میں اڈھونڈتے رہے۔ اس پائے کا سائنس داں تیسرے درجے میں سفر کرے گا نہیں یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ اتنی شہرت کے باوجود اتنی عاجزی، یہ تھا البرٹ آئن اسٹائن۔

پوری دنیا کی توجہ اس پر لگی ہوئی تھی اور وہ ایک چھوٹے سے کمرے میں کتابوں کے درمیان خاموشی سے زندگی بسر کر رہا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اب بھی لمبی سیر پر نکلتا تھا۔ اس کے سرخ چہرے اور سر پر بکھرے ہوئے بالوں کے گچھے کو اس وقت تک سب جان چکے تھے۔

یہ سب اپنی جگہ لیکن جرمنی میں یہودیوں کے خلاف جذبات بھڑکنے جا رہے تھے۔ چند جرمن سائنس دانوں نے تو اس کے نظریہ اضافیت کو یہودی فلسفہ کہنا شروع کر دیا کیوں کہ آئن اسٹائن یہودی تھا۔ اسے ان کی اس حرکت پر سخت دکھ ہوا۔ اس لیے نہیں کہ اس کے نظریے کو غلط قرار دیا جا رہا تھا بلکہ اسے سائنس دانوں کی ذہنیت پر افسوس ہو رہا تھا جو سائنس کو بھی مذہب کے خانوں میں بانٹ رہے تھے۔ اس نے اس تکلیف کا ازالہ بیرونی دوروں سے کیا۔ وہ جرمنی سے باہر دوروں کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ وہ جس طرف نکل جاتا۔ اس کے پیچھے سننے کے لیے لوگوں کی بھیڑ لگ جاتی۔ اسے وہ سن بچش تسکین مل رہی تھی۔ اس کے ملک میں جو ناخوشگوار ماحول پرورش پا رہا تھا اس سے کچھ وقت کے لیے اسے چھٹکارا مل گیا۔

انہی دوروں کے دوران میں وہ ایک خاص لیکچر دینے کے لیے پرگ یونیورسٹی گیا جہاں وہ کسی زمانے میں پروفیسر رہ چکا تھا۔ وہ جہاں جاتا تھا لوگوں کی ایک بڑی تعداد اسے دیکھنے کے لیے جمع ہو جاتی تھی اس لیے اس کی آمد کو خفیہ رکھا گیا تھا۔ صرف پروفیسر فلپ ٹراک تھے جو اسے لینے اسٹیشن گئے تھے۔ وہ راستے بھر یہ سوچ رہے تھے کہ عالمی شہرت نے آئن اسٹائن کو بہت کچھ بدلوایا گیا ہو گا۔ اس کی سادگی رخصت ہو چکی ہوگی لیکن جب آئن اسٹائن نے ریل کے ڈبے سے نیچے قدم رکھا تو پروفیسر کو سخت حیرت ہوئی۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا تھا۔ لیکن آلود اور کوٹ اور چمکا ہوا ہیٹ پہنے جو شخص گاڑی سے اترا وہ کسی طور پر بین الاقوامی شخصیت کا مالک دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

اس رات وہ تقریر کرنے کے لیے آڈینوریم میں پہنچا تو آڈینوریم کچھ بھرا ہوا تھا۔ ان میں سے اکثریت ان کی

اس طرح خوش و خرم دکھائی دے رہا تھا جیسے اپنے جیسے لوگوں کے درمیان آگیا ہو۔

فوٹو سیشن مکمل ہونے کے بعد رپورٹر حضرات آگے بڑھے اور سوال پر سوال پوچھنے لگے۔ آئن اسٹائن خوش اخلاقی سے ہر سوال کا جواب دے رہا تھا۔

اس کا انٹرویو ختم ہوا تو نامہ نگار ایلسا کی طرف متوجہ ہوئے۔ ایلسا اس کے ساتھ جہاں بھی جاتی تھی ایک ہی قسم کے سوالات پوچھے جاتے تھے۔ لہذا اب وہ بھی ان سوالوں کی عادی ہو گئی تھی۔ زیادہ تر سوالات آئن اسٹائن کی عادات و اطوار اور ایسا کے ساتھ اس کے تعلقات اور گھریلو زندگی کے بارے میں ہوا کرتے تھے۔ یہاں بھی وہی سوالات پوچھے گئے۔ وہ مسکرا مسکرا کر جواب دیتی رہی۔

انٹرویو ختم ہوا تو وہ دونوں کچھ دیر کے لیے اپنے کیمپن میں چلے گئے اور پھر وہ جہاز سے نچے اتر گئے۔ ایک سرکاری وفد اس کے استقبال کے لیے تیار کھڑا تھا۔ اسے اور ایلسا کو بغیر چھت والی ایک بڑی کار میں بٹھا دیا گیا۔

آئن اسٹائن کی کار کے پیچھے پیچھے کاروں کا ایک کارواں سٹی ہال کی طرف روانہ ہوا۔ اسے اپنی مقبولیت کا اندازہ نہیں تھا لیکن ایلسا جانتی تھی کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ لوگوں کا جوش و خروش دیدنی ہوگا۔ یہی ہوا بھی۔ شہر میں داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا سڑکوں پر لوگوں کا بھاری جھوم تھا۔ وہ سب آئن اسٹائن زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے اور ہاتھ ہلا رہے تھے۔ ایلسا نے آئن اسٹائن کو کار میں کھڑے ہونے کے لیے کہا۔ کار کھلی چھت کی تھی لہذا وہ کھڑا ہو گیا اور بازو لہرا لہرا کر نعروں کا جواب دینے لگا۔ فلک بوس عمارتوں کی کھڑکیوں میں لوگ کھڑے تھے۔ ہر آنکھ اسے دیکھنے کی مشاق تھی۔ کچھ لوگ اس کی کار کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے۔ دیوانہ وار بیخ بیخ کر اسے مخاطب کر رہے تھے۔ سٹی ہال تک پہنچنے میں اسے بہت دیر لگ گئی تھی۔ سڑکوں کے دونوں طرف لوگ ہی لوگ تھے۔ سٹی ہال میں میسر نے اس کا استقبال کیا اور شہر کی گنجی پیش کی۔

اس کے بعد دعوتوں اور تقاریب کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ واشنگٹن گیا تو صدر دارن ہارڈنگ نے وہاں ہاؤس میں اس کا استقبال کیا۔

اس نے اس دورے میں پرنسٹن، ہارورڈ اور کولمبیا یونیورسٹی میں لیکچر دیے۔

چھ ہفتوں کا یہ دورہ انہی مصروفیات میں گزر گیا۔ جس

ماہنامہ سرگزشت

دن اسے روانہ ہونا تھا اس سے ایک رات پہلے نیویارک کے ہوٹل ایسٹر میں وسیع پیمانے پر ڈنکا اہتمام کیا گیا۔ یہاں سے انہیں لندن جا کر کننگز کالج میں تقریر کرنی تھی۔ وہ جہاز میں بیٹھا تو یہ خیال اس کے دل میں جاگزیں ہو گیا تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو امریکا اس کی بہترین پناہ گاہ بنے گا۔ امریکا سے یہودی کہہ کر طعنہ نہیں دے گا۔

وہ امریکا کی گراں قدر آزادی کا تحفہ اپنے ساتھ لے کر جا رہا تھا۔

وہ لندن پہنچا تو رڈ رائس کار اس کی منتظر تھی جو اس کے میزبان لارڈ ہالڈین نے بھیجی تھی۔ باوردی ڈرائیور نے دروازہ کھولا اور وہ دونوں اس میں بیٹھ گئے۔ یہ کار کچھ فاصلہ طے کر کے ایک خوب صورت بنگلے میں داخل ہو گئی۔ گاڑی رکتے ہی کئی ملازم ایک ساتھ دوڑے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ وہ دونوں باہر آئے۔ آئن اسٹائن نے اپنا سامان اتارنے کے لیے ہاتھ بڑھایا لیکن ملازمین پہلے ہی سامان اتار چکے تھے اور لے کر کسی طرف جا بھی چکے تھے۔ لارڈ ہالڈین رسمی استقبال کے لیے آچکے تھے۔

”آپ اور مادام کچھ دیر آرام کر لیں۔ ڈنر پر ملاقات ہوگی۔“

ملازموں نے انہیں راستہ دکھایا اور وہ دونوں محرابوں اور راہداریوں سے گزرتے ہوئے ایک کمرے کے سامنے پہنچ گئے۔ چابی سے دروازہ کھولا اور ہٹ کر کھڑا ہو گیا تاکہ وہ پہلے داخل ہوں۔ وہ ابھی تک اتنا سیدھا اور پرعیش زندگی سے ایسا ناواقف تھا کہ خواب گاہ کو ہال روم سمجھ کر ایلسا سے کہنے لگا۔ شاید یہ ملازم غلطی سے ہمیں یہاں لے آیا ہے۔ کوئی خواب گاہ اتنی وسیع بھی ہو سکتی ہے یہ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس اس وقت ہوا جب اس نے اپنا سامان کمرے کے وسط میں پڑا دیکھا۔ ملازم غلطی سے یہاں نہیں لے آیا ہے بلکہ اسے یہیں آرام کرنا ہے۔ پھر شاندار فرنیچر اور وسیع و عریض بیڈ پر نظر پڑی۔ وہ اپنی جھینپ مٹانے کے لیے ایک صوفے میں جھنس گیا۔ ملازم حکم کے منتظر تھے۔ صندوقوں سے سامان ابھی باہر نکالنا تھا۔

”یہ کیا مصیبت ہے۔ ان ملازموں کو باہر نکالو۔ میں انہیں زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتا۔“ البرٹ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔ ایلسا اس کی اس بڑبڑاہٹ کو خوب سمجھتی تھی۔

”ہم تمہیں بعد میں بلا لیں گے۔ فی الحال تمہارا کوئی

فروری 2015ء

47

کام نہیں۔“ ایسا نے ملازموں سے کہا۔

ملازموں نے تسلیم کے لیے سر جھکایا اور کمرے سے نکل گئے۔

اس کے اعزاز میں ڈنکا اہتمام کیا گیا تھا۔ اس تقریب میں برہانہ کی تقریباً تمام اہم شخصیات شریک تھیں۔ اس تقریب میں سارے وقت اس کے نظریہ اضافیت پر باتیں ہوتی رہیں۔ یہ ایسا پیچیدہ نظریہ تھا کہ وہاں بیٹھا ہوا کوئی شخص اسے سمجھنے کا پوری طرح الما نہیں تھا۔ ہر شخص یہی ظاہر کر رہا تھا کہ وہ اس کے کچھ حصے کو سمجھتا ہے۔ آئن اسٹائن کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیوں کہ ان میں سے کوئی بھی سائنس داں نہیں تھا۔

اگلی شام اسے کنگز کالج میں لیکچر دینا تھا۔

لیکچر ہال کھپا کھچ بھر تو گیا تھا لیکن تنظیمین خوف زدہ تھے کہ کہیں کوئی بد نظمی نہ ہو جائے۔ ان کی توقع سے زیادہ لوگ آگئے تھے اور یہی بات باعث تشویش تھی۔ ان لوگوں کو نظریہ اضافیت سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔ یہ یقیناً کوئی گڑبڑ کرنے آئے ہیں کیوں کہ آئن اسٹائن جرمن ہے۔ برطانیہ ابھی تک جرمنی کے ساتھ جنگ کو بھولا نہیں ہے۔ وہ اپنی سرزمین پر ایک جرمن سائنس داں کو ہرگز برداشت نہیں کریں گے۔ تنظیمین کو اب احساس ہو رہا تھا کہ انہوں نے آئن اسٹائن کو مدعو کر کے غلطی کی ہے۔ برطانوی عوام کے دلوں میں جرمنی کے خلاف نفرت ہے۔ کہیں یہ معزز مہمان اس نفرت کا نشانہ نہ بن جائے۔

آئن اسٹائن و برطانوی عوام کے مخالفانہ جذبات کا احساس تھا۔ اسے ایسے الفاظ کا چناؤ کرنا تھا جن سے وہ برطانوی عوام کی سرد مہری دور کر سکے۔

اس نے اپنی تقریر کا آغاز نیوٹن کو خراج عقیدت پیش کرنے سے کیا۔

”مجھے اس ملک میں آ کر تقریر کرنے سے خوشی ہو رہی ہے جس ملک نے دنیا کو عظیم ترین سائنس داں دیا۔“

نیوٹن کی تعریف میں الفاظ خرچ کرنے کے بعد اس نے یہ فلسفہ سمجھایا کہ سائنس ملکی حدود سے تعلق نہیں رکھتی۔ وہ سب کے لیے ہوتی ہے۔ سائنس داں کا تعلق کسی ملک و مذہب سے نہیں ہوتا۔ سائنس انسانوں کی بھلائی کے لیے ہے چاہے وہ کہیں کے بھی ہوں۔

حاضرین میں کاپلی ہوئی بے زاری، بے دلی اور سرد مہری رفتہ رفتہ کم ہونے لگی۔ اس کے بعد آئن اسٹائن نے جو

کچھ کہا لوگوں نے سنا اور خوب تالیاں بجائیں۔

آئن اسٹائن نے ان کے ہم وطن نیوٹن کو خراج عقیدت پیش کیا تھا وہ اس کا استقبال کر رہے تھے۔ یہ خیال کہیں بھی نہیں تھا کہ کون جرمن ہے اور کون انگریز۔ ایک طرف سائنس داں تھا دوسری طرف سائنس داں کے پرستار۔

ان ہیجان انگیز دوروں کے بعد انہیں برلن اپنے گھر کی طرف لوٹنا تھا۔ انہوں نے ایک مرتبہ پھر دوبارہ انگلستان کو عبور کیا۔

وہ باہر کی روشنی سے وطن کے اندھیروں میں داخل ہوا تو آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل نہیں تھیں۔ جنگ کے بعد کی تباہ کاریاں عریاں ہو کر سامنے آگئی تھیں۔ ہر طرف بے کاری کا عفریت منہ کھولے کھڑا تھا۔ یہودی خاص طور پر نشانہ بن رہے تھے۔ وہ تو عالمی شہرت یافتہ باعزت سائنس داں تھا۔ اس صورت حال سے بجا ہوا تھا لیکن اپنے ہم قوموں کے ساتھ ناروا سلوک دیکھ کر تڑپ اٹھا۔ وہ ان کی مدد کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے یہودیوں کے لیے چندہ جمع کرنے کا کام شروع کر دیا۔ جو تنظیمیں فلاح یہود کے لیے پیش پیش تھیں۔ وہ اپنا منصب بھول کر ان کی تقاریب میں شریک ہونے لگا۔ اس کی شخصیت کے باعث بڑے بڑے ہجوم اکٹھے ہونے لگے۔ وہ یہ کام قصبہ قصبہ پھر کر رہا تھا۔ اس کی ان کوششوں کو دیکھ کر جرمن اس کے خلاف ہو گئے۔ اسے متعصب کہا جانے لگا۔ کچھ دنوں سے دھمکی آمیز خطوط بھی ملنے لگے تھے۔ اس کے لیکچروں کے دوران اس کے خلاف نعرے لگنے لگے۔ وہ جب امریکا اور برطانیہ میں اپنی پذیرائی سے اپنی موجودہ حالت کا موازنہ کرتا تو سخت تکلیف ہوتی۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ اس کے وطن نے اسے کیا دیا۔

اس روز وہ کسی تقریب میں شرکت کر کے گھر واپس آیا تھا۔ بہت تھکا ہوا اور نڈھال۔ ایسا اس کی یہ حالت نظر انداز نہ کر سکی۔ وہ یہی سمجھی تھی کہ اس کی طبیعت خراب ہے لیکن جب پوچھنے پر اسے بے تماشائیت سے دیکھا تو اسے تشویش ہوئی۔ نہیں البرٹ کا دماغ تو نہیں چل گیا۔

”کیا بات ہے البرٹ، اس طرح کیوں نہیں رہے ہو۔“

”اپنی حالت پر ہنسوں نہیں تو کیا کروں۔ لوگ اب سائنس داں کو یہودی اور غیر یہودی کے خانوں میں بانٹ

خوشی تھی کہ وہ اس ملک میں آزادانہ گھوم سکتا ہے۔ کوئی اسے یہودی ہونے کا طعنہ نہیں دے سکتا۔

کئی ہفتوں کے دورے کے بعد اس نے یہ ملک چھوڑا تو نشانوں اور تمغوں سے بھرے صندوق اور یہاں کی رقمیں یادیں اس کے ساتھ تھیں۔ یہاں سے وہ فلسطین گیا۔

اسی دورے کے دوران میں اس تک یہ خبر پہنچائی گئی کہ سویڈش اکیڈمی آف سائنس نے اسے فزکس کے لیے اس کی خدمات کو مد نظر رکھتے ہوئے نوبل انعام دیا ہے۔

جنگ کے بعد کسی جرمن باشندے کو ملنے والا یہ پہلا نوبل پرائز تھا۔ یہ انعام جنگ عظیم میں کھست کے لگنے والے زخموں کا ازالہ بن گیا۔ محرمیوں کو تسکین ملی۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ یہ بھول گئے کہ آئن اسٹائن یہودی ہے۔ اب وہ ان کے لیے صرف جرمن باشندہ تھا جسے نوبل انعام ملا تھا۔

اس نے ایک اور سفر کیا۔ اس بار وہ سویڈن کے بادشاہ سے نوبل پرائز لینے گیا۔ یہ وہ اعزاز تھا جس کی کوئی قیمت نہیں لیکن اس کے ساتھ چالیس ہزار ڈالر کا نقد انعام بھی ملا۔ کوئی اور ہوتا تو اس رقم سے وہ اپنی زندگی مزید رقمیں بنا لیتا لیکن وہ آئن اسٹائن تھا۔ اس کی ضروریات بہت کم اور اس کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ اسے اتنی بڑی رقم ملنے کی ذرا بھی خوشی نہیں ہوئی۔ اس نے یہ تمام رقم اپنی مطلقہ بیوی میلو امریش کو سوسٹری لینڈ بھجوا دی تاکہ اس کے لڑکوں کی تعلیم پر خرچ کی جاسکے۔

وہ اب اس اطمینان کے ساتھ وطن واپس آیا کہ اب برلن میں اس کے خلاف اٹھنے والی آوازیں دم توڑ دیں گی اور وہ کسی مداخلت کے بغیر اپنا کام کر سکے گا۔ اس کے ذہن نے نظر یہ اضافیت سے متعلق کچھ اور اضافے تخلیق کر لیے تھے۔ وہ برلن پہنچ کر اپنے کام میں مشغول ہو جانا چاہتا تھا۔

وہ برلن پہنچ کر پوری تندہی سے اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ اب جرمنی میں رہتے ہوئے وہ جرمنوں سے محفوظ تھا۔ اس کی عالم گیر شہرت نے جرمنوں کو مسحور کر دیا تھا۔ وہ یہ دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے تھے کہ محض اس کی وجہ سے برلن یونیورسٹی ساحوں کی دلچسپی کا مرکز بن گئی ہے۔ سیر و سیاحت کے لیے جو بھی برلن آتا وہ برلن یونیورسٹی ضرور جاتا کہ اس مشہور سائنس دان کی ایک جھلک دیکھ سکیں۔ کچھ تو یہ بھی جسارت کرتے تھے کہ اسے طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے

رہے ہیں۔ میرے کام سے انہیں کوئی غرض نہیں۔ وہ مجھے صرف یہودی سمجھتے ہیں۔ حد ہوگئی۔ انہوں نے میرے لیکچر کے دوران میں ایسی گڑبڑ پھیلائی کہ میں لیکچر ادھورا چھوڑ کر آ گیا۔ میں بہت اہم بات کرنے والا تھا اور نہ رسکا۔

”البرٹ یہ ہنسنے کی بات نہیں۔ تمہاری جان کو سخت خطرہ ہے۔ تم اب ہائل قندی کے لیے اکیلے نہ لٹا کرو۔“

”اگر انہوں نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو وہ میرا نہیں اپنا نقصان کریں گے۔“

”میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتی۔ کچھ دنوں کے لیے اس زہریلے ماحول سے باہر نکل جاؤ۔“

اس روز وہ لیساکے ساتھ پچاروڈی کے گھر گیا تو وہ سب بھی اس کی طرف سے فکر مند تھے۔ سب یہی مشورہ دے رہے تھے کہ وہ کچھ دنوں کے لیے برلن چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے۔

”مجھے جاپان سے خطوط آتے رہے ہیں لیکن میں اب تک وہاں جانے سے گریز کرتا رہا ہوں۔ میں سمجھتا تھا یہاں میری زیادہ ضرورت ہے۔“

”البرٹ اب تم اپنے فیصلے پر نظر ثانی کرو۔ ہم کچھ عرصہ بعد اپنے وطن لوٹیں گے تو ہاں کوئی نہ کوئی تبدیلی ضرور آچکی ہوگی۔ کم از کم یہ تو ہوگا کہ لوگ تمہیں بھول چکے ہوں گے۔“

البرٹ آئن اسٹائن نے جاپان میں متعدد لیکچر دینا منظور کر لیا۔ اس نے جرمنی کو الوداع کہا اور جاپان پہنچ گیا۔ اس کی وہی پذیرائی ہوئی جس کا وہ مستحق تھا۔ اس کے جاپان پہنچنے کے دن قومی تعطیل کی گئی اور خود ملکہ معظمہ نے اس کا استقبال کیا۔

اس نے جاپان میں رہ کر جہاں جہاں بھی لیکچر دیے جاپانی عوام جوق در جوق اسے سننے کے لیے آئے، حالانکہ ان کے لیے یہ ایک تکلیف دہ عمل تھا۔ وہ مترجم کے ذریعے اس کے خیالات سن رہے تھے۔ آئن اسٹائن جاپانی عوام کی سائنس دوستی کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ ایک ایسی زبان میں جو ان کی سمجھ میں نہیں آتی تھی اس کی تقریر کو گھنٹوں بے حس و حرکت بیٹھے سنتے تھے۔ محض اس یقین پر کہ وہ جو کچھ کہ رہا ہے سب کی بھلائی کے لیے ہے۔

اسے ان تقاریب میں شرکت کر کے اپنے وطن میں اپنی ناقدی کا شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ اسے یہ بھی

آسمان ایک کیے دے رہے ہیں۔ دراصل وہ ایک ایسی علامت بن گیا تھا کہ وہ جو بھی کہتا لوگ اسے خدائی راز سمجھ کر قبول کر لیتے۔

برلن میں لوگوں کا جوش و خروش دیکھنے کی چیز تھا۔ اس کے گھر کے سامنے لوگوں کی بھیڑ جمع تھی۔

”ایسا میں تو ایک عام شہری کی زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ آزادی کے ساتھ گھومنا پھرنا چاہتا تھا لیکن مجھے لگتا ہے یہ لوگ مجھے آزادی کی زندگی نہیں گزارنے دیں گے۔ یہ تو میری پرستش پر تلے ہوئے ہیں۔“

”یہ آپ کے پرستار ہیں ان سے گھبرانا نہیں چاہیے۔“

”میں اس ہجوم میں گھرارہا تو اپنے تخلیقی کام کیسے کروں گا۔ میرے ذہن میں ابھی کئی نظریات ہیں۔ یہ تو مجھے کچھ بھی نہیں کرنے دیں گے۔“

”کچھ دن کی بات ہے۔ یہ بھیڑ چھٹ جائے گی۔ آپ فکر مت کریں۔ میں سب سنبھال لوں گی۔“

ایسا نے واقعی سب سنبھال لیا۔ اس نے اخباری نمائندوں سے ملاقاتیں کیں اور انہیں قائل کر لیا کہ وہ انٹرویو ضرور کریں لیکن دس یا پندرہ منٹ سے زیادہ انہیں نہیں ملیں گے۔ جو عام لوگ اس سے ملنے کے خواہش مند تھے انہیں کسی نہ کسی طرح ہالتی رہی۔ ٹیلی فون پر کالوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ وہ تھکے بغیر فون اٹینڈ کرتی رہی۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا تھا لیکن آئن اسٹائن مطمئن نہیں تھا۔ وہ چاہتا تھا ان پرستش کرنے والوں سے دور چلا جائے۔ انہی دنوں اسے کیلی فورنیا انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی میں تین ماہ کے لیے مہمان پروفیسر کے طور پر کیلی فورنیا آنے کی دعوت دی گئی۔ وہ تو پاؤں لٹکائے بیٹھا ہی تھا۔ اس نے یہ دعوت قبول کر لی۔

وہ کیلی فورنیا کے لیے روانہ ہو گیا۔ مغربی ساحل کی طرف جاتے ہوئے وہ دریائے ہڈسن کے کنارے واقع ایک گرجا گھر کو دیکھنے گیا۔ پادری ڈاکٹر ہیری نے اسے گرجا کو دیکھنے میں اس کی رہنمائی کی۔ ڈاکٹر ہیری اس خوب صورت عمارت کو دکھاتے ہوئے اسے ایسی جگہ لے گئے جہاں چند بڑے لوگوں کے مجسمے رکھے ہوئے تھے۔ یہ افلاطون ہے، یہ گوتھ بدھ، یہ کنفیوشس اور وہ اس مجسمے کو ٹھنکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ یہ خود اس کا مجسمہ تھا۔ اتنے عظیم لوگوں کے ساتھ اس کا مجسمہ! کوئی اور ہوتا تو خوشی سے چلانے لگتا

دیکھنے کے لیے خاموشی سے اس کمرے میں بھی پہنچ جاتے جہاں وہ چند مخصوص طلبہ سے خطاب کر رہا ہوتا تھا۔ آنے والوں کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ وہ ٹیکچر دینے میں اتنا منہمک ہے کہ اسے یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کون آیا اور آکر بیٹھ گیا اور جب جی چاہا اٹھ کر چلا گیا۔

وہ تو سمندر تھا۔ لہریں گننے والے لہریں گنتے تھے لیکن وہ لہریں گننے والوں کو نہیں گنتا تھا۔ سمندر جو ہوا۔

جو لوگ برلن میں اسے دیکھ کر جاتے تھے اپنے ملکوں میں جا کر فخر سے کہتے تھے کہ وہ آئن اسٹائن کو دیکھ کر آئے ہیں اور سننے والے کرید کرید کر اس کے بارے میں پوچھا کرتے تھے۔ اتنا شہرت شاید ہی کسی سائنس داں کو ملی ہو جو اسے مل رہی تھی۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ اسے ان باتوں سے کوئی سروکار ہی نہیں تھا۔ وہ زندگی بھر نہ سمجھ سکا کہ لوگوں کو اس میں کیا دلچسپی ہے اور کیوں ہے۔

اب وہ برلن میں مصروف ترین دن گزار رہا تھا۔ ایسا کی مصروفیات بھی بڑھ گئی تھیں۔ البرٹ کے نام ہزار ہا خطوط آتے تھے۔ ایسا کا کام یہ تھا کہ وہ ان میں سے اہم یا اہم لوگوں کے خطوط الگ کر کے البرٹ کے سامنے رکھے بلکہ پڑھ کر بھی نہ لے۔ بے شمار لوگ اس سے ملاقات کے لیے آتے۔ اب وہ ہر ایک سے تو نہیں مل سکتا تھا۔ ایسا کا کام یہ تھا کہ ان سے ملاقات کی غایت پوچھے۔ ان کا کوئی مسئلہ ہے تو خود حل کر دے۔ جس سے ملاقات ضروری ہو اسی کو اس تک رسائی دے۔ غیر ملکی سرکردہ ہستیاں بھی ملنے آتیں تو ایسا ان پر واضح کر دیتی کہ سائنس داں کا زیادہ وقت نہ لیا جائے۔

ایسا کی اس سخت نگرانی نے اسے اتنا وقت دے دیا کہ وہ چند نئے حیران کن سائنسی نظریات پیش کرنے کے قابل ہو گیا۔ ان نظریات پر وہ سالہا سال سے غور کر رہا تھا۔ یہ نظریات اس فلسفے کا نقطہ آغاز تھے جسے اس نے ”یونیفائیڈ فیلڈ تھیوری“ کا نام دیا۔ یہ دراصل فلسفہ اضافیت ہی کا ضمیر تھے۔

اس نظریے کا پیش ہونا تھا کہ اخباری صفحات اس کی خبروں سے بھر گئے۔ ہر طرف چرچا تھا۔ اخباری نامہ نگار برلن کے ہوٹلوں میں بھر گئے۔ وہ اس کوشش میں تھے کہ کسی طرح اس کا انٹرویو لینے میں کامیاب ہو جائیں۔ آئن اسٹائن حیران تھا کہ ایسا دقیق نظر یہ کسی کے کیا سمجھ میں آ رہا ہو گا۔ اس کے باوجود لوگ اس کی مداح سرائی میں زمین

حالات کے بد سے بدتر ہونے کے آثار نظر آنے لگے تو وہ ایک مرتبہ پھر کیلی فورنیا جانے کی تیاری کرنے لگا۔ اس نے اپنا پاسپورٹ برلن میں امریکی قونصل کے دفتر میں ویزا کے لیے بھیج دیا۔ اس کے پاس ایٹمشل پاسپورٹ تھا۔ ویزا کی مہر لگوانا محض ایک رسمی کارروائی ہوا کرتی تھی۔ ہمیشہ یہی ہوتا تھا لیکن اس مرتبہ ایسا نہیں ہوا۔ قونصل خانے سے فون آیا۔ کل صبح آئن اسٹائن کو ہمارے دفتر بھیج دیا جائے۔

”یہ کیسا حکم ہے۔ کیا انہیں نہیں معلوم کہ یہ آئن اسٹائن کا پاسپورٹ ہے۔“

”شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔ میں جا کر دیکھ آؤں گی۔“ ایلسا نے کہا۔

”نہیں، جب مجھے بلایا ہے تو میں ہی جاؤں گا۔“

دوسرے دن صبح ہی سے آسمان پر بادل چھا گئے تھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے موسلا دھار بارش شروع ہو گئی تھی۔ وہ اسی بارش میں بھٹکتا ہوا قونصل خانے کے دفتر پہنچ گیا۔ ایک کلرک نے اسے کرسی پیش کی اور اس سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔

”آپ کس مقصد سے امریکا جا رہے ہیں۔“

”کیا آپ کو نہیں معلوم کہ میں کس مقصد سے جا سکتا ہوں۔“

”شاید مجھے معلوم ہو لیکن آپ جو بتائیں گے میں وہی تو لکھوں گا۔“

”میں وہاں سائنس کے موضوعات پر کچھ تقریریں کرنے جا رہا ہوں۔ اپنی مرضی سے نہیں آپ کے ملک کی دعوت پر۔“

”آپ کا تعلق کس سیاسی جماعت سے ہے۔“

”میں اس سوال کا جواب دینا حماقت سمجھتا ہوں۔“

اس سے تو بہتر یہ ہے کہ میں امریکا کا دورہ منسوخ کر دوں۔“ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دفتر سے باہر نکل آیا۔

اس کے باہر نکلتے ہی سفارتی حلقوں میں زبردست کھلبلی مچ گئی۔ ”آئن اسٹائن نے دورہ امریکا ملتوی کر دیا ہے۔ وہ ناراض ہو کر قونصل خانے سے نکل گیا ہے۔“ ٹیلی فون کی کھنٹیاں یہ پیغام ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانے لگیں۔ کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ چیف قونصل خود آئن اسٹائن کے گھر پہنچ گیا۔ اس کے کمرے میں وضاحت اور معذرت کے الفاظ گونجنے لگے۔ جس کلرک نے سوالات پوچھے تھے چیف قونصل کا خیال تھا اسے واپس امریکا بھیج دیا

لیکن وہ صرف اتنا کہہ سکا۔ ”میں تو ابھی قید حیات ہوں۔ مرنے کا کوئی ارادہ بھی نہیں۔ ابھی پچھلے سال ہی تو میں نے پچاسویں سالگرہ منائی ہے۔“

”آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ آپ کی خدمات کو زندگی میں ہی سراہا گیا ہے۔“

”میں اسے بے جا طرف داری ہی کہہ سکتا ہوں۔“

وہ گر جا سے باہر آیا تو اس کے قدم اس کا بوجھ اٹھاتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

اسی رات، وہ اور ایلسا تھیرڈ دیکھنے گئے۔ انہوں نے جیسے ہی اپنی سیٹیں سنبھالیں فوراً اعلان ہونے لگا۔

”آپ لوگ خوش قسمت ہیں کہ آپ کے درمیان

مسٹر آئن اسٹائن اور ان کی بیگم موجود ہیں۔“

اس اعلان کے ساتھ ہی زوردار تالیاں بجا شروع ہو گئیں۔ وہ حیران تھا کہ پردہ ابھی اٹھا نہیں پھر یہ تالیاں کیسی۔ ایلسا نے یاد دلایا کہ یہ تالیاں آپ کی موجودگی کا اعلان سن کر بجائی جا رہی ہیں۔ اسے اپنی جگہ کھڑے ہو کر اور ہاتھ ہلا کر ان تالیوں کا جواب دینا پڑا۔

تالیاں تھیں کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا تھا۔ بالآخر کئی منٹ بعد تالیوں کا شور کم ہوا اور کھیل شروع ہوا۔

”ایلسا میں نے کہا تھا نا کہ میری پرستش یہاں بھی کی جا رہی ہے۔ یہ صورت حال میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔“

”آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔“ ایلسا نے کہا۔

”سائنس داں اور بھی ہیں لیکن لوگ آپ کو ان سب سے زیادہ چاہتے ہیں۔“

”میں اس شہرت پر ہمیشہ احتجاج کرتا رہوں گا۔“

”تم کتنے عظیم ہو میرے البرٹ۔“

”اب تم بھی پرستش پر اتر آئیں۔“ البرٹ نے کہا

اور دونوں تہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

وہ جس پبلک مقام پر جا رہا تھا اسے ایسی ہی صورت حال کا سامنا ہو رہا تھا۔ اس نے چند روز محض ایلسا کی خاطر اس زحمت کو برداشت کیا اور پھر انٹرنیشنل ٹیوٹ کی پروفیسر شپ میں خود کو مصروف کر لیا۔

تین ماہ کی خوش گواری یادوں کو ہمراہ لیے برلن آیا۔ یہاں سیاسی حالت دگرگوں تھی۔ وہ ان حالات کے سنبھالنے کا انتظار کرتا رہا۔ اس انتظار میں جب کئی مہینے گزر گئے اور

میں تخلیق کر دیے تھے۔ اب ان پر اسے مزید کام کرنا تھا۔ وہ اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

یہاں کے جھیلوں میں اسے فرصت نہیں مل سکتی تھی لیکن وہ فرصت پیدا کر رہا تھا۔ اس کے قدر دان میزبان ڈنر پارٹیوں میں شامل کرنے کے لیے طرح طرح کے جال بچھاتے تھے لیکن وہ ایسا کے ذریعے انہیں نرمی سے مایوس کر دیتا تھا۔ اس کی ڈاک میں روزانہ بڑی تعداد میں خطوط اور تحائف ہوتے تھے جن میں اسے دیکھنا ہوتا تھا کہ کون سا تحفہ قبول کرنا ہے۔ کس تحفے کو رد کر دینا ہے۔ وہ قیمتی تحائف کو اکثر رد کر دینے کا قائل تھا لیکن معمولی اور کم قیمت کے تحائف کو خلوص کی نشانی سمجھتا تھا۔

امریکا میں فکر و عمل کی وہ آزادی تھی جس کا وہ مثلاًشی تھا۔ وہ وہاں کے سائنس دانوں کے ساتھ مل کر کام کرتا رہا۔ جرمنی میں سیاسی حالات اس کے خلاف ہوتے جا رہے تھے۔ وہ کوئی سیاسی شخصیت نہیں تھا لیکن یہودی ہونا اس کے خلاف جارہا تھا۔ ہٹلر کو بہت زیادہ طاقت حاصل ہو گئی تھی۔ اس نے آسانی سے انتخاب جیت لیا۔

آئن اسٹائن کیلی فورنیا سے برلن لوٹنے کی تیاری کر رہا تھا کہ ہٹلر جرمنی کا ڈکٹیٹر بن گیا۔ اب اس کا برلن جانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ اس نے برلن جانے کا فیصلہ موخر کر دیا اور نیویارک آ گیا۔ یہاں اس کا شاندار استقبال ہوا لیکن آئن اسٹائن کے چہرے پر دکھ کی پرچھائیاں صاف دیکھی جاسکتی تھیں۔ اس کا وطن برلن اس سے چھوٹ گیا تھا۔ میں تو محفوظ ہوں لیکن میرے ہم قوموں پر کیا گزر رہی ہو گی۔ یہ دکھ ایسا تھا کہ اپنے استقبال میں بجائی جانے والی تالیاں اسے بری لگ رہی تھیں۔

اس نے اعلان کیا کہ وہ چند دن کے اندر پہلے ہی روانہ ہو جائے گا۔

وہ بحری جہاز میں سفر کر رہا تھا کہ اس کے اندیشے اس کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ اسے بتایا گیا کہ نازی برلن میں اس کے مکان میں گھس گئے۔ تمام قیمتی اشیاء تلف کر دیں اور اس کا بینک اکاؤنٹ ضبط کر لیا۔

وہ سلیم پہنچا تو ایک بے زرا اور بے گھر شخص تھا جس کا کوئی وطن نہیں تھا۔ اس نے ساحل سمندر پر ایک چھوٹی سی جھونپڑی لے لی اور کام شروع کر دیا۔ وہ گھنٹوں ساحل پر بیٹھا رہتا اور اپنی تھیوریوں پر غور کرتا رہتا۔ جرمنی میں اس کے خلاف غم و غصے کے جذبات تھے۔

جائے گا۔ آئندہ ایسی گستاخی آپ کے ساتھ نہیں ہوگی۔

”آپ کو فوراً ویزا جاری کیا جا رہا ہے۔ آپ کو آنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کا پاسپورٹ آپ کے پاس بھیج دیا جائے گا۔“ اس وعدے کے باوجود آئن اسٹائن کا غصہ کم نہیں ہوا تھا۔ وہ کھانے کی میز پر بیٹھا اس وقت بھی بڑبڑا رہا تھا۔

”جس ملک کا کلرک مجھ سے مجرموں کی طرح سوال کرے، میں وہاں کیوں جاؤں۔ میں شہرت کا نہ کسی عزت کا طالب ضرور ہوں۔ ویزا لگ کر آ گیا تو بھی نہیں جاؤں گا۔ میں یہ دورہ ملتوی کر چکا۔“

ایسا سمجھ رہا تھی کہ وہ ابھی غصے میں ہے اس سے کوئی بات نہ کی جائے لیکن جب کھانا ختم ہو چکا تو ایسا نے موقع دیکھ کر اس سے بات کی۔ ”وہ غریب کلرک غلطی کر بیٹھا ہے۔ اسے معاف کر دو۔“

”معافی سے کچھ نہیں ہوگا۔ یہ ایک اصول فیصلہ ہے کہ میں امریکا نہ جاؤں۔“

”امریکا اسے اپنی بے عزتی سمجھے گا۔“

”سمجھا کر۔“

”آپ کی ضد سے کہیں اس کلرک کی ملازمت نہ چلی جائے۔ یہ معاملہ وہ بے گانہ نہیں۔ اخباروں میں ہنگامہ برپا ہو جائے گا اور اس کلرک کی ملازمت پر بن جائے گی۔“

وہ کچھ دیر کے لیے چپ ہو گیا۔ اس کے چہرے پر آیا ہوا تباؤ کم ہونے لگا۔ اس کی آنکھیں ایسا کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

”تم ٹھیک کہتی ہو ایسا۔ میرا غصہ اس کلرک کا نقصان کر دے گا۔ تم اخبارات کو یہ خبر پہنچا دو کہ ہمارے دورے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ہم کل امریکا روانہ ہو رہے ہیں۔“

☆.....☆

امریکا میں اس کی ہمیشہ پذیرائی ہوتی تھی۔ اب بھی ہورے تھی۔ جنوبی کیلی فورنیا میں یونیورسٹی کے احاطے کے نزدیک اسے چھوٹا سا مکان دیا گیا تھا۔ اس کے صحن میں بیٹھ کر وہ سردیوں کے دنوں میں دھوپ سے لطف اندوز ہو سکتا تھا۔ یونیورسٹی اتنی نزدیک تھی کہ پیدل یونیورسٹی تک جاسکتا تھا۔ امریکیوں کی مہمان نوازی کا وہ پہلے ہی قائل تھا۔

اس نے اس مکان میں چند دن آرام کیا اور پھر وہ ایک دن یونیورسٹی جانے کے لیے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

اتنے دنوں کے آرام نے کئی نظریات اس کے ذہن

اللہ کا ذکر نفسیاتی امراض

کے لیے بہترین علاج

ہالینڈ کے ماہر نفسیات کا کہنا ہے کہ لفظ اللہ کا ذکر افسردگی اور ذہنی تناؤ کے شکار مریضوں کے لیے بہترین علاج ہے۔ ڈچ پروفیسر گزشتہ تین برسوں سے مریضوں پر تجربے کر رہے تھے۔ ان میں بیشتر مریض غیر مسلم تھے جب انہیں لفظ اللہ صاف طور پر بولنے کی تربیت دی گئی تو اس کا غیر معمولی نتیجہ برآمد ہوا۔ ماہر نفسیات کے مطابق اللہ کا ہر حرف نفسیاتی امراض میں موثر ہے۔ پہلا حرف الف نظام تنفس سے خارج ہوتا ہے اور سانس کو کنٹرول میں رکھتا ہے۔ حرف ل کی ادائیگی سے سانس کے تناؤ کو عاقبت ملتی ہے اور حرف ہ سے پھیپھڑے اور دل کا رابطہ ہوتا ہے جو دل کی دھڑکن کو کنٹرول کرتا ہے۔ جو مسلمان بلا ناغہ قرآن مجید کی تلاوت اور ذکر اللہ کرتے ہیں وہ خود کو نفسیاتی بیماریوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں۔

(بحوالہ: سکون قلب)

مرسلہ: طالب حسین طلحہ

نیوسینٹرل جیل، ملتان

کھڑا تھا۔ اسے ایک کشتی کے ذریعے جہاز تک پہنچا دیا گیا۔ خلیج نیویارک میں ایک اور کشتی اسے جہاز سے اتار کر ساحل کے ایک خفیہ مقام پر لے گئی۔ اس مقام پر ایک کار اس کی منتظر تھی۔ اس کا ایجن اشارت تھا۔ آئن اسٹائن اور ایسا کے بیٹھے ہی اس کار نے فرائے بھرے اور اسے پرنسٹن پہنچا دیا جہاں ایک شاندار مکان، فرنیچر سے آراستہ اسے نئی زندگی کا پیغام دے رہا تھا۔

یہ چھوٹا سا سفید گھر سڑک کے کنارے بنے ہوئے دوسرے گھروں سے مختلف نہیں تھا۔ کمروں کی ہر کھڑکی سے گھر میں لگا ہوا باغ نظر آتا تھا۔ مکان میں ہر وقت خاموشی طاری رہتی تھی۔ یہ وہی تنہائی تھی جس کا وہ ہمیشہ سے طالب رہتا تھا۔ اس کی پچھلی زندگی لوٹ آئی تھی۔ ہر صبح پیدل شہر کے آخری سرے کی طرف چل دیتا تھا۔ کسی خوف اور

اس کے بہت سے دوستوں کو قتل کیا جا چکا تھا۔ جرمن اخبارات اس پر وطن دشمنی کے الزامات لگا رہے تھے۔ ایسے مضامین شائع ہو رہے تھے کہ جن میں لکھا ہوتا تھا۔ آئن اسٹائن کو ابھی تک پھانسی پر کیوں نہیں چڑھایا گیا۔ ایسا تک یہ خبریں پہنچ رہی تھیں اور وہ تشویش میں مبتلا تھی۔ یہ کھٹکا اسے ہمیشہ لگا رہتا تھا کہ نہ جانے کب کوئی نازی سرحد پار کر کے آئن اسٹائن تک پہنچ جائے۔

سلیم کے شاہ اور ملکہ آئن اسٹائن کے گہرے دوست تھے۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ وہ سلیم میں ہے اور اپنی ضد کی وجہ سے، ساحل کے قریب ہی رہنا چاہتا ہے تو انہیں معاملے کی نزاکت کا احساس ہوا۔ دونوں ملکوں کی سرحدیں ملتی تھیں لہذا آئن اسٹائن کو نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔ شاہ نے جھونپڑی کے نزدیک پہرا بٹھا دیا تاکہ ہر آنے جانے والے پر نظر رکھی جاسکے۔

کئی ممالک کے سربراہوں کو معلوم ہو چکا تھا کہ آئن اسٹائن پناہ کی تلاش میں ہے اور اس وقت سلیم میں ہے اور جرمنی سے قریب ہونے کی وجہ سے یہ علاقہ اس کے لیے غیر محفوظ ہے۔ اسے مختلف ملکوں اور اداروں کی طرف سے پیش کش ہونے لگی کہ وہ ان کے پاس آ کر پناہ لے سکتا ہے۔ اسے تمام آسائش مہیا کرنے کے وعدے کیے جا رہے تھے۔ اس نے بہت غور کیا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ امریکا میں سکونت اختیار کرے گا۔

نیو جرسی کے پرنسٹن شہر میں ایک انسٹی ٹیوٹ کی تنظیم کی جارہی تھی۔ یہ ایک ایسا ادارہ تھا جہاں سائنس دان کسی مداخلت کے بغیر تحقیقی کام کر سکتے تھے۔ یہ ایک پرائیویٹ ادارہ تھا جسے ایک امیر خاندان چلا رہا تھا۔ جس وقت اس کی تنظیم کی جارہی تھی آئن اسٹائن نے مالکان سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ اس ادارے کو اپنی جزوقتی خدمات مہیا کرے گا یعنی سال میں کچھ وقت یہاں رہے گا اور باقی وقت برلن میں گزارے گا۔ اب برلن جانے کا سوال نہیں تھا لہذا اس نے تنظیم سے بات کی اور کل وقتی خدمات پیش کر دیں۔

بورڈ نے اس کی پیشکش قبول کی اور وہ مستقل سکونت کے لیے یورپ سے امریکا روانہ ہو گیا۔

وہ نہایت رازداری سے روانہ ہوا۔ کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ کب روانہ ہوا اور کہاں کے لیے۔ اس کی زندگی کو خطرہ تھا لہذا یہ رازداری ضروری تھی۔ اس کا جہاز نیچ سمندر میں

آواز آئے گی۔ ”ست کہیں کا۔“
 وہ کسی حال میں بھی ہو کام سے غافل نہیں رہ سکتا تھا۔
 وہ جلد ہی ایسا کو بھلا کر اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔ ایسا
 اس کی سیکریٹری بن کر اس کے ساتھ تھی اور اب وہ نہیں تھی۔
 اس نے اپنی دیکھ بھال کے لیے ایک سیکریٹری رکھ لی۔
 مکان میں ہر وقت خاموشی چھائی رہتی۔ صرف اس کی
 سیکریٹری وہاں تھی جو اس کے کھانے پینے کا خیال رکھتی۔ اس
 کی نگرانی کرتی۔ اس کی ڈاک دیکھتی، فون اینڈ کرتی اور
 اسے یاد دلاتی رہتی کہ وہ اپنی صحت کا خیال رکھے۔

وہ اپنے دفتر میں بیٹھا تھا کہ دو اشخاص اس سے ملنے
 آئے۔ یہ دونوں سائنس داں تھے اور یورپ سے آئے
 تھے۔ وہ اسے ایک ایسی تحقیق کے بارے میں بتانے آئے
 تھے جو ایٹم میں بندے پناہ قوت کو بروئے کار لانے کے
 امکان کا راستہ دکھاتی تھی۔ آئن اسٹائن کو بتانا اس لیے
 ضروری تھا کہ انہوں نے یہ تجربات آئن اسٹائن ہی کے
 نظریات کی روشنی میں کیے تھے۔ انہوں نے اس کا شکریہ بھی
 ادا کیا۔

”آپ کے بعض نظریات جو رسالہ ”ڈرفزک“ میں
 شائع ہوئے تھے اگر وہ ہمارے سامنے نہ ہوتے تو ہم ہرگز
 اس نتیجے پر نہ پہنچتے۔“

”چلو اچھا ہوا۔ میرا نظریہ کسی کے کام تو آیا۔ تحقیق
 جاری رکھو۔ میں تم پر اپنے نظریات کی چوری کا الزام نہیں
 دھروں گا۔“ آئن اسٹائن نے ہنستے ہوئے کہا۔

”نہیں جناب! ہم اپنی بات آپ کو سمجھا نہیں سکے۔
 بات بہت تشویش ناک ہے۔ جرمن سائنس دانوں پر بھی
 آپ کے نظریات کی افادیت ظاہر ہو گئی ہے۔ اگر وہ اسے
 عملی جامہ پہنا کر ایٹمی قوت بن گئے تو یہ نازی عذاب بن
 جائیں گے۔“

”تو بننے دو۔ وہ تو ویسے بھی عذاب ہیں۔“
 ”جناب! یہ یہودیوں کی بقاء کا سوال ہے۔ اگر نازی
 ایٹمی قوت بن گئے تو یہودی کہیں بھی نہیں رہ سکیں گے۔“

وہ دونوں سائنس واں یہودی تھے اور آئن اسٹائن
 بھی۔ وہ متعصب نہیں تھا لیکن فطری طور پر یہودیوں کے
 لیے اپنے دل میں گنجائش رکھتا تھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ کچھ
 دیر بعد وہ پھر ان سے مخاطب ہوا۔

”تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟“
 ”ہم یہ چاہتے ہیں کہ امریکا اس میں پہل کرے۔“

خطرے کے بغیر۔ مکان ختم ہونے اور ایک میدان سے
 گزرنے کے بعد اسٹی ٹیوٹ تھا جہاں اس کا دفتر تھا۔ اس
 کی فرمائش پر یہاں سادہ سا فرنیچر رکھا گیا تھا۔ وہ اکثر تنہا ہی
 کام کرتا تھا۔ کبھی کبھی ایک دو معاون بھی اس کی مدد کے لیے
 شامل ہو جاتے تھے۔ فزکس کے کچھ طلبہ آ جاتے تھے جن سے
 خطاب کرتا بھی اس کے فرائض میں شامل ہوتا تھا۔

وہ یہاں پُرسکون زندگی گزار رہا تھا لیکن اسے وہ
 دوست یاد آتے۔ نئے جنہیں وہ برلن میں چھوڑ آیا تھا۔ وہ
 مظالم کی ان خبروں سے فکر مند تھا جو اس کے وطن سے اس
 تک پہنچ رہی تھیں۔ جو لوگ برلن سے بھاگ کر دوسری
 جگہوں پر چلے گئے تھے وہ اس سے مدد کے طالب رہتے تھے
 اور وہ ان کی مدد کرتا تھا۔ کبھی مالی طور پر کبھی سفارش کے
 ذریعے۔

اس کی زندگی پُرسکون تھی لیکن ابھی اس دریا میں کچھ
 ارتعاش باقی تھا۔ اس کی نگرانی، اس کی تخلص، اس کی بیوی،
 اس کی چچا زاد، اس کی دوست، اس کی سب کچھ چند روز بیمار
 رہ کر انتقال کر گئی۔ وہ اس کے سرہانے بیٹھا تھا اور پچھلی
 زندگی کا ایک ایک ورق پلٹ رہا تھا۔ وہ بار بار آنسو پونچھ رہا
 تھا۔ اس کے احباب جمع ہو گئے تھے جو اسے تسلی دے رہے
 تھے لیکن ان کے الفاظ کتنے بے وقعت تھے انہیں کیا خبر تھی کہ
 وہ خود مر گیا ہے۔

ایسا کو فرسی دیہات کے ایک قبرستان میں دفن کر دیا
 گیا جہاں وہ ایسا۔۔۔ ملنے روز جایا کرتا تھا۔

بظاہر ایسا لگتا تھا کہ وہ بالکل ٹوٹ چکا ہوگا اور حقیقت
 بھی یہی تھی۔ وہ اب تک ایسا کے سہارے چل پھر رہا تھا۔
 چلنا بھول سکتا تھا لیکن وہ چلنا نہیں بھولا۔ چند روز بعد ہی
 لوگوں نے دیکھا کہ ایک شخص جس نے ڈھیلی ڈھالی نیکر، ربڑ
 کے ٹکڑوں والے جوتے اور ایک پرانی قمیص پہن رکھی ہے
 تیز ہوا میں اس کے اٹھے ہوئے بال مزید الجھ رہے ہیں۔ وہ
 چہل قدمی کے لیے اٹلا ہے اور اس وقت سرک پار کر رہا
 ہے۔ یہ البرٹ آئن اسٹائن ہے۔

ایک دن اسے لوگوں نے ایک کنسرٹ میں دیکھا۔
 کچھ لوگوں نے اسے ایک مقامی سینما گھر میں دیکھا۔ وہ
 یہاں قلم دیکھنے آیا تھا۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ایسا کا غم
 بھلانے کے لیے ان تفریحات میں شریک ہو رہا ہے۔ ان
 دنوں وہ میونخ کے ایک اسکول میں بیٹھا ہوا بچہ نظر آ رہا تھا۔
 چپ چاپ، سہا ہوا، خرف زدہ۔ جیسے ابھی کچھلی صفوں سے

امریکا سے پہلے اگر جرمنی ایٹمی قوت بن گیا تو بڑی تباہی ہوگی۔“
 ”اگر ایسا ہے تو تمہیں میری بجائے حکومت امریکا سے بات کرنی چاہیے۔“

”آپ نے درست کہا لیکن حکومت تک ہماری رسائی کہاں۔ اگر آپ صدر روز ویلٹ کو خط لکھ دیں یا ان سے ملاقات کریں تو وہ اس منصوبے پر توجہ دیں گے۔“
 آئن اسٹائن اب بھی ہچکچارہا تھا لیکن ملاقاتیوں کے زور دینے پر وہ تیار ہو گیا۔ اس نے میز کی دراز سے لیٹر پیڈ نکالا اور صدر امریکا کے نام خط لکھ دیا۔
 یہ خط نہایت خفیہ طریقے سے صدر تک پہنچا دیا گیا اور ہمیشہ خفیہ رہا۔
 یہ خط محض خط نہیں تھا۔ ایک نئے دور کا آغاز تھا۔
 ایٹمی قوت کی دریافت کے کام کا آغاز ہو گیا۔ اس دریافت سے آئن اسٹائن کا براہ راست تعلق نہیں تھا لیکن بہر حال یہ کام شروع اس کے خط سے ہی ہوا۔

امریکی زندگی میں بظاہر کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ زندگی اس طرح رواں دواں تھی لیکن اندر ہی اندر ایک جہان انگیز کارروائی جاری تھی۔ حکومت ایک خوفناک تبدیلی کے حصار میں تھی۔
 اس منصوبے پر مہینوں کا کام ہوتا رہا۔ پھر ایک روز اسے نیویارک بلا لیا گیا۔ یہ دورہ نہایت خفیہ رکھا گیا تھا۔ اسے بھی تاکید تھی کہ کسی کو کچھ نہ بتائے اور کسی کو اپنے ہمراہ نہ لائے۔

وہ اس سفر پر اکیلا ہی روانہ ہوا تھا لیکن اتفاق سے اس کا ایک معاون اسے راستے میں مل گیا جو اس سفر کا گواہ بن گیا۔
 یہ گواہی وہ بھی نہیں دے سکتا تھا کہ آئن اسٹائن کس کام میں مدد کے لیے نیویارک جا رہا ہے۔

☆.....☆

جنگ عظیم دوم شروع ہوئی۔ جرمنی اور اس کے اتحادی آگے بڑھتے جا رہے تھے کہ اگست 1945ء کے ایک دن جاپان کے ایک شہر ہیروشیما پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ ایک چندھیا دینے والی روشنی ہوئی۔ پھر زمین پر ایک گرج دار آواز پیدا ہوئی۔ پھر زندگی نام کی ہر چیز موت میں تبدیل ہو گئی۔ بلند و بالا عمارتیں کھلونوں کی طرح اڑ گئیں۔ زمین گرد

دغبار بن کر ہوا میں منتشر ہو گئی۔ دولاکھ زندگیاں چشم زدن میں جھلس کر ختم ہو گئیں۔ اس سے پہلے اتنی بڑی تباہی کسی نے نہیں دیکھی تھی نہ کوئی تصور کر سکتا تھا کہ کوئی ایسا ہتھیار بھی ہو سکتا ہے جو چند سیکنڈ میں اتنی بڑی تباہی لاسکتا ہے۔

یہ وہ بم تھا جو امریکا نے جاپان پر گرایا تھا۔ ایٹم بم۔ دنیا ابھی اس سے ناواقف تھی لیکن امریکا نے اسے تیار کر لیا تھا۔

آئن اسٹائن اپنی مطالعہ گاہ میں پرسکون بیٹھا کسی کتاب کا مطالعہ کر رہا تھا کہ یہ خبر اس تک پہنچی تو اس نے گھبرا کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ باغیچے میں پھول ہوا کی تھکیاں کھا کر سر ہلا رہے تھے۔ اس نے اپنے منہ میں دبا ہوا پائپ نکالا اور دیوار پر دے مارا۔ یہاں زندگی نہیں رہی ہے اور وہاں زندگی ختم ہو گئی۔ وہ دوبارہ اپنی کرسی پر گر گیا۔ اس کا قصور وار میں بھی ہوں۔ میرے نظریات ہی نے ایٹمی قوت کے بارے میں تحقیق کی راہ کھول دی تھی۔ نہ میں یہ نظریہ تخلیق کرتا نہ یہ دن دیکھتا۔ ڈی روز ویلٹ کے نام میرے خط ہی نے امریکا کو بم تیار کرنے پر راغب کیا تھا۔ اس نے اپنا سر اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ میرا نظریہ تو زمان و مکان، مادہ اور توانائی کے باہمی رشتوں سے متعلق تھا۔ میں نے یہ تو نہیں کہا تھا کہ اس سے انسانوں کی تباہی کا کام لیا جائے۔ اگر امریکا نے یہ بم تیار کر ہی لیا تھا تو اسے کسی ویران جگہ پر گرا کر دنیا کو بٹا سکتا تھا کہ اس کے پاس ایسا موڈی ہتھیار ہے۔ اسے انسانوں پر گرانے کی کیا ضرورت تھی۔ اب یہ فارمولا دنیا کے دوسرے ممالک تک بھی پہنچ سکتا ہے۔ پھر بتاؤ دنیا کی کیا حالت ہوگی۔

وہ اپنی آرام کرسی پر اس طرح بڑا تھا جیسے مردہ ہو۔ اس کی سیکرٹری کئی مرتبہ اسے دیکھ کر جا چکی تھی۔ وہ یہی سوچ رہی تھی کہ وہ کسی موضوع پر غور کر رہا ہے۔ اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں لیکن اب کھانے کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ ڈرتے ڈرتے اس کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ آئن اسٹائن آنکھیں کھول کر اس کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں کو جنبش ہوئی لیکن اس کی آواز ساتھ نہ دے سکی۔ وہ اسے یہ کیسے بتاتا کہ اس تباہی کا ایک کردار وہ بھی ہے۔ اس راز کو خفیہ ہی رہنا چاہیے۔ وہ خاموشی سے اٹھا اور سیکرٹری کے کہنے سے کھانے کی میز پر چلا گیا۔

وہ کھانے کی میز پر آ گیا تھا لیکن اس کا ذہن ابھی تک الجھا ہوا تھا۔ اس نے جلدی جلدی کھانا ختم کیا اور آرام

تھا۔ اب لیکچر دیتے ہوئے اس کی آواز اتنی دھیمی ہوتی تھی کہ سامعین بڑی مشکل سے سن پاتے تھے۔ ڈاکٹروں نے اسے ہدایت کر دی کہ جیسے ہی سردی کا آغاز ہو وہ سر پر اونی ٹوپی پہننا شروع کر دے۔ اکیلے گھر سے نکلنے کو منع کر دیا لہذا چہل قدمی کے لیے لگتا تو اس کا کوئی نہ کوئی معاون اس کے ساتھ ہوتا۔

1955ء میں وہ اتنا کمزور ہو گیا تھا کہ کئی کئی دن گھر سے نکلنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ اس کا بھریوں بھرا چہرہ اپنی اس بے بسی پر افسردہ رہنے لگتا تھا۔ یقیناً ان دنوں وہ اپنی تھوڑیوں پر نہیں اپنے ماضی پر غور کرتا رہا ہوگا۔ اسی سال اس کا جنم دن منایا گیا۔ یہ مارچ کا مہینا تھا۔

وہ اپنی مطالعہ گاہ تک محدود ہو گیا۔ اس کی کمزوری اتنی بڑھی کہ اس کے ڈاکٹروں کو تشویش ہونے لگی۔ وہ اسپتال میں داخل ہونے سے بچتا تھا لیکن اب اسے اس کی مرضی پر نہیں چھوڑا جاسکتا تھا۔ اسے رینشن اسپتال پہنچا دیا گیا۔ فوری علاج سے کچھ بہتری آئی۔ ملاقات کے لیے آنے والوں سے بات چیت بھی کرنے لگا۔ اس عزم کا اظہار بھی کرنے لگا کہ اسپتال سے جاتے ہی وہ اپنے کام میں لگ جائے گا۔ اس مرتبہ کچھ ایسے راز منکشف کرے گا کہ دنیا حیرت زدہ رہ جائے گی۔ ڈاکٹروں کو بھی اُمید ہو چلی تھی کہ اب وہ سنبھل گیا ہے۔

18 اپریل 1955ء کو آدھی رات کے بعد نرس اس کے سر ہانے کھڑی تھی۔ اس نے دیکھا کہ سوتے میں اس کی سانس الجھ رہی ہے۔ اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی ہے۔ وہ ڈاکٹر کو بلانے کے لیے دروازے کی طرف بھاگی لیکن راستے ہی سے پلٹ آئی۔ وہ سوتے میں کچھ کہہ رہا تھا اس نے قریب آ کر سننا چاہا۔ وہ جرمن زبان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ نرس کے لیے یہ الفاظ اجنبی تھے۔ وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکی۔ خدا جانے وہ کیا کہہ رہا تھا۔ کس کو یاد کر رہا تھا۔ دل کی بات دل ہی میں لے کر چلا گیا۔ اس کی بہت سی باتیں دنیا کی سمجھ میں نہیں آئی تھیں آخری بات بھی کوئی نہ سمجھ سکا۔

جب تک ڈاکٹر آتا، وہ مرچکا تھا!!

ماخذات: آئن اسٹائن

ترجمہ و ترتیب: اوپی نامی

سوعظیم آدمی: مترجم عاصم بٹ

کرنے کے کمرے میں چلا گیا۔ اس کا ذہن ایک مرتبہ پھر جاپان میں ہونے والی تباہ کاریوں کی طرف چلا گیا۔ اب بھی ہو سکتا ہے کہ میں جب تک زندہ رہوں اس میں قوت کے غلط نتائج کی طرف توجہ دلاتا رہوں۔ انسانی ذہنوں کو رضامند کر سکوں کہ وہ اس عظیم قوت کو صرف نیک مقاصد کے لیے استعمال کر سکیں۔

☆.....☆

اب وہ اپنی احتیاط خود کر رہا تھا۔ کوشش کر رہا تھا کہ اس کے نظریات اس کی تعلیمات عام لوگوں تک نہ پہنچ سکیں۔ عام لوگوں سے اس کی مراد غیر ذمہ دار سائنس دان تھے اور حال یہ تھا کہ وہ جب اپنی کسی تھیوری کی تشریح کے لیے اپنے شاگردوں کو لیکچر دینا چاہتا تو پریشان کرنے والے لوگوں کا ہجوم لگ جاتا اور جو اس کے لیکچر کو واقعی سمجھ سکتے تھے ان کے لیے جگہ بھی باقی نہ رہتی۔ اس نے بورڈ آف ڈائریکٹرز کی میٹنگ میں یہ مسئلہ ان کے سامنے رکھ دیا اور منوا لیا کہ پلیٹن بورڈ پر لکھ کر اس کے لیکچر کا اعلان نہ کیا جائے۔ اس سے اس کے کام میں حرج پڑتا ہے اور سائنس غیر سائنسی لوگوں کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے۔

اس دن کے بعد سے یہ خبر چکے سے اہل طلبہ تک پہنچا دی جاتی تھی یا چند خاص خاص آدمیوں کو ٹیلی فون کر دیا جاتا تھا۔ فون پر بھی صرف اتنا کہا جاتا "آج تین بجے دوپہر"۔ سمجھنے والے سمجھ جاتے اور کمر صرف ان آدمیوں سے بھرتا جو وہاں بیٹھنے کے مستحق ہوتے۔ وہ مقررہ وقت پر وہاں پہنچتا تختہ ریاضی پر چند اشکال کھینچتا اور پھر فزکس ماہرین کی مخصوص زبان میں ان اشکال کی تشریح کرنے لگتا۔

اس کا لیکچر سننے والوں میں سینٹر طلبہ ہوتے، یا نواحی یونیورسٹیوں کے سرکردہ سائنس دان۔

لیکچر ختم ہونے کے بعد وہ خاموشی سے باہر نکل جاتا۔ ایک شخص آتا اور تختہ سیاہ کے پیچ کھول کر اسے نیچے اتارتا اور ایک خاص کیمیاوی مادہ چھڑکتا تا کہ چاک سے لکھی گئی اشکال اور الفاظ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائیں اور اس عظیم سائنس دان کی یادگار بن کر ہمیشہ زندہ رہیں۔

یہ تھی ایک ترقی یافتہ ملک میں اس ہیرو کی قدر و منزلت۔

جیسے جیسے دن گزرتے گئے وہ کمزور ہوتا گیا۔ اگلے دس برسوں تک وہ سائنس دانوں کی تربیت میں مصروف رہا۔ بڑھتی ہوئی عمر اور کام کی زیادتی نے اسے ناتواں کر دیا

خون کے آنسو

انور فرہان

16 ستمبر... وہ سانحہ ہے جس نے ظلم کی انتہا کو چھولیا ہے۔ اس سانحہ پر خاموش رہنا بھی ظالمین کی اقتدا ہے۔ ہر سطح پر اس ظلم کی مذمت ضروری ہے۔ کیونکہ حملہ وطن دشمنوں نے ہمارے مستقبل پر کیا ہے۔ یہ ننھے ننھے بھول وطن کے لیے بہت کچھ کرتے۔ ملک کی بقا و سلامتی کے لیے، تعمیر و ترقی کے لیے اپنا حصہ ڈالتے مگر ان ظالمین نے ان کی زندگی کے چراغ گل کر کے ہمارے مستقبل کو تاریک کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم پر ڈھائے گئے اس ظلم پر پوری دنیا نے افسوس ظاہر کیا ہے ہمارے درد کو کم کرنے کے لیے الفاظ کا مرہم رکھا ہے۔



ہیں۔ بربریت کا شکار ہونے والے ان پھولوں کی قبروں پر پھولوں کی برسات دیکھنے والوں کا کلیجہ پھٹ گیا۔ صاحب اولاد ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ درندگی کا شکار ہونے والے پھول سے بچوں کے والدین پر کیا قیامت گزری ہوگی۔

134 بچوں اور اساتذہ کی شہادت پر جہاں پاکستان میں تین روزہ سوگ منایا گیا وہاں ترکی میں بھی سوگ کے لیے ایک دن وقف کر دیا گیا۔ دیگر ممالک کے سربراہان نے بھی اس سانحے پر اپنے گہرے دکھ کا اظہار کیا اور وزیر اعظم میاں محمد نواز شریف کو ٹیلی فون کر کے بتایا کہ وہشت گردی کی اس بزدلانہ کارروائی کی وہ بھرپور مذمت کرتے ہیں اور حکومت پاکستان اور پاکستانی عوام کے دکھ میں برابر کے

16 دسمبر 2014ء کو دن کے گیارہ اور ساڑھے گیارہ کے درمیان جدید آتشیں اسلحوں سے ایس سات وہشت گردوں نے، پشاور کے آری پبلک اسکول میں گھس کر ننھے، کمزور اور معصوم طالب علموں کو اپنی گولیوں اور بموں کا نشانہ بنا کر جس درندگی کا مظاہرہ کیا، اس نے پوری دنیا کو دہلا کر رکھ دیا ہے۔ انسان نما درندوں نے جس بربریت کا مظاہرہ کیا ہے، اس کی بھرپور مذمت ہر اس شخص نے کی ہے جس کے سینے میں درد مند دل ہے۔ بچے تو ہمارے ہوں، آپ کے ہوں یا کسی کے بھی ہوں، ہر کوئی ان سے پیار کرتا ہے کیوں کہ بچے تو پھول ہوتے ہیں اور پھول گلے کا ہار ہوتے ہیں۔ گھر کی خوب صورتی اور سنگھار ہوتے

فروری 2015ء

57

ماہنامہ سترگزشت

اپنے گھروں سے تعلیم حاصل کرنے اسکول گئے تھے۔
دہشت گردی کا بھلا یہ کیا انداز ہے کہ بڑوں کا انتقام بچوں
سے لیا جائے؟ یہ کیسے مسلمان ہیں؟ انہیں مسلمان تو کیا آدم
کی اولاد کہنا بھی انسانیت کی توہین ہے۔“

ٹی وی کے معروف اداکار فواد خان جنہوں نے
بھارتی فلم ”خوب صورت“ سے عالمگیر شہرت حاصل کی۔
انہوں نے پشاور اسکول کے سانچے پر اظہار خیال کرتے
ہوئے کہا۔ ”میں اس سانچے پر گہرے دکھ اور صدمے کی
حالت میں ہوں۔ اسکول کے معصوم بچوں کا قتل عام وحشیانہ
درندگی ہے۔ اس کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔ میری
دعاؤں ان کے غمزہ والدین کے ساتھ ہیں۔ رحیم و کریم
اللہ انہیں صبر جمیل عطا فرمائے۔“

معروف فلم ساز و ہدایت کار اور ویرٹول افیکٹ کری
ایٹر سعید رضوی نے سانچے پشاور پر اپنے صدمے کا اظہار
کرتے ہوئے کہا۔ ”پشاور میں معصوم بچوں کی شہادت ایک
بدترین سانحہ ہے۔ درندہ صفت دہشت گردوں نے جس
سفاکی سے بچوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا ہے اس کی تاریخ میں
مثال نہیں ملتی۔ کوئی انسان بھی ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ یہ کون
لوگ ہیں جنہیں معصوم جانوں پر بھی رحم نہیں آیا۔ یہ بچے ہمارا
مستقبل تھے۔ ہماری نسلوں کو ختم کرنے کی سازش کی جا رہی
ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ درندہ نما ان لوگوں کو ہمیشہ ہمیشہ
کے لیے ختم کر دیا جائے اس مقصد کے لیے ہم سب کو اپنے
تمام اختلافات بھلا کر متحد و متفق ہو جانا چاہیے۔“

تھقہ اوڈھو کا دل پشاور سانچے سے دل کر رہ گیا۔
انہوں نے پشاور کے آرمی پبلک اسکول کے معصوم طالب
علموں پر بے رحم دہشت گردوں کے حملے پر اپنے پزیرا اثرات
بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”میں کیا کہوں مارے صدمے کے
بجھ سے تو بولا بھی نہیں جا رہا ہے۔ اس واقعے نے میرے دل
کو اس طرح دہلا کر رکھ دیا ہے کہ میرا دماغ بھی گویا ماؤف
ہو گیا ہے۔“

اداکارہ ماہرہ خان نے چھوٹے چھوٹے تابوتوں میں
اسکول کے معصوم بچوں کی مہتیں جاتے دکھ کر اپنے جذبات
کا اظہار یوں کیا۔ ”تابوت جتنے چھوٹے ہوتے ہیں اتنے
ہی بھاری ہوتے ہیں۔ انہیں اٹھانے والے ہی نہیں، انہیں
دیکھنے والے بھی ان کے بوجھ سے دبے جاتے ہیں۔ وہ بچے
جو اسکول میں علم کی روشنی حاصل کرنے گئے تھے انہیں موت
کے اندھیرے میں دھکیلنے والے بزدل اور نفرت انگیز ہیں۔“

شریک ہیں۔ اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل بان کی مون
نے بھی اس بربریت کی مذمت کی اور متاثرین سے ہمدردی
کا اظہار کیا۔ پوپ پال نے بھی گرجا گھر میں شہید بچوں کے
درجات کی بلندی اور لواحقین کے لیے صبر جمیل کی دعاؤں کا
اہتمام کیا۔ دیگر مذاہب کی عبادت گاہوں میں بھی دنیا بھر
میں دعائیں کرائی گئیں۔ بھارت نے اپنے تمام سیاسی
اختلافات کو بالائے طاق رکھ کر اپنے لوگ۔ بھارت میں اس
دہشت گردی کے خلاف قراردادِ مذمت پاس کرائی۔ جب
کہ بھارت کے تمام اسکولوں میں طلبہ نے دو منٹ کی
خاموشی اختیار کر کے، پشاور کے آرمی پبلک اسکول کے تمام
شہید طالب علموں سے ہمدردی اور یک جہتی کا ثبوت دیا۔

ان سارے واقعات کی تفصیل پر جانے کی بجائے
میں اس وقت اس حساس موضوع پر سب سے زیادہ حساس
طبقہ کے احساسات و جذبات کی تفصیل بیان کروں گا۔ یہ
طبقہ آرٹسٹوں اور فنکاروں کا ہے۔ شوبز کے تمام شعبوں سے
وابستہ لوگوں کے دلوں پر اس سانچے عظیم سے کیا قیامت
گزری اور اس کا اظہار انہوں نے کس طرح کیا یہ سب کچھ
آپ کو بتاؤں گا۔

پاکستانی شوبز سے تعلق رکھنے والے فنکاروں اور دیگر
متعلقہ افراد نے اس سانچے عظیم پر اپنے غم و غصے کا بھرپور
اظہار کیا۔ فلم اور ٹی وی کے نامور اداکار طلعت حسین نے
آرٹس کونسل کراچی میں منعقد ہونے والے مذمتی اجلاس میں
اپنے گہرے دکھ کا اظہار کیا۔ اس دوران انہوں نے یہ بھی
کہا۔ ”آج جو حالات پاکستان کے ہیں ایسے کبھی نہیں تھے۔
ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں حکومت نام کی کوئی چیز موجود
نہیں ہے۔ دہشت گردی کے طوفان کو روکنے میں حکام بری
طرح ناکام ہیں۔“

کراچی کے آرٹس کونسل کے انعقاد پذیر مذمتی اجلاس
میں سینئر فلم اور ٹی وی آرٹسٹ منور سعید نے کہا۔ ”بچے ہمارا
سرما یہ ہیں۔ ہم ان میں اپنا مستقبل تلاش کرتے ہیں مگر
افسوس کہ ہم انہیں بھی تحفظ دینے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔
کیا یہ ہماری شرمندگی کا باعث نہیں کہ ہمارے تعلیمی ادارے
بھی دہشت گردی سے محفوظ نہیں؟“

فلم اور ٹی وی سے وابستہ وراثت اداکار ایوب کھوسو
نے پشاور اسکول سے المناک سانچے پر اپنے دکھ کا اظہار
کرتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اپنی زندگی میں اس سے بڑا
اور برا سانحہ نہیں دیکھا۔ آخر ان معصوم بچوں کا کیا تصور تھا جو

ان کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔“

خان، احسن خان، مہرین راجیل، شیبہ بٹ، سہمی راجیل، فردوس جمال، اسد، فاروق مینگل، آمنہ الیاس، صبا قمر، اقراء، کرن حق، جاناں ملک، عذرا آفتاب، ثوبیہ خان، عائشہ خان، امین اقبال، سہیل سمیر، عظیم سجاد اور گلوکار عطاء اللہ عسکری جیلوی، جواد احمد، علی حیدر، انور رفیع، علی عظمت، فاخر، سجاد علی۔ حامد علی خان، ندیم عباس، گلوکارہ سائرہ نسیم، ترنم ناز، شازیہ منظور نے اپنے گہرے دکھ کا اظہار کیا۔

لاہور کے اسٹیج فنکاروں نے بھی اپنے گہرے دکھ اور افسوس کا اظہار کیا۔ پروڈیوسر حنیف، اداکار عابد کشمیری، سخاوت ناز، ظفر ارشاد، حسن مراد، گوگاجی، طاہر نوشاد اور دیگر نے اپنے بیان میں کہا۔ ”اس سانحے پر ہمارا دل خون کے آنسو رو رہا ہے۔ دہشت گردوں کو سزائے موت سے بھی کوئی بڑی سزا دی جاتی تو وہ بھی کم ہوتی۔“

پشاور کے آرمی پبلک اسکول کے المناک سانحے پر کراچی کے تھیٹر اور ٹیلی ویژن کے جن فنکاروں، ہدایت کاروں اور دیگر متعلقہ افراد نے شدید الفاظ میں مذمت کی اور بچوں کو بے دردی کے ساتھ گولیوں اور بموں کا نشانہ بنانے والے دہشت گردوں کو نشانِ عبرت بنانے کا مطالبہ کیا، ان میں قیصر خان نظامانی، شکیل صدیقی، رؤف لالہ، عرفان ملک، علی حسن، حنیف راجا، ماجد جہانگیر، سید فرقان حیدر، اقبال مولٹانی، خادم حسین اچوی، خالد ظفر، خالد سلیم موٹا، نعیم گرج، حسن جہانگیر، فرید خان، سلیم آفریدی، ایاز خان، اسلم شیخ، انور اقبال، ایم افرامیم، عارف مہدی، اسلم محمود، عزیز بیچونواز، ولی شیخ، سلیم جاوید، ڈاکٹر مستانہ، شہزاد عالم، نذر حسین، مہتاب شاہ، ایم ایوب، پرویز صدیقی اور سلوی کے نام قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے اپنے مذمتی بیانات میں جو کچھ کہا اس کا لب لباب یہ ہے کہ ہم دہشت گردوں کی بزدلانہ کارروائی کی جتنی بھی مذمت کریں کم ہے۔ ایسے درندہ صفت افراد کو پاکستان ہی نہیں پوری دنیا سے نیست و نابود کر دینا چاہیے۔ ہم شہید ہونے والے معصوم بچوں کے والدین اور اہل خانہ سے دل کی گہرائیوں سے اظہارِ تعزیت کرتے ہیں۔ ہم ان کے غم میں برابر کے شریک ہیں اور دعا گو ہیں کہ رب رحیم و کریم انہیں صبر جمیل عطا فرمائے، آمین غم آمین!!

ممسی کی فلمی نگری کو بھی اس سانحے نے غمزدہ کر دیا۔ برصغیر کے لہجہ فنکار یوسف خان المعروف دلپ کمار نے اس بہیمانہ حملے پر اپنے جذبات کا اظہار کرتے

معروف پاکستانی گلوکار شفقت امانت علی نے دہشت گردی کے اس المناک سانحے پر اپنے احساسات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”کوئی مذہب دہشت گردی اور بربریت کی اجازت نہیں دیتا۔ جن دہشت گردوں نے یہ خونیں کھیل کھیلا ہے ان کا کوئی مذہب نہیں۔ جو مذہب سے برگشتہ ہوتے ہیں، وہ اللہ کے نافرمان بن رہے ہوتے ہیں۔ اللہ ان کی طرف نہیں ہوتا۔ دنیا کے مستقبل کو مارنا اللہ نے نہیں سکھایا۔ اس لیے اللہ کا عذاب ان پر ضرور نازل ہوگا۔“

صدارتی ایوارڈ یافتہ گلوکارہ شاہدہ منی نے اس سانحے عظیم پر اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا ”پشاور کے اسکول میں ہونے والے سانحے کے بعد میں کئی دنوں تک سو نہیں سکی۔ شہید ہونے والے میرے اور اس قوم کے بچے تھے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ وطن عزیز کو دہشت گردوں سے پاک کر دیا جائے۔ ملک کو درپیش اندرونی اور بیرونی خطرات سے نپٹنے کے لیے تمام سیاسی قوتوں کو متحد ہونا پڑے گا۔ پاکستان کی بقا اور سالمیت آپس کے اتحاد و اتفاق میں ہے۔ اس طرز کے واقعات کے بعد لوگوں میں خوف و ہراس پھیلتا ہے۔ اب ہماری سیاسی اور عسکری قیادت کو پوری قوت کے ساتھ ان درندہ صفت دہشت گردوں سے نمٹنا ہوگا۔ پوری قوم اپنی پاک فوج کے ساتھ ہے۔“

لاہور میں فلم انڈسٹری کے زیر اہتمام جو تعزیتی اجلاس ہوا اس میں سجاد بگ، چودھری اعجاز کمران، سعید بٹ، قیصر ثناء اللہ، جونی ملک، پرویز رانا، نسیم حیدر شاہ، سعید رانا، صنم بٹ، عاکف ملک، زید اے زلفی اور اداکارہ نسیم سمیت درجنوں فلم والوں نے شرکت کی۔ اس موقع پر فاتحہ خوانی کی گئی اور شہداء کو خراج عقیدت پیش کیا گیا اور ان کی یاد میں شمعیں روشن کی گئیں۔ مقررین نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”بچوں پر ظلم و بربریت کی انتہا کی گئی ہے۔ دہشت گرد بزدل اور گھٹیا لوگ ہیں۔ جنہوں نے بے گناہ معصوم طالب علموں اور اساتذہ کو بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا۔ حکومت اور سیاست دانوں کو اسٹپ ہو کر دہشت گردی کا خاتمہ کرنا چاہیے۔“

اس نوع کی دیگر مذمتی اور تعزیتی تقریرات کا اہتمام بھی لاہور میں کیا گیا جن میں سید نور، صائمہ، جاوید شیخ، مصطفیٰ قریشی، علی ظفر، عمائمہ ملک، خوشبو، عائشہ خان، ماریہ خان، مہوش حیات، عرفان کھوسٹ، کاشف، محمود، شامل

استعمال کیا گیا نہ ڈانس پیش کیا گیا۔ وہ خود بغیر میک اپ کے نمودار ہوئے۔ بے حد افسردہ چہرے کے ساتھ اس شوکی میزبانی کی۔ انہوں نے پشاور کے آرمی پبلک اسکول میں دہشت گردوں کے ہاتھوں شہید ہونے والے بچوں کے عم میں گہرے دکھ اور افسوس کا اظہار کیا اور اس زندگی کی مذمت کرتے ہوئے کہا۔ ”مذہب کے نام پر بچوں کو قتل کرنے والوں نے قرآن نہیں پڑھا۔“

سلمان خان نے اپنے اس شو کے علاوہ ٹویٹر پر اپنے جذبات کا یوں اظہار کیا۔ ”جہاد کا مطلب کوشش ہے، اچھا بننے کی کوشش۔ جب کہ آج جہاد کا بہت زیادہ غلط مطلب لیا جاتا ہے۔ فسادی لوگوں نے فساد کو جہاد بنا دیا ہے۔“ انہوں نے اپنے اس پیغام میں سوال کیا۔ ”آخر کب تک معصوم بچے انتہا پسندی کی بھیا تک قیمت ادا کرتے رہیں گے؟“ وہ اپنے ٹویٹ میں کہتے ہیں۔ ”ایک معصوم جان بچانا پوری انسانیت کو بچانے کے برابر ہے۔ اسی طرح ایک معصوم اور بے گناہ کی جان لینا پوری انسانیت کی جان لینے کے برابر ہے۔ حتیٰ کہ جنگ کے دوران بھی بچوں، عورتوں، بزرگوں، مذہبی عبادت گاہوں اور زراعت کو نشانہ بنانے کی ممانعت کی گئی ہے۔ پیغمبر اسلام کا تو ارشاد پاک ہے۔ ”وہ ہم میں سے نہیں جس کے ہاتھ اور جس کی زبان سے دوسرے محفوظ نہ ہوں۔“

ممبئی فلم انڈسٹری کے نامور اداکار انوپم کھیر نے سانحہ پشاور کے بعد دہشت گردوں کے نام ایک کھلے خط میں کہا ہے ”ہر مرتبہ جب تم دہشت گردی کرتے ہو تو میں تھوڑا سا مر جاتا ہوں۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں بہت عرصہ سے تھوڑا تھوڑا مرتا جا رہا ہوں۔ میں اس وقت مراجب شہری علاقوں میں بم دھماکے ہوئے۔ جب عام لوگوں کو یہ خیال بنایا گیا۔ جب طیارے ہائی جیک ہوئے۔ جب اپنا دفاع نہ کر پانے والے کمزور ہلاک ہوئے اور جب نیتے غلاموں کی طرح بیچ دیے گئے۔ لیکن آج جب تم نے 130 سے زائد بچوں کو پشاور کے ایک اسکول میں سنگ دلائے قتل کیا تو مجھے ڈر ہے کہ میرے اندر مزید مرنے کے لیے کچھ نہیں رہا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس بربریت کے پیچھے تمہارے کیا مقاصد تھے لیکن تم نے مجھے چلتی پھرتی لاش میں بدل دیا ہے۔ تم بچوں کو قتل کرنے کا کیا جواز پیش کر سکتے ہو؟ کیا معصوم چہروں پر گولیاں برسوانے کے لیے بہادری کا ایسا ہی مظاہرہ کرنا چاہیے؟ تم نے ان بچوں پر شیطانی دہشت گردی

ہوئے کہا۔ ”میں نے یہ المناک خبر سنی تو مجھے ایک دھچکا لگا۔ اس سانحے پر میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔ اس دکھ کو لفظوں میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔“ انہوں نے پہلی بار کسی ویب سائٹ پر پیغام دیا ہے جس میں معصوم بچوں کی شہادت پر اپنے گہرے دکھ اور افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”طالبان دہشت گردوں نے پشاور کے اسکول میں جس زندگی کا مظاہرہ کیا ہے وہ میرے لیے ناقابل فراموش ہے۔ طالبان کا جرم اب ناقابل معافی ہے۔“

یہ بات یاد رہے کہ دلیپ کمار کی جنم بھومی پشاور ہے۔ اس حوالے سے بھی انہیں پشاور اور اس کے شہریوں سے ایک خاص انیسیت ہے۔ ان کا یہ کہنا ”میرا دل چاہتا ہے کہ اڑکر ان غمزدہ والدین کے پاس پہنچ جاؤں جن کے بچے اس سانحے میں ان سے چھن گئے ہیں۔“ اس امر کی نشاندہی ہے کہ انہیں آج بھی اس شہر اور اس کے لوگوں سے کس قدر محبت ہے۔ جب کہ ایک درد مند دل رکھنے والے حساس فنکار کی حیثیت سے بھی اس سانحے پر دکھی ہونا ایک فطری امر ہے۔

بھارت کے میگا انٹار ایٹا بھنگن نے پشاور کے آرمی پبلک اسکول پر طالبان کے بزدلانہ حملے پر اپنے احساسات کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ وقت دعا ہے کہ مذہب کے داعی اب معصوم بچوں پر بھی رحم نہیں کرتے۔“ انہوں نے بڑے دکھ کے ساتھ کہا۔ ”اس سانحے پر اظہار خیال کرنا بہت مشکل ہے۔“ انہوں نے اپنے ایک بلاگ میں اس سانحے کا شکار ہونے والوں سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ”ہلاک شدگان اور بچ جانے والے بچوں کے لیے دنیا کی جانی چاہیے۔“ 72 سالہ بالی ووڈ اسٹار کو اس المناک سانحے پر ناقابل بیان صدمہ پہنچا ہے جس کا اظہار وہ لفظوں میں نہیں کر سکتے۔ ”میں اس موقع پر اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتا کہ آگے بڑھیں اور اس دہشت گردی کے بے لگام گھوڑے کے منہ میں لگام دیں۔ دہشت گردوں کو روکیں اور اس بربریت کو پروان چڑھنے کا ذرا بھی موقع نہ دیں۔“

بالی ووڈ فلموں کی اہم ترین ضرورت اور عوام کے لوں کی دھڑکن دینگ خان پشاور اسکول کے سانحے پر اس نذر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اپنے مشہور ٹی وی شو ”بگ س 8“ اس سانحے کے بعد روٹین سے ہٹ کر کیا۔ اس شو ل انہوں نے پشاور کے متاثر طلبہ کے سوگ میں سیاہ لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ جب کہ اس روز اس شو میں میوزک کا

وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”میری والدہ مسلمان تھیں۔ انہوں نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایک قول کے بارے میں مجھے بتایا تھا جو آج بھی مجھے یاد ہے کہ ”مسلمان وہ ہے جس کے قول اور فعل سے دوسرے شخص کو نقصان نہ پہنچے۔“ لیکن آج یہ عالم ہے کہ بھائی بھائی کو مار رہا ہے۔ ”ایسے دہشت گرد بھی مسلمان نہیں ہو سکتے جو اپنے بھائیوں اور بچوں کا خون بہائیں۔“

مہیش بھٹ نے دو ٹوک الفاظ میں کہا۔ ”سانحہ پشاور انتہائی قابلِ مذمت ہے۔ پاکستان کے تمام لوگوں کو متحد ہو کر دہشت گردی سے نمٹنا چاہیے۔“

نامور نغمہ نگار اور کہانی نویس جاوید اختر کے ہدایت کار اور اداکار بیٹے فرحان اختر پشاور سانحے سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہیں اپنے جذبات پر قابو رکھنا مشکل ہو گیا۔ انہوں نے اپنے گہرے صدمے کا اظہار کرتے ہوئے ٹویٹ کیا۔ ”میرا دل ٹوٹ گیا ہے۔ یہ انتہائی تکلیف دہ سانحہ ہے۔ خدا مجھے اس صدمے کو برداشت کرنے کا حوصلہ دے۔“

بالی ووڈ کی معروف نغمہ نگار پرورش جوشی آرمی پبلک اسکول پشاور کے طلب علموں کے سپہانہ قتل پر صدمے سے نڈھال ہو گئیں۔ اپنے اس دلی دکھ کا اظہار انہوں نے اپنی ایک نظم میں کیا ہے جس میں وہ کہتی ہیں۔ ”اس واقعے پر تو آسمان کو زور شور سے رونا چاہیے اور تہذیبوں کی گردنیں بھی شرم سے جھک جانی چاہیے۔ یہ ماتم کا وقت تو ہے ہی لیکن سوچنے اور غور و فکر کرنے کا وقت بھی آ گیا ہے کہ دہشت گردی کے اس کینسر کو کیسے ختم کیا جائے؟“

بھارتی اداکارہ دیا مرزا نے پشاور سانحہ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ المناک صورتِ حال ہے۔ اس پر قابو پانا تمام لوگوں کی ذمہ داری ہے۔“

بالی ووڈ اداکارہ بیپا شاماسو کا کہنا ہے۔ ”میں نہیں جانتی انسان کس طرح دہشت گرد بن جاتا ہے اور دنیا کو دہشت زدہ کرنے کے لیے پھول جیسے بچوں کو اپنی بربریت کا نشانہ بناتا ہے۔“

ممبئی فلم انڈسٹری کی بنگالی اداکارہ رانی کھرچی نے نئی دہلی میں سانحہ پشاور کے شہید طالب علموں کی یاد میں شمعیں روشن کرتے ہوئے کہا۔ ”اس بربریت پر سفاک قاتلوں کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔ نہتے بچوں پر گولیاں برسوانے والے درندوں سے بھی بدتر ہیں۔“

کی جو یہ بھی نہیں جانتے کہ تنازعات کیا ہوتے ہیں۔ کوئی بھی مذہب بچوں کو قتل کرنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتا۔ تم نے آج جس بربریت کا مظاہرہ کیا ہے اس کی لفظوں میں مذمت ممکن نہیں۔ یہ سچ ہے کہ تاریخ بڑے پیمانے پر قتل عام کے واقعات سے بھری پڑی ہے لیکن وہ زیادہ تر سیاسی تحریکوں یا ایسے ہی تنازعات کا شاخسانہ تھے لیکن تم نے آج معصوم بچوں کا جس طرح قتل عام کیا ہے، اس کی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔“ انوپم کھیر نے اپنے کلمے خطبہ میں مزید لکھا ”مجھے نہیں معلوم کہ تم کس طبقے یا کس سوچ سے تعلق رکھتے ہو کیوں کہ جانوروں کو بھی صرف بھوک مٹانے یا خوف کی وجہ سے مارا جاتا ہے۔ درحقیقت تم شیطان سے بھی بدتر ہو۔ جنگوں کی تصویریں دیکھ کر میں جذباتی ہو جاتا ہوں لیکن آج ایسا نہیں ہوا۔ آج میں نے اس والد کی تھوڑی دیکھی ہے جس نے بیٹے کو اسکول بھیجنے سے پہلے خود اپنے ہاتھوں سے اس کے جوتوں کے تسمے باندھے تھے۔ غمزداد باپ کہہ رہا تھا۔ ”میرے پاس جوتے تو ہیں لیکن میرا بیٹا نہیں ہے۔“ میں اس پر جذباتی نہیں ہوا بلکہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ آج تمہارے یا گلہ پن نے ہر جگہ والدین کو ایک کر دیا ہے جو سب مل کر تمہیں کوس رہے ہیں اور وقت بہت کر دے گا کہ ان کا کون سا ضائع نہیں گیا۔“

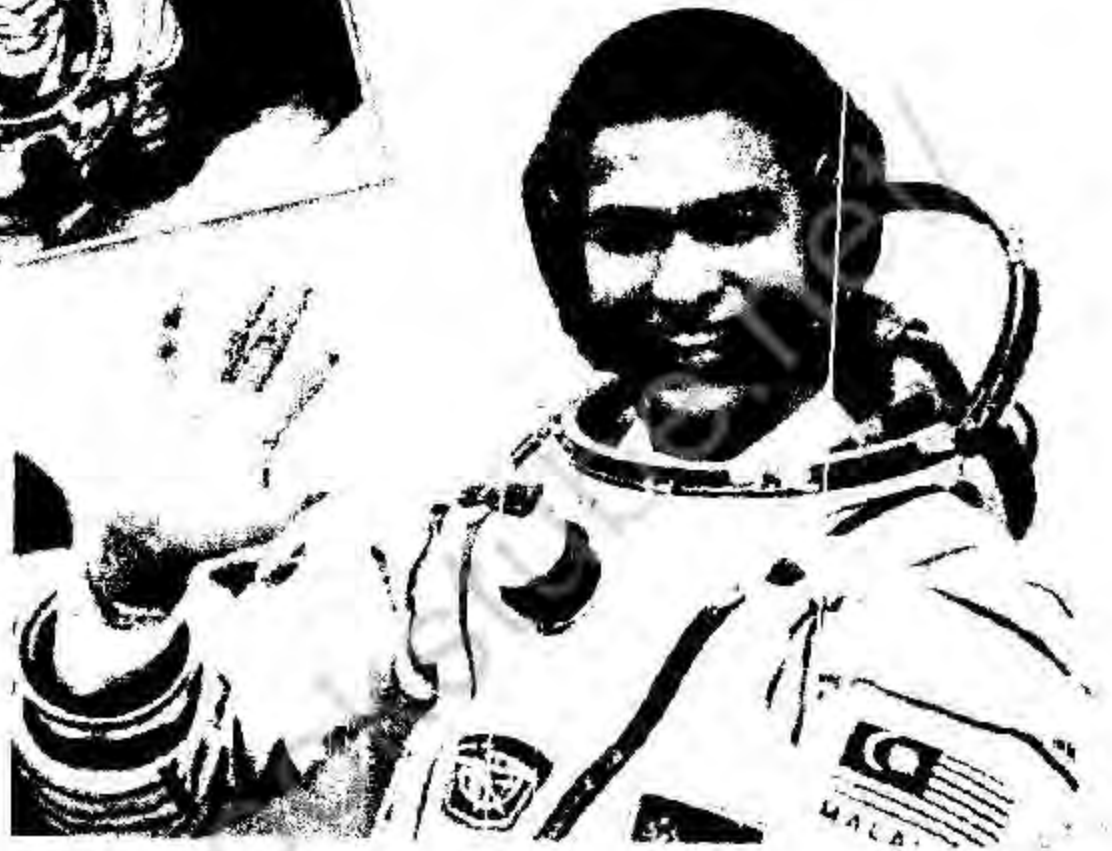
بالی ووڈ کنگ خان نے پشاور کے اسکول میں پھول جیسے طالب علموں کے قتل عام پر اپنے دلی دکھ کا اظہار کرتے ہوئے اپنے ٹویٹ میں لکھا۔ ”بچوں کے ساتھ رہنے سے ہمارے دلوں کو امن و شانتی حاصل ہوتی ہے۔ جب کہ ایسے لوگوں کے لیے میرے دل میں بے انتہا نفرت ہے جو امن کے سفیروں پر حملہ کرتے ہیں۔“ شاہ رخ خان نے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے مزید لکھا۔ ”بچوں سے ہی روح کو تسکین ملتی ہے۔ ان لوگوں سے مجھے شدید نفرت کا احساس ہو رہا ہے جنہوں نے ہمارا مستقبل، ہمارے بچے اور ہمارے دل کا سکون چھین لیا ہے۔“ یاد رہے کہ شاہ رخ خان بھی پشاور کے ہیں۔

بھارت کے معروف فلم ساز مہیش بھٹ جن کا پاکستانی فلم انڈسٹری اور فلم والوں سے قریبی تعلق ہے اور جو اپنی فلموں کے ذریعے بھی دونوں ملکوں کی ثقافت اور روایات کا تبادلہ کرتے رہتے ہیں۔ انہوں نے پشاور کے المناک سانحہ کے بعد اپنے ایک انٹرویو میں کہا۔ ”دہشت گرد کبھی بھی مسلمان نہیں ہو سکتے۔“ انہوں نے اپنی اس بات کی

خلا میں اذان دینے والے اور روزہ رکھنے والے پہلے شخص کا ذکر خاص

ابن کبیر

خلا میں نماز



سیارۃ زمین سے اوپر بہت اوپر خلائی اسعوتوں میں جب پہلی بار اذان کی آواز گونجی، پہلے شخص نے رمضانوں کے روزہ رکھے اور اس کے لیے حکومت کی طرف سے علما کمیٹی بنی، غور و خوض کے بعد 18 صفحے پر محیط سفارشات مرتب ہو گئیں جس میں دیگر ممالک کے جید علما کے فتوے بھی شامل تھے۔ جس میں خلا کی وسعتوں میں کس رخ پر سجدہ کیا جائے۔ نماز کے وقت کا تعین کس طرح ہو۔ روزہ کے لیے احکام کیا ہیں۔ کس طرح سحر و افطار کے وقت کا تعین ہو اور یہ سفارشات صرف یک شخص کے لیے مرتب ہوئی۔ وہ شخص کون ہے کس ملک کا رہائشی ہے۔

وہاں ستاروں کے جھرمٹ اور محو حرکت سیاروں کے درمیان اس کا گھر کسی چراغ سا چمک رہا تھا۔ زمین کے متر فیصدھے پر موجود نیلا سمندر گندی مٹی کے ملاپ سے سحر انگیز امتزاج پیدا کر رہا تھا۔

اس نے گہرا سانس لیا۔ شمسی حرکت دل تک گئی، جو

فروری 2015ء

زمین سے بہت دور، خلا کی ازلی خاموشی میں تیرتے اسپیس اسٹیشن میں کچھ ہلچل ہوئی۔ اسٹیشن کے اندرونی حصے میں نصب چھوٹے سے آپٹیکر سے اذان نشر ہوئی اور وہ کمزور پڑ چکی کشش ثقل میں تیرتا اپنے کیبن کی سمت بڑھنے لگا۔

دیز، شفاف شیشے کے پاس وہ کچھ پلوں کو ٹھہر گیا۔

ماہنامہ سرگزشت

62

دور، بادلوں کے پیچھے چاند کی ہلکی سی شیبہ تھی، جس نے اس کے معصوم ہونٹوں پر مسکراہٹ سجادی۔

ایک ہی آسمان میں سورج اور چاند کو بیک وقت دیکھنا اس کے لیے ہمیشہ ہی محوِ فکر رہا۔

اچانک نظر شمالی افق پر پڑی۔ وہاں، بلند یوں پر کوئی شے حرکت کر رہی تھی۔ ایک ہوائی جہاز، جو دسعتوں کو چیر کر برق رفتاری سے آگے بڑھ رہا تھا۔ پیچھے دھوئیں کی دبیز لکیر تھی۔

اس نے تیزی سے ہاتھ بڑھا کر مٹھی بند کر لی۔ ایک لمحے کو لگا، جیسے اس نے جہاز قید کر لیا ہو۔

انگلے ہی بل جہاز پھر آسمان میں ظاہر ہوا۔ اس نے مٹھی کھولی۔ نظریں اس وقت تک جہاز پر لگی رہیں، جب تک وہ افلاک کی دسعتوں میں غائب نہیں ہو گیا۔

سورج پوری طرح ڈوب چکا تھا۔ بادلوں سے تاک جھانک کرتے چاند کے ساتھ اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی۔ موذن قلاح کی سمت پکار رہا تھا۔ نمازیوں نے وضو بنایا اور مسجد کی جانب چل دیے۔

”منظر۔ کیا ارادے ہیں؟“ گلی سے کسی نے پکارا۔

اس نے نیچے جھانکا۔ اسٹریٹ لائٹ کی کمزور پڑتی روشنی میں اسے اپنا دوست یونس نظر آیا۔ ”نماز کے لیے نہیں چلنا کیا؟“

”ابھی آیا۔“ وہ غسل خانے میں گھس گیا۔ وضو بناتے ہوئے یاد آیا کہ رمضان شروع ہونے میں صرف ایک ہفتہ باقی ہے۔ روزے رکھنے کی خواہش سات سالہ بچے کے دل میں پروان چڑھنے لگی۔

کچھ ہی دیر میں وہ سیلن زدہ زینہ عبور کر کے گلی میں پہنچ چکا تھا۔

”اس بار میں نے روزے رکھنے کا ارادہ کر رکھا ہے۔“ اس نے چھوٹے ہی کہا۔

”گرمیوں کے روزے۔“ یونس نے گردن ہلائی۔

”ٹھیک ہے۔ وہ میرے والد کہتے ہیں نا، ہمت مرداں مرد خدا۔“

دونوں دوست مسجد کی سمت چل دیے۔ مظفر نے پھر آسمان کی سمت دیکھا۔ دھوئیں کی لکیر اب تیزی سے بھرتی جا رہی تھی۔ اس بار لڑکے نے لکیر کو مٹھی میں بند کرنے کی کوشش کی اور انگلے ہی بل اپنی حرکت پر ہنس پڑا۔ پاس سے گزرتے

اس ہستی کی ثناء سے بھرا تھا، جو مشرق و مغرب کا مالک ہے۔ جس نے لامتناہی کائنات کے ہر ذرے پر اپنی مہر ثبت کر رکھی ہے۔

”اور تم اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے۔“ اس نے زیر لب کہا۔

لطفات میں تیرتا وہ شیشیل کے اس حصے میں پہنچا، جہاں آکسیجن کا انتظام تھا۔ سوٹ سے آزاد ہونے کے بعد نظر ماچھکوف پر پڑی۔

روسی نے گردن ہلائی۔ ”تو تمہاری عبادت کا وقت ہو گیا؟“

”ہاں، عصر کی نماز۔“ اس کی چھوٹی، سیاہ آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس نے اپنے پیروں کو مقناطیسی فلور سے جوے لوئگ بوٹ میں قید کیا، تاکہ صفر کشش ثقل میں ایستادہ ہو سکے۔

جب ماچھکوف نے سوال کیا کہ اس مشق کی کیا ضرورت جب علماء نے خلا میں اشارے سے نماز پڑھنے کی اجازت دے رکھی ہے، تو وہ مسکرایا۔ ”کیونکہ یہ عمل مجھے خوش بخشتا ہے۔“

یہ ایک خواب کا سفر تھا۔ خواب، جو وہ بچپن سے دیکھتا آیا تھا، جس کی تکمیل اب سے دو روز قبل ایک پُر قوت راکٹ کے ذریعے اسے یہاں لے آئی۔ اور اب وہ زمین سے میلوں پرے اپنے رب کے حضور سجدہ ریز تھا۔ نماز کی ادائیگی کے بعد وہ میز تک گیا۔ کچھ دیر مختلف مرتبانوں کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر جوس کا پیکٹ اور سینڈویچ لے کر کھانے کی میز تک پہنچا۔ کچھ ہی دیر میں قازقستان کے شہر بایکونور میں نماز مغرب کا وقت ہوا چاہتا تھا۔

وہ وہیں کے اوقات کے مطابق روزہ افطارہ کیا کرتا تھا۔ اور وہ ایسا کرنے والا دنیا کا پہلا شخص تھا۔

☆.....☆

جولائی کی آخری کریمیں کھڑکی کی چوکھٹ پر دھیرے دھیرے سمٹنے لگیں تو ہتھیوں نے اپنے گھونسلوں کا رخ اختیار کیا۔

گلی میں کھیلتے بچے گھروں کی سمت چل دیے۔ اپنے کمرے میں داخل ہونے کے بعد اس نے گیند ایک سمت اچھالی، جوتے اتارے اور کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ سورج لگ بھگ ڈوب چکا تھا۔ آسمان میں چھائی زروروشنی میں کہیں

”تمہیں اس ملک کے لیے مثال بننا ہے۔ ہمارے

خاندان کا نام روشن کرنا ہے۔“

سیاہ آنکھوں والا معصوم بچہ، جس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اُس میں ایک وجیہہ مرد پوشیدہ ہے، اپنے باپ کی باتیں پوری طرح تو نہیں سمجھ پاتا مگر یہ ضرور جان لیتا کہ اس کا تعلق کسی بلند جذبے سے ہے۔ ایسا جذبہ جو اظہار کے وقت اس کے باپ کے چہرے پر چمکتا۔ جس کی دمک ماں کی آنکھوں میں نظر آتی اور جس کی ہمک وہ اپنے خوابوں میں پاتا جہاں وہ فضا میں پرواز کر رہا ہوتا۔

ہاں، پرواز۔ معتدل موسموں والے شہر کے اس بچے کے دل کے نہاں گوشوں میں اس آرزو نے کب جنم لیا، اس بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے مگر سچ یہ ہے کہ وہ کبھی ایک پل کو بھی اس خواہش سے جان نہیں چھڑا سکا۔

نصابی کتابوں سے الجھتے ہوئے، شہر کی بلند و بالا عمارتوں کے پہلو سے گزرتے ہوئے اور گلی میں بچوں کے ساتھ قبائل کھیلتے ہوئے وہ اس خواہش کو اپنے اندر ڈوتا محسوس کرتا۔ یہ اس وقت بھی ساتھ تھی، جب اُس نے طب کی تعلیم حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس وقت بھی جب آپریشن تھیٹر میں پہلا چیرا لگایا۔ اس وقت بھی، جب ایک دو شیرہ کو کبرے کی کائنات میں اپنے روبرو پایا۔ اس خواہش نے بھی چھپا نہیں چھوڑا۔

ہاں، ایک لمحہ ایسا ضرور ہوتا جب یہ بے چین خواہش کچھ شانت ہو جاتی، کچھ ٹھہر جاتی۔ ایسا تب ہوتا، جب کوالا لپور کی فضاؤں میں اذان گونجتی اور مؤذن شہر کے باسیوں کو فلاح کی سمت پکارتا۔

☆.....☆

موار... ملائیشیا کا دوسرا بڑا شہر۔ شاہوں کی راجدھانی اور مظفر کی پہلی درس گاہ۔

موار جو نیر سائنس کالج کا شمار ملک کی بہترین درس گاہوں میں ہوتا تھا۔ وہاں تک رسائی ان ہی طلباء کے حصے میں آتی جو کتابوں کو کھلونوں سے زیادہ عزیز رکھتے۔ جو چھٹی کا انتظار نہیں کرتے بلکہ اس کھٹی کے منتظر رہتے جو اسکول شروع ہونے کا اعلان کرے... اور مظفر ان میں سے ایک تھا۔ ایک مہذب شخص کا تہذیب یافتہ بیٹا۔ جس کی مسکراہٹ اور آنکھیں اپنی حلیم ماں سی تھیں۔

یہ وہ زمانہ ہے، جب امریکا کی Pioneer 10 نامی خلائی گاڑی نظام شمسی کے کنارے پہنچنے میں کامیاب

بڑے میاں نے اسے گھورا۔

وہ کوالا لپور میں غروب ہونے والا جو اکی 1979 کا آخری سورج تھا۔ نیل آرماسٹرنگ کو چاند پر قدم رکھے دس برس بیت چکے تھے۔ ناسا نے مریخ بھی فتح کر لیا تھا۔ خلائی محاذ پر سوویت یونین کو پے در پے شکست ہو رہی تھی۔ مگر فلکستوں کے اس سلسلے سے جزیرہ نما ملائیشیا میں مقیم شیخ مظفر شکور کی قسمت پر کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا۔ قدرت کا منصوبہ بے عیب تھا۔

☆.....☆

باپ عرب، ماں ملائی۔ دوھیال صحراؤں میں مقیم اور نھیال ساحلوں پر آباد۔ مگر نہ تو وہ ملائی تھا، نہ ہی عرب۔ اپنے بیٹے کے مستقبل کے بارے میں پاپے شیخ محی الدین واضح نہ ہو، مگر اس کی شناخت سے متعلق وہ واضح سوچ رکھتا تھا۔

”یہ ایک سچا مسلمان بنے گا۔ پانچ وقت، کا نمازی۔ ملائیشیا کے لیے قابل تقلید مثال۔“

عورت مسکرا دی۔ دل میں سوچا، یہ عرب بھی خوب ہیں، ٹھیک ہے پوت۔ کے پاؤں پالنے ہی میں نظر آ جاتے ہیں، پر ایسا بھی کیا دیکھ لیا اپنے بیٹے میں۔ البتہ نماز والی بات پر وہ خوش ہوئی۔ خود بھی صوم و صلوة کی پابند تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا، جب اگست 1957 میں برطانوی سامراج سے آزاد ہونے والی جنوب مشرقی ایشیا کی یہ ریاست دھیرے دھیرے اپنے ہیروں پر کھڑی ہونے لگی تھی۔ بالخصوص دار الحکومت میں بسنے والی معیشت کے اثرات نظر آنے لگے۔ پختہ سڑکیں۔ بلند عمارتیں۔ نکاسی و فراہمی آب کا جدید نظام۔ اور ہاں، بے شمار مساجد۔ جن میں چند تو مسلم طرز تعمیر کا شاہکار تھیں۔

یوں تو ملائیشیا میں اور تو میں بھی آباد تھیں، دیگر مذاہب کے ماننے والوں کو بھی مکمل آزادی تھی، مگر اکثریت ملائی مسلمانوں کی تھی۔ ریاستی مذہب بھی اسلام تھا۔

شیخ محی الدین نے، جو کھجوروں اور سخت روٹی کو مرغوب ترین غذا تصور کرتا، خود۔ سے عہد کیا کہ وہ اپنے بچے کو ایک سچا مسلمان بنائے گا۔ اوائل عمری ہی سے اپنے ساتھ مسجد لے جانے لگا۔ اسے بنیادی عقائد سے آگاہ کرنے کا عمل اسی وقت شروع کر دیا، جب عام بچے کھیل کود میں معروف ہوتے۔ ساتھ ہی وہ ایک اور خیال بچے کے ذہن میں راسخ کر رہا تھا۔

ہوئی تھی۔ یہ رواد مظفر نے کالج میگزین میں پڑھی۔ یہ جان کر اس کی خوشی دو چند ہوئی کہ ناسا کی اس خلائی گاڑی کو اسی برس خلا میں چھوڑا گیا تھا جب اس نے خوشیوں کی اس دنیا میں آنکھ کھولی تھی۔

اس نے Pioneer 10 کی تصاویر کاٹ کر کمرے کی دیوار پر چسپاں کر لیں۔ وہاں اور بھی کئی تصاویر تھیں۔ ایک میں نیل آرماسٹرنگ چاند پر کھڑا ہے، ایک میں راکٹ شعلے اگلتا ہوا فضا میں بلند ہو رہا ہے، ایک میں خلا میں تیرتے خلا باز کے پیچھے نیلی زمین دکھائی دے رہی ہے۔ یہی وہ تصویر تھی جس نے اسے دیوانہ بنا رکھا تھا۔ وہ تصویر میں موجود خلا باز کی جگہ لیٹا چاہتا تھا۔ وہاں بلندی سے اس حسین دھرتی کا جو کائنات میں زندگی کی قوت سے ہمک رہی تھی، مشاہدہ کرنا چاہتا تھا۔

وہ خوابوں میں جی رہا تھا اور قدرت مسکرا رہی تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اُس کی تقدیر میں کیا لکھا ہے۔

یوں تو موار میں موسم شانت رہتا مگر سالانہ نتائج کے اعلان والے روز نہ جانے کہاں سے گھنے بادل اُٹھ آئے۔ کچھ ہی دیر میں گھن گرج کے ساتھ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ کھلی فضا میں ہونے والی تقریب کو ہال میں منتقل کر دیا گیا اور بچوں کے والدین کو کسی نہ کسی طرح پہنچ گئے مگر کوالا پور سے آنے والا شیخ محی الدین اب تک نہیں پہنچا تھا۔ مظفر کی نظریں بار بار دروازے کی طرف اٹھیں اور پھر مایوس لوٹ آئیں۔

اچانک اتر پر کچھ مانوس چہرے نمودار ہوئے۔ اس کی کلاس کے نتائج کا اعلان ہونے کو تھا۔ مظفر نے گہرا سانس لیا۔ کھڑکی پر نظر ڈالی جہاں بارش دستک دے رہی تھی اور باہر دھند چھائی ہوئی تھی۔

اس کے کلاس ٹیچر نے تیسری پوزیشن اپنے والے بچے کا نام پکارا۔ اس کا عزیز ترین دوست بے یقینی کے ساتھ اٹھا اور تالیوں کی گونج میں اسٹیج کی سمت بڑھنے لگا۔ پھر دوسری پوزیشن پانے والے کا نام ہال میں گونجا اور بادل زور سے گرجے۔

مظفر مایوسی میں اتر گیا۔ یقین ہو گیا کہ اس بار وہ پوزیشن لینے میں ناکام رہا ہے۔ خود سے کہا۔ ”اٹھا ہوا کہ آج ڈیڈ نہیں آئے۔ انیس، کتنا دکھ ہوتا۔“

اس بار بادل کچھ زیادہ ہی زور سے گرجا۔ یوں جیسے توڑ پھوڑ کرتا ہوا ہال میں چلا آئے گا۔ سب کی نظریں دروازے کی سمت اٹھ گئیں۔ کچھ لمحے وہ ٹوڈ بانہ خاموشی سے دروازے کی

سمت دیکھتے رہے۔ اچانک دروازہ ایک دھماکے سے کھلا۔ بارش کی بو چھاڑا اندر داخل ہوئی اور ایک بھگا ہوا شخص نظر آیا۔ وہ ٹھٹھہر رہا تھا۔

”ڈیڈ آپ آگئے۔“ مظفر نے چیخ ماری اور دوڑتے ہوئے اس سے لپٹ گیا۔ دو آدمی بھاگے بھاگے گئے اور تالیوں لے آئے۔ آدمی نے خود کو خشک کیا اور مظفر کی ساتھ والی نشست پر بیٹھ گیا۔

”کئی کیسی ہیں؟ میرا کراچھوٹو کو تو نہیں دے دیا؟ مسجد کے امام صاحب کی طبیعت کیسی ہے؟“ اس کے پاس ڈھیروں سوال تھے۔

آدمی مسکراتا رہا۔ بچہ دم لینے کو رکھا تو پوچھا۔ ”آج میں خاصا لیٹ ہو گیا۔ کیا تمہاری کلاس کا رزلٹ سنا دیا گیا ہے؟“

”ہاں۔“ بچے کے لہجے میں کچھ مایوسی تھی۔ باپ نے اسے تھکی دی۔ اسٹیج سے میزبان کی آواز سنائی دی۔

”اور پہلی پوزیشن لی ہے شیخ مظفر شکور نے۔“

یہ وہ جملہ تھا، جس پر یقین کرنے میں اس کے مصوم ذہن کو تھوڑا وقت لگا۔ جب وہ تالیوں کے حوصلہ افزا شور میں اسٹیج کی سمت بڑھ رہا تھا، اساتذہ کے شفیق چہروں پر مسرت دکنے لگی۔ زینے پر قدم رکھنے سے قبل اس نے مز کر اپنے باپ کی طرف دیکھا۔ وہاں یقین کا دریا موجزن تھا۔

اُس کا باپ... وہ عرب لا علم تھا کہ اس بھیکے ہوئے لمحے اس کی نظریں ملائیشیا کے مستقبل پر تکی ہیں۔ اس کا بیٹا، استعارہ کی شکل اختیار کرنے والا ہے۔

وہ دوپہر، جب موار میں موسلا دھار بارش ہو رہی تھی اور ایک ننھا طالب علم پہلی پوزیشن کا میڈل گلے میں ڈالے مسکراتا ہوا تھا، Pioneer 10 نے نظام شمسی کے کنارے سے واپسی کا سفر شروع کر دیا۔ اس کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔

☆.....☆

اس نے چیتے سی جست لگائی۔ ایک کسرتی بدن پانی کو تیز دھار آلے کی طرح چیرتا ہوا غائب ہو گیا۔ اس کے بازوؤں میں بجلیاں بھری تھیں۔ وہ برقی رفتار سے آگے بڑھ رہا تھا۔ سیکڑوں لوگوں کے بڑجوش نعرے حوصلہ بڑھاتے رہے۔ سوئمنگ پول کے کنارے کھڑا کوچ چیخ چیخ کر ہدایات جاری کر رہا تھا۔ مگر وہ انہیں نہیں سن رہا تھا۔ اس کا دل دعائیہ کلمات کے ساتھ سانس لے رہا تھا کہ فتح قریب تھی۔

وہ شیخ مظفر تھا۔ موار جو نیر سائنس کالج کا طالب علم۔ مگر اُس قیمتی لمحے وہ درس گاہوں کے مابین کسی مقابلے میں شریک نہ تھا۔ اس کے مذمقابل طالب علم نہیں تھے۔ یہ تو مشکل لیول پر ہونے والا ایک کانٹے دار مقابلہ تھا جس میں کسرتی بدن والے خوش شکل مظفر نے سب کو گرویدہ بنا لیا۔ وہ شرکاء میں سب سے کم عمر تھا مگر عزم سب سے بلند۔

1982ء کے سن کا تذکرہ تیرا کی کے شائقین کبھی اُس کے بغیر نہیں کرتے۔ جب کبھی یہ موضوع لکھتا خود سے کہتے: ”ہاں، وہ پہلی پوزیشن حاصل نہیں کر سکا، مگر اس نے دوسروں کو ناکوں... چنے چبوا دیے۔“

جب ایک خصوصی انٹرویو میں ایک دل نشیں صحافی نے اس کی حیران کن کارکردگی کی بابت سوال کیا تو وہ مسکرایا۔ ”بہت سادہ ہے، اگر آپ کے ذہن میں یقین کا تن اور درخت ہو، تو اس کے پھل آپ کی جھولی میں گرنے لگتے ہیں۔ ذہنی یقین، جسمانی معجزے دکھاتا ہے۔“

لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اگلے برس پھر تیر کی کے مقابلوں میں جا دو جگائے گا مگر یہ کیا، مظفر تو اب داستان گو بن گیا تھا۔ 84ء میں جب ریاستی سطح پر داستان گوئی کا مقابلہ ہوا تو لوگوں نے شیخ محی الدین کے بیٹے کو ہاتھوں کی شکارانہ حرکت، چہرے کے اتار چڑھاؤ اور آواز کے زیر و بم کی مدد سے ایک سحر انگیز کہانی سناتے دیکھا۔ انہیں لگا، جیسے تاریخ کے جھروکوں سے کوئی قصہ گو برآمد ہوا ہے جس نے انہیں اللہ کے گرد بٹھالیا ہے اور وہ وقت سے ماوراء ہو گئے ہیں۔ جب مقابلے کے آخر میں اسے فاتح ٹھہرایا گیا تو کسی کو تیرت نہیں ہوئی۔ خود مظفر بھی متحیر نظر نہیں آیا۔ یقین کے درخت پر لگے پھل جھولی میں گرنے لگے تھے۔

87ء میں پھر اس نے ایک کڑے مقابلے میں حصہ لیا مگر نہ تو وہاں کوئی سونٹنگ پل تھا، نہ ہی کوئی اسٹیج۔ وہ تو ٹینس کورٹ تھا۔ موار کالج کا چھوٹا اب ٹینس ریکٹ تھا۔ کھڑا تھا اور وہ لوگ جو اسے جانتے تھے، حیرت سے تنک رہے تھے۔ ان کے ذہنوں میں سوال تھا۔ ”یہ شخص ہے کیا؟ ایک منفرہ ایک تیراک، ایک داستان گو یا ایک ٹینس پلیئر؟“

آج ہم جانتے ہیں کہ ان کے سوالات محدود تھے۔ جتنا وہ سوچ سکتے تھے، سمجھ سکتے تھے، شیخ مظفر شکور اس سے کچھ بڑھ کر تھا۔ وہ ملائیشیا کے لیے قدرت کا تحفہ خاص تھا۔

☆.....☆

”بھارت کا رخ کرو تو آگرہ ضرور جانا۔ وہاں محبت کی

ایک زندہ یادگار ہے جسے تاج محل کہتے ہیں۔ شاہجہاں اور ممتاز کی محبت کے گیت آج بھی سنائی دیتے ہیں۔“

یہ وہ بات تھی، جو دو عشروں قبل دہلی سے یہاں آ کر آباد ہونے والے اس کے بڑی مسٹرنا صرا کٹر کہا کرتے تھے۔ جب انہیں پتا چلا کہ وہ واقعی ہندوستان جا رہا ہے تو اسے ہمایوں کے مزار اور لال قلعہ کی تاریخ بتانے کے ساتھ خصوصی نصیحت کی کہ دہلی جائے تو جامع مسجد میں دو نفل ادا کرے۔ اور اگر وقت ہو تو قطب مینار اور دریائے جمنا کی سیر کو بھی جائے۔ مسٹرنا صرنے تو اس کے لیے پورا سفری ہدایت نامہ تیار کر لیا تھا۔

مگر وہ آگرہ یا دہلی نہیں، کرناٹک کے ضلع ادوپی جا رہا تھا، جو اپنی زرخیز ثقافت، مندروں اور ماہی گیروں کے لیے مشہور تھا۔ مگر جہاں کہیں، تو وہ ادوپی بھی نہیں جا رہا تھا، اس کی منزل تو بحیرہ عرب سے آٹھ میل دور واقع چھوٹا سا علاقہ یعنی پال تھا۔

اب ہمارا مظفر کستر بے میڈیکل کالج کا طالب علم تھا۔ اور مینی پال اس سے ملحقہ یونیورسٹی ٹاؤن تھا۔ ویسا علاقہ وہ قطعی نہیں تھا، جس کا سفر اختیار کرنے سے قبل دوست احباب آپ کو مشورے دیں کہ فلاں فلاں جگہ ضرور جانا۔ یہ ایک پرسکون قصہ تھا۔ جہاں مقیم لگ بھگ تمام افراد کا تعلق میڈیکل کالج سے تھا۔ وہاں خاموشی چھائی رہتی۔ نہ تو بازاروں کا شور، نہ ہی ٹریفک کا زور۔ بس کوئل کی کوک۔

جب طلبا پڑھتے پڑھتے اکتا جاتے، تو ان پہاڑیوں کا رخ کرتے، جن کے آگے بحیرہ عرب کے پانی پھیلے تھے۔ جہاں پیچھی نیچی پرواز کرتے اور غوطہ لگا کر شکار دبوچ لیتے۔ اور ایک پرانا لائٹ ہاؤس، جہاں کھڑے ہو کر مظفر نے سمندر سے آتی نمی محسوس کی اور اُس کا گرویدہ ہو گیا۔

وہ یہاں سرجری اور میڈیسن میں نیچلر کی ڈگری لینے آیا تھا۔ مگر ہندوستان ہی کیوں، کیا ملائیشیا میں اچھی درس گاہوں کی کمی تھی۔ اس کے پیچھے ایک سے زائد کہانیاں تھیں۔

ایک تو وہ کہانی جو اس کی ماں اپنی سہیلیوں کو سنایا کرتی تھی کہ اس کے بیٹے کو اس کا لرشپ ملی ہے اور وہ ہندوستان کی ایک بڑی درس گاہ سے اکتسابِ علم کرنے جا رہا ہے۔ دوسری کہانی اس کا ماموں محلے داروں کو سناتا پھرتا۔

”جناب، ہمارے ہاں تو میڈیکل کالج کی فیسیں

آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔ تعلیم کو کاروبار بنا لیا ہے۔
 بھائی محی الدین کیا کریں۔ ہندوستان بھی بنا پڑا ہے۔“
 مگر سب سے اہم کہانی وہ ہے، جو اس کا باپ اُسے
 سنایا کرتا۔ ”جو پر راز کے لیے پیدا ہوتے ہیں نو جوان، وہ
 ٹھکانے بدلتے رہتے ہیں۔ سفر تو باعثِ رحمت ہے۔ اب
 دیکھو، اگر ہمارے اجداد ادھر نہ آتے، تو نہ ملتا تمہاری اماں
 سے ملتا نہ ہی تم پیدا ہوتے۔“

اس جملے کی ادائیگی کے ساتھ بوڑھا زوردار قبچہہ
 لگاتا۔ پھر یکدم سنجیدہ ہو جاتا۔ ”اچھا سنو، وہاں سندر بہتیرے
 ہیں۔ ہمیں تمام مذاہب کا احترام کرنا چاہیے، اور وہاں قدیم
 مساجد ضرور تلاش کرنا اور وقتاً فوقتاً خط لکھتے رہنا۔“
 تو اب مظفر ہندوستان میں تھا جہاں نئے تجربات کے
 ساتھ مسالے دار کمانے اس کے منظر تھے، جنہیں کھاتے
 ہوئے آنکھوں اور ناک سے پانی بہتا رہتا۔

ویسے اس کی ماں کی سنائی کہانی میں دم تھا۔ اُس
 درس گاہ کا شمار ہندوستان کے بہترین میڈیکل کالجوں میں
 ہوتا۔ وہاں سے اکتسابِ فیض کرنے والے اس وقت دنیا
 کے بڑے اداروں میں فرائض انجام دے رہے تھے۔ البتہ
 مظفر کے دل میں کسی یورپی یا امریکی ادارے کا حصہ بننے
 کی خواہش نہیں تھی۔ وہ تو ڈگری لینے کے بعد ایشیا لوٹنے
 کا آرزو مند تھا، تاکہ صلاحیتیں اپنے ملک کی ترقی کے لیے
 وقف کر دے۔

گو وہ انتہائی سرگرم طالب علم تھا، مگر یہ جگہ اس کی سابق
 درس گاہ سے مختلف تھی۔ تقریری مقابلے کم کم ہوتے۔ تیرا کی کا
 شوق بھی انفرادی دلچسپی تک محدود ہو گیا۔ ملائی زبان تو کوئی
 جانتا نہیں تھا جو وہ داستانیں سناتا۔ کبھی کبھار جب لاشوں کی
 چیر پھاڑ اور اسائنمنٹ کا بوجھ اسے بیزاری میں مبتلا کر دیتا،
 تب وہ بحیرہ عرب کی نمکین ہوا کا ذائقہ چکھنے کے لیے لائٹ
 ہاؤس کی سمت چل پڑتا۔

یہ ایک معمول کی مشق تھی جو دوسرے برس کے ماہ ستمبر
 میں جب پانیوں پر دھند چھائی تھی، یکدم بدل گئی۔ لائٹ
 ہاؤس کا زینہ عبور کرتے ہی نو جوان نے ایک اپرا کو رو برو
 پایا۔ ہوانے اُس کے سرخ لبادے کو سنبھال رکھا تھا۔ کالی
 زلفیں اسرار بڑھا رہی تھیں۔

آہٹ من کر وہ مڑی۔ وہ آنکھیں بحیرہ عرب سے نیلی
 اور گہری تھیں۔ مسکرائی تو جیسے مندروں کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔
 پھر آہستگی سے، بغیر ایک لفظ کے فضا میں تیرتے ہوئے وہاں

سے چلی گی۔
 مظفر خوابنا کی سی کیفیت میں تھا۔ جب کچھ سنبھلا، تو
 ذہن مسٹر ناصر کی کرناٹک کی ساحروں سے متعلق سنائی
 کہانیوں کی سمت چلا گیا۔

اُس نے لائٹ ہاؤس سے نیچے جھانکا۔ کبرے میں لپٹا
 سرخ لبادہ دھیرے دھیرے آگے بڑھ رہا تھا۔

”میرا نام مظفر ہے۔“ وہ چلایا۔ ”آپ کا نام؟“
 لڑکی کپٹی۔ دھیرے سے مسکرائی اور کار میں بیٹھ گئی۔
 گاڑی دھند کو چیرتے ہوئے غائب ہو گئی اور مظفر کے دل میں
 وہ جذبہ بھکنے لگا، جسے ہم محبت کہتے ہیں، جو خلاؤں سا وسیع
 ہے، جہاں دل کی خلائی گاڑی بھٹک جائے، تو پھر کبھی نہیں
 ملتی۔

☆.....☆

یہ اُس کا باپ تھا جس نے خط پڑھتے ہی اندازہ لگا لیا
 کہ اُس کا بیٹا ایک عظیم تبدیلی سے گزر رہا ہے۔

اور کیوں ناں اندازہ لگاتا۔ کسی زمانے میں وہ بھی
 جوان اور دل پھینک تھا۔ لیکن اب وہ محتاط ہو گیا تھا۔ زندگی کو
 تھوڑا بہت سمجھنے لگا تو اس نے بیٹے کو خط لکھا۔ براہِ راست
 نصیحت کرنے کی بجائے اشارتاً کہا کہ وہ اپنی پڑھائی پر توجہ
 مرکوز رکھے۔ یہ بھی لکھ دیا کہ ماں تمہارے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی
 ہے۔

اُس وقت تک مظفر کی اُس اپرا سے دو ملاقاتیں ہو
 چکی تھیں۔ پہلی تو خواب میں ہوئی اور دوسری میونسپل لائبریری
 کی سیڑھیوں پر۔ اور اُس شام نو جوان نے جانا کہ آئن اسٹائن
 درست کہتا تھا، واقعات وقت کی رفتار پر گہرا اثر چھوڑتے
 ہیں، جیسے یہ لمحہ... جو ختم سا گیا ہے۔

اس بار وہ کچھ زیادہ حسین اور حقیقی لگی۔ ساڑھی میں
 لمبوس دوشیزہ کی دلنریب مسکراہٹ اشارہ تھی کہ وہ مظفر کو
 پہچان گئی ہے۔

اس سے پہلے کہ وہ بھیڑ میں گم ہو جاتی، مظفر اس کے
 پیچھے دوڑا۔

”ہیلو۔ میں مظفر شکور ہوں۔ اور آپ؟“
 ”میں پنا ہوں۔“ لڑکی مسکرائی تو پھر گھنٹیاں بجنے
 لگیں۔

وہ قرعہ کافی شاپ میں جا بیٹھے۔ موسم سے بات
 شروع ہوئی جو مشاغل سے ہوتی پسند ناپسند تک پہنچی۔ مظفر
 نے کچھ اپنے بارے میں بتایا، کچھ اس کے بارے میں جانا۔

جب پہنا جانے لگی، تو مظفر نے پوچھا۔ ”ہم پھر کب مل سکتے ہیں؟“

وہ ہنسی اور دقت تھم گیا۔ ”جب بحیرہ عرب کے پانیوں پر دھند چھائی ہوئی ہو اور ایک ملائی نوجوان پڑھائی سے اکتا چکا ہو۔“

یہی وہ ملاقات تھی، جس سے لوٹ کر اُس نے اپنے باپ کا تازہ تازہ موصول ہونے والا خط پڑھا۔ یکبارگی حقیقت کی دنیا میں آ گیا جہاں مٹی کی دیواریں اور حقائق کی چٹانیں تھیں۔

اس نے معروضی انداز میں اپنی کیفیت کا جائزہ لیا۔ وہ ایک غیر ملکی تھا جو ایسی لڑکی کے عشق میں مبتلا ہو چکا تھا۔ ایسی لڑکی جس کی ثقافت اور مذہب یکسر الگ ہیں۔

”میں یہاں پڑھنے آیا ہوں، عشق لڑانے نہیں۔“ بستر پر جانے تک وہ خود کو سمجھا تا رہا مگر خواب کا کیا کیجیے۔ اس پر کسی کا کہاں زور چلنا ہے۔ وہاں ایک اسپر کی حکمرانی تھی۔

☆.....☆

مون سون شہر کے لیے تیز بارشیں لے کر آیا۔ ندی نالے بھر گئے۔

امتحانات کے دوران میں بادل مسلسل برستے رہے۔ اس دوران سپنا کی کئی بار یاد آئی۔ اس نے مختلف جگہوں پر اسے تلاش بھی کیا، مگر ہاتھ ناکامی آئی۔

امتحانات کے بعد رمضان شروع ہو گیا۔ سحری اور افطار پھر تراویح، مظفر کے شب و روزنی ترتیب میں ڈھل گئے۔ زیادہ وقت عبادت میں گزرتا۔ وہ یونیورسٹی میں واقع چھوٹی سی مسجد میں نماز پڑھا کرتا۔ اکثر افطار بھی وہیں کرتا۔

عید آئی اور چلی گئی۔ اس بار انہوں کی کمی شہرت سے محسوس ہوئی۔ یہ عید کا تیسرا دن تھا، جب وہ صبح بیدار ہوا تو کھڑکی کے باہر دھند تھی۔ اچانک ذہن میں جھماکا ہوا۔ ریسٹورنٹ کی ایک بھولی بسری یاد کا سرا ہاتھ آ گیا۔ وہ جلدی سے تیار ہوا۔ باہر نکلتے ہوئے مٹھائی کا وہ ڈبا اٹھایا جو کل ملائیشیا سے یہاں پہنچا تھا۔

قدموں میں اُمید کی لہر تھی اور چہرے پر ایک خاص نوع کا اطمینان۔ لائٹ ہاؤس کے گرد کھرا تھا اور چٹانوں سے ٹکراتے سمندر کا شور کہیں دور سے آتا محسوس ہوتا۔ اس نے خاموشی سے زینہ عبور کیا۔ آخری قدم پر پہنچ کر اس نے گہرا سانس لیا۔ وہ وہاں موجود تھی۔ سرخ لبادے میں لمبوس۔ بال

کھلے۔

لڑکی کے چہرے پر مانوس مسکراہٹ اور اطمینان تھا۔ وہ انتظار میں تھی۔

”یہ آپ کے لیے۔“ اس نے مٹھائی کا ڈبا آگے کر دیا۔ ”میری والدہ نے بھجوائی ہے۔“

”شکر یہ۔“ اس نے ڈبا لے لیا۔ دونوں کے درمیان خاموشی کا ایک حسین وقفہ آیا۔ پھر دھند زدہ منظر میں مظفر کی آواز گونجی۔ ”آپ بے حد حسین ہیں۔“

”واقعی؟“ وہ سر پیچھے جھٹک کر ہنسنے لگی۔ ”اور تم بہت اچھے انسان ہو مظفر۔“

”شاید ہم پھر نہ ملیں۔“ اُس نے جی کڑا کر کے کہا۔ سپنا کچھ بل اسے دیکھتی رہی۔ آنکھوں میں یاس تھی۔ پھر اُس کے لب وا ہوئے۔ چپ ٹوٹی۔ ”ہم ان ملاقاتوں کو ہمیشہ یاد رکھیں گے۔“

”ہاں۔ اس نے گردن ہلائی۔“ ”الوداع۔“ وہ مڑا اور زینے سے اترنے لگا۔ پس منظر میں نقرئی آواز گونجی۔ ”عید مبارک مظفر۔“

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ دھند میں کسی روشن مینار کی طرح تھی اور ساری زندگی اُس کے ذہن میں محفوظ رہنے والی تھی۔

”عید مبارک۔“ وہ زینہ اتر کر ہر طرف چھائی دھند میں گم ہو گیا۔

☆.....☆

دعائیں سماعتوں میں رس گھولتیں۔ جھریوں زدہ ہاتھ اس کے چہرے پر تھے اور شہر پر نازل ہونے والے طوفانی جھکڑ بے معنی ہو چکے تھے۔

وہ ایک بوڑھی عورت تھی جو چند روز قبل اپنے اکلوتے بیٹے کو لیے اسپتال آئی۔ اس کا بیٹا گذشتہ کئی برس سے گھٹنوں کے ناقابل برداشت درد کے باعث چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں نے سرجری کا مشورہ دیا۔ مریض آپریشن ٹیبل تک تو پہنچ گیا مگر اس روز شہر ہونا ک طوفان کی لپیٹ میں آ گیا۔ موسلا دھار بارش ہوئی۔ سینٹر سرجن وقت پر نہیں پہنچ سکا۔ ادھر مریض درد سے تڑپ رہا تھا۔ کیس توقع سے زیادہ گمبیر تھا۔ سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، ایسے میں ایک نوجوان ڈاکٹر جس کا چہرہ کچھ جانا پہچانا تھا کہ وہ اسپورٹس اور تقریری مقابلوں

”جی جی ضرور۔“ اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے کہا۔ ”پلیزیٹ جائیں۔“
 ”اور ہاں لڑکے۔“ بڑے میاں بستر پر لیٹتے ہوئے بولے۔ ”اگر اچھا علاج کیا، تو اور مریضوں کو تمہارا ہاتھ دوں گا۔ سمجھے۔“

اس نے بمشکل ہنسی روکی۔ پھر ان کے پٹھوں کا جائزہ لیا۔ نسخہ لکھا۔ ایک دو ٹیسٹ تجویز کیے۔ جاتے جاتے وہ اچانک مڑے۔ ”مجھے اُمید ہے کہ تم ہندوستان سے اچھی یادیں لے کر لوٹے ہو گے۔“
 ”جی ہاں، بہت سی یادیں ہیں۔“ اس نے زیر لب کہا۔

بوڑھا شخص کچھ دیر اسے دیکھتا رہا۔ پھر کاندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”محبت میں ناکامی لوگوں کو توڑ دیتی ہے، مگر اس نے تمہیں ایک بہتر انسان بنا دیا ہے۔ اور مجھے یقین ہے کہ تم ایک اچھے شوہر ثابت ہو گے۔“
 ”شوہر!“ وہ چونکا۔

”ہاں میاں۔ تمہاری اماں لڑکی دیکھ چکی ہیں۔ یہی اطلاع دینے تو میں یہاں آیا ہوں۔ علاج تو بہانہ تھا۔“ یہ کہہ کر مسٹر ناصر کمرے سے نکل گئے۔
 اس نے اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔
 ☆.....☆

سر پر اسکارف باندھے، بادام کے درخت کے نیچے بیٹھی حلیمہ اسے سیدھی سادہ ملائی لڑکی لگی۔
 بلاشبہ خوش شکل اور بااخلاق۔ مگر اس میں مظفر کو وہ شعلہ نظر نہیں آیا، جو حصول مقصد کے لیے انسان کو بے کل رکھتا ہے۔ وہ جذبہ، جو ارد گرد طاری بے عملی کو توڑ کر فرد کو جدوجہد پر اکساتا ہے۔ ہجوم میں اپنی منفرد شناخت بنانے کی آرزو جگاتا ہے۔

تو اسے لڑکی میں کوئی خاص بات نظر نہیں آئی۔ مگر کوئی ایسا اعتراض بھی نہیں تھا۔ وہ اچھے نین نقش کی تھی۔ سلیٹے سے گفتگو کرتی۔ مظفر کو یقین تھا کہ وہ اس کے اہل خانہ کا اچھی طرح خیال رکھے گی اور اس کے خوابوں کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنے گی۔

وہ نہیں جانتا تھا کہ حلیمہ وہ قوت ہے، جو اُسے افلاک کی بلند یوں تک لے جانے کے لیے زمین تیار کرے گی۔ اُس نے ابھی اس لڑکی کو پہچانا نہیں تھا۔
 پہلی حیرت سے مظفر کا اُس روز سامنا ہوا جب اسپتال

میں حصہ لے چکا تھا، سامنے آیا۔
 پیرامیڈیکل اسٹاف مظفر کو پسند کرتا تھا مگر کیس کی پیچیدگی دیکھتے ہوئے وہ اُمید کھونے لگے۔ اُن میں اور مظفر میں یہی تو فرق تھا۔ وہ کبھی اُمید کا اجلا دامن نہیں چھوڑتا۔ آپریشن سے پہلے وہ بوڑھی عورت کے پاس آیا۔ ”مسلمان مصیبت میں گھبرا جائیں گے۔“
 کیسے پُر یقین الفاظ تھے۔ سسکیاں لیتی عورت چپ ہو گئی۔

وہ ایک طویل اور تھکا دینے والا آپریشن تھا۔ طوفانی جھکڑ شہر میں کھرام بچا رہے تھے۔ کئی چھتیس ازگنیں اور دیواریں ڈھے گئیں۔ لشکی، مالتے ڈوب گئے تھے، مگر مظفر ہر شے سے بے پروا سر جری میں جتا رہا۔ آپریشن کامیاب رہا۔ اور اب اس کے مسکراتے بہرے پر جھریوں زدہ ہاتھوں کی شفقت بھی تھی۔ اسپتال کی دیواروں پر سر پختے جھکڑ۔ بے معنی ہو گئے تھے۔

یہ اس زمانہ نے کا واقعہ ہے، جب وہ ملائی شہر سرمبان کے مرکزی اسپتال میں ملازم ہو گیا تھا۔ 97ء میں گریجویٹیشن کی ڈگری ملتے ہی وہ کرناٹک سے سیدھا ملائیشیا چلا آیا، حالاں کہ اسے انڈیا میں دو تین اچھی پیشکشیں ہوئی تھیں اور کیوں نہ ہوتیں، وہ میڈیکل کالج کے ذہین ترین طلباء میں سے ایک تھا۔ مگر اپنے وطن کی خدمت کا جذبہ اُسے کھینچتا ہوا سرمبان کے اُس شفا خانے لے آیا، جہاں نہ تو تنخواہ اچھی تھی، نہ اچھی مراعات۔ مگر مظفر کو پروا نہیں تھی۔ اسے تو بس جھریوں زدہ ہاتھوں میں سانس لیتی ممتا کی طلب تھی۔

سیانے کہتے ہیں، بوڑھی دعائیں تقدیر بدل دیتیں ہیں اور ایسا ہی ہوا۔ اس طویل آپریشن کے چند روز بعد کوالا لپور سے کال آگئی۔

اپنے آبائی شہر کے ایک اسپتال میں خدمات انجام دینا، جہاں وہ خود بھی بچپن میں زیر علاج رہا تھا، ایک پُر مسرت تجربہ تھا۔ اور وہ اس وقت دو چند ہو گیا، جب اس کے پڑوسی مسٹر ناصر پہلے مریض کے روپ میں کمرے میں داخل ہوئے۔

”ارے انکل آپ۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔
 ہندوستانی نے نہ منہ بنایا۔ ”میاں انکل ونگل نہیں چلے گا۔ مریض ہوں اور شدید تکلیف میں ہوں۔ اب مجھے ڈاکٹر کی طرح علاج کرو۔“

کیا۔ بلند یوں اور خلائی جنگ امریکا کی جیت پر تمام ہوئی۔ مظفر کھڑکی میں آن کھڑا ہوا۔ سورج غروب ہو رہا تھا اور اس کی سنہری کرنیں چوکھٹ پر سمٹ رہی تھیں۔ ایسے میں کہیں بلند یوں پر گھن گرج ہوئی۔ وہ ایک طیارہ تھا جو دھویں کی لکیر چھوڑتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔ مظفر نے ہاتھ بڑھا کر اسے منٹھی میں بند کر لیا اور اگلے ہی پل اپنی بچکانہ حرکت پر جھینپ گیا۔

طیارہ منٹھی سے نکل گیا تھا۔ بس دھویں کی لکیر رہ گئی اور تب جامع مسجد سے مؤذن کی آواز بلند ہوئی۔

☆.....☆

لائٹ... کیمرہ... ایکشن!

وہ تیزی سے آگے بڑھا۔ جوس کا گلاس اٹھا کر ایک ہی سانس میں حلق میں اتار لیا۔ پھر کیمرے کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔

”اد کے۔ کٹ!“ ڈائریکٹر کی آواز سنائی دی۔ ”بھئی بہت عمدہ مظفر۔ یا رڈاکٹری چھوڑ۔ تجھ میں ایک اچھا ماڈل چھپا ہے۔“

مظفر نے قہقہہ لگایا۔ ”بھائی، تم سے دوستی ہے، اس لیے چلا آیا۔ ورنہ یہ جھنجٹ کون پالے۔“

”یہ لیجیے۔“ ڈائریکٹر نے قہقہہ لگایا۔ ”لوگ ٹی وی پر آنے کے لیے مرے جا رہے ہیں اور نواب صاحب اُسے جھنجٹ کہہ رہے ہیں۔ خیر، جناب اس جھنجٹ کی ادائیگی جلد ہو جائے گی۔“

”اس کی ضرورت نہیں۔“ اس نے تیزی سے کہا۔ ”جناب، ادائیگی تو ہوگی۔ آپ کو ضرورت نہ ہو، تو کسی فلاحی تنظیم کے لنگر خانے میں دے دیں۔“

شوٹ سے لوٹ کر مظفر اپنے کاموں میں لگ گیا۔ وہ اس واقعے کو بھول ہی گیا تھا کہ ایک روز دفتر میں رکھا فون بجایا۔ دوسری طرف اُس کے والد تھے۔

”بھئی ماڈلنگ کا شوق تھا تو پہلے بتاتے، ایسے ہی تمہیں اتنا پڑھایا لکھایا۔“

پہلے تو وہ کچھ سمجھ ہی نہیں سکا۔ جب اندازہ ہوا کہ آج نشر ہونے والا اشتہار زیر بحث ہے تو جھینپ گیا۔ ٹیلی فون کالز کا تانا بندھ گیا۔ دوست، رشتے دار، اسپتال کے ساتھی۔ ہر کوئی مبارک باد دے رہا تھا۔

شام میں ڈائریکٹر کا فون آیا۔ وہ اُسے ایک اور اشتہار میں کاسٹ کرنا چاہتا تھا۔

کے سامنے سے فلسطین کے حق میں نکالا جائے۔ والا ایک جلوس گزرا۔ جلوس کی قیادت کرتی پُر جوش لڑکی کو دیکھ کر وہ چونکا کہ وہ اسے انتہائی، نوس لگی۔ جب جلوس نظروں سے اوجھل ہو گیا، تب اندازہ ہوا کہ یہ وہی لڑکی ہے، جو اس روز با دام کے درخت سے گرے۔ تہ شکوفوں میں بیٹھی تھی۔

اگلی بار ساحل سمندر پر تھیر انتظار کر رہا تھا۔ وہ کچھ دوستوں کے ساتھ لہروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ نظر نو جوانوں کے ایک گروہ پر پڑی۔ ہاتھوں میں سفید دستانے۔ سیاہ تھیلے۔ وہ ساحل پر پڑا کچرا اکٹھا کر رہے تھے۔ سب سے آگے ایک لڑکی تھی جسے اُس نے پہلی نظر میں ہی پہچان لیا۔

اگلی بار اپنا تجسس مہیز کرنے کے لیے اسے امریکی قونصل خانے کے پہلو سے گزرتا پڑا جہاں طلبہ کا ایک گروہ یادداشت پیش کرنے آیا تھا۔ ہاں وہ حلیمہ تھی اور بلا کی خوبصورت لگ رہی تھی۔

دھند میں لپٹے لائٹ ہاؤس سے لوٹنے کے بعد پہلی بار مظفر کے دل میں وہ کوئٹل پھوٹی جو جلد درخت کی شکل اختیار کرنے والی تھی۔

گھر آ کر بھی وہ اُسی دو شیزہ کے بارے میں سوچتا رہا جس نے فلسطینی بچوں کی فلاح و بہبود کا خواب آنکھوں میں سجایا تھا۔ بے خیالی میں نظر ایک پرانے میگزین پر پڑی، جس میں ”میر“ نامی خلائی اسٹیشن کا تذکرہ تھا۔

84ء میں قائم ہونے والا یہ اسٹیشن ہنوز خلاؤں میں تیر رہا تھا۔ اور اس اسٹیشن میں ایک خلا باز گذشتہ 14 ماہ سے مقیم تھا۔ نام تھا والری پلین کوف۔ وہ شخص کسی ایک اسٹیشن میں طویل ترین وقت گزارنے کا ریکارڈ قائم کر چکا تھا۔

مظفر نے آرٹیکل، بڑی دلچسپی سے پڑھا۔ پلین کوف اب لوٹنے کی تیاری کر رہا تھا۔ مضمون نگار کے مطابق اس کے آبائی وطن روس میں اُس کے استقبال کی تیاری شروع ہو گئی تھی۔

”عرصے بعد روس سے متعلق کوئی اچھی خبر ملی۔“ مظفر نے سوچا۔ ”ورنہ سوویت یونین کے زوال کے بعد تو یہ ریاست اپنے ہیروں پر ڈھے گئی تھی۔“

مظفر ٹھیک ہی سوچ رہا تھا۔ سرد جنگ ختم ہوتے ہی روس کے کارخانوں میں آگ بجھ گئی۔ ایک ہولناک ہنگامے نے جنم لیا۔ نظریات متروک ہوئے۔ لینن کے مجسمے اتار دیے گئے۔ سرمایہ دارانہ نظام پورے جمانے لگا۔ جو لوگ سرخ نظریات سے تاحال چٹھے تھے، انہیں اٹھا کر کہاڑ خانے میں پھینک دیا

”کیا دیوانے ہو گئے ہو۔“ وہ جھلا گیا۔

”دیوانے تو لوگ ہو گئے ہیں تمہارے۔ اور دیکھو نہ مت کرنا۔ انجینیئر، تمہیں ہی کاسٹ کرنے کے لیے کہا ہے۔ مجھ غریب پر رحم کرو۔“ یہ کہہ کر اُس نے فون کاٹ دیا۔ مظفر بیلو بیلو ہی کرتا رہ گیا۔

کچھ دیر بعد پھر فون بجایا۔ یہ کال آج موصول ہونے والی تمام کالز سے زیادہ حیران کن تھی۔

لائسن کی دوسری طرف شہر سلنگور میں واقع نیشنل یونیورسٹی آف ملائیشیا کا ڈائریکٹر تھا۔ ”مسٹر مظفر.. اچھا ہوا آپ سے بات ہوگی۔ بہت دیر سے رابطے کی کوشش کر رہا ہوں، مگر...“

”اوہ، کیسے ہیں جناب۔ وہ بس آج لائسنز کچھ مصروف تھیں۔“ اُس نے جمل ہو کر کہا۔

”سمجھ سکتا ہوں جناب۔ دراصل مجھے آپ سے بہت اہم بات کرنی تھی۔ میں یونیورسٹی آف ملائیشیا کی جانب سے آپ کو ملازمت کی پیش کش کرنا چاہتا ہوں۔“

”واقعی۔“ وہ اچھل پڑا۔ اس درس گاہ کا شمار ملک کے بہترین اداروں میں ہوتا تھا۔ اُسے یقین تھا کہ ایک دن اُس تک رسائی حاصل کر لے گا مگر یہ سب اتنی جلدی ہو گا۔ اس کی وہ توقع نہیں کر رہا تھا۔

ڈائریکٹر کی آواز اُسے لمحے لمحے حال میں لے آئی۔ ”نیا سیشن شروع ہو رہا ہے۔ بس چاہوں گا کہ آپ آکر ہم سے مل لیں۔“

اگلے ہی دن اس کا کارفرمائے بھرتی یونیورسٹی کی سمت جاری تھی، جو کوالا لپور سے 35 کلومیٹر دور تھی۔ مختصر سی میٹنگ میں تمام معاملات طے پا گئے۔ اچھی تن خواہ۔ بہترین مراعات۔

لوٹے وقت وہ بہت خوش تھا۔ گھر پہنچا ہی تھا کہ فون بجایا۔ دوسری طرف اس کا دوست تھا۔ ”کیوں مجھ غریب کے پیٹ پر لات مار رہے ہو۔ چلے آؤ۔ دو گھنٹے کا شوٹ ہے۔“

”مگر بات یہ ہے دوست...“

ڈائریکٹر نے بات کاٹ دی۔ ”تو چاہتا ہے کہ تیری بھابی مجھے گھر سے نکال دے۔ میں کچھ نہیں سنوں گا۔ شیو کرو اور سیدھے چلا آ۔“

اس نے گہرا سانس لیا اور ریسیور رکھ دیا۔ ”بچپن کے دوست بھی عذاب ہوتے ہیں۔“

دو گھنٹے کا کہہ کر اسے رجھایا گیا تھا۔ شوٹ ساری رات

جاری رہی۔ جب وہ صبح تھا کہ ہارا گھر پہنچا تو بستر پر جانے سے پہلے ایک اور خبر سے سامنا ہوا۔

باورچی خانے میں ماں چلا رہی تھی۔ ”بہت کر لی تو نے آوارہ گردی۔ میں نے تیری شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”مگر کیوں...“ وہ بوکھلا گیا۔ ”میرا مطلب، کس سے۔“

”اسی حلیمہ سے۔ دیکھو وہ لڑکی مجھے پسند ہے۔ اور میں ناں نہیں سنوں گی۔“

وہ نہ کرنا بھی نہیں چاہتا تھا مگر اسے کچھ وقت درکار تھا۔

”میرے خیال میں...“ اس نے سر کھجاتے ہوئے کہا۔ ”فی الحال ممکن ٹھیک رہے گی۔“

عورت نے اپنے شوہر کی طرف دیکھا۔ بوڑھے نے آنکھ ماری کہ لڑکا راضی ہے، اب خدمت کرو۔

”ٹھیک ہے۔ ممکنی سہی۔ جا اب تھوڑا آرام کر لے۔“

وہ دھپ سے بستر پر گرا اور گرتے ہی سو گیا۔

☆.....☆

وہ قفص تھا، جو اپنی راکھ سے جی اٹھا۔

نیا ہزار یہ روس کے لیے نئے سفر کا آغاز تھا۔ پوتن نے منہدم ہو چکی ریاست کو اپنے ہیروں پر کھڑا کرنے کا عہد باندھ لیا مگر اس کام کے لیے جوش سے زیادہ ہوش کی ضرورت تھی۔ اس سرد مہر شخص نے غضب کا دماغ پایا تھا۔ معاش

استحکام پہلی ترجیح۔ اس نے روس کے بہترین دماغوں کو ایک جگہ اکٹھا کر دیا۔ پڑوسی ممالک سے رابطے شروع کیے۔

دوستوں کا اعتماد بحال کیا۔ یوں روس کے زخم خوردہ جسم میں جان پڑنے لگی۔ وہ اپنی راکھ سے دوبارہ جنم لینے لگا۔

روس اور ملائیشیا میں تجارتی روابط تو پہلے سے تھے، مگر 2003 کے اوائل میں دونوں ممالک کے اعلیٰ عہدے داروں کے درمیان ایک خفیہ میٹنگ ہوئی۔ ایک بڑا معاہدہ ہونے والا

تھا۔ مہاتیر محمد کی حکومت نے اپنی ایئر فورس کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ انہیں لڑاکا طیارے درکار تھے۔ نظر انتخاب دو انجن والے Su-30 پر ٹھہری،

جس کی رفتار نے اس زمانے میں جہلکا مچا رکھا تھا۔ روسی ساختہ یہ طیارہ 96ء میں مارکیٹ میں آنے کے بعد سے خبروں میں تھا۔ ایک جہاز کی قیمت 40 ملین ڈالر۔ ملائیشیائی حکومت اٹھارہ جہاز خریدنے کو تیار تھی۔ یہ ایک شان دار معاہدہ تھا۔ کروڑوں ڈالر کا سودا جسے روس کسی صورت کھونا نہیں چاہتا تھا۔

ہے۔ روسی حکومت دو ملائی خلا بازوں کو تربیت فراہم کرے گی اور پھر ان میں سے... ایک شخص انٹرنیشنل اسپیس اسٹیشن میں قدم رکھنے کا اعزاز حاصل کرے گا۔

”تو بھائیو، جلد ایک ملائی کائنات کی وسعتوں میں قدم رکھنے کو ہے۔“ وزیر اعظم نے کہا۔
وہ ایک تحیر خیز لمحہ تھا۔ کئی ملائی فرط جذبات سے رو پڑے۔

ٹیکنالوجی منسٹر جمال دین ابن محمد نے مزید تفصیلات بتائیں۔ ”اس کا مقصد بین الاقوامی دنیا میں اپنی شبیہ بہتر بنانا نہیں، بلکہ اپنی نئی نسل کو سائنس اور ریاضی جیسے مضامین کی جانب راغب کرنا ہے۔ ہمیں آزاد ہوئے پچاس برس بیت چکے ہیں اور اس سے اچھا تحفہ اور کیا ہوگا کہ ایک ملائی اب خلا میں جائے۔“

اس نے ایک لمحے کا توقف کیا۔ پھر گویا ہوا۔ ”ہمیں ملائیشیا کے لیے ایک رول ماڈل کی تلاش ہے، جو نئی راہوں کی نشان دہی کرے۔“

پریس کانفرنس تمام ہوتے ہی ہر گھر، ہر محلے میں بحث چھڑ گئی۔ چائے خانوں، ریستورانوں میں مکالمے جاری تھے۔ لوگ پرجوش تھے۔ اس رات کوئی نہیں سویا۔ ہر سو جشن تھا۔

مگر اس شور سے دور، جشن سے پرے ایک شخص آنکھیں موندے بستر پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ کھڑکی سے جھانکتی چاندنی دیواروں پر بکھری تھی، جہاں نیل آرماسٹرنگ کی تصویر تھی، جہاں ایک خلائی گاڑی تھی، جہاں ایک راکٹ شعلے چھوڑتا فضا میں بلند ہو رہا تھا۔

شیخ مظفر شکور اس وقت حالت دعا میں تھا مگر وہ کسی خواہش کی تکمیل کا طلب گار نہ تھا، وہ تو اس پُرسرت موقع کے لیے قدرت کا شکر یہ ادا کر رہا تھا۔

☆.....☆

ٹیلی فون بجایا۔

دوسری طرف ٹیکنالوجی منسٹر تھا۔ ڈائریکٹر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”جی جمال دین صاحب۔ حکم۔“

”جناب۔ مزاج بخیر ہیں۔ ابھی آپ کو اسپیس پروگرام کی تو خبر ہے ہی۔ اب ہم اسپیس ایجنسی کو ایک اہم ذمے داری سونپ رہے ہیں۔“

”حکم کیجیے۔ میں ہمہ تن گوش ہوں۔“

تمام معاملات طے پا گئے۔ معاہدے پر دستخط ہونے کا وقت تھا اور تب... ملائی وزیر خزانہ نے روس کے سامنے ایک کڑی شرط رکھی، جو تیزی سے صحت کھوتے مہاتیر محمد کے لیے طیاروں کے سوئے جتنی اہم تھی۔ دراصل کئی برس سے ملائیشیا کے بہترین ذہنوں میں ایک منصوبہ پنپ رہا تھا اور انہوں نے سوئے کے لیے وقت کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔

روس کی جانب سے انکار کے امکانات لگ بھگ نہ ہونے کے برابر تھے مگر اس وقت ملائی وفد شدید تناؤ کا شکار ہو گیا، جب روسیوں نے مذاکرات ملتوی کر دیے۔

روسی وزیر خزانہ نے اپنے خلائی پروگرام کے ڈائریکٹر سے رابطہ کیا۔ شرط سن کے ایک لمحے کو وہ ہنپٹا گیا۔ سوچ بچار کے بعد انہیں صدر روس سے بات کرنے کا شورہ دیا گیا۔

اگر آج پوتن کو دنیا کا طاقتور ترین شخص کہا جا رہا ہے، تو یہ بے سبب نہیں۔ دراصل یہ طاقت اس کی بے پناہ ذہانت کی دین ہے۔ وہ بڑے بڑے مسئلے چٹکیوں میں حل کر لیا کرتا تھا۔ تو ملائی حکام کی شرط سن کر وہ ضرور مسکرایا ہوگا۔ ”ہاں۔“ اس نے اپنے مخصوص انداز میں کہا ہوگا۔ ”ہمیں شرط منظور ہے۔“

اشارہ۔ ملتے ہی Su-30 طیاروں کا خرید کا معاہدہ طے پا گیا۔

ملائی وزیر خزانہ نے فوراً ٹیکنالوجی منسٹر جمال دین ابن محمد کو فون کیا۔ ”پریس کانفرنس کے لیے تیار ہو جائیں۔“

☆.....☆

ہواؤں میں بہار کی خبر تھی اور درختوں پر پھول کھلنے کا موسم آ گیا۔ ملائیشیا کے لیے وہ ایک پُرسرت دن تھا۔ ایسا دن، جو کئی برسوں تک ان کی یاووں کو مہکانے والا تھا۔

سرت میں حیرت کی آمیزش کے ساتھ احساس تفاخر بھی تھا۔ اور کیوں نہ ہو، ایک عظیم خواب کی تکمیل کا لمحہ آ گیا تھا۔ پہلے ملائی باشندے کا خلا میں جانے کا راستہ ہموار ہونے لگا تھا۔

یہ موقع اتنا اہم تھا کہ وزیر اعظم نے خود اس کا اعلان کیا۔ ”میرے ہم وطنو۔ مبارک ہو۔ رائل ملائیشیا ایرو فورس کے لیے اٹھارہ انتہائی جدید Su-30 کی خریداری کا معاہدہ طے پا گیا ہے۔ ساتھ ایک خبر اور ہے۔“

عوام کو اس اعلان نے ناقابل مزاحمت خوش سے بھر دیا کہ نیشنل اسپیس ایجنسی کے تحت حکومت روس کے اشتراک سے Angkasawan نامی پروگرام شروع کیا جا رہا

بجدہ ریز ہونے والا تھا، ابھی تک درخواست روانہ نہیں کی تھی۔ وہ قدرت کے منصوبے سے بے خبر مریضوں کے علاج معالجے میں لگا تھا۔

ایک ڈرامائی تبدیلی کے لیے قدرت کی غیر مرئی ڈور حرکت میں آئی۔ چھوٹے چھوٹے واقعات رونما ہوئے، جن کی گہرائی میں ترتیب پوشیدہ تھی۔

مظفر کی منگیت رحیمہ نے خواب میں چاند گاڑی دیکھی۔ بیدار ہونے کے بعد ابھی وہ خواب کی تفہیم میں الجھی تھی کہ ایک غیر متوقع فون کال موصول ہوئی۔ شہر کے مشرقی علاقے میں فلسطین پر آج دوپہر ایک سیمینار ہو رہا تھا۔ منتظمین خواہش مند تھے کہ وہ اس میں شرکت کرے۔ مقررہ وقت پر لڑکی گھر سے نکلی تو مطلع صاف تھا۔ مگر سیمینار سے نمٹ کر جب آسمان میں سیاہ دبیز بادل نظر آئے، تو وہ بڑبڑائی۔ ”اس موسم میں بارش۔“

ابھی ٹیکسی میں سوار ہوئی تھی کہ بادل زور سے گر جا۔ کچھ ہی دیر میں اندھیرا چھا گیا۔ تیز ہواؤں کے ساتھ مینہ برسنے لگا۔ کئی درخت اکھڑ گئے۔ اسے ٹیکسی چھوڑنی پڑی۔ جب وہ ایک چھپرے تلے کھڑی بھیگ رہی تھی، اچانک انکشاف ہوا کہ اس کا متوقع سسرال بس چند گلیوں پر ہے۔

بوڑھا محی الدین اسے دیکھ کر یوں مسکرایا، جیسے وہ اس کی آمد کی توقع کر رہا ہو۔ مظفر کی ماں نے اسے گلے لگا لیا۔ اپنے کپڑے دے دیے۔ بوڑھا اسے گھر دکھانے لگا۔ وہ مظفر کے کمرے میں بھی گئے، جہاں لگی تصاویر اس کے بچپن کی کہانی بیان کر رہی تھیں۔

یکبارگی اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔ بھولا ہوا خواب یاد آتے ہی اسے آج کے عجیب و غریب واقعات میں ترتیب نظر آنے لگی۔

”کیا مظفر نے اسپیس پروگرام کے لیے اہلائی کیا ہے؟“ اس کا یہ سوال ساس کو غیر ضروری لگا کہ وہ اپنے بیٹے کو ایک معالج کے روپ میں جانتی تھی۔ یہ لڑکے کا باپ تھا، جس نے کسی دانا کی طرح گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ”اگر نہیں کیا، تو کرنا چاہیے۔“

اس طوفانی دوپہر جب اسپتال میں مظفر کو اپنی منگیت کی فون کال موصول ہوئی، تو پہلے وہ سمجھ ہی نہیں سکا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ اور جب سمجھ گیا، تو خود سے سوال کیا کہ آخر اس نے اب تک اس پروگرام کے لیے درخواست کیوں نہیں دی۔ ”یہ کام تو مجھے پہلے کر لینا چاہیے تھا۔“

”اس قومی مشن کے لیے آپ کو دو خلا باز منتخب کرنے ہوں گے، جو روس میں تربیت حاصل کریں گے۔ ان میں سے کوئی ایک ہی انٹرنیشنل اسپیس اسٹیشن جانے والے راکٹ میں سوار ہوگا۔ تین کرڈ افراد میں سے صرف ایک۔“ وزیر نے وقفہ لیا۔ ”آپ سمجھ سکتے ہیں کہ یہ بھاری ذمے داری ہے۔“

”بالکل۔“ ڈائریکٹر نے اعتماد سے کہا۔ ”بس وہ شرائط بتادیں، جن کی بنیاد پر امیدواروں کو پرکھا جاتا ہے۔“ کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر وزیر نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”وہ ملائیشیا کا حقیقی چہرہ ہونا چاہیے۔ ایک قابل تقلید انسان۔“

اس گفتگو سے بہت دور، کوالالمپور کے ایک بھرے پرے علاقے میں وہ انسان، جسے بین الاقوامی دنیا میں ملائیشیا کا نیا چہرہ بنانا تھا، ایک بوڑھی عورت کو کمرک پار کروا رہا تھا۔ اور اس عمل کی انجام دہی کے بعد وہ تقریباً دوڑتا ہوا اسپتال کی سمت بڑھنے لگا۔

شیخ مظفر کو لیٹ ہونا گوارا نہیں تھا۔ اسپیس پروگرام سے متعلق جاری تجزیوں اور تبصروں میں اس وقت تیزی آگئی۔ جب ٹیکنالوجی منسٹر نے ایک گرم دوپہر میسجیل کارپوریشن کی نمائندگی کے کچھ بھرے ہال میں ملائی اسپیس ایجنسی کو سونپنا جانے والی ذمے داری کا اعلان کیا۔ اس نے ویب سائٹ، پراپ لوڈ کردہ فارم کا ذکر کرتے ہوئے واضح کیا کہ امیدواروں کو کڑے امتحان سے گزرتا پڑے گا۔

”لاکھوں میں سے کسی ایک ہی کو یہ سنہری موقع ملے گا۔“

عوام کا ردعمل توقعات سے کئی گنا زیادہ تھا۔ ہزاروں افراد نے فارم ڈاؤن لوڈ کیا۔ اگلے روز اسپیس ایجنسی کی ویب سائٹ بڑھتے دباؤ کا وجہ سے بند ہوگئی۔ اسے بحال کرنے سے قبل درخواست فارم کو مختلف حکومتی سائٹ پر اپ لوڈ کرنا پڑا، ورنہ وہ پھر جواب دے جاتی۔

اڑتالیس گھنٹے بعد جب ایجنسی کے ڈائریکٹر نے ویب سائٹ پر نظر ڈالی، تو سر پیٹ آیا۔ وہ جانتا تھا کہ ایک ہفتے بعد ان کے پاس اتنی درخواستیں ہوں گی کہ پورا دفتر کاغذوں سے بھر جائے گا۔

درخواستوں کی آمد کا سلسلہ اگلے کئی روز جاری تھا۔ البتہ اس انسان نے جو کچھ ماہ بعد خلا میں اپنے رب کے حضور

آگاہی کے اُس لمحے کے بعد وہ ہر آنے والے دن اس یقین کو پختہ کرتا رہا کہ تربیت کے لیے روسی شہر اشارشی جانے والے دو ملائی نوجوانوں میں ایک... شیخ مظفر شکور ہوگا۔ پہلے فیض خالد کے نام کا اعلان ہوا۔ اور یہ متوقع تھا۔ ملائی آر می کا وہ چھبیس سالہ سپاہی کسی چھتے کی طرح پھرتیلا اور چوکس تھا۔ مسکراتے چہرے کے پیچھے عزم کا منہ زور دریا تھا۔ روشن آنکھوں میں آہنی ارادے چھپے تھے۔ وہ خلاؤں کی تسخیر کا خواب لے کر پیدا ہوا تھا۔

دوسرے امیدوار کے نام کا اعلان خاصی تاخیر سے ہوا۔ اُس وقت تک میڈیا خالد کا انٹرویو کر چکا تھا اور وہ اپنی بذلہ سخی سے ملائیشیا کو گرویدہ بنا چکا تھا۔

جب اسپیس ایجنسی نے دوسرے امیدوار کا نام ظاہر کیا، بہت رات ہو چکی تھی۔ جینلر پرستی چھانگنی اور اخبارات پریس میں چلے گئے۔ خبر اگلی صبح اتنی تاخیر سے نشر ہوئی کہ شہری روزمرہ کے کاموں کے لیے گھر سے نکل گئے تھے۔

شام ڈھلے جب میڈیا کو دوسرے کامیاب امیدوار کا انٹرویو کرنے کا خیال آیا، ٹیکنالوجی منسٹر کی جانب سے مظفر اور خالد کو سامان باندھنے کا حکم جاری ہو چکا تھا۔ انہیں اگلی صبح روس روانہ ہونا تھا۔

میڈیا کو اس کے ماں باپ اور اسپتال کے ساتھیوں سے بات کر کے رپورٹ مکمل کرنی پڑی، جس کا سب سے نمایاں حصہ وہ تھا، جب کیمروں نے اس کے گھر کی دیوار پر چسپاں ٹیل آرما سٹرنگ کی تصویر کو قلم لیا۔

☆.....☆

دھماکا ہوتے ہی منظر سرخ روشنیوں میں نہا گیا۔ خلائی جہاز شہابیوں کی زد میں آ گیا۔ خطرے کا سائرن کان پھاڑ رہا تھا۔ مسلسل جھٹکوں کے دوران میں آکسیجن گھٹنے کا احساس ہولناک تھا۔ مظفر کا دم گھٹ رہا تھا۔ زندہ رہنے کا اکلوتا امکان خلائی جہاز کو خطرے کے علاقے سے باہر نکالنا تھا۔

یہ ہولناک منظر خلا کا نہیں تھا۔ ابھی وہ زمین ہی پر تھے۔ وہ ایک مصنوعی صورت حال تھی۔ روسی خلائی حادثوں کا خاصا تجربہ رکھتے تھے۔ وہ Soyuz-TMA نامی خلائی گاڑی میں سوار ہونے والے خلا بازوں کو بدترین خطرات سے نمٹنے کی مشق کر دیتے تھے۔ مشقوں کا یہ سلسلہ اٹھارہ ماہ جاری رہنے والا تھا۔

کچھ لوگ سمجھ رہے تھے کہ روس میں مظفر اور خالد مزے

جب وہ فارم ڈاؤن لوڈ کرنے کیپوٹر کے سامنے بیٹھا، تب اسے خیال آیا کہ یہ پہلی بار تھا، جب اس نے اپنی مگسٹر سے براہ راست بات کی۔ اور کتنی عجیب بات ہے کہ اس دوران میں محبت سے متعلق دونوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ دو گھنٹے بعد اس نے درخواست تمام ضروری کاغذات کے ساتھ متعلقہ ایڈریس پر روانہ کر دی۔ بادل آسمان سے یوں غائب ہو گئے تھے، جیسے وہ کبھی وہاں رہے ہی نہ ہوں۔ سورج پھر نمودار ہو گیا۔

☆.....☆

قدرت کے منتخب کردہ شخص کی درخواست موصول ہو چکی تھی، مگر ابھی وہ ہزاروں درخواستوں میں چھپی بیٹھی تھی۔ جدید ٹیکنالوجی کی مدد لی گئی۔ درخواستوں کے پرنٹ لینے کی بجائے کمپیوٹر ہی پر ایک خود کار نظام نے ان کا جائزہ لیا۔

ساڑھے تین گیارہ ہزار افراد کو چھلنی باریک تھی اور شرائط کڑی، اس کے باوجود سینکڑوں درخواستیں ڈائریکٹر کی میز تک پہنچنے میں کامیاب رہیں۔ یہ تمام امیدوار اعلیٰ تعلیم یافتہ، بلا کے ذہین اور چاق و چوبند تھے۔

عملہ اگلے چوبیس گھنٹے تک مصروف رہا۔ کوئی شخص گھر نہیں گیا۔ آخر دو سو امیدواروں کا انتخاب کیا گیا۔ عملے نے ان افراد کو خوشخبری بھرے فون کیے۔ انگریزی حرف جی کے اعتبار سے مرتب کردہ فہرست میں شیخ مظفر شکور وہ آخری شخص تھا، جسے انہوں نے کال کی۔

اپنے رب کا شکر یہ ادا کرنے کے بعد جسے مظفر نے پہلا فون کیا، وہ اس کی مگسٹر تھی۔ اب محبت ان پر سایہ قلمن تھی۔ مظفر نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ وہ ذہانت اور قابلیت کی جانچ کے کڑے مراحل عبور کر جائے گا۔ وہ تو دو سو افراد میں منتخب ہونا ہی اپنے لیے اعزاز سمجھ رہا تھا مگر جب موسم سرما کی پہلی شام اتری اور شہر میں سرد ہواؤں نے راستہ تلاش کیا، حکومت نے ان دس افراد کا اعلان کر دیا، جنہوں نے دشوار گزار مرحلہ عبور کر لیا تھا۔

مظفر کا نام ان میں شامل تھا۔

جب باپ نے گلے لگاتے ہوئے اپنے متحیر بیٹے کو کہا۔ ”اب صرف ایک مرحلہ باقی ہے۔“ ٹھیک تب اسے اپنی کہی ہوئی ایک بات یاد آئی۔ ”اگر آپ تخیل کی دنیا میں یقین کا بیج بویں اور اس کی آبیاری کریں، تو اس کا پھل حقیقت کی دنیا میں آپ کو ضرور ملے گا۔“

خلا میں جانے والے مسلمانوں کا تذکرہ

ملائیشیا سے تعلق رکھنے والا شیخ مظفر شکور خلا میں جانے والوں میں شامل تھا۔ اس سے قبل آٹھ مسلمان یہ اعزاز اپنے نام کر چکے ہیں۔ پہلا شخص سعودی عرب سے تعلق رکھنے والا سلطان سلیم السعود تھا، جس نے 1985 میں کشش نقل سے آزادی کا انوکھا تجربہ کیا۔ تین برس بعد شامی باشندے محمد فارس نے خلا کے لیے رخت سفر باندھا۔ سوویت یونین سے تعلق رکھنے والے موسیٰ منارف نے تو مجموعی طور پر خلا میں 541 دن گزارے۔ اس کے بعد افغانستان کے عبدالاحد محمد، روس کے توکتار آوبا کیروف اور قازقستان کے تالگات موسیٰ نے یہ اعزازات اپنے نام کیے۔

اگلے صاحب سالیوان شالیوف تھے۔ وہ بھی قازقستان ہی کا باشندہ تھا، جو دوبار (98ء اور 2004ء) میں خلا میں گیا۔ آٹھواں نام اہم ہے کہ اس بار کسی مسلم مرد نے نہیں، بلکہ ایک عورت نے خلا میں سفر کا خواب آنکھوں میں سجایا تھا۔ یہ تھی ایرانی نژاد امریکی انوشہ انصاری، جس نے 2006 میں یہ کارنامہ انجام دیا۔ اس کی یادداشتیں بھی شائع ہو چکی ہیں۔ انوشہ کے اگلے برس مظفر خلا میں گیا اور وہاں ماہ رمضان گزارنے اور عید منانے والا پہلا شخص ٹھہرا۔

ایک ماہر خلا باز قرار دیا۔ ”ایک خلا نورد کے لیے کوئی اور لفظ استعمال کرنا، جیسے خلائی سیاح یا مسافر اس کی توہین ہے۔ مظفر ان بہترین لوگوں میں سے ایک ہے، جن سے میری ملاقات ہوئی۔“

اس اثناء میں حکومت نے مالی گھیلوں جیسے سنگین الزام سے دو دو ہاتھ کرنے کی تیاری بھی کر لی۔ ایک بڑی پریس کانفرنس میں اعلان کیا گیا کہ ملائی خلا باز کا مقصد صرف خلا میں چہل قدمی نہیں۔ وہ انسانی خلیوں کے نمونے، دواؤں میں استعمال ہونے والے بیکٹریا اور پروٹین کرشل ساتھ لے جائے گا اور صرف کشش نقل میں اُن پر مختلف تجربات کرے گا۔ عوام کو یقین دلایا گیا کہ اگر تجربات کامیاب رہے، تو علاج

میں ہوں گے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اٹھارہ ماہ انتہائی کٹھن تھے۔ انہیں بدترین صورت حال میں زندہ رہنے، موت کے رو برو ہونے اور اسے شکست دینے کی مشق اتنی بار کروائی گئی کہ انہوں نے خوف کا لفظ اپنی لغت سے خارج کر دیا۔

مظفر کی خالد سے گاڑھی چھننے لگی تھی۔ وہ اسے فوج میں گزرے دنوں کی کہانیاں سنا تا، مظفر کرناٹک کے قصبے بیان کرتا۔ وہ بھول گئے تھے کہ ابھی اُن کے درمیان ایک مقابلہ باقی تھا۔ قسمت کسی ایک پر مہربان ہونے والی تھی۔ اور جب وہ لمحہ آیا، تو اسے پہلی بارک باد دینے والا خالد ہی تھا۔

”تم میرے بھائی کی طرح ہو۔“ اس نے مظفر کے گلے لگتے ہوئے کہا تھا۔ ”مظفر کی خلا میں موجودگی کا مطلب ہے کہ خالد وہاں موجود ہے۔“

جولائی 2007 میں جب روسی ساختہ Soyuz TMA میں سوار ہونے والے خوش قسمت ملائی نوجوان کے نام کا اعلان کیا گیا، حلیمہ کے ماں باپ نے بوڑھے باپ کو فون کر کے کہا۔ ”جناب، جو نبی آپ کا لڑکا لو، نے، شادی کی تاریخ طے کر لیں۔ ہم ایسے گوبر تابیاب کو کھونا نہیں چاہتے۔“

☆.....☆

ایک جانب مظفر کی کامیابی کے شادیانے بچ رہے تھے، دوسری طرف ناقدین چھریاں تیز کر رہے تھے۔

آغاز ایک انٹریزی اخبار کی رپورٹ سے ہوا، جس میں ملائی خلائی پروگرام کو پیسوں کا ضیاع قرار دیتے ہوئے اس میں بھاری گھیلوں کا انکشاف کیا گیا۔ حکومت اس الزام سے نمٹنے کی تیاری کر رہی تھی کہ ایک اور اخبار نے منتخب ملائی پر پھبتی کسی کہ وہ کوئی غلاباز نہیں، بس ایک سیاح ہے، جس کی وجاہت اور کسرتی بدان کو حکومت اگلی الیکشن مہم میں بطور اشتہار استعمال کرنے والی ہے۔

مظفر پر ہونے والی تنقید، جس نے اس کی مگلیتر اور کئی دوستوں کو افسردہ کر دیا تھا، جلد دم توڑ گئی۔ پہلا بیان ملائیشیا میں روسی سفیر الیگزینڈر کیرچیوے نے دیا۔ اس نے واضح الفاظ میں کہا۔ ”مظفر کڑی تربیت سے گزرا ہے اور خلا بازوں والی تمام مہارتوں کا حامل ہے۔“ اس نے ملائی نوجوان کو کسی بھی امریکی یا برطانوی خلا باز کے ہم پلہ قرار دینے پر اصرار کیا۔

کچھ روز بعد ناسا کے ایک سابق افسر ربرٹ گلمن نے، جو مظفر کے تربیتی پروگرام میں شامل رہا تھا، اپنے انٹرویو میں اسے شان دار الفاظ میں خراج تحسین پیش کرتے ہوئے

علماء اور اسپیس ایجنسی کے ماہرین کے درمیان کئی نشستیں ہوئیں۔ نیکینا لوجی منسٹر نے معاملے میں خصوصی دلچسپی لی۔ دیگر ممالک کے علماء سے بھی رابطہ کیا گیا۔ بالآخر 18 صفحات پر مشتمل ایک کتابچہ تیار کیا گیا۔ حکومتی منظوری کے بعد اس کی ایک کاپی شیخ مظفر کو بھیجی گئی۔

اُس کتابچے کو وصول کرتے ہوئے اُس نے وہی خوشی محسوس کی جو میڈیکل کی ڈگری وصول کرتے ہوئے کی تھی۔ وہی مسرت جو خلائی پروگرام کے لیے منتخب کردہ دوسو افراد میں اپنا نام پا کر رگ و پے میں دوڑ گئی تھی۔ وہی تشکر جو اس روز محسوس کیا، جب اسے خلا میں جانے والے پہلے ملائی کے طور پر چنا گیا۔

کتابچہ ہاتھ میں تھا اور آنکھوں میں نمی تھی۔ کتابچے کا نام ساری کہانی بیان کر رہا تھا۔ ”انٹرنیشنل اسپیس اسٹیشن میں اسلامی عبادات کا ہدایت نامہ!“

ہاں، جس مشکل نے اسے بے کل رکھا، جس مسئلے نے بے چین کیا، اس کا سدباب ہو چکا تھا۔

قصہ یوں ہے کہ منتخب ہونے کے بعد ہی سے مظفر کے ذہن میں یہ سوالات گردش کرنے لگے کہ وہ ہمہ وقت، تیزی سے حرکت کرتے اسپیس اسٹیشن میں قبلے کا تعین کیسے کرے گا؟ صفرکشش قفل میں نماز کیسے ادا کی جائے گی؟ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کتنی بار نماز ادا کرے گا۔ مسلمان چوبیس گھنٹے میں پانچ بار رب کے حضور جھکتا ہے، دن کا تعین زمین کی محوری اور مدار کی حرکت سے ہوتا ہے، مگر اسپیس اسٹیشن تو یہ فاصلہ ہر 90 منٹ میں طے کر لے گا۔ یعنی زمین کی حرکت کا کلیہ اسٹیشن پر لاگو کیا جائے، تو ہر 90 منٹ بعد ایک نیا دن ہوگا۔

علماء نے خوب غور و خوض کے بعد فتویٰ دیا کہ شیخ مظفر اسپیس اسٹیشن میں جہاں دن اور رات کی تفریق مٹ جاتی ہے، نماز ادا کرنے کے لیے قازقستان کے اوقات کار پیش نظر رکھے۔ جب ادھر موذن فلاح کے لیے پکارے تو سجدے میں جھک جائے۔

صفرکشش قفل میں پانی سے وضو کرنا ناممکن ہے، اس کام کے لیے گیلا تولیہ استعمال کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ وہ رکوع اور سجدے کا پابند نہیں کہ خلا میں حیرتے ہوئے ایسا کرنا غیر امکانی ہے۔ وہ نیت باندھنے سے قبل قبلہ رو ہو جائے۔ آیات پڑھتا ہوا اشارے سے تمام ارکان ادا کر سکتا ہے۔

معاملے اور اوروں کی سازی کی صنعت کو حیران کن فائدہ پہنچے گا۔ ایک سرکاری اہلکار جوش میں یہ بھی کہہ گیا۔ ”انٹرنیشنل اسٹیشن میں شیخ مظفر ملائی کھانے تیار کرے گا اور دیگر خلا بازوں کی ہماری ذمہ داری چائے Teh tarik سے واضح کرے گا۔

پریس کانفرنس کا بہت چرچا ہوا۔ ترقی کے عین مطابق سنجیدہ نکات سے زیادہ چائے کی تیاری اور ملائی کھانے زیر بحث رہے۔ بالآخر نیکینا لوجی منسٹر کو سامنے آتا پڑا، جس نے واضح الفاظ میں کہا۔ ”خلا میں شیخ مظفر کو چائے اور کھانوں کی تیاری سے زیادہ اہم معاملات درپیش ہوں گے۔“ اس نے انسانی خلیوں اور پروٹین کرشل پر ہونے والے تجربات کی اہمیت اجاگر کی۔ ”جناب مظفر کی انٹرنیشنل اسپیس اسٹیشن میں موجودگی کے دوران میں ملائی نوجوانوں کے لیے ایک لائیو کلاس کا اہتمام کیا جائے گا، جہاں وہ صفرکشش قفل پر ٹھوس اور مانع کے بدلتے بزن اوپر روشنی ڈالیں گے۔“

بلاشبہ یہ باتیں اہم تھیں۔ مگر ایک پہلو اور تھا، جس کی جانب کسی نے توجہ نہیں دی۔

یہ ایک اضطراب تھا۔ ایک خاص نوع کی بے چینی، جو مظفر کی اساطیری شہرت پر منتج ہونے والی تھی۔

☆.....☆

ہاں، وہ ایک محبت وطن ملائی تھا، ایک ایمان دار معالج، فرماں بردار بیٹا، مگر سب سے پہلے ایک مسلمان۔ شیخ وقتہ نمازی۔ پابندی سے روزے رکھنے والا، خیرات دینے والا، دوسروں کے کام آنے والا مسلمان۔ ہر سانس میں اپنے رب کو یاد رکھتا، اس کے حضور سجدہ ریز ہوتا مظفر کے نزدیک اس دن کی اہم ترین سرگرمی تھی اور یہی امر اسے بے چین کیے ہوئے تھا۔ جوں جوں سفر کی تاریخ قریب آتی گئی، بے چینی بڑھتی گئی۔

بالآخر اُس نے نیکینا لوجی منسٹر کو فون کیا جو دفتر میں بیٹھ رمضان کی آمد کا حساب لگا رہا تھا۔ نوجوان کی باتوں سے اُس کا دل محبت سے بھر گیا۔ ساتھ ہی وہ حیران ہوا کہ اس نے خود اس بابت کیوں نہیں سوچا۔ منسٹر نے اسپیس ایجنسی فون کیا۔ ”آپ نے میرے منہ کی بات چھین لی۔“ ڈائریکٹر پُر جوش تھا۔ ”ہم فوراً کام شروع کر دیتے ہیں۔“

اب اعلیٰ حکام نے قوی فتویٰ کونسل سے رابطہ کیا۔ علماء نے جب مدعا سنا، تو فتویٰ جاری کرنے سے پہلے خلا میں جانے والے نوجوان اور اُس کی معاونت کرنے والوں کے لیے دعائیہ کلمات ادا کیے۔

تھے۔ مظفر امریکی خلا باز بیکی وائسن اور روسی خلا باز یوری مالچنکو فضا کے ساتھ یہ حفاظت انٹرنیشنل خلائی اسٹیشن پہنچ گیا تھا۔ کچھ گھنٹے مزید گزرے اور پھر وہ خبر بھی آئی گئی، جس کے لیے ملائی مسلمان دعا گو تھے۔ شیخ مظفر شکور نے قازقستانی اوقات کے مطابق سحری کر لی تھی۔

وہ بیماریوں سے جو جھتے مہاتیر محمد کے لیے ایک قیمتی لمحہ تھا۔ وہی تو تھا جس نے ملائی اسپیس پروگرام کی بنیاد رکھی اور اب دعا گو تھا کہ وہ مزید کچھ روز زندہ رہے، کم از کم عید تک، تاکہ اپنے دیس کے ہونہار باشندے کو خلا میں عید منانا دیکھ لے۔

ہاں، مظفر پوری تیاری سے گیا تھا۔ کچھ مخصوص ہسٹ۔ کچھ مشروب۔ کچھ ملائیشیا کی سوغاتیں۔

تو اب وہ زمین سے میلوں پرے، خلا میں تیرتی اسپیس سٹل میں تھا، جس میں نصب اسپیکر سے دھیمی آواز میں اذان نثر ہوتی اور وہ تیرتا ہوا اپنے کیمین کی سمت بڑھنے لگا۔ جب بڑے، شفاف شیشے کے پائس سے گزرتا تو وسیع و عریض کائنات کی ایک جھلک اُس کے دل کو اُس ہستی کی ثناء سے بھر دیتی، جو مشرق و مغرب کا مالک ہے۔ مالچنکو فضا سے دیکھ کر کہتا۔

”تو تمہاری عبادت کا وقت ہو گیا۔“

مظفر اس اسٹیشن میں دس روز رہا۔ اس دوران میں اس نے باقاعدگی سے پانچ وقت کی نماز ادا کی، جس کی فلم پورے ملائیشیا نے ایک ناقابل بیان خوشی کے ساتھ دیکھی۔ مگر وہ اپنی پیشہ وارانہ ذمے داریوں سے بھی غافل نہیں ہوا۔ جو خلیے اور بافتیں ساتھ لے گیا تھا، ان پر کشش نعل اور دباؤ سے آزاد ماحول میں تجربات کیے۔ پروٹین کرشل کے تجربے میں وقت پیش آئی مگر اس نے اُسے جاری رکھا۔

خلیوں پر ریسرچ کا مقصد کلیجے کے سرطان میں بہتری کے امکانات تلاش کرنا تھا۔ کچھ تجربوں کا تعلق طبی تحقیق اور کچھ کا صنعتی علوم سے تھا۔

کلیجے کے سرطان کی ضمنی میں تجربات اُمید پر منتج ہوئے۔ اعداد و شمار امکانات کی جانب اشارہ کر رہے تھے۔

وہاں بتے یادگار دنوں میں اس نے ویڈیو لنک کے ذریعے ملائی طلباء کو لیکچر بھی دیے۔ سیکڑوں درس گاہوں کے ہزاروں طلباء نے اپنے ہیرو کو انٹرنیشنل اسپیس اسٹیشن میں تیرتے، مانع اور ٹھوس اشیاء کے بدلے مزاج کی خبر دیتے دیکھا۔ ایک ویڈیو تو بہت مقبول ہوئی، جس میں مظفر نے

ملائیشیا کے اسلامک ڈیولپمنٹ کے ترجمان نے ایک خصوصی پریس کانفرنس میں کتابچے کی تفصیلات بتائیں۔

”اس کا روسی اور عربی کے علاوہ انگریزی میں بھی ترجمہ کیا گیا اور تمام زبانوں کے علماء نے اس کی توثیق کرتے ہوئے اسے قابل تریف ٹھہرایا ہے۔“

ترجمان نے یہ بھی کہا کہ شیخ مظفر ماہ رمضان کے آخری عشرے میں خلا میں جائیں گے، سفر میں ہونے کی وجہ سے انہیں رعایت ہے، وہ بعد میں روزے پورے کر سکتے ہیں لیکن اگر وہ روزہ رکھتے ہیں، تو اس پرائیونٹ کی حرکت کا کلیہ لاگو نہیں ہوگا۔ وہ قازقستانی شہر یا کونور کے اوقات کے مطابق سحری اور افطاری کریں گے۔ ”یوں تو ان پر کوئی شرط عائد نہیں، مگر مجھے یقین ہے کہ وہ خلا میں روزہ رکھنے والے پہلے مسلمان کا اعزاز حاصل کرنے کا موقع جانے نہیں دیں گے۔“

اس جیلہ پرنٹی وی سیٹ کے سامنے بیٹھا مظفر مسکرایا۔

”مظفر اپنے رب کا فرماں بردار ہے۔ اور اس کے عطا کردہ موقع سے منہ موڑنا حماقت ہوگی۔“

☆.....☆

وہ ایک طلسماتی لمحہ تھا۔ 10 اکتوبر 2007 کو، جونہی ماسکو میں نصب جہازی گھڑیال کے کائناتے پانچ بج کر 22 منٹ پر پہنچے ملائیشیا نے سانس روک لیا۔

اگلے ہی پل اس شتی ہوئی شام ایک راکٹ آگ اُٹھتا ہوا، چنگماڑا ہوا فضا میں بلند ہوا۔ پہلے وہ سورج سا دکھتا رہا۔ پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ کوالا لپور میں نصب عظیم الجذہ اسکرین پر اور گھر گھر لگے ٹی وی سیٹ پر کروڑوں افراد نے یہ منظر دیکھا اور خود میں خوشی اور تفاخر کا دریا سوجزن پایا۔ لوگ آنکھوں میں نمی لیے ایک دوسرے کو مبارک باد دے رہے تھے کہ ان کے دیس کا ایک باسی اسی راکٹ میں سوار تھا۔

اس طلسماتی لمحے شیخ مظفر کسی کا بیٹا یا کسی کا منگیتر نہیں تھا۔ وہ فقط ملائیشیا کا سپوت تھا۔ پوری دنیا کے مسلمانوں کی آنکھ کا تارا۔ خلا میں جانے والا پہلا ملائی اور ماہ رمضان میں یہ اعزاز پانے والا اولین مسلمان۔

گوراکٹ منظر سے اوجھل ہو گیا تھا مگر کوالا لپور میں نصب اسکرین کے سامنے لگا ہجوم اگلے کئی گھنٹوں تک وہیں رہا۔ یہ جشن جلد نہیں تھمنے والا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ خوشخبری موصول ہوئی، جس کے وہ منتظر

ماہنامہ سرگشت

ہیرو کے مانند اس کا استقبال کر سکیں۔

☆☆☆

وہ ایک آگ کا گولا تھا، جو گیسوں کی چادر چیرتا زمین کی سمت بڑھ رہا تھا۔

یہ شعلوں میں لپٹے اس اسپیس کرافٹ کا تذکرہ ہے، جو خلا بازوں کو زمین پر لارہا تھا۔ اس کے گرنے کی رفتار گولی سے تیز تھی اور اسے مسلسل جھٹکے لگ رہے تھے۔

گو حفاظتی انتظامات مکمل تھے اور مظفر تربیت کے دوران میں اس صورت حال سے نمٹنے کی مشق کر چکا تھا، مگر ایک لمحے کو اس کی دھڑکن تیز ہو گئی۔ خوف کی معمولی سے جنبش، جو اگلے ہی پل یقین کی روشنی میں غائب ہو گئی۔ اس نے اپنے رب کو یاد کیا۔ دعا میں جہاں اپنے پیاروں کو دوبارہ دیکھنے کی آرزو تھی، وہیں احساس تشکر بھی کہ اللہ نے اسے ایک ایسا اعزاز عطا کیا، جو اس سے قبل کسی ملائی باشندہ کو نہیں حاصل ہوا۔ ایسا اعزاز، جو کسی مسلمان خلا باز کے حصے میں نہیں آیا تھا۔ اور تب شدت جذبات سے مغلوب ہو کر اس نے کہا۔ ”اب اگر میری جان بھی چلی جائے، تب بھی کوئی غم نہیں۔“

زمین کی طرف گرتے اسپیس کرافٹ نے محفوظ لینڈنگ کی۔ وہ ایک ویرانے میں گرا تھا۔ تمام لوگ محفوظ تھے اور خوشی سے ان کے چہرے دمک رہے تھے۔ کچھ ہی دیر میں روسی اہل کار تیز رفتار گاڑیوں میں وہاں پہنچ گئے۔

پہلے انہیں قریب ترین خلائی اسٹیشن لے جایا گیا۔ کچھ دیر بعد بین الاقوامی میڈیا نے خلا بازوں کی واپسی کی خبر نشر کی، تو ملائیشیا میں جشن کا آغاز ہو گیا۔ ایسا جشن جس کی ملکی تاریخ میں مثال نہیں ملتی تھی۔

مظفر کے وطن لوٹتے ہی اس جشن میں شدت آگئی۔ اس نے ملائی زمین پر قدم رکھتے ہی رب کے حضور سجدہ کیا۔ ٹیکنالوجی منسٹر نے اسے آگے بڑھ کر گلے لگایا۔

گیارہ ہزار ملائی باشندوں میں منتخب ہونے والے مظفر نے، جو اب پوری دنیا کے مسلمانوں کا ہیرو تھا، اپنے پیغام میں کہا۔ ”مجھے شہرت کی خواہش نہیں، نہ یہ آرزو ہے کہ میرا استقبال کسی سلیبرٹی کی طرح کیا جائے۔ میرے اس سفر کا مقصد ملائیشیا کے طلباء کو متحرک کرنا تھا، خصوصاً بچوں کو، جن کی آنکھوں میں خواب ہیں۔ بے شک میں خلا میں جانے والا پہلا ملائی شخص ہوں، مگر آخری نہیں۔“

دھیرے سے ڈبے سے جوس انڈیلا اور باہر آنے والا مائع ایک چھوٹی سی سرخ گیند میں تبدیل ہو گیا۔ کچھ لمحے وہ اس سے کھیلتا رہا اور ہزاروں متحیر آنکھیں اسے دیکھتی رہیں۔

یہ فقہ طلبا نہیں تھے، پورا ملائیشیا اسے دیکھ رہا تھا۔ عید کے روز اس اعداد میں یکدم کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

مظفر کا یہ اعلان کہ وہ بروز عید اسٹیشن میں اپنے ساتھیوں کے لیے ایک دعوت کا اہتمام کرے گا، بین الاقوامی اخبارات کی زینت بنا۔ جنوبی ایشیا کی مسلم اقوام پر بحسب تھیں۔ خلا میں عید منانے کا تصور ہی ان کے خون کی رفتار بڑھا دیتا۔ ملائی حکومت نے اس ظہرانے کی لائیو کوریج کا اعلان کر رکھا تھا۔ حکومتی اور سرکاری عہدے داروں نے اپنی مصروفیات کا شیڈول بتانے سے قبل نشریات کے اوقات کار پر نظر ڈالنا ضرور جانا۔

عید کے روز مظفر نے قازقستان کے وقت کے مطابق نماز ادا کی۔ اس کے ہم وطن کچھ کھٹے پہلے یہ فریضہ انجام دے چکے تھے اور کوالالمپور میں اس کے گھر سہیلی کارڈوں اور ٹیلی فون کالز کا تاننا بندھا تھا۔ وہ رشتے دار بھی بوڑھے محی الدین تک اپنے نئے جذبات پہنچانا چاہتے تھے، جن کی برسوں سے اس نے شکل نہیں دیکھی تھی۔

مبارک باد کا یہ طوفانی سلسلہ ظہرانہ کے وقت تھما، جب ملائی ٹی وی نے اس دھندلی مگر بحسب اور دلچسپی سے بھرپور نشریات کا آغاز کیا۔ دو پرائیویٹ چینلوں بھی یہ فریضہ انجام دے رہے تھے۔ وزیر اعظم نے اپنی مصروفیات منسوخ کر کے خود کو جوش کے اس ریلے کے حوالے کر دیا، جس کا مرکز دارالحکومت میں نصب قوی الجیہ اسکرینیں تھیں۔ اور وہ روکتے کھڑا کر دینے والا احساس تھا، جسے الفاظ میں بیان کرنا دشوار تھا۔

معروف شخصیات کے تاثرات قلمدانے کے خواہش مند ٹی وی چینلوں کی توجہ کا مرکز اسپتال میں پڑا وہ بوڑھا تھا، جو کچھ روز ہوئے پائی پاس سے گزرا تھا۔ مہاتیر محمد، جو ملائی خلائی پروگرام کا بانی تھا۔ وہ ایک یادگار دن تھا، ایک یادگار عید۔

جب ٹی وی اسکرین پر مسکراتے مظفر نے اپنے ہم وطنوں کو عید مبارک کہا، تو سب نے یک زبان ہو کر دلولہ انگیز انداز میں جواب دیا۔ اس یقین کے ساتھ کہ ان کی آواز چاند تک پہنچ جائے گی۔

خلا میں جانے والا نواں مسلمان ایک استعارہ بن چکا تھا۔ اور اب وہ اس کی واپسی کا انتظار کر رہے تھے، تاکہ ایک



مشہور زمانہ پابندی کا شکار کتابوں کا تذکرہ

پڑھنا منع ہے

منظر امام



انسان کی رفیقی خاص کتابیں ہوتی ہیں جو زندگی کی صحیح راہ متعین کراتی ہیں مگر کچھ کتابیں ایسی بھی ہوتی ہیں جو راہ سے بھٹکاتی ہیں۔ انہیں معاشرے کا دشمن کہنا چاہیے۔ اسی وجہ سے ان پر پابندی لگائی جاتی ہے کہ وہ ہر ایک کی پہنچ سے دور رہیں مگر کچھ کتابیں ملکی سیاست کا بھی شکار ہو جاتی ہیں اور ایسی کتابوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ یہاں ہم چند ایسی مشہور کتابوں کا ذکر کر رہے ہیں جو پابندی کا شکار بنیں۔

کتابیں ہماری دوست ہیں۔ یہ ہم نہ جانے کب سے سنتے آئے ہیں اور یہ بالکل درست بھی ہے۔ کتابیں ہمیں بہت کچھ دیتی ہیں۔ وہ ہمیں دنیا بھر کی معلومات فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ ہمیں روحانی اور نفسیاتی سکون بھی دیتی ہیں۔ کیونکہ انسان نے ترقی اس وقت سے شروع کی جب چھاپے خانے ایجاد ہوئے۔ کتابیں لکھی اور پڑھی جانے لگیں۔

انسان نے کائنات کے ہر موضوع پر کتابیں لکھی

تو پھر دوسرے معاشرے کا کیا کہنا۔
سلاٹر ہاؤس 5:-

کرت ولن گاٹ کی یہ مشہور کتاب ہے۔ یہ تنازع کتاب امریکا میں شائع ہوئی تھی۔ اس کی کہانی کچھ یوں ہے کہ پانچ بچے ایک جنگ میں گرفتار ہوئے تھے انہیں ایک قید خانے میں رکھا گیا تھا جہاں ان پر بے پناہ تشدد ہوتا رہا۔ اس کتاب کا Contant ہی ایسا تھا جس کے خلاف ہنگامہ برپا ہو گیا۔ امریکا میں اس کتاب پر سخت پابندی لگا دی گئی اور جہاں جہاں کتب خانوں میں یہ کتاب پہنچ چکی تھی وہاں وہاں سے اس کتاب کو ہٹا دیا گیا۔

کیونسٹ مینی فسٹو

یہ کتاب کارل مارکس اور فریڈرک انجیل کی تصنیف ہے۔ یہ کتاب سامراجیت یا کمیونسٹ لائزم کے خلاف ہے۔



کتاب نے ایک دنیا کو چونکا کر رکھ دیا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کتاب کی وجہ سے انیسویں اور بیسویں صدی میں دنیا میں کمیونزم کو ترقی ہوئی۔ اس کتاب کے خلاف سامراجیوں کے علاوہ مذہبی حلقوں نے

بھی بہت ہنگامہ کیا تھا۔

میں پابندی لگا دی گئی تھی اور پڑھنے والا نگاہوں میں آجاتا تھا۔ ممکن ہے کہ اب یہ کتاب یورپ اور امریکا میں ملنے لگی ہو۔ لیکن یہ بھی پابندی کے مراحل سے گزر چکی ہے۔

ایڈونچر آف بیگلیری فن

یہ کتاب مشہور ادیب مارک ٹوائین نے لکھی ہے۔ مارک ٹوائین تحریر کی دنیا کا ایک دیوبہگل انسان تھا۔ اس کے قلم



نے اس کتاب کو تخلیق کیا۔ اس پر پابندی تو شاید نہیں لگائی گئی لیکن یہ تنازع ترین کتابوں میں سے ایک ہے۔ اس کے موضوع پر بہت تنقید کی جاتی رہی ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ اس میں فحش مواد

ہیں۔ اچھی کتابیں، بری کتابیں، کروڑوں کی تعداد میں کتابیں ہی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ دنیا بھر کے کتب خانے کتابوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ ہم ان سے رہنمائی حاصل کر کے آگے بڑھتے ہیں۔ کتابوں کا بدل کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ ہم چاہے کتنا ہی جدید طریقہ کیوں نہ اختیار کر لیں کتابوں کا سحر اپنی جگہ قائم رہے گا۔ دنیا بھر میں ایسی بے شمار کتابیں ہیں جو متنازع رہی ہیں۔ ان کو متنازع بنانے والے ان کے موضوعات ہوتے ہیں۔

بہت سی کتابیں کسی خاص مکتبہ فکر، مسلک یا مذہب کے خلاف ہوتی ہیں، اس لیے ان پر پابندی لگا دی جاتی ہے۔ بہت سی کتابیں حکمرانوں کو اس نہیں آتیں اس لیے وہ پابندی کی زد میں آجاتی ہیں۔ بہت سی کتابیں اخلاقی طور پر اتنی گری ہوئی ہوتی ہیں کہ ان کو پڑھنا برا سمجھا جاتا ہے۔ بہت سی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو کسی خاص فلاسفی کی وکالت کرتی ہیں۔ غرض یہ کہ ہر موضوع پر کتابیں موجود ہیں۔

ہم نے اس مضمون میں ایسی چند کتابوں کا جائزہ لیا ہے جو پوری دنیا میں یا تو شدید تنازع رہی ہیں یا بہت سختی کے ساتھ ان پر پابندی لگا دی گئی ہے۔ ایسی کتابوں میں بڑے بڑے ناموروں کی کتابیں بھی شامل ہیں۔ آئیں ایک نظر ایسی کتابوں کو دیکھتے ہیں۔

Things Fall Apart

(تھنگز فال آپارٹ)

یہ مشہور ترین کتاب چنیو اچبے کی لکھی ہوئی ہے۔ یہ



کتاب اپریل 1958ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں اس نے برطانوی اور امریکی سامراجیت پر بھرپور تنقید کی ہے۔ ظاہر ہے یہ بات ان سامراجیوں کو ہضم نہیں ہوئی، اس لیے انہوں نے اس کتاب پر پابندی لگا

دی تھی۔ ایسے کئی ممالک ہیں جہاں اس کتاب پر آج بھی پابندی ہے۔

سوال یہ ہے کہ وہ ممالک جو آزادی اظہار کے داعی بنتے ہیں جب ان کے یہاں بھی ایسی صورت حال ہوتی ہے

ماہنامہ سرگزشت

اور سب سے زیادہ متنازعہ بھی ہے۔

اے ملیں لیٹل پیسز

جیمس فیرے کی یہ کتاب امریکا میں شائع ہوئی تھی۔
یہ انسان پر انسان کے تشدد کی ایسی کہانی ہے جس کو بہت
مزے مزے لے کر بیان کیا گیا ہے۔ ابتداء میں یہ کتاب

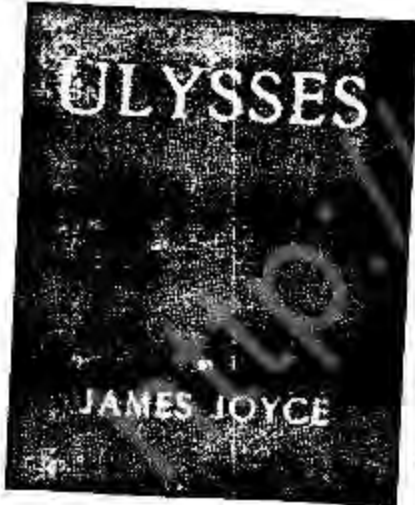


زیادہ متنازعہ نہیں تھی لیکن
جب ٹی وی کا مشہور
میزبان اوپر ادن فیری
نے اپنے ایک ٹی وی
پروگرام میں اس کتاب پر
تبصرہ کیا تو اس کے خلاف
ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور
یہ کتاب متنازع بن گئی۔

Ulysses

جیمز جوائس کی یہ مشہور زمانہ کتاب جس نے پوری دنیا
کے ادیبوں اور ناقدوں کو ہلا کر رکھ دیا اور آج تک اس
کتاب کا سحر قائم ہے۔ جیمز جوائس خود ہی ایک بڑا نام ہے
اور اس کی یہ کتاب بھی شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے
باوجود اس کتاب کا موضوع بہت متنازع رہا ہے۔ اس میں
نفسیاتی الجھنوں کے ساتھ ساتھ جنسی الجھنوں پر بھی روشنی
ڈالی گئی ہے اور ماہرانہ طرزِ تحریر کے ذریعے جنس کے ایسے
ایسے حوالوں سے لکھا گیا ہے جو قابلِ گرفت اور ناقابلِ

اشاعت کے زمرے میں
آتی ہے۔ جیمز کی اس
کتاب کو امریکا، برطانیہ
اور آئر لینڈ وغیرہ میں
چھاپنے کی اجازت نہیں
دی گئی تھی۔ اس نے
فرانس جا کر اپنی یہ کتاب
شائع کرائی۔ امریکا میں
ایک پبلشر نے اس کتاب
کو شائع کرنے کی ہمت کی تھی لیکن اسے گرفتار کر لیا گیا۔ یہ
کتاب اپنے اسٹائل اور طرزِ تحریر کی وجہ سے بے مثال ہے
لیکن اس کا سبیکٹ اس قابل نہیں سمجھا گیا کہ اس کو پڑھنے دیا
جائے۔



زیادہ ہے اور کچھ کا خیال ہے کہ اس کتاب میں سیاہ فاموں کی
بے جا حمایت کی گئی ہے۔ مارک ٹوائن جیسے بڑے مصنف کو
اتنا بھی حق نہیں کہ وہ اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار کر
سکے۔

انارکسٹ کک بک

ولیم پاؤل کی یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے واقعی
خطرناک ہے اور اس قابل بھی تھی کہ اس پر پابندی لگا دی جانی۔
جب دیت نام کی جنگ اپنے عروج پر تھی۔ ولیم پاؤل اس
وقت نوجوان تھا۔ اس نے اس وقت یہ کتاب لکھی تھی۔ اس
کتاب میں غیر قانونی طور پر بم بنانے کی ترکیبیں بتائی گئی
تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ لکھنے
والے کا نظریہ کچھ اور رہا
ہو لیکن یہ کتاب تخریب
کاروں اور دہشت
گردوں سے بہت کام
آ سکتی تھی۔ اس خطرے کو
دیکھتے ہوئے اس کتاب پر
پابندی لگا دی گئی۔ میرا



خیال ہے کہ لکھنے والوں کو بھی اس بات کا خیال رکھنا ضروری
ہے کہ ان کا لکھا ہوا ذہنوں پر کس طرح اثر انداز ہو سکتا ہے
اور اس میں متنی خرابیاں یا اچھائیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ بہت
سے لکھنے والوں کا نظریہ انفرادیت کا بھی ہوتا ہے یعنی کوئی
ایسی بات لکھی جائے جو دوسروں سے بالکل مختلف ہو۔ اس
سلسلے میں ان سے بے احتیاطی ہو جاتی ہے۔

The origin of species

چارلس ڈارون کی یہ ہنگامہ خیز کتاب ہے۔ اس کتاب
نے پوری دنیا کے سماجی، مذہبی اور معاشرتی طبقوں کو چھینوڑ کر
رکھ دیا۔ اس کی اشاعت سے لے کر آج تک اس کتاب کا
ہنگامہ نہیں رک سکا ہے۔
اس کتاب میں انسان کے
ابتدا کے بارے میں لکھا گیا
ہے کہ وہ پہلے کیا تھا اور کہاں
سے مختلف مدارج طے کرتا
ہوا آج موجودہ شکل میں آیا
ہے۔ یہ ڈارون کی ساری
زندگی ان محنت کا نچوڑ ہے



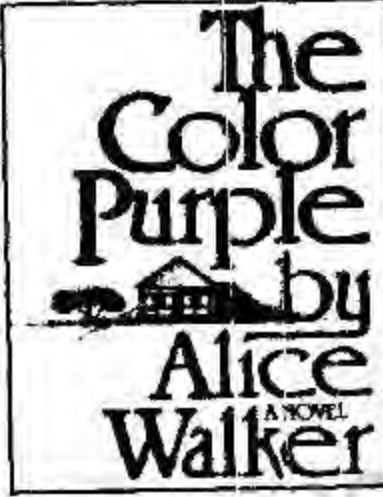
فروری 2015ء

81

ماہنامہ سرگزشت

دی کلر پرپل

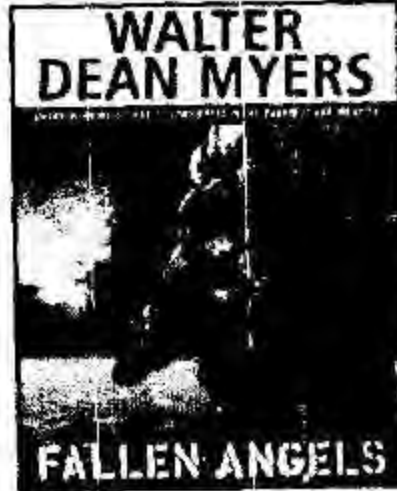
الاس و کرکی یہ کتاب بھی بہت متنازع رہی ہے۔ یہ ایک ایسی سیاہ فام عورت کی داستان ہے جو دنیا سے اپنا حق مانگنے نکلی ہے۔ اس کتاب پر بے تحاشا تنقید کی گئی کیوں کہ بہت سے حلقے یہ سمجھتے تھے کہ اس کتاب کے مندرجات میں



سیاہ فاموں کے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا ہے۔ یہ تو ایک وجہ تھی۔ دوسری وجہ اس کتاب کا Content ہے۔ اس میں جنس، تشدد، اغوا بالجبر اور نہ جانے کیا کیا بھرا ہوا ہے۔ اس لیے اس کتاب پر بھی پابندی لگ گئی تھی۔ مگر 1983ء میں اس کتاب کو 'پبلیٹزر ایوارڈ' جیسے بڑے انعام کا حقدار بھی قرار دیا گیا۔ 1985ء میں اس ناول پر اسٹون اسپل برگ جیسے مشہور ہدایت کار نے فلم بھی بنائی۔

Fallen angels

والٹر ڈین کی مشہور کتاب ہے۔ اس کتاب کے شائع ہوتے ہی پورے امریکا میں ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ اس کی اشاعت 1998ء میں ہوئی تھی۔ یہ کتاب ویت نام کی جنگ اور اس جنگ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی صورت حال پر ہے۔ ظاہر ہے یہ کتاب مورد عقاب کیوں نہیں ہوتی۔ لہذا اس پر ہنگامے ہوئے۔ سخت ترین تنقید ہوئی اور وہ پابندی کی زد میں آگئی۔



The catcher in the rye

جے ڈی سلینگر کی یہ کتاب 1951ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اپنے انٹنس اور غیر اخلاقی Content کی وجہ سے بہت متنازع رہی۔ اس سے اخلاقیات کے خراب ہونے کا اندیشہ تھا (اس سے اندازہ لگائیں کہ جہاں کی اخلاقیات ویسے ہی خراب نہ، اگر وہاں کے لوگ اس کتاب کے بارے میں یہ

سب کہہ رہے ہیں تو یہ کیسی کتاب ہوگی)

ہیری پوڈر سیریز (بے کے رولنگ)

اب آجائیں کتابوں کے اس سلسلے کی طرف جو ہیری پوڈر سیریز کے نام سے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ اس سیریز



کی ہر کتاب پر ایک فلم بن چکی ہے۔ بچے تو بچے بڑے بھی اس کے دیوانے ہیں۔ خود ہمارے ملک پاکستان میں بچے ان کتابوں کو بہت شوق سے پڑھتے ہیں لیکن کیا آپ کو معلوم ہے کہ بہت سے

ملکوں میں ان کتابوں پر پابندی ہے بلکہ یہاں تک ہوا ہے کہ ہیری پوڈر کی کتابیں جلا دی گئی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کتابیں بچوں کو حقیقی دنیاؤں سے بہت دور جادوئی دنیا میں لے جاتی ہیں۔ جہاں بڑے بڑے جادوگر ہیں۔ بھوت ہیں۔ چڑیلیں ہیں اور یہ سب پڑھ پڑھ کر بچوں کے ذہنوں پر بڑے اثرات پڑنے لگے ہیں۔ وہ خوابوں اور خیالوں کی دنیاؤں میں رہنے لگے ہیں اور بچے اگر اثرات گہرے لینے لگیں تو پھر وہ عملی زندگی میں ست ہو جاتے ہیں۔ وہ جادو گروں اور پریوں کو تلاش کرنے لگتے ہیں۔ ان سے عمل کی طاقت ختم ہو جاتی ہے۔ اس بنیاد پر اس سیریز کی کتابیں کئی ملکوں میں ممنوع ہیں۔

A day no pigs would die

(اے ڈے نو پگس وڈ ڈائی)

رابرٹ نیوٹن کی یہ کتاب بہت متنازع رہی ہے۔ اس کتاب میں ایک جانور نے اپنی آپ بیتی بیان کی ہے اور وہ بھی اتنے دردناک طور پر کہ پڑھنے والے پریشان ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ویسے تو یہ



کتاب جانوروں پر ہونے والے ظلم کے خلاف احتجاج کے طور پر لکھی گئی ہے لیکن اس کا انداز بہت بھیانک ہے۔ اس لیے متنازع ترین کتابوں میں سے ہے۔

ماحول اور ملک کا نقشہ کھینچا ہے۔ اس کے مندرجات میں چونکہ بے حد جنسی رغبت کا رجحان ہے اس لیے اس کتاب پر پابندی لگا دی گئی تھی۔ 2012ء میں اسی ناول سے ماخوذ اسی نام سے فلم بھی بنی جو 21 ستمبر 2012ء کو ریلیز ہوئی اور 33 ملین امریکن ڈالر کا بزنس کیا۔

Topic of cancer

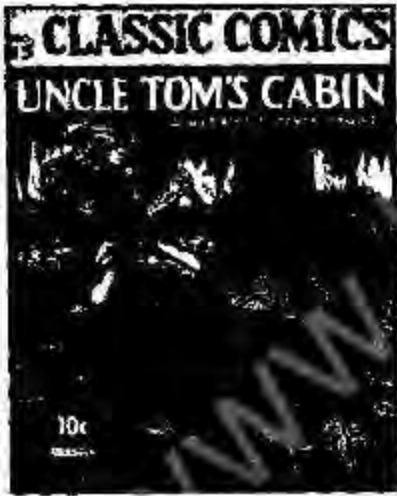
1934ء میں شائع ہوئی اور فوری طور پر پابندی کی زد میں آئی۔ اسے ہنری ملر نے لکھا تھا۔ یہ ان فرانسیسیوں کی کہانی ہے جو فرانس سے باہر اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ کہانی کا مرکزی کردار ایک رائٹر ہے جو خود کو زندہ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس کے Contant میں جنس اور تشدد کا عنصر ہے۔ اس لیے اس پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔



اس لیے اس پر پابندی عائد کر دی گئی تھی۔

انگل ٹام کیسین

یہ مشہور ترین کتاب ہیرٹ چر کی ہے۔ اس کتاب کو مشہور ترین اور متنازعہ ترین کتابوں کی فہرست میں رکھا گیا ہے۔ اس کتاب کا موضوع سیاہ فام غلاموں کی حالت زار ہے۔ متنازعہ ہونے کے باوجود اس کتاب کو دنیا بھر میں بہت زیادہ پڑھا گیا ہے۔



اینڈ ٹینگو میک تھری

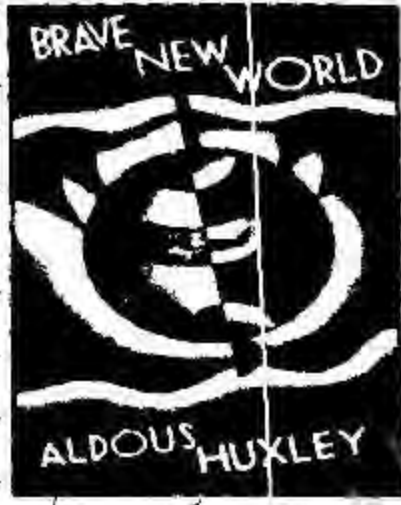
(And tango make three)



ویسے تو یہ کتاب بچوں کے لیے ہے۔ اس کے باوجود اس کتاب کے مندرجات پر بہت اعتراضات ہوتے رہے ہیں۔ اس کے خلاف جگہ جگہ احتجاج کیے گئے ہیں۔ یہ دو پگلوں کی کہانی ہے جو

Brave new world

آلڈوس ہکسلی کی بہت حساس موضوع پر لکھی ہوئی کتاب ہے۔ یہ کتاب بچوں کی پیدائش کے حوالے سے ہے۔ چونکہ اس کو پڑھنے کے بعد ذہن میں منفی قسم کے خیالات پیدا ہونے لگتے تھے۔ اس لیے اس کتاب کو



کتب خانوں، اسکولوں اور کالجوں سے ہٹا لیا گیا۔

The metamorphosis

یہ ایک بہت بڑے ادیب کا فکا کی شاہکار کتاب ہے۔ کاٹکا نے اپنی تحریروں میں اس قسم کے تجربات کیے ہیں۔ اس نے دنیا کو لذت اور اذیت کے درمیان دیکھا ہے۔ یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جو خود بھی ایک کیڑے میں تبدیل ہو گیا۔ پھر وہ اپنے ماحول کو ایک کیڑے ہی کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔

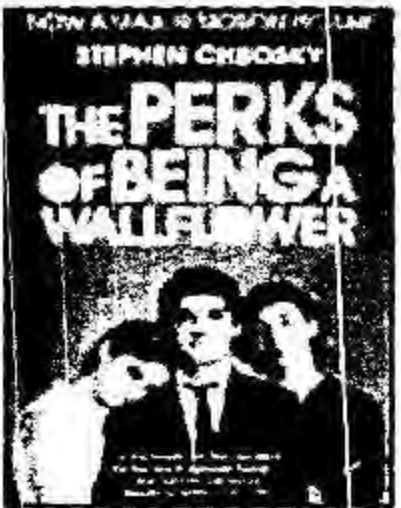


اس کتاب کو اس کے اپنے ملک چیکوسلواکیہ میں متنازعہ اس لیے قرار دیا گیا تھا کہ اس نے اپنی یہ کتاب جرمن میں لکھی تھی۔ بعد میں جب اس کے مندرجات سامنے آئے تو نازیوں اور روسیوں نے بھی اس پر پابندی لگا دی۔

دی پارکس آف نی انگ ویل فلاور

اسٹیفن چو کی کی یہ کتاب بہت متنازعہ رہی۔ یکم

فروری 1999ء کو شائع ہوتے ہی اس کتاب پر امریکا میں مکمل پابندی عائد کر دی گئی تھی۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ ایک نوجوان نے اپنے ایک دوست کو خطوط لکھے ہیں۔ جن میں اس نے پورے



عائد کی گئی تھی۔ مایا انجیلو نے اسے آپ بیتی کے طور پر لکھا ہے۔ اس میں تشدد، ریپ، منشیات کا استعمال وغیرہ سب کچھ ہے۔ اس کتاب نے فروخت ہونے کا ریکارڈ قائم کر دیا تھا۔ پھر اس پر پابندی لگا دی گئی۔



لو لیٹا

ولڈ امیرٹا بکوں کی کتاب۔ یہ ایک ایسے شخص کی کہانی ہے جس نے ایک بیوہ عورت سے شادی کی۔ اس کی بارہ سال کی ایک بیٹی تھی۔ اس شخص نے اس بیٹی سے تعلقات

استوار کر لیے۔ یہ کتاب پورنوگرافی کے زمرے میں آتی ہے۔ اس کتاب پر بے شمار ملکوں میں سخت پابندی ہے۔ اب ہم کچھ ایسی کتابوں کا ذکر کرتے ہیں جن پر ہندوستان یا پاکستان میں پابندی ہے۔

ہندو ہیون



یہ کتاب میکس وائل نے 1934ء میں لکھی تھی۔ اس کتاب پر ہندوستان میں سخت پابندی ہے۔ یہ کتاب میکس وائل نے اس وقت لکھی تھی جب وہ لاہور کے ایک کالج میں پڑھا رہا

تھا۔ یہ کتاب ہندوستان میں عیسائی مشنریوں کے حوالے سے ہے۔

The face of mother india

1936ء میں کیے تھے یہ مایو کی لکھی ہوئی یہ کتاب ہندوستان کے سیکولر ازم کو آئینہ دکھا رہی ہے۔ اس لیے اس کتاب پر ہندوستان میں سخت پابندی ہے۔ یہ کتاب



ایک بچہ پنگوئن سے ماں باپ بن جاتے ہیں۔ کتاب بہت دلچسپ انداز میں لکھی گئی ہے اس کے باوجود ممتاز اس لیے ہے کہ اس میں جنسیت کا عنصر بہت زیادہ ہے۔

The grapes of wrath

جان اسٹین بیک کی یہ کتاب 1939ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ غریب لوگوں کی جدوجہد کی کہانی ہے۔ شائع ہوتے ہی ایک ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ اس کے نسخے جلا دیے گئے۔ پھر اس پر پابندی لگا دی گئی۔ ان سب کے باوجود یہ کتاب لٹریچر میں کلاسک کا درجہ رکھتی ہے۔ اس ناول پر 1940ء میں جین فورڈ جیسے مشہور ڈائریکٹر نے ایک فلم بھی بنائی جو 1989ء میں نیشنل فلم رجسٹری نے لائبریری آف کانگریس کے لیے 25 فلموں میں منتخب کرالی۔



امریکن سائکو

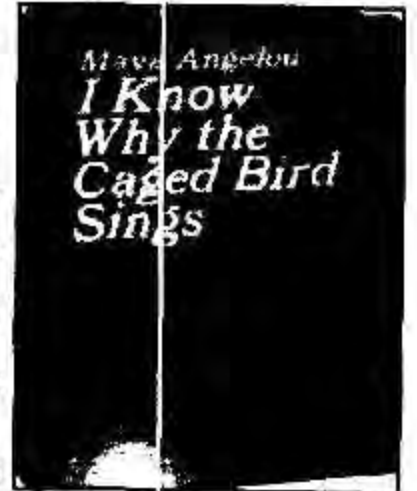


بریٹ اسٹین کی کتاب۔ یہ ایک سیریل کٹر کی کہانی ہے۔ 1991ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں تشدد کا عنصر اتنا زیادہ ہے کہ اس کی اجازت سے پہلے جرمنی میں پابندی لگی پھر آسٹریلیا اور کینیڈا نے بھی

پابندیاں عائد کر دیں۔ ایسے ابھی نئی علاقے ہیں۔ جہاں اٹھارہ سال سے کم عمر کے بچوں کا پڑھنا سخت منع ہے۔

I know why the caged bird sing

اس کتاب کو لکھنے والی مایا انجیلو ہے۔ امریکی تاریخ کی سب سے زیادہ متاثرہ کتاب۔ اس پر پابندی بھی انتہائی شدید



فروری 2015ء

84

ماہنامہ سہ گزشت

Copied From Web

”دی ٹروفرفقان“ مصنف السٹی المہدی۔

”سینٹک ورسس“ مصنف سلمان رشدی۔

”انڈیا انڈی پیٹنٹ“ مصنف چارلس بیٹھمس،

”این ایریا آف ڈارکنس“ مصنف وی ایس نیپل۔

”دی جومل ان دی لوٹس“ مصنف ایلمن ایڈورڈ۔

The evolution of the British
empire and commonwealth from
the American Revolution by alfred
Leroy Burt.

”مین فرام ماسکو“ مصنف گریوال واٹن۔

Early Islam by Desmond.

”نرواے پولیٹیکل بائیوگرافی میچل ایڈورڈ“

”نائن آور آف راما“ مصنف ایشٹلے ولپرٹ

”نیپال“ مصنف ٹونی ہاگن عائشہ مصنف کرٹ

فریشر

”مذہب نے انسان کے ساتھ کیا کیا“ سخت پابندی،

1954ء میں شائع ہوئی تھی۔

The moor's last sigh

یہ کتاب بدنام زمانہ سلمان رشدی کی ہے۔

ہندوستان میں اس کتاب پر اس لیے پابندی لگا دی گئی کہ

اس میں ایک کردار شیوسینا کے بانی بال ٹھا کرے کا نام ہے۔

اس کے علاوہ اس میں ایک کردار جس کا نام جواہر لعل رکھا

گیا ہے۔

وہ کتابیں جو پاکستان میں بین ہیں۔

”ٹھنڈا گوشت“ سعادت حسن منٹو کی۔ اس پر پابندی

لگا دی گئی تھی۔

”رنگیلار رسول“ 1924ء میں شائع ہونے والی اس

کتاب میں ذات مقدس پر کچھ اچھالی گئی ہے۔

یہ کتاب لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ اس کے پبلشر

راجا پال پر سیکشن 153A کے تحت مقدمہ قائم ہو گیا تھا۔ 6

اکتوبر 1929ء کو راجا پال کو قتل کر دیا گیا۔

Satanic verses

بدنام زمانہ مصنف رشدی کی بدنام زمانہ

کتاب۔ اس پر بہت سختی سے پابندی ہے اور اس میں

جو بکواس کی گئی ہے اس کے بارے میں کچھ لکھنا ہی

فضول ہے۔



ہندوؤں کی ذہنیت اور ہندوستانی مسلمانوں کی حالت زار پر
ہے۔ پوری طرح بتایا گیا ہے کہ ہندو ذہنیت کس طرح
مسلمانوں کا اتحصال کرتی ہے۔

اولڈ سو لجر صاحب

فرینک، رچرڈ نے



یہ کتاب 1936ء میں

لکھی تھی۔ یہ برطانیہ سے

ایک فوجی کی داستان

ہے۔ جب وہ ہندو

میں تعینات

ہندوستان میں اس

پر پابندی ہے۔

The Language of the Lingam

1937ء میں شائع ہوئی۔ یہ چونکہ ٹیر رازم اور ان

کی رسومات کے بارے میں ہے۔ اس لیے اس پر سختی سے

پابندی ہے۔

ان کے علاوہ کچھ اور کتابیں جو ہندوستان میں پڑھنا

منع ہے۔

”پاکستان پس منظر۔ پیش منظر“ حمید انور کی اردو

میں ہے۔

”بیز فائر“ آغا بابری کی اردو میں ہے۔ (1950ء)

”نماک اور خون“ نسیم مجازی۔ اردو میں ہے۔

(1950)

”محرکہ سومنات“ مولانا صادق حسین کی۔

”بھوپت سنگھ“ 1959ء میں شائع ہوئی۔ گجراتی

زبان میں۔

”مسٹریز انڈیا“ جسے موکی سنگھ نے لکھا۔

”سینٹیڈ گارڈ، انھرو پولو جی آف سیکس لائف ان

لیونٹ“ مصنف برن ہارٹ۔

”چندر موہنی“ جو اردو میں لکھی گئی ایک قدیم کتاب

ہے۔

”راما ٹولڈ“ مصنف ابرے سین۔

”ڈارک آرگ“ مصنف رابرٹ ڈبلیو نیل۔

”کیٹھو کشمیر“ مصنف عزیز بیگ۔

”دی ہارٹ آف انڈیا“ مصنف الیگزینڈر کمپبل۔

”لوٹس اینڈ دی رولٹ“ مصنف آر تھر کسٹلر۔

سمندری لٹیروں

اشفاق عطاری

بہتے ہوئے پانی پر اپنی حکومت قائم کرنے والے سفاک لٹیروں کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ صدیوں سے انسانی خون کی ہولی کھیلتے آئے ہیں۔ اس کام میں عورتیں بھی پیچھے نہیں ہیں۔ عورتوں نے بھی سمندر کے سینے پر سفاکیٹ و بربریت کی تاریخ رقم کی ہے۔

بحری قزاقی کی تاریخ کئی پرانی ہے۔ اس بارے میں تو یہ نہیں بتا سکتے لیکن معلوم تاریخ کے چند قزاقوں کا ذکر کر رہے ہیں تاکہ آپ کو اندازہ ہو جائے کہ یہ قزاق کس قسم کے ہوتے تھے اور ان کی سرگرمیاں کیا تھیں۔
ولیم کڈ (اسکاٹ لینڈ کا باشندہ):

اس کا زمانہ 1645ء سے 1701ء تک کا ہے۔ یہ امریکا جا کر نیویارک میں آباد ہو گیا تھا۔ وہ ایک درو مند دل رکھنے والا انسان سمجھا جاتا تھا۔ وہ فلاحی کاموں میں بھی حصہ لیا کرتا تھا۔

ولیم کو اس کے بڑوسی اور جہاں یہ کام کرتا وہاں کے لوگ بہت پسند کرتے تھے۔ کیوں کہ یہ نوجوان دوسروں کا ہمدرد تھا۔ ان کے دکھ سکھ میں کام آیا تھا لیکن زندگی نے ابھی تک اسے کچھ زیادہ نہیں دیا تھا۔ اتنی محنتوں کے باوجود اس کے پاس مایوسی اور مفلسی ہی رہی۔ البتہ اس کے خواب بہت شاندار تھے۔ وہ خواب میں اپنے آپ کو دولت مند ہوتے ہوئے دیکھا کرتا اور اس خواب کی تعبیر کی کوشش کرتا۔ ایک دن اسے ایک بحری جہاز پر جب کام کی آفر ہوئی تو اس نے آفر دینے والے سے کہا۔ ”یار! میرے پاس تو اس قسم کے کاموں کا کوئی تجربہ ہی نہیں ہے۔“

”کوئی بات نہیں۔ تجربہ کسی کے پاس نہیں ہوتا کام کے بعد آتا ہے۔“

”تو کیا میں یہاں ٹھیک نہیں ہوں۔“ اس نے

آپ نے، بحری قزاق تو ضرور دیکھے ہوں گے۔ کچھ نہیں تو فلموں میں تو ضرور دیکھا ہوگا۔ فلموں میں عام طور پر ان قزاقوں کا حلیہ تقریباً ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ سر پر ایک بڑی سی ہیٹ، ہونٹوں کے درمیان دھواں اگلتا ہوا سگار اور ایک آنکھ کے سامنے چمڑے یا کپڑے کا خول۔۔

پتا نہیں ان قزاقوں کی ایک آنکھ کیوں خراب ہوتی ہے۔ آپ نے ان پر کہانیاں بھی پڑھی ہوں گی۔ ناول بھی لکھے گئے ہیں۔

حالیہ دنوں میں صومالیہ کے بحری قزاقوں کا بہت چرچا رہا ہے۔ یہ لوگ کھلے سمندر میں اپنے جہازوں پر دندناتے پھرتے ہیں اور کبھی کبھی تجارتی اور مسافر بردار بحری جہاز کو پرغمال بنا کر لوٹا کر لیتے ہیں اور عملے کو پکڑ لیتے ہیں۔ ان کے پاس اسلحہ بھی ہوتا ہے اور افرادی قوت بھی۔ آج کل تو یہ ہوئے، لگا ہے کہ مسافروں اور جہاز کے عملے کو پرغمال بنا کر باقاعدہ تاوان وصول کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد انہیں رہا کرتے ہیں۔

یہ سمجھ لیں کہ یہ بحری قزاق سمندر کے سینے پر متوازی حکومت قائم رکھتے ہیں۔ ان سے دنیا کی ہر حکومت عاجز آچکی ہے۔ انہوں نے کئی بار پاکستانی جہازوں کو بھی پرغمال بنایا ہے اور عملے کی رہائی کے عوض بھاری تاوان وصول کیا ہے۔ یہ زیادہ پرانی باتیں نہیں ہیں۔ گزشتہ چار پانچ برسوں میں ایسے کئی واقعات ہو چکے ہیں۔

پوچھا۔

کرنے والا۔

انسان کو بدلتے دیر نہیں لگتی۔ نہ جانے کب اس کے مزاج میں شیطانیت آجائے۔ ولیم بھی ایسا ہی ثابت ہوا۔ اس نے سمندر کے سینے پر اپنے جہاز دوڑا دوڑا کر لوٹ مار شروع کر دی۔ اس کی بد قسمتی یہ ہوئی کہ اس نے ایک بار ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک جہاز پر حملہ کر دیا۔ بس پھر کیا تھا۔ برطانوی بحریہ اس کے پیچھے لگ گئی اور اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اسے انگلینڈ لے جایا گیا جہاں اسے پھانسی کی سزا ہوئی۔

”بالکل نہیں، تم جیسے باہمت نوجوان کو تو ابھی تک بہت کچھ کر لینا چاہیے تھا، خیر ابھی بھی وقت نہیں گزرا۔ تم اپنے خوابوں کی تعبیر حاصل کر سکتے ہو۔ اس کے علاوہ بحری جہازوں میں ملازمت کا ایک اور فائدہ ہوتا ہے جو کسی ملازمت میں نہیں ہوتا۔“

”وہ کیا؟“

”دنیا بھر کی سیر۔ جہاں جہاں جہاز لنگر انداز ہوگا، تم وہاں کی سیر کرو گے۔“

کہا جاتا ہے کہ اس کی گردن کی رسی تین بار ٹوٹی تھی۔ چوتھی بار رسی نے مرتے دم تک اس کا ساتھ دیا۔ اس طرح اس بحری قزاق کی کہانی ختم ہوئی۔

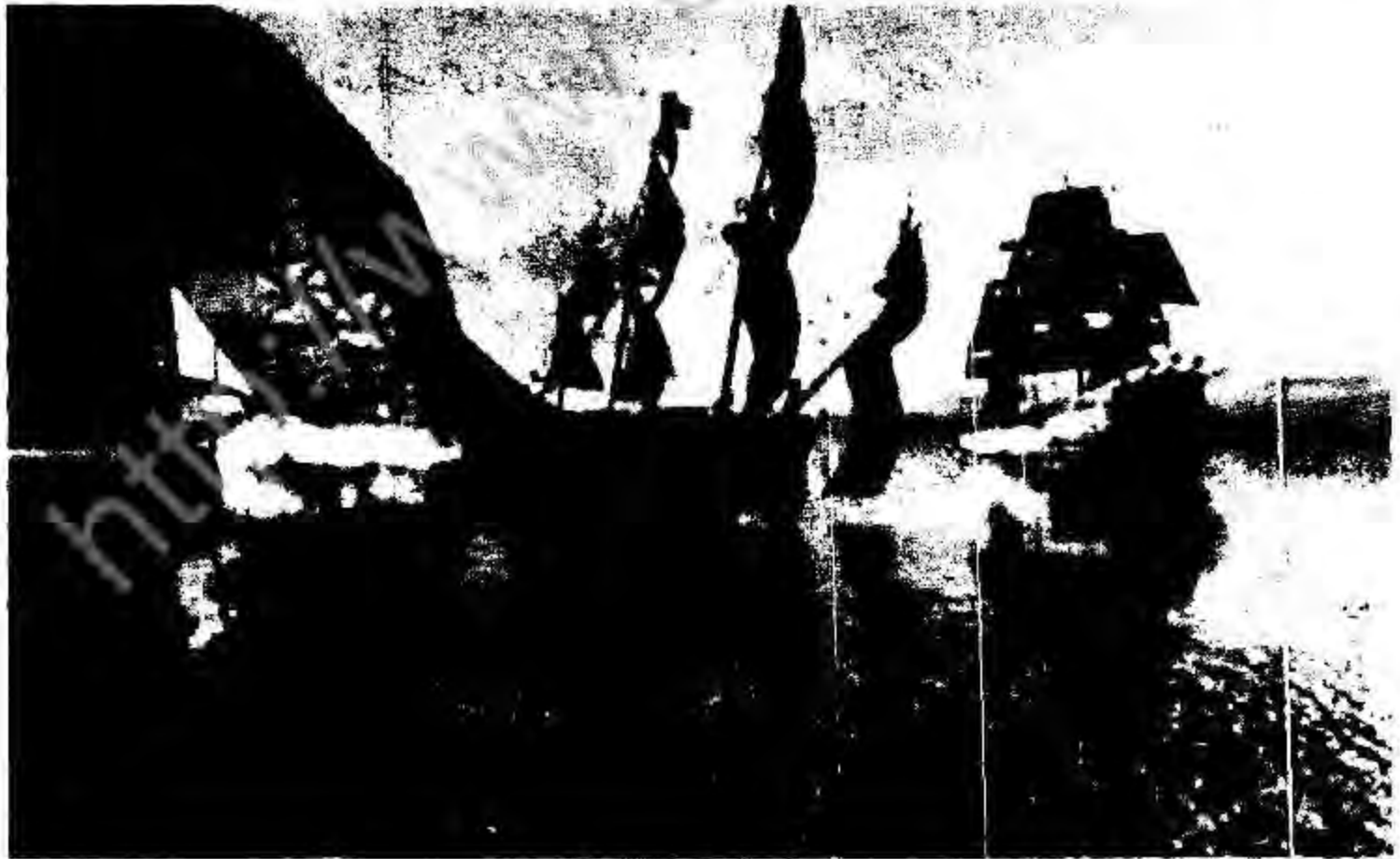
ولیم کے لیے یہ بہت بڑا چرم تھا۔ اس نے جہاز پر ملازمت کر لی اور یہاں سے اس کی زندگی کا ایک نیا باب شروع ہو گیا۔

ایڈورڈ (برطانوی):

یہ ایک انتہائی بے رحم بحری ڈاکو تھا۔ یہ شخص کالی آنڈھی یا کالی واڑھی والے شیطان کے نام سے مشہور تھا۔ کیوں کہ اس کی کالی واڑھی اس کے سینے پر لہراتی رہتی۔ ایڈورڈ کا زمانہ 1680ء سے 1718ء تک کا ہے۔ اس کی دہشت بہت زیادہ تھی اس نے باقاعدہ جنگی بیڑہ تیار کر

وہ بالکل بدل کر رہ گیا۔ اسے جس جہاز پر ملازمت ملی اس کا تعلق بحری قزاقوں سے تھا۔ اب پوری کہانی تو نہیں معلوم لیکن آگے جا کر ولیم خود بحری قزاق بن گیا۔

وہ ایک کامیاب بحری قزاق ثابت ہوا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے مزاج میں بے رحمی شامل ہون چلی گئی۔ کہاں تو دوسروں کی مدد کرنے والا ایک ہمدرد نوجوان اور کہاں بحری قزاق۔ لوٹ مار اور قتل



نے یہ پیشکش فوراً قبول کر لی۔ اس طرح وہ خود بھی ایک قزاق بن گیا۔

کہا جاتا ہے کہ اس نے چار سو کے قریب جہازوں کو اپنا شکار بنایا تھا۔ بالآخر برطانوی بحریہ سے مقابلے میں مارا گیا۔

ہنری (برطانوی):

یہ کچھ پراسرار بحری قزاق ہے۔ اس کی موت کی تاریخ بھی معلوم نہیں ہے اور یہ بھی نہیں معلوم کہ کہاں اور کن حالات میں اس کی موت واقع ہوئی۔

اس شخص نے 1693ء میں برطانوی شاہی بحریہ سے اپنی ملازمت کا آغاز کیا تھا۔ پھر ایک ایٹمی جہاز پر چلا گیا۔ جہاں کسی بات پر بغاوت ہو گئی اور اس نے بغاوت کی کمان سنبھال لی۔

اس کے بعد سے اس کا بحری ڈاکو کا کردار شروع ہوتا ہے۔ اس نے زیادہ جہاز تو نہیں لوٹے لیکن ایک جہاز ایسا لوٹا جس نے اس شخص کو دولت مند ترین بحری قزاق بنا دیا۔ کہا جاتا ہے کہ ہنری قزاق کی تاریخ کا سب سے دولت مند شخص بن گیا تھا۔

اس نے بحیرہ ہند میں ایک ایسا جہاز لوٹا جس میں سونے چاندی کے جواہرات کی صورت میں بے شمار دولت بھری ہوئی تھی۔

کسی کو نہیں معلوم کہ وہ اپنے اس بیش بہا خزانے کو لے کر کہاں چلا گیا اور کہاں اس کی موت ہوئی۔

اینی بونی (خاتون قزاق):

جی ہاں اس میدان میں کچھ عورتوں نے بھی طبع آزمائی کی ہے اور بہت کامیاب بھی رہی ہیں۔ اینی بونی بھی ان میں سے ایک تھی۔

کہا جاتا ہے کہ وقت انسان کو بدل کر رکھ دیتا ہے اور وہ بھی اس طرح کہ اس کی پرانی شخصیت کہیں گم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اپنی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ وہ ایک سیدھی سادی عورت تھی۔ جس کا خاندان بہتر مستقبل کی تلاش میں امریکا جا رہا تھا۔ راستے میں جیمز بونی نام کے ایک شخص کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ شادی کے بعد بونی انتہائی بے وفا شوہر ثابت ہوا۔ شوہر کی بے وفائیوں سے تنگ آ کر اینی نے کئی دوسرے مردوں سے تعلقات استوار کر لیے۔ اس نے تعلقات تو استوار کیے تھے لیکن شوہر بونی ہی رہا۔ ان ہی لوگوں میں ایک ملکیو جیک تھا جو ایک بحری قزاق تھا۔ یہاں

رکھا تھا جس میں چار جہاز تھے اور 3 سو سے زائد اس کے مسلح سپاہی۔

یہ شخص خود بھی ہر وقت مسلح رہتا۔ اس کا لباس ایک طرح کا اسلحہ خانہ تھا درجنوں خنجر دو عدد تلواریں۔ پستول سب ہی ہر وقت اس کے پاس ہوا کرتے۔

ایک ریکارڈ کے مطابق اس شخص نے چالیس سے زیادہ بحری جہازوں کو لوٹا تھا۔ بے شمار قیدی بنائے تھے اور بہت سے قیدیوں کو بے رحمی سے مار دیا تھا۔ اس شخص کی کئی بیویاں تھیں جن کو وہ اپنے ساتھ میں جہاز پر رکھا کرتا۔ ایک بار قیدیوں میں اسے ایک لڑکی پسند آ گئی جس کی عمر سولہ سترہ برس ہوگی۔ ایڈورڈ نے اس سے بھی شادی کر لی۔ وہ اسے اپنی دوسری بیویوں سے زیادہ عزیز رکھتا۔ اس کی دل جوگی کی کوشش کرتا۔ پھر ایک دن اس نے اس جہیتی کے ساتھ ایسا سلوک کیا جس سے اس کے مزاج کی بے رحمی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اس بے جا رہی نے اس کو سمجھانے اور راہ راست پر لانے کی کوشش کی تھی۔ ایڈورڈ نے غصے میں آ کر اس کو اپنے وحشی عملے کے حوالے کر دیا کہ وہ اس کے ساتھ جو سلوک چاہے کریں۔

ایک بحری جہاز میں آگ کا ایک گولہ اس کے جہاز پر آگیا۔ جس میں اس کے جہاز میں آگ لگ گئی۔ اس آگ نے اس کی داڑھی کو تھل سا دیا۔ ایڈورڈ زخمی ہو کر گر پڑا۔ اسی حالت میں اس کی گرفتاری عمل میں آئی۔ اس کا سر کاٹ کر کئی دنوں کے لیے لٹکا دیا گیا تھا۔

برتھر لورا ہورن (ویلز):

ابتدا میں معذرت آدی تھا۔ کسی جہاز پر کام کیا کرتا تھا اور جہاز کے معاملات میں اسے بے پناہ مہارت حاصل تھی۔ اس کا یہی فنجد میں اس کے کام آیا۔

ایک بار اس کے جہاز کو بحری قزاقوں نے پکڑ لیا۔ قیدیوں میں برتھر بھی شامل تھا۔ اس کو بھی ایک کمرے میں دوسروں کے ساتھ باندھ کر ڈال دیا گیا تھا۔ اتفاق سے اس رات سمندر میں طوفان آ گیا۔ قزاقوں کا جہاز دائیں بائیں ڈولنے لگا۔ اس نے چیخ چیخ کر بتایا کہ وہ اس وقت جہاز کو کنٹرول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اسے جہاز کے کنٹرول روم میں پہنچا دیا گیا۔ جہاں اس نے واقعی اس جہاز کو کنٹرول کر کے دکھایا۔ قزاق اس کی مہارت سے بہت متاثر ہوئے اور اسے جہاز پر کام کرنے کی پیشکش کی۔ برتھر

و طیرہ بنا رکھا تھا۔ اس نے اسپین کی بحریہ کو زچ کر کے رکھ دیا تھا۔

مورگن نے چار سو کے قریب جہازوں کو لوٹا۔ اس نے پناہ شہر پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ سمندروں پر اس کی دھاک بندھی ہوئی تھی۔

بالآخر مورگن گرفتار ہوا۔ اسے انگلینڈ بھیج دیا گیا لیکن چارلس دوم نے صرف اس بنا پر نہ صرف اس کی سزا معاف کر دی بلکہ اسے سر کا خطاب بھی دیا کہ اس نے دشمن کو نقصان پہنچایا تھا۔ تو اس طرح ایک بحری قزاق کو سر کا خطاب ملا تھا۔

اتنا ہی نہیں بلکہ اسے جیکا کا گورنر بھی بنا دیا گیا تھا اور اپنی موت تک وہ اس عہدے پر رہا۔ گویا کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں کہ وہ چاہیں کچھ بھی کر لیں خوش نصیبی ان کے ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ مورگن بھی ان ہی لوگوں میں ایک تھا۔

سرفرانس ڈریک (انگلینڈ):

اندازہ لگائیں کہ یہ بحری ڈاکو بھی سر کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ صرف اس لیے کہ اس نے اپنی بحری قزاقی سے

سے اپنی زندگی میں تبدیلی شروع ہوئی۔ پھر اس کی دوستی میری نام کی ایک عورت سے ہو گئی۔ وہ بحری ڈاکو بننے کے منصوبے بناتی رہتی تھی۔

اپنی نے ملکیو کے ساتھ مل کر قزاقی شروع کی اور قزاق بن گئی۔

قزاق بننے کے بعد اپنی نے اپنا چولا ہی بدل لیا تھا۔

وہ مردانہ لباس میں رہا کرتی۔ بدن پر پورے ہتھیار سجائے اور مردوں ہی کی طرح ماڑ دھاڑ کیا کرتی۔ اپنی نے کئی جہاز لوٹے بالآخر گرفتار ہو گئی۔ اس کے ساتھ میری بھی گرفتار ہوئی تھی دونوں کو موت کی سزا ہوئی۔ لیکن یہ اتفاق تھا کہ گرفتاری کے وقت دونوں ہی حاملہ تھیں۔ رحم کی درخواست کی بنا پر ان دونوں کو شاید قید میں رکھ کر چھوڑ دیا گیا تھا اس کے بعد کیا انجام ہوا یہ کوئی نہیں جانتا۔

سر ہنری مورگن (ویلز):

یہ حیرت کی بات ہونی چاہیے کہ ایک بحری قزاق اور سر کا خطاب لیکن بات کچھ ایسی ہی ہے۔

کیپٹن مورگن کا تعلق برطانیہ سے تھا۔ اس کا زمانہ

1635ء سے 1688ء کا ہے وہ ایک بہادر اور بے جگر قسم کا بحری قزاق تھا۔ اس نے اسپین کے جہازوں کو لوٹنے کا

موسم سرما کی دل فریبیاں
فوری کے شمارے کی مست خرامیاں

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

● مایا جال ● باپ کی تلاش میں پرخار راستوں پر گامزن بیٹی کا کٹھن سفر
ہوس زر کا ہونا ک کھیل اجد ونیس کا انتخاب

● آوارہ گرد ● دکھ کھکے شتر کے ساتھیوں کی لیک زلی اور انوکھی دنیا کی جھلک... ہر ایک
کو اپنی تلاش کا سہارا پیش تھا۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کی شمولیت

● جواری ● احمد اقبال کے شہر بار قلم سے ایک جواری کے کھیل کے نت نئے انداز

● مغرب کے نرالے انداز ● مغربی دنیا کی تہذیب اور ماحول کی عکاسی اور محبت کی پڑوہ ناقابل فراموش کہانیاں

سزورق کی کہانیاں

● پہلی کہانی ● نیلے پہاڑوں اور خوشنوا دایوں میں قتل و خون کی پراسرار کارروائیاں

● دوسری کہانی ● محبت اور عداوت کی جنگ میں کسی ایک کی فتح کا دل خراش فسانہ



آپ کے تہرے...
مشورے...
اور نئی نئی دلچسپ باتیں... کھائیں

چینی حکومت کو پیشکش کی کہ وہ اپنے تجربے سے کام لیتے ہوئے بحری قزاقوں کو گرفتار کروا سکتا ہے۔ اسے بحری قزاقوں کی گرفتاری پر نہ صرف مقرر کر دیا گیا بلکہ کرنل کا عہدہ بھی دے دیا گیا۔ اسی عہدے پر اس کی موت واقع ہوئی۔

چنگ شی (عورت۔ چین سے تعلق):

بحری قزاقوں کی تاریخ میں چنگ شی نے بہت شہرت حاصل کی۔ بلا کی دلیر اور ذہین عورت تھی۔ اس کا زمانہ 1785ء سے 1844ء تک کا ہے۔ یعنی اتنے برسوں تک لوٹ مار کرتی رہی تھی۔ اس کا شوہر بھی بحری قزاق تھا۔ شوہر ہی نے اس کو قزاقی کی تربیت دی۔ سمندروں سے آگاہ کیا۔ وہ ساری میکانیک بتائی جو قزاقی میں کام آتی ہیں۔

اس کے پاس بھی باقاعدہ بحری طاقت تھی۔ بندرہ سو جہاز اور 80 ہزار مسلح افراد خود اندازہ لگا لیں کہ کتنی بڑی بحری قوت اس کے پاس ہوگی۔ اس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس نے ایک لڑکے چیونگ پر سائی کی پرورش کی۔ بعد میں اس سے شادی کر لی۔

بالآخر چنگ شی پکڑی گئی۔ حکومت نے کچھ سزا دے کر اس کو معاف کر دیا۔ یہ خود بھی لوٹ مار کی زندگی سے اکتا چکی تھی۔

اس نے چین میں ایک ہوٹل کھول لیا اور آخری دنوں تک اس ہوٹل کو چلاتی رہی۔ ہو سکتا ہے کہ تاریخ میں اور بھی بہت سے بحری قزاق گزرے ہوں یا گزر رہے ہوں۔ لیکن ہم نے صرف ان کا ذکر کیا ہے جو کسی نہ کسی حوالے سے مشہور رہے ہیں۔

بحری قزاقی ایک بہت بڑا جرم سمجھا جاتی ہے۔ آج سمندروں میں ایسے کئی راستے ہیں جو اس لحاظ سے بہت خطرناک تصور کیے جاتے ہیں اور جہازوں کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ ان راستوں سے کترا کر نکل جائیں۔

لفظ بحری قزاق مسلم دشمنوں کا اخذ کردہ ہے۔ قازقستان کے لوگ بہت بہادر اور جنگجو تھے۔ ان کی وجہ سے عیسائیوں کو ہر جگہ ہزیمت اٹھانی پڑتی تھی۔ مسلمانوں سے نفرت کی وجہ سے ہی وہ ڈاکوؤں کو قازق یا قزاق کہنے لگے۔ ان کی تقلید میں ہم نے بھی یہ لفظ اردو میں شامل کر لیا۔



اپن کو نقصان پہنچایا تھا۔ شاید اس زمانے کا دستور یہ رہا ہو کہ تم چاہے کوئی بھی ہو۔ کیسے بھی ہو۔ بس دشمن کو نقصان پہنچاؤ اور سر کا خطاب پالو۔ اس کا زمانہ 1540ء سے 1595ء کا ہے۔ ملکہ الزبتھ اول کے حکم پر اس کو سر کا خطاب دیا گیا تھا۔ یہ ایک بے رحم قزاق تھا۔ اس کا انتقال بد نصیبی کی وجہ سے پناما سٹی میں ہوا تھا۔

فرائنگوس (فرانسیسی):

اس کا زمانہ 1635ء سے 1668ء تک کا ہے۔ یعنی اس دوران اس نے قزاقی کی ابتدا کی اور انتہا کو پہنچ گیا۔ اس کا کردار اور بہت عجیب تھا۔ وہ ایک غریب انسان تھا۔ سادہ دل، منہموم اور ہمدرد۔ لیکن دولت اور طاقت ملتے ہی بے انتہا انتہا دل اور بے رحم ہو گیا۔

وہ ایسا شخص تھا جو معاف کرنا جانتا ہی نہیں تھا اور اپنے دشمنوں کو اذیت دے کر مارا کرتا۔ اس شخص کی شہرت اس لیے بھی ہے کہ اس نے سمندر میں بھی لوٹ مار کی اور جنگی پر بھی۔ اس کے ساتھ پوری بنا لین ہوا کرتی تھی۔

اس نے کئی چھوٹے چھوٹے شہروں پر حملے کیے اور پورے شہر کو لوٹ کر واپس چلا گیا۔ چونکہ فرائنگوس ایک لالچی شخص تھا صرف دولت کے لیے شہروں پر قبضہ کرتا اور لوٹ لینے کے بعد شہر اور شہروالوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر آگے روانہ ہو جاتا تھا۔

ایک بار وہ ایک قیدی کا دل نکال کر کھا گیا تھا اور خود اس کا یہ انجام ہو کہ پناما کے جنگی قبائل نے اسے پکڑ اور کھا گئے۔ جس نے کسی کا دل نکال کر کھا یا تھا بعد میں اسے بھی کھا لیا گیا۔ یہ تھا ایک بے رحم بحری قزاق کا انجام۔

چیونگ پوسائی (1800ء):

اٹھارہویں صدی کا مشہور بحری قزاق۔ اس کا تعلق چین سے تھا۔ یہ ایک بار بحری قزاقوں کے ہاتھوں گرفتار ہو گیا تھا۔ قزاق کے سردار نے اس کو اپنا بیٹا بنا لیا اور اپنے انداز سے اس کی تربیت شروع کر دی۔

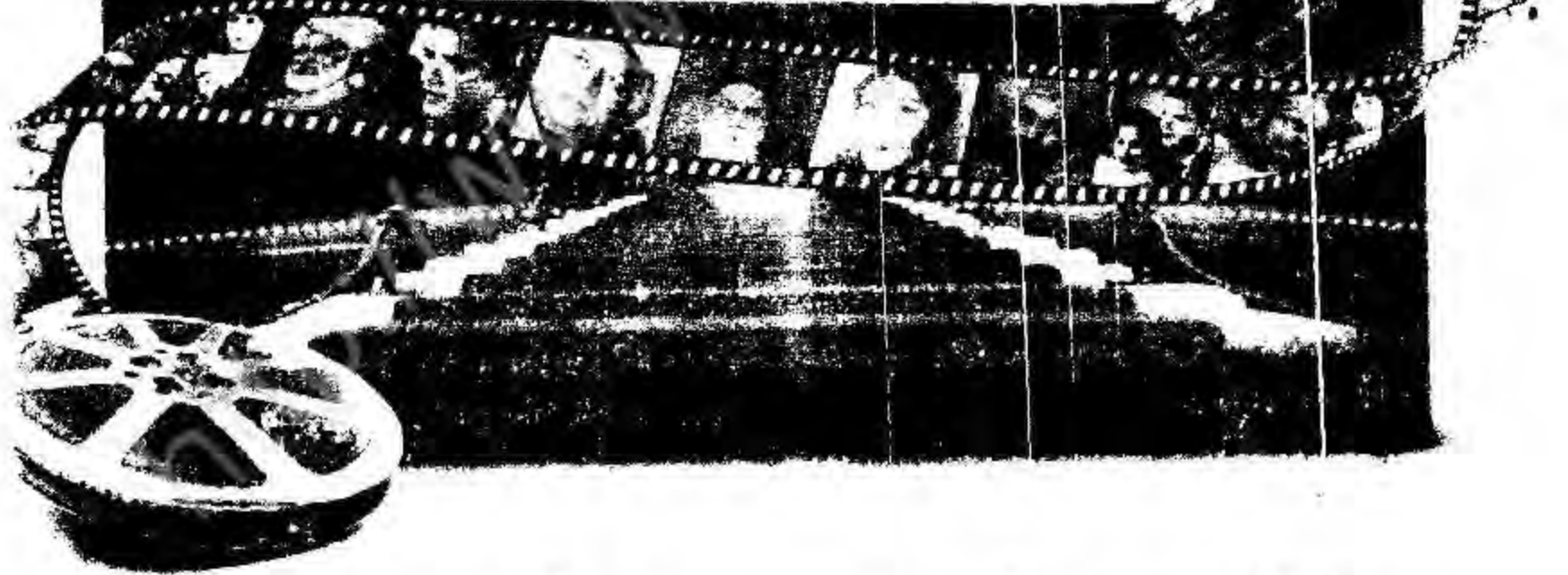
چین ہی میں اس کے جوہر سامنے آنے لگے۔ قزاقی میں اس کا مستقبل بہت روشن نظر آنے لگا تھا اور ہوا بھی یہی۔ بڑے ہو کر وہ بہت بڑا قزاق بن گیا۔ اس کی طاقت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ سو کے قریب بحری جہازوں کا مالک تھا اور پچاس ہزار مسلح سپاہی اس کے ساتھ ہوا کرتے۔ شاید بہت سے ممالک کی سرکاری نیوی بھی ایسی نہیں ہوتی ہوگی۔ بالآخر چیونگ پوسائی میں پکڑا گیا۔ اس نے



یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستوا
علمی سفیانت آفاقہ آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
جہت مہرے دہرت اور ہم ہیں دوستوا

ایسے نادروں و نگار حال حال ہی نظر آتے ہیں جو نصف
صدی سے علم و ادب، صحافت و قلم کے میدان میں سرگرم عمل
ہوں اور اپنے روزاول کی طرح تازہ دم بھی ان کے ہیں رسا کی
پرواز میں کوشش ذمی واقع ہو، یہ ان کا علم کبھی ٹھکن کا شکار نظر
آئے آفاقی صدیوں کے ہمارے ایسے ہی جوان فکر و بلند حوصلہ بزرگ
ہیں وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہیں انہی دنیاوی حیثیت کی
نشان اس کی پشیمانی پر ثابت شدہ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے
وابستگی کے دوران میں انہوں نے اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت
سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا نید و شہید
اور سہیل ملاقات کا یہ سلسلہ خالصاً طویل لانی اور بہت زیادہ قابل
رشتہ ہے انہی ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور
شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج
جو اب معلوم ہوتا ہے

ادب و صحافت سے قلمی و نثری دستاویزوں اور استاں سرگزشت



برصغیر میں فلم کا آغاز ہندوستانوں نے ہی کیا لیکن
انہوں نے ٹیکنیکل امداد کے لیے غیر ملکیوں کی خدمات
حاصل کیں لہذا ابتدا میں جرمن ہدایت کار، ایڈیٹر اور
دوسری ٹیکنیک جاننے والے غیر ملکی سے مدد لی گئی ان غیر

سنیما کو متحد ہندوستان میں بائیسکوپ کہا جاتا تھا۔
اس سے پہلے تھیٹر اور اسٹیج ہی تفریح کا بڑا ذریعہ تھے۔ یہ
ڈرامے عموماً رات بھر چلا کرتے تھے اور لوگ بستر اور کھانے
پینے کا سامان اپنے ساتھ لے کر اسٹیج دیکھنے جاتے تھے۔

منصفوں کی قطار میں خود ملزم بیٹھے ہوتے ہیں۔ سہراب مودی کی اس فلم کو ان پرانے زمانے کی خواتین نے بھی دیکھی جنہوں نے کبھی زندگی میں سینما گھر کا رخ تک نہ کیا تھا۔ ہم نے پہلی فلم ”کنکن“ دیکھی تھی۔ وہ بھی خواتین

والے ڈبے میں بیٹھ کر اس فلم میں ہیروئن ناراض ہو کر ہیرو کے دیئے ہوئے کنکن ہیرو کو واپس کر کے سمندر میں ڈوبنے جاتی ہے۔ جوں جوں ہیروئن سمندر کی طرف بڑھتی ہے دیکھنے والی خواتین کی آہ و زاری اور دعاؤں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ بالآخر ہیرو اس وقت سمندر تک پہنچتا ہے جب ہیروئن کی ساڑھی کا صرف ایک پلو ہی سمندر کی سطح پر نظر آتا ہے لیکن کیوں کہ ہیروئن کو بچانا مقصود تھا اس لیے ہیرو اس کو بانہوں میں اٹھا کر سمندر سے باہر لے آیا اور پھر بہت لمبی خوشی رہنے لگے۔ ہیرو اشوک کمار تھے۔ فلم میں ہیروئن کا نام رادھا تھا مجھے اس قدر اچھی لگی کہ ہر کتاب یا کاپی پر ”رادھا“ لکھ دیا کرتے تھے اور پھر ہماری پٹائی بھی ہوتی۔

اس کے بعد ہم کو اگلی فلم دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا۔ ہم نے اپنے چچا زاد کے ہمراہ فلم ”بغداد کا چور“ دیکھی اور بغداد کے چور پر عاشق ہو گئے۔ بغداد کا چور کوئی مرد نہ تھا۔ یہ ایک خاتون تھیں جو ہمیں بہت اچھی لگیں۔ ان کا کمال یہ تھا کہ جب بادشاہ کی فوجیں ان کو پکڑنے کے لیے محل کی چھت پر پہنچتی ہے تو بغداد کا چور ایک فلا بازی لگا کر نیچے فرش پر پہنچ جاتی تھیں تو جی بے چارے دوبارہ بیٹھے آتے تھے تو بغداد کا چور ایک ہی فلا بازی لگا کر اوپر پہنچ جاتی تھیں۔ اس لیے کافی عرصے تک بغداد کا چور (یا چورنی) ہماری ہیروئن رہیں اور ہم دوسری فلم کا انتظار کرنے لگے۔

یہ ایک طویل تذکرہ ہے جس کے لیے ایک علیحدہ کالم کی ضرورت ہے جو وقت آنے پر بیان کی جائے گی۔

تذکرہ ہو جائے لاہور کی گلیوں کا۔ اس زمانے میں لاہور کے بارہ دروازے تھے جن میں سے ٹوٹ پھوٹ اب بہت کم رہ گئے ہیں۔ ہم اپنی قدیم یادگاروں کی قدر نہیں کرتے بلکہ جان بوجھ کر اس کا حلیہ بگاڑ دیتے ہیں۔ پرانے زمانے میں شہر عموماً فصیلوں کے اندر ہوتا تھا رات ہوتے ہی اس کے دروازے بند کر دیے جاتے تھے۔ مقصد شہریوں کے جان و مال کی حفاظت کرنا تھا۔ اب ہمارے بارہ دروازوں میں سے چند نوٹے پھوٹے دروازے ہی باقی رہ گئے۔ دروازے کا نام تو ہے مگر دروازہ غائب ہے۔ لوگوں نے مکاں بنالی ہیں۔ اکبری منڈی بھی ایک دروازہ تھا۔

ملکیوں نے مقامی افراد کو بہت کچھ سکھایا۔ خصوصاً بمبئی، آگرہ اور کلکتہ، سینئرز میں ابتدائی تربیت دینے والے غیر ملکی ہی تھے۔ کیا آپ یقین کر سکتے ہیں کہ 1934ء میں بھی برصغیر والے فلم کی تربیت لینے انگلستان جا کر کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آمازی سے انہیں برتری حاصل رہی اور انہوں نے بہت معیاری فلمیں بنائیں جن کے موضوعات آج بھی قابل غور ہیں۔

سہراب مودی جیسے قابل اور بڑے پیمانے پر سوچنے والے، بڑے پیمانے پر فلمیں بنائیں۔ مثلاً فلم ”سکندر“ بناتے ہوئے سہراب مودی نے اس کے ساتھ کھل انصاف کیا اور سکندر کے زمانے کے ملبوسات اور ہتھیار خاص طور پر تیار کرائے۔ سکندر کی نمائش نے سارے ملک میں دھوم مچا دی۔ جنہوں نے یہ فلم دیکھی ہے وہ آج تک اس کے مناظر اور مکالمے یاد رکھے ہیں۔

برصغیر کی دوسری عظیم فلم بنانے والے بھی سہراب مودی ہی تھے۔ اس بار انہوں نے ایک ہندوستانی موضوع اپنایا۔ ان کی فلم ”پاوار“ آج تک لوگوں کو یاد ہے۔ اس میں نور جہاں کا کردار اداکار دلیپ کمار کی ساس نسیم بانو نے ادا کیا تھا۔ وہ ایک مہذب خاتون تھیں اور اپنے حسن و جمال کی وجہ سے انہیں ”پری چہرہ“ کا خطاب دیا گیا تھا جس کی وہ مستحق بھی تھیں۔ ان کے مقابلے میں شہنشاہ جہانگیر کا کردار چندر موہن نے ادا کیا تھا۔ وہ ایک باوقار اور خوب صورت انسان تھے۔ خاص طور پر ان کی موٹی موٹی آنکھیں اور شاہانہ چال کی وجہ سے وہ درحقیقت ایک شہنشاہ نظر آتے تھے۔ ایسا کردار انہیں بعد میں کبھی ادا کرنے کا موقع نہیں ملا۔

ہندوستانی بادشاہوں میں جہانگیر اپنے عدل و انصاف کی وجہ سے مشہور ہیں۔ اس فلم کی کہانی میں بھی سہراب مودی نے ان کی اس خصوصیت کا تذکرہ کیا۔ عطلی سے ملکہ نور جہاں نے ایک تیر چلایا جس کی وجہ سے ایک دھوبن ہلاک ہو گئی۔

جہانگیر نے اپنے محل کے سامنے ایک بہت بڑے سائز کی زنجیر عدل بنوائی تھی۔ کسی بھی شہری کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ رات یا دن کے کسی وقت بھی زنجیر عدل ہلا دے اس کے ساتھ انصاف کیا جائے گا۔ خواہ ملزم ملک کی ملکہ ہی کیوں نہ ہو۔ بد قسمتی سے ہمارے حکمرانوں کا اس کے برعکس جہاں عوام انصاف کی طلب میں در در ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں لیکن کہیں سے انہیں انصاف نہیں ملتا کیوں کہ

نظر آتی ہیں۔ پرانی وضع کے دروازے، بل کھاتی گلیاں اور شکست جھرو کے لاہور کے شاندار ماضی کی یاد دلاتے ہیں۔ رنجیت سنگھ نے شہر کے گرد فصیل کی 1812ء میں از سر نو تعمیر کروائی۔ انگریزوں نے فصیل اور دروازوں کو تباہ کر دیا۔ صرف روشنائی دروازہ اصل حالت میں موجود ہے۔ 1947ء کے ہنگاموں میں دوسرے ثقافتی ورثوں کی طرح شاہ عالم دروازہ بھی جل کر تباہ ہو گیا۔

اکثر دروازوں کے نام وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بگڑ چکے ہیں۔ بھائی دروازہ تمام دروازوں سے طویل ہے۔ یہ علاقہ علم و ادب کا مرکز رہا ہے۔

ماضی کے درپچوں سے لاہور شہر پر ایک نگاہ ڈالیں تو شہنشاہوں کا یہ شہر ایک بلند و بالا حفاظتی حصار کے اندر اپنی خوب صورتیوں اور رعنائیوں میں ڈوبا ہوا دکھائی دیتا ہے جس حکمران نے بھی اس شہر کو پایہ تخت بنایا، اس نے اس کی حفاظت کو مقدم جانا۔ عہد مغلیہ بالخصوص اکبر اعظم کے دور حکمرانی میں لاہور نے ترقی، حفاظت اور ترمیم و آرائش کی ان رفعتوں کو چھوا جو دنیا میں کم کم شہروں کو نصیب ہوتی ہیں۔ اکبر نے شہر کے ارد گرد فصیل تعمیر کروائی جس میں نصب کیے جانے والے دروازے ایک طرف حفاظتی نکتہ نظر سے اہم تھے تو دوسری طرف ان کی خوب صورتی اور ناموں کی معنویت مغل فرمانروا کے تخیل کی بلند پروازی کا مظہر تھی۔ فصیل شہر اور اس کے مضبوط دروازے لاہور کے شہریوں کو تحفظ کا احساس دلاتے تھے۔ آج اگرچہ فصیل اور زیادہ تر دروازے موجود نہیں مگر پھر بھی ہمارے لیے ایک ایسے ثقافتی ورثے کا درجہ رکھتے ہیں جو ہمارے حال کو ماضی کے ساتھ وابستہ رکھتا ہے۔

لاہور شہر کیسے آباد ہوا؟ اس حوالے سے مختلف آراء ہیں۔ پہلی اور دوسری صدی میں یہاں راجپوت شہزادے حکمرانی کرتے تھے۔ آٹھویں اور نویں صدی میں لاہور طاقت ور براہمن خاندان کا دار الخلافہ بن گیا۔ اس کے بعد تقریباً آٹھ سو سال تک یہاں مختلف مسلمان حکمرانوں نے حکمرانی کی جن میں مغل سرفہرست ہیں۔ 19 ویں صدی کے اوائل میں سکھوں نے پنجاب پر قبضہ کر کے لاہور کو پایہ تخت بنایا لیکن 1839ء میں رنجیت سنگھ کی موت کے بعد انگریزوں کی حکمرانی آگئی۔ مغلیہ دور میں دریائے راوی شہر کی فصیل کے ساتھ بہتا تھا۔ اکبر کی تعمیر کردہ فصیل کو رنجیت سنگھ نے 1812ء میں دوبارہ تعمیر کروایا۔ لیکن 1849ء میں جب انگریز آئے تو انہوں نے فصیل شہر اور ماسوائے



سہراب مودی

اسی طرح بھائی دروازہ سارے لاہور بلکہ پاکستان بھر میں مشہور ہے۔ لیکن اب یہ کھانے پینے کی مزیدار چیزوں کے حوالے سے مشہور ہے اگرچہ اب تو سارا لاہور فوڈ اسٹریٹ بن چکا ہے لیکن بھائی کے کھانوں کی بات ہی اور ہے۔

لاہور کے بارہ دروازے تھے جن میں سے اب مندرجہ ذیل باقی رہ گئے:-

روشنائی گیٹ۔

کشمیری دروازہ۔

مستی گیٹ۔

خفزی گیٹ۔

دہلی گیٹ۔

کلیا گیٹ۔

اکبری گیٹ۔

مہرچی گیٹ۔

شاہ عالمی گیٹ۔

لاہوری گیٹ۔

میری گیٹ۔

بہٹی یا بھائی گیٹ۔

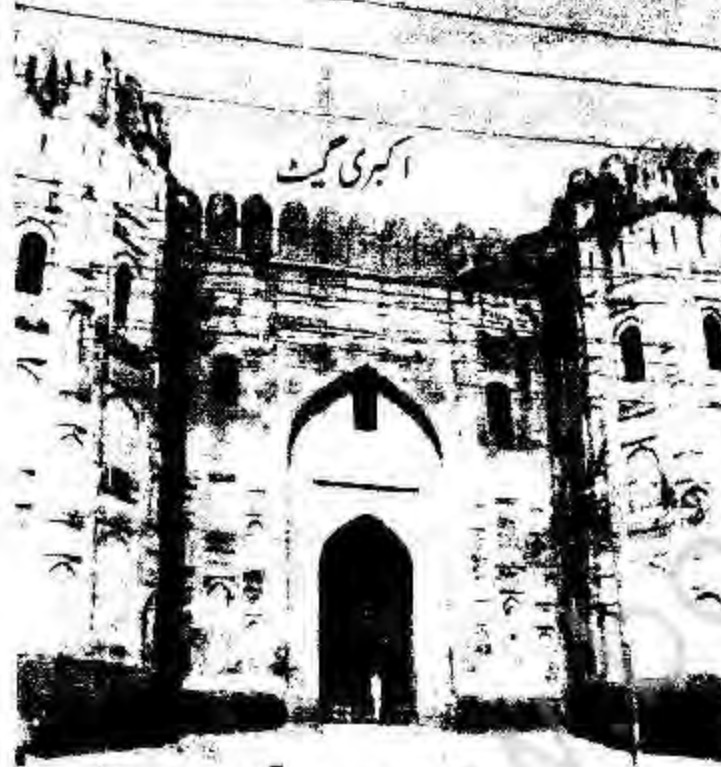
کسالی گیٹ۔

اس مختصر تعارف کے بعد مزید معلومات حاضر ہیں۔ اکبر اعظم نے شہر کے گرد ایک مضبوط فصیل تعمیر کروائی جس میں تیرہ دروازے رکھے گئے تھے۔ ان دروازوں سے لاہور کی ثقافت اور قدیم تہذیب کی جھلکیاں

مجسٹریٹس اور وہ میونسپل آفیسرز کے زیر استعمال تھے۔ برطانوی عہد کا پہلا کوتوالی بھی اسی دروازے کے اندر قائم ہوا تھا۔ کسی زمانے میں اس دروازے کے باہر دارہ شکوہ کے نام سے منسوب ایک چوک بھی تھا جہاں ان کے محلات اور مشہور کھوڑا منڈی واقع تھی۔

اکبری دروازہ:

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اس دروازے کا نام اکبر اعظم کے نام پر رکھا گیا تھا۔ انگریزوں نے عنان حکومت سنبھالی تو دوسری تاریخی عمارتوں کی طرح اس دروازے کو بھی مسمار کر دیا اگرچہ دوسرے کئی دروازے تو بعد میں انہوں نے تعمیر بھی کروائے لیکن اس دروازے کی تعمیر کو



درخور اعتنا نہ سمجھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ ابراہیم کے نام سے منسوب تھا جن کی ہیبت سے ایک عالم کانپ اٹھتا تھا۔ اس دروازے کے اندر بہت بڑی غلہ منڈی قائم ہے جو اکبری منڈی کہلاتی ہے۔

سوتی یا موچی گیٹ:

یہ دروازہ قدیم شہر کے جنوب میں کھلتا تھا۔ یہ بھی دوسرے کئی دروازوں کی طرح آج اپنا وجود کھو چکا اور صرف نام کی حد تک زندہ ہے۔ اس دروازے کے نام کے حوالے سے دو قسم کے خیال پیش کیے جاتے ہیں۔ ایک نظریہ

روشنائی دروازے کے تمام دروازے تباہ کر دیے۔ 1990ء میں قدیم شہر کے گرد فصیل تعمیر کرنے کا منصوبہ شروع ہوا اور کچھ دیوار بنی بھی لیکن کسی وجہ سے منصوبہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ قدیم شہر کے زیادہ تر دروازے اب موجود نہیں لیکن ملک کے نامور مصور ممتاز حسن رومی کے خیال نے ان دروازوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کیمنوس پر محفوظ کر دیا ہے۔ لاہور کے دروازے پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

ذکی گیٹ یا کیکی گیٹ:

ذکی گیٹ کا نام پیر ذکی شہید کے نام پر رکھا گیا تھا جو حملہ آوروں کے خلاف لڑتے لڑتے شہید ہوئے تھے۔ آج اس گیٹ کے آثار بھی نظر نہیں آتے اور یہ حادثہ زمانہ کا شکار ہو چکا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کا نام بھی بگڑتے بگڑتے بن گیا اور آج یہ کیکی گیٹ کے نام سے ہی مشہور ہے۔

دہلی گیٹ:

یہ گیٹ چوتھے اس سڑک پر کھلتا تھا جو لاہور سے دہلی کو جاتی تھی۔ اس لیے اس کا نام دہلی گیٹ رکھا گیا۔ اس گیٹ کی تعمیر مغلیہ دور حکومت میں ہوئی لیکن جب مغلیہ سلطنت کا سورج غروب ہوا تو انگریزوں نے نہ صرف اس دروازے کو مسمار کر دیا بلکہ اس پاس واقع تاریخی عمارتیں بھی منہدم کر دیں۔ اس دروازے کے آثار آج بھی چننا دروازہ (سفید گیٹ) کے طور پر موجود ہیں جو موجودہ دروازے سے سو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ دروازہ چونکہ ہائی وے پر کھلتا تھا اس لیے شہر میں داخل ہونے کے لیے زیادہ تر یہی دروازہ استعمال ہوتا تھا۔ انگریزوں نے مغلیہ دور کے دروازے کی جگہ 1862ء میں بالکل ایک مغربی طرز کا دروازہ تعمیر کروایا جس کے ارد گرد اور پرکئی کمرے تھے جو

دہلی گیٹ



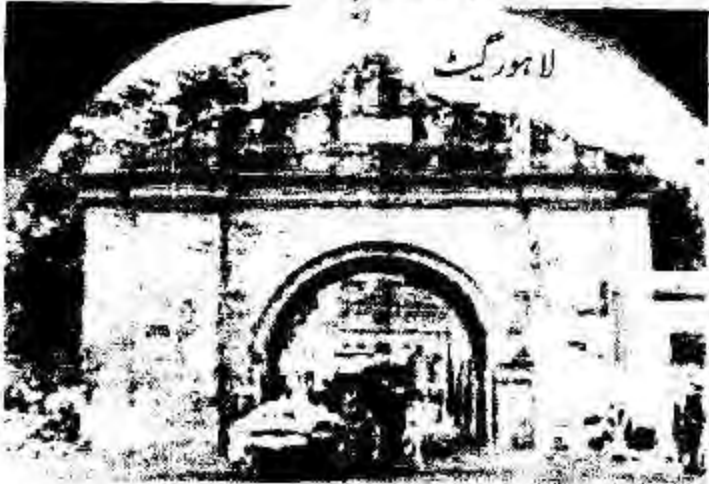
لوہاری یا لاہوری دروازہ:

اس دروازے کا نام لاہور شہر کے نام سے ہی منسوب ہے۔ پہلے لاہور شہر کا ایک چوتھائی حصہ ہی آباد تھا جب گیارہویں صدی کے اوائل میں سلطان محمود غزنوی کے وائسرائے ملک ایاز نے شہر کی از سر نو تعمیر کروائی۔ اس دروازے کو لوہاری گیٹ بھی کہتے ہیں کیوں کہ ایک خیال یہ ہے کہ کسی زمانے میں یہاں لوہاروں کی دکانیں تھیں اور اسی مناسبت سے اس دروازے کو لوہاری گیٹ کہا جاتا ہے۔ یہ دروازہ نوانارکلی بازار کے بالکل سامنے واقع ہے۔ برصغیر کے پہلے مسلمان حکمران قطب الدین ایبک اس دروازے کے باہر تھوڑے ہی فاصلے پر دفن ہیں۔ ملتان سے آنے



موچی دروازہ

یہ ہے کہ دروازے کا نام اکبر کے ایک ملازم موتی رام کے نام پر رکھا گیا جو اس وقت دروازے کے قریب ہی رہائش پذیر تھا لیکن بعد میں نام بگڑتے بگڑتے موچی دروازہ بن گیا۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ کسی زمانے میں اس دروازے کے اندر ایک بازار تھا جہاں جوتے نہ صرف فروخت ہوتے تھے بلکہ پرانے جوتے مرمت بھی کیے جاتے تھے۔ اسی مناسبت سے اس دروازے کا نام موچی دروازہ پڑ گیا۔ ان دونوں مفروضوں میں کون سا مفروضہ درست ہے یہ تو حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جاسکتا لیکن ایک بات طے ہے کہ یہاں دروازہ ضرور تھا۔



والے قافلے شہر میں داخلے کے لیے یہی دروازہ استعمال کرتے تھے۔ اس دروازے کے اندر کسی زمانے میں اینٹوں کا ایک قلعہ واقع تھا جو کچا کوٹ کے نام سے تاریخ کی کتابوں میں موجود ہے جس کے بارے میں خیال ہے کہ یہ پہلا شہر لاہور تھا جس کی بنیاد ملک ایاز نے رکھی تھی۔ جو دروازے بعد میں انگریزوں نے از سر نو تعمیر کروائے وہ زیادہ تر مغربی انداز میں تعمیر ہوئے لیکن لوہاری واحد دروازہ ہے جو اپنی اصل حالت میں تعمیر ہوا۔ 18 ویں صدی کی اتار کی کے دوران صرف لوہاری اور دوسرے دروازوں کے علاوہ باقی تمام دروازے بند کر دیے گئے تھے۔

موری گیٹ:

یہ لاہور کے تیرہ دروازوں میں سب سے چھوٹا دروازہ تھا۔ پنجابی میں چونکہ سوراخ کو موری کہتے ہیں۔ اسی لیے یہ دروازہ موری گیٹ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ عام طور پر شہر کی گندگی باہر پھینکنے کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

ٹیکسالی گیٹ:

یہ دروازہ بھی دوسرے دروازوں کی طرح معدوم ہو

شاہ عالمی دروازہ:

اس دروازے کا اصل نام بھیرانوالہ گیٹ تھا۔ یہ دروازہ مغل شہنشاہ شاہ عالم بہادر شاہ کے نام سے منسوب تھا جو اپنے والد اورنگزیب عالمگیر کے بعد تخت پر بیٹھے تھے۔ انہوں نے زیادہ تر وقت لاہور میں ہی گزارا تھا اور ان کی وفات کے بعد 1712ء میں اس دروازے کا نام ان کے نام پر رکھ دیا گیا۔ 1947ء میں جو فسادات پھوٹے اس کی آگ میں مسلمانوں کا شاندار ماضی جل کر خاکستر ہوا۔ ان میں یہ دروازہ بھی شامل تھا۔ آج یہ صرف نام کی حد تک زندہ ہے۔ اس دروازے سے ہی قدیم شہر کے اہم علاقوں کا راستہ جاتا تھا۔ اس دروازے کے پاس ہی نواب وزیر خان کی پری محل، حویلی، حویلی میاں خان، ایاز ملک کا مقبرہ اور گردوارہ ہولی صاحب واقع تھا۔ آج پرانی عمارتوں میں صرف پری محل مسجد اور شہری مسجد موجود ہیں جب کہ ملک ایاز کا مقبرہ از سر نو تعمیر کیا گیا ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے اس دروازے کو خود شاہ عالم نے اپنی زندگی میں ہی خود سے منسوب کر دیا تھا۔ آج یہاں پاکستان کی سب سے بڑی ہول سیل مارکیٹ قائم ہے۔

دروازے کو روشنیوں والا دروازہ یعنی روشنائی گیٹ کہتے ہیں۔ اس کی تعمیر بھی اکبر اعظم نے کروائی تھی اور صرف شرفا ہی اسے استعمال کرتے تھے۔ اور گزیب عالمگیر نے اسے آباد خانہ میں شامل کیا اور 1673ء میں اسے بادشاہی مسجد کے صحن میں شامل کر لیا گیا لیکن جب رنجیت سنگھ حکمران بنا تو اس نے اسے باقاعدہ باغ کی شکل دے دی درمیان میں ایک خوب صورت بارہ دری بنوائی جو حضورِ باغ کے نام سے آج بھی موجود ہے۔



کشمیری دروازہ:

یہ دروازہ اگرچہ اب بھی موجود ہے لیکن زمانے کے زخم اس کے چہرے پر عیاں ہیں اور یہ ماضی کی شان و شوکت



کھو چکا ہے۔ یہ دروازہ چونکہ کشمیر کے رخ پر ہے اس لیے اسی مناسبت سے کشمیری دروازہ کہلاتا ہے۔

مستی دروازہ:

اس دروازے کا اصل نام مسجدی دروازہ تھا کیوں کہ یہاں سے سیدھی سڑک لاہور شہر کی سب سے قدیم مسجد مریم

مکانی کی طرف جاتی تھی جو اکبر کی والدہ مریم مکانی کے نام پر بنائی گئی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ نام مسجدی سے بگڑتے بگڑتے مستی ہو گیا۔ آج دروازے کے آثار بھی معدوم ہو چکے ہیں۔



چکا ہے اور صرف یہ نام کی حد تک زندہ ہے۔ مغلیہ دور میں یہاں ٹیکسال قائم تھی اور اسی مناسبت سے اسے ٹیکسالی گیٹ کہتے ہیں۔ آج یہاں گیٹ کے آثار موجود ہیں نہ ٹیکسال کے بلکہ یہ علاقہ شہر کا بدنام ترین علاقہ شمار کیا جاتا ہے کیوں کہ اس دروازے کے اندر بازار حسن واقع ہے۔ پنجابی زبان کے نامور شاعر شاہ حسین اور استاد دامن بھی یہیں رہتے تھے اور آرتھ بھی ان کا حجرہ خستہ حالت میں ہی سہی لیکن موجود ضرور ہے جہاں استاد دامن اکیڈمی واقع ہے۔

روشنائی گیٹ:

یہ دروازہ شہر کے شمال میں واقع ہے۔ یہ واحد دروازہ ہے جو اصل حالت میں موجود ہے اور ہمارے شاندار ماضی کی گواہی دیتا ہے۔ یہ بادشاہی مسجد اور شاہی قلعہ کے درمیان واقع ہے جو حضورِ باغ میں کھلتا ہے۔ ماضی میں شہزادے، شہزادیاں، درباری اور شاہی ملازم شاہی قلعہ سے شہر میں داخل ہونے کے لیے اسی دروازے کو استعمال کرتے تھے۔ اس دروازے کے اندر واقع زیادہ تر گھر امراء کے تھے جہاں رات کو بلند و بالا عمارتوں میں چراغاں ہوتا تھا اور علاقہ بقعہ نور بن جاتا تھا۔ اسی حوالے سے اس



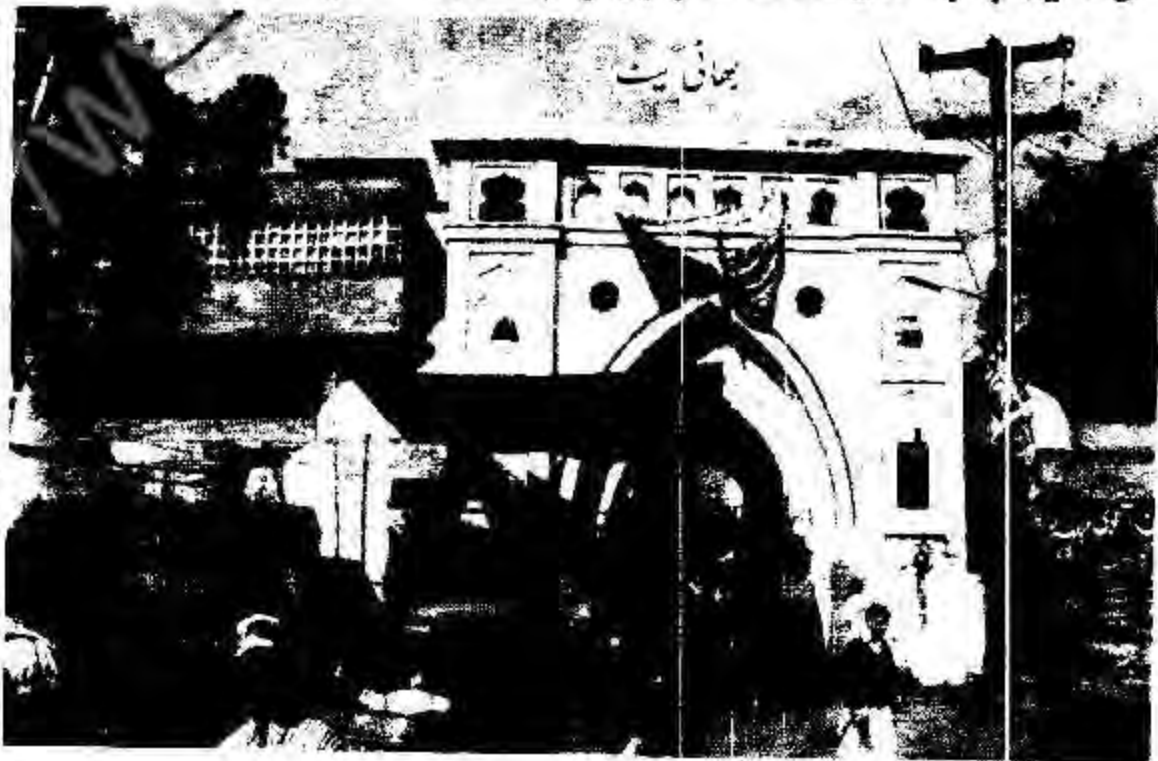
دروازہ ہے۔ بھائی دروازے کے دائیں جانب تاگوں کا اڈا اور خالی میدان ہوتا تھا جہاں سرکس لگتا تھا اور بائیں جانب مسجد و مزار غلام رسول ہے۔ یہ بزرگ بلیوں والی سرکار کے نام سے مشہور ہیں۔ حکیم احمد شجاع اپنی کتاب ”لاہور کا چیلیسی“ میں لکھتے ہیں: ”بھائی دروازے کا اصل نام بھی دروازہ تھا اور یہی وہ مقام تھا جہاں مغلوں کی حکومت آنے سے قبل بھی قوم کے جنگجو دلیروں نے ملتان کے بعد لاہور آ کر پڑاؤ ڈالا تھا۔ دوسرے دروازوں کی طرح اس دروازے کا نام بھی بگڑتے بگڑتے بھائی سے بھائی ہو گیا۔ ایک اور روایت کے مطابق ملک ایاز کے زمانے میں بھٹ قبیلے نے اس دروازے کے اندر رہائش اختیار کی اور اسی مناسبت سے یہ دروازہ بھائی دروازے کے نام سے مشہور ہوا۔ غزنوی کے دور میں قدیم شہر یہاں ختم ہو جاتا ہے۔ لاہور کا سب سے پہلا سینما گھر بھائی دروازے کے باہر قائم ہوا تھا۔ قدیم ”اچی مسجد“ بھی اسی دروازے کے اندر

خضری یا شیراوالہ دروازہ:

یہ دروازہ راوی کے کنارے کھلتا تھا۔ اس کا نام حضرت خضرؑ کے نام کی مناسبت سے خضری دروازہ رکھا گیا۔ جب رنجیت سنگھ نے دروازے کی از سر نو تعمیر کروائی تو اس نے اس دروازے پر دو سدھارے ہوئے شیر پتھرے میں رکھے تو یہ دروازہ شیراوالہ گیٹ کے نام سے مشہور ہو گیا۔

بھائی دروازہ:

بھائی دروازہ شہر قدیم کے جنوب میں واقع ہے۔ اس کی دائیں جانب موری دروازہ اور بائیں جانب نکسانی



بھائی گیٹ

واقع ہے۔ فن تعمیر کے حوالے سے بھائی، حفصی اور کشمیری ایک جیسے ہیں۔ لمبائی کے لحاظ سے یہ تمام دروازوں سے طویل ہے۔ انگریز دور میں اس کی از سر نو تعمیر ہوئی۔ بھائی دروازہ کوچہ فقیر خانہ اور فقیر خانہ میوزیم کے حوالے سے بھی مشہور ہے۔

☆.....☆

از مارشل نذر خان کے دور میں ان کی خواہش پر فضائیہ نے ایک فلم بنائی تھی جس میں پیشہ وراہکاروں کے علاوہ دوسرے اداکار بھی کام کر رہے تھے۔ اشفاق نقوی مزاح نگار ہیں آجے ان کی زبانی اس فلم کی رواد سنئے:

یہ قصہ ان دنوں کا ہے جب از مارشل نذر خان پاک فضائیہ کے سربراہ تھے۔ انہیں اچانک ایک فلم بنانے کی سوجھی۔ بالکل کمرشل فلم وہ جو پردہ اسکرین پر دکھائی جاتی ہے۔ اس کا اولین مقصد تو فضائیہ کی پروڈکشن تھا مگر ساتھ ہی ملکی ایک جہتی کا جذبہ بھی دکھایا گیا تھا۔ کہانی کچھ اس طرح تھی کہ مغربی پاکستان کا ایک نوجوان یعنی ہیر و فضائیہ میں فلائیٹ لیفٹیننٹ ہے اور مشرقی پاکستان کے رہنے والی ہیر وئن فوج میں نرس بن کر پشاور میں تعینات ہے۔ کسی طرح دونوں کی نگاہیں لڑ جاتی ہیں۔ ادھر ہیر و کی بہن اس کے ایک مشرقی پاکستانی دوست اور فضائیہ کے افسر سے عشق فرمانے لگتی ہے۔ (فلم میں ان کا ایک دوگانہ بھی ریکارڈ کیا گیا جو آدھا اردو اور آدھا بنگلہ میں تھا)۔

اب چونکہ ہم بھی ان دنوں فضائیہ میں منگ مار رہے تھے تو اچانک ایک روز ہم پر حکم نازل ہوا کہ یہ فلم تم بنوادے یعنی بندہ حقیر کی تقدیر میں یہ بھی لکھا تھا کہ فلاں فلاں گھڑی اسے فلمی دنیا کی طرف کوچ کرنا پڑے گا۔ اب مجبوری تھی ہم اس دنیا میں داخل بھی ہو گئے اور بخیر و عافیت لوٹ بھی آئے مگر صرف لوٹ آنے کی حد تک اس ڈیڑھ سال کے عرصے میں جو ہم پر بنتی وہ ڈکھ ہم ہی جانتے ہیں۔

ہم نے اسے جے کاردار کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ لوگ کہتے تھے بڑا ہی ماہر فلم ساز ہے دنیا کے دس بہترین ڈائریکٹروں میں شمار ہوتا ہے۔ انگلستان میں باقاعدہ ٹریننگ حاصل کر چکا ہے۔ اس کی بنائی ہوئی فلمیں بین الاقوامی میلوں میں انعام حاصل کر چکی ہیں۔ اس کی بیوی لبنان کے کسی وزیر کی بیٹی ہے اور ایک زمانے میں مس لبنان بھی رہ چکی ہے وغیرہ۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہوا کہ دوسری جنگ عظیم کے دوران وہ بحر یہ میں افسر رہا ہے۔

جنگ ختم ہونے کے بعد جب وہ رہا ہو کر اپنے بھائی اے آر کاردار کے پاس بمبئی پہنچا تو اس نے اسے مدراس بھیجا تاکہ وہاں سے کچھ وصولی کر لائے مگر وہ ایسا گیا کہ کئی ماہ تک غائب رہا۔ معلوم ہوا کہ وہ سرمنڈوا کر ایک آشرم میں سادھو بنا بیٹھا ہے۔ قصہ کوتاہ اس کے بارے میں جو کچھ بھی سنا وہ ایک شریف آدمی کو خوف زدہ کرنے کے لیے کافی تھا اور ہم خود کو شریف آدمی ہی سمجھتے تھے بلکہ اب تک سمجھتے ہیں۔

کاردار نے اپنی مدد کے لیے ایک نائب بھی جن رکھا تھا۔ ٹائٹل گنڈاپور۔ وہ بعد میں نیف ڈیک کالاہور میں منیجر بھی بن گیا۔ کیمرا مین مروان مارشل تھا۔ اس کا تعلق تو انگلستان کے کسی امیر گھرانے سے تھا مگر فوٹو گرافی کا شوق اسے لے ڈوبا۔ اس نے باقاعدہ ٹریننگ حاصل کر کے کیمرا مین کا پیشہ اختیار کر لیا۔ اس کا یہ شوق جنون کی حد تک بڑھا ہوا تھا۔ لوگ مذاق سے کہا کرتے تھے کہ اگر مارشل کو سڑک پر جاتے ہوئے کوئی آدمی دکھائے دے جو تھوڑے سے کسی بچے کا سر کھل رہا ہے تو وہ بڑھ کر اسے روکنے کی بجائے فوراً اپنا کیمرا نکال کر اس منظر کی فلم بنانی شروع کر دے گا۔

اس کی بیوی کراچی میں رہتی تھی۔ اس سلسلے میں ایک مرتبہ اس نے ہم سے شکایت بھی کی۔ کہنے لگی جب مجھے معلوم ہوا کہ کئی روز باہر رہنے کے بعد وہ فلاں دن گھر آئے گا تو میں اس روز خاص طور سے بال بنوائی ہوں اور اچھا سا میک اپ کر کے بیٹھ جاتی ہوں مگر جب یہ گھر میں داخل ہوتا ہے تو بیلو کبہ کر فرس پر بیٹھ جاتا ہے اور اپنے کیمرے نکال کر ان کے لینز صاف کرنا شروع کر دیتا ہے۔ میری طرف دیکھتا بھی نہیں۔ خیر اس نے اعتنائی کا اس محترمہ نے بھی بڑے اچھے طریقے سے بدل لیا مگر وہ ایک الگ داستان ہے۔

یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اب ہوا یوں کہ ہمیں اس دیوانے یعنی اے جے کاردار کے ساتھ تھی کر دیا گیا۔ اس کے ذمے یہ کام تھا کہ فلم ڈائریکٹ کرے اور ہمارے ذمے یہ کام کہ اس فلم سازی کے دوران اسے جو مدد درکار ہو وہ فراہم کریں۔ گویا ہم فلم کے پروڈکشن منیجر بنا دیے گئے۔ یہ فلم شروع تو پشاور میں ہوئی مگر رفتہ رفتہ آگے کھسکتی رہتی یہاں تک کہ مشرقی پاکستان تک جا پہنچی۔ ظاہر ہے ہم بھی اس کے ساتھ ساتھ کھسکتے بلکہ کھسکتے رہے اور نتیجتاً کوئی پچیس پاؤنڈ وزن کھو بیٹھے۔

پہلے تو ہم نے اس فلم کے بارے میں مزید معلومات اکٹھا کرنا شروع کیں اور جوں جوں یہ معلومات بڑھتی گئیں

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety



فلم پکار کا ایک منظر

ہماری پریشانیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔
 اول تو اسی خبر نے مرعوب کر کے رکھ دیا کہ فلم کی کہانی لکھنے والوں میں پروفیسر احمد علی اور زیڈ اے بخاری جیسے لوگ شامل ہیں اور نقد نگاروں میں فیض احمد فیض مگر آگے چل کر جب اس فلم میں کام کرنے والوں کی فہرست دیکھی تو ہم بھونچکا رہ گئے۔ اس زہ نے کی فلمی دنیا کا کون سا بڑا نام تھا جو اس میں شامل نہیں تھا۔ شبنم، سورن لتا، فریدہ خانم، روزینہ، حنا علقہ، مینا شوری،

اپنی انگریز بیوی اور بچیوں لیلی اور نور جہاں سمیت وہاں آنے پہنچے۔ یہ دونوں بہنیں وہاں گھڑ سواری سے دل بہلانے لگیں۔ ان دنوں ہم بھی جو ناگڑھ لائسنسز میں لیفٹیننٹ تھے۔ اس لیے کبھی کبھی اپنا گھوڑا دوڑاتے ہوئے ان کے ساتھ شامل ہو جاتے۔ لیلی تو اس کے بعد علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے چلی گئی اور بعد کو ایک عیسائی پائلٹ سے شادی کر لی مگر جب یہ فلم بنی تو وہ اپنے پہلے شوہر کو چھوڑ کر ساسا ایڈورٹائزنگ والے شہزادہ احمد شاہ سے شادی کر چکی تھی اور اسے لال میاں کہہ کر پکارتی تھی۔ باقی رہی اس کی بہن نور جہاں تو وہ پاکستان کے اوانکی ایام میں اپنی چھوٹی سی سرخ رنگ کی کار کاڈ اتار کر شام کو کراچی کے صدر بازار میں بلاوجہ چکر کاٹی اور دیکھنے والوں کو ترسائی۔ اس نے بعد میں ایک چھوٹے موٹے ایکٹر سے شادی کر لی۔

ہاں تو، اس فلم بنانے کے سلسلے میں ہماری اولیٰ بن ڈیوٹی یہ تھی کہ ان تمام فلمی ستاروں کو سنبھالیں۔ ان کے قیام اور طعام کا انتظام کریں، ان کے نازخروے اٹھائیں اور ساتھ ہی یہ حکم بھی کہ انہیں وقت پر شوٹنگ کے لیے پہنچائیں۔ ظاہر ہے اس آخری بات کا یہ قبیلہ ہرگز عادی نہ تھا۔ اگر وہ عادی تھا تو ناڈ کرنے کا اور لاڈ اٹھوانے کا۔

پہلا مرحلہ ان کے قیام کا تھا۔ پشاور ایک چھوٹا سا شہر اور اتنے بہت سے بڑے بڑے مہمان مگر ڈیوٹی آخر ڈیوٹی تھی۔ ان کی رہائش کا انتظام کرنا ہی پڑا۔ ڈین ہوٹل میں کمرے لے کر خواتین کو وہاں فٹ کیا۔ طارق عزیز اور دو بنگالی ایکٹروں کو آفیسر میس میں ٹھہرایا اور خود کاردار اور اس کے دیگر عملے کو پشاور کلب کے حوالے کیا۔ لیلی نے کوئی پرابلم



پکار

KAMAL AMROH SOHRAB MOOH

طارق عزیز، شہزادی تاج، مشرقی پاکستان سے روزی اور وہ مرداد کار خدائی بنا۔ ان کے علاوہ آرٹ ڈائریکٹر بھی یعنی جس کے ذمے نیک اپ اور مختلف قسم کے لباس تجویز کرنے کا کام تھا وہ بھی بین الاقوامی شہرت یافتہ مصورہ لیلی شہزادہ۔ اسے ہم نے بہت عرصے پہلے جو ناگڑھ میں دیکھ رکھا تھا۔ اس کے والد علی بھائی جاویری یعنی جوہری ساتھ والی ریاست جام نگر میں رہتے تھے اور ہندوستان کے پرل کننگ (سچے موتیوں کے بادشاہ) مشہور تھے۔ وہ بحری جہاز لے کر سندروں کو کھنگالتے اور ان کی تہہ سے موتی نکلاتے۔ انہیں ایک مرتبہ جو ناگڑھ کے دیوان (وزیر اعظم) نے مدعو کیا اور وہ

پیش نہ کی۔ وہ اتر مارشل نور خان کی عزیز تھی اس لیے اتر ہاؤس میں چلی گئی۔ اس وجہ سے ہماری شان تو بڑھ گئی مگر دوستوں نے حسد کرنا شروع کر دیا کیوں کہ ہم کھلے بندوں کی طرح ان کے گھر میں داخل ہو سکتے تھے۔ چاہے رات کے دو ہی کیوں نہ بچے ہوں۔ آخر لیلیٰ کو لانا اور واپس چھوڑنا بھی تو ہمارے ہی ذمے تھا۔ ویسے بھی لیلیٰ ہم پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہو گئی تھی۔

مہمانوں کو ٹھکانے لگا تو دیا گھر شامت آگئی ہماری دن میں چار مختلف مقامات کا چکر لگانا پڑا۔

پشاور کے عوام کو جو نئی خبر ملی کہ ان کے شہر میں ایسی ایسی شہرہ آفاق ہستیاں نازل ہو گئی ہیں تو انہیں شوق دیدار نے برا ہیختہ کر کے ہمارے لیے ایک اور مسئلہ کھڑا کر دیا یعنی ان نامور ہستیوں کو نگاہ بد سے بچانے کا۔ اس سلسلے میں پولیس کی مدد طلب کی جریں تو گئی مگر بذات خود ایک مصیبت ثابت ہوئی۔ سپاہی بد تعینات کیے گئے وہ بھی تو بے چارے دل پشوری کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے خود بہا نے بنا بنا کر ان فلمی ستاروں کے گروں میں جانا شروع کر دیا اور اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے دوستوں کو بھی دعوت دیدار دینے لگے۔ شبنم کے ساتھ تو خیر اس کے میاں روہن گھوش تھے اور ایک آدھ نے اور بھی دورانہ دستی سے کام لیتے ہوئے اپنی بڑی بی بی کو ساتھ لے آئی تھیں مگر وہ بد عظمیٰ سے تنہا آگئیں پریشان ہونے لگیں اور ہمارے سامنے شکایات کے انبار لگ گئے جس کے نتیجے میں ہماری ڈیوٹی میں ایک اور اضافہ ہو گیا یعنی ان کی اشک شوئی کرنا، انہیں یقین دلانا کہ کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ بس بے چارے زبردیوار کھڑے ہیں تیرا کیا لیتے ہیں وغیرہ۔

ان حالات سے تنگ آ کر ہم نے کاردار سے کہا کہ بھائی ان پری چہرہ لوگوں سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کرو جس کا کام نہ ہو اسے واپس لا ہو بھیج دو، آخر پشاور کون سا دور ہے جس روز شوٹنگ ہو صبح کی فلائٹ سے بلا لوتا کہ شام کو اپنے گھر لوٹ جائیں۔ ہماری ذمہ داری میں کچھ کی تو کرو۔ خدا کا شکر کہ بات اس کی سمجھ میں آگئی اور ہم نے بیشتر کو وہاں سے روانہ کر کے اطمینان کی سانس لی۔

فلم کی شوٹنگ ہوتی رہی اور ہم صبح شام ہوائی اڈے کے چکر کاٹتے رہے۔ کبھی کسی کو لینے کبھی کسی کو چھوڑنے۔ ایک مرتبہ ہم کسی پری چہرہ کو ہوائی اڈے سے لے کر آ رہے تھے کہ دیکھا ہماری ٹیم پیدل چلی جا رہی ہیں ہم نے گاڑی روک کر انہیں ساتھ بیٹھنے کو کہا تو انہوں نے مہینا کر اور بھی

تیز رفتاری سے پیدل چلنا شروع کر دیا۔ ایک صبح صاعقہ کی آمد تھی۔ باقی تمام عملہ موقع واردات پر پہنچ چکا تھا۔ ہمیں اسے ہوائی اڈے سے سیدھے وہاں پہنچانا تھا۔ سین کچھ اس طرح تھا کہ پشاور کے ایک پرانے مکان کی چھت پر صاعقہ اور روزینہ کھڑی ہیں اوپر سے فضائیہ کے تین طیارے گزرتے ہیں جنہیں دیکھ کر یہ دونوں ہاتھ ہلاتی ہیں۔ اس مقصد کے لیے تین فائٹر پشاور کے رن وے پر تیار کھڑے تھے۔

صاعقہ جہاز سے اتری تو اس کی باجی بھی ساتھ تھی۔ ہم آگے بڑھ کر انہیں کار کی طرف لے جانے لگے تو اس کی باجی بول اٹھی۔ ”لڑکی کی طبیعت خراب ہے، جہاز میں تے کرتی رہی ہے۔“ اب ہم تو جانتے تھے کہ اس تے کا طبیعت کی خرابی سے کوئی تعلق نہیں۔ پرواز کے دوران ایک آدھ جھکا لگے تو ایسا ہو ہی جاتا ہے مگر وہ کہاں ماننے والی تھی کہنے لگی، شوٹنگ بعد میں دیکھی جائے گی پہلے لڑکی کو ڈاکٹر کے پاس لے چلو۔ ہم برے پھنسے۔ ادھر اس کے انتظار میں شوٹنگ نہیں ہو سکتی تھی ادھر اس کا یہ اصرار۔ چاروٹا چار پی اے ایف اسپتال کا رخ کرنا پڑا۔ ان دونوں کو باہر چھوڑ کر ہم اندر گئے ڈاکٹر صاحب سے سرگوشی کی جو مریضہ لے کر آیا ہوں اس کی طبیعت میں کوئی خرابی نہیں بس جلدی سے تسلی کے لیے کوئی ہلکی سی دوا دے دو تا کہ شوٹنگ میں تاخیر نہ ہو۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم فوراً مریضہ کو اندر لے گئے مگر انہوں نے ہمیں باہر جا کر انتظار کرنے کو کہا۔ چلو کوئی بات نہیں۔ ہم باہر آ گئے اور لگے کرنے انتظار۔ جب وہ انتظار ایک حد سے بڑھنے لگا تو ہم پریشان ہو گئے۔ اٹھے ادھر ادھر ٹہلنے اور جب صبر کا پیمانہ بالکل لبریز ہو گیا تو ہم ڈاکٹر صاحب کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جا دھمکے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ وہ مریضہ کے بازو پر پٹی باندھے اس کا بلڈ پریشر دیکھ رہے ہیں۔ ہم پر نظر بڑی تو دو بارہ چشمکیں نکاہوں سے باہر جا کر انتظار کرنے کا حکم صادر فرما دیا۔ ہم تو اپنا سر پکڑ کر رہ گئے۔ ہم جتنی جلدی میں تھے ڈاکٹر صاحب اتنی ہی دیر کر رہے تھے۔ کوئی مزید آدھ گھنٹے کے بعد مریضہ کمرے سے نمودار ہوئی۔ ہاتھ میں ایک پرچی تھی جس پر کوئی درجن بھر دواؤں کے نام لکھے تھے جنہیں بنواتے بنواتے کوئی آدھ گھنٹا اور صرف ہو جاتا۔ ہم نے اپنے معزز مہمانوں سے درخواست کی کہ آپ شوٹنگ کے لیے چلیے ہم واپس آ کر دوا لے جائیں گے مگر وہ کہاں ماننے والی تھی۔

شہید ذہنی کوفت میں مبتلا ہے۔ بار بار اپنے اس بیٹے ہوئے زمانے کو یاد کرتی۔ میرے گھر کے گرد راجے مہاراجے چکر لگایا کرتے تھے۔ اس کا تکیہ کلام بن چکا تھا۔ اس کا دل بہلانا بھی ہمارے ہی فرائض میں شامل ہو گیا اور جب اسے پتا چلا کہ اس کا پہلا میاں ظہور راجا ہمارا دوست رہا ہے تو وہ ہم سے اور بھی زیادہ ہمدردیاں طلب کرنے لگی۔ ویسے کاردار نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ مینا کو ہر روز شراب کی ایک پوری بوتل مہیا کر دی جائے۔

چلتے چلتے کچھ ظہور راجا کے بارے میں بھی سن لیجئے۔ یہ نوجوان پنڈی کار نے والا تھا اور ایک روز گھر سے فرار ہو کر ممبئی کے فلمستان میں پہنچ گیا۔ اس کا والد تھانیدار تھا اور جب اسے معلوم ہوا کہ اس کا بیٹا ایکٹر بن گیا ہے تو سچ پا ہو گیا اور زندگی بھر اس کی صورت نہ دیکھنے کی قسم کھالی۔ کافی عرصے کے بعد پنڈی میں ایک فلم لگی جس کا نام تھا مرزا صاحبان۔ اس کا ہیرو ظہور راجا تھا۔ اس کے گھر والوں کو جب معلوم ہوا کہ اس فلم میں ظہور راجا بھی ہے تو اس کی بہنیں اپنے بھائی کو دیکھنے کے لیے تڑپ اٹھیں۔ اس زمانے میں لڑکیاں آج کل کی طرح منہ اٹھائے اکیلی سینما نہیں جایا کرتی تھیں۔ انہوں نے اپنی والدہ کو ساتھ ملا یا۔ وہ بھی اپنے تخت جگر کو دیکھنے کے لیے تاب ہو گئیں مگر پھر وہی ڈر۔ بڑے راجا صاحب سے فلم دیکھنے کی اجازت کیسے لی جائے؟ ایک دن انہیں اچھے موڈ میں دیکھ کر نہ صرف فلم دیکھنے کی اجازت مل گئی بلکہ وہ خود بھی ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئے۔

پورا خاندان سینما گھر پہنچا۔ فلم شروع ہوئی اور ظہور راجا نے اپنا دیدار کرانا شروع کیا مگر آگے چل کر سین آیا جس میں ظہور راجا کی پٹائی ہونے لگتی ہے۔ یہ دیکھ کر اس کی ماں اور بہنیں تو بلبل اٹھیں مگر بڑے راجا صاحب نے وہیں بیٹھے بیٹھے تھانیدار اتہ آواز لگائی۔ ”بہت مارو، ممبئی جا کے کچر بن گیا اے۔“

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے ہماری فلم میں سورن لٹا بھی تھی۔ اسے دیکھ کر ہمیں اس کی کئی سال پرانی فلم یاد آگئی جس میں اس کا گانا ”اکھیاں ملا کے، جیا برما کے، چلے نہیں جانا“ زباں زد عام ہوا کرتا تھا۔ اس فلم میں ہمارے دوست کرن دیوان نے ہیرو کا رول ادا کیا تھا۔ اب ہم نے اسے نہایت کم گو، مدبر، سنجیدہ اور انتہائی باوقار پایا۔ وہ اکیلی اپنے کمرے کے برآمدے میں بیٹھی رہتی اور دوسروں کے کمروں کے گرد چکر کاٹنے والوں کا تماشا کرتی۔

کہنے لگیں پہلے دیا لیجئے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے میرے سامنے آ کر کھانا ہے ڈاکٹر تیرے صدمے (ویسے یہ ڈاکٹر پانچ وقت کے نمازی کیا تہجد گزار بھی مشہور تھے)۔ خیر، یہ شوٹنگ کسی طور اس روز مکمل ہو ہی گئی یہ اور بات ہے کہ کاردار بار بار کٹ کا نعرہ لگاتا کیوں کہ جہاز اوپر سے اس تیزی سے گزرتے کہ کبھی ایک لڑکی ہاتھ اٹھانے میں تاخیر کر دیتی کبھی دوسری۔ بس وائرلیس کے ذریعے جہازوں سے بار بار کہنا پڑتا کہ ایک چکر اور لگاؤ۔ اس وجہ سے اتنی دیر ہو گئی کہ صاعقہ لاہور واپس نہ جاسکی۔

اس رات سب کو بستر استراحت پر لٹانے کے بعد ہم اپنے گھر جاتے ہوئے آفس میس میں سے تڑپے۔ رات کے کوئی گیارہ بج رہے تھے۔ دیکھا کہ میس کی بار میں بتیاں جل رہی ہیں۔ ہمیں بڑی حیرت ہوئی کیوں کہ بار تو رات دس بجے بند کرنے کا حکم تھا۔ ہم گاڑی روک کر اندر گئے تو کیا دیکھا کہ وہ تینوں پائلٹ جنہوں نے لڑکیوں کے اوپر سے پرواز کی تھی وہاں اپنا غم غلط کر رہے ہیں۔ ہمیں دیکھتے ہی پھٹ پڑے۔ ”سر! آپ نے مراد دیا۔ ہم سے بار بار چکر لگوائے مگر وہ لڑکیاں ہمیں دکھائی تک نہ دیں۔“ ہم فوراً جلال میں آ گئے۔ ”اچھا تو یہ بات ہے۔“ ہم نے کہا۔ ”بار مت بند ہونے دینا، ہم ابھی ان کو لے کر آتے ہیں۔“

ہم واپس ڈین ہوٹل آئے۔ روزینہ اور صاعقہ کو جگا کر فوراً تیار ہونے کا حکم دیا اور انہیں اپنی جیب میں بٹھا کر واپس آفس میں آ گئے۔ لڑکوں کی تو باپ بھینس کھل گئیں اور انہوں نے اونچا میوزک لگا کر ڈانس کرنا شروع کر دیا۔ ان میں سے ایک تو آگے چل کر اے آر چیف مارشل اور نضائیہ کا سر براہ بھی بنا۔ روزینہ یہ سمجھی کہ ہم اسے کسی ذاتی غرض سے جگا کر لائے ہیں۔ وہ ہمارے برابر کاؤنٹ کے اونچے اسٹول پر بیٹھی اپنا پاؤں بڑھا کر ہماری ٹانگ سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔ ہم نے فوراً ڈانٹ دیا۔ اگر اس کی یہ حرکت برداشت کر لیتے تو اگلے روز وہ ہمارا حکم کیسے مانتی۔

اب کچھ مینا شوری کے بارے میں سنئے۔ یہ محترمہ جتنے روز شوٹنگ ہانتی رہی پشاور ہی میں براجمان رہیں۔ گجرات کی یہ الہڑ پہلے پہل مینا کماری کے نام سے فلم سکندر اعظم میں آئی اور اس کے کھڑے کے کالے تل بردنیا فریفت ہو گئی۔ بعد میں لارا لپا گرل کے نام سے مشہور ہوئی مگر یہ باتیں اس وقت کی تھیں جب ”تس جوان تھا۔ اب تو پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا تھا۔ ان دنوں تو اسے دیکھ کر یہی محسوس ہوا کہ وہ

کریں گے یا خشک جھیل کے کنارے سین فلمائیں گے۔ ہم حکم کی بجا آوری کرتے۔ ہمیں کچھ معلوم نہ ہوتا کہ اس سین کے لیے کیا کیا سامان درکار ہوگا۔ ایک شام ہم پشاور سے کوئی آٹھ دس میل دور وارسک کالونی پہنچے۔ وہاں فضا یہ کے افسر فیملی کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ شوٹنگ شروع ہوئی اور چلتی رہی۔ رات کوئی بارہ بجے کاردار کہنے لگا کہ دو سپاہی چاہئیں جن کے ہاتھوں میں اسٹین گن ہو۔ سپاہی تو وہاں اس وقت موجود تھے مگر اسٹین گنیں کہاں سے آئیں؟ مجبوراً ہمیں پشاور واپس آکر آرمانٹ افسر کو نیند سے جگانا پڑا۔ اس نے آکر آرمی کھولی اور دو عدد اسٹین گنیں ہمارے حوالے کیں۔ ہم لے کر گاڑی بھگاتے ہوئے واپس وارسک پہنچے اور وہ اسٹین گنیں پیش کیں۔ کاردار نے ان کی طرف دیکھا تک نہیں۔ کہنے لگا میں نے سین کا وہ حصہ کاٹ دیا ہے اب ان کی ضرورت نہیں۔ ہم تو سرپیٹ کر رہ گئے۔

ایک مرتبہ کاردار کو جو سین فلمانے کی سوچھی وہ بھی وارسک ہی میں تھا۔ اس میں روزی اور اس کی سہیلی شبنم علی صبح ایک مکان کے سامنے کھڑی دکھائی جاتی ہیں۔ اوپر سے ایک دن اوفور طیارے چڑھتے سورج کی طرف پرواز کرتا ہوا گزرتا ہے اور یہ دونوں اسے دیکھ کر ہاتھ ہلاتی ہیں اب باقی تو سب کچھ ٹھیک تھا مگر دن اوفور طیارے صرف سرگودھا میں تھے سو ہم نے وہاں کے بیس کمانڈر کو فون کیا۔ ان دنوں ظفر چودھری صاحب وہاں تعینات تھے ہم نے کہا۔ ”سر! کل صبح پانچ بجے ایک دن اوفور چاہیے جو وارسک کے اوپر پرواز کرے اسے ہم نیچے سے کنٹرول کریں گے۔“ ظفر چودھری صاحب بھٹا گئے۔ کہنے لگے۔ ”کون بول رہا ہے؟“ ہم نے کہا۔ ”فلائٹ لیفٹیننٹ نقوی“ غصے سے بولے۔ ”کس سے بات کر رہے ہو؟“ ہم نے بڑے آرام سے کہا۔ ”بیس کمانڈر سرگودھا سے یہی ان سی کا آرڈر ہے۔“ جھنجھلا کر بولے۔ ”ڈیم اٹ، صبح پہنچ جائے گا۔“ اب پشاور کی سردی اور اتنی سویرے روانگی ہم نے ڈین ہوٹل کے منیجر کو کڑا حکم دیا کہ صبح چار بجے شبنم اور روزی کو جگا کر ناشتا کرادے۔ لیکن کی فکر نہیں تھی کہ وہ ہمارے ساتھ صبح تین بجے بھی چلنے کو تیار تھی۔ پورا پونٹ وقت پر وارسک پہنچ گیا۔ روزی اور شبنم کو ایک افسر کے گھر کے سامنے کھڑا کیا اور گھر والوں کو سختی سے منع کیا کہ کھڑکیوں میں سے نہ جھانکیں۔ ادھر سورج نمودار ہوتے ہی دن اوفور بھی پہنچ گیا۔ وہ اوپر سے اتنی تیزی سے گزرا کہ یہ پری چہرہ لوگ اسے دیکھتے ہی

کاردار فلم میں لیے ڈائلاگ کا قائل نہیں تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ریڈیو ڈراموں کی کہانی ڈائلاگ کے ذریعے آگے چلتی ہے مگر فلم میں تو سیلوانیڈ یعنی تصویر خود بولتی ہے۔ اسی لیے فلموں کے عالمی مقابلوں میں تمام فلمیں بغیر سائڈ ٹریک کے دکھائی جاتی ہیں۔ یہ فلم جو ہم بنا رہے تھے اس میں بھی ڈائلاگ کا فقرہ ان تھا۔ اسی لیے سورن لتا ایک روز ہم سے پوچھنے لگی۔ ”نقوی صاحب کیا یہ سائینٹ فلم بن رہی ہے؟“

اس دوران ہم نے پشاور کلب میں فریڈہ خانم پر ایک گانا بھی فلم بند کیا۔ کلام فیض کا ہم کو ذیہ قاتل سے آئے ہیں اور آواز فریڈہ کی۔ بس سماں بندھ گیا مگر مصیبت یہ ہوئی کہ کلب کے تمام ممبران شراب کے نشے میں دھت وہاں آدھیکے اور ہمیں کئی ری ٹیک کرانے پڑے۔

اس فلم کے ایک سین میں شبنم کو بطور فوجی نرس پیش کرنا تھا لہذا اس کے لیے وردی درکار تھی۔ ہم فوراً سی ایم ایچ کے نرسنگ ہاسٹل پہنچے اور میٹرن سے اپنا مدعا بیان کیا۔ کہنے لگی وردی تو آپ کو مل جائے گی مگر پہنائیں گے ہم خود۔ آپ فلموں والے (یعنی ہمیں یہ بھی سنا تھا) نرسوں کو بڑے غلط انداز میں پیش کرتے ہیں۔ اسے وارڈ میں مریضوں کے درمیان اچھلتے کودتے اور گانا گاتے دکھاتے ہیں۔ ہم شبنم کو خود سمجھائیں گے کہ نرس بن کر کس طرح چلنا پھرنا چاہیے۔

شام ہونا تو حسب ارشاد ہم شبنم کو سی ایم ایچ کے نرسنگ ہاسٹل لے گئے۔ مگر یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وردی پہنانے کی رسم ادا کرنے کے لیے اسپتال کی تمام نرسیں موجود تھیں۔ پھر وہاں پر ایک اور مصیبت کھڑی ہو گئی۔ شبنم خاصی دراز قد ہے اسے کسی کی شلووار پوری نہیں آرہی تھی۔ مجبوراً ہم بھاگ کر اپنے ایک افسر کے گھر گئے اور اس کی دراز قد بیوی کی منت کر کے اٹھے کی شلووار مستعار لے آئے۔ یہ الگ بات ہے کہ چند روز بعد جب ہم وہ شلووار واپس کرنے گئے تو انہوں نے اسے سخن میں پڑے کوڑے کے ڈھیر میں پھینک دیا۔ خیر باقی تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو گیا مگر اس روز ہماری شوٹنگ کوئی دو گھنٹے تاخیر سے شروع ہوئی۔

ہر فلم کا باقاعدہ اسکرپٹ ہوتا ہے جس میں ہر تفصیل درج ہوتی ہے یعنی فلاں سین اس طرح ہوگا اس میں فلاں فلاں یہ یہ کیڑے پینے گا۔ اس کے لیے یہ یہ سامان درکار ہوگا وغیرہ مگر ہماری اس فلم کا کم از کم ہمارے پاس کوئی اسکرپٹ نہیں تھا۔ بس ہر بات کاردار کے اپنے دماغ میں تھی۔ بیٹھے بیٹھے کہتا چلو فلاں فلاں کو ساتھ لو آج وارسک میں شوٹنگ

سلیکون کے کرشمے

۷ جولائی 1981ء کو اسٹینٹن فیک نامی پائلٹ نے شمسی توانائی سے چلنے والے ہوائی جہاز کے ذریعے روڈ بارانگلستان عبور کیا۔ اس پرواز میں ساڑھے پانچ گھنٹے صرف ہوئے، طیارے کا نام سولر چیلنجر تھا اور وہ پلاسٹک کا بنا ہوا تھا۔ اس کی دم اور پروں پر سولہ ہزار ننھے ننھے شمسی سیل نصب تھے۔ یہ سولر سیل جسے فوٹو وولٹیک سیل بھی کہا جاتا ہے، سورج کی روشنی بلا واسطہ بجلی میں تبدیل کر دیتے ہیں، انہیں بجلی پیدا کرنے کے لیے دفائی انجن یا جنریٹر استعمال نہیں کرنا پڑتے۔ سولر سیل چارلس فرٹس نامی ایک سائنسدان نے 1889ء میں ایجاد کیے تھے، وہ چھوٹے چھوٹے سکون کی مانند تھے۔ انہیں بہتر بنانے کی سر توڑ کوششیں ہوتی رہیں، آخر 1954ء میں امریکا کی سیل لیبارٹری کے سائنسدانوں نے ایک ایسا عنصر دریافت کر ہی لیا جو سولر سیل کو بہت زیادہ بہتر بنانے میں مدد ثابت ہو سکتا تھا۔ یہ عنصر تھا سلیکون! جو ریت جیسی معمولی شے سے حاصل کیا جاتا ہے۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شمسی توانائی ایک بالکل نئی دریافت ہے لیکن ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ تاریخ پر ایک نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ماضی قدیم کا انسان بھی شمسی توانائی سے آگاہ تھا، بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اس کی زندگی کا زیادہ تر انحصار صرف شمسی توانائی ہی پر تھا۔ تاریخ کے وہ مہذب لوگ جنہوں نے سب سے پہلے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا، یونانی تھے، انہی نے سب سے پہلے توانائی کے اس بے مثل ذریعہ کو اپنا غلام بنایا۔ وہ اپنے گھروں، محلوں اور عوامی چوراہوں کا رخ ہمیشہ جنوب کی طرف رکھتے تھے جہاں سورج کی روشن کرنیں زیادہ شدت اور خاص زاویے سے گر تیں، ان کے بعد رومی تہذیب کو عروج نصیب ہوا تو ان لوگوں نے بھی یونانیوں کی دیکھا دیکھی اپنی رہائش گاہیں اور پلازے انہی کے طریق پر ڈیزائن کیے۔ انہوں نے صاف شیشہ ایجاد کیا جو سورج کی شعاعیں گھروں کے اندر تک لے جانے میں کارآمد ثابت ہوا۔ سورج کی توانائی کو زیادہ سے زیادہ استعمال کرنے کے لیے انہوں نے جا بجا گرین ہاؤس بنائے جن میں وہ سارا سال سبزیاں اور پھل کاشت کر سکتے تھے۔

مرسلہ: نعمان صفدر لاہور

رہ گئے اور ہاتھ ہلانا بھول گئے۔ مجبوراً اس طیارے کے پائلٹ عارف اقبال سے دو چکر اور لگوانے پڑے۔
شوٹنگ ختم کر کے واپس پشاور پہنچے تو شبنم پوچھنے لگی ”آج کوئی اور کام تو نہیں؟“ ہم نے کہا۔ ”نی انال تو نہیں۔“ کہنے لگی۔ ”تو پھر مجھے آج لنڈی کوتل میں شاپنگ کرادو۔“ اس وقت تک بازہ کا بازار نہیں سجا تھا صرف لنڈی کوتل ہی تھا۔ وہاں سے واپسی پر اسلامیہ کالج پشاور کے سامنے لاریوں کی بڑی کڑی چیکنگ ہوتی تھی۔ ہم نے فوراً وردی پہنی اور اپنی سرکاری جیب میں شبنم اور روبن گھوش کو لنڈی کوتل لے گئے۔ وہاں شبنم نے 28 ہزار کی شاپنگ کر ماری۔ ہم نے مذاق سے کہا کہ آج تو تم نے بہت پیسے خرچ کر ڈالے۔ کہنے لگی۔ ”کوئی بات نہیں یہ تو میں نے رات طارق عزیز سے جیتے تھے۔“ معلوم ہوا کہ ہمارا ڈین ہوٹل کے میجر کوٹری لگاتا ہے سو رہا۔ شبنم تو صبح چار بجے تک ہاتھ کھلتی رہی تھی۔

پشاور سے ہمارا ایونٹ کراچی سے ہوتا ہوا پی آئی اے کے ذریعے ڈھا کا پہنچا۔ وہاں ہماری پریشانیوں میں اتنی کمی ہوئی کہ ہمارے رے صرف مرد ہی مرد تھے۔ خواتین میں سے صرف شبنم اور روزی تھیں جن کے اپنے گھر موجود تھے۔ لیٹی کو کاردار کسی خاص مصلحت کی بنا پر پیچھے چھوڑ آیا اور اس کی جگہ ایک مقامی منحوس صورت میک اپ مین کی خدمات حاصل کر لیں جس کا ہمیں آج تک قتل ہے۔

طارق عزیز وغیرہ کو ہم نے ایک بڑا سا ہوٹل تمام مکان لے کر ٹھہرا دیا۔ کاردار خود انٹرکان میں چلا گیا اور ہم نے آفیسر میس میں ڈیرہ جمایا۔ ہم نے پہنچتے ہی ایک ٹیکسی کرائے پر لے لی جس کا ڈرائیور پشاور کا رہنے والا تھا۔ ان دنوں ہم پشتو میں خاصے رواداں تھے۔ اس سے گاڑھی چھننے لگی اور وہ رات دن ہماری خدمت میں مصروف رہتا۔ یہ جنوری 1969ء کا ذکر ہے۔ ڈھا کا میں خاسی کڑ بڑھی اور احتجاجی جلوس نکلتے رہتے تھے اس لیے شہر اکثر کرفیو میں ڈوبا رہتا۔ ہم نے فوراً کرفیو پاس بنوایا، اپنا بھی اور ٹیکسی کا بھی اور ساتھ ہی یہ بھی لکھوا لیا کہ اس ٹیکسی میں ہمارے علاوہ چار اور مسافر بھی سفر کر سکتے ہیں۔ اس کا فائدہ ایک شام ندیم کو بھی ہوا۔ وہ ان دنوں کسی فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں وہاں آیا ہوا تھا۔ ہم کرفیو کے دوران ایک شام انٹرکان پہنچے تو دیکھا کہ وہ رونی صورت بنائے لابی میں گھوم رہا ہے۔ ہمیں دیکھتے ہی منت کرنے لگا کہ مجھے کسی صورت شبنم کے گھر پہنچا دو۔ ہم اسے لے کر ایلیمنٹ روڈ پر شبنم کے گھر چھوڑ آئے۔ اگلے

قریب ٹہلنے لگے اتنے میں سائیکل رکشا آکر جہاز کی سیڑھیوں کے قریب رکنے لگے اور وہاں سے سوار ہونے والے مسافران میں سے نکل کر جہاز میں داخل ہونے لگے۔ ان خالی رکشاؤں میں وہاں پر اترنے والے مسافر بیٹھ کر اپنے گھروں کی طرف روانہ ہو گئے۔

اس جہاز کی واحد اتر ہوٹس بھی ٹارمک پر کھڑی تھی۔ ہمیں ٹیسٹ پائلٹ سے خوش گپیاں کرتے دیکھ کر ہمارے پاس آئی اور روتی صورت بنا کر کہنے لگی۔ ”سر! پی آئی اے والوں سے کہیں کہ ہمارا بھی کچھ خیال کریں۔ مسافر بار بار گھنٹی بجا کر بلاتے ہیں اور اگر کسی کے پاس پہنچنے میں ذرا سی دیر کر دوں تو ڈانٹنے لگتے ہیں۔ آپ ہی بتائیے اتنے سارے مسافر اور فلائنگ ٹائم صرف آٹھ منٹ کا۔ میں اس دوران کس کس کے پاس پہنچ سکتی ہوں۔“ ویسے یہ ہم نے بھی نوٹ کیا کہ وہاں کے لوگ کچھ زیادہ ہی Demanding ہیں۔

کو میلا سے روانہ ہوئے تو آگے نسبتاً کچھ لمبا سفر تھا۔ راحت کہنے لگے۔ ”تم پہلی بار مشرقی پاکستان آئے ہو تمہیں یہ علاقہ دکھاتا ہوں۔“ اس کے ساتھ ہی وہ جہاز کو بہت نیچے لے گئے۔ ہم نے کہا بھائی یہاں سے تو کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ کہنے لگے اچھا تو یہ لو۔ وہ جہاز کو فوراً سات ہزار فٹ کی بلندی پر لے گئے اور اسے کبھی دائیں اور کبھی بائیں جھکانے لگے۔ نتیجہ یہ کہ پیچھے بیٹھے مسافروں کی چیخیں نکل گئیں۔ یہاں تک کہ جہاز کا اصلی کیپٹن بھاگا ہوا کاک پٹ میں آکر پوچھنے لگا۔ ”سر خیریت تو ہے؟“

چنا گانگ پہنچ کر اس ہوائی اڈے کی زبوں حالی بھی دیکھی۔ وہاں سے ہم سیدھے گودی پر پہنچے اور اپنے سامان کے بارے میں دریافت کیا۔ کہنے لگے سامان آ تو گیا ہے مگر وڑ ہاؤس میں پڑا ہے۔ اس وقت دیر ہو چکی ہے صبح آکر نشاندہی کر دیجیے گا۔

اب چنا گانگ میں کوئی میس تو تھا نہیں اس لیے ہم نے شاہ جہاں ہوٹل میں کمرے لے لیے۔

شام ڈھلے ہم شہر دیکھنے کی غرض سے نکلے۔ ڈھا کا میں تو ہر قسم کی رکشاؤں کی بھرمار ہے مگر وہاں کوئی ایک بھی نظر نہ آیا۔ صرف ٹیکسیاں تھیں۔ ہم نے ایک میں بیٹھ کر ڈرامیور سے کہا کہ شہر کا چکر لگا دو وہ ہمیں سیدھا وہاں کے بازار حسن میں لے گیا۔ یہ بازار حسن کیا تھا بس چند جھوپڑیاں تھیں جن میں سے چھٹے ناکوں والی کوئی تین تین فٹ کی لڑکیاں نکل کر چم، ہیلو چم چمکتی ہوئی ہماری ٹیکسی کے

روز معلوم ہوا کہ اس رات وہ ستر ہزار روپے بار بیٹھا ہے۔ ظاہر ہے شبنم اور روبن گھوش سے بھلا کون جیت سکتا ہے۔ ہم نے شوٹنگ میں کام آنے والا بھاری سامان کراچی سے بذریعہ بحری جہاز چنا گانگ بھجوا دیا تھا تاکہ وہاں سے آگے ڈھا کا پہنچ جائے۔ دو ایک روز انتظار کیا مگر سامان نہ پہنچا۔ کاردار نے ہم سے چنا گانگ جانے کو کہا۔

مارشل لاء کا زمانہ تھا ہم نے سوچا بندرگاہ والوں پر رعب تو وردی ہی سے بیٹھے گا مگر ہماری وردی پشاور میں پڑی تھی۔ ہمارا ایک پرانا شاگرد پرویز ان دنوں ڈھا کا میں تعینات تھا۔ وہ بھی ہمارے ہی قد کاٹھ کا تھا اس کی وردی پہنی اور فوکر میں سوار ہونے پہنچ گئے۔ کافی عرصے بعد یہی پرویز لاہور میں پر تعینات تھا۔ وہاں یوم دفاع کے موقع پر فضائی مظاہرہ ہونا تھا جس میں آری کا ایک مشاق طیارہ بھی حصہ لے رہا تھا۔ پرویز شوقیہ طور پر اس طیارے کے پائلٹ کے ساتھ بیٹھ گیا مگر تھوڑی ہی دیر بعد وہ طیارہ نیچی پرواز کرتا ہوا ایک بیگر سے ٹکرا کر پورے مجمع کے سامنے پاش پاش ہو گیا۔

ڈھا کا سے چنا گانگ جانے والے فوکر کا پائلٹ تو کوئی بنگالی تھا مگر اس میں کیپٹن راحت بھی موجود تھے جو ان دنوں پی آئی اے کے ٹیسٹ پائلٹ تھے۔ ایک زمانے میں وہ پی اے ایف میں تھے اور اکارڈن کے ساتھ بڑے خوب صورت گانے سنایا کرتے تھے۔ ان کا گایا ہوا ”ابھی نہ جاؤ چھوڑ کے ابھی تو جی بھرا نہیں“ آج تک یاد ہے۔ ان کو گانے کا اس قدر شوق تھا کہ جب وہ پی آئی میں چلے گئے تو خاصے سینئر ہونے کے باوجود نائٹ کوچ پر اپنی ڈیوٹی لگواتے تاکہ اطمینان سے پنڈی سے کراچی تک مائیک پر مسافروں کو گانے سناتے رہیں۔ پچھلے دنوں اخباروں میں کیپٹن ثروت کا ذکر آتا رہا ہے۔ وہی جو جنرل مشرف کو کولمبو سے کراچی لا رہا تھا یہ کیپٹن ثروت انہی کیپٹن راحت کا بیٹا ہے۔

ہم ڈھا کا سے جہاز میں سوار ہوئے تو کیپٹن راحت کی نظر ہم پر پڑ گئی۔ انہوں نے فوراً ہمیں کاک پٹ میں بلا لیا اور جس پائلٹ کا انہیں ٹیسٹ لینا تھا اسے پیچھے بھج دیا اور ہم اس کی سید پر بیٹھ گئے۔ جہاز اوپر اٹھا اور ابھی کوئی دس منٹ بھی نہیں گزرے کہ لینڈ کرنے لگا۔ معلوم ہوا کہ ہم کو میلا پہنچ گئے ہیں مگر لینڈ کرنے کے بعد اس علاقے کی پسماندگی دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔ نہ کوئی ٹرمینل نہ کوئی بس، صرف سیڑھی لگانے والے دو آدمی تھے۔ جہاز کا عملہ اتر کر ٹارمک پر کھڑا ہو گیا۔ کو میلا اترنے والے مسافر بھی نکل کر جہاز کے

چولے جس (یعنی نہیں چلے گا نہیں چلے گا) ہم گاڑی روک کر ان کے قریب گئے اور ایک لڑکے سے پوچھا۔ ”کی چالے نہیں“ بڑے معصومانہ انداز سے کہنے لگا۔ ”امی جانی ناں“ یعنی میں نہیں جانتا۔ گویا وہ نعرہ اس لیے لگا رہا تھا کیوں کہ اسے وہ نعرہ لگانے کو کہا گیا تھا باقی رہا اس نعرے کا مطلب تو وہ نعرہ لگانے والا ہی جانے۔

ایک روز کرفو کے دوران ہم روزی کے گھر اس کی خیریت پوچھنے پہنچ گئے۔ ہم نے کہا کسی چیز کی ضرورت تو نہیں، کرفو کی وجہ سے تم بازار نہیں جا سکتیں۔ کہنے لگی۔ ”نوکی شاپ کچھ نہیں چاہیے۔ گھر میں تالاب ہے، موسلی پکڑتا اور کھاتا ہے۔“

کاردار کو صبح سویرے سین فلما نے کا بڑا شوق تھا۔ ڈھاکا میں بھی اس نے ایک ایسا ہی پروگرام بنایا کہ شبنم اور طارق عزیز کو ایک ڈولتی ہوئی ناڈ میں بٹھا کر صبح سویرے شاٹ لیا جائے۔ اب وہ سین دریا کے کس حصے میں فلمایا جائے اس مقام کا تعین ضروری تھا۔ لہذا ہم نے ڈھاکا کے بیس کمانڈر ذوالفقار علی خان جو بعد میں قضائیہ کے سربراہ بھی بنے ان سے ہیلی کاپٹر دینے کی استدعا کی۔ وہ پہلے تو برہم ہوئے مگر بعد میں ائر ہیڈ کوارٹر پشاور سے بات کرنے کے بعد تیار ہو گئے۔ اس ہیلی کاپٹر میں ہم نے بوڑھی گزنگا پر کئی چکر لگائے۔ ایک گوشہ کاردار کو پسند آ گیا۔ اب چونکہ اس مقام تک پہنچنا صبح سویرے تو ناممکن تھا اس لیے مشرقی پاکستان حکومت کا ایک اسٹیمر حاصل کیا تاکہ اس میں پورا فلم یونٹ رات گزارے اور تڑکے اپنا کام شروع کر دے۔

صدر گھاٹ سے اسٹیمر میں سوار ہو کر چلنے سے پہلے ہم نے ملازم کو ایک روپیہ دیا تاکہ ہمارے لیے پان لے آئے۔ ہم نے سوچا ایک روپے کے دو تین پان تو آ ہی جائیں گے مگر اس نے واپس آ کر ہمارے سامنے پورے چالیس پان رکھ دیے اور ساتھ ہی ایک پتے میں لپٹا ہوا کوئی پاؤ بھر چونا۔

اس اسٹیمر میں دو کیمبن تھے۔ ایک شبنم اور روہن مھوش کو دے دیا اور دوسرا کاردار اور ہم نے سنبھال لیا۔ باقی تمام لوگوں کو بیٹھے ہولڈ میں بھیج دیا۔ مشرقی پاکستان کی آدھی آبادی چھوٹی چھوٹی کشتیوں میں رہتی ہے جن کے درمیان میں ایک نیم گولائی کی چھت ہوتی ہے۔ یہ کشتیاں وہاں کے عظیم اور کشادہ دریا بوڑھی گزنگا کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ چلتی یا کھڑی رہتی ہیں۔ صرف اسٹیمر دریا کے بیچوں بیچ چلتے ہیں اور ان کی اٹھائی ہوئی لہروں سے یہ کشتیاں ڈولتی

مرد جمع ہو گئیں۔ ہم نے ٹیکسی والے کو ڈانٹا تو کہنے لگا۔ ”سر یہاں باہر کے ملکوں سے جہاز آتا ہے ان میں سے جو سیلر اترتا ہے اس کو ہم بیٹیں پر لے آتا ہے۔“ ہم نے کہا۔ ”کم بخت ہم سیلر نہیں ہیں۔ واپس ہوٹل لے چلو۔“ ہوٹل پہنچ کر ہم اس کی سب سے بالائی منزل پر چلے گئے۔ جہاں ایک خوب صورت بار تھا اور اس کی بڑی بڑی کھڑکیوں میں سے پورے شہر کا دل فریب منظر دکھائی دیتا تھا۔

اگلے روز اپنا سامان بھجوا کر ہم ڈھاکا واپس آ گئے۔ وہاں قیام کے دوران اور بھی بہت سے لطیفے ہوئے۔ ایک روز جب کرفو نہیں تھا اور ہماری ٹیکسی کاردار کے حوالے تھی تو ہم نے کہیں جانے کے لیے اپنے بیٹ مین سے کہا کہ رکشا لے آئے۔ وہاں پر ایسے رکشا تھے جن کے آگے سائیکل لگی تھی۔ اس کے علاوہ موٹر سائیکل رکشا بھی تھے۔ اس لیے ہم نے اپنے بنگالی بیٹ مین کو باقاعدہ ہدایت کی کہ موٹر سائیکل رکشا لائے۔ تھوڑی دیر بعد وہ نمودار ہوا اور مسکراتے ہوئے کہنے لگا۔ ”شاب! بے بی آ گیا۔ بالکل نیا والا۔“ ہم تو سچ پا ہو گئے۔ ”ارے گدھے۔“ ہم چلائے۔ ”ہم نے رکشالانے کو کہا تھا اور تم بے بی لے آئے ہو۔“ ساتھ والے کمرے میں ہمارا ایک بنگالی شاگرد تھا۔ ہماری آواز سن کر وہ دوڑتا ہوا ہمارے کمرے میں داخل ہوا۔ پوچھنے لگا کیا ہوا سر۔ ہم نے بتایا کہ اس کبخت سے رکشالانے کو کہا تھا اور یہ کوئی لونڈیا پکڑ لایا ہے۔ ہمارے شاگرد نے بیٹ مین سے بنگلہ میں بات کی اور ہنسنے لگا۔ کہنے لگا۔ ”سر یہاں رکشا تو اس کو کہتے ہیں جو آدمی کھینچتا ہے موٹر سائیکل رکشا کو بے بی ہی کہتے ہیں۔“

ڈھاکا میں ایک مقامی ایم پی اے تھے جو وہاں کے پوش علاقے دھان منڈی میں رہتے تھے۔ ان کی بیگم شوقیہ طور پر فلموں میں بھی کام کرتی تھیں۔ نام تو ان کا نہ جانے کیا تھا مگر انہیں شانی کہتے تھے۔ ایک شام ہم ان کے گھر گئے باتوں باتوں میں خاصی دیر ہو گئی۔ جب ہم اٹھنے لگے تو وہ کہنے لگیں۔ ”نوکی شاپ آپ اتنا دیر سے کدھر جائے گا۔ آج رات آپ ہمارا ساتھ سو جاؤ۔“ ہم تھوڑے سے چکرائے مگر پھر خیال آیا کہ وہ صرف یہ کہہ رہی ہیں کہ آج رات آپ ہمارے ہی یہاں سو جائیں۔

ایک روز ہم بازار سے گزر رہے تھے کہ دیکھا کہ نوجوان لڑکوں کا بڑا منظم جلوس جا رہا ہے۔ وہ چار چار کی ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے تھے تاکہ دفعہ 144 کی خلاف ورزی نہ ہو۔ ساتھ ہی وہ نعرہ لگا رہے تھے۔ ”پولے نہیں،

والوں کی نظریں اوپر کی بجائے ہمیشہ نیچے کی طرف ہی رہتی ہیں۔ اس وقت تک ائر مارشل نور خان مغربی پاکستان کے گورنر بن چکے تھے اس لیے ہم سیدھے گورنر ہاؤس پہنچے۔ وہاں سامنے ہی ان کی بیگم کھڑی تھیں۔ وہ عیسلی مشہور تھیں مگر اس روز بڑی شفقت سے پیش آئیں۔ پوچھنے لگیں۔ ”نقوی صاحب پان کھائیے گا؟“ ہم نے شکر یہ ادا کیا اور کہا کہ ”پہلے گورنر صاحب سے ملاقات کر دیجیے ضروری کام ہے۔“ وہ اندر سے نمودار ہوئے تو ہم نے اپنی پتہ بیان کی اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ ایک پنجابی فلم جو پاس ہو چکی ہے اس میں لاپے میں ملبوس ہیروئن کو زمین پر لیٹے ہوئے ہیرو کے سر پر ہاتھ دکھایا گیا ہے اور وہ نیچے سے مستی خیز نظریں بنا کر اوپر کودتا ہے اگر وہ فلم پاس ہو سکتی ہے تو پھر ہم نے کون سا گناہ کیا ہے؟ انہوں نے فوراً ایک نیا سنسر بورڈ تشکیل دینے کا حکم صادر فرمایا جس نے ہماری فلم ڈھائی منٹ میں پاس کر دی۔

اب آیا فلم کی رونمائی کا مسئلہ۔ اس وقت ائر مارشل رحیم خان فضا نے کے سربراہ تھے۔ انہوں نے صدر جنرل یحییٰ خان کو مدعو کیا اور ساتھ ہی تمام سفیروں اور بڑے بڑے افسروں کو۔ ہم نے فلم دکھانے کا پینڈی کے ایک بڑے سینما گھر میں انتظام کیا۔ فلم ختم ہونے کے بعد جس دروازے سے صدر صاحب کو نکلتا تھا اس کے سامنے ہم نے تمام ایکٹروں اور ایکٹریس کو لائن حاضر کر رکھا تھا۔ صدر صاحب نکلے اور ایکٹروں سے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا مگر جاتے جاتے ہم نے انہیں یہ کہتے بھی سنا کہ You have ruined my evening تم نے میری شام برباد کر دی۔

ہم نے وہ فلم ایک ڈسٹری بیوٹر کے حوالے کی اور اطمینان کا سانس لیا کچھ دنوں بعد معلوم ہوا کہ وہ فلم پشاور سے ایک سینما میں لگی ہے۔ ہم نے کہا دیکھیں تو سہی کہ پردہ اسکرین پر ہماری کارکردگی کیسی معلوم ہوتی ہے اور لوگ ہماری انٹھ محنت کا کس گرم جوشی سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ ہم نے پہلا ہفتہ گزرنے دیا۔ سوچا کہ رش کم ہو جائے تو پھر جا کر اطمینان سے دیکھیں گے مگر وائے قسمت اگلے ہفتے اپنی بنائی ہوئی فلم دیکھنے پہنچے تو معلوم ہوا کہ اتر چکی ہے۔

اس معرکہ آرا فلم کا نام بتانا تو ہم بھول ہی گئے اس کا نام تھا ”قسم اس وقت کی“ اسی لیے ہم نے قسم کھا رکھی ہے کہ آئندہ کبھی فلم بنانے کے جھنجھٹ میں نہیں پڑیں گے۔

جاری ہے

رہتی ہیں۔ شام کو کاردار اور ہم اوپر عرشے پر جا کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں مغرب کا وقت ہو گیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ہر ڈوبتی ہوئی کشتی کی گھنٹی کی گھنٹی پر گھرانے کا سربراہ کھڑا نماز ادا کر رہا ہے۔ عجب روٹکنے کھڑے کرنے والا منظر تھا۔

کچھ دیر بعد چاند ابھر آیا۔ کاردار نے ہم سے کہا کہ نیچے جا کر شبنم اور روبین گھوش کو بلا لاؤ۔ ہم نے جا کر ان کے کیمن میں جمانکا تو دیکھا کہ شبنم تو سو رہی ہے اور روبین سوٹ پہن کر کرسی پر بیٹھا کتاب پڑھ رہا ہے۔ اسے اوپر آنے کو کہا تو اس نے انکار کر دیا۔ ہم واپس اوپر پہنچے تو ہمیں تنہا دیکھ کر کاردار پوچھنے لگا کہ کیا ہوا۔ ہم نے کہا ہونا کیا ہے شبنم سو رہی ہے اور روبین بیٹھا پھرہ دے رہا ہے۔

جب وہ مقام آیا جہاں شوٹنگ کرنا تھی تو ہم نے جہاز رکوا دیا۔ قریب ہی کنارے پر ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ رکا ہوا جہاز دیکھ کر وہاں کے لوگوں کو بحسب ہوا اور وہ اپنی چھوٹی چھوٹی کشتیاں لے کر جہاز کے قریب آ گئے۔ نئی نئی صورتوں پر نظر پڑتے ہی انہوں نے گانا بھی شروع کر دیا۔ ایک بنگالی ملازم کی مدد سے انہیں سمجھایا کہ ان کی کشتیاں ہمیں صبح سویرے درکار ہوں گی۔ ہم نے بھی اپنی بنگلہ دانی پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”نا کا دین“ یعنی پیسہ بھی دیں گے۔ وہ بڑی خوشی سے مان گئے اور اگلی صبح ہمارے بیدار ہونے سے پہلے ہی پہنچ گئے۔

پوچھتے ہی ہم نے شبنم اور طارق عزیز کو ایک ناؤ میں سوار کرایا۔ دوسری میں کیمرا مین بیٹھ گیا اور تیسری میں کاردار اور ہم۔ اس تمام تردد کا نتیجہ ایک چھوٹا سا سین تھا جس میں کاردار کی ہسٹ دھرمی کے باعث کوئی ڈائلاگ نہیں تھا۔ بس شبنم اور طارق کو آمنے سامنے بیٹھا دکھایا۔ دونوں ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہیں، طارق ناؤ کے کنارے پر اپنی ہتھیلی کھول کر رکھ دیتا ہے اور شبنم اس پر بستہ سے اپنا ہاتھ جما دیتی ہے۔ اللہ اللہ خیر صلا، شات ختم اور ہم بدھوؤں کی طرح لوٹ کر اپنے گھر یعنی ڈھا کا واپس آ گئے۔

اللہ اللہ کر کے فلم کی شوٹنگ ختم ہوئی۔ اس کے بعد ہم نے اسے ایڈٹ کرایا اور پھر بڑے فخر یہ انداز میں اسے فلم سنسر بورڈ کے سامنے پیش کرنے لاہور پہنچ گئے مگر ہائے رے قسمت۔ انہوں نے فلم دیکھ کر اسے پاس کرنے سے انکار کر دیا۔ وجہ یہ کہ ایک سین جس میں شہزادی تاج کا ڈانس دکھایا گیا تھا اس میں اس کا زیریں لباس گھنٹوں سے ذرا اوپر تھا۔ ان کے اعتراض کی معقول وجہ تو یہ ہو سکتی تھی مگر سنسر

اپنی قومی ایئر لائن کا اپنا مزاج ہے۔ اس ایئر لائن میں برسوں خدمت انجام دینے والے ایک افسر کے شب و روز کی لفظی تصویر کہ وہ کس طرح اور کن کن مراحل سے گزرا۔ کہنے کو یہ زندگی نامہ کی جھلک ہے مگر اپنے اندر بہت کچھ مخفی رکھتا ہے۔

باذوق قارئین کے لیے توشہ خاص

معلومات کو ایک ساتھ ملا کر دو ڈنڈیوں کی بجائے ایک ڈنڈی میں تبدیل کر دیتی ہیں جو V بار کہلاتی ہے اس کی شکل الے (A) سے ملتی ہے۔ سعودیہ کے تمام جہازوں کے V ADI بار کے تحت کام کرتے تھے۔ A-300 میں بھی سعودیہ یہی چاہتی تھی مگر اربس اس کے خلاف تھی۔ اس پر گرما گرم بحث ہو رہی تھی کہ اسی دوران میں زیادہ اہم مسئلہ نکل آیا۔ رات کے کھانے کا۔ جب ہوٹل کا مقام طے ہو گیا تو ہوٹل جانے کا وقت ہو چکا تھا۔ صدر دروازے پر ڈرائیور میرا منتظر تھا۔ ”پنا گیر کے بچے“ کے لیے پھر عزت افزائی کا موقع تھا۔ ڈرائیور نے اپنے معزز مہمان کو ہوٹل چھوڑا اور اطلاع دی کہ معزز مہمان کو رات کے کھانے کے لیے یہی ڈرائیور آٹھ بجے آکر لے جائے گا۔ معزز مہمان رات آٹھ بجے ہوٹل کی لابی میں ڈرائیور کا منتظر تھا۔ رات کا کھانا انہی مراحل سے گزرا جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ رات ایک بجے معزز مہمان کو ہوٹل واپس پہنچا دیا گیا۔ رات سونے سے پہلے میں نے وقت کے سود و زیاں کا حساب لگایا جو کچھ اس طرح تھا۔

چائے۔ ڈیڑھ گھنٹا
کھانا دوپہر۔ دو گھنٹے
کھانا رات۔ پانچ گھنٹے
کام۔ ڈھائی گھنٹے

ہوٹل کا انتخاب رنجیت نے خود کیا تھا۔ ہم وہاں پہنچ گئے۔ مجھے اعتراف ہے کہ فرانس کا کھانا بے انتہا لذیذ ہوتا ہے۔ دنیا بھر کے کھانوں میں اس کا ثانی مشکل سے ملے گا مگر میرے لیے فریج کھانا آرڈر کرنے میں تین مشکلات پیش آتی ہیں۔ پہلی مشکل ہے زبان۔ ظاہر ہے کہ ہر کھانے کا نام فریج میں ہوتا ہے پھر یہ کہ کھانے میں خنزیر کا کوئی جزء نہ ہو اور سب سے آخر میں یہ کہ اس کے پکانے میں کسی قسم کی شراب استعمال نہ کی گئی ہو۔ یہ سب سے مشکل مرحلہ ہے اس لیے کہ فریج کھانوں کے پکانے میں زیادہ تر کسی نہ کسی طرح کی شراب استعمال ہوتی ہے ان تمام کا مشکل کشا رنجیت کی شکل میں موجود تھا۔ کھانا کھا کر ہم دو گھنٹے بعد واپس کانفرنس روم میں پہنچے۔ تین بجے والے تھے۔ آدھے گھنٹے کام کرنے کے بعد سب لوگ تھک چکے تھے۔ چائے کا دور چلنا لازمی تھا۔ چائے کے بعد آدھے گھنٹے پھر کام ہوا اور اس کے بعد وہی اہم مسئلہ کہ رات کا کھانا کہاں کھایا جائے۔

آج ہم نے جن جن ٹیکنیکل معاملات پر بحث کی تھی اس میں سب کے تشفی بخش جوابات مل چکے تھے سوائے ایک کے۔ جہاز میں ایک انسٹرومنٹ ہوتا ہے جو ADI کہلاتا ہے اس میں دو ڈنڈیاں سی ہوتی ہیں۔ ایک جہاز کا رخ بتاتی ہے۔ دوسری یہ بتاتی ہے کہ جہاز مقررہ بلندی سے اوپر یا نیچے تو نہیں جا رہا ہے۔ بعض انزلسٹران دونوں ڈنڈیوں کی



ہم لوگوں کو اپنے ڈائمنگ روم میں لے گئے۔ فریج کھانا ہمیشہ کی طرح لذیذ تھا۔ میں نے پہلی دفعہ انچودی مچھلی کو تیل میں اچار کی طرح بنا ہوا کھایا۔ پہلی دفعہ والا کھانا پھر کھل چکا تھا۔ ایک کا اضافہ کر دیا۔

بوعدو سے تولوس۔ تولوس میں اربس کے منگر سے ہوٹل۔ آج کا کام ختم۔ لیکن انچودی کا مزہ ہنوز باقی تھا۔

چند دن بعد ایک دفعہ پھر سے تولوس کے سفر کا مرحلہ درپیش تھا۔ اس دفعہ فلائٹ آپریشنز کے کچھ معاملات نمٹانے تھے۔ سعودیہ کے کیپٹن عبدالرؤف میرے ساتھ تھے۔ کیپٹن عبدالرؤف کا خاندان ہندوستان سے تعلق رکھتا تھا۔ تقسیم کے بعد یہ لوگ پاکستان آئے مگر چند سال بعد سعودی عرب جا کر وہاں بس گئے۔ کیپٹن عبدالرؤف اب سعودی شہری تھے۔ ہندوستان پاکستان کے ناطے ان سے میری اچھی دوستی ہو چکی تھی۔

پہلے ہم کو سعودیہ کی پرواز سے جدہ سے پیرس جانا تھا۔ ہم دونوں فرسٹ کلاس میں سفر کر رہے تھے۔ کھانے کا دور ختم ہو چکا تھا اب اسکرین پر فلم دکھائی جانے والی تھی۔ ہوسٹس اس کی تیاری میں مصروف تھی۔ ہیڈ سیٹ تقسیم کر رہی تھی۔ ہمارے پاس آئی تو کیپٹن عبدالرؤف نے دو ٹکیوں کی فرمائش کی۔ نیچے آگئے تو ان کو اپنی سیٹ پر جما کر ان پر براہمان ہو گئے۔ جب آرام سے بیٹھ گئے تو مجھ سے مخاطب ہوئے۔ ”سامنے والی سیٹ کی پشت میری آنکھوں کے آگے آتی ہے۔ میں ٹھیک سے اسکرین کو نہیں دیکھ سکتا۔ اس لیے نیچے استعمال کرتا ہوں۔“ کیپٹن عبدالرؤف کا قد بہت چھوٹا تھا اگر ایک آدھ انچ اور پستہ قد ہوتے تو پائلٹ نہ بن سکتے تھے۔ اپنے قد سے متعلق کیپٹن نے ایک واقعہ سنایا۔

”میں ایک فلائٹ کی تیاری کر رہا تھا۔ جہاز میں اپنی سیٹ پر بیٹھا تھا۔“ پائلٹ کا کپڑے کی اٹھ ہاتھ والی سیٹ پر بیٹھا ہے۔ کو پائلٹ دائیں ہاتھ والی سیٹ پر۔ جٹ دے سے داخل ہونے والے مسافر کپتان کو دیکھ سکتے ہیں۔ کیپٹن عبدالرؤف نے سلسلہ کام جاری رکھا۔

”ایک معمر خاتون جب جہاز میں داخل ہوئیں تو انہوں نے مجھے کپتان کی سیٹ پر بیٹھے دیکھ لیا۔ ہوسٹس سے پوچھا۔“ کیا یہ لڑکا جہاز اڑائے گا۔“
قد کے ساتھ ساتھ کیپٹن عبدالرؤف عمر چور بھی تھے اپنی عمر سے دس سال کم دکھائی دیتے تھے۔

جب ہوسٹس نے اثبات میں جواب دیا تو وہ خاتون

دیکھو یہ میرے خواب تھے دیکھو یہ میرے زخم ہیں میں نے تو سب حساب جاں بر سر عام رکھ دیا میرا پروگرام تو لوس میں صرف ایک دن گزارنے کا تھا۔ اب مجھے ایک دن اور بڑھانا پڑے گا۔ اگلے روز بھی وقت ان تقسیم کچھ اسی طرح رہی سارے معاملات حل ہو گئے سوائے 7 بار کے۔ رات کھانا کھا کر ہوٹل پہنچا تو وہی ایک بجے کا وقت تھا۔ کل صبح مجھے پیرس اور پھر رات میں پیرس سے جدہ کے لیے روانہ ہونا تھا۔

جدہ پرواز کے دوران میں، میں سوچتا رہا کہ میں کرٹ کو ایک فالٹو دن کا کیا حساب دوں گا۔ جرمن ذہن صرف کام کی سوچتا ہے۔ کھانے کے لیے اس کے پاس اتنا فالٹو وقت کہاں۔ کل کی کل دیکھی جائے گی۔ اس وقت نیند زیادہ پرکشش ہے۔

نیند نشتے بعد میں دوپہر تولوس میں کرٹ اور دوسرے لوگوں کے ہمراہ موجود تھا۔ A-300 کی 7 بار کا مسئلہ حل کرنے ہم لوگوں کو اربس کے کسٹمر انجینئر کے ہمراہ تھامسن CSF کی تنصیبات پر جانا تھا۔ تھامسن کا دفتر بوعدو شہر میں تھا جو تولوس کے شمال مغرب میں ڈھائی سو کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ یہ سفر اربس کے دو سینا جہازوں میں طے کیا گیا۔ تولوس سے بوعدو چند منٹ کا سفر تھا۔

تھامسن کی تنصیبات پر پہنچے تو لگتا تھا کہ جیسے کسی کارخانہ یا کاروباری مرکز میں نہیں بلکہ کسی پکنگ اسپاٹ پر اترے ہیں۔ ہر طرف ہریالی پھرتی، پودے اور پھول۔ مجھے یہ جگہ دیکھ کر ایک اور کارخانہ یاد آ گیا۔ جہاں میرا چند ماہ پیشتر ہی جانا ہوا تھا۔ یہ کارخانہ اٹھس انڈسٹریز کا تھا۔ یہ کارخانہ اونچی نیچی پہاڑیوں کے درمیان انگلستان کے شہر چلٹنہیم میں واقع ہے۔ A-300 کے لیے سعودیہ نے اٹھس کا فلائٹ مینجمنٹ سسٹم (FMS) منتخب کیا تھا۔ میں اسی کے سلسلے میں چلٹنہیم گیا تھا۔ اٹھس کا یہ کارخانہ دوسری جنگ عظیم کے دوران میں بنایا گیا تھا۔ یہاں لڑائی میں استعمال کیا جانے والا سامان بنایا جاتا تھا۔ کارخانے کے لیے یہ جگہ دانستہ چنی گئی تھی تاکہ ہٹلر کی فوجوں کے حملے سے بچا جاسکے۔ جرمن فوجوں کو یہ گمان کرنا مشکل تھا کہ جنگی استعمال کے سامان بنانے کا یہ کارخانہ کسی صنعتی علاقے کی بجائے ایسے پر نضا مقام پر بنایا جائے گا اور اونچی نیچی پہاڑیوں کے درمیان چھپا ہوا ہوگا۔

کاروباری گفتگو کے بعد حسب دستور تھامسن والے

واپس لاؤنج میں چلی گئیں۔ فلائٹ پر باوجود تمام یقین دہانیوں کے جانے سے اڑا کر دیا۔ فلم ختم ہو چکی تھی۔ جہاز پیرس ایئرپورٹ پر لینڈنگ کے لیے اتر رہا تھا۔ ہم نے سیٹ بیلٹ باندھ لیے۔

پیرس ہمارا مستقر نہیں تھا۔ دو گھنٹے بعد ہم لوگوں کو دوسری پرواز سے تولوں جانا تھا۔ کیپٹن عبدالرؤف پہلی دفعہ تولوں آئے تھے۔ میں اب تولوں کا مستقل زائر بن چکا تھا۔ ان کو تولوں گھمانا پھرانا میرا کام تھا مگر اس وقت شام ہو چلی تھی۔ کہیں جانے کا وقت نہیں تھا۔ ہم لوگوں نے نہر کے کنارے ٹہلنے پر اکتفا کیا۔ رات کھانے کے لیے ہم اسٹیک کے ریستورنٹ چلے گئے۔ اس جگہ صرف اسٹیک ملتے ہیں، اس اسٹیک ہاؤس کی خاص بات اس کا بتایا ہوا ساس ہے جو ان کی اپنی ترکیب سے بنایا جاتا ہے اور اسٹیک کے ذائقے کو دوبالا کر دیتا ہے۔ اتنا لذیذ اسٹیک۔ ساس میں نے اور کہیں نہیں کھایا۔

اگلے روز ناشتا ختم کرنے کے بعد ہم لوگ لابی میں اتر بس کی بھیجی ہوئی سواری کا انتظار کر رہے تھے کہ اچانک آواز آئی۔ بوں ٹور موسیو درزا کی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ تو موسیو ایٹلاں کا مسکراتا ہوا چہرہ دکھائی دیا۔ موسیو ایٹلاں کو سراغ رساں ہونا چاہیے تھا مگر شومی قسمت سے وہ سیلز مین بن گئے تھے۔ ان کی کمپنی A-300 اور A-310 کے لیے کاک پیٹ انٹرومنٹ بناتی تھی جو وہ سعودیہ کو بیچنا چاہتے تھے۔ شاید انہوں نے اتر بس کسٹمر سپورٹ میں جان پہچان بنا لی تھی اس لیے کہ جب کبھی میرا تولوں جانا ہوتا تو وہ ایئرپورٹ پر موجود ہوتے حالانکہ ان کا دفتر پیرس میں تھا۔ میں نے ان سے ہاتھ ملایا۔ انہوں نے دعوت دے دی۔ ”آج رات کا کھانا آپ اور کیپٹن رؤف میرے ساتھ کھائیں۔“

”ہم معذرت چاہتے ہیں اس لیے کہ ہم لوگ آج شام ہی پیرس چلے جائیں گے۔“ موسیو ایٹلاں کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ ”کوئی بات نہیں ہم رات کا کھانا ایک ساتھ پیرس میں کھا سکتے ہیں۔ آپ کس فلائٹ سے واپس جا رہے ہیں۔ میں بھی اپنی پیرس کی بکنگ کروالوں۔“ میں نے ان کو فلائٹ کی تفصیل بتا دی۔

”ارے یہ کیسا اتفاق ہے۔“ موسیو ایٹلاں نے حیرت زدہ ہوتے ہوئے کہا۔

”میری سیٹ تو پہلے سے ہی اسی فلائٹ پر بک

ہے۔“

یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں تھا۔ یہ حرکت موسیو ایٹلاں پہلے بھی کر چکے تھے۔ وہ اتر بس کے دفتر سے ہمارا پروگرام معلوم کر کے اسی فلائٹ میں پہلے بھی اپنی سیٹ بک کروا چکے تھے۔ جس فلائٹ سے ہم لوگ سفر کر رہے تھے۔ CIA کو ان کی خدمات حاصل کر لینی چاہیے تھیں۔

پیرس ایئرپورٹ پر موسیو ایٹلاں نے کہا۔ ”اتفاق سے میں نے“ لے کا ٹکریس“ میں پہلے ہی سے ایک میز بک کر دیا رکھی ہے آپ دونوں نو بجے تک وہاں پہنچ جائیں۔“ یہ دوسرا اتفاق تھا۔

لیکن پیرس پہنچ کر اس دوسرے اتفاق کا فائدہ اٹھانے سے پہلے ہم لوگوں کو بلاناک میں اتر بس کے دفتر پہنچ کر وہ کام مکمل کرنے تھے جن کے لیے ہم تولوں آئے تھے۔ اتر بس کا ڈرائیو گاڑی لے کر آچکا تھا ہم لوگ گاڑی میں بیٹھ کر بلاناک کے لیے روانہ ہو گئے۔

اتر بس کے کانفرنس روم میں چائے کافی کا حسب معمول زبردست اہتمام تھا۔ اتر بس کے کسٹمر مینیجر فلی پروسٹ نے پوچھا۔ ”موسیو رضا کی چائے یا کافی؟“ میں نے جواب دیا۔ ”نہ چائے نہ کافی۔ آج صرف کام۔“

فلی کے نزدیک بڑی بے عزتی کی بات تھی کہ میں نے چائے کی پیالی ٹھکرادی تھی۔ میں نے وضاحت کی۔ فلی میں چائے ضرور پیوں گا۔ میں تمہارے ساتھ صرف کھلوڑا کر رہا تھا۔ دراصل کیپٹن رؤف کو پرسوں فلائٹ بر جانا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم فلائٹ آپریشن سے متعلق تمام کام آج نمٹا کر کل واپس جدہ روانہ ہو جائیں۔ ورنہ کیپٹن رؤف اپنی فلائٹ نہیں لے جاسکیں گے۔

”اوہ یہ بات ہے۔“ فلی کی مسکراہٹ دوبارہ واپس آگئی مگر زیادہ دیر کے لیے نہیں۔ میں نے اپنی بات مکمل کی۔ ”میرے خیال سے آج ہم لنچ کے دوران میں بھی کام کریں گے کیا یہ ممکن ہے کہ ریستورنٹ جانے کی بجائے یہیں کچ کر لیں۔“

میں نے اتر بس کی ٹیم کے دو گھنٹے کے لنچ کے پروگرام برپائی پھیر دیا تھا۔ بے دلی سے جواب ملا۔ ”ٹھیک ہے ہم لنچ باکس کا آرڈر دے دیں گے۔“

چار بجے کے لگ بھگ ہماری میننگ ختم ہوئی تو فلی نے کہا۔ ”موسیو رضا کی اب ہم میٹینس ٹریننگ سیمولیشن دیکھنے چلتے ہیں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا مگر کیپٹن

رڈف۔ کچھ اور ہی پروگرام بنائے بیٹھے تھے۔ انہوں نے مجھے اردو میں مخاطب کیا۔ ”آپ سیمولینر بعد میں دیکھ لیجئے گا۔ مجھے دوبارہ تو لوں آنے کا موقع ملے یا نہ ملے۔ میں چاہتا ہوں کہ بیٹنگ میں جو جہاز بن رہا ہے اس کا کاک پٹ دیکھوں۔“ جہاز کے کپتان شاید خواب میں بھی صرف کاک پٹ بنا دیکھتے ہوں گے۔ کیا یہ ممکن ہے؟ میں نے فلی سے پوچھا۔ فلی نے جواب دیا۔ ”اگر کپتان کی یہی خواہش ہے تو ضرور پوری ہوگی۔ ہم دونوں فلی کے ساتھ اسمبلی بیٹنگ روانہ ہو گئے۔ جہاں ائرفرانس کے لیے جہاز تکمیل کے آخری مراحل میں تھا۔

کاک پٹ میں داخل ہوئے تو مجھے بڑی حیرت ہوئی۔ اشار بورڈ یعنی جہاز کی دائیں سائیڈ پر فلائٹ انجینئر کی پینل مٹی ہوئی تھی۔

جہاز کا سامنے کا رخ فارورڈ کہلاتا ہے۔ پچھلا رخ آفٹ (ایاں رخ اشار بورڈ اور بایاں رخ پورٹ کہلاتا ہے۔ فلائٹ انجینئر کی پینل اشار بورڈ رخ پر ہوتی ہے لیکن نئے A-300/A-310 میں فلائٹ انجینئر پینل کا کیا کام؟ اس میں تو فلائٹ انجینئر کا وجود ہی نہیں ہے۔ یہ تو FFCC ہے فارورڈ فیوگ کرڈ کاک پٹ یعنی اس کا کاک پٹ کا عملہ صرف پاکٹ اور کو پاکٹ پر مشتمل ہے جن کا رخ سامنے کی طرف ہوتا ہے۔ فلائٹ انجینئر، جس کا رخ دائیں جانب ہوا کرتا تھا نئے A-300 میں اس کی ضرورت کو ختم کر دیا گیا تھا۔ پھر اس جہاز میں فلائٹ انجینئر پینل چہ معنی؟ فلی نے اس کی وضاحت کی۔

دراصل یہ جہاز ائرفرانس کے لیے بنایا جا رہا ہے۔ ان کی یونین بہت طاقت ور ہے۔ اس لیے ہم کو خاص طور سے ان کے جہازوں میں فلائٹ انجینئر کی پینل بنانا پڑا۔ اس سے ہمارے جہاز کے ڈیزائن پر بھی بہت اثر پڑا اس لیے کہ ہم کو پاکٹ کی پینل سے چند چیزیں نکال کر یہ نئی پینل بنانا پڑا۔ ائرفرانس نے اس تبدیلی کی بھاری قیمت ادا کی ہے۔ وہ اپنی یونین کے آگے بے بس ہیں۔

جہاز میں صرف اس کے رخوں..... فارورڈ آفٹ وغیرہ کا ہی نہیں بلکہ اس کی باہر لگی ہوئی لائٹوں کا بھی اپنا ایک مقررہ ضابطہ ہے۔ جس سے انحراف نہیں کیا جاسکتا۔ جہاز کے پروں کے سروں ونگ ٹپ پر نیویگیشن لائٹیں لگی ہوتی ہیں۔ پورٹ طرف والی لائٹ سرخ رنگ کی ہوتی ہے جب کہ اشار بورڈ رخ والی لائٹ ہرے رنگ کی ہوتی ہے اگر

زمین پر رات کے وقت ایک سے زیادہ جہاز ہوں تو پاکٹ اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ اس کی سمت آرہے ہیں یا دوسری سمت جا رہے ہیں۔ یہ لائٹیں حق راہ داری (Right of way) کے لیے بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ جہاز کی دم کے بالکل آخری سرے پر سفید لائٹ لگی ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ جہاز میں بیکن یا اسٹروپ لائٹ۔ ٹیکسی لائٹ اور لینڈنگ لائٹیں بھی لگی ہوتی ہیں جو جہاز کے اترنے اور رن وے پر ٹیکسی کرنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ جس وقت جہاز کے انجن اشارٹ کرنے ہوتے ہیں۔ اس وقت بیکن لائٹ جلا دی جاتی ہے تاکہ زمینی عملہ کو معلوم ہو جائے کہ اب انجن اشارٹ ہوں گے اور جہاز حرکت میں آئے گا۔ بیکن لائٹ پرواز کے پورے دورانہ میں چلتی رہتی ہیں۔ یہ وہ لائٹیں ہیں جو جہاز کی چھت پر اور فیوز لاج کے نچلے حصے میں لگی ہوتی ہیں۔

کیپٹن عبدالرؤف کی کاک پٹ دیکھنے کی لگن بے جا نہیں تھی۔ یہ روایتی کاک پٹ نہیں تھا۔ ڈیجیٹل ایوی اٹکس کے استعمال کی وجہ سے کاک پٹ میں لگے ہوئے اہم انشرومنٹ اب میکینیکل نہیں رہے تھے ان کی جگہ CRT کیسٹوڈ رے ٹیوب استعمال کیے جا رہے تھے۔ CRT کی سب سے عام مثال TV سیٹ کی اسکرین ہے۔ جہاز کے ان انشرومنٹ کو چھوٹی سی TV اسکرین کی طرح تصور کریں کہ جن پر انشرومنٹ کا عکس تصویر کی صورت میں ظاہر ہوتا۔ کل ملا کر ایسی چھ اسکرین استعمال کی گئی تھیں چونکہ یہ تمام اسکرین شیشے کی تھی ان میں کوئی میکینیکل پرزہ شامل نہیں تھا یہ کاک پٹ گلاس کا کپٹ کہلاتی۔

ائربس نے ایک اور جدت پیدا کی تھی جہاز کے فلائٹ کنٹرول کے سگنل بجلی کے تاروں کے ذریعے بھیجنا۔ فلائٹ کنٹرول جہاز کے وہ پارٹ ہیں جو جہاز کو اوپر اٹھانے نیچے لانے اور دائیں بائیں موڑنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اب تک یہ کام کنٹرول اسٹک کے ذریعے لیا جاتا تھا۔ کنٹرول اسٹک ایک ادھ کئے گاڑی کے اسٹیرنگ وینل کی طرح ہوتی ہے جو پاکٹ اور کو پاکٹ کی سیٹوں کے آگے لگی ہوتی ہیں۔ بجلی کے استعمال کے باعث اب کنٹرول اسٹک کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ یہ کام اب ایک جوائے اسٹک سے لیا جاتا تھا ویسی ہی جوائے اسٹک جو کمپیوٹر گیم کھیلنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے۔

کیپٹن رڈف آپ کو مزید تکنیکی تفصیلات سے نہیں

موسیقی کا بندوبست تھا پہلے ڈانس میوزک اپنے عروج پر تھا سب کا خیال تھا کہ ابھی پردہ اٹھے گا اور تھر کتی ہوئی بیلے ڈانس اسٹیج پر نمودار ہوگی۔ سب کا خیال غلط نکلا، نان کھانے پر ٹوٹی۔ دل ہی دل میں سب نے RJ کو اپنے مقدور بھر برا بھلا کہا۔ حالانکہ زبان سے سب RJ کا شکریہ ادا کر رہے تھے۔

دو دن بعد میٹنگ ختم ہوئی تو اس کے منٹس آف میٹنگ لکھنے کی ذمہ داری سعودیہ کو سونپی گئی۔ میں نے اور کرٹ نے ہوٹل آکر منٹس لکھے۔ اس میٹنگ میں تین چار اہم باتوں پر اتفاق ہوا تھا۔

1- سعودیہ اور RJ دونوں کے پاس L-1011 جہاز تھے۔ جن کے مواصفات 90 فیصد ایک جیسے تھے۔ ان کو ملا کر ایک مکمل مواصفات بنایا جائے جو دوسری ائر لائن استعمال کر سکیں۔

2- آئندہ جہازوں کی خریداری مشترکہ طور پر کی جائے تاکہ زیادہ جہازوں کی خریداری کے سبب بہتر سودے ہو سکیں۔

3- شریک ائر لائنز اپنا کام باہر بھیجنے کی بجائے ایک دوسرے کے مینگر اور مہارت استعمال کریں۔ وغیرہ وغیرہ۔ جب منٹس کی لکھائی ہو چکی تو میں نے کرٹ سے کہا کہ اس میں ایک جز کا اضافہ کر دیں۔ کرٹ نے پوچھا ”کیا“ تو میں نے جواب دیا۔ یہ لکھ دیں کہ تمام شریک ائر لائنز نے رائل چارڈیس کی روایتی عرب میزبانی کو بہت سراہا۔

کرٹ نے ٹھٹھہ لگایا پھر قلم میز پر رکھ کر اپنے مخصوص انداز میں سینک کی ایک ڈنڈی کو اپنے ہونٹوں میں دبایا اور کہا ”حسن تم مجھ سے بھی بڑے گولی باز ہو۔“ پھر یہ جملہ منٹس میں بڑھا دیا۔ گولی باز والا جملہ نہیں مہمان نوازی والا۔ رات کھانا کھانے کے بعد جب کرٹ منٹس تمام شرکاء کو سناتے ہوئے روایتی عرب مہمان نوازی پر پہنچے تو کرا تالیوں سے گونج اٹھا۔

اگلے ایک سال AATC کے اجتماع کا سلسلہ جاری رہا۔ سعودیہ میں تبدیلی آئی کہ شرعی سعودیہ سے باہر ہو چکے تھے امین الشوری دوبارہ جنرل مینیجر انجینئرنگ کے عہدے پر فائز تھے۔ AATC کی اگلی میٹنگ تیونس میں تھی۔ مجھے اور امین کو اس میں شرکت کرنا تھا۔ سعودیہ کے جنرل مینیجر پلاننگ پہلے ہی تیونس جا چکے تھے۔

دہلائیں گے۔ ان کا کاک پٹ کا معائنہ ختم ہو چکا ہے۔ ہم لوگ جہاز سے باہر آچکے ہیں۔ ہمارا رخ ائر پورٹ کی طرف ہے جہاں سے ہم کو بیس کے لیے روانہ ہونا ہے۔ میرے خیال میں آپ جان گئے ہوں گے یا ہوں گی کہ تو لوں ائر پورٹ پر کون ہمارا منتظر تھا۔ جی ہاں آپ ٹھیک سمجھے ا سمجھیں۔ موسیو اے ملاں۔ انہوں نے مسکرا کر ہمارا استقبال کیا۔ فلائٹ کی اڑان کا اعلان ہو چکا تھا۔ ہم لوگوں نے جلدی جلدی اپنے بورڈنگ کارڈ لیے اور جہاز کا رخ کیا۔ دو ہفتے بعد مجھے ایک بار پھر سے تو لوں آنا ہوگا۔

ایر بس کی اس میٹنگ میں سعودیہ کے ساتھ ساتھ کویت ائرویز کے ارکان بھی شامل ہوں گے کویت ائرویز نے ایربس کے A-310 کے طیارے خریدے تھے۔ A-300-600 اور A-310 بہت سے سسٹم وغیرہ مشترک تھے اگر دو یا زیادہ ائر لائنز ساتھ مل کر مذاکرات کریں تو کامیابی کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ سعودیہ اور کویت ائرویز دونوں AATC کے رکن تھے۔ دونوں نے تقریباً ایک ساتھ ایربس کے جہاز خریدے تھے۔ دونوں ائر لائنز ایک ساتھ مل کر مذاکرات سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکتی تھیں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب ہم لوگوں نے A-300 کا کام ابھی شروع ہی کیا تھا۔ دنیا نے عرب کی چند ائر لائنز نے فنی اشتراک کے لیے ایک جماعت بنائی جس کا نام عرب ائر لائنز میکنیکل کنسورٹیم (AATC) رکھا گیا۔ اس میں آٹھ ائر لائنز شامل تھیں۔ سعودیہ، گلف ایر، کویت ائرویز، ڈل ایسٹ ائر لائنز، رائل چارڈیس، تیونس ایر اور رائل ائرموراک۔

اس سے پہلے یورپ کی پانچ ائر لائنز نے ایسی ہی ایک تنظیم قائم کر رکھی تھی جو ATLAS گروپ کہلاتی تھی۔ AATC کچھ انہی خطوط پر قائم کی گئی تھی گو کہ AATC کے عزائم کا دائرہ ATLAS سے وسیع تر تھا۔

AATC کی پہلی میٹنگ میں، میں شریک نہ تھا۔ دوسری میٹنگ اردن کے شہر عمان میں تھی۔ سعودیہ کی نیم میں شرعی، کرٹ اور میں شامل تھا۔ اس میٹنگ کا بنیادی مقصد مستقبل کا دائرہ عمل ترتیب دینا تھا۔

دو پہر کھانے کے لیے میزبان رائل چارڈیس ائر لائنز (RJ) نے ایک مقامی ہوٹل میں بندوبست کر رکھا تھا۔ رات کا کھانا ان کے اپنے کلب میں تھا۔ کھانے سے پہلے

گھنٹا دیا جاتا ہے کہ نہادھو کر تیار ہو جائیں۔ ہم کو ٹھیک ایک گھنٹے بعد رات کے کھانے پر جانا ہے۔“
اگر یہ کھانا صرف سعودیہ کے لیے ہوتا تو اس کو ٹالا جاسکتا تھا مگر یہاں تو پانچ چھ اور انٹرنیشنل کے مندوب بھی مدعو تھے۔

ڈیڑھ گھنٹے بعد ہم ہوٹل میں موجود تھے۔ لگتا تھا کہ ہوٹل کی عمارت پہلے رہائشی گھر کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ ایک بڑے احاطے کے اندر یہ ہوٹل تھا۔ ایک سے زیادہ کھانے کے کمرے تھے۔

ہال میں AATC کے علاوہ دس پندرہ لوگ اور ہوں گے۔ کھانے سے پہلے موسیقی کا پروگرام تھا۔ نیلی ڈاننگ کی موسیقی اپنے عروج پر پہنچی تو دو رقاصائیں ہال میں داخل ہوئیں۔ ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ ہال میں بیٹھی ہوئی دو تین لڑکیوں نے اپنی کمر کے گرد و پٹانما کپڑا باندھا اور رقاصوں کے ساتھ شریک ہو گئیں۔ ان کی مہارت رقاصوں کے لیے چیلنج تھی۔ افسر اور ماتحت کا فرق مٹ چکا تھا۔ امین اور جوئی نے تالیاں پیٹ پیٹ کر اور منہ منہ انگلیاں ڈال کر زوردار سیٹیاں بجا بجا کر دادی۔ پورے ہال میں سماں بندھا ہوا تھا۔ پھر رقص ختم گیا۔ کھانا آچکا تھا۔ ہوٹل واپس پہنچے تو رات کے تین بج رہے تھے۔

مینگ میں مزید امور کے ساتھ یہ بھی طے ہوا کہ سعودیہ اور تیونس ائیر کو انجن کی مرمت اور اوور ہالنگ overhoning میں تعاون کی ضرورت ہے۔ میں اور سعودیہ کے مینیجر پاور پلانٹ طارق قطب تیونس آکر اس معاملے کو آگے بڑھائیں گے مگر اس سے پہلے AATC کے تعاون کا ایک اور موقع نکل آیا۔

سعودیہ کے بیگنر میں فالٹو کام آ گیا تھا چند ماہ کے لیے ساٹھ ستر میکینکس کی ضرورت تھی۔ ڈل ایسٹ ائیر لائنز (MEA) کے حالات ان دنوں بہت خراب تھے۔ بیروت کا امن غارت ہو چکا تھا امن کی جگہ گولہ بارود نے لے لی تھی۔ MEA کے اپنے جہاز بیروت میں پارک نہ کیے جاسکتے تھے بیگنر میں کام نہ تھا۔ ان کے میکینک بے کار تھے۔ سعودیہ ان میکینکس کو استعمال کر سکتی تھی۔ سعودیہ کی ٹیم کے سربراہ جوئی صاحب تھے ان کے ساتھ میں اور MEA کے ایک سابقہ سپردا ز رڈ کرن۔ جو اب سعودیہ کے لیے کام کر رہے تھے۔ شامل تھے۔ بیروت جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ مینگ قبرص کے شہر لارناکہ میں رکھی گئی۔

سعودیہ کی تیونس کی پرواز پر 1011-L جہاز اڑتے تھے۔ بیج میں یہ پرواز لیبیا کے شہر تریپولی میں رکتی تھی۔ جہاز تریپولی ساتھ خیریت کے پہنچ گیا لیکن یہ خیریت زیادہ دیر قائم رہنے والی نہ تھی۔ ایک گھنٹا قیام کے بعد مسافروں کو تیونس جانے کے لیے دوبارہ سوار کرائے جانے کا اعلان ہونا چاہیے تھا جو نہ ہوا۔ آپ گھنٹا مزید گزر گیا تو امین نے سعودیہ کے گراؤنڈ انجینئر کو بلا لیا کیوں کہ ٹریفک کے لوگوں نے بتایا تھا کہ جہاز کی تاخیر فنی ترابی کی وجہ سے ہے۔

گراؤنڈ انجینئر نے بتایا کہ اسپارک پلگ میں جانے والی ہائی ٹینشن کیبل شارٹ ہو گئی ہے۔ تیونس اسٹیشن پر یہ کیبل موجود نہیں ہے اور نہ ہی فلائی اوے کٹ میں موجود ہوتی ہے۔ مزید یہ کہ تیونس میں 1011-L کے پرزوں کی پولنگ بھی نہیں ہے۔

اسپارک پلگ گاڑی کے پلگ کی طرح جہاز کے انجن اشارت کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔

فلائی اوے کٹ (FAK) وہ چند اہم پرزہ جات ہیں جن کی ایک جہاز کو ضرورت پڑ سکتی ہے۔ یہ پرزہ جات بکسوں میں بند کر کے جہاز کے ساتھ روانہ کیے جاتے ہیں تاکہ وقت ضرورت استعمال کیے جاسکیں۔

پولنگ وہ نظام ہے جس کے تحت ہر ائیر پورٹ پر مختلف انٹرنیشنل پرزہ جات کا ایک اٹور قائم کرتی ہیں اور وقت ضرورت ممبر ائیر لائن پول میں سے مختلف پرزہ جات چند دن کے لیے ادھار لے سکتی ہے تاکہ ان کا جہاز اگر اس اسٹیشن پر خراب ہو جائے تو وقتی طور پر اس کو قابل پرواز بنایا جاسکے۔ تریپولی کے اسٹیشن پر چونکہ سعودیہ کے عدادہ کسی اور ائیر لائن کا 1011-L جہاز نہیں اترتا تھا۔ وہاں 1011-L کا پول موجود نہ تھا۔ ایک اور ضروری بات۔ جہاز کی بعض خرابیاں ایسی ہوتی ہیں جن کا جہاز کی یا مسافروں کی حفاظت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ایسے نقص ہوں تو جہاز کو اڑایا جاسکتا ہے مگر ہائی ٹینشن کیبل خراب ہو تو جہاز نہیں اڑایا جاسکتا۔ یہ جہاز صرف اس صورت میں اڑ سکتا تھا کہ جدہ سے کیبل تیونس پہنچائی جائے۔

چھبیس گھنٹے ہم لوگوں نے سوتے جاگتے بیٹھے بیٹھے کسی نہ کسی طرح گزارے۔ اب سعودیہ کا امدادی طیارہ آچکا تھا جو ہم کو تیونس لے جائے گا۔

تیونس ائیر پورٹ پر ہمارے جنرل مینیجر پلاننگ جوئی صاحب موجود تھے۔ انہوں نے حکم دیا۔ آپ لوگوں کو ایک

ماہنامہ ستر گزشتہ

گیا۔ ورائڈ سے ساحل سمندر کا منظر دکھ لگتا تھا۔ کھانے کے لیے میزیں بھی ورائڈ سے ہی لگائی گئی تھیں۔ میں تھوڑی دیر سمندر کا منظر دیکھتا رہا۔ پھر بازار گھومنے نکل گیا۔ واپس آیا تو رات ہو چکی تھی کھانا کھا کر کمرے میں چلا گیا۔ کمرے میں گرمی ہو رہی تھی۔ پنکھا چلانا چاہا تو پنکھا کمرے میں تھا ہی نہیں۔ باہر سمندر کی ہوا چل رہی تھی گرمی کا پتا نہ چلتا تھا۔ کھڑکی کھولی کہ شاید ہوا اندر آئے تو کمر اٹھنا ہو جائے۔ کھڑکی میں سلاخیں عائب اور کھڑکی بالکل سڑک کے ساتھ کھلتی تھی۔ لوگ اس کمرے میں کیسے رہتے تھے معلوم نہیں ہوٹل والے سے شکایت کی تو پتا چلا کہ وہاں پنکھوں کا رواج نہیں ہے۔ دوسرا کوئی کمرہ بھی خالی نہ تھا۔ زندگی میں پہلی دفعہ میں ایک رات میں چھ دفعہ نہایا۔ دوسرے دن جزیرہ میکائوس جانا تھا۔

میکائوس کے ہوٹل میں کمرہ لینے سے پہلے میں نے اس سے پوچھا۔ ”آپ کے پاس کمروں میں پنکھے ہیں؟“ وہ کچھ حیران ہوا پھر جواب دیا۔ ”جی ہاں ہیں۔ مگر کیوں؟“ میں اس کو اس ”کیوں“ کا کیا جواب دیتا۔

سامان کمرے میں رکھ کر میں میٹھیوں سے نیچے آ رہا تھا کہ میں نے دیکھا کہ ایک لڑکی حیران پریشان نیچے والے فلور سے اوپر آ رہی تھی۔ جب ہم دونوں آمنے سامنے ہوئے تو اس نے کہا۔ ”میں بھٹک گئی ہوں مجھے باہر جانے کا راستہ نہیں مل رہا ہے کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟“ میرا دل چاہا کہ اس کو گود میں اٹھا کر تاجوں کے دنیا میں میرے علاوہ اور بھی لوگ ہیں جو میٹھیوں پر بھٹک سکتے ہیں۔ گود میں اٹھانے کا موقع تو نہ تھا میں نے باہر جانے والے راستے کی طرف اشارہ کر دیا دراصل وہ باہر کے راستے کے بجائے ہیمنٹ میں چلی گئی تھی۔

وہ باہر جانے والے راستے کی طرف بڑھی پھر پلٹ آئی۔ ”میں بھی کتنی بد تمیز ہوں کہ آپ کا شکر یہ بھی نہ ادا کیا۔ میرا نام جولی ہے۔“ ”حسن“ میں نے اپنا نام بتایا۔

”میں دراصل اپنے میاں کے ساتھ بیچ جا رہی تھی مگر اپنے ساتھ کچھ چیزیں لے جانا بھول گئی تھی۔ وہ لینے واپس آئی تو راستہ بھٹک گئی۔ اب میں جا رہی ہوں۔ میرا شوہر ناراض ہو گا کہ دیر ہو گئی۔ وہ بہت غصہ ور اور سخت مزاج ہے۔ کیا آپ بھی بیچ جا رہے ہیں؟“

”بعد میں۔ ابھی نہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ جولی چلی گئی۔

لا رتا کہ میں ساحل سمندر پر ایک جگہ ہے جو نکلے بیچ کھلتی ہے۔ یہاں پر ہم نے ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ کراہی ہوٹل ساٹھ ڈالر یومیہ۔ میٹنگ ہوٹل کے کانفرنس ہال میں ہوئی۔ دونوں فریق ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کے خواہش مند تھے تمام معاملات طے ہو گئے۔ کنٹریکٹ پر اگلی میٹنگ میں دستخط ہوں گے جو ایتھنز میں ہوگی۔

رات کا کھانا ہوٹل میں ہی تھا۔ کھانے کے بعد بیٹھے کی باری تھی۔ بیٹھے میں اور چیزوں کے علاوہ فلمیں بے بھی شامل تھا۔ یہ میں نے پہلی بار سنا تھا۔ پہلی بار والا کھانا ایک سے بڑھ گیا۔

فلمیں بے کیلے کی ایک لمبی پرت کاٹ کر اس کو بعض چیزوں میں ہلکا سا تل کر بنا یا جاتا ہے۔ جب یہ تیاری کو پہنچ جاتا ہے تو فرائی بین میں کوئی چیز چھڑکی جاتی ہے جس سے بین میں نیلا شعل اٹھتا ہے پھر فلمیں بے تیار۔ یہ تمام کارروائی مہمانوں کے سامنے کی جاتی ہے۔

میں فلمیں بے کھا رہا تھا اور ڈکرن میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے تو جواب ملا ”راز کی بات ہے بعد میں بتاؤں گا۔“ جیسے ہی میں نے فلمیں بے ختم کیا تو ڈکرن کی زبان کھل گئی۔ ”تم نے ابھی شراب کھائی ہے جس چیز سے فلمیں بے میں شعل اٹھا تھا وہ شراب تھی۔“

”تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا۔“ میں نے پوچھا جواب ملا ”مزہ کر کر اہو جاتا۔“

جدہ واپس آ کر میں کنٹریکٹ تیار کر چکا تھا۔ اس کو سعودیہ کے شعبہ قانون سے منظور بھی کروا چکا تھا۔ صرف میکیکنس کے ویزا کا مسئلہ تھا۔ اس کے حل ہونے کے بعد ایتھنز روانہ ہوئی تھی۔ کنٹریکٹ پر منگل کے دن دستخط ہو چکے تھے بدھ کا دن سفر میں شمار ہوتا۔ اس کے بعد جمعرات اور جمعہ کی چھٹی تھی۔ دفتر ہفتے کے دن پہنچنا تھا۔ میں یہ دو دن یونان میں گزارنے کا پروگرام بنا کر آیا تھا۔

کنٹریکٹ پر دوپہر کو دستخط ہو چکے تھے۔ میں سہ پہر کو ایتھنز کے نزدیک ایک جزیرہ ہڈرا پہلا گیا۔ ہڈرا جانے کے لیے ہوور کرافٹ کی سہولت موجود تھی۔ ہوور کرافٹ چونکہ براہ راست پانی پر نہیں چلتے ہیں بلکہ ہوا کی ایک تہ پر چلتے ہیں ان کی رفتار کشتی کے مقابلے میں بہت تیز ہوتی ہے یہ ہوور کرافٹ غالباً فلائنگ ڈولفن کے نام سے مشہور تھے۔

ہڈرا میں، میں سمندر کے کنارے ایک ہوٹل میں ٹھہر

بلا قیمت تھے۔ تیونس اتر نے جاری کیے تھے۔ اتر لائنز کاروبار کے سلسلے میں یہ بلا قیمت ٹکٹ ایک دوسرے کے ملازمین کو جاری کرتی رہتی ہیں ان کی وقعت ایسا ہی ہوتی ہے جیسی قیمت والے ٹکٹ کی ہوتی ہے۔ اس پر سفر کرنے والے مسافر کو آف لوڈ نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے ٹکٹ اکانومی کے تھے مگر تیونس اتر کے مینیجر ہم کو اتر پورٹ چھوڑنے آئے تھے۔ انہوں نے ہم لوگوں کو اپ گریڈ کر کے فرسٹ کلاس کے بورڈنگ کارڈ دلوائے تھے۔ اب گریڈ کیے ہوئے مسافر کو بھی آف لوڈ نہیں کیا جاسکتا اگر ایک بار بورڈنگ کارڈ جاری کر دیا جائے۔

جہاز کی پرواز میں آدھا گھنٹا باقی تھا۔ میں اور طارق باتوں میں مصروف تھے کہ ایک اسٹیورڈ ہمارے پاس آیا ہمارے ٹکٹ چیک کیے۔ قصہ مختصر یہ کہ اس نے اپنے اختیارات سے تجاوز کرتے ہوئے مجھے اور طارق کو جہاز سے اتار دیا۔ طارق نے اترنے کے بعد اسٹیورڈ کی شکایت کی اس کے خلاف کارروائی کی گئی وغیرہ وغیرہ۔ مگر اس سب کا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے تیونس کے دو اور ساحلی شہر حمامات اور سوی گھونسنے کا موقع مل گیا۔

تیونس کی میننگ کے بعد یہ لازمی ہو گیا تھا کہ JT8D کی مرمت کے اخراجات کا مزید جائزہ لیا جائے۔ جس کے لیے SABENA سے رابطہ قائم کیا گیا وہ لوگ جدہ آئے۔ بات مزید آگے بڑھانے کے لیے سعودیہ کی ٹیم کو SABENA کی انجن شاپ کا معائنہ کرنا تھا۔ اس کام کے لیے ہم لوگوں کو برسلز جانا پڑا۔ بات نہ بنی۔ سعودیہ کے انجن پرانی انجنسی کے پاس ہی جاتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد یہ کنٹریکٹ اتر کینیڈا کو مل گیا۔ اب مجھے ہر چھ مہینے بعد سہ ماہی جائزہ میننگ کے لیے مونٹریال جانا تھا۔ سعودیہ کے خرچے پر۔ وہاں سے نورنو جایا جاسکتا تھا۔ سعودیہ کے خرچے پر۔ AATC کو برقرار رکھنے کے لیے جس جذبے کی ضرورت تھی وہ موجود نہ تھا چند سال بعد AATC داستان پارینہ بن چکی تھی۔

AATC کے داستان پارینہ بننے میں ابھی چند سال باقی تھے آج AATC زندہ تھی۔ بھرپور طور پر سانس لے رہی تھی اور آج کی اربس کی میننگ AATC کے پرچم تلے ہی معتقد کی گئی تھی سعودیہ اور کویت اتریز آج ایک ساتھ مل کر اربس کا سامنا کر رہے تھے۔ یہ میننگ تین دن جاری رہی جس میں بہت سے امور زیر بحث آئے جن میں

میں نے شہر گھومنے کے بعد بیچ کا رخ کیا۔ وہاں داخل ہوا تو آواز آئی۔ ”حسن ہمارے پاس آ جاؤ۔“ یہ جولی کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا۔ ساتھ میں اس کا میاں تھا وہ دونوں مجھ سے کچھ فاصلے پر تھے۔ جولی جب ہوٹل میں ملی تھی تو وہ ایک ہلکے لالہ رنگ کے بہت عمدہ تراش کے ایزبوں تک کے گاؤن میں ملبوس تھی۔ اب یہ لوازمات غائب ہو چکے تھے۔ ”حسن خود بے تاب تھا جلوہ دکھانے کے لیے“ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

میں ان کی طرف بڑھ گیا۔ ”یہ میرا میاں ہے ڈیوڈ، تم یہاں بیٹھ جاؤ۔“ جولی نے اپنے میاں کا تعارف کروایا۔ میں نے ڈیوڈ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میرے ہاتھ کو نظر انداز کر کے اس نے جوں کو ڈانٹا۔ ”یہاں بھی دوست بنا لیے تم نے۔ منع کیا تھا تم کو۔“ پھر میری طرف خونخوار نظروں سے دیکھا۔ میں نے عاقبت اسی میں جانی کہ آگے بڑھ جاؤں مجھے اپنی ہڈیاں تڑوانے کا کوئی شوق نہ تھا۔

AATC کی تیونس والی میننگ میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ سعودیہ اور تیونس اتر انجن کی مرمت میں تعاون کریں گے۔ اس کی بنیادی وجہ بونگ B-737 کے انجن ماڈل JT8D کی مرمت کا خرچہ تھا۔

سعودیہ کے JT8D انجن ”لفٹ بنسا“ کے پاس اور ہال ہوتے تھے اور تیونس اتر کے ”سینا“ کے پاس۔ سعودیہ ان انجنوں کی مرمت کی جو قیمت ادا کرتی تھی وہ تیونس اتر کی قیمت سے زیادہ تھی۔ میں اور طارق قطب اس تھکی کو سلجھانے تیونس پہنچ گئے۔ تمام معاملات کا تفصیلی جائزہ لیا گیا اندازہ یہ ہوا کہ سعودیہ کے اور تیونس اتر کے جہاز جس ماحول میں اترتے ہیں اس میں بہت فرق ہے اور دونوں اتر لائنز کی پروازوں کے دورانیے میں بھی فرق ہے۔ سعودیہ کے انجن صرف سعودی عرب میں ہی اترتے تھے یہاں پر ریت اور مٹی ڈیش کی وجہ سے انجن کے بلیڈ جلدی خراب ہوتے تھے اس لیے ان کو جلد بدلنا پڑتا تھا۔ جو ایک بڑا خرچہ تھا۔

اس کے علاوہ سعودیہ کی داخلی پروازوں کا دورانیہ اوسطاً صرف ایک گھنٹا تھا۔ جس کی وجہ سے انجن کی طاقت ٹیک آف کے وقت زیادہ استعمال ہوتی جس کا انجن کی مرمت کی قیمت پر اثر پڑتا تھا۔ تیونس اتر کی پروازوں کا اوسط دورانیہ دو گھنٹے سے بھی زیادہ تھا اس لیے ان کا مرمت کا خرچہ کم تھا۔ تیسرے دن ہماری واپسی تھی۔ ہمارے ٹکٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہیں۔“

ارٹس نے اس کا قیمتاً بندوبست کر دیا۔
آج میٹنگ کا آخری دن تھا۔ ہم لوگ لُج سے فارغ
ہو کر واپس کانفرنس روم پہنچے تو تین بج رہے تھے۔ تین بجے
سب سے اہم کام چائے کا دور ہوتا ہے۔ چائے ختم کرنے
کے بعد ہم لوگ اس دورے کا آخری کام نمٹا سکتے ہیں۔
ٹریڈنگ سیمولیشن کا معائنہ۔

جہاز کی خریداری کے کنٹریکٹ میں کئی جز ہوتے
ہیں۔ ان میں سے ایک جز کسٹمر سپورٹ کہلاتا ہے۔ اس میں
ان تمام چیزوں کا معاہدہ ہوتا ہے جو جہاز ساز کمپنی ائیر لائن کو
مہیا کرے گی۔ ان چیزوں میں سے ایک چیز ہوتی ہے
ٹریڈنگ۔ یہ ٹریڈنگ فضائی عملہ اور زمینی عملہ دونوں کے لیے
ہوتی ہے۔ مکینک کی ٹریڈنگ کے لیے جو ساز و سامان دیا
جاتا ہے اس میں سسٹم ٹریڈز شامل ہوتے ہیں۔ یہ بڑے
بڑے بورڈ ہوتے ہیں جن میں مختلف سسٹم جیسے ہائیڈرالک،
الیکٹریکل وغیرہ کی تفصیل ہوتی ہے جس کی مدد سے مکینک
اس سسٹم کی کارکردگی کو سمجھ سکتا ہے۔ ائیرٹس کو سعودیہ کو ایسے
پانچ چھ سسٹم ٹریڈز دینے تھے۔

ان سسٹم ٹریڈز کی بجائے ائیرٹس نے ایک نئی جدت
پیدا کی تھی۔ انہوں نے جہاز کا ڈھانچا بنا کر اس کے کاک پٹ
میں وہ تمام چیزیں نصب کر دی تھیں جو جہاز میں اور کاک پٹ
میں ہوتی ہیں جس کی وجہ سے ٹریڈنگ میں بہت آسانی پیدا ہو
گئی۔ سیمولیشن simulator بہت کام کی چیز ثابت
ہوئی۔ سعودیہ اور کویت ائیر لائنوں نے ائیرٹس کا شکریہ ادا
کیا۔ میٹنگ ختم ہو چکی تھی مواصفات کے سارے مسائل حل ہو
چکے تھے۔ اب صرف BFE پر کام کرنا باقی تھا۔

یہاں یاد دہانی کرادوں کہ BFE وہ کمپوٹ ...
سسٹم ہوتے ہیں جن کی فراہمی ائیر لائن کے ذمہ ہوتی ہے۔
A-300-600 کی BFE کے انتخاب کے لیے کافی وقت
باقی تھا۔ B-747 کے لیے زیادہ وقت نہ ہونے کی وجہ سے
ہم B-747 کی BFE پر اتنی توجہ نہ دے سکے تھے۔

پندرہ بیس دنڈر تھے جن سے ہم کو مذاکرات کرنے
تھے۔

پروگرام یہ بنا کہ میں اور کرٹ دو ہفتے کے لیے پیرس
جائیں گے۔ تمام دنڈرز سے ہوٹل کے کانفرنس روم میں
ملاقات اور مذاکرات ہوں گے۔ ان مذاکرات میں صرف
تکنیکی امور پر بحث ہوں گے۔ کمرشل مذاکرات بعد میں

سے کچھ طے پا گئے۔ مجھ پر اتفاق نہیں ہوسکا۔
ایک اہم مسئلہ جہاز کی لینڈنگ کی ٹیکنیک کا تھا۔ ائیرٹس
نے جب جہاز کی اُروخت سے قبل مذاکرات کیے تھے تو
انہوں نے کہا تھا کہ جہاز آئیو لینڈنگ کے لیے سرٹیفائی کیا گیا
ہے لیکن جب مواصفات کا تفصیلی کام شروع ہوا تو ائیرٹس کا
موقف تھا کہ جہاز آئیو لینڈنگ کر سکتا ہے مگر اس سہولت کے لیے
سعودیہ کو مواصفات کی تبدیلی کے لیے چیئنج ریکوسٹ جاری
کرنی پڑے گی جس کی بھاری قیمت ہوگی۔ سعودیہ چیئنج
ریکوسٹ جاری کر۔ نے کو تیار تھی لیکن قیمت نہیں دینا چاہتی اس
لیے کہ سعودیہ کا خیال تھا کہ ائیرٹس نے جہاز نیچے وقت یہ چیز
واضح طور پر سعودیہ کو نہیں بتائی تھی بلکہ اس سہولت کو اس طرح
پیش کیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ آئیو لینڈنگ کی سہولت جہاز کی
قیمت میں شامل ہے۔ ائیرٹس کو سعودیہ اور کویت ائیر لائن کے
آگے ہارمانی پڑی۔

سعودیہ کی ائیرٹس سے ایک انوکھی فرمائش تھی۔ وہ
چاہتے تھے کہ کاک پٹ کے نیچے کا وہ حصہ جہاں ایویانکس
کے کمپیوٹرز وغیرہ نصب کیے جاتے ہیں وہاں پر ٹھنڈی ہوا کا
بندوبست کیا جائے۔ ائیرٹس والوں نے حیران ہوتے
ہوئے پوچھا۔ ”مگر وہاں پر آپ ٹھنڈی ہوا کا کیا کریں
گے؟“

خلیج کے ممالک میں ایک بہت بڑا مسئلہ ہے
گرمی..... بے توجہ شاگرمی۔ گرمی کا موسم جب اپنے عروج پر
ہوتا ہے تو ان ممالک میں کھلے میدان میں درجہ حرارت
پچاس ڈگری سینٹی گریڈ سے بھی تجاوز کر جاتا ہے۔ جہاز کے
اندر جہاں ایویانکس کی تنصیبات ہوتی ہیں۔ ہیٹ سوک کی
وجہ سے درجہ حرارت باہر کھڑے ہوئے جہاز میں ستر ڈگری
سینٹی گریڈ سے بھی تجاوز کر جاتا ہے جس کی وجہ سے ایویانکس
کے یونٹ کی کارکردگی متاثر ہوتی، ان میں سے اکثر کام کرنا
بھی چھوڑ سکتے ہیں۔ سعودیہ آزمانا چاہتی تھی کہ اگر ایویانکس
بے (Bay) میں ٹھنڈی ہوا کا بندوبست کیا جائے تو اس کا
کیا اثر ہوگا۔

”مگر ٹھنڈی ہوا کے ساتھ ساتھ نمی بھی آئے گی جس
سے کروٹن یعنی زنگ لگنے کا خطرہ بڑھ جائے گا۔“ ائیرٹس
نے جواب دیا۔

سعودیہ نے جواب دیا۔ ”ہم اس آزمائش کے لیے
تیار ہیں۔ جب تک ہم ٹھنڈی ہوا چھوڑیں گے نہیں ہم کو
معلوم نہیں ہوگا کہ اس کے منفعت بخش اور مضر اثرات کیا

ہوں گے۔

پیرس کا انتخاب اس لیے کیا گیا کہ اکثر و نڈر یورپ کے تھے گوکہ بعض و نڈر امریکا کے تھے اور حسب ضرورت تو لوں سے ائیر بس کے متعلقہ نمائندوں کو شرکت کے لیے بلایا جاسکتا تھا۔ کرٹ اور میں ہر و نڈر سے ملیں گے اور ہمارے دوسرے انجینئر صرف اپنے متعلقہ و نڈر سے ملیں گے۔ مثلاً کریم صرف ایویانکس کے و نڈر کی میٹنگ میں موجود ہوگا۔

میٹنگ کی تفصیل تکنیکی طور پر پیچیدہ اور غیر دلچسپ ہو گی۔ یہاں صرف طریقہ کار بتانا مقصود ہے۔ دن کے وقت ہم ایک و نڈر سے ملتے دوپہر کو وہ ہم لوگوں کو کھانے کے لیے لے جاتے۔ ہماری شرط صرف اتنی تھی کہ ڈیڑھ گھنٹے میں کھانے سے فراغت ہو جانی چاہیے۔ دن کی میٹنگ ہم نے زیادہ تر امریکی و نڈر کے ساتھ رکھی کہ ان کو ڈیڑھ گھنٹے میں کھانے کا وقفہ ختم ہو جانے پر کوئی ملال نہ ہوتا تھا۔ فرانسیسی و نڈر کی بات الگ تھی۔ ان سے ہم سہ پہر میں ملتے اور رات کے کھانے کے لیے ان کے ایئر ہوتے۔ اگر کسی دن اتفاق سے بارہ بجے سے پہلے فراغت حاصل ہو جائے تو شکر ادا کرتے لیکن یہ ناشکری ہوگی اگر یہ اعتراف نہ کیا جائے کہ ان دو ہفتوں میں جو بہترین نعمتیں کھانے کو ملیں وہ زندگی میں کسی اور دو ہفتے میں نہ ملیں۔

جدہ واپس پہنچے تو یہاں پانسہ پلٹا ہوا تھا۔ امین الشوریٰ شرعی کی جگہ براجمان تھے اور شرعی نہ صرف انجینئرنگ سے ہی بلکہ سعودیہ سے بھی باہر تھے۔ امین ذہانت کے اعتبار سے اور بحیثیت انجینئر شرعی سے بہتر تھے۔ مگر شرعی کے ساتھ میرے پچھلے ڈیڑھ دو سال بہت اچھے گزرے تھے۔ مجھے شرعی کے جانے کا دکھ ہوا۔ سعودیہ سے الگ ہونے کے باوجود میری اور شرعی کی دوستی مضبوطی سے قائم رہی۔ جب کبھی ہماری ملاقات دنیا کے کسی بھی کونے میں کسی کانفرنس یا دوسرے اجتماع میں ہوتی تو میں کم از کم ایک وقت کے کھانے پر ان کا مہمان ہوتا۔ وہ بڑے تھے میں چھوٹا۔ بڑے چھوٹوں کو کھلاتے ہیں۔ ان سے کھاتے نہیں شرعی عرب کے اس اصول پر سخت پابندی سے قائم تھے۔ شرعی دنیا میں وہ واحد آدمی ہیں جنہوں نے میرے پیچھے روزہ کھول کر مغرب کی نماز ادا کی۔ یہ حق انہوں نے اپنے چھوٹے کو خاص طور سے تفویض کیا تھا۔ میں ان کا شکر گزار ہوں۔

امین کے ساتھ شروع کا دور آزمائش کا دور تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں ایک تو یہ کہ امین کو دنیا کی ہر چیز کا منہ پہلوا جا کر کرنے میں جو ملکہ حاصل تھا وہ شاید دنیا میں کسی اور کو نہ تھا۔ دوسرے فلائیڈ امین کا منظور نظر تھا اور کرٹ سوتیلی اولاد۔ حالانکہ فلائیڈ نے امین کو ”زہریلا بوتلا“ کا خطاب دے رکھا تھا امین کا قد چھوٹا تھا۔

میں اور جیری کرٹ کے ماتحت تھے لہذا ہم دونوں سپنوں سے کسی طرح کم نہ تھے مگر جب امین کے ساتھ کئی سال کام کیا تو پتا چلا کہ امین سے بدتر دشمن کوئی نہیں اور اسی طرح امین سے بہتر اور پُر خلوص دوست کوئی نہیں۔

پیرس میں ہم نے BFE کے ایک رخ پر وقت صرف کیا تھا۔ فنی رخ، کمرشل مذاکرات ابھی باقی تھے۔ فنی رخ کو ترجیح اس لیے دی جاتی ہے کہ اگر آپ فنی طور پر کسی چیز سے مطمئن نہیں ہیں تو چاہے آپ کو کمرشل میں چاند بھی دے دیا جائے تو وہ چیز نہیں خریدی جائے گی۔ یہ سعودیہ کا اصول نمبر ایک تھا جس پر ہم سختی سے کار بند تھے۔ اسی اصول کے تحت بعض و نڈر سے مزید بات چیت کی ضرورت نہ تھی۔

ہوا بازی کی دنیا میں دو نمائشیں بہت اہم ہوتی ہیں۔ ایک فارنبرا ائرشو اور دوسرا پیرس ائرشو یہ نمائشیں ملٹری اور سول دونوں طرح کی ہوا بازی کے شائقین میں یکساں مقبول ہیں۔ اب دہنی ائرشو بھی خاصا مقبول ہو چکا ہے۔ یہ شاید 1981ء میں پہلی دفعہ منعقد ہوا تھا۔

عام لوگ یہاں جہازوں کو اور جہازوں کے کرب کو دیکھنے آتے ہیں لیکن دنیائے ہوا بازی کے لوگ یہاں کاروبار کرنے آتے ہیں۔ اکثر اوقات بڑے بڑے آرڈر بچا کے رکھے جاتے ہیں کہ ان کا اعلان ائرشو کے دوران کیا جائے گا۔ شو کے دوران کروڑوں ڈالر کا کاروبار ہوتا ہے۔ دنیا بھر میں اگر ہوا بازی کے شعبے میں کوئی بھی کمپنی اگر کسی حیثیت والی کمپنی ہے تو وہ ضرور اس میں شرکت کرے گی۔ ان سب کے اسٹال ہوتے اور ساتھ ہی ساتھ شیلے۔ تمام کاروبار ان شیلے میں ہوتا ہے۔ خاص خاص مہمان دوپہر کھانے پر شیلے میں مدعو ہوتے ہیں۔

پیرس ائرشو BFE کے کمرشل معاملات و مذاکرات کے لیے بہترین موقع تھا ہم لوگوں نے اس کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔

پیرس میں جس زمانے میں ائرشو ہوتا ہے اسی زمانے میں ٹینس کا مشہور فرینچ اوپن بھی ہوتا ہے۔ ہوٹل اگر پہلے سے بک نہ ہو تو ٹھہرنے کی جگہ حاصل کرنا ”لانا ہے جوئے“

فروری 2015ء

116

ماہنامہ پیپرگزشت

Copied From Web

لگ بھگ بھی ہو سکتا تھا لیکن ساڑھے پانچ ملین ڈالر کے کنٹریکٹ کے لیے یہ سودا مہنگا نہ تھا۔

کھانا کھا کر باہر نکلے تو ہمارے میزبان نے کہا کہ اگر آپ کو بوادے بولون کی بہت ہی خاص چیز دیکھنی ہو تو اگلے ہاتھ سے مڑ کر آگے جنگل کی طرف جانے والی سڑک پر نکل جائیں۔ آپ کا وقت بہت اچھا گزرے گا۔ ہم یہ غلطی کر بیٹھے۔ جیسے ہی سڑک جنگل میں داخل ہوئی کئی لڑکیوں نے ہاتھ ہلا ہلا کر ہم کو اپنی طرف بلانا چاہا۔ ویسے تو یہ عام سی لڑکیاں تھیں لیکن ان میں ایک خاص بات تھی وہ کپڑوں سے بے نیاز تھیں۔ ہاں ان میں سے جو چند ایک شریف زادا یاں تھیں انہوں نے کمر سے نیچے تھوڑا بہت کپڑوں کا ٹکٹف کر رکھا تھا مگر یہ نظارہ میرے لیے آخری نظارہ نہ تھا۔ جب بھی ہمارا کوئی انجینئر جدہ سے اپنے متعلقہ وٹڈر سے مذاکرات کے لیے آتا تو کرٹ کا اصرار ہوتا کہ وہ اس نظارے سے محروم نہ رہ جائے۔ اس کو وہاں لانے لے جانے کی ذمہ داری میری تھی۔ گاڑی میں چلا رہا تھا۔

مجھے پیرس کا پہلا کبیرے بھی کرٹ نے دکھلایا۔ ہم ایک شیلے میں میننگ میں مصروف تھے کہ کرٹ نے کہا کہ ہم کو بہت ضروری کام سے جانا ہے یہ میننگ پانچ بجے سے پہلے ختم ہو جانی چاہیے۔ میننگ پانچ بجے سے پہلے ختم ہو گئی۔ میں نے کرٹ سے پوچھا کہ ایسے کون سے ضروری کام سے جانا ہے تو اس نے کہا تم کو جلد معلوم ہو جائے گا آج تم لوگ میرے مہمان ہو کھانا میری طرف سے۔ کھانا ختم کرنے کے بعد کرٹ نے کہا۔ ”اب فولی برٹھے“ Follie Berger اب میری کبھ میں آیا کہ اتنا اہم کون سا کام ہے۔ کرٹ نے پہلے سے ہی چار شیٹس بک کروار کھی تھیں ہم نے ٹکٹ کا ڈنٹر سے ٹکٹ لیے اور ہال میں داخل ہو گئے۔ سب سے آگے والی قطار کی طرف چلو میں بڑھا آدمی ہوں دور سے یہ لڑکیاں مجھے صاف نظر نہیں آئیں گی۔ کرٹ نے ہنستے ہوئے کہا۔

”تو اس بڑھاپے میں تم کو جوان لڑکیاں دیکھنے کا شوق کیوں چرایا۔“ میں نے چھیڑا۔

”صرف میں بڑھا ہوں میرا دل جوان ہے۔ تم بھی اپنا دل جوان رکھا کرو۔“

کرٹ کا انتقال ہارٹ فیل کے سبب ہوا۔ ہال بہت بڑا تھا لاکھ لوگ تھے زیادہ تر سیاح۔ شوکی ابتدا ایک گانے سے ہوئی۔ پورا ہال روشنیوں

شیر کا“ ہو جاتا ہے۔ ہمارا اثر شو جانے کا فیصلہ دیر سے ہوا تھا۔ بڑی کوششوں کے بعد پیرس کے ہالی ڈے ان میں جگہ ملی۔ یہ ہوٹل پیرس کے گنجان علاقے میں ہے جہاں کار پارک نہیں بن سکتا۔ ان کا کار پارک اوپری منزلوں پر تھا۔ جب کبھی کار پارک اوپری منزل پر بنائے جاتے ہیں تو گاڑیوں کو وہاں لے جانے کے لیے راستہ بھی بتایا جاتا ہے لیکن یہاں اتنی جگہ نہ تھی اور شاید عمارت بھی بہت پہلے کی بنی ہوئی تھی۔ ان تمام مشکلات کا ایک انوکھا حل نکالا گیا تھا۔ ہوٹل میں آ کر گاڑی ایک بڑی لفٹ میں لے جانا پڑتی تھی۔ وہ لفٹ گاڑی کو اوپر پارکنگ لائٹ میں لے جاتی تھی۔ لفٹ کا سامنے کا دروازہ کھلتا اور گاڑی باہر۔ یہ انوکھا پارکنگ کا انتظام میں نے اور کہیں نہیں دیکھا۔

گاڑی ہم نے کرائے پر لی تھی اس کا چلانا میری ذمہ داری تھی اور ساتھ ہی یہ بھی ذمہ داری تھی کہ کسی بھی دن بغیر بھٹکانے ہوئے اپنے ساتھیوں کو اثر شو نہ پہنچاؤں۔ اس ذمہ داری کو میں نے بڑی لگن اور خوبی سے نبھایا۔ حالانکہ دو تین لوگ اور بھی گاڑی میں بیٹھے ہوتے تھے لیکن ہر غلط موٹر کی ذمہ داری میرے اوپر ڈال دی جاتی۔ میں ویسے بھی بھٹکنے اور بھٹکانے میں اپنا ثانی آپ ہوں پھر سونے پر سہاگا سڑکوں کے نام اور پیرس والوں کا سائن بورڈ لگانے کا انداز۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح یہ مرحلہ طے ہو جاتا۔ کسی ایک دن بھی ایسا نہ ہوا کہ ہم شو کا نام ختم ہونے کے بعد وہاں پہنچے ہوں۔

ملاقاتیں حسب معمول جاری تھیں جس کسی کے ساتھ صبح کی میننگ Meeting ہوتی کھانا ہم انہما کے شیلے میں کھاتے۔ ہماری حتی الامکان کوشش تھی کہ رات کے کھانے میں نہ پھنسیں کیوں کہ رات کو پیرس ہم اپنے طور پر گھومنا چاہتے تھے مگر انسان کی ہر خواہش پوری نہیں ہوتی۔ ایک وٹڈر تھے کہ اگر ہم ان کا سارا سامان خرید لیتے تو ہر جہاز پر تقریباً پانچ لاکھ ڈالر کا سامان لگتا۔ سعودیہ نے کل گیارہ A-300 خریدے تھے۔ وہ لوگ بھر اصرار ہم لوگوں کو کھانے کے لیے ایک جگہ لے گئے جس کا نام تھا ”بوادے بولون“ یہاں پر ایک ریستورنٹ تھا جس کا نام تھا پیرے کیمپاں۔ اس کی خاص بات یہ تھی کہ یہاں پر کھانے کی قیمتیں ہر مینو پر نہیں ہوتیں صرف ایک مینو پر ہوتی ہیں جو صرف میزبان کو دیا جاتا ہے۔ اس کی خاص وجہ تھی کہ آج سے تیس سال پہلے بھی وہاں پر ایک آدمی کا کھانا سو ڈالر کے

سے جھگکا اٹھا۔ صوتی اثرات غضب کے تھے۔ سازوں کی آواز اثر انگیز گلوکارہ ایک رسی کی سیڑھی کے ذریعے ادر سے اٹیج پر اتری۔ اس کے گانے نے سماں باندھ دیا۔ لگتا تھا پورے ہال میں بجلیاں دوڑ رہی ہیں۔ اتنا سحر انگیز گانا نہ میں نے پہلے سنا تھا اور نہ اس کے بعد۔ شوکئی گھٹنے کا تھا۔ رات دیر سے ہوٹل واپس ہوئی۔

صبح اٹھ کر میں نے ایک دفعہ پھر لوگوں کو بھٹکانے کے فرائض انجام دیے۔ معمول کے مطابق کام چلتا رہا۔ آج پھر رات کا کھانا نالنا مشکل ہو گیا۔ کھانے کا انتظام ایک چھوٹے سے ہوٹل میں تھا۔ پندرہ بیس مہمانوں کا پورا کمرہ ایک تھا۔ ہمارے ایک ساتھی نے لطیفہ سنانا شروع کر دیا۔

ایک دفعہ ایک بار میں اشتہار لگا تھا کہ جو کوئی جارج کو ہنسائے گا اس کو سو ڈالر انعام ملے گا۔ ایک آدمی نے شرط لگائی اور اس کمرے کی طرف گیا جہاں جارج تھا۔ جارج آدمی نہ تھا ایک گدھا تھا۔ وہ آدمی جارج کو لے کر باہر نکلا تو جارج دو لتیاں مار مار کر قہقہے لگا رہا تھا۔ آدمی نے سو ڈالر لیے اور چلا گیا۔ دوسرے دن وہی آدمی پھر بار میں آیا تو اب کی دفعہ اشتہار لگا اس پر لکھا تھا جو آدمی جارج کو لائے گا۔ اس کو سو ڈالر انعام ملے گا۔ اس آدمی نے شرط لگائی اور کمرے میں گیا جب باہر نکلا تو جارج دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔ بار کے مالک نے آدمی کو سو ڈالر دیے اور سو ڈالر اوپر سے اور دیے اور کہا کہ سو ڈالر صرف اس لیے ہیں کہ یہ بتاؤ کہ تم نے جارج کو کیسے ہنسایا اور کیسے رلایا۔ جب اس آدمی کا جواب ہمارے ساتھیوں نے سنا تو پورا کمرہ قہقہوں سے گونج اٹھا۔ (وہ جواب قابل اشاعت نہیں ہے) سب ہنس رہے تھے سوائے ہمارے میزبان کے۔ لطیفہ سنانے والے نے کہا۔

”یار سب ہنس رہے ہیں مگر تم خاموش ہو کیا بات ہے۔“
جواب ملا۔ ”میرا نام جارج ہے۔“ اس پر پہلے سے بھی زیادہ زور دار قہقہوں نے پورے کمرے کو ہلا کر رکھ دیا۔ کبھی کبھار کو مختصر کرتے ہوئے صرف اتنا بتاتا ہے کہ ایک کے بعد ایک BFE ارب بس کو مقررہ وقت برڈیلیور کر دیے گئے۔ ہماری BFE کی ذمہ داری ختم ہو چکی تھی۔ سوائے ایک کے، سیٹوں کا انتخاب ابھی باقی تھا۔

سعودیہ نے جس وقت B-747 کی سیٹوں کا انتخاب کیا تھا اس وقت ہمارے پاس وقت اتنا نہیں تھا کہ سیٹیں بنانے والے مختلف ونڈر سے رابطہ کر کے باقاعدہ مذاکرات کے ذریعے سیٹ بنانے والی کمپنی کا انتخاب کیا جاتا۔ سب سے آسان طریقہ یہ تھا کہ جو کمپنی سعودیہ کے

دوسرے جہازوں کے لیے سیٹیں بنا رہی تھی اسی کمپنی کو B-747 کی سیٹوں کا کام بھی دے دیا جائے لیکن A-300 کی بات اور تھی۔ A-300 کی سیٹوں کے انتخاب کے لیے ہمارے پاس وقت ہی وقت تھا۔ اس وقت کو استعمال کرتے ہوئے سعودیہ نے اپنے ذاتی سیٹ کے مواصفات تیار کیے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اپنی ضروریات کے مطابق خریداری کا کنٹریکٹ اور مینڈر تیار کر کے یورپ، جاپان اور امریکا کی سیٹ تیار کرنے والی کمپنیوں کو بھجوادیا۔ اب ان کمپنیوں کی باری تھی کہ وہ معہ اپنی بنائی ہوئی سیٹوں کو جدہ لا کر سعودیہ کے مینجمنٹ کے سامنے پیش کریں۔ سیٹوں کا انتخاب اور جہاز کی اندرونی آرائش وہ چیزیں ہیں کہ ائر لائن مینجمنٹ کا ہر فرد اس میں اپنا حصہ ڈالنا چاہتا ہے۔ سرخرو ہونا چاہتا کہ اس نے جہاز کے انتخاب میں اپنا کردار ادا کیا۔ باقی چیزوں میں وہ لوگ نامحرم ہوتے ہیں کہ ان دوسری چیزوں کے لیے ٹیکنیکی معاملات کا جاننا ضروری ہوتا ہے جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ اعزاز صرف پائلٹ، انجینئر اور مارکیٹنگ کے چند افراد کے حصے میں ہی آسکتا ہے۔

سیٹ کے چناؤ کا مقابلہ ٹھکڑا تھا۔ چھ سات ونڈر ملوث تھے۔ آخر کار یہ کنٹریکٹ فرانس کی کمپنی سکما (Sicma) کو سونپا گیا۔ مواصفات کا کام اب مکمل ہو چکا تھا۔ جہاز بنا شروع ہو چکے تھے لیکن بیچ بیچ میں... مسائل اپنا سرا بھارتے رہتے تھے۔ ایک بڑا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ FMS کا مسئلہ۔

FMS فلائٹ مینجمنٹ سسٹم کا عمودی، ورٹیکل نیویگیشن وقت پر مکمل نہیں ہو سکتا تھا جس کی وجہ سے پائلٹ کا کام بھی بڑھ جاتا اور اینڈھن کی متوقع بجٹ پر بھی اثر پڑ سکتا تھا لیکن اس مسئلے کی وجہ سے جہازوں کی ڈیلیوری میں تاخیر نہیں کی جاسکتی تھی۔ FMS فی الحال بغیر ورٹیکل نیویگیشن کے نصب کیا جائے گا۔ پھر جب ورٹیکل نیویگیشن کا حصہ مکمل ہو جائے گا تو اس کو FMS کمپیوٹر میں لگا دیا جائے گا لیکن اس کو تا ہی کو ارب بس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔

FMS کے بعد مزید کوئی قابل ذکر واقعہ نہیں ہوا۔ تمام A-300-600 جہاز سعودیہ کے بیڑے میں شامل ہو چکے تھے۔ میری مواصفات کی ذمہ داری پاپی کمیل کو پہنچ چکی تھی۔

☆☆☆

گیارہواں اور آخری ارب بس A-300-600 جدہ پہنچ چکا تھا جس مقصد کے تحت انجینئرنگ کو دو دھڑوں میں تقسیم

سفروری 2015ء

118

ماہنامہ سرگزشت

کیا گیا تھا۔ وہ مقصد یعنی سعودیہ کے لیے دو (2) نئی طرح کے جہاز خریدنا۔ پایہ تکمیل کو پہنچ چکا تھا۔ اب مواصفات پر کام کرنے والے انجینئروں کے پاس زیادہ کام نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ دنیا میں ”کوئٹی“ (Quality) سے متعلق ایک نئی سوچ نے جنم لیا تھا۔ اس نئی سوچ کا نام کوئٹی ایشرنس (Assurance) رکھا گیا۔ اس سے پہلے سارا زور کوئٹی کنٹرول پر تھا۔

کوئٹی کنٹرول کا مقصد یہ تھا کہ جو چیز معیار کے مطابق نہیں بنائی گئی ہے یا جو کام معیار کے مطابق نہیں کیا گیا ہے اس کی گرفت کر کے یا تو وہ چیز دوبارہ بنائی جائے یا مسترد کر دی جائے اور جو کام ٹھیک طرح سے نہیں کیا گیا ہے اس کو دوبارہ ٹھیک طرح سے کیا جائے۔ اس طرز عمل میں خرابی یہ ہے کہ چیز چونکہ بن چکی ہوتی ہے یا کام ختم ہو چکا ہوتا ہے اس کے دوبارہ بنانے یا ٹھیک کرنے یا کام کو دوبارہ کرنے میں وقت اور پیسہ دونوں کا ضیاع ہوتا ہے۔ اس زیاں کو کم سے کم سطح پر رکھنے کے لیے کوئٹی ایشرنس کی سوچ نے جنم لیا۔

کسی کام کے کرنے سے پہلے ہی یا بنانے سے پہلے ہی کوئٹی ایشرنس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ان امور کا احاطہ کیا جائے جو اس کام میں یا اس چیز میں نقص کے امکانات پیدا کر سکتے ہیں اور پھر ان امور کا سدباب کیا جائے۔ کوئٹی ایشرنس صرف چیزوں کے بنانے یا تھیک کرنے کی امور تک ہی محدود نہیں ہے۔ اس کا اطلاق زندگی کے ہر شعبے پر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک دفتر میں کام کن اصول کے تحت کیا جاتا ہے۔ ان اصولوں میں بہتری لائی جاسکتی ہے، یا یہ کہ ایک لائبریری میں کتابیں کس طرح سے ہینڈل کی جاتی ہیں۔ اس کے طریق کار کو بھی بہتر بنایا جاسکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ سعودیہ کی اعلیٰ قیادت نے فیملہ کیا کہ سعودیہ کے ٹیکنیکل ڈیپارٹمنٹ میں کوئٹی ایشرنس کا شعبہ قائم کیا جائے۔ اس شعبے کو تشکیل دینے کی ذمہ داری کرنل اور فلانیڈ کو سونپی گئی۔ کرنل اپنے اس پروجیکٹ میں مصروف ہو گیا۔ میرے پاس کوئی خاص کام نہیں تھا۔ میں نے ایک ہفتہ کی چھٹی کی درخواست دے دی۔ اگر چھٹی منظور ہوگئی تو میرا فریقا جانے کا پروگرام تھا۔ تیزانیہ اور کینیا۔ میں شمالی افریقہ یعنی مصر، تیونس اور مراکش جا چکا تھا مگر ”کالا“ افریقانہ دیکھ تھا۔ چھٹی منظور ہوگئی۔

SAS کی پرواز جدہ سے تیزانیہ کے شہر دارالسلام جانی تھی۔ SAS سعودیہ کے ملازمین کو 90 فیصد ڈسکاؤنٹ پر ٹکٹ جاری کرتی تھی۔ مجھے صرف دس فیصد کرایہ دینا تھا۔ یہ ٹکٹ سعودیہ کے دفتر سے ہی بڑا جاتے تھے۔ دو دن تیزانیہ

سرگنٹی پارک دیکھنے کے لیے پھر تیزانیہ، کینیا۔ جدہ ایئرپورٹ پر میں نے SAS کے کاؤنٹر پر اپنا ٹکٹ پیش کیا۔ میرے ساتھ صرف ایک ہینڈ بیگ تھا۔ میں بورڈنگ کارڈ کا انتظار کر رہا تھا کہ پیچھے سے آواز آئی ”انکل“۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک پیاری سی پاکٹ سائز گڑیا جیسی لڑکی کھڑی تھی۔ ”جی!“ میں نے جواب دیا۔

”انکل! آپ سعودیہ میں کام کرتے ہیں؟“
”جی بیٹا! میں سعودیہ میں کام کرتا ہوں۔“
اب کام کی بات۔ ”انکل! میں بھی سعودیہ میں کام کرتی ہوں میرا نام زینا پٹوا ہے میں تیزانیہ میں اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتی ہوں۔ یہاں پر میں سعودیہ سٹی کے ایئر ہوسٹس کپاڈنڈ میں رہتی ہوں۔“ پھر آدم برسر مطلب۔ ”میں گھر جا رہی ہوں میرا ایک فالٹو سوٹ کیس ہے، کیا آپ اس کو چیک ان کروادیں گے آپ کے ساتھ کوئی سامان نہیں ہے۔“
یہ لڑکی فکریہ تھا۔

دنیا بھر میں ایسے لاتعداد واقعات ہو چکے تھے جہاں پر بھولی بھالی معصوم گڑیاں اسمگلنگ کے سلسلے میں اپنے شکار کے حق میں زہری پڑیاں ثابت ہو چکی تھیں۔ خاص طور سے نشیات کی اسمگلنگ کے ضمن میں۔ جدہ سے نشیات یا اور دوسری چیزوں کا خطرہ تو نہ تھا لیکن سونا خوب اسمگل ہوتا تھا۔ جدہ میں سونے کے کاروبار پر یا لانے لے جانے پر کوئی پابندی نہ تھی لیکن دنیا کے تقریباً توڑے فیصد ملکوں میں سونا لانے لے جانے پر پابندی ہے۔ میرے ایک ساتھی جلال صاحب خود اس کا شکار ہوتے ہوتے بچے تھے۔

جلال صاحب کے ایک قریبی دوست نے ان کو ایک کریم کی شیشی دی کہ یہ میری بیوی کو دے دیجیے گا۔ جلال صاحب نے شیشی لے لی پھر بعد میں سوچا کہ ایک معمولی کریم کی شیشی جدہ سے پاکستان کیوں بھیجی جا رہی ہے اس شک کی بنا پر انہوں نے شیشی کھول کر کریم کے اندر انگلی ڈالی تو وہ کسی سخت چیز سے ٹکرائی۔ یہ سخت چیز دس تولہ سونے کی ڈلی تھی۔

میں نے زینا سے (اصل میں یہ زینت ہے) پوچھا۔
”تمہارا باقی سامان کہاں ہے؟“
”وہ تو چیک ہو چکا میں اپنا بورڈنگ کارڈ لے چکی ہوں۔“

میں نے ایجنٹ سے کہا کہ ”سامان میں اپنے نام سے چیک نہیں کراؤں گا۔ اگر میرے ٹکٹ کے وزن کا الاؤنس استعمال کرتے ہوئے یہ سوٹ کیس زینت کے نام سے ہو سکتا ہے تو بے شکہ کر دیں۔ میرا اس سوٹ کیس سے کوئی تعلق نہیں

ہونا چاہیے۔“

سوٹ کیس چیک ان ہو گیا۔ میں زینا کے ساتھ پاسپورٹ پڑھنا لگا کر لائن میں چلا گیا۔

جہاز میں زینت کی سیٹ میری سیٹ سے تین چار قطار آگے تھی۔ آدھا سفر گزرا ہو گا کہ زینت نے مجھے اپنے پاس آنے کا اشارہ کیا۔ اس کے برابر دو سیٹیں خالی تھیں میں وہاں بیٹھ گیا۔

”انکل آپ کے پاس کھلے ڈالر ہیں؟“

”ہیں مگر شاید بیس پچیس، میں سفر میں سیاحی چیک لے کر چلتا ہوں مگر کیوں؟“

”اس لیے کہ تفریح میں ڈالر کی بہت قدر ہے۔ کھلے بازار میں ڈالر کے عوض آٹھ گنی دس گنی مقامی کرنسی ملتی ہے۔ آپ ٹیکسی والے کو بھی ڈالر بیچے گا۔ سیاحی چیک میں آپ کو نقصان ہوگا۔“ یہ افریقا میں سفر کرنے کا پہلا سبق تھا۔

دارالسلام ائر پورٹ، پر زینت کے انتظار میں تفریحی کی ائر لائن کا ایک ملازم موجود تھا۔ اس نے میرا بھی پاسپورٹ لے لیا۔ امیگریشن کروایا۔ زینت کا سامان لیا اور ہال سے باہر آگئے۔ زینت کو ائر پورٹ پر ہی رکنا تھا۔ ہم صبح کے وقت پہنچے تھے زینت کی فلائٹ سہ پہر کو تھی۔ میں زینت کو وہیں چھوڑ کر باہر آ گیا۔

مشرقی افریقا میں بہت سے لوگ غیر منقسم ہندوستان سے آ کر بس گئے تھے۔ اب یہ سب یہیں کے شہری ہیں۔ مجھے جو ٹیکسی والا ملا وہ بھی ایک سابقہ ہندوستانی نوجوان تھا۔

”آپ کرایہ ڈالر میں دیں گے یا مقامی کرنسی میں۔ ڈالر میں دیں گے تو دو ڈالر مقامی کرنسی میں جو رقم اس نے بتائی وہ تقریباً بیس ڈالر بنتی تھی۔“

”میں تم کو کرایہ ڈالر میں دوں گا۔ مجھے کسی صاف سترے ہوٹل پہنچا دو۔“

ٹیکسی کرنے سے پہلے میں ائر پورٹ کے مقامی بینک سے دو سو ڈالر کے عوض مقامی کرنسی لے چکا تھا۔ ہوٹل معقول تھا مگر وہاں کا ڈنٹر پر ایک بورڈ لگا تھا۔ ”کرایہ پچیس ڈالر بومیہ ایڈوانس دینا ہوگا۔ صرف امریکی ڈالر لیے جاتے ہیں۔ مقامی کرنسی قبول نہیں کی جائے گی۔“

میں ڈالر دینے کے لیے تیار تھا لیکن میرے پاس سو ڈالر سے کم کا کوئی سیاحی چیک نہ تھا۔ ہوٹل والا مجھے بھایا مگر ڈالر مقامی کرنسی میں دے رہا تھا۔

میں نے سوٹ کیس اٹھایا اور باہر آ گیا کہ میں ”دارالسلام“ کی سلامتی کو خیر باد کہہ کر سیدھا سرنگھنی پارک چلا

ماہنامہ سرگزشت

جاؤں گا۔ سرنگھنی کا ٹکٹ لیا۔ بس چار گھنٹے بعد جائے کی۔ میں شہر کے مرکز کی طرف چلا گیا۔ عجیب بے ہنگم شہر تھا ہر طرف گندگی، سلم ایک تاریکی سی چھائی ہوئی تھی میں نے سرنگھنی کی سیر کو الوداع کہا اور تفریحی رکنے کی بجائے سیدھا نیروبی جانے کا پروگرام بنایا۔ سرنگھنی کا ٹکٹ واپس کرنے گیا تو آدھے پیسے ملے۔ وجہ یہ کہ انہوں نے ٹکٹ مجھے بلیک میں دیا تھا۔

شہر کے بینک میں مقامی کرنسی کو ڈالر میں واپس بدلوانے گیا۔ انہوں نے انکار کر دیا کہ جہاں سے آپ نے ڈالر بدلوائے تھے وہیں سے واپس مل سکتے ہیں اور کوئی بینک نہیں دے سکتا۔

”تفریحی ائر لائن کے دفتر جا کر نیروبی کی سیٹ بک کروائی۔ ائر پورٹ کی راہ لی۔ ائر پورٹ پہنچ کر بینک گیا کہ مقامی کرنسی بدلوا لوں۔ انہوں نے انکار کر دیا۔ وجہ ایک دفعہ بدلوائے گئے ڈالر واپس نہیں مل سکتے۔“ وہ مقامی کرنسی آج تک میرے پاس کہیں بڑی ہوئی ہے۔

چیک ان کا ڈنٹر کی طرف بڑھا تو زینت دکھائی دی۔ ”تمہاری فلائٹ ابھی تک نہیں گئی۔“

تاخیر ہو گئی ہے دو گھنٹے بعد جائے گی۔ آپ یہاں کیا کر رہے ہیں۔“ زینت نے پوچھا۔

میں نے مختصر الفاظ میں اپنی کتھا سنائی۔ ”اب میں نیروبی جا رہا ہوں۔“

نیروبی پہنچ کر کھلی اور صاف فضا میں سانس لینے کا احساس ہوا۔ ایسٹ افریقا میں شاید کینیا ہی ایک ایسا ملک رہ گیا ہے جہاں پر سیاحوں کے لیے ہر طرح کی سہولیات موجود ہیں۔ سیاح یہاں پر بغیر ان خدشات کے کہ جو دوسرے افریقی ممالک میں سہولت کے ساتھ گھوم پھر سکتے ہیں۔

نیروبی کی پرواز کے دوران میں میرے برابر والی سیٹ پر ایک صاحب بیٹھے تھے جن کا نام ارجن تھا ان کا خاندان بھی برٹش انڈیا کے زمانے میں یوگنڈا میں آ کر آباد ہو گیا تھا۔ عیدی امین نے جب یوگنڈا سے ایشیائی باشندوں کو نکالا ہے تو ارجن صاحب کا خاندان بھی متاثر ہوا لیکن بعد میں حالات کچھ بہتر ہو گئے۔ ارجن صاحب کا یوگنڈا کے شہر کپالا میں ایک درمیانے درجے کا ہوٹل تھا۔ بیوی کا انتقال ہو چکا تھا۔ ایک بیٹا ایک بیٹی تھی۔ ہندوستان میں بیٹی کی شادی کر کے واپس کپالا جا رہے تھے۔ براستہ نیروبی۔

میں نے ارجن صاحب کو اپنا دارالسلام کا تجربہ بتایا۔ ان کا کہنا تھا کہ زیادہ تر سیاح افریقا کے متعلق بغیر ضروری معلومات حاصل کیے ہوئے افریقا پہنچ جاتے ہیں کہ یہ

فروری 2015ء

120

Copied From Web

Pod فالٹو پوڈ

ہوائی جہاز کے انجن اس کے پروں پر جہاں نصب کیے جاتے ہیں وہ جگہ پوڈ کہلاتی ہے۔ ہر انجن کا الگ الگ پوڈ ہوتا ہے۔ ہونگ 747 میں چار انجن ہوتے ہیں ہر انجن کا اپنا الگ الگ پوڈ ہوتا ہے۔ اس طرح 747 میں کل چار پوڈ ہوتے ہیں۔ جہاز کے انجن بہت بھاری ہوتے ہیں۔ 747 کے ایک انجن کا وزن کئی ہزار کلوگرام ہوتا ہے۔ یہ بھاری بھر کم انجن جب جہاز پر نصب نہ ہو تو اس کو اس کے اپنے اسٹینڈ پر رکھا جاتا ہے۔ انجن اسٹینڈ بہت بڑے اور بہت وزنی ہوتے ہیں۔ اگر فالٹو (اسپیئر) انجن کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرنا ہو مثلاً جب انجن کو مرمت کے لیے بھیجا ہو تو انجن اپنے اسٹینڈ پر لا کر بھیجا جاتا ہے۔ اگر یہ مرمت دوسرے شہر میں ہو تو بڑے ٹرک استعمال کیے جاسکتے ہیں اور اگر ملک سے باہر کروانی ہو تو انجن اور اسٹینڈ کو مال بروار ہوائی جہاز سے لے جایا جاتا ہے لیکن ایک طریقہ ہے جس کے استعمال سے انجن کو اس کے اسٹینڈ سے نجات دلائی جاسکتی ہے۔ مال بردار جہاز کی زحمت سے بچا جاسکتا ہے۔ اس طریقے کو استعمال کرنے کے لیے جہاز کے پر (ونگ) میں ایک فالٹو پوڈ بنایا جاسکتا ہے جس کی قیمت اڑ لاکھ کو الگ سے ادا کرنی پڑتی ہے مگر اس کا فائدہ یہ ہے کہ انجن اور اسٹینڈ کو مال بردار جہاز میں لا کر بھیجنے کی بجائے اس کو فالٹو پوڈ میں لگا کر بھیجا جاسکتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مال بردار جہاز کے کرائے کی بچت بھی ہو جاتی ہے اور مال بردار جہاز کی پرداز کا انتظار بھی نہیں کرنا پڑتا، ایک پتھہ دو کالج۔

خاصہ ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔ ہر ملک کی موسیقی کا اپنا لطف ہے۔ سوائے اوپیرا کے کہ جس کو سمجھتا کاردار ہے۔ سننے کے بعد کان کئی دن تک جھنجھٹاتے رہتے ہیں۔

افریقی موسیقی کا سماں بندھ گیا۔ ہوٹل واپسی آدمی رات کے بعد ہوئی۔ کل سفاری پر جانا تھا۔ سفاری پر جانے والی گاڑی صبح ہوٹل پہنچ چکی تھی۔ یہ ایک مائیکرو بس تھی جس کی چھت کے نیچے کے حصے کو کاکٹ کراس کو لوہے کے ڈنڈوں پر اس

فروری 2015ء

121

سیاحوں کی جنت ہے۔ ”ایسا نہیں ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”افریقا میں اب بہت کم ایسے ممالک ہیں جہاں سیاح بے خوف و خطر سفر کر سکیں۔ خطرات کے علاوہ سیاحوں کی سہولیات کا بھی فقدان ہے۔“ آپ نے اچھا کیا کہ نیروبی آگئے۔ اب ایسٹ افریقا میں صرف کینیا ہی ایسا ملک ہے جہاں سیاحت کی ہر طرح کی سہولتیں میسر ہیں۔ پھر خبردار کیا۔ ”اندھیرے کے بعد نیروبی کی تاریک گلیوں کی طرف مت جائیے گا۔ وہاں لوگ لوٹ لے جاتے ہیں۔ بڑی اور روشن سڑکوں پر یہ خطرات نہیں ہوتے۔“

ارجن صاحب نے مجھے اپنا کارڈ دیا اور ایک ہوٹل کا پتا بتایا۔ ”آپ وہاں جا کر موہن صاحب سے میرا حوالہ دے کر بات کر بیجیے گا۔ وہ آپ کی سفاری کا بھی بندوبست کر دیں گے۔ سفاری افریقا گھومنے کا بہترین طریقہ ہے۔ درندوں کے زیادہ نزدیک مت جائیے گا۔“ ہدایت نامہ ختم ہوا۔ موہن صاحب گرجوشی سے ملے۔ اپنے ایک جاننے والے ٹریول ایجنٹ کو فون کر کے سفاری کا بھی بندوبست کر دیا۔ یہ سفاری پانچ یا چھ جگہ جاتی تھی میرے پاس اتنا وقت نہ تھا طے، یہ ہوا کہ تین جگہ دیکھنے کے بعد میں مومباسہ میں ان سے جدا ہو جاؤں گا۔ وہاں سے نیروبی واپسی میرا اپنا ذمہ ہو گا۔ جن تین جگہوں پر ہم گئے ان کے نام مجھے یاد نہیں۔ زندگی میں کبھی حالات زندگی لکھنے کی نوبت آئے گی یہ سوچا بھی نہ تھا۔ کبھی کوئی ڈائری یا اور کوئی یادداشت والی چیز کے لوازمات محفوظ نہیں کیے۔ جو کچھ ذہن میں محفوظ رہ گیا ہے رقم کر دیتا ہوں۔ ٹیلیفون کا اور غلط یادداشت کا خطرہ رہتا ہے۔

رات کا کھانا کھانے کمرے سے باہر آیا تو موہن صاحب نے کہا۔ ”کھانا آپ یہیں کھالیں نزدیک میں کوئی معقول ریسٹورنٹ نہیں ہے۔ رات کے وقت زیادہ دورا کیلے پیدل ہانا مناسب نہیں ہوگا۔ کھانے کے بعد اگر آپ باہر جانا چاہیں تو مین روڈ پر رہے گا زیادہ دور نہ جائیے گا۔ سامنے ایک بار ہے۔ وہاں افریقی دھنوں پر ڈانس ہوتا ہے۔ غیر ملکی شراب کے ساتھ دیسی شراب بھی ملتی ہے۔ اچھی جگہ ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”کیا دیسی شراب کے ساتھ دیسی کوکا کولا بھی ملتی ہے۔“ جواب ملا۔ ”کیوں نہیں۔“

مجھے مختلف ملکوں کی موسیقی سننے کا شوق ہے۔ میں جس زمانے میں کینیڈا میں مسٹر (Muntz) کمپنی میں کام کرتا تھا۔ وہاں پر کئی ملکوں کی موسیقی کے کیسٹ اور 8 ٹریک (یہ ایک طرح کے کیسٹ ہوتے تھے جو کینیڈا اور امریکا میں استعمال ہوتے تھے) بکا کرتے تھے۔ میرے پاس ان کا اچھا

ماہنامہ سپرگزشت

وراثہ تھا۔ یہاں پر مہمانوں کے لیے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ لائیں ہر طرف کی بچھا دی گئی تھیں۔ وراثہ سے کئی سو گز کے فاصلے پر دو بڑی سرچ لائیں لگی ہوئی تھیں جن کی روشنی دریا میں اس جگہ پڑتی تھی جہاں جانور پانی پینے آتے تھے۔ محل تاریکی کے باعث ماحول پراسرار اور حسین ہو گیا تھا۔ جانور اپنے اپنے وقت پر اور اپنے اپنے گھاٹ پر پانی پینے آتے۔ لگتا تھا اس معاملے میں انہوں نے کوئی ان کہا معاہدہ کر رکھا تھا کہ صرف اپنے وقت پر اور صرف اپنے گھاٹ پر پانی پینیں گے۔ مجھے ہندوستان اور پاکستان کے درمیان پانی کی تقسیم کا معاہدہ یاد آ گیا۔ کیا ہم ان جانوروں سے بھی گئے گزرے ہیں۔

چوتھے دن سفاری پر جاتے ہوئے ڈرائیور نے مجھے مومباسہ کے ہوٹل پر اتار دیا۔ باقی لوگ آگے بڑھ گئے۔ ہوٹل سمندر کے کنارے تھا۔ سفید چمکیلی ریت ہوٹل کی سفید عمارت اور سینکڑوں ناریل کے درخت و تقریب منظر پیش کر رہے تھے۔

میں نے سامان کمرے میں رکھا۔ پچھلے تین دن کے دوران سارے کپڑے میلے ہو چکے تھے ان کو دھلوانا تھا۔ میں نے ریسپشن فون کر کے لڑکے کو بلوایا۔ ”مجھے یہ کپڑے ارجنٹ دھلوا دو شام تک مل جائیں۔“

”شام تک ملنا مشکل ہے۔ کیا میں خود ان کو دھو دوں۔“

”دھو دو مگر صاف پانی استعمال کرنا۔ میں نیچے کھانا کھانے جا رہا ہوں۔ تم کمر بند کر دینا۔“ میں نیچے کھانا کھانے چلا گیا۔

واپس کمرے میں آیا تو میری قمیضیں دھل چکی تھیں۔

”صاف پانی سے دھویا۔“ میں نے اس سے پوچھا۔ جواب ملا۔ ”جی بالکل۔“ پھر اس نے کموڈ کی طرف اشارہ کیا۔ ”اسی میں دھوئے ہیں پانی بالکل صاف تھا۔“

”ارے بخت! اس نجس پانی سے دھوئے ہیں اور کہتا ہے صاف ہے۔“ میں اس پر برس پڑا۔

اس کا جواب تھا کہ میرا ناراض ہونا غلط تھا۔ ”آپ نے صاف پانی کہا تھا میں نے صاف پانی استعمال کیا ہے۔ گندہ مٹی والا پانی تو لائڈری والے استعمال کرتے ہیں جو وہ نالہ سے لیتے ہیں جس میں مٹی بھری ہوتی ہے۔ یہ پانی اس سے بہت زیادہ صاف ہے۔“ میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ میں نے کہا۔ ”تم بھی دفع ہو جاؤ اور یہ قمیضیں بھی ساتھ لے جاؤ۔“ اس کا اب بھی اصرار تھا کہ پورے مومباسہ میں اس سے زیادہ صاف پانی نہیں مل سکتا۔

طرح جوڑا جاتا ہے کہ جب اس کو دھکا دیا جائے تو چھت کا یہ حصہ ڈیڑھ دو فٹ اوپر اٹھ جاتا ہے اور سفاری کے سیاح کھڑے ہو کر چھت کے چاروں طرف سے منظر دیکھ سکتے ہیں۔ اگر گاڑی سے باہر نکل کر دیکھیں تو اس میں درندوں کے حملے کا خطرہ ہو سکتا ہے۔

ہماری گاڑی میں ڈرائیور کے علاوہ کل چھ افراد تھے سب سعودی عرب سے آئے تھے۔ میرے علاوہ تین انگریز نرسیں تھیں جو ریاض کے اسپتال میں کام کرتی تھیں اور دو بھائی تھے۔ ان میں سے ایک، دسویں جماعت کا طالب علم تھا اور دوسرا بھائی نویں جماعت کا۔ یہ دونوں پاکستانی تھے۔

سفاری عام سفاریوں کی طرح تھی۔ مخصوص مقامات تھے جہاں مختلف جانور رہتے تھے لوگ ان کو شوق اور تجسس سے دیکھ رہے تھے۔ کراچی کے گاندھی گارڈن میں اور سفاری میں فرق یہ تھا کہ وہاں جو نور پنجرے میں ہوتے ہیں اور لوگ آزاد۔ سفاری میں آدمی آیدتے اور جانور آزاد۔

افریقا کے راستے کے جنگلوں کے مناظر دکش تھے۔ مجھے جانوروں سے زیادہ ان میں دلچسپی تھی۔

راستے میں ایک بنگلہ ڈرائیور نے گاڑی روکی۔ سڑک کے کافی نیچے دریا بہ رہا تھا۔ ”یہاں پر کبھی کبھی ٹکر چھ آتے ہیں۔“ اس نے کہا۔

”شاید ہماری قسمت آج اچھی ہو۔“ قسمت اچھی تھی ڈرائیور نے ہاتھ کے اشارے سے کہا۔ ”وہاں دیکھو دھر۔“ دونوں لڑکے دوڑ کر ادھر گئے۔ ان کی آواز سن کر مگر مجھ نے پانی میں ڈبکی لگا دی۔ سب کو بہت افسوس ہوا سوائے میرے۔ اس کی تین وجوہات تھیں ایک، تو یہ کہ میں تھائی لینڈ میں ایک سے زیادہ دفعہ ہر سائز کے مگر چھ کے فارم پر بہت نزدیک سے دیکھ چکا تھا۔ دوسرے یہ کہ اگر کراچی میں مگر چھ دیکھنے کا شوق ہو تو منگھو پیر دور نہیں اور تیسری اور سب سے اہم وجہ کہ پاکستان کے سیاسی اکھاڑے میں ایسے مگر چھ ہیں کہ دنیا کا بڑے سے بڑا مگر چھ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ یہ مگر چھ عوام کی دولت کو ہڑپ کرتے رہتے ہیں اور مگر چھ کے آنسو بہاتے رہتے ہیں۔ ان مگر چھوں کی ایک خصوصیت اور بھی ہے۔ ان میں سے ہر ایک کو حتمی اور یقینی طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اٹھارہ کروڑ عوام کیا چاہتے ہیں۔ صرف ایک عوام ہی بے چارے ہیں کہ جن کو نہیں معلوم کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔

اگلے دن دوسری سفاری پر جانا تھا۔ اس سفاری میں دن سے زیادہ رات اہم تھی۔ ہوٹل کے پچھواڑے بہت بڑا

میں دو دن گزار کر نیروبی آ گیا۔

☆.....☆

میرے ملک ملک پھرنے کے تجربے نے مجھے یہ بتایا تھا کہ کسی شہر یا ملک کو دیکھنے کے دو طریقے ہیں یا تو ہیکٹیج ٹور لے لیا جائے یا پھر وہاں کے عام شہری کی طرح بسوں پر اور پیدل گھوما جائے۔ مجھے مختلف ممالک کے لوگوں کے طرز زندگی اور رہن سہن دیکھنے کا شوق ہے۔ میں ہر جگہ پیدل بہت گھومتا ہوں۔ ایسے تو پیدل گھومنے کے لیے میرا پسندیدہ شہر جیڑس اور سب سے زیادہ ناپسندیدہ لندن ہے۔

نیروبی آ کر میں اسی طرز پر گھومنے نکل گیا۔ ایک محلہ میں پہنچا تو وہاں ایک نوجوان سے ملاقات ہو گئی۔ ”کیا آپ سیاحت کے لیے آئے ہیں۔“ اس نے پوچھا پھر اپنی خدمات پیش کیں۔ ”میں آپ کو گھما سکتا ہوں۔“ گھمانے کے لیے تو کئی خطرناک معنی بھی ہو سکتے ہیں لیکن یہ لڑکا دیکھنے میں ٹھیک لگ رہا تھا۔ وہ مجھے گلیوں میں گھماتا رہا اور وہاں کے لوگوں کی باتیں بتاتا رہا۔ پھر ایک چار دیواری کے پاس جا کر رک گیا۔ ”کیا آپ ہمارے یہاں کے روایتی رقص دیکھنا پسند کریں گے؟“ میں سوچ میں پڑ گیا اس لیے کہ میں مومباسہ میں ایک کئی گھنٹے کا شو دیکھ چکا تھا۔ پھر میں نے اس سے تفصیل پوچھی۔ اس نے چار دیواری کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے اندر انتظام ہے آپ چاہیں تو رقص کا بندوبست ہو سکتا ہے۔ پندرہ بیس سنٹ لگیں گے۔ یہیں کے مقامی لڑکے لڑکیاں رقص کریں گے۔ ان کو جمع کرنے کا وقت چاہیے وہ لوگ تیاری میں لگ گئے۔ میں اس لڑکے کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ راستے میں چند بہت بڑے بڑے درخت دکھائی دیے۔ اس میں کچھ عجیب طرح کے چھوٹے چھوٹے پھل لٹک رہے تھے۔ ”یہ کیا ہے؟“ ”جی یہ کاجو کے درخت ہیں۔ توڑوں، آپ کھا میں گے۔“ میں نے منع کر دیا تا معلوم کیوں میرا خیال تھا کہ کاجو چھوٹے پودوں پر لگتے ہوں گے مگر یہ درخت تو امرود کے بڑے درختوں سے بھی زیادہ بڑے تھے۔ کاجو سری لنکا میں بھی بہت ہوتا ہے۔ وہ لوگ اس کو گھونپا کرتے ہیں۔ کئی سال بعد جب میں اور موسیٰ نوریلیا میں چائے کے باغات گھومنے جا رہے تھے تو راستے میں ایک چھوٹا شہر پڑتا تھا جس کا نام تھا، ”گھو گھو گھو“ وہاں سڑک پر لڑکے لڑکیاں کاجو بیچ رہے تھے جو وہاں کی مقامی پیداوار تھی۔

آدھے گھنٹے بعد واپس آئے تو رقص کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ افریقی ڈھول پیٹے جا رہے تھے۔ رقاصوں نے کمال

کے فن کا مظاہرہ کیا۔ ایک گھنٹا لگتا تھا پانچ منٹ میں گزر گیا۔ ان لوگوں نے پیسے لینے سے انکار کر دیا۔ میں ان کا مہمان تھا وہ مہمانوں سے پیسے نہیں لے سکتے تھے۔ لڑکے نے بھی پیسے نہ لیے۔ مہمان سے پیسے لینا بے عزتی کی بات تھی۔ میں شرمندہ ہو رہا تھا۔

☆.....☆

کل رات میں نیروبی سے واپس جدہ آ چکا تھا۔ اپنے دفتر میں لمانڈو کو اپنے افریقا کے سفر کی روئیدار سنارہا تھا کہ اتنے میں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ”میرے دفتر میں آ جاؤ۔“ یہ کرٹ کی آواز تھی۔ میں اپنی افریقا کی داستان ادھوری چھوڑ کر کرٹ کے دفتر کی طرف چل پڑا۔

”افریقا کیسا تھا؟“ کرٹ نے پوچھا۔

”ویسا ہی جیسا تم چھوڑ کر آئے تھے۔“ کرٹ سعودیہ آنے سے پہلے چند سال ایتھوپیا کی اتر لائن میں نوکری کر چکا تھا۔ اکثر وہاں کے قصے سنایا کرتا تھا۔

”تمہاری عیاشی کا ہفتہ ختم ہو چکا۔ اب اپنا رزق حلال کرو۔“ کرٹ کو سعودی عرب آ کر رزق حلال اور حرام سے آشنائی ہو چکی تھی۔

”میں نے پچھلے چار پانچ سال میں خوب رزق حلال کمایا ہے اب میرا حق بنتا ہے کہ میں اپنی باقی زندگی عیش کرنے میں گزار دوں۔“ میں نے کرٹ کو جواب دیا۔

کرٹ نے ایک آرگنائزیشن چارٹ (Organigation Chart) میرے آگے کر دیا۔

”یہ کیا ہے؟“ میں نے چارٹ تھامتے ہوئے پوچھا۔ ”یہ انجینئرنگ اور کوالٹی کا نیا سیٹ اپ ہے۔ تمہارا شعبہ بند کر دیا جائے گا۔ تمہارے ماتحت کام کرنے والے انجینئر فلائیڈ کے پاس چلے جائیں گے۔“ ”ٹھیک ہے لیکن میرا کیا بنے گا؟“

”تم میرے ساتھ کوالٹی کے شعبے میں چلو گے۔ مجھے کوالٹی ایسورنس کا ڈائریکٹر بنایا جا رہا ہے تم مینجنگ کوالٹی ایسورنس ہو گے۔“

”لیکن.....!“ میں نے احتجاج کیا مجھے تو ایسورنس کی الف بے کا بھی پتا نہیں ہے۔“

”تم کو مواصفات اور کنٹریکٹ کی الف بے کا پتا تھا؟“ کرٹ نے پوچھا۔

”نہیں۔“ میں نے کرٹ کو جواب دیا۔

”اب ہے؟“ اس نے جواب پوچھا۔ ”ہاں ہے۔“ میں

نے اقرار کیا۔

”تو کوالٹی ایشرس کا بھی ہو جائے گا کیس کلوڈ۔“
میں نے اپنا ہاتھ اس کے سامنے بڑھا دیا۔ ”ہیل ٹلر۔“ پھر
ہنستا ہوا اپنے دفتر واپس آ گیا۔ کرٹ جرمن نڑا تھا۔

کرٹ اور فلائیڈ کا بنایا ہوا ٹیکنیکل ڈویژن کا نیا چارٹ
جب منظوری کے لیے، رٹان و باغ وی پی ٹیکنیکل کے پاس گیا
تو اور سب تو منظور ہو گیا سوائے میرے مینیجر کوالٹی ایشرس
بنانے کے۔ اب میرے پاس تین راستے تھے۔ فلائیڈ کے
ساتھ بحیثیت ماسٹرانجینئر کام کروں یا کینیڈا واپس چلا جاؤں یا
پاکستان واپس چلا جاؤں۔ میں نے پاکستان واپس جانے کا
سوچ لیا لیکن جس خالق نے انسان کو بنایا ہے اس نے اس
انسان کے رزق کا بندوبست بھی فرمایا ہے۔ جیری جو پہلے تین
سال سے بحیثیت مینیجر ٹیکنیکل کنٹریکٹ کام کر رہا تھا اس نے
استغفیٰ دے دیا۔ یہ عہدہ مجھے سونپ دیا گیا۔

میں نے جب جیرا کا کام سنبھالا تو اس نے کہا۔ ”یہ
کام میں نے تم سے ہی لیا تھا اب واپس تم ہی کو سونپ رہا
ہوں۔ یہ تم ہی کو مبارک ہو۔ میں مہذب دنیا میں واپس جا رہا
ہوں۔“ یہ اس کی ناشکری تھی۔

سعودی عرب میں رہنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا تھا کہ
زیادہ تر گورے سعودی عرب کے ناشکرے تھے۔ وہ اسی بھرتی
سے اپنا رزق کماتے تھے اور اسی سر زمین کو اور اس کے باشندوں کو
پس ماندہ اور نیم تہذیب یافتہ گردانتے تھے۔ ان کا مذاق اڑاتے
تھے لیکن جیری اس مہذب دنیا میں صرف دو سال گزارنے کے
بعد سعودی عرب واپس آ چکا تھا اور میرے سامنے 2005 تک
ریاض سعودی عرب میں ملازمت کر رہا تھا۔

سرمنڈاتے ہی اولے پڑے۔ سعودیہ کے رولس رائس
کے RB-211 انجنوں کی مرمت اور اوور ہال کا کنٹریکٹ
برٹش ایرویز (BA) کے پاس آغا۔ یہ بہت بڑا کنٹریکٹ تھا اور
برٹن میں ہی بعد اس کی کارکردگی کا جائزہ میٹنگ ہوا کرتی تھی۔
یک سے ماہی جدہ میں اور ایک سے ماہی لندن میں۔ میرے
مینیجر کنٹریکٹ بننے کے چار دن بعد ہی یہ میٹنگ جدہ میں
نقہ ہونے والی تھی۔ اس کے لیے میری معلومات اور تیاری
فر سے بھی کم تھی۔ اس سے پہلے یہ میٹنگ کرٹ کے ماتحت
اکرتی تھی کین ہارمن کرٹ کے ساتھ ہوتا تھا وہ انجن کا ماہر
اب یہ میٹنگ مجھے سنبھالنی تھی۔

BA (برٹش ایرویز) کی میٹنگ میں میری کارکردگی کا
اتر اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ میٹنگ ختم ہونے کے

اگلے روز کین (Ken) میرے دفتر میں آیا۔ اس کے ہاتھ
میں ایک موٹی سی کتاب تھی اور ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ
”حسن تم کو اس کتاب کو پڑھنے کی اشد ضرورت ہے۔ اس کو
پڑھنے کے بعد تم کو معلوم ہو جائے گا کہ جہاز کا انجن کیا چیز ہوتی
ہے اور اس کی مرمت کیسے کی جاتی ہے۔“ میں نے کتاب لے
لی اور کین کا شکر یہ ادا کیا۔ اگلی میٹنگ تین مہینے بعد لندن میں
ہونی تھی۔ لندن کی میٹنگ کے لیے میں ہر طرح سے تیار تھا۔
اس میٹنگ کے بعد کین کو مجھے ایک اور کتاب دینے کی
ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

BA کے کنٹریکٹ کی آخری میٹنگ جدہ میں منعقد
ہوئی تھی۔ میٹنگ کے اختتام پر BA کے وفد کے ارکان کو
ہوٹل واپس پہنچانا میری ذمہ داری ٹھہری۔ میں راستے بھٹکنے میں
ماہر ہوں۔ اگر راستے بھٹکنے کا کوئی عالمی گولڈ میڈل ہوتا تو وہ
یقیناً مجھے مل چکا ہوتا۔ افسوس کہ ایسا کوئی عالمی انعام نہیں ہے۔
کنیز ورلڈ ریکارڈ والے بھی اس طرف توجہ دے سکتے ہیں۔
BA کے وفد کو مجھے جس ہوٹل میں چھوڑنا تھا وہ
کورنیش..... ساحل سمندر..... پر بنایا گیا تھا۔ وہاں پہنچنے کے
لیے مین روڈ سے ایک موڑ سرورس روڈ پر لینا پڑتا تھا۔ اس موڑ کو
ڈھونڈتے ڈھونڈتے جب میں کورنیش کے آخری سرے کے
قریب پہنچ گیا تو مجھے یقین ہو چکا تھا کہ میں ایک دفعہ پھر بھٹک
چکا ہوں۔ اپنی تھقت پر پردہ ڈالنے کے لیے میں نے گاڑی کو
روک کر BA کے وفد کے قائد کو مخاطب کیا۔

”آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے ہوٹل پہنچنے کا سب سے
آسان اور سب سے پہلے پہنچانے والا طریقہ کون سا ہے؟“
وہ بے چارہ حیران ہوا پھر نفی میں سر ہلایا۔ میں نے اس
کو طریقہ سمجھایا۔

”سب سے پہلے آپ ہوٹل کے جائے وقوع سے تین
کلومیٹر آگے نکل آئیں۔ پھر گاڑی روک کر غور کریں پھر یوٹرن
لے کر دوبارہ ہوٹل تلاش کریں۔“ وہ لوگ ہنسنے لگے میں نے
گاڑی واپس موڑ لی۔

اس طریق کار کو سننے کے بعد آپس کا حجاب ٹوٹ چکا
تھا۔ BA کے ایک مندوب نے مجھے ایک لطیفہ سنایا۔ کہنے
لگا۔ ”ایک دفعہ ایک فرانسیسی، ایک امریکی، ایک روسی اور ایک
پاکستانی ایک جہاز میں دنیا کے گرد چکر لگانے نکلے۔“
فرانسیسی نے جہاز کے باہر ہاتھ نکالا پھر کہا۔ ”میرا ملک آ گیا۔“
لوگوں نے پوچھا تم کو کیسے پتا چلا تو اس نے جواب دیا۔ ”میں
نے اسفل ٹاور کو چھوا۔ پھر اسی طرح روسی نے ہاتھ باہر نکال کر

فروری 2015ء

124

ماہنامہ سرگزشت

Copied From Web

نہ ہوں اور سعودیہ زبرد اسپتیر سے دو چار ہو تو پریٹ سعودیہ کو تیس دن کے لیے مفت لیز انجن فراہم کرے گی۔ تیس دن کے اختتام پر یا سعودیہ کے اپنے ایک یا زیادہ انجن قابل پرواز ہو جانے پر جو بھی پہلے وقوع پذیر ہو۔ سعودیہ یہ انجن پریٹ کو واپس کر دے گی۔

اتفاق سے ایک ایسا وقت آ گیا کہ سعودیہ کے پاس ایک بھی قابل پرواز اسپتیر انجن نہیں تھا۔ پریٹ نے اپنی ذمہ داری نباتے ہوئے سعودیہ کو ایک لیز انجن فراہم کر دیا۔ تیس دن گزر گئے مگر سعودیہ کا اپنا ایک بھی اسپتیر انجن قابل پرواز نہیں بنایا جاسکا۔ آج لیز انجن پریٹ کو واپس کرنا تھا۔ عدنان نے مجھے بلایا۔ ”انجن لیز کرنے کی کیا کیا شرائط ہیں۔“ عدنان نے دریافت کیا۔

”تیس دن کے بعد یہ انجن قابل پرواز حالت میں پریٹ کو سعودیہ کے خرچے پر واپس کر دیا جائے گا۔“ میں نے جواب دیا۔

عدنان نے انجن شاپ کے مینیجر کو مخاطب کیا۔ ”انجن کو ناقابل پرواز بنا دو۔“ یہ انجن اس وقت تک ناقابل پرواز رہا جب تک سعودیہ کا اپنا ایک انجن قابل پرواز نہیں بنالیا گیا۔ B-737 کے JT8D انجن کا کنٹریکٹ لفٹ ہنسا سے ختم ہو چکا تھا۔ اب یہ کنٹریکٹ آرکائیوڈ دیا گیا تھا۔ کین ہارمن اور میں میرے دفتر میں JT8D انجن کی اگلی سہ ماہی میٹنگ کی تیاری کر رہے تھے۔ یہ میٹنگ مانٹریال میں آرکائیوڈ کے ساتھ ہونے والی تھی۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ دوسری طرف سے عدنان کی آواز آئی۔ ”میں ایک انجن کی مرمت کا کنٹریکٹ بھیج رہا ہوں۔ اس کا تجزیہ کر کے مجھے چھٹی سے پہلے بھجوا دینا۔“ پھر مزید ہدایت۔ ”ایک ضروری بات سب اعداد و شمار پینسل سے لکھنا۔ صرف ایک کا پی بنانا۔“ ”حاضر حضور۔“

عدنان کا سیکریٹری کنٹریکٹ میرے دفتر پہنچا گیا۔ عدنان سعودیہ کے VP میکینکل تھے۔ یہ کنٹریکٹ ایک یورپی انٹرائزن اور یمن ائرویز کے درمیان تھا۔ یمن کے باشندوں کو سعودی عرب میں خاص مراعات حاصل تھیں جو کسی اور قومیت کے باشندوں کو حاصل نہ تھیں۔ ان کو کام کرنے کی آزادی تھی اور کاروبار کرنے کے لیے لکھل کی شرط بھی نہ تھی۔

(جاری ہے)

لہا یہ میرا طلب آ گیا۔ میں نے ریڈ اسلور کو چھوا۔ اس کے بعد امریکی نے کہا کہ میرا ملک آ گیا میں نے ایسا ٹرانسٹ بلڈنگ کو چھوا آخر میں پاکستانی کی باری تھی اس نے ہاتھ باہر نکال کر کہا۔ ”میرا ملک آ گیا“ جب لوگوں نے پوچھا تو اس نے جواب دیا۔ ”کسی نے میرے ہاتھ سے میری گھڑی اتار لی۔“ سب لوگ ہنسنے لگے میں ٹرمنڈہ ہو رہا تھا۔ اب تک میں ایسے لطیفے سعودی عرب میں مقیم لوگوں سے سنتا تھا لیکن آج لندن کا باسی مجھے ایسے لطیفے سنا رہا تھا۔ ہماری ایمانداری کے چرچے ہر جگہ سے جا سکتے ہیں۔ ہم کو کیسے کوئی گرائے گا؟ ہم نے خود کو گرایا ہے وہاں کرنے والے جہاں سنہلتے ہیں۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ ابھی سعودیہ کے تمام انجن مرمت کے لیے باہر بھیجے جاتے تھے۔ بونگ B-737 کے انجن ٹاڈل (JT8D) ایک فرانسیسی کمپنی Snecma میں مرمت ہوتے تھے۔ پھر جب یہ کنٹریکٹ اسنکما (Snecma) سے ختم ہوا تو یہ جرمن انٹرائزن لفٹ ہنسا کو دے دیا گیا۔ لفٹ ہنسا کے کنٹریکٹ میں ایک گارنٹی یہ بھی تھی کہ سعودیہ کے JT8D انجن کی مرمت کا سالانہ خرچہ ایک خاص حد سے تجاوز نہیں کرے گا اور اگر کرتا ہے تو لفٹ ہنسا اضافی خرچہ سعودیہ کو واپس کرے گی۔ سال کے اختتام پر حساب لگایا کہ اس سال کا خرچہ اس حد سے تجاوز کر چکا تھا۔ سعودیہ نے اپنا مطالبہ لفٹ ہنسا کو بھجوا دیا کہ اضافی پیسے سعودیہ کو واپس کیے جائیں۔ لفٹ ہنسا نے جواب دیا کہ یہ حسب کتاب ہر سال نہیں ہوگا بلکہ جب یہ کنٹریکٹ ختم ہوگا اس وقت یہ حساب کیا جائے گا۔ عدنان نے مجھے اپنے دفتر بلایا۔ ”کیا یہ سچ ہے کہ یہ حساب کنٹریکٹ کی مدت ختم ہونے کے بعد ہوگا۔“

”یہ بات کنٹریکٹ میں مبہم ہے واضح نہیں ہے۔“ ”ٹھیک ہے تم لفٹ ہنسا کو لکھ دو کہ نوٹس کی مدت ختم ہونے پر یہ کنٹریکٹ ختم کر دیا جائے گا۔“ نوٹس کی مدت 60 دن یا 90 دن تھی۔ اگلے ہفتے لفٹ ہنسا کی ٹیم جدہ میں موجود تھی۔ معاملات مل جل کر طے کر لیے گئے۔ لفٹ ہنسا یہ کنٹریکٹ نہیں کھونا چاہتی تھی۔ عدنان کو ایسے فیصلے کرنے میں ملکہ حاصل تھا۔

جب سعودیہ نے اربس A-300 کے لیے پریٹ اینڈ وٹنی کے JT9 انجن خریدے ہیں تو اس میں پریٹ نے ایک ذمہ داری لی تھی کہ اگر ایسی صورت حال پیش آئے کہ سعودیہ کے تمام کے تمام اسپتیر انجن یا اوزر پر مرمت ہوں یا قابل پرواز

عیار اعظم

سید احتشام

جرم کی تاریخ جتنی پرانی ہے اتنی ہی اقسام ہیں مجرموں کی۔ ایسے ایسے مجرم گزرے ہیں کہ ان کے بارے میں پڑھ کر ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اسفاک ہی نہیں عیاری و مکاری میں بھی بعض مجرم منفرد نظر آتے ہیں۔ زیرِ نظر مجرم بھی ایک ایسا ہی شخص تھا۔ اس نے آدھے یورپ کو دہلا دیا تھا۔ عیاری کی ایسی ایسی چالیں چلتا تھا کہ لوگ حیران رہ جاتے تھے۔



عالمی پیمانے پر مشہور مجرم کی عیاری کا قصہ

جرائم کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی خود انسان کی تاریخ اور یہ تاریخ ایک سے بڑھ کر ایک عیار اور شاطر مجرموں سے بھری پڑی ہے لیکن تمام ماہر جرائم اس بات پر متفق ہیں کہ جرائم کی پوری تاریخ میں وکٹر لستیگ Victor Lustig جیسا مکار مجرم پیدا نہیں ہوا۔ وہ قانون سے بچ نکلنے کے بے مثال ہتھکنڈوں سے پوری طرح لیس تھا۔ اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ چھیا لیس مرتبہ گرفتار ہوا اور ایک مرتبہ بھی اسے مجرم ثابت نہیں کیا

فروری 2015ء

127

ماہنامہ سرگزشت

Copied From Web

جاسکا۔

آنکھیں پھیل گئیں اور اس وقت تو مزید پھیل گئیں جب اس نواب نے یہ بتایا کہ وہ ایک پروڈیوسر ہے۔ وہ فتنہ ساماں صرف اٹھارہ برس کی تھی اور اس کا پیشہ وارانہ اعزاز محض ایک بی کلاس کی فلم تک ہی محدود تھا۔ لہذا جب اس پروڈیوسر اجنبی نے اس شوخ کی تعریف کرتے ہوئے یہ کہا کہ اسے اس میں بے پناہ صلاحیتیں نظر آ رہی ہیں اور یہ کہ وہ اس نا تراشیدہ ہیرے کو تراش خراش کر براڈوے کا ایک ایسا اشار بنا سکتا ہے جس کی جگہ گاہٹ نگاہوں کو خیرہ کر دے گی تو وہ حسن مجسم اور معصومیت کی پیکر پوری کی پوری اس کے پیشے میں اتر گئی۔

☆☆☆

اگلے چند دنوں تک وکٹر اور اسٹیلا سوہن، ہوانا کی سیر کرتے رہے۔ وقتاً فوقتاً تار بازی بھی کی اور اس طرح خود کو نمایاں کرتے رہے۔ جلد ہی وکٹر کی توجہ شہرے بالوں والے ایک نحیم نحیم امریکی نوجوان پر مرکوز ہو گئی جس کی شخصیت ڈرامائی تاثر کی حامل تھی۔ وکٹر نے سوچا کیا اسے کبھی تھیٹر کے کیڑے نے کاٹا تھا؟ اگر یہ بات تھی تو وہ وکٹر کا موزوں ترین شکار تھا جس کی اسے تلاش تھی۔ اس نوجوان امریکی سے تعارف حاصل کرنا کوئی مشکل نہیں تھا۔ اس کا نام رونا لڈ ڈانج تھا اور وہ ایک مالدار سیلز مین تھا۔

”تمہیں ایک بات بتاؤں۔“ وہ پرجوش لہجے میں بولا۔ ”مجھے تمہارے خطاب سے زیادہ براڈوے کے پروڈیوسر ہونے نے متاثر کیا ہے۔ مجھے شروع ہی سے تھیٹر میں کام کرنے کا بے حد شوق تھا۔ میں کالج کے ڈراموں میں حصہ لیا کرتا تھا۔ میں نے بڑی جانفشانی سے اپنے آبائی شہر میں چھوٹے چھوٹے تھیٹر یکل گروپس تشکیل دیے تھے۔ پھر بھی میں وہ مقام حاصل نہ کر سکا جس کا میں آرزو مند تھا۔“ اس کا لہجہ مایوسی میں ڈھل گیا۔

وکٹر بڑی ہمدردی اور توجہ سے اس کی داستان حسرت ستار ہا اور پھر اپنے شکار کے شوق اور جنون کا اندازہ کر کے اس نے بڑی شائستگی سے موضوع بدل دیا۔ جیسا کہ اسے توقع تھی اس دن کے بعد ڈانج پورے ہوانا میں اس کے ساتھ نظر آنے لگا۔ وہ وکٹر کی عیش و نشاط کی زندگی سے مسحور ہو گیا تھا اور ویسی ہی ہوشربا زندگی بسر کرنے کے خواب دیکھنے لگا تھا اور اس خواب کی تعبیر کو پانے کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار تھا۔ وکٹر بڑے محتاط انداز میں اس کے آتش شوق کو بجھزکا تا رہا۔

ان دنوں میں یعنی جیمز ایف جانسن یو ایس سیکرٹ سروس کا ایک ایجنٹ ہوا کرتا تھا۔ مجھے اس کیس میں ایک مرکزی کردار ادا کرنا پڑا جس نے بالآخر اس ماسٹر کرنس کو قانون کے شکنجے میں جکڑ کر انصاف کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا۔

وڈ گرگ دیدہ شخص جو خود کو کاؤنٹ وکٹر لسنیگ کہتا تھا قانون کو چکرو دینے کی عیارانہ صلاحیتوں سے مالا مال تھا۔ اب خدا تیرا بہتر جانتا ہے کہ یہ اس کا اصلی نام تھا یا نقلی کیوں کہ اس کے علاوہ اس کی دیگر تیس عرفیت تھیں۔ وہ کسی تویمی فسوں کاری سے حرکت کرتا اور نہایت سفاکی سے شکار پر شکار کیے چلا جاتا۔ وہ یو ایس سیکرٹ سروس ہی تھی جو بالآخر اسے ہمیشہ کے لیے سلاخوں کے پیچھے بھیجنے میں کامیاب ہوئی۔ اسے سینتالیسویں مرتبہ گرفتار کر کے کیفر کردار تک پہنچانے میں میرا تعاون شامل تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس فیصلہ کن اور ناقابل فراموش آپریشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے ہمیں انتھک محنت کرنی پڑی تھی۔ اس کی زبانی سنی باڈز کو اپنے انداز میں پیش کر رہا ہوں۔

☆☆☆

وہ بے پرستوں اور بادہ خواروں کی ایک پرشور اور ہنگامہ خیز مخلوط پارٹی تھی۔ مستیاں اور رنگینیاں شباب پر تھیں۔ جام سے جام اور بدن سے بدن لگتا رہے تھے۔ لضا سگریٹ کے مرغولوں سے کیف ہو رہی تھی۔ شرکاء کے ہجوم میں ایک ورجن سے زائد نوخیز اور مڑشباب حسینائیں فلمسازوں کو لہانے اور رجھانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی تھیں تاکہ انہیں کسی فلم میں ہیروئن کا چانس مل جائے۔ یہ ہالی ووڈ کی روایتی محفل تھی جس میں شوخ و شگ حسینائیں پینے والوں کو نظروں سے بھی پلا رہی تھیں۔

تمام شرکائے محفل میں ایک شخص ایسا تھا جو سب سے جدا اور بالکل منفرد نظر آ رہا تھا۔ وجیہہ، بردبار اور پروڈیوسر اس کے جسم پر نگرینو ایوں کے طرز کار روایتی سوٹ تھا۔ وہ اپنے ہاتھ میں جام اٹھائے شرکائے محفل کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر ایک نوخیز حشر بدایاں پر پڑی۔ وہ شخص آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھا اور قریب پہنچ کر اس کے سامنے کورٹس بجالایا۔ ”مجھے کاؤنٹ وکٹر لسنیگ کہتے ہیں۔“ اس نے نہایت شیریں لہجے میں اپنا تعارف کرایا۔ لفظ کاؤنٹ یعنی نواب پر اس مددش کی نیم باز

”مسٹر ڈاج۔“ وہ محتاط لہجے میں گویا ہوا۔ ”میں بے شک ایک کھیل پیش کرنے پر بے حد سنجیدگی سے غور کر رہا ہوں لیکن ریہرسل میں صرف ایک شے مانع ہے۔“

”وہ کیا؟“ ڈاج نے گہرے اشتیاق سے پوچھا۔

”بات دراصل یہ ہے مسٹر ڈاج کہ ایک محتاط اندازے کے مطابق پروڈکشن کی کل لاگت ستر ہزار ڈالر ہے اور پچاس ہزار اب بھی کم پڑ رہے ہیں لیکن بے شک کسی بھی فرد کو انچاس فی صد سے زیادہ رقم کی سرمایہ کاری کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔“ اس کا لہجہ رازدارانہ تھا۔

”تو بات ہوگئی۔“ ڈاج دنور جذبات سے چیخ پڑا۔

”میں چونتیس ہزار ڈالر اس میں لگاؤں گا۔“

”مجھے منظور ہے۔“ ڈاج نے پُر جوش لہجے میں کہا۔

اس کے دوسرے ہی دن ڈاج کیوبا سے اپنے آبائی شہر پرووڈنس لوٹ گیا۔ داکٹر، اسٹیلا کے ساتھ وہیں قیام پذیر رہا لیکن فون پر ان دونوں کا رابطہ تھا۔ داکٹر باتوں ہی باتوں میں ڈاج کو اشارے کنائے سے یہ بتاتا رہا کہ یہ اس کی زندگی کا پہلا اور آخری موقع ہو سکتا ہے۔ کہیں یہ موقع اس کے ہاتھ سے نکل نہ جائے۔ اسی طرح تین ہفتے گزر گئے۔ تب ایک دن داکٹر نے اسٹیلا کو بتایا کہ وہ ”کاروباری دورے“ پر امریکا جا رہا ہے۔

”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔“ اسٹیلا نے کہا۔

”یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں۔“ داکٹر نے درستی سے جواب دیا۔

”میں تمہاری منت کرتی ہوں۔ خدا کے لیے تم مجھے یہاں تنہا چھوڑ کر مت جاؤ۔“ اسٹیلا کی حسین آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”میں کچھ نہیں سننا چاہتا۔ میرا کام سب سے اہم ہے اور میرا فیصلہ اٹل ہے۔“ داکٹر کا لہجہ سفاک تھا۔

وہ اسٹیلا کو ہوٹل میں بے یار و مددگار چھوڑ کر پرووڈنس روانہ ہو گیا۔ اسٹیلا روتی بھلکتی ہی رہ گئی۔

☆☆☆

پرووڈنس پہنچ کر داکٹر نے ایک ہوٹل میں قیام کیا اور ڈاج کو فون پر اپنی آمد کی اطلاع دی۔ ڈاج اس کا فون موصول کر کے خوشی سے ناچ اٹھا۔ ”تم کتنی دیر میں پہنچ رہے ہو؟“ داکٹر نے پوچھا۔

”میں ایک گھنٹے کے اندر پہنچ رہا ہوں۔“

”رقم ساتھ لانا نہ بھولنا۔“ داکٹر نے یاد دہانی کے طور پر کہا۔

”تم فکر مت کرو۔ میں نے رقم کا بندوبست کر لیا ہے۔“ ڈاج نے جواب دیا۔

”گڈ لک۔“ داکٹر بولا۔ ”میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

اس کے ایک گھنٹے کے بعد ڈاج کاؤنٹ کے ہوٹل کے روم میں تھا۔ کاؤنٹ داکٹر نے اپنے حصے کے چھتیس ہزار ڈالر گڈیوں کی شکل میں ڈاج کے سامنے رکھ دیے۔ ”یہ میرے حصے کے چھتیس ہزار ڈالر ہیں۔ چاہو تو گن لو۔“

”نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“ ڈاج نے کہا اور اپنے حصے کے چونتیس ہزار ڈالر نکال کر سامنے پھھی ہوئی

داکٹر ہچکچایا۔ ”دیکھو روتالڈ۔“ وہ بڑی اپنائیت سے بولا۔ ”تم میرے دوست ہو اور میں ایک دوست سے رقم لینا پسند نہیں کرتا۔ بالخصوص ایک ایسے کاروبار میں جو درحقیقت ایک قسم کا جوا ہے اور جوئے میں کچھ بھی ممکن ہے۔ اگر وہ کھیل پٹ گیا تو ہم دیوالیہ ہو جائیں گے۔ ایمان سے میں تمہیں برا ڈوں، پروڈکشن میں سرمایہ کاری کا مشورہ نہیں دوں گا۔“

ڈاج کی آنکھوں پر پٹی بندھ گئی۔ وہ داکٹر سے زور و شور سے بحث کرنے لگا۔ ”سنو کنز میں ٹھیٹر کا بے حد شائق ہوں اور یہ رسک لینے کو بالکل تیار ہوں۔“ وہ بولا۔

”میں تم سے بحث کر کے نہیں جیت سکتا۔“ داکٹر نے ہار مانتے ہوئے کہا۔

”اب معاہدے کی کیا صورت ہوگی؟“ ڈاج نے پوچھا۔ ”کیونکہ یہاں نہ تو ہمارے درمیان کوئی معاہدہ طے پا سکتا ہے اور نہ ہی میں اتنی بڑی رقم ادا کر سکتا ہوں۔“

”یہ قابل فہم ہے۔“ داکٹر نے اتفاق کیا۔ ”ظاہر ہے کوئی شخص اتنی بڑی رقم لے کر غیر ممالک کی سیر و تفریح کے لیے نہیں نکلتا۔“

”درست۔“ ڈاج نے کہا۔ ”تو پھر ایسا کرتے ہیں کہ تم رموڈ آئی لینڈ میں میرے شہر پرووڈنس پہنچو۔ میں اس دوران میں اپنے حصے کی رقم کا جلد از جلد بندوبست کر لوں گا اور رقم مل بیٹھ کر معاہدے کی تفصیلات طے کر لیں گے۔“

”یہ منہ سب رہے گا۔“ داکٹر نے اتفاق کیا۔ ”لیکن ایک بات کا خیال رکھنا جب تک کل رقم کی ادائیگی نہیں ہوگی تب تک کوئی معاہدہ نہیں ہوگا۔“

بیز پر رکھ دیے۔ وکٹر نے اپنی اور اس کی گڈیاں اٹھا کر اپنے بریف کیس میں رکھیں اور بریف کیس منتقل کر کے الماری کے ایک شیلڈ میں رکھ دیا۔ ”اب اس خوشی میں چھوٹا موٹا جشن ہو جائے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”تم نے میرے منہ کی بات سمجھ لی۔“ ڈاج نے خوش ہو کر کہا۔

”قریب ہی ایک بے حد پرسکون بار ہے، وہیں چلتے ہیں۔“ وکٹر نے کہا۔

دونوں ہوٹل سے نکل کر پینے پلانے کی غرض سے اس بار میں پہنچ گئے لیکن ابھی وہ اطمینان سے بیٹھ بھی نہ پائے تھے کہ وکٹر کے ہوٹل کا نیل بوائے وہاں آدھمکا۔ ”کاؤنٹ لسٹنگ آپ کے لیے لندن سے ایک فون کال ہے۔“

”یہ کال ممکن ہے کھیل کے حقوق برائے انگلستان کے سلسلے میں ہو۔“ وکٹر خوش ہو کر بولا۔ ”میں ابھی آیا، دعا کرتے رہو۔“

اس کے ساتھ ہی وہ تیزی سے بار سے نکل گیا۔ ڈاج اس کے انتظار میں بیٹھا دعا کرتا رہا۔ لمحے آہستہ آہستہ بیت رہے تھے۔ ہرگز رتے لمحے کے ساتھ ڈاج کے اضطراب میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس طرح آدھا گھنٹا گزر گیا۔ ڈاج پریشان ہو کر اٹھا اور بار سے نکل کر واپس وکٹر کے ہوٹل پہنچ گیا۔ وکٹر کا کمر بالکل خالی تھا۔ نہ وہاں کوئی کپڑا تھا، نہ سوٹ کیس اور نہ ہی رقم۔ وکٹر فوفو چکر ہو گیا تھا۔ غصے کے مارے، ڈاج کا خون کھول اٹھا۔ اس نے فوراً پولیس کو مطلع کر دیا۔ یہاں پر یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وکٹر ایک بنیادی غلطی کر بیٹھا تھا۔ مجرمانہ کھیل کا ایک اصول یہ ہے کہ شکار سے رقم کسی ایسے بہانے سے اٹھنی جاتی ہے کہ وہ فوراً پولیس کے پاس نہ جا سکے۔ جہاں تک ڈاج کا تعلق تھا تو اس معاہدے میں کوئی غیر قانونی بات نہیں تھی۔ براڈوے کا پروڈیوسر بننے کی اس کی آرزو مذمت سے بالاتر تھی۔ اس نے اتنی تیزی سے پولیس کو حرکت دے دی تھی کہ وکٹر، پروڈیوسر کے ریلوے اسٹیشن پر ہی پکڑا جاتا مگر اس نے یہ چالاک کی کہ ریلوے اسٹیشن کا رخ کرنے کی بجائے ایک سرودہ کار میں قصباتی سڑکوں سے راہ فرار اختیار کر کے مونٹریال پہنچ گیا اور وہاں اپنے مجرم شناساؤں کے ہاں جا پہنچا۔

لیکن ڈاج کے غم و غصے میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ وہ تنہا وکٹر کے تعاقب میں واپس کیوبا ہوانا پہنچ گیا۔

وہاں اسے اسٹیلٹا بہت ہی برے حال میں ملی۔ وکٹر ہوٹل کا بل ادا کیے بغیر اسے چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ چونکہ اسٹیلٹا اپنی زبان کا ایک لفظ بھی نہیں بول سکتی تھی چنانچہ ہوٹل والوں نے اسے ہوٹل میں برہنہ رخص کرنے والیوں کے طائفے میں شامل ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ وہ ٹوٹ کر بکھر گئی تھی اور خود اپنی ہی نظروں میں گر گئی تھی۔ وکٹر نے اس کی روج کو پھل دیا تھا۔ ڈاج اس سے ملا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ڈاج نے اسے دو سو ڈالر دیے اور مشورہ دیا کہ وہ اپنے گھر لوٹ جائے۔ پھر وہ واپس پروڈیوسر چلا گیا۔ وہاں پہنچ کر اس نے اتنا بڑا طوفان کھڑا کر دیا کہ وکٹر کو مونٹریال بھی غیر محفوظ لگنے لگا۔ چنانچہ وہ جعلی پاسپورٹ بنا کر ایک مال بردار بحری جہاز میں سوار ہو کر فرانس پہنچ گیا۔

☆☆☆

فرانس میں قیام کے دوران میں وہ واپس امریکا پہنچنے کی ترکیبیں لڑانے لگا۔ اس زمانے میں امریکا اس جیسے ”باکمال“ لوگوں کے لیے بہترین شکار گاہ تھی۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ امریکا کی اہم بندرگاہوں کی سخت نگرانی ہو رہی ہوگی کیونکہ ڈاج بالکل ہو رہا تھا۔ اس نے آدمی درجن ریاستوں کی پولیس کو متحرک کر دیا تھا۔ لیکن مئی 1927ء تک وہ اس کا ایک دلیرانہ حل ڈھونڈ چکا تھا۔ اس ماہ کے اوائل میں وہ چھپ چھپا کر نیویارک جانے والے ایک بحری جہاز ماریطانیہ میں سوار ہو گیا۔ دوسرے دن اس نے سمندری سفر کے دوران میں جہاز کے ریڈیو روم سے نیویارک میں یو ایس سیکرٹ سروس کے ریڈیو ایجنٹ کو ایک پیغام بھیجا۔ پیغام میں یہ تحریر تھا۔ ”میرے پاس تمہارے لیے ایک نہایت اہم اطلاع ہے۔ میرا بحری جہاز ماریطانیہ بدھ کو وہاں لنگر انداز ہوگا۔ کاؤنٹ وکٹر لسٹنگ۔“ یہ پیغام بھیجنے کے بعد وہ بالکل مطمئن ہو گیا اور باقی سفر اس نے نہایت اطمینان سے کیا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ سیکرٹ سروس والوں کی دو خاص ذمے داریاں تھیں۔ صدر کی حفاظت کرنا اور جلساؤں کو پکڑنا۔ جب یہ پیغام ہمارے سیکرٹ سروس والوں کو پہنچا تو وہ یہی سمجھے کہ کاؤنٹ لسٹنگ کے پاس جلساڑی سے متعلق اہم اطلاعات ہوں گی چنانچہ انہوں نے ماریطانیہ کے لنگر انداز ہونے سے پہلے ہی اپنے دو ایجنٹوں کو پاکٹ بوٹ میں ماریطانیہ میں سوار ہونے کے لیے بھیج دیا۔ دونوں ایجنٹ کشتی میں سوار ہو کر کھلے سمندر میں پہنچ گئے اور نیویارک کی طرف گامزن بحری

ایک بار پھر تفتیش کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پیٹر ربانو اس پر اعتماد شخص کے منہ سے کام کی باتیں اگلوانا چاہتا تھا لیکن چار گھنٹے پھر پانچ گھنٹے اور پھر چھ گھنٹے گزر گئے۔ وکٹر کے چہرے سے نہ تو ٹھکن ظاہر ہو رہی تھی اور نہ ہی اس کی پیشانی پر ناگوار شکلیں نمودار ہو رہی تھیں۔ حالانکہ ربانو اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر رہا تھا اور اس کے جواب میں وہ مسلسل اپنی جہب زبانی سے اسے مات پر مات دیے جا رہا تھا۔

”بد قسمتی سے۔“ وہ ایک سوال کے جواب میں بولا۔
”کچھ نام میرے ذہن سے پھسل گئے ہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ آپ کے تعاون سے مجھے وہ نام یاد آ جائیں گے۔ میں یہاں رضا کارانہ طور پر آیا تھا اور اگر ضرورت پڑی تو میں بخوشی چوبیس گھنٹے آپ سے تعاون کرنے کو تیار ہوں۔ اب آخری سوال کیا تھا؟“

ربانو! ایک ایسے شخص کو ناراض نہیں کرنا چاہتا تھا جو اس سے تعاون کرنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ اس طرح آدھی رات ہو گئی۔ ربانو کے اعصاب جواب دینے لگے تھے۔ وکٹر بے ٹکان بولے جا رہا تھا۔

☆☆☆

یوں وہ اپنے منصوبے پر ٹھیک ٹھیک عمل کر کے ڈانچ کے پھرے داروں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ بعد میں جب وہ جعل سازی میں ملوث ہوا تو سیکرٹ سروس والے اس کے پیچھے لگ گئے۔ اس دوران میں وہ پوری سنجیدگی سے اس کے ماضی کو کھنگالنے لگے۔

وکٹر نے اپنی بحرمانہ زندگی کے ابتدائی تجربات پہلی جنگ عظیم سے پہلے، بحری جہازوں پر حاصل کیے جو بین الاقوامی امراء اور روسا کا من پسند مسکن تھا۔ وہ چیکو سلواکیہ کے ایک معزز گھرانے میں پیدا ہوا تھا جہاں سے وہ نوعمری ہی میں بھاگ گیا تھا۔ اس نے کچھ عرصہ پیرس میں ایک چھوٹے موٹے چوراہے کی حیثیت سے گزارا اور جلد ہی اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ راتوں رات امیر بننے کے لیے قمار بازی سے بہتر کوئی ذریعہ نہیں۔

اپنے تیسرے بحری سفر کے دوران میں اس کی ملاقات اس بحری جہاز میں ایک اور شاطر پیشہ ور پتے باز سے ہوئی جو اسی ارادے سے سفر کر رہا تھا جس ارادے سے وکٹر سفر کر رہا تھا۔ وہ لمبے قد کا ایک دبلا پتلا آدمی تھا۔ اس کی پتلی پتلی انگلیاں چابک دستی سے پتے بدل دیتیں کہ وکٹر کو بھی یقین نہ آتا کہ پتے بدل دیے گئے ہیں۔ جب وہ ایک

فروری 2015ء

131

ماہنامہ سرگزشت

جہاز میں سوار ہو گئے۔
وکٹر نے کسی نواب کی سی شان سے ایک فرسٹ کلاس کیبن میں ان کا استقبال کیا اور پھر گویا ہوا۔ ”میں اس وقت تم لوگوں سے بات نہیں کر سکتا کیونکہ میں اپنا سامان باندھنے اور اپنے دوستوں کو الوداع کہنے میں مصروف ہوں۔ اب ہم لنگر انداز ہونے ہی والے ہیں میں بخوشی تمہارے آفس ہینچ جاؤں گا۔ تاہم مجھے ایک چھوٹی سی مشکل پیش آ سکتی ہے۔“
وہ پرخیاں انداز میں ہنسی کر رک گیا۔

”وہ کیا؟“ ایجنٹوں نے پوچھا۔

”میں پروویڈنٹس میں ایک غلطی میں ملوث ہو گیا تھا اور وہاں کی پولیس ممکن ہے مجھ سے سوال و جواب کرنے کی منتظر ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مجھے واپس رسوڈ آئی لینڈ جانا پڑے۔“

سیکرٹ ایجنٹوں کو پروویڈنٹس میں پیش آنے والے اس واقعے کا کوئی علم نہیں تھا۔ چنانچہ ایجنٹ پیٹر ربانو نے بلا سوچے کچھ جواب دیا۔ ”اگر تمہارے پاس جعل سازی یا محترم صدر کے بارے میں ایسی کوئی اطلاع ہے جس سے ان کی جان کو خطرہ لاحق ہو تو یہ معاملہ سب سے اہم ہے۔ باقی چیزوں سے بعد میں بھی نمٹا جا سکتا ہے۔“

”معزز حضرات! میں یہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔“ وکٹر نے بڑی مہمویت سے کہا۔

جیسا کہ اسے توقع تھی جب ماریطانیہ لنگر انداز ہوا تو نیویارک کا ایک سراغ رساں اسے حراست میں لینے کے لیے وہاں موجود تھا لیکن اس موقع پر سیکرٹ ایجنٹ پیٹر ربانو نے مداخلت کی۔ اس نے اپنا سیکرٹ سروس کا بیج سراغ رساں کو دکھایا اور وضاحت کی کہ یہ وفاقی حکومت کا کیس ہے۔

سراغ رساں نے شانے اچکائے۔ ”اگر یہ تم لوگوں کا کیس ہے تو میرے خیال میں یہ تمہارا ہے۔“ اس نے کہا اور بندرگاہ سے نکل گیا۔

☆☆☆

نیویارک کے سیکرٹ سروس آفس پہنچ کر وکٹر کی جان میں جانا آئی۔ یہاں اسے اپنی جہب زبانی کے جوہر دکھانے تھے۔ وہ سیکرٹ سروس والوں سے بے حد تعاون کرتا نظر آ رہا تھا۔ وہ بے تحاشا بولتا چلا گیا لیکن اس کے منہ سے ایسا بہت کم اطلاعات نکلیں جو کام کی ہوں۔ اس دوران میں ربانو نے بیج کا آرڈر دے دیا اور بیج کے بعد

چھری تلے آنے کے لیے بے تاب تھا۔ ”میں کبھی کسی پیشہ ور جواری کے ساتھ نہیں کھیلا۔“ وہ گویا ہوا۔ ”میں یہ آزمانا چاہتا ہوں اور کون جانے؟ ہو سکتا ہے میں جیت جاؤں۔“

”کون جانے؟“ نگلی نے دہرایا۔ ”لیکن میں اب بھی آپ کے ساتھ کھیلتا نہیں چاہتا۔“

اس نے نہ صرف اس دن بلکہ اس سے اگلے دن اور اس سے اگلے دن بھی ڈکسن کے ساتھ جو کھیلنے سے انکار کر دیا لیکن سفر کی آخری رات وہ بظاہر طوعاً و کرہاً ڈکسن کے ساتھ کھیلنے بیٹھ گیا اور اس سے تیس ہزار جیت لیے۔ ڈکسن نے یہ بنیادی سبق اپنی گروہ میں باندھ لیا کہ شکار میں بھی اپنی دلچسپی ظاہر مت کرو بلکہ وہ جتنا آگے بڑھے تم اتنا ہی پیچھے ہٹو یہاں تک کہ وہ خود ہی اپنے گلے پر چھری پھروانے کے لیے تیار ہو جائے۔

جب پہلی جنگ عظیم نے بحر اوقیانوس کے سفر کو ناممکن بنا دیا تو وہ عارضی طور پر اپنی پرانی شکار گاہ پیرس لوٹ گیا اور اپنے پرانے دھندے میں لگ گیا لیکن جنگ کے ختم ہوتے ہی وہ سیدھے امریکا پہنچ گیا۔ اس زمانے میں امریکا ڈکسن جیسے لوگوں کے لیے بہترین پناہ گاہ تھا۔ نیویارک پہنچتے ہی اس نے نگلی کو ڈھونڈ نکالا اور اس کے ذریعے وہ امریکی جرائم کی دنیا میں متعارف ہوا لیکن وہ ان جرائم پیشہ کے ساتھ مل کر کام کرنے والوں میں سے نہیں تھا۔ اس نے ان سب سے رکی تعلقات تو رکھے لیکن وہ خود اپنی انا کا بادشاہ تھا۔ اس دوران میں نگلی سے دوستی کے نتیجے میں پچیس ہزار ڈالر کے لبرٹی بونڈز اس کے ہاتھ لگ گئے۔

☆☆☆

کینساس کے ایک مقامی سپلینا کے امریکن سیونگز بینک کا صدر ٹورمیٹ گرین ہر وقت اس بات پر کڑھتا رہتا تھا کہ وہ کون سی شخص گھڑی بھی جب بینک نے مارٹن فارم کا سودا کیا تھا۔ وہ چند سال پہلے اس فارم کو بند کرنے پر مجبور ہو گیا تھا اور اب اس کی عمارتیں گر رہی تھیں۔ نگلی ادا کرتے تھے اور کوئی خریدار نظر نہیں آ رہا تھا۔ نہ ہی اس کا کوئی امکان تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ مارٹن فارم کوئی اچھی جگہ نہیں تھی۔ لہذا کوئی بھی اسے خریدنے پر رضا مند نہیں ہوتا تھا۔ تب 1924ء میں موسم بہار کی ایک صبح ایک نہایت غیر معمولی ملاقاتی گرین کے دفتر میں نمودار ہوا۔

کینساس کے لوگ کبھی بھی دھاری دار سوٹ نہیں پہنتے تھے جیسا کہ ملاقاتی پہنے ہوئے تھا۔ نہ ہی بینک کا صدر

فروری 2015ء

دوسرے سے متعارف ہوئے تو ڈکسن کو معلوم ہوا کہ وہ نگلی آرٹسٹائن تھا، اس دور کا سب سے ماہر جواری چنانچہ دونوں شاطر آپس میں ہرے دوست بن گئے اور پارٹنر کی حیثیت سے پورا سال اتنا بحری جہاز پر امراء اور رؤسا کو دونوں ہاتھوں سے لوتے رہے۔ ڈکسن نے نگلی سے بہت گریسٹھے۔

”پہلے خود کو شکار کے حصول کے لیے ممکن بناؤ۔“ اس نے ایک دن ڈکسن سے گفتگو کے دوران کہا۔ ”اس سے دوستی کرو اور اسے یہ سوچنے کا موقع دو کہ تم کیا چاہتے ہو۔ انتظار کرو اور جب وہ سمجھ جائے تو پیچھے ہٹ جاؤ۔“

”مجھے شک ہے کہ شکار اسی طرح جال میں پھنسے گا۔“ ڈکسن نے خیال پیش کیا۔

”ممکن ہے ہر شکار نہ پھنسے لیکن اہم شکار ضرور پھنسے گا۔“ نگلی نے جواب دیا۔ ”میں تمہیں اس کا عملی مظاہرہ کر کے دکھاتا ہوں۔“ اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ ”جب تم اندر آئے تھے تو کیا تم نے اس شخص کو دیکھا تھا جس سے میں باتیں کر رہا تھا۔ اس کا نام ہنری ڈکسن ہے وہ ایک رئیس ہے اور اکتاہٹ کا شکار ہے۔ اس نے اب تک تاش کھیلنے کی خواہش ظاہر نہیں کی ہے لیکن وہ کرے گا اور جب وہ ایسا کرے گا تو میں اسے بتا دوں گا کہ میں کیا ہوں۔ پھر بھی وہ میرے ساتھ کھیلتا چاہے گا، تم دیکھنا۔“

نگلی واپس بار میں ڈکسن کے پاس لوٹ گیا اور اس سے پھر سے گفتگو میں مشغول ہو گیا۔ دوسرے ڈرنک کے دوران میں ہنری ڈکسن نے تاش کھیلنے کی خواہش ظاہر کر دی۔ نگلی نے ایک لمبے سوچا اور پھر کہا۔ ”مسٹر ڈکسن، میں ایسا نہیں سمجھتا۔ مجھے آپ کی دوستی عزیز ہے اور میں اس دوستی کو برقرار رکھنا چاہتا ہوں۔“

”کیا تم مجھے بتاؤ کہ میں ہر جاؤں گا؟“ ڈکسن نے پوچھا۔

”قطعاً نہیں۔“ نگلی نے شائستگی سے جواب دیا۔

”لیکن آپ کو جیتنے کا کوئی موقع نہیں ملے گا۔ دیکھیں، بات دراصل یہ ہے کہ میں ایک پیشہ ور جواری ہوں۔“

”اگر میں تمہارے ساتھ نہ کھیلا تو مجھ پر لعنت۔“

ڈکسن فیصلہ کن لہجے میں بولا۔

ڈکسن ایک قریبی بیز پر بیٹھا ان دونوں کے درمیان ہونے والی یہ حیران کن گفتگو سن رہا تھا۔ اس کے خیال میں نگلی سے ایک بھیانک غلطی سرزد ہو گئی تھی لیکن اس کا خیال غلط تھا۔ اگلے دن جب ڈکسن اور نگلی بار میں ملے تو شکار

ٹورمیٹ گرین اس مہذب زبان اور غیر ملکی لب و لہجے سے مانوس تھا جس میں وہ اجنبی مخاطب ہوا۔ گرین نے تھوڑی سی بے اطمینانی محسوس کرتے ہوئے اپنی شناخت کرائی اور پھر استفسار کیا۔

”ہیں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“

”میرا نام کاؤنٹ وکٹر لسننگ ہے۔“ نووارد نے

کہا۔ ”میرا ایک فارم خریدنا چاہتا ہوں۔“

”فارم؟“ گرین اچانک سیدھا ہو بیٹھا۔

”ہاں۔“ وکٹر نے اس کے سامنے ایک کرسی پر بیٹھتے

ہوئے کہا۔ ”موسیو! آپ کے سامنے پچھلے دور کا ایک پناہ

گزرین ہے۔ ایسٹ ٹائروں میں ہمارے کسانوں نے

بغاوت کر دی ہے اور ہم سے ہمارا سب کچھ چھین لیا ہے۔

ہمارے آلور کے باغات اور ہمارے، موٹی جوئل درسل

ہماری ملکیت چلے آ رہے تھے، ہاتھ سے نکل گئے ہیں۔ اب

مجھے از سر نو زندگی شروع کرنی ہے۔“

”ہاں، بے شک۔“ گرین بولا۔

”میں یہاں مضافات کا جائزہ لیتا رہا ہوں۔“ وکٹر

نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”اور مجھے ایک ایسی

جگہ مل گئی ہے جو مجھے اچھی لگی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس جگہ

کو مارٹن فارم کہتے ہیں۔ کیا آپ اس کے مالک کو جانتے

ہیں؟“

”میں..... ہم ہی اس کے مالک ہیں۔“ گرین نے

مریل آراز میں کہا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کوئی

خواب دیکھ رہا ہو۔ ”یہ..... یہ برائے فروخت

ہے..... نہایت مناسب قیمت پر۔“

وکٹر نے اپنے چہرے پر پچھتاوے کے تاثرات پیدا

کیے۔ ”میں تھوڑی سی رقم کے ساتھ آسٹریا سے فرار ہونے

میں کامیاب ہو سکا۔“ اس نے اپنی ایک اندرونی جیب سے

ایک لفافہ برآمد کیا اور بینکر کو پیش کر دیا۔ پھر گویا ہوا۔ ”جب

میں نیویارک پہنچا تو خاندان کے زیورات اس رقم میں

تبدیل کر لیے۔ کیا یہ رقم کافی ہوگی؟“

گرین نے لفافہ کھولا اور پچیس ہزار کے لبرٹی بونڈز

باہر آ گئے۔ گرین نے بڑی مشکل سے اپنی کیفیت پر قابو پایا

اور گویا ہوا۔ ”ہاں، بالکل..... میرے خیال میں، ہم وہ فارم

اتنی قیمت میں فروخت کر دیں گے۔“

وکٹر نے بڑی احتیاط سے وہ لفافہ واپس اپنی جیب

میں رکھ لیا اور پھر گرین اور بینک کا نائب صدر جان روز،

اسے مارٹن کی جائداد دکھانے لے گئے۔ فارم کی حالت نہایت خستہ تھی اور اسی وجہ سے گرین کا وہ یہ معذرت خواہانہ تھا لیکن وکٹر قطعاً مایوس نظر نہیں آ رہا تھا بلکہ بڑے رُجوش انداز میں انہیں بتا رہا تھا کہ چند ہی برسوں میں وہ جگہ کیسی لگنے لگے گی۔ جب وہ اچھی طرح اس جگہ کا معائنہ کر چکا تو اس نے ان دونوں بینکرز سے اگلے دن اپنے ہوٹل کے کمرے میں ملنے کی خواہش ظاہر کی تاکہ اس خرید و فروخت کو حتمی شکل دی جاسکے۔

”ایک اور بات بھی ہے۔“ وہ آخر میں بولا۔ ”اس

فارم کو قابل کاشت بنانے اور اس سے کچھ کمانے میں

برسوں لگیں گے اور مجھے اس کے لیے سرمائے کی ضرورت ہو

گی۔ میرے پاس پچیس ہزار ڈالر کے دوسرے لبرٹی بونڈز

بھی ہیں۔ کیا وہ کیش ہو جائیں گے؟“

”اس سے آسان تو کوئی بات ہو ہی نہیں سکتی۔“

گرین نے یقین دلایا۔

لہذا اگلے دن جب وہ دونوں بینکر وکٹر کے ہوٹل کے

کمرے میں پہنچے تو پچیس ہزار ڈالر کیش اور مارٹن فارم کے

دستاویزات بھی ساتھ لیتے آئے۔ وکٹر نے ڈریسر کی ایک

دراز سے بھورے رنگ کا ایک لفافہ نکالا اور اسے ایک طرف

سے کھول کر انہیں بونڈز کی گڈیوں کا دیدار کرایا۔

”پچاس ہزار ڈالر مالیت کے بونڈز۔“ وہ بولا۔ پھر

اس نے لفافہ واپس اسی دراز میں رکھ کر دراز بند کر دی۔

اب اس نے ایک دوسری دراز سے داسکی کی ایک

بوٹل نکالی۔ ”آسٹریا میں زمین کی خرید و فروخت پر ایک

چھوٹا موٹا جشن منایا جاتا ہے۔“ اس نے کہا اور انہیں جام

بھر بھر کے پیش کیے۔

انہیں آسٹریا طرز کے جشن منانے پر بھلا کیا

اعتراض ہو سکتا تھا۔ چنانچہ کئی دور چل گئے۔ پھر وکٹر نے ان

کے پچیس ہزار ڈالر کیش کے عوض بونڈز کا وہ براؤن لفافہ اور

دستاویزات انہیں دے دیے۔ ایک دوسرے سے مصافحہ کیا

اور وہ دونوں بینکر واپس بینک آ گئے تاکہ بونڈز کا معائنہ کر

سکیں لیکن لفافے سے جو شے برآمد ہوئی اسے دیکھ کر ان

دونوں کے ہوش اڑ گئے اور جسم سے ٹھنڈا پینا پھوٹ پڑا۔ وہ

واپس بھاگے بھاگے ہوٹل پہنچے لیکن وکٹر وہاں سے رن وچکر ہو

چکا تھا۔ اس کا کمر خالی پڑا تھا۔ ان کے ہاتھ میں جو براؤن

لفافہ تھا اس میں پرانے اخبار کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

☆☆☆

ولتر نے اس اعتماد اور یقین کے ساتھ کہ بیشتر لوگ اپنا نقصان برداشت کر لیتے ہیں اور سب بھول جاتے ہیں۔ اپنا سراغ چھپانے کی کوئی کوشش نہیں کی لیکن اس مرتبہ وہ غلط ثابت ہوا۔ اس واقعہ کے چند ہی دنوں کے بعد وہ جھکڑیاں پہنے ہوئے بینک کے وکیل اور سراغ رساں رے ایلٹن کی حراست میں ٹرین کے ایک کمپارٹمنٹ میں واپس کینساس کا سفر کر رہا تھا۔ شکاگو پہنچنے تک اٹھارہ گھنٹے کی مسافت کے دوران میں وہ بیشتر وقت اس پریشان کن صورت حال سے بالکل بے نیاز نظر آیا۔ گا ہے گا ہے وہ ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا لیکن پھر آہستہ آہستہ ایک پیٹرن ابھرتا چلا گیا۔ وہ سراغ رساں ایلٹن پر یہ حقیقت واضح کرنا چاہتا تھا کہ اس پر مقدمہ چلانا خود اس کے موکل کے حق میں برا ہو سکتا ہے۔

”میں تم سے پوچھتا ہوں۔“ وہ ایک زہر خند سے بولا۔ ”کیا مارٹن جیکسکی وہابیات جگہ کے لیے پچیس ہزار ڈالر طلب کرنا دیانت داری تھی؟ مزہ تو تب آئے گا جب اس کیس کی تشہیر کے نتیجے میں سارے اکاؤنٹ ہولڈرز بینک سے اپنی رقم نکالنے کے لیے دوڑ پڑیں گے اور بے پناہ ہجوم ہو جائے گا۔ انہیں پیسے ہی معلوم ہو گا کہ ان کے بینک افسران کو ٹھگ لیا گیا تھا تو ان پر سے ان کا اعتماد ختم ہو جائے گا اور بینک تباہ ہو جائے گا۔ دوسری طرف اگر تم مجھے رہا کر دو تو میں ساری رقم واپس کر دوں گا۔ پھر کسی کو بھی نقصان نہیں ہوگا اور کوئی بد مزگی نہیں ہوگی۔“

یہ ساری باتیں سراغ رساں ایلٹن کی آئیڈیا لوجی کے خلاف تھیں لیکن ان باتوں میں بڑا وزن تھا۔ ان میں سادگی بھی تھی اور پرکاری بھی۔ جب وہ شیکاگو پہنچے تو ایلٹن نے سیلینا کال کیا اور ان بینک کاروں سے تفصیلی بات کی۔ آخر میں وہ وکٹر کو اس شرط پر رہا کرنے پر تیار ہو گئے کہ وہ ساری رقم ادا کر دے۔ وکٹر راضی ہو گیا۔

☆☆☆

یہ مونٹریال تھا جہاں وکٹر کو اپنا اگلا بڑا شکار نظر آیا۔ وہ حسب معمول شہر کے سب سے اعلیٰ ہوٹل میں ٹھہرا۔ جلد ہی ایک بے جوڑ جوڑے نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرا لی۔ مرد نمایاں شخصیت کا حامل ایک عمر رسیدہ شخص تھا جب کہ اس کی ساتھی ایک شوخ و شنگ نوخیز حسینہ تھی۔ وکٹر نے بڑی ہوشیاری سے ہوٹل کے نیٹل کیپٹن سے باتوں ہی باتوں میں اس جوڑے کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں۔ نیٹل کیپٹن نے اسے بتایا کہ مرد کا نام لینس مرٹن تھا۔ وہ ایک

چھوٹے سے شہر ورمونٹ کا میئر تھا جو اکثر مونٹریال میں اپنی بیوی کے ہمراہ چھٹیاں گزارا کرتا تھا۔

اب وکٹر نے اپنی شاطرانہ چال چلنے کے لیے پہلا قدم اٹھایا۔ اس نے مرٹن کی جیب سے پرس اڑانے کے لیے شہر کے بہترین پاکٹ مار کی خدمات حاصل کیں لیکن ساتھ ہی اسے سختی سے خبردار کیا کہ وہ پرس کو کھول کر دیکھنے کی کوشش نہیں کرے گا۔ اس جیب کترے ایمل کے لیے یہ باتیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ اس نے اگلے ہی دن مرٹن کا پرس اڑا کر وکٹر کے حوالے کر دیا اور جب وکٹر نے مرٹن کا تم شدہ پرس اسے لوٹا یا تو وہ اس قدر خوش ہوا کہ اس نے وکٹر کو انعام دینا چاہا لیکن وکٹر نے برامانتے ہوئے اس کی یہ پیشکش سختی سے ٹھکرادی۔

دونوں کے درمیان بہت تیزی سے دوستی استوار ہو گئی۔ قدرتی طور پر مرٹن کو جسس ہوا کہ اس کا نیا دوست کس طرح پیسے کماتا تھا۔ اس کا ذریعہ آمدن کیا تھا کیوں کہ وہ بہت پیسے والا لگتا تھا۔ پہلے پہل وکٹر نے بتانے سے گریز کیا لیکن جب مرٹن نے اصرار کیا تو وہ اپنی وہی کہانی سنانے لگا کہ اس کے پاس بہت زمینیں تھیں لیکن کاشت کار باغی ہو گئے اور سب کچھ ان سے چھین گیا۔

”میں صرف پیسے کمانے کے لیے کام کرنے کو پیدا نہیں ہوا تھا۔“ وہ بولا۔ ”لیکن مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔“

”لگتا ہے تم بہت کچھ حاصل کر چکے ہو۔“ مرٹن نے کہا۔ ”تمہارا ذریعہ آمدن کیا ہے؟“

”گھوڑے۔“ وکٹر نے جواب دیا۔

”تو تم جواری ہو؟“ مرٹن نے پوچھا۔

”بہ مشکل ہی جواری ہوں، لنیس۔“ وکٹر نے بے تکلفی سے کہا۔ ”میں یقینی چیزوں پر شرطیں لگاتا ہوں۔“

”وہ کس طرح؟“ مرٹن نے جسس سے پوچھا۔

”میرا ایک کزن ہے جو ایک ٹیلی گراف آپریٹر ہے۔“ اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”جیسے ہی یو

ایس ایس کے نتائج مونٹریال پہنچتے ہیں یہ ایمل کی ڈیوٹی ہوتی ہے کہ وہ ان نتائج کو شرط لگانے والے منتقل پارلر کو

رہیلے کر دے لیکن ایمل کبھی کبھی تھوڑی تاخیر سے اپنی

رپورٹ بھیجتا ہے اور اسے اتنی مہلت مل جاتی ہے کہ وہ اسی

دوران میں مجھے فون پر یہ بتا دے کہ میں کس جیتنے والے

گھوڑے پر شرط لگاؤں۔ یہ بہت سیدھا سادا معاملہ ہے۔“

اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”میں آج ہی

اپنے پیسوں سے تمہارے لیے ایک چھوٹی سی شرط لگاؤں گا۔ سوڈا کی شرط اگر تم جیت گئے تو جیت کی رقم تمہاری اور ہار گئے تو میں تمہاری طرف سے ڈنر کروں گا۔ بولو منظور ہے؟“

”منظور ہے۔“ مرٹن بولا۔

اس سہ پہر وکٹر نے ایک ہزار ڈالر گمن کر مرٹن کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ ”یہ رانی جیت کی رقم۔“ اس نے کہا۔ ”اب اس کے بارے میں کوئی بات مت کرو۔“

لیکن مینکر مرٹن اس کے بابت بہت کچھ جانتا چاہتا تھا۔ اگلی صبح وہ دونوں ایمیل سے ملنے والے ٹیلی گراف آفس پہنچ گئے۔ ابھی وہی جیب کتر تھا جس نے مرٹن کا پرس اڑایا تھا۔ اس نے بڑی مشکل سے وکٹر کے کہنے سننے پر مرٹن کو اندر آنے کی اجازت دی۔ اس سہ پہر وکٹر مرٹن کو شرط بازوں کے ایک پارلر لے گیا۔ وہاں ایک کیشیئر کی کھڑکی کے آگے متمول افراد قطار میں کھڑے تھے۔ یہ سب کے سب مونٹریال کی جرائم کی دنیا کے باسی تھے۔ جنہیں وکٹر نے بہت احتیاط سے چنا تھا اور ریہرسل کرائی تھی۔

وکٹر نے اپنی کلائی کی گھڑی کی طرف دیکھا اور مرٹن کو کہنی ماری۔ ایمیل کو کال کرنے کا وقت ہو گیا تھا۔ وہ دونوں اس کیمبن کے سامنے واقع ایک فون بوتھ تک گئے اور جب فون کی گھنٹی بجی تو وکٹر نے مرٹن کو ریہرسل اٹھانے کی اجازت دے دی۔ مرٹن نے ریہرسل اٹھایا۔

”ہینڈ کو آرڈر چوٹی ریس میں جیتے گا۔“ ایمیل کی آواز سمع برگوش ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی کلک کی آواز کے ساتھ سلسلہ منقطع ہو گیا اور واقعی ہینڈ کو آرڈر جیت گیا۔ شروع شروع میں مرٹن کی قسمت نے کچھ زیادہ ساتھ نہیں دیا لیکن سہ پہر میں جب ریس ختم ہوئی تو مرٹن ڈھائی ہزار ڈالر جیت چکا تھا۔ اگلے دن کی ریس میں وہ پانچ ہزار ڈالر جیتا۔ اب اس کی حرص بڑھتی جا رہی تھی چنانچہ اب وکٹر نے اس کے گلے پر چھری پھیرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اگلی صبح دونوں ایمیل کو اس کا حصہ دینے کے لیے اس سے ملے لیکن ایمیل کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ وہ پیسے لے کر بھی خوش نہیں ہوا۔ بالآخر وہ بول پڑا۔ ”میں یہ جاب چھوڑ رہا ہوں۔ میری بیوی..... وہ کچھ عرصہ سے بیمار ہے اور اب ڈاکٹر نے اس کے مرض کی تشخیص کر دی ہے۔ اسے ٹی بی ہے۔ مجھے فوراً سے یہاں کی آب و ہوا سے دور کہیں اور لے جانا ہے۔“

”لیکن میاں، خدا کے لیے۔“ مرٹن پھٹ پڑا۔ ”کیا تم تھوڑا راک نہیں سکتے؟ میرا مطلب ہے جب تک یہ کھیل جاری ہے۔“

”کیا تم سمجھتے ہو کہ میرے لیے میری بیوی سے زیادہ پیسے کی اہمیت ہے؟“ ایمیل غصے سے حلق پھاڑ کر چیخا۔ ”نہیں، ہرگز نہیں، ایسا نہیں ہے۔ میں فوری جا رہا ہوں۔“

وکٹر قدم اٹھا کر ان دونوں کے درمیان آ گیا۔ ”بے شک۔“ وہ ایمیل کو مناتے ہوئے بولا۔ ”ایلیز کی صحت سب سے اہم ہے۔“ پھر وہ مینکر کی طرف مڑا۔ ”مجھے افسوس ہے لیس..... لیکن میں اپنے کزن سے متفق ہوں اور ویسے بھی تم خاصے ڈالر کماتے ہو۔“

”کیا ہم ایک مرتبہ اور نہیں کھیل سکتے؟ صرف ایک مرتبہ۔“ مرٹن نے منت کی۔ ”ہم سب سے بڑی شرط لگا سکتے ہیں۔“

”سب سے بڑی شرط لگانے کے لیے ڈھیر ساری رقم کی ضرورت پڑے گی۔“ کاؤنٹ وکٹر نے کہا۔ ”داؤ پر اکٹھی رقم لگائے بغیر یہ نہیں ہو سکتا۔ میں تیس ہزار ڈالر کا انتظار کر سکتا ہوں۔ کیا تم بھی اتنی ہی رقم داؤ پر لگا سکتے ہو، لیس؟ کیوں کہ تیس ہزار ڈالر کافی ہیں۔“

”میں..... میں میرا خیال ہے کہ میں اتنی رقم لگا سکتا ہوں۔“

وکٹر اپنے کزن کی طرف مڑا۔ ”اس بارے میں کیا خیال ہے ایمیل؟ کیا ہم مزید ایک داؤ نہ لگالیں؟“

☆☆☆

واپس ہوٹل جاتے ہوئے وکٹر بہت مڑجوش نظر آ رہا تھا وہ مرٹن کا دھیان بنائے رکھنے کے لیے دلچسپ باتیں کرتا رہا۔ جب وہ ہوٹل کے قریب پہنچے تو وکٹر نے کہا۔ ”ہمیں تمہاری بیوی کو تمہارے منصوبوں سے ضرور آگاہ کرنا چاہیے۔ واقعی تمہیں جیتی ہوئی آدمی رقم اسے دینی چاہیے۔“

”آدمی؟“ مرٹن کے حلق سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔ ”آخر کیوں؟“

وکٹر اس کی طرف دیکھ کر سازشی انداز میں مسکرایا اور چپ رہا۔

اگلی صبح وکٹر مارٹن کو لے کر جو اپنے ہاتھ میں ستر ہزار ڈالر بھینچے ہوئے تھا۔ واپس کی پارلر پہنچا۔ مقررہ وقت پر فون کی گھنٹی بجی اور ایمیل کی آواز سنائی دی۔ ”چھٹی ریس میں ہلڈا پر رکھ دو۔“

پہنایا تو مرٹن کی بیوی اسے چھوڑ کر چلی گئی۔ وکٹر کا منصوبہ پورا ہو گیا۔ مرٹن اپنی الجھنتوں میں پھنس کر اسے بالکل بھول گیا۔

☆☆☆

مرٹن سے فراڈ کرنے کے بعد وکٹر مونٹریال سے سیدھے ہیرس پہنچ گیا اور وہاں وہ پورا ہفتہ آرام کرتا رہا۔ اس دوران میں وہ کبھی کسی کیفے میں درماؤتھ کی چسکیاں لیتا یا فٹ پاتھوں پر چہل قدمی کرتے ہوئے اسٹالوں پر کھڑے ہو کر اخبارات کو الٹا پلٹتا رہتا لیکن وہ تنہا نہیں ہوتا۔ اس کے ہمراہ ایک اچکا ہوا کرتا تھا جس کا نام کولینز عرف ڈیپریڈین تھا۔

اس دن ایک اسٹال پر کاؤنٹ وکٹر نے اچانک ایک روز نامہ تہہ کر کے اپنے پرائیویٹ سیکریٹری کے سامنے رکھ دیا اور گویا ہوا۔ ”میں جانتا ہوں کہ ہمارا شکار کیا ہے لیکن میں نہیں جانتا کہ کون ہماری چھری تلے آئے گا۔ وہ جو کوئی بھی ہوگا اس کا تعلق فولاد کے سامان کی خرید و فروخت سے ہوگا۔ اس شخص نے حال ہی میں دو بڑے سودے کیے ہیں اور خوب مال کمایا ہے۔ اب وہ بڑی چیزوں کا سودا کرنا چاہتا ہے۔ یہ آئٹم پڑھو۔“ اس نے ایک چھوٹی سی خبر کی طرف اشارہ کیا۔

اس خبر کے مطابق انہیں ٹاور کی مرمت کی ضرورت تھی لیکن اس کی مرمت پر بے حد خرچ آ رہا تھا۔ چنانچہ فرانسیسی حکومت اس بات کا جائزہ لے رہی تھی کہ اسے قائم رکھنے کی بجائے بیچ دینا سستا بڑے گا۔ خبر پڑھ کر ڈیپریڈین کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ ”کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟“ وہ بولا۔ ”تم ایسا نہیں کر سکتے۔“

”میرا خیال ہے کہ ہم ایسا کر سکتے ہیں۔“ کاؤنٹ وکٹر نے پورے اعتماد سے جواب دیا۔ ”اخبار نے سب سے دشوار کام ہمارے لیے آسان کر دیا ہے۔ اب ہمیں صرف حکومت کا ایک سفارشی خط اور چند لیٹر ہیڈ ورکار ہوں گے۔“

☆☆☆

اس کے چند ہی دنوں کے بعد لوہے کے پانچ بڑے کاروباریوں کو اس بیورو کے ڈپٹی ڈائریکٹرز کی جانب سے ذاتی خطوط موصول ہوئے جسے ایفل ٹاور پر عدالتی اختیار تھا۔ ان خطوط میں انہیں ملنے اور حکومت کا ایک ٹھیکہ دینے کے سلسلے میں گفت و شنید کی دعوت دی گئی تھی۔ وقت تین بجے

مرٹن کو بروقت شرط لگانے کی مہلت مل گئی۔ اسی وقت کیشیئر نے چیخ کر کہا۔ ”رہس ختم ہو گئی۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے کھڑکی بند کر دی لیکن رہس کی رپورٹ مختلف تھی۔ اس مرتبہ مالی بین نامی گھوڑا اول نمبر پر رہا جب کہ بلڈا دوسرے نمبر پر رہی۔ مرٹن کے چہرے کا رنگ راکھ جیسے ہو گیا۔ اس کا سر چکرانے لگا۔ وکٹر اسے تھام کر دائر روم سے باہر لے آیا۔

”آخر یہ کیسے ہوا؟“ مرٹن حیرت اور صدمے کی کیفیت کے تحت بار بار دہرا رہا تھا۔ ”آخر ہوا کیا؟“ وکٹر بھی بظاہر ویسا ہی پریشان نظر آ رہا تھا۔ ”ہمیں کزن ایمل کو ڈھونڈنا پڑے گا۔“ وہ بولا۔ ”کیا تمہیں یقین ہے کہ تم نے صحیح سنا تھا؟“

ایمل ٹیلی گراف آفس سے نکل ہی رہا تھا کہ انہیں مل گیا۔ جب اسے وہ خبر سنائی گئی تو وہ مرٹن کی طرف مڑ کر غصے سے تیخ پڑا۔ ”اجس..... نامعقول..... میں نے کہا تھا، بلڈا پر رکھ دو۔ کیا تم رکھ دو۔ کا مطلب نہیں سمجھتے؟ اس کا مطلب ہے وہ دوسرے نمبر پر رہے گی۔ تم نے مجھے تباہ کر دیا۔ میری غریب ایلزا.....“

”ہم کل پھر واؤ لگالیں گے۔“ وکٹر بول پڑا۔ ”ہم یہ نہیں کر سکتے۔“ ایمل غرایا۔ ”مجھے چاہتا ہے۔ میرا ہاں مجھے دوبارہ نہیں رکھے گا۔“

وکٹر پہلے سے اپنا سامان باندھے ہوئے تھا۔ اب اسے صرف دائر روم کے ”ایکٹرز“ کو ادا کی کرنی تھی اور شہر سے نکل جانا تھا۔ اسے یقین تھا کہ مرٹن اپنا منہ بند رکھے گا تاہم وہ کوئی خطرہ مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ وہ آرام سے ہوٹل کی لانا میں ادھر ادھر ٹھلٹا رہا۔ یہاں تک کہ مرٹن کی بیوی شاپنگ کر کے تیزی سے ہوٹل میں داخل ہوئی۔

”مبارک ہو، مائی ڈیئر۔“ وہ اس کے سامنے کورٹس بجالایا۔ ”اب تم ایک امیر عورت ہو۔“

وہ شوخ، ایک پرمسرت چیخ کے ساتھ لفت کی طرف بھاگی۔ وکٹر مسکرایا، اس نے اپنا سبٹ کیس اٹھایا اور ہوٹل سے رخصت ہو گیا۔ مرٹن اپنی معشوقہ دلنواز کو یہ باور کرانے میں ناکام رہا کہ وہ رہس میں شرط ہار گیا ہے۔ اس کی معشوقہ اس کا تعاقب کرتی ہوئی درمونٹ پہنچی اور اس نے مرٹن کو دھمکی دی کہ اگر اس نے اسے رقم نہیں دی تو وہ ساری بات اس کی بیوی کو بتا دے گی۔ مرٹن اسے اتنی رقم اکٹھی کر کے دینے سے قاصر رہا اور معشوقہ نے جب اپنی دھمکی کو عملی جامہ

کر لیا۔ ڈیپریڈین نے اسے وکٹر کے سوٹ پر حتمی بات چیت کے لیے پھر کال کیا اور لوٹ کر وکٹر کو بتایا کہ شکار چھری تلے آنے سے پہلے خوف سے میاں رہا ہے۔ ”وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ ہم میٹنگ کے لیے بیورو کے آفس کی بجائے ہوٹل کیوں استعمال کر رہے ہیں؟“ وہ فون پر نزوس لگ رہا تھا۔

شکار، میٹنگ کے لیے دیے گئے وقت پر ہوٹل پہنچ گیا۔ ”موسیو، پواسن۔“ وکٹر نے بڑی گرم جوشی سے اس کا استقبال کیا۔ ”مبارک ہو، ہمیں آپ کی کامیابی کا جام تجویز کرنا چاہیے۔“

”ابھی سو دا تجویز نہیں ہوا ہے۔“ پواسن غرایا۔

”آہ، یقیناً..... پھر جام تجویز کرنے سے پہلے بزنس کی بات ہو جائے۔“ وکٹر نے کہا۔ پھر ڈیپریڈین کی طرف مڑا۔ ”تم واپس بیورو جا سکتے ہو۔ میں تمہیں بجے اپنی میز پر ہوں گا۔“

کوئیزیا ڈیپریڈین جیسے ہی ہوٹل سے رخصت ہوا وکٹر کا افسرانہ کردار دور ہو گیا۔ ”موسیو۔“ وہ لجاجت سے بولا۔

”ہمیں تھوڑی سی گفت و شنید کی ضرورت ہے۔“ اس نے ایک لمحہ توقف کیا۔ پھر گویا ہوا۔ ”ایک سرکاری افسر کی زندگی آسان نہیں ہوتی۔ ہمیں عمدہ مہمان نوازی کرنی پڑتی ہے۔ بہترین لباس پہننا پڑتا ہے۔ ان سب کے باوجود ہمیں قلیل تنخواہ پر گزارا کرنا پڑتا ہے۔ لہذا حکومت کا ٹھیکہ دینے کے لیے یہ دستور ہے کہ آفسرانہ چارج کچھ وصول کرتا ہے۔“

”رشوت؟“ آندرے نے مداخلت کی۔

”موسیو، آپ بہت صاف گو ہیں۔“

”اور یہی وجہ ہے کہ ہم بیورو میں ملنے کی بجائے یہاں ملتے ہیں؟“

”آپ دانا ہیں۔“ وکٹر مسکرایا۔

آندرے نے اپنی جیب سے ایک چیک اور دوسری جیب سے ایک بیوہ نکالا جو نوٹوں سے پھولا ہوا تھا۔ ”معاف کرنا، اب تو ہمیں کامیابی کا جام تجویز کرنا ہی ہوگا۔“ وکٹر معذرت خواہانہ مسکراہٹ کے ساتھ باریکی طرف بڑھ گیا۔

اس کے ایک گھنٹے کے اندر اندر وہ نہ صرف آندرے کا چیک کیش کر چکا تھا بلکہ آسٹریا روانہ ہو چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ اور کولنز، ایفل ٹاور کی فروخت اور رشوت کی رقم سے دیانا کے سب سے عالی شان ہوٹل میں ایک ماہ تک جی بھر کے عیش کرتے رہے۔ اس دوران میں وکٹر بلا تانہ پیرس

مقرر کیا گیا تھا۔ دن جمعہ کا اور ملاقات کریملن ہوٹل میں ڈپٹی کے سوٹ میں طے کی گئی تھی۔

وہ پانچوں تاجر مندرہ دن ہوٹل کے سوٹ میں تشریف لے آئے۔ کاؤنٹ وکٹر اپنی میٹنگ کا آغاز کرتے ہوئے ان سے مخاطب ہوا۔ ”موسیو، پلیز..... میں آپ کی توجہ کا طالب ہوں۔ میں آپ کو حکومت کے ایک ایسے راز میں شریک کرنے والا ہوں جس سے صرف میں وزیر اعظم اور صدر واقف ہیں۔“ اس نے ڈرامائی وقفہ لیا۔ پھر گویا ہوا۔ ”حکومت ایفل ٹاور کو توڑنے والی ہے۔“ وہ ایک بار پھر خاموش ہو گیا۔ سوٹ میں سناٹا چھا گیا۔

”شاید آپ کو یہ..... پتا ہو کہ یہ 1889ء میں ہونے والی پیرس ایکسپوزیشن کے موقع پر محض شہر کی عارضی دکھائی کے خیال سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کا مقصد اسے شہر کا ایک مستقل حصہ بنانا ہرگز نہیں تھا۔ شروع ہی میں اس کی تعمیر نے باذوق شہریوں کی جمالیاتی حس کو مجروح کر دیا تھا اور لوگ بھڑک اٹھے تھے۔ آپ اس کو اس زاویہ نظر سے دیکھیں۔“

کاؤنٹ کے معزز مہمان بڑی خوشی سے اس زاویہ نگاہ سے دیکھنے پر آمادہ تھے کیونکہ اس میں انہیں بھاری منافع نظر آ رہا تھا۔ اس میٹنگ کے بعد کاؤنٹ وکٹر، اس پارٹی کو ایفل ٹاور کے معائنے کے لیے لے گیا۔ اس نے اپنی پارٹی کو شہتیروں کی تعداد، سائز اور وزن سے آگاہ کیا اور جب وہ انہیں بتا چکا تو اس نے گزارش کی کہ ڈیپریڈین حضرات اپنا اپنا ٹینڈر سر بہم لگانے میں اگلے بدھ تک اس کے ہوٹل پہنچ دیں۔

”اور یاد رکھیں۔“ اس نے آخر میں زور دے کر کہا۔ ”آپ حضرات حکومت کے ایک راز کے امین ہیں۔ مجھے آپ سے ہوش مندی کی توقع ہے۔“

☆☆☆

وہ اس گروپ کی سب سے مال دار پارٹی کو پہلے ہی منتخب کر چکا تھا۔ اس کا نام آندرے پواسن تھا۔ آندرے پواسن، بنیادی طور پر ایک دیہاتی تھا اور سماجی اعتبار سے احساس کتری میں مبتلا تھا۔ وہ اپنی ذات کی یہ نامی دور کرنے کے لیے معاشرے میں بلند سے بلند مقام اور بڑی سے بڑی کامیابی حاصل کرنے کا سخت آرزو مند تھا۔ ٹینڈر موصول ہونے میں کوئی تاخیر نہیں ہوئی۔ اگلے دن ڈیپریڈین نے آندرے پواسن کو فون پر اطلاع دی کہ اس کا ٹینڈر منظور ہو گیا۔

اگلے ہفتے تک آندرے پواسن نے رقم کا بندوبست

رکھنے کا فیصلہ کر لیا اور جب اس نے اسے ہوٹل کے ویٹروں کو بڑی فیاضی سے شپ دیتے ہوئے منہ پھاڑ پھاڑ کر قہقہے لگاتے اور ہوٹل کے سرکردہ رہائشیوں سے میل جول بڑھانے میں ناکام ہوتے ہوئے دیکھا تو سمجھ گیا کہ اسے اس کا شکار مل گیا ہے۔ ایک ایسے شخص سے گفتگو چھیڑنا کوئی مشکل نہیں تھا جسے ہر شخص دھتکار رہا تھا۔

شروع شروع میں وکٹر کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کس طرح ہر مین لولر کو ٹریپ کرے لیکن گزرتے ہوئے دنوں کے ساتھ ساتھ اس نے رومانین باکس کے ذریعے ہر مین کی سادہ لوحی کو آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ پیسے بنانے کی ایک مشین تھی جس کے بارے میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس سے پانچ کے نوٹ کو دس کے نوٹ میں اور دس کے نوٹ کو بیس کے نوٹ میں تبدیل کیا جاسکتا تھا۔ یہ ایک بھدی، بدنما مشین تھی اور بیشتر لوگوں کو معلوم تھا کہ یہ شخص ایک بھونڈا اور ناشائستہ مذاق ہے لیکن وکٹر کے ہاتھوں میں کوئی بھی شے بھدی اور بدنما نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے اس باکس کو اندر اور باہر سے پالش کر کے بہت خوش نما اور دیدہ زیب بنا دیا تھا جسے دیکھ کر کوئی بھی احمق دھوکا کھا سکتا تھا۔ وکٹر اس مشین کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔

ایک دن سہ پہر میں جب وہ دونوں ہر مین لولر کی خوش نمائندگی کے عقبی عرشے پر نیم دراز ایک دوسرے سے گپ شپ کر رہے تھے کہ اس دوران میں ان کی باتوں کا رخ پیسے کمانے کی طرف مڑ گیا۔ ہر مین نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور گویا ہوا۔

”مجھے تم پر رشک آتا ہے۔ ایک امیر و کبیر تو اب جسے گزراؤقات کے لیے کام کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔“

”میں تمہیں بتاؤں میرے دوست کہ ایسا نہیں ہے۔“ وکٹر نے جواب دیا۔ ”اس میں کوئی شک نہیں کہ میں ایک بہت بڑے جاگیردار گھرانے کا چشم و چراغ ہوں لیکن ہمارے کاشت کاروں کی بغاوت کے نتیجے میں ہمیں اپنی زمینوں سے ہاتھ دھونے پڑ گئے۔ انہوں نے ہم سے ہمارا سب کچھ چھین لیا۔ اس کے بعد ہم پر بڑی مہمبتیں ٹوٹیں۔“

ہر مین بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہا تھا اور اس کے خاموش ہونے پر اسے منتظر نظروں سے ٹکٹے لگا تھا۔ وکٹر دوبارہ گویا ہوا۔ ”دراصل میرے پاس ایک خاص مشین ہے۔“

”خاص مشین؟ وہ کیا؟“ ہر مین نے قدرے چونک

کے تمام روزناموں کا مطالعہ کرتا رہا۔ پھر وہ کونٹرز سے بولا۔ ”آندرے اب تک پولیس کے پاس نہیں گیا ہے۔ اس کا صرف ایک ہی مطلب ہو سکتا ہے۔ وہ اپنی فریب خوردگی تسلیم کرنے سے گھبرار رہا ہے اسے خوف ہے کہ اگر اس نے ایسا کیا تو پورے پیرس میں سب کے مذاق کا نشانہ بن جائے گا۔ آگتا ہے وہ یہ راز اپنے ساتھ اپنی قبر میں لے جائے گا اور چونکہ اس نے اسفل ٹاور کو اپنے قبضے میں نہیں لیا ہے چنانچہ ہم اسے دوبارہ بڑے آرام سے بچ سکتے ہیں۔“

امریکا واپس پہنچ کر اس نے پام بیچ میں رہائش اختیار کی جو اس وقت امریکا کے امیر ترین لوگوں کی دل پسند تفریح گاہ تھی لیکن کاؤنٹ وکٹر کی آمد نے ان ارب پتی لوگوں کے درمیان ایک ہلچل مچا دی۔ وہ دنیا کی سب سے مہنگی اور چھپمان رولس رانس کار میں پام بیچ کے سب سے عالی شان ہوٹل پہنچا جسے ایک جاپانی شو فر ڈرائیو کر رہا تھا۔ ہوٹل کے رہائشی ارب پتی۔ اپنی گردنیں اچکا اچکا کر اس رئیس اعظم کی ایک جھلک دیکھنے کی کوشش کرنے لگے جس نے یک چشمی سینک پین رکھی تھی لیکن اپنی آمد کے بعد دو دن تک صرف اپنے کمرے تک محدود رہا۔ اس دوران میں لوگوں کے تجسس میں اضافہ ہوتا رہا اور جب وہ نمودار ہوا تو ساحل پر دوسروں سے آجھ فاصلے پر ایک چھتری کے نیچے ایک کتاب لے کر نیم دراز ہو گیا۔

ایک گھنٹے کے بعد شو فر ایک ٹیلی گرام کے ساتھ بھاگا بھاگا آیا۔ کاؤنٹ نے ٹیلی گرام وصول کی اور کوئی جواب دینے سے انکار کر دیا۔ اس دن اور اگلے دن وہی حرکت بار بار دہرائی جاتی رہی۔ تیسری سہ پہر تک وہ ہوٹل کے تمام باسیوں کی توجہ کا مرکز بن چکا تھا۔

ہفتے کے اواخر میں کاؤنٹ اپنی مراسر اور شاندار گوش نشینی سے باہر آیا اور اس نے لوگوں کے کانوں میں یہ بات ازال دی کہ وہ ٹیلی گرام پور پین فنانسروں کی طرف سے بھیجے گئے تھے جو مختلف بروجیکٹ میں اس کے مالی تعاون اور مشورے کے طالب تھے لیکن چونکہ اسے مزید پیسا کمانے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی چنانچہ اس نے کسی بھی ٹیلی گرام کا جواب دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اس طرح اس نے اپنا پہلا ہدف حاصل کر لیا۔ ہوٹل کے باسیوں نے نہ صرف اسے خوش آمدید کہا بلکہ اس کی تلاش میں رہنے لگے۔

پھر جب ہر مین لولر نامی نووارد کستی رانی کا لباس پہنے چالیس فٹ لمبی کستی میں وہاں پہنچا تو وکٹر نے اس پر نگاہ

نوٹ کی ساری چھپائی من و عن اس کاغذ پر منتقل ہو رہی ہے۔“ اس نے وضاحت کی۔ ”اس کیمیاوی عمل کے ہونے میں چھ گھنٹے لگتے ہیں۔“

اس کے ٹھیک چھ گھنٹے کے بعد وہ دونوں وکٹرز کے ہوٹل کے کمرے میں لوٹے۔ وکٹرز نے بڑی احتیاط سے سارے ٹاب کو دوبارہ سیٹ کیا۔ پھر Ejecter کے لیور کو گھمایا۔ فوراً ہی ہزار ہزار ڈالر کے دونوٹ باہر آگئے۔ وکٹرز نے ہر مین کے معائنے کے لیے وہ دونوں نوٹ اس کے سامنے کر دیے۔ ہر مین کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ اسے اب بھی یقین نہیں آرہا تھا۔

”تم ایسا کرو کہ ایک ایک نوٹ معائنہ کے لیے دو مختلف بینکوں میں لے جاؤ۔“ وکٹرز نے اس سے کہا۔ ”تا کہ کسی کو ہمارے اس چھوٹے سے راز کے بابت کوئی شبہ نہ ہو۔“

ہر مین نے ویسا ہی کیا۔ وہ دونوں نوٹ لے کر ہوٹل سے نکل گیا اور جب لوٹا تو قائل ہو گیا تھا۔ وکٹرز کو اس بات کی توقع تھی اور وہ جانتا تھا کہ ایسا ہی ہوگا۔ اس نے ہر مین کو بے وقوف بنانے کے لیے جو چال چلی تھی وہ صرف یہ تھی کہ اس نے اپنے ہوٹل کے کمرے میں پہلی بار ہر مین کے قدم رکھنے سے پہلے ہی ہزار ڈالر کا ایک نوٹ اس مشین میں چھپا دیا تھا۔ وہ دونوں نوٹ بالکل اصلی تھے۔

”کاؤنٹ۔“ ہر مین نے پوچھا۔ ”کیا دنیا بھر میں یہی واحد مشین ہے؟“

”ہاں بالکل۔“ وکٹرز نے مستحکم لہجے میں جواب دیا۔ ہر مین نے زبان پھیر کر اسے ہونٹوں کو تر کیا۔ ”کیا... کیا تم یہ مشین مجھے فروخت کرو گے؟ میں تمہیں پچیس ہزار ڈالر دوں گا۔ فی الوقت میرے پاس اتنی ہی رقم ہے۔ میں جانتا ہوں کہ یہ بہت بڑی فرمائش ہے جو میں کر رہا ہوں لیکن... لیکن تم اپنے لیے ایک دوسری مشین بنا سکتے ہو۔“ اس کا لہجہ لعنت آمیز تھا۔

”ہر مین، تم میرے دوست ہو۔“ وکٹرز واضح طور پر ایک لمحے کو ہچکچا کر بولا۔ ”اور ایک دوست کی فرمائش کو رد کرنا مجھے زیب نہیں دیتا۔ یہ مشین ہے تو نایاب اور اس اعتبار سے اس کی صحیح قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا لیکن جب تم کہتے ہو کہ سردست تمہارے پاس صرف پچیس ہزار ڈالر ہیں تو...!“

اگلے دن وکٹرز ہر مین کے پچیس ہزار ڈالر سمیت ہوٹل

کر پوچھا۔

”ایک ایسی خاص مشین جو ایک سادہ کاغذ کے ٹکڑے کو کیمیاوی پروسیس کے ذریعے اصلی نوٹ میں تبدیل کر دیتی ہے۔ بالکل اصلی نوٹ میں۔“ ہر مین اسے غیر یقینی نظروں سے گھورنے لگا۔ ”تم یقیناً مذاق کر رہے ہو۔“ وہ بولا۔

”قطعی نہیں، میرے دوست۔“ وکٹرز نے مستحکم لہجے میں جواب دیا۔ ”کیا تم نے ایمل ڈیو برے کا نام سنا ہے؟ نہیں؟ وہ ایک کیمیبیل انجینئر تھا۔ ایک مینٹس.....!“

اس کے ساتھ ہی وہ مین الاقوامی جلسا سازی اور فریب دہی کی لمبی من گھڑت داستانیں سنانے لگا جس کا لب لباب یہ تھا کہ اس مرحوم مینٹس کی ایجاد کردہ پیسے بنانے کی اس مشین کا واحد ماڈل اس کے ہاتھ لگ گیا تھا۔

”لیکن آرتھم پکڑے گئے تو؟“ ہر مین پوچھ بیٹھا۔ ”میرا مطلب ہے... جلسا سازی کرتے ہوئے۔“

”میں جلسا سازی نہیں کر رہا میرے دوست۔“ وکٹرز نے جواب دیا۔ ”میں بالکل اصلی کرنسی کو دوبارہ چھاپ رہا ہوں جس کی شناخت ناممکن ہے۔ سارے بینک اسے قبول کرتے ہیں۔ کیا میں آج سہ پہر میں ایک ہزار ڈالر کا نوٹ چھاپ کر تمہیں دکھاؤں؟“

”ہاں بڑے شوق سے۔“ ہر مین تیار ہو گیا۔

وہ دونوں عرشے سے اٹھ کر وکٹرز کے کمرے میں آئے۔ وکٹرز نے ایک دیوار گیر شیف میں سے ایک چھوٹا سا ڈبا نکالا۔ اس کے دونوں طرف تنگ شکاف بنے ہوئے تھے اور ایک طرف ہینٹل کے چمکتے ہوئے ٹاب اور ڈائل تھے۔ یہ ڈبا دیکھنے میں اس قدر دیدہ زیب اور خوش نما تھا کہ کوئی بہت ہی بیش قیمت اور غیر معمولی اثاثہ لگتا تھا۔ اب وکٹرز نے ایک ہزار ڈالر کا ایک نوٹ نکالا اور ہر مین کی طرف بڑھاتے ہوئے مخاطب ہوا۔

”تم اچھی طرح اس کا معائنہ کر لو۔“

ہر مین نے اس نوٹ کو اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھا۔ وہ بلاشبہ اصلی نوٹ تھا۔ وکٹرز نے وہ نوٹ اس سے لے کر مشین کے ایک شکاف میں داخل کر دیا۔ پھر وہ اس نوٹ کے مائز کا کٹنا ہوا کاغذ کا ایک ٹکڑا مشین کے دوسرے شکاف میں داخل کیا اور بڑی سنجیدگی اور مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے مشین کے ٹاب کے سلسلے کو موزوں کیا۔ پھر ہر مین سے مخاطب ہوا۔ ”اب اس نوٹ اور سادہ کاغذ دونوں کا کیمیاوی عمل شروع ہو گیا ہے جس کے تحت اس

دکھانے لگی تو وہ آہستہ آہستہ مزید کھلنے لگا۔ آخر کار اس نے وکٹر پر اپنا یہ راز افشا کر دیا کہ وہ پبلک فنڈز میں خورد برد کرتا رہا تھا۔ وہ کاؤنٹی کا خزانچی بھی تھا۔ وہ رقم خود پر خرچ کر کے راتوں کو رنگین کرتا تھا۔ اب اس کے اکاؤنٹ میں پچیس ہزار ڈالر تھے جو کہ کم تھے اور وہ بے حد پریشان تھا۔

”میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں اس کی کو کیسے پورا کروں گا۔“ وہ رازواری سے بولا۔

وکٹر نے اس کے گلاس میں مزید شراب انڈیلی اور اس سے ہمدردی کے اظہار میں سر ہلانے لگا۔ ”اتنی رقم تو میں نے ایک سہ پہر ایک ہی جھٹکے میں کما لی تھی۔“ وہ شان بے نیازی سے اسے شانے اچکا کر بولا۔

”ایک ہی جھٹکے میں؟..... تم نے.....؟ وہ کیسے؟“

”میرے پاس ایک مشین ہے جو کرنسی کو دگنا کر دیتی ہے۔“ وکٹر نے رساں سے جواب دیا اور پھر اسے تفصیل سے ”رومانین باکس“ کے بابت بتانے لگا۔ ”اگر تم میرے سوٹ کیس میں سے وہ مشین نکال کر لے آؤ تو میں ابھی اس کا عملی مظاہرہ کر کے تمہیں دکھا سکتا ہوں۔“ آخر میں وہ بولا۔

اس عملی مظاہرے کے نتیجے میں اگلی صبح وکٹر کو نہ صرف قید سے رہائی مل گئی بلکہ اس کی جیب میں دس ہزار ڈالر بھی آ گئے۔ یہ رقم شریف نے اس یقین اور اعتماد کے ساتھ کاؤنٹی کے فنڈز سے نکال کر اسے دیے کہ اس مشین سے نہ صرف یہ کہ اس کے سارے نقصانات کی تلافی ہو جائے گی بلکہ وہ بہت جلد امیر و کبیر بن جائے گا۔

☆☆☆

وہ مارچ کا مہینا تھا۔ اگلے نومبر میں وکٹر، شکاگو میں اپنے ہوٹل کے کمرے میں آرام کر رہا تھا کہ دروازے پر زور سے دستک ہوئی۔ اس نے اٹھ کر دروازہ کھولا اور اگلے ہی لمحے اسے ایک ریوالر کی نال نظر آئی جو اس پر تھی ہوئی تھی۔ اس ریوالور کے عقب میں شریف رچرڈ کا غصے سے لال بھوکا چہرہ تھا۔ ”تمہیں تلاش کرنے میں مجھے کئی مہینے لگ گئے۔“ رچرڈ حلق پھاڑ کر چیخا۔ ”اب میں تمہیں قتل کروں گا۔“

”کیوں؟ ماجرا کیا ہے، شریف؟“ وکٹر نے بڑے سکون سے پوچھا۔

”وہ مشین کام نہیں کرتی۔“ شریف دباؤ سے وکٹر کے چہرے سے حیرت اور بے یقینی برسنے لگی۔

سے رنو چکر ہو گیا۔ چونکہ اس مشین کو آپریٹ ہونے میں چھ گھنٹے لگتے تھے چنانچہ وکٹر نے اندازہ لگایا کہ اتنی مدت میں تو وہ نہیں سے کہیں پہنچ چکا ہوگا۔

لیکن جیسا کہ ظاہر ہوا اسے فرار ہونے کے لیے اس سے بھی بہت زیادہ وقت مل گیا۔ ہر مین ایک احمق اور ضدی شخص تھا۔ وہ اتنی جلدی اس فریب کے جال سے باہر نکلنے کو تیار نہیں تھا۔ جب مشین نے کام نہیں کیا تو وہ یہی سمجھا کہ اس نے مشین کو غلط آپریٹ کیا ہے اور وہ اسے دوبارہ آپریٹ کرنے کے جتن کرنے لگا۔ اس کوشش میں اسے کئی دن نہیں بلکہ کئی ہفتے لگ گئے۔ اس دوران میں وہ اپنے کاروبار کی طرف سے بھی بالکل غافل ہو چکا تھا۔ بالآخر ایک دن اس کی بیوی نے طیش میں آ کر اس مشین کو ایک ہتھوڑے سے توڑ ڈالا۔ ”احمق، نامعقول۔“ وہ حلق پھاڑ کر چیخی۔

☆☆☆

ہر مین سے، پچیس ہزار ڈالر اٹھانے کے بعد وکٹر پام بیج سے فرار ہو کر سیدھے ہالی ووڈ اور پھر وہاں سے اسٹینلا سوٹی کے ہمراہ ہوانا پہنچا تھا جہاں اس نے رونا لڈو ڈانچ کو چونتیس ہزار ڈالر سے محروم کر دیا تھا اور پھر پیرس سے واپس امریکا پہنچ کر پولیس سے، نہنچنے کے لیے سیکرٹ سروس کو استعمال کیا تھا۔ پھر وہ نیویارک سے سیدھے اوکلاہاما چلا گیا لیکن یہاں اس سے چوک ہو گئی۔ وہ اوکلاہاما میں جعلی بونڈز بیچتا ہوا پکڑا گیا اور اسے جیل میں ہوا کھانی پڑی لیکن وہ جانتا تھا کہ اسے مجرم قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ جعلی بونڈز کی فریب دہی کا کوئی گواہ نہیں تھا لیکن ساتھ ہی اسے یہ خدشہ بھی لاحق تھا کہ جب اس کی گرفتاری کی خبر مشرق میں پولیس ڈیپارٹمنٹ تک پہنچے گی تو ڈانچ کی طرف سے اسے بے حد مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

وہ جیل صرف ایک کوٹھری پر مشتمل تھی جس میں وہ قید تھا چنانچہ وکٹر نے جلد ہی شریف رچرڈ سے کپ شپ شروع کر دی۔ اس نے شریف کو غیر ممالک کے دارالانفلو میں اونچی سوسائٹی کی ہوٹل بادا ستان میں سنا سنا کر مسحور کر دیا۔ اس موقع پر شریف رچرڈ بھی اپنی بڑی بڑی پارٹیوں کا ذکر کر کے وکٹر کو متاثر کرنے کی کوشش کرنے اور سچی بگھارنے لگا۔ ان لن ترانیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ صیدا اور صیادوہ دونوں ہی میز پر ایک ساتھ بیٹھے، ہسکی کی ہسکیاں لینے کے ساتھ ہی ہنس کر باتیں کرتے ہوئے نظر آنے لگے۔ وہ شراب حال ہی میں ایک جگہ سے ضبط کی گئی تھی۔ جب شراب شریف پر اثر

اسٹریٹ پر سوڈا لڑکا ایک جعلی نوٹ چلاتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑ لیا گیا۔“

بعد ازاں اس پر مقدمہ چلا اور اسے وفاقی جیل بھیج دیا گیا۔ ظاہر ہے وکٹرنے اسے جو کرارے نوٹ دیے تھے وہ جعلی تھے۔

☆☆☆

ہمارے آپریشن کا آغاز 1934ء میں اس وقت ہوا جب مجھ سمیت ملک بھر کے تمام حصوں سے سولہ سیکرٹ ایجنٹوں کو ایک اسپیشل اسکواڈ تشکیل دینے کے لیے نیویارک طلب کیا گیا۔ ہمیں اس بات کا کوئی علم نہیں تھا کہ ہمیں کیوں طلب کیا گیا تھا لیکن ہم یہ ضرور جانتے تھے کہ معاملہ غیر معمولی اہم رہا ہوگا۔ وہاں ہمارے اکٹھا ہوتے ہی اس آپریشن کے سربراہ یعنی ہمارے پاس رابرٹ گاڈ بانی فوراً اپنے مطلب پر آگئے۔

”ہمارے اسٹیٹ بینک کو ماہانہ ایک لاکھ کی شرح سے جعلی نوٹ مل رہے ہیں۔“ انہوں نے کہا۔

کانفرنس کی میز کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سیٹی کی مدھم آواز پھیل گئی۔ پاس نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔ ”یہ ملک کی تاریخ میں ایک ریکارڈ ہے اور ہم جانتے ہیں کہ اگر ماہانہ ایک لاکھ ڈالر کے جعلی نوٹ گردش کر رہے ہیں تو اس سے گنتی تعداد میں چھاپے جا رہے ہوں گے۔“

انہوں نے ایک لفافہ کھول کر اندر سے سوڈا لڑکا ایک نوٹ نکالا۔ ”اس نوٹ کو دیکھیں۔“ وہ بولے۔

ہم سب نے باری باری اس نوٹ کا معائنہ کیا اور انکشت بدنداں رہ گئے۔ کسی ماہر کے سوا کوئی بھی اسے جعلی نہیں کہہ سکتا تھا۔ ہم نے آج تک اتنا عمدہ جعلی نوٹ نہیں دیکھا تھا۔ اسے نقل۔ مطابق اصل کہا جاتا تو قطعی بے جا نہ ہوتا۔ کانفرنس روم میں مکھیوں جیسی بھینٹا ہٹ ہونے لگی۔ ہم لوگ پاس سے سوال کرنے لگے۔ اس کا کوئی اتا پتا؟ یہ کاغذ کہاں سے آیا؟ روشنائی کہاں سے آئی؟ تانبے کی پلیٹ کہاں سے آئی؟ نقش کندہ کرنے والے کی شناخت کیسے ہو گی؟ اس کا کوئی سراغ ہے؟ وہ کہاں آبریت کر رہا ہے؟ ان سب سوالوں کے جواب میں گاڈ بانی نے نفی میں سر ہلایا۔

”اسی کا تو ہمیں سراغ لگانا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”اور ہمیں چوبیس گھنٹے یہی کام کرتے رہنا ہے۔“ اس نے اپنی انگلی سے اس جعلی نوٹ کو کھڑکھڑایا۔ ”ہمیں ہر صورت میں ان پلیٹوں کا سراغ لگانا ہے۔“

”یہ ناممکن ہے۔“ وہ بولا۔

”کیا تم نے داہنی طرف والے ٹاب کو دوبار گھمایا تھا اور کیا اسے واپس اس کے ہندسے پر بائیں طرف لکھا تھا؟ پھر کیا اس کے دس سیکنڈ کے بعد سوچ آن کیا تھا؟ ٹھیک دس سیکنڈ کے بعد؟ نہ نو سینڈ اور نہ گیارہ سیکنڈ کے بعد؟ پھر کیا تم نے کمپریر کو گھمانے سے پہلے اشارہ دینے والے ٹاب کو تین مرحلوں پر سیٹ کیا تھا؟“

شیرف کا ریوالور والا ہاتھ نرم پڑ گیا۔ ”میں نہیں جانتا..... میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ مشین کام نہیں کرتی۔“ وہ بولا۔

دکٹر نے ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ”میں دیکھ رہا ہوں کہ تم ہاتھ کا کام کرنے میں اتنے ماہر نہیں ہو کہ اس مشین کو آپریٹ کر سکو۔ اب میں صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ تمہاری خاطر وہاں جاؤں اور مشین کو آپریٹ کروں لیکن بد قسمتی سے میں اپنے کام میں اس قدر الجھا ہوا ہوں کہ.....!“

شیرف نے پھر اس پر ریوالور تان لیا۔ ”لیکن.....“ وکٹر جلدی سے بول پڑا۔ ”میں تمہارے دس ہزار ڈالر تمہیں لوٹا دیتا ہوں۔“ یہ کہنے کے ساتھ ہی اس نے اپنے پرس میں سے سو سو ڈالر کے کرارے نوٹ نکال کر دس ہزار ڈالر گن کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

شیرف حیرت سے منگ ان نوٹوں کو گھورتا چلا گیا۔ پھر اس نے اپنا ریوالور اپنی جیب میں رکھ لیا۔ ”تمہاری بڑی نوازش۔“ وہ منمنباہ۔

”بالکل نہیں۔“ وکٹر نے خندہ پیشانی سے کہا اور اسے دروازے کی طرف لے چلا۔ ”جب میں اس مشین کو ٹھیک کرنے آؤں گا تو تم یہ رقم مجھے لوٹا دینا۔“ اس نے اپنا بازو شیرف کے شانے کے گرد حائل کر دیا۔ ”تم نے چند برے مہینے گزارے ہیں لیکن اب جب کہ یہ معاملہ صاف ہو گیا ہے۔ تو میرا خیال ہے کہ تم اس رقم میں سے چھوٹا موٹا جشن منانے کا حق رکھتے ہو، تو کیوں نہ تھوڑی سی رقم خرچ کر لو۔“

”یہ تو بہت عمدہ آئیڈیا ہے۔“ شیرف خوش ہو کر بولا اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔

اس دن کے بعد سے وکٹر ہر صبح نئے اور لیز سے شائع ہونے والا ہر روز نامہ خریدنے لگا۔ جو تھے دن اسے وہ خبر مل گئی جس کی اسے تلاش تھی۔ وہ خبر یہ تھی۔ ”اوکلاہاما کے ریمن کاؤنٹی کا شیرف ایس آر چرچ ڈگری فٹنار۔ اسے بوربن

اس بنا پر کہ وہ حنا اسمتھ نامی ایک خاتون کے ساتھ نظر آتا رہا تھا جو ایک دلالہ تھی۔ اس کی دو کال گزرتے درمیان حسد کے جذبے نے اتنا اودھم مچایا تھا کہ مادام حنا کو فوری شہر چھوڑ کر بھاگنا پڑ گیا تھا۔

جیسے جیسے ہفتے گزرتے گئے ویسے ویسے حنا اسمتھ اور وکٹر کے سراغ کے پیچھے بھاگتے ہوئے ہم جلسازی سے دور... مزید دور ہوتے چلے گئے۔ لیکن پھر ایک دن نیویارک کے وائس اسکواڈ نے ہمیں یہ اطلاع دی کہ وہ لوگ مادام کے گرد گھیرا تنگ کرنے والے ہیں۔ وہ لوگ اسے پارک ایونیو کے سامنے واقع اس کے ایک اپارٹمنٹ سے گرفتار کرنا چاہتے تھے لیکن ہم نے ان سے درخواست کی کہ جب تک ہم اپنی کارروائی مکمل نہ کر لیں، وہ لوگ اسے گرفتار نہ کریں وہ لوگ مان گئے۔ ہمارے پاس حنا کی ایک خاصی اچھی تصویر تھی چنانچہ ہم اس اپارٹمنٹ بلڈنگ کے باہر اکٹھا ہو کر انتظار کرنے لگے۔ ایک گھنٹا گزر گیا۔ پھر دوپہر چار آٹھ اور پھر بارہ گھنٹے گزر گئے۔ ہم اپنی جگہ کھڑے رہے۔ آخر کار مادام حنا باہر نکلی۔ ہم اسے فوراً پہچان گئے۔ ہم نے فوراً اس کو بگ کیا اور چونکہ ہم جانتے تھے کہ اس نے وکٹر کو اپنے دوستوں سے مسٹرفریک کی حیثیت سے متعارف کرایا تھا۔ لہذا ہم نے اس عرفیت کو اس کے دیگر ناموں میں شامل کر لیا اور حنا کی گفتگو سننے بیٹھ گئے۔

اسی طرح کئی ہفتے گزر گئے لیکن سوائے بکو اس کے کوئی قابل ذکر بات سننے کو نہیں ملی۔ پھر ایک سہ پہر گاؤ بائی کو ایک ایجنٹ کی کال موصول ہوئی جو حنا کی گفتگو کا ٹیپ سننے کی ڈیوٹی انجام دے رہا تھا۔ گاؤ بائی نے اس کی بات سن کر ریسپور ایک دھماکے سے رکھ دیا اور میری طرف مڑا۔ ”مسٹرفریک لین وکٹر لسنیک نے ابھی ابھی حنا کو کال کیا تھا۔ وہ ایک گھنٹے کے اندر اس سے ملنے اس کے اپارٹمنٹ آ رہا ہے۔ تم اور سیکر اس کے اپارٹمنٹ کے باہر نگرانی شروع کر دو۔ وکٹر کے قریب جانے کی ضرورت نہیں۔ صرف اس کی شناخت کر لو اور مزید احکامات کے لیے ہمیں فون کرو۔“ سیکر نے اور میں نے اپنے ہیٹ اٹھائے اور باہر کی طرف بھاگے۔

☆☆☆

ہم دو گھنٹے تک حنا اسمتھ کے اپارٹمنٹ کے باہر کھڑے رہے اور پھر یہ سوچتے لگے کہ شاید ہم ”مسٹرفریک لین“ کو کھویں بیٹھے ہیں۔ ہمارے پاس وکٹر کی جو تصویر تھی وہ چھ

میرا پہلا قدم خبروں سے رابطہ کرنا تھا لیکن مجھے ان سے کوئی معلومات حاصل نہ ہو سکیں۔ اس کے بعد ہم کاغذ سپلائی کرنے والوں کے پاس گئے۔ پھر تانبے کی پلیٹیں بنانے والے اور چھاپنے کی روشنائی بنانے والے کے پاس گئے لیکن اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ پھر ایک صبح گاؤ بائی نے ہم سب کو طلبہ کر لیا اور اعلان کیا۔ ”ہمیں نقش بنانے والے کا پتا چل گیا ہے۔“

ہم لوگ اپنی نشستوں پر یکبارگی اچھل پڑے۔ گاؤ بائی نے اپنا گلا کھنکار کر صاف کیا اور دوسرا انکشاف کیا۔ ”اس کا نام ولیم رائس ہے۔ اس نے آج سے سات سال پہلے بمی جعلی نوٹ بنائے تھے لیکن وہ کچھ زیادہ گردش میں نہیں آئے۔“ وائسنگٹن کے بیورو نے اس پہلے والے نوٹ کے نمونے سے اس نوٹ کا موازنہ کیا ہے اور انہیں یقین ہے کہ ولیم رائس ہی ہمارا مطلوبہ شخص ہے۔“

اس کے بعد گاؤ بائی نے ولیم رائس کی ایک تصویر ہمیں دیکھنے کو دی اور کہا۔ ”ہمیں اس سے زیادہ کچھ بھی معلوم نہیں ہے۔“ پھر ایک لمحے کے توقف کے بعد دوبارہ گویا ہوا۔ ”وائس، ایک گریجویٹ فارماسٹ ہے۔ وہ 1920ء کے عشرے میں اوکلاہاما میں ایک ڈرگ اسٹور چلایا کرتا تھا۔ پھر 1925ء کے آس پاس وہ شکاگو میں نمودار ہوا اور ال کیپون کے دہسکی کے جعلی لیبل تیار کرنے لگا۔ وہ ایک نہایت کم گو اور کم آمیز شخص تھا۔ زیادہ دوست نہیں بناتا تھا اور پچھلے سات سال سے آس پاس ہمیں نظر بھی نہیں آ رہا ہے۔ صرف ایک ہی شخص ہے جو اس کا قریبی دوست لگتا ہے اور وہ ہے... وکٹر لسنیک۔“

”لیکن لسنیک اتنا گھامڑ نہیں ہے کہ خود کو جلسازی میں ملوث کرے گا۔“ میں نے اعتراض کیا۔

☆☆☆

ہم بڑے خوش ہوئے کہ ہمیں وکٹر لسنیک کو پکڑنے کا ایک قانونی جواز مل گیا تھا لیکن دنیا بھر کے اہم شہروں کے پولیس ڈیپارٹمنٹ سے تفتیش و تفتیش کے باوجود کوئی نتیجہ برآمد نہ ہو سکا۔ ہاں ہماری محنت یہ رہتی تھی کہ ہمیں اس کا ایک بہت ہلکا سا سراغ مل گیا۔ لہذا ہم اس سراغ کے پیچھے چل پڑے کیونکہ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی سراغ نہیں تھا۔ حال ہی میں وکٹر، ٹیمس برگ پولیس کی نگاہوں میں آیا تھا۔ اس بناء پر نہیں کہ اس کے خلاف کوئی الزام تھا بلکہ صرف

بچوں کو دودھ پلانے

والی ماؤں کا بلڈ پریشر

ماؤں کی جانب سے شیر خواروں کو دودھ پلانے کا فائدہ صرف بچوں کو ہی نہیں ہوتا بلکہ خود ماؤں بھی اس سے مستفید ہوتی ہیں۔ ایک نئے طبی جائزے میں انکشاف کیا گیا ہے کہ دودھ پلانے کے کئی سال بعد بھی ماؤں کے بلڈ پریشر بڑھنے کا امکان کم ہوتا ہے۔ یونیورسٹی آف ویسٹرن سنڈنی اسکول آف میڈیسن کے ریسرچرز نے دیکھا ہے کہ خواتین اپنے بچوں کو جتنے زیادہ عرصے تک اپنا دودھ پلاتی ہیں 64 سال کی عمر کو پہنچنے سے پہلے تک ان میں ہائی بلڈ پریشر کا امکان اتنا ہی کم ہوتا ہے تاہم 64 سال کی عمر کے بعد اس فائدے کا امکان گھٹنے لگتا ہے۔ ریسرچ نے بریسٹ فیڈنگ اور ہائی بلڈ پریشر میں تعلق کو سمجھنے کے لیے 74 ہزار 785 آسٹریلوی خواتین کے بارے میں تفتیش کی جو 45 سال یا اس سے زیادہ عمر کی تھیں۔

مرسلہ: زویا فرہاد جہلم

کنارے کھڑی ہوئی ایک کار میں بیٹھ گیا۔ اسٹیئرنگ وہیل پر ڈرائیور موجود تھا اور انجن چل رہا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی کار تیزی سے روانہ ہو کر ٹریفک میں شامل ہو گئی۔

”جلدی۔“ سیکر میرا بازو تھام کر چیخی۔

خوش قسمتی سے ہماری کار بھی وہیں پارک تھی میں اچھل کر اسٹیئرنگ وہیل پر بیٹھ گیا اور ہم تیزی سے وکٹر کے تعاقب میں روانہ ہو گئے لیکن ٹریفک اتنا بوجھ تھا کہ ہم اچانک ہی اسے کھو بیٹھے۔ میں مختلف سڑکوں پر گاڑی کو گھمانے لگا کہ شاید کہیں اس کی جھلک نظر آجائے لیکن بے سود۔ اس کا کہیں پتا نہیں تھا۔ آخر کار ہم مایوس ہو کر واپس حنا اسمتھ کے اپارٹمنٹ پہنچ گئے۔ گاؤ بائی اور دیگر چار ایجنٹ حنا کے اپارٹمنٹ کے باہر کھڑے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ ہم چیف کو تفصیل بتانے لگے اور وہ اگلے منصوبے کے بارے میں ہدایات دینے لگا۔ میں اس کی باتیں بے دلی سے سن رہا تھا اور اندر ہی اندر چیخ و تاب کھا رہا تھا۔ اس کی حماقت اور بروقت فیصلہ کرنے میں ناکام ہونے کی وجہ سے وکٹر ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تھا اور ہماری ساری محنت پر پانی پھیر گیا تھا لیکن وہ ہمارا باس تھا۔ میں خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ اچانک ایک منظر میری نگاہوں کے سامنے تیر گیا۔ وہ وکٹر کی کار تھی اور اس میں وکٹر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ ڈرائیور سے تیز تیز

سال پرانی تھی۔ اس عرصے میں وہ کافی بدل چکا ہوگا۔ میں نے ہیڈ کوارٹرز سے رابطہ قائم کیا لیکن انہیں ٹیپ پر کوئی نئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ میں فون کر کے لوٹا ہی تھا کہ اچانک سیکر نے میرا بازو پکڑ لیا اور سڑک کے دوسری طرف اشارہ کیا۔ ایک خوش پوش آدمی ابھی ابھی اپارٹمنٹ بلڈنگ سے برآمد ہوا تھا۔ کیا وہ وکٹر لسنیگ تھا؟ ہم اس کا تعاقب کرنے لگے۔ میں اس کے چلنے کے انداز پر غور کرنے لگا۔ بیشر امریکیوں کی ہال یا مقصد ہوتی ہے جب کہ یورپین کا انداز چہل قدمی کرنے کا ہوتا ہے۔ وہ شخص بھی چہل قدمی کر رہا تھا۔ میں اور سیکر سڑک کے دونوں طرف سے اس کا تعاقب کر رہے تھے لیکن اس سے پہلے کہ ہم اس کا قریبی جائزہ لیتے وہ ایک کٹڑے سے مزکرا ایک ڈرگ اسٹور میں داخل ہو گیا۔ میں سیکر سے جا ملا۔

”وہ اپنے سائے سے بھی بدکا ہوا ہے۔“ سیکر نے کہا۔ ”میں نہیں سمجھتا کہ وہ ہم سے یا خبر ہو گیا ہے لیکن ہمیں بہت احتیاط سے اسے سنبھالنا ہوگا۔“

میں خاموشی سے ڈرگ اسٹور میں داخل ہوا اور میں نے فون بوتھ سے گاؤ بائی کو فون کیا۔ میں اس سے رابطہ ملنے کا انتظار کر رہا تھا کہ اسی دوران میں وکٹر کا ڈنٹر پر سے مزا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے اس کے چہرے کی ایک جھلک نظر آئی اور میں فوراً اسے پہچان گیا۔ وہ وکٹر ہی تھا۔

”ہاں۔“ اسی وقت دوسری طرف سے گاؤ بائی کی آواز میری سماعت سے نکرائی۔

”مسٹر فرینک ہی وکٹر لسنیگ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اس وقت وہ میرے سامنے ہے اور میں اسے دیکھ رہا ہوں۔“

”اسما کے ساتھ رہو۔“ باس نے حکم دیا۔

”دیکھو چیف۔“ میں نے جواب دیا۔ ”سڑک پر اس سے نمٹنا بہت مشکل ہوگا۔ وہ اپنے سائے سے بھی بدکا ہوا ہے۔ اگر یہ شخص ہمیں مطلوب ہے تو ہمیں اسے ابھی گرفتار کرنا ہوگا۔“

”مجھے ہدایات کے لیے واشنگٹن کال کرنی ہوگی۔“ چیف نے جواب میں کہا۔ ”اس دوران میں اس کا پیچھا کرتے رہو اور ایک گھنٹے کے بعد دوبارہ کال کرو۔“

میں نے ریسیور رکھ دیا اور وکٹر ڈرگ اسٹور سے نکل گیا۔ میں ہر نکل کر سیکر سے جا ملا۔ اس نے اپنے سر سے جنوب کی طرف اشارہ کیا۔ اسی وقت وکٹر سڑک کے

باتیں کر رہا تھا۔

”ہی ہے وہ۔“ میرے منہ سے پھنسی پھنسی سی آواز نکلی۔ ”یہ لسنیگ ہے۔“

سب لوگ مڑ کر دیکھنے لگے۔ وہ کار ہماری نگاہوں کے سامنے آدھے بلاک کے فاصلے پر سڑک کے کنارے رک گئی۔ چیف میری طرف مڑا۔ ”جانسن، تم اسے اٹھا لو..... اسمعہ، تم ڈرائیور کو پکڑو۔ رہا تو اور سیدھے کمرے انہیں کور کرو۔ بہت احتیاط کی ضرورت ہے وہ مسلح ہو سکتے ہیں۔ اب چلو، چلیں۔“

میں نے ہولسٹر میں اپنی گن کو ڈھیلا کیا اور سڑک پر تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ وکٹر اور اس کا ڈرائیور اب بھی باتوں میں مصروف تھے۔ میں کار کے قریب پہنچا۔ اچانک مڑا اور کار کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھول کر میں نے وکٹر کو بازو سے پکڑ لیا۔ ”سیکرٹ سروس۔“ میں غرایا۔

وہ اس ناگہانی افتاد پر ہٹا بکا رہ گیا۔ میں نے اسے کھینچ کر کار سے اتارا اور اس کی جامہ تلاشی لی لیکن اس کے پاس کوئی گن نہیں تھی۔ اسمعہ نے ڈرائیور کو پکڑ لیا تھا اور اب ہمارے اسکوڈ نے انہیں گھیر لیا تھا۔

”آخر یہ سب کیا ہے؟“ وکٹر نے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر معصومیت سے پوچھا۔ پھر اس نے ہم چاروں کی طرف دیکھا جو اس کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھے اور اس کی نظر پیٹر بانو پر پڑ گئی۔ ”اوہ، تم تو مجھے یاد ہو۔“ وہ بولا۔

☆☆☆

ہم اسے پکڑ کر لے آئے اور اگلے چوبیس گھنٹے تک اس سے پوچھ گچھ کرتے رہے۔ وہ ہم سے اس طرح باتیں کرتا رہا گویا کوئی میزبان ڈنر پر اپنے مہمانوں کو اپنی دلچسپ اور پُر لطف باتوں سے محفوظ کر رہا ہو لیکن چونکہ وہ جانتا تھا کہ اس کے خلاف ہمارے پاس صرف جعل سازی کا الزام تھا جس پر ہم اسے اندر کر سکتے تھے چنانچہ اس نے جعل سازی کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔ اس کی زبانی ہمیں یہ معلوم ہوا کہ وہ اپنے ایک نئے شکار کوششے میں اتار چکا تھا اور اس شام اسے اس شکار سے ملنا تھا۔

”آپ حضرات ایسا کریں کہ مجھے رہا کر دیں تاکہ میں اپنا یہ بزنس اپائنٹمنٹ رکھ سکوں۔ اس کے بعد میں یہاں لوٹ آؤں گا یہ میرا وعدہ ہے۔“

”کیا تم مذاق کر رہے ہو؟“ چیف گاؤ بائی حیرت سے بولا۔ ”کیا تم مجھ سے یہ توقع کر رہے ہو کہ میں تمہیں رہا

کر دوں تاکہ تم ایک اور جرم کا ارتکاب کر سکو؟“
”وہ ذات شریف جس سے میں ملنے جا رہا ہوں، مجھے دس ہزار ڈالر دے گا۔“ وہ خوشامدانہ لہجے میں بولا۔
”اگر میں اسے اس خوشی سے محروم رکھوں تو یہ بڑی زیادتی ہو گی۔“

چیف نے یہ سن کر ایک ایجنٹ کو اس شکار کے پاس بھیجا تاکہ وہ اسے بتائے کہ اسے تقریباً ٹھگ لیا گیا ہے۔ ایجنٹ چلا گیا اور جب واپس آیا تو اس نے ہمیں بتایا کہ وہ شخص سخت چراغ پا تھا۔ وکٹر پر نہیں بلکہ ہم پر۔ اس شخص کا خیال تھا کہ ہم نے اسے پیسا کمانے سے روک دیا ہے۔ وہ ہم پر سخت برہم تھا۔ ”اس نے کہا۔“ مجھے یقین ہے کہ وکٹر نے اسے ہسپانا تاز کر لیا ہے۔“

اب ہم نے وکٹر پر سوالوں کی ایسی بوچھاڑ کر دی کہ اس کے ٹھکے چھوٹ گئے۔ ہم نے اسے لن ٹرانوں کا کوئی موقع ہی نہیں دیا۔ مسلسل کئی گھنٹے تک تاہر توڑ سوالوں کے بعد ایک تصویری ابھرتی نظر آنے لگی۔ اس نے تسلیم کیا کہ وہ شکار میں ولیم واٹس کو جانتا تھا۔ پھر اس نے تسلیم کیا کہ وہ مشرق میں واٹس سے وقتاً فوقتاً ملتا رہا تھا۔
”مشرق میں کہاں؟“ چیف چونکا۔

”مختلف جگہوں پر۔“ اس نے جواب دیا۔ ”بالخصوص جرمنی کے ایک بار میں۔“
”کیا تم جانتے ہو کہ وہ کہاں رہتا ہے؟“ چیف نے پھر سوال کیا۔

”میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ واٹس اس معاملے میں بے انتہا بہانے باز ہے۔ وہ کسی کو بھی اپنے گھر کا پتا نہیں بتاتا اور مجھے کوئی اندازہ نہیں ہے کہ وہ کہاں رہتا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

لیکن چیف اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔ وہ اس موضوع پر بار بار ہتھوڑے برسائے لگا یہاں تک کہ وکٹر نے ہتھیار ڈال دیے۔

”واٹس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ایک آرام دہ کمرے میں رہتا ہے۔“ وہ بول پڑا۔ ”اس نے کہا تھا کہ وہ اپنی کھڑکی سے دریائے ہڈسن اور گودی میں کھڑے بحری جہازوں کا نظارہ کر سکتا ہے اور یہ کہ اسے صبح میں سورج کی بھرپور روشنی ملتی ہے جو پلیٹوں پر کام کرنے کے لیے بہت ضروری ہے۔“

اس نے غیر شعوری طور پر اگل دیا تھا۔ ولیم واٹس،

نچوڑیں گے۔ ہمیں یقین تھا کہ وہ چارونا چار اگلے گا لیکن اس دوران میں ایک عجیب واقعہ پیش آ گیا۔ وکٹرو فاتی جیل سے فرار ہو گیا۔

یہ جیل مین ہینن کے قلب میں واقع تھی اور وہاں سے فرار ہونا کسی کے لیے بھی ممکن نہیں تھا۔ ہم گھنٹوں جیل کے ایک ایک قیدی سے پوچھ گچھ کرتے رہے تب ہماری سمجھ میں آیا کہ وہ کیسے فرار ہوا تھا۔

دراصل میں دوپہر میں ہمیشہ سارے قیدیوں کو ورزش کرانے کے لیے چھت پر لے جایا کرتا تھا۔ اس دن وکٹرو بیماری کا بہانا کر کے اپنی کوٹھڑی میں رک گیا۔ اس موقع پر سارے کوریڈور سنسان تھے۔ آدھے محافظ چھت پر قیدیوں کے پاس تھے اور آدھے لٹچ پر تھے۔ اس دوران میں وکٹرو نے اپنے گدے کے نیچے سے بستر کی چادروں کا بنا ہوا ایک رسا نکالا۔ بستر کی چادریں ہر پختے لانداری سے دھل کر آئی تھیں اور وہ ان میں ایک چادر چپکے سے اپنے پاس رکھ لیتا تھا۔ رسا نکالنے کے بعد اس نے کوٹھڑی کا قفل کھول لیا۔ یہ آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ اس کے پاس چابی کہاں سے آئی۔ قفل کھول کر وہ سنسان کوریڈور کو عبور کر کے واش روم میں پہنچا اور ایک کٹر کے ذریعے جونہ جانے کس طرح اس کے ہاتھ لگ گیا تھا کھڑکی کی وزنی آہنی چاور کاٹ کر باہر نکل پڑا گیا۔ نیچے سڑک پر سے گزرتے ہوئے کئی لوگوں نے اسے دیکھا لیکن اس نے یہ ظاہر کیا کہ وہ کھڑکیاں صاف کر رہا تھا۔

☆☆☆

اس کے فرار نے ایک طوفان کھڑا کر دیا۔ سیکریٹری آف ٹریڈری اور سیکرٹ سروس کا سربراہ ہیری سورگن غصے سے پاگل ہو گیا۔ نیویارک کے گورنر ہربرٹ نے پولیس کو ان کی نااہلی پر سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ پولیس کو جب معلوم ہوا کہ ہم نے وکٹرو سے سودے بازی کی تھی تو اس نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ یہ جانے بغیر کہ سودے بازی کی نوعیت کیا تھی اور ہمارے مقاصد کیا تھے۔ وہ اس کے فرار کو سودے بازی کا نتیجہ سمجھ بیٹھے۔ غرض یہ کہ ہر طرف سے ہم پر لعنت ملامت ہونے لگی۔ اس سے بھی بدتر یہ ہوا کہ ہم ان پلیٹوں تک رسائی حاصل کرنے میں سخت ناکام رہے۔ حنا اسمتھ نے کچھ بتانے سے انکار کر دیا۔ ڈیپریڈین نے ان پلیٹوں کے حصول میں کوئی قابل ذکر کردار ادا نہیں کیا تھا۔ اس نے محض وکٹرو کی ہدایت پر عمل کیا تھا۔ وہ محض ایک اچکا تھا جو وکٹرو کے

فروری 2015ء

145

پلیٹوں پر کام کر رہا تھا اور وکٹرو یہ بات مانتا تھا لیکن اس سے آگے ہم اس سے کچھ بھی نہیں اگلا سکتے۔

اب ہم نے ایصلہ کیا کہ اس سے سودے بازی کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ اس نے جو بھی دیگر جرائم کیے تھے، وہ ہمارے دائرہ اختیار میں نہیں آتے تھے۔ ہمارا اول و آخر کام ان پلیٹوں کو حاصل کرنا تھا چنانچہ ہم اسی انداز سے آگے بڑھے۔ ہم نے کوئی وعدہ کیے بغیر وکٹرو سے یہ کہا کہ اگر وہ ہم سے تعاون کرے تو ہم اس کے شکر گزار ہوں گے۔ وہ ہمارا یہ اشارہ سمجھ گیا۔

”میں ان پلیٹوں پر ہاتھ ڈال سکتا ہوں۔“ بالآخر وہ بولا۔ ”لیکن مجھے یقین نہیں ہے پھر بھی میرے خیال میں، میں ایسا کر سکتا ہوں۔ مجھے بہر حال اپنے ایک دوست کی مدد درکار ہوگی۔“

وہ ”دوست“ ڈیپریڈین نکلا۔ ہم نے ان دونوں کو تھوڑی دیر کے لیے تنہا چھوڑ دیا اور پھر ڈین اسی سہ پہر میں لوٹ آنے کا وعدہ کر کے رخصت ہو گیا اور وہ اپنے وعدے کے مطابق لوٹ بھی آیا۔ اس کے پاس ٹائم اسکوئر کے سب وے اسٹیشن کے ایک سیکرٹ لاکر کی چابی تھی جو اس نے ہمارے حوالے کر دی۔ ”آپ حضرات کو اس لاکر میں وہ چیز مل جائے گی جس کی آپ کو تلاش ہے۔“ اس نے کہا۔

چنانچہ دو سیکرٹ اینجنٹوں کو وہاں دوزا دیا گیا۔ وہ لوگ ایک بیچ کے ہاتھ لوٹے۔ اس بیچ میں پلیٹوں کے تین سیٹ (Set) اور پانچ ہزار ایک سو ڈالر کے جعلی نوٹ تھے۔ وکٹرو مسکراتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اور کورٹش بجالایا۔ پھر جانے کے لیے دروازے کی طرف بڑھ گیا لیکن ہم نے اسے پکڑ لیا۔ اس پر سازش کرنے اور جعلی نوٹ رکھنے کا الزام عائد کر کے جج سے کہا کہ وہ اس کی ضمانت پچاس ہزار ڈالر مقرر کرے۔

”ڈبل کر اس۔“ وکٹرو چیخ پڑا۔

وہ مسلسل چنٹا رہا لیکن ہم نے اس کی ایک نہیں سنی اور اسے وفاقی جیل بھیج کر ہی دم لیا۔ ہمیں جلد ہی پتا چل گیا کہ اس نے ہمیں ایک بار پھر بے وقوف بنانے کی کوشش کی تھی۔

☆☆☆

وکٹرو کے جیل جاتے ہی واٹس کے جعلی نوٹوں کے بہاؤ کا سوتا خشک ہونے لگا۔ لہذا ہم سمجھ گئے کہ ہم نے واٹس کے شریک جرم کو پکڑنے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ ہم نے سوچا کہ وہ کچھ عرصہ جیل کا مزہ چکھ لے پھر ہم اسے دوبارہ

ماہنامہ سکرگزشہت

پڑتے ہی وائس کی آنکھیں جیسے دہشت سے پتھرا گئیں۔ ہم کوئی موقع دیے بغیر اسے دھکیلتے ہوئے اندر گھس گئے۔ چوہے جیسا وہ منحنی شخص پلکیں جھپکا رہا تھا۔ اس کا منہ حیرت سے کھل گیا تھا اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ کھلی کھڑکی کے پاس ہی ایک میز بچھی ہوئی تھی۔ اس منبر پر تانے کی ایک پلیٹ اور نقش کندہ کرنے کے اوزار نظر آ رہے تھے۔ کمرے میں نقل بہ مطابق اصل پلیٹیں چھپا کر رکھی گئی تھیں جن کی مدد سے سوڈالر کے جعلی نوٹ چھاپے جاتے تھے۔ ان پلیٹوں کے ساتھ ہی دیگر اوزار اور پچاس ہزار ڈالر کی جعلی کرنسی بھی برآمد ہوئی۔ ہمیں اپنا مطلوبہ شخص مل گیا تھا۔

☆☆☆

مورخہ 5 دسمبر 1935ء کو وائس اور وکٹر لسننگ عدالت کے کنبہرے میں کھڑے تھے۔ وائس سرکاری گواہ بن گیا تھا۔ اس نے اپنے پارٹنرشپ کی پوری داستان بے کم و کاست بیان کر دی۔ ان دونوں نے مل کر ایک ملین ٹین لاکھ چالیس ہزار ڈالر کے جعلی نوٹ چھاپے تھے اور مارکیٹ میں پھیلانے تھے۔ مورخہ 7 دسمبر کو وکٹر نے عدالت کے روبرو اپنے جرم کا اعتراف کر کے مقدمہ رکوا دیا اور عدالت نے اسے بیس سال قید کی سزا سنائی لیکن اب وہ اپنے گھناؤنے ماضی کا بھی قیدی تھا۔ سزا سنائے جانے کے بعد جب ہم دونوں آپس میں باتیں کرنے لگے تو اس نے مجھ سے پوچھا۔

”کیا تم جانتے ہو کہ شریف رچرڈ کس جیل میں ہے؟“

”تمہاری مراد اس شریف سے ہے جسے تم نے جعلی نوٹ دے کر پھنسا دیا تھا؟“ میں نے پوچھا۔ ”میرا خیال ہے کہ وہ لوٹس برگ کی جیل میں ہے۔“

”کیا تم میری خاطر اتنا کر سکتے ہو کہ مجھے وہاں نہ بھیجا جائے؟“ اس نے منت کی۔ ”مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہے کہ سوائے اس جگہ کے مجھے کہاں بھیجا جائے گا۔“ اس کی آواز کانپ رہی تھی۔ ”مجھے کہیں بھی بھیج دو مگر وہاں مت بھیجو۔“ اس کی ساری خود اعتمادی ہوا ہو گئی تھی۔

اسے الکر از بھیج دیا گیا۔ 1947ء میں وہ فوت ہو گیا۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ اس کی موت کی سند پر اس کا پیشہ نو آموز سیز مین درج کیا گیا۔ ایک ایسے شخص کو سیز مین کہنا واقعی بڑی زیادتی تھی جس نے ایفل ٹاور دو مرتبہ بچا تھا۔



اشارے پر چلتا تھا۔ لہذا اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ ہمیں صرف ولیم وائس کا نام معلوم تھا لیکن ہم اس کے ٹھکانے سے صرف اتنا ہی واقف تھے جتنا وکٹر نے ہمیں بتایا تھا۔

چنانچہ ایک دن میں اسکوڈ کے ایک ممبر کے ہمراہ مین ہیشن گیا جہاں ہم دریا کے اس پار صبح کی تیز دھوپ میں چمکتی ہوئی ہزار ہا کھڑکیوں کی طرف دیکھ سکتے تھے۔ کیا وائس اب بھی ان ہی میں سے کسی ایک کھڑکی کے پیچھے موجود تھا یا وکٹر کے جیل سے فرار ہونے کی خبر سن کر کہیں فرار ہو گیا تھا۔ اس کا پتا چلانے کا صرف ایک ہی طریقہ تھا۔ میں پورے موسم گرما میں ایک ایک دروازہ کھٹ کھٹا کر سب مینوں سے پوچھتا رہا کہ کیا وہ کسی ایسے کرائے دار کو جانتے تھے جو کم گو اور کم آمیز ہوا اور شاذ و نادر ہی باہر نکلتا ہو۔

اور جب ستمبر میں ایک ایجنٹ نے جو ایف بی آئی کے ساتھ مل کر کام کر رہا تھا۔ وکٹر کو پیش برگر سے دوبارہ گرفتار کر لیا۔ ہم یہ خوش خبری سن کر لمحاتی طور پر بے حد خوش ہوئے اور جوش و خروش سے یوں باتیں کرنے لگے گویا ہمارا کیس اختتام کو پہنچ گیا ہو لیکن پھر ہمیں خیال آیا کہ نل سے ہم پھر نوب جرسی میں دروازوں کی گھنٹیاں بجا رہے ہوں گے۔

☆☆☆

چند ہفتوں کے بعد ایک شام جب ہم اپنے دفتر میں ڈیوٹی کے لیے اکٹھا ہوئے تو ایجنٹ جارج بول پڑا۔ ”ایک امکان نظر آ رہا ہے۔“

اس کے ہاتھ میں اس کے نوٹس تھے جن پر وہ نظریں دوڑا رہا تھا۔ ”بڑے کمرے کا ایک مکان، یونین سٹی... دریا، ہڈن کا نظارہ اور صبح کی دھوپ ملتی ہے۔ ایک شخص جس کا نام مسٹر جان رائے... چوہے جیسا، آمدنی کا بظاہر کوئی ذریعہ نہیں۔ کوئی دوست نہیں، کوئی بیوی نہیں، کوئی بچہ نہیں۔ جب اس نے کرا کر اے پر لیا تھا تو نیراسکا کے شہر اہاما کا حوالہ دیا تھا۔“

”یہی وہ شہر ہے جہاں وائس کا ڈرگ اسٹور ہوا کرتا تھا۔“ میں بول پڑا۔

”ہو سکتا ہے۔“ ربا نونے کہا۔ ”لیکن ہمیں یہ چیک کرنا پڑے گا۔“

اگلی صبح ہم چھ ایجنٹ رائے کے دروازے کے باہر کھڑے تھے۔ ”دودھ والا۔“ جارج نے پکار کر کہا۔ ”کیا آج پیسے دے رہے ہو؟“

چند لمحوں کے بعد دروازہ کھلا اور اگلے تین لمحوں پر نگاہ



سمندر کے بھید

عائشہ جونجیو

سمندر خشکی سے بہت زیادہ بڑا ہے اس لیے اس کے اندر کی دنیا بھی زیادہ بڑی ہے۔ پتا نہیں کیسی کیسی مخلوق اس کے اندر رہتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ جل پری رہتی ہے تو کوئی کہتا ہے ٹروٹن چہرے والے مرد۔ ان کے علاوہ بھی بے شمار اجسام موجود ہیں۔

سمندر کے راز پر ایک مختصر سا جائزہ

سمندر ہمارے لیے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ خدا کی اس عظیم الشان نعمت کے فوائد بے شمار ہیں۔ ہم نے اس مضمون میں سمندر کے ان پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔ جو ہمارے لیے ایک بھید کی طرح ہیں۔

ہم سمندر کنارے جا کر اسے دیکھنے کے لیے پاگل رہتے ہیں اور وہ ہمیں اپنی طرف کھینچتا ہے۔ ہم اس کے ساحل پر بیٹھ کر نہ جانے کون سی دنیاؤں میں کھو جاتے ہیں۔ ہتے ہیں کہ ڈوب جانے والوں کو سمندر اپنی طرف بلا تا ہے اور وہ اس کی آواز پر مست ہو کر اس کی طرف بڑھتے ہی چلتے ہیں اور بالآخر ڈوب جاتے ہیں۔

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ سمندر تو کتنا خود غرض ہے کہ جب انسان زندہ ہو تو اسے تیرنے نہیں دیتا اور جب

چینیوں کے قدیم عقیدے کے مطابق دو خدا ہوا کرتے تھے۔ ایک گانگ گانگ، پانی کا خدا اور دوسرا ژورانگ (آگ کا خدا)۔

ان دونوں خداؤں کی اپنی اپنی خدائی تھی۔ جہاں ان کے احکامات چلا کرتے اور یہ دونوں اپنی اپنی مملکت کے حاکم ہوا کرتے۔ پھر کسی بات پر دونوں خداؤں کے درمیان آن بن ہو گئی۔ جس کے نتیجے میں ایک بہت خوفناک جنگ ہوئی اور اس جنگ کے نتیجے میں پانی کے خدا کو شکست ہو گئی اور اس جنگ کے بعد پانی کا خدا بہت شرمندہ ہوا۔ اسے اپنے آپ سے ہی وحشت ہونے لگی۔ پھر اس نے پہاڑوں سے گود کر اسی سمندر میں خودکشی کر لی جس کو خود اس نے تخلیق کیا تھا۔ اس حادثے کے بعد اس کے دیو میکل بدن کے ہزاروں لاکھوں نمڑے ہو گئے اور ان نمڑوں سے لاتعداد سمندری مخلوق وجود میں آ گئیں۔

چینیوں اور جاپانیوں کے خیال میں سمندر میں دیو بیکل اژدھے اور جل پریاں بھی ہوا کرتی ہیں۔ جاپان میں ایک ایسی سمندری مخلوق کو تسلیم کیا جاتا ہے جس کا نام Vinyo ہے جس کا ایک بڑا سا مردانہ سر ہوتا ہے۔ لیکن کمر سے نیچے وہ مچھلی کی طرح ہوتا ہے۔

ایک اور مخلوق کا بھی ذکر ملتا ہے جس پر بچوں کے لیے بے شمار کہانیاں لکھی گئی ہیں اور فلمیں بھی بنائی گئی ہیں اس مخلوق کا نام ٹرائی ٹون ہے۔ Tri Ton ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مخلوق گھوڑے، مچھلی اور انسان کی مخلوط شکل میں ہوتی ہے۔

روم کے ایک رائٹر Pausanias نے بھی اپنی کہانیوں میں اس مخلوق کا ذکر کیا ہے۔ اس رائٹر کا زمانہ 143AD سے 180AD تک کا ہے۔

قدیم آئر لینڈ اور برطانیہ میں بھی پانی کے ایک دیوتا کا تصور تھا جس کو انہوں نے مناپان کا نام دیا تھا۔ مچھلیوں کے شکار پر جانے سے پہلے مچھیرے اس کے حضور نذرانے پیش کیا کرتے اور اپنے شکار کی کامیابی کی دعائیں کیا کرتے۔

روس اور اس کے ملحقہ علاقوں میں بھی سمندری مخلوق کا ذکر ملتا ہے۔ ان کے خیال یا عقیدے کے مطابق وہ مخلوق سینکڑوں کی تعداد میں سمندر میں اپنی کالونی بنا کر رہتی ہے۔ اس مخلوق کا نام انہوں نے Rusalka رکھا ہے۔

یہ تو تھیں سمندر کے حوالے سے قدیم کہانیاں اور روایتیں۔ اب ذرا موجودہ (مانسی قریب) کا بھی جائزہ

مر جائے تو اسے ڈوبنے نہیں دیتا۔ چاندنی راتوں میں یہ اور بھی پُرکشش ہو جاتا ہے۔ محبت کرنے والے بوڑھے ساحل پر بیٹھ کر اس کی طرف دیکھتے اور پیار بھری سرگوشیاں کرتے ہیں۔

نہ جانے کتنے راز اس سمندر کے سینے میں دفن ہیں۔ نہ جانے کتنی کہانیاں ہیں۔ کہتے ہیں کہ سمندر کے ندر کی دنیا بہت حسین ہے۔ شاید ہماری ظاہری دنیا سے بھی زیادہ۔ نہ جانے کیسی کیسی بھول بھلیاں، چٹانیں اور دیگر مخلوق اس جہان میں آباد ہیں۔

مانگیں گے تا درازی عمر کی دعا بے فیض زندگی سے اگر اوب جائیں گے سورج کی ڈوبتی ہوئی کرنوں کے ساتھ ساتھ گہرے سمندروں میں کہیں ڈوب جائیں گے ہم کبھی کبھی زیر سمندر جب کیمرے کی آنکھ سے اس کے حسن کو دیکھتے ہیں تو بے اختیار سبحان اللہ کہنے پر مجبور جاتے ہیں۔

اتنا ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی روایات اور پراسرار کہانیاں بھی ہیں۔ وہ لوگ جن کی کشتیاں برسوں پہلے ڈوب گئیں لیکن آج بھی ایک خاص تاریخ کو وہ ڈوبی ہوئی کشتیاں سمندر کے سینے پر بھٹکتی ہوئی دکھائی دے جاتی ہیں۔

اس مخلوق کی کہانی جس کا اور پری حصہ عورت کا اور دھڑ مچھلی کا ہوتا ہے جسے جل پری کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ برمودا ٹرائی اینگل کے حوالے سے حیرت انگیز داستانیں ہیں۔

یہ سب کیا اس لیے ہے کہ انسان ابھی پوری طرح سمندر کو دریافت نہیں کر پایا ہے۔

سمندر سے انسان کو ہمیشہ سے دل چسپی رہی ہے۔ اس نے نہ جانے کتنی کہانیاں اور کتنی روایات سمندر سے منسوب کر رکھی ہیں۔ میتھالوجیز میں بھی سمندر سے وابستہ روایات ملتے ہیں۔

ہر عقیدے کے لوگ سمندر کے حوالے سے مختلف عقیدے رکھتے ہیں (سوائے مسلمانوں یا الہامی مذاہب کے)۔ آئیں ذرا سمندر سے وابستہ روایات اور عقیدوں کو دیکھتے ہیں۔

ہندو میتھالوجی ہو یا تبت کے رہنے والوں کی۔ سمندر ان کے نزدیک بہت وصال اور بہت بھید بھرا ہوتا ہے۔

لے لیتے ہیں۔

جب یہ کہانیاں بہت عام ہو گئیں تو ایک مصنف پیٹریشیا نے اصل حقائق تک پہنچنے کے لیے مارچ 2003ء میں ایک مہم کا آغاز کیا۔ وہ یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ سمندروں میں کوئی حیرت انگیز مخلوق ہے بھی یا صرف کہانیاں اور روایتیں ہیں۔ اس نے اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ کلاڈونگ نام کی ایک طاقت ور اور تیز رفتار لائچ کے ذریعے اس مہم کا آغاز کیا۔

پھر ان دنوں نے 5 مارچ 2003ء میں سمندر میں ایک ایسی مخلوق دیکھی جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی۔ البتہ اس کی کہانیاں موجود تھیں اور ان ہی کہانیوں کی حقیقت جاننے کے لیے انہوں نے اس مہم کا آغاز کیا تھا۔ ان کے بیان کے مطابق وہ مخلوق دس بارہ میٹر طویل تھی اور سب سے حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اژدھے نما اس مخلوق کا سر انسانی نفا اور اس میں ہیرے جیسی چمک تھی۔ پیٹریشیا کا یہ بیان ہے کہ وہ اس مخلوق کو دیکھ کر دنگ رہ گئی تھی۔ وہ لوگ اپنی لائچ کو اس کے قریب لے گئے لیکن اس نے پانی میں غوطہ کھا دیا تھا۔

یہ صرف ایک بیان ہے۔ جب کہ اس مخلوق کی موجودگی بہت عرصے سے محسوس کی جا رہی ہے۔ بے شمار شواہد ہیں۔ آئیے دیکھتے ہیں کہ یہ شواہد کب ریکارڈ پر آئے ہیں۔

1895ء۔۔ جی ہاں! اس مخلوق کے ریکارڈ پر آنے کا سلسلہ 1895ء سے شروع ہوا۔ جب بہت سے چمھیروں اور ایک بڑی سی کشتی پر کام کرنے والے کاریگروں نے اس مخلوق کو اپنی کشتی کے پاس دیکھا۔ انہوں نے فوراً کنارے پر آ کر حکام کو اس کی رپورٹ دی۔ ان کے بیان کے مطابق اژدھے نما وہ جسم بارہ تیرہ میٹر طویل تھا اور اس کا انسانی چہرہ اس طرح چمک رہا تھا جیسے شیشے کے پیچھے چراغ جل رہے ہوں۔

اس کے بعد بہت عرصے تک وہ مخلوق دکھائی نہیں دی یا اگر دکھائی دی بھی ہو تو کسی نے رپورٹ نہیں کی۔ اس لیے ریکارڈ پر نہیں آسکا۔

لیکن پھر اس کا دوسرا ریکارڈ 1903ء میں سامنے آیا۔ اس بار ایک بڑے جہاز والوں نے اس مخلوق کو دیکھا تھا۔ جہاز نے جب اس کے قریب جانے کی کوشش کی تو اس مخلوق نے پانی میں غوطہ کھا دیا اور نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ 1903ء کے بعد وہی مخلوق 1908ء میں جیک مان نام کے ایک مارچ کو دکھائی دی اور اس نے بھی وہی طریقہ

بیان کیا جو پہلے والے بتا چکے تھے۔

اس کے بعد 1923ء میں لمر اور جیک لوری نام کے دو ملاحوں نے اسے دیکھا اور یہ دونوں اسے اچھی طرح دیکھنے میں کامیاب رہے تھے۔ ان کے بیان کے مطابق اس مخلوق کا انسانی چہرہ اتنا روشن تھا جیسے بلب جل رہے ہوں۔ ان کا بیان ہے کہ وہ اسے دیکھ کر دنگ رہ گئے تھے۔

اس کے بعد یہ پراسرار مخلوق 1929، 1930، 1943، 1947 سے 1970ء تک دیکھی گئی۔ 1970ء میں میساچوسٹس یونیورسٹی کے ایک محقق نے کئی ہفتے اس مخلوق کی تلاش میں لگا دیے۔ اس کے بعد اس نے جو اپنی رپورٹ مرتب کی وہ شائع ہو چکی ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق وہ ایک حیرت انگیز مخلوق ہے۔ بارتیرہ میٹر لمبی اور کسی موٹے اژدھے کی طرح موٹی۔

بظاہر اسے پانی کا اژدھا سمجھا جاسکتا تھا لیکن اس کا بالکل انسانی چہرہ اسے حیرت انگیز بنا دیتا ہے۔ دو بھنویں دو آنکھیں، ناک، ہونٹ، دو کان، سب کچھ انسانی چہرے کی طرح۔

فرق یہ ہے کہ کوئی بھی انسانی چہرہ بجلی کے بلب کی طرح روشن نہیں ہوتا لیکن وہ چہرہ روشن رہتا ہے۔ 1972ء میں فرینک سیریلے نام کے ایک صحافی نے بتایا کہ یہ مخلوق ایک دو کی تعداد میں نہیں ہے بلکہ پانی کے نیچے ان کی پوری کالونی آباد ہے۔

آخری بار اس مخلوق کو 2003ء میں دیکھا گیا جس کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔

اب ان رپورٹس سے ایک بات یہ بھی سامنے آئی ہے کہ یہ مخلوق دنیا کے ہر سمندر میں موجود ہے یا کہیں بھی موجود ہو سکتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ یہ کیا مخلوق ہے؟ اور انسان سے اس کا کیا رشتہ ہے کہ اس کا چہرہ انسانی ہو گیا ہے۔ اس بھید سے اس وقت پردہ اٹھ سکتا ہے جب وہ مخلوق ہاتھ لگے اور سائنس دان اس پر تجربے کر سکیں۔ لیکن ابھی تک وہ انسان کے ہاتھ نہیں لگ سکی ہے۔

اس کو صرف دیکھا ہی جاتا رہا ہے۔ سمندر کے بے شمار بھید ہیں۔ ایک بھید یہ بھی ہے خدا بہت عظیم ہے اور اس نے اپنی عظمت کی نشانیاں خشک وتر میں رکھی ہوئی ہیں تاکہ ہم ان کو دیکھیں اور اس بے مثال خالق کی تعریف کر سکیں۔



سراب

راوی: شہباز ملک

تحریر: کاٹیف زیبر

قسط نمبر: 94

وہ پیدائشی مہم جو تھا بلند و بالا پہاڑ، سنگلاخ جتانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایلا۔ لٹکارسے ابھرتی محسوس ہونی کہ اُوہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے ساحرے میں مسحور ہو کر اپنا آپ ما ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب۔ ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے دھن و دل کو بھٹکاتا ہے۔ جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر اسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سراپوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی وقت کے گرداب میں ڈوبنے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بند و وصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

فروری 2015ء

150

ماہنامہ سرگزشت

Copied From Web



Copied From Web



میری محبت سویرا، میرے بھائی کا مقدر بنا دی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران نادر علی سے ٹکراؤ ہوا، اور یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شاہ جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد یار تک چلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کر دیا کہ مجھے ڈیوڈ شاہ کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاش لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کر دیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیب تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ میں نے کرنل زرو سکی کو زخمی کر کے بساط اپنے حق میں کر لی۔ میں دوستوں کے درمیان آ کر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ ہم ہانسبرہ پہنچے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہرو تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زرو سکی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کر رہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھاگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زرو سکی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کر دیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پایا۔ ہسپتال کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جنس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کر دی اور میں نے ان کے ساتھ جا کر بریف کیس حاصل کر لیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آ گئے۔ سفیر کو وہی بھیجنا تھا اسے ائر پورٹ سے سی آف کر کے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسڈنٹ ہو گیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی بنٹی کی بھانجی زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالت مجبوری میں راضی ہو گیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو زس مجھ سے چٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہو کر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر لے چلے۔ مجھے راج کنور کی حویلی میں پہنچایا گیا۔ ٹائیک اور رامن اندر آئے۔ میں نے ان پر قابو پایا پھر راج کنور پر قابو پایا لیکن جب دروازہ کھولا تو باہر بڑا کنور کھڑا کہہ رہا تھا "شہباز ہتھیار پھینک کر باہر آ جاؤ۔" میں نے بروقت راج کنور کے ہاتھ پر ہاتھ مارا ہسپتال نکال کر دور جا کر اچھر وہاں سے نکل کر راستے میں شام کی گاڑی پر قبضہ کیا اور راج کنور کو گاڑی میں ڈال کر بھاگ نکلا۔ راج کنور کو لے کر سرحد پار کر گیا۔ مگر جب اپنی سرزمین پر اترتا تو خبر ملی کہ سعدیہ کو اغوا کر لیا گیا ہے اور اسے واپس انڈیا لے جایا جا رہا ہے۔ میں نے واپسی کے لیے پہلی گاڑی لانے کو کہا۔ شملہ پہنچے پھر وہاں سے راج کنور کے محل کی ناکا بندی کرنے جا پہنچے۔ میرا خیال تھا کہ جب سعدیہ کو لایا جائے گا تو راستے میں گاڑی کو روک لیں گے۔ کچھ دیر بعد ہائی وے پر ایک گاڑی کی بیڈلائٹس چمکی بیٹو نے سڑک پر نوکیلی کیلیں بچھا دی تھیں۔ گاڑی نزدیک پہنچتے ہی دھماکا سا ہوا۔ گاڑی سے فائر ہوا جو بیٹو کے شانے میں لگا۔ ہم نے گولی چلانے والے کو شوٹ کر دیا۔ گاڑی کی تلاشی لی مگر وہاں سعدیہ کی بجائے کنور تھا۔ ہم محل کی طرف دوڑے، کہ ایک پہلی کا پٹرا تر رہا تھا۔ اس سے سعدیہ اتری ورنادر چلی گئی۔ میں بیٹو کو لے کر ڈاکٹر گپتا کے پاس پہنچا۔ اس نے طبی امداد دے کر ٹھہرنے کے لیے اپنی بہن سیتا کے گھر بھیج دیا۔ سینا کا شوہر ارون اسے حراساں کر رہا تھا اسے میں نے موت کی گود میں بھیج دیا پھر آگے بڑھا تھا کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا، اس نے ڈیوڈ شاہ کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شاہ کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے پراسرار وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور

پہلیں سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجانامی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے منشی دل جی کی آواز سنائی دی۔ ”شاجی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔“ ڈیوڈ شاہ کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجانے مانگ بند کر دیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگا دی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کر رہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے دار کر کے بے ہوش کر دیا اور محل میں پہنچا دیا۔ مجھے پتا تھا ہر جگہ ڈیکٹا فون لگا ہوا ہے۔ تبھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا ”کنور ہوشیار“ سادی کو لے کر چیمبر..... مگر جملہ اداوارہ گیا اور سادی کی چیخ سنائی دی پھر منشی دل نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں اس سے نمٹ رہا تھا کہ فتح خان نے آکر مجھے اور سادی کو نشانے پر لے لیا۔ تبھی راج کنور آ گیا۔ اس نے گولی چلائی جو بندوق کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا پستول راج کنور پر خالی کر دیا میتو مرچکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چتا کے حوالے کیا اور ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعہ سرحد تک پہنچے۔ وہاں سے اپنے شہر۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ ڈیوڈ کی کال آگئی اس نے تصفیہ کرانے کی بات کی اور کال کٹ گئی۔ ہم بنگلے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ کیس پھینک کر ہمیں بے ہوش کر دیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔ شاکی قید میں شانے مجھے کہا کہ میں فاضلی کی مدد کروں کیونکہ میرے ہاتھوں میں ایک ایسا کڑا پہنایا گیا تھا جو فاضلی سے 500 میٹر دور جاتے ہی زہرا بجلیکٹ کر دیتا، میں حکم ماننے پر تیار ہو گیا فاضلی نے مرشد کی جعلی خانقاہ پر حملے کا پروگرام بن گیا۔ ہم نے فاضلی کے آدمیوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ حملہ کامیاب رہا فاضلی مارا گیا اور مجھے سانپ نے ڈس لیا مگر سانپ کا زہر مجھ پر کارگر نہ ہوا۔ فاضلی نے جو کڑا مجھے پہنایا تھا اس کا الٹا اثر ہوا اور وہ خود کڑے میں چھپے سائینائیڈ زہر سے مارا گیا۔ میں مرشد کی خانقاہ سے نکل کر دوستوں کے پاس پہنچا پھر راجا صاحب سے ملنے جیپ کے ذریعے ان کے علاقے کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ علاقہ بھی تھا جہاں برٹ شانے ہیرے چھپائے تھے۔ میں اسے تلاش کرنے کے لیے بیڑ پر چڑھا تھا کہ فائر ہوا اور میں پھسل کر نیچے گرا۔

(اب آگے پڑھیں)

مجھ پر دو طرف سے روشنی پڑ رہی تھی یعنی فتح خان کے ساتھ کم سے کم ایک آدمی اور بھی تھا۔ مجھے ان دونوں میں سے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا ایسے میں کسی قسم کا رسک لینا بالکل مناسب نہیں تھا۔ میں نے پہلے شانے سے شاٹ گن اتاری اور آگے پھینک دی۔ پھر پستول بھی نکالا اور اسی سمت اچھال دیا۔ میرا پاؤں خلا میں بری طرح پھنسا ہوا تھا اور میں نے اندر ہاتھ ڈال کر بہ مشکل کھینچ کر اپنا پاؤں خلا سے نکالا۔ مگر مزید حرکت سے گریز کیا تھا۔ میرے سامنے فتح خان جیسا وحشی تھا جس سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ کب کیا کر گزرے؟ کوئی آگے آیا اور اس نے میرے پھینکے ہتھیار اٹھا لیے۔ فتح خان نے کہا۔ ”اب دونوں ہاتھ اٹھا کر کھڑا ہو جاؤ۔“

میں نے حکم کی تعمیل کی۔ وہی آدمی آگے آیا اور اس نے میری تلاشی لے کر پرس، موبائل اور جیپ کی چابیاں قبضے میں لے لیں۔ میں نے کہا۔ ”فتح خان تم نے بیکار میں زحمت کی میں تمہارے ہی کام سے آیا تھا۔“

نیچے گرتے ہوئے میرا پہلو تنے کے ایک کسی قدر ابھرے اور بہت زیادہ کھردرے حصے سے لگرایا اور اس نے میرا پہلو چھیل دیا تھا۔ مزید یہ کہ پاؤں خلا میں گیا اور گرنے سے مڑا۔ اس میں بھی شدید تھکائی تھی۔ ان دو جگہوں پر درد کی وجوہات واضح تھیں اس کے باوجود میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ فتح خان کے چلائے برسٹ نے مجھے چھوا تھا یا نہیں۔ بعض اوقات گولی کا زخم زرا دیر سے اپنا احساس دلاتا ہے۔ میں خور کو ٹول رہا تھا۔ اتنے میں فتح خان کی آواز آئی۔ ”شہباز تم ٹھیک ہے؟“

”گولی چلا کر پوچھتے ہو کہ ٹھیک ہے؟“ میں نے خشکی سے کہا۔ اس دوران میں، میں نے تسلی کر لی تھی کہ مجھے گولی نہیں لگی ہے۔

”تم کو نہیں اس خانہ خراب لو کو گولی ماری ہے جو تم پر جھپٹ رہا تھا۔“ فتح خان نے وضاحت کی۔ ”اب تم آرام سے اپنا پستول اور شاٹ گن سامنے پھینک دو۔ جلدی مت کرنا ورنہ جلدی مری جاؤ گے۔“

مارنے کے بعد بولا۔ ”خان ادھر کچھ نہیں ہے۔“
فتح خان پشتو میں غرایا اور یہ غراہٹ ناقابل اشاعت
تھی۔ اس نے بیک وقت سوراخ اور ہیروں کی شان میں
مدح سرائی کرتے ہوئے جو کہا تھا اسے بیان کرنا ممکن نہیں
ہے۔ پھر اس نے مجھ سے کہا۔ ”شہباز وہ ہیرا کدھر ہے؟“
”میں تو خود تلاش میں ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”اب
تک کامیابی نہیں ملی ہے۔“

”تو تلاش کرو جب تک کامیاب نہیں ہو جاتے۔“ فتح
خان نے سفاک لہجے میں کہا۔ ”اگر تلاش نہیں کر سکے تو مر
جاؤ گے۔ میں تیرے کو اسی وادی میں دفن کر جائے گا۔ جیسے
مجھے ہیرا نہیں ملا اسی طرح تمہارے ساتھیوں کو تم نہیں ملے
گا۔“

اس دوران میں چاند کی رہی سہی روشنی بھی ختم ہو چکی
تھی مگر اب روشنی کی مجبوری بھی ختم ہو گئی تھی۔ فتح خان اور
اس کے ساتھی کے پاس تیز روشنی والی ٹارچس تھیں۔ ”مجھے تو
خدشہ ہے کہ تم ہیرے مل جانے کے بعد بھی میرے ساتھ یہی
سلوک کرو گے۔“

”ابھی میں تم کو کوئی ضمانت نہیں دے سکتا اس لیے
کام شروع کرو۔“

”میرے پاؤں میں چوٹ آئی ہے۔“ میں نے
کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ویسے ٹیس لگاتی تھی اور اب میں
سکون میں تھا یعنی ٹخنے کو نقصان نہیں ہوا تھا۔ مگر میں نے فتح
خان سے کہا۔ ”میں آسانی سے حرکت نہیں کر سکتا۔“

”شہباز خان تمہارا آواز بتا رہا ہے تم تکلیف میں نہیں
ہے۔ اس سے پہلے کہ میں جلال کو بولوں بہتر ہوگا تم حرکت
میں آجائے۔“

بادل ناخواستہ میں حرکت میں آیا اور ہم نے ٹارچوں
کی روشنی میں تنوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ روشنی فتح خان
دکھا رہا تھا اور ہم تنے دیکھ رہے تھے۔ فتح خان نے کہا۔
”مجھے یقین تھا کہ اس گورے حرامی نے تم کو ہیروں کا جگہ
بتایا ہوگا اور تم جانتا ہے کہ ہیرے کہاں ہیں؟“

”برٹ شانے صرف اشارہ دیا تھا۔“ میں نے
کہا۔ ”اس نے مرنے سے پہلے شمالی ڈھلان اور سب سے
بڑے تنے کے الفاظ کہے تھے۔“

”تمہارا مطلب ہے تم ہیروں کی صحیح جگہ کے بارے
میں نہیں جانتا؟“

”ظاہر ہے میں جانتا تو یوں ہر درخت کا تانا چپک
کر رہا ہوتا۔ اسی درخت سے ہیرے حاصل کر لیتا جہاں

”تمہارا مطلب ہے تم ہیرا لینے آیا تھا کہ لے کر میرا
خدمت میں پیش کر دو؟“ فتح خان نے عیاری سے کہا۔ ”تم
فتح خان کو اتنا برو قوف سمجھتا ہے؟“
”میں نے تمہیں کبھی بے وقوف نہیں سمجھا اور جہاں
تک ہیرے پیش کرنے کی بات ہے تو میں وہ تمہیں ہی دیتا
مگر ایک شرط کے ساتھ۔“
”کیسا شرط؟“

”مرشد۔ سے میری جان چھڑوادو۔“

”تمہارا مطلب ہے مرشد کا مرؤر؟“

”یہ میں تم پر چھوڑ دیتا، تم جیسے مناسب سمجھتے یہ کام
کرتے اور ہیروں کے لیے تم درجنوں جانیں پہلے ہی لے
چکے ہو۔“

”جب میں نے تم کو آفر کیا تو تم نے انکار کر دیا اس
وقت تم فتح خان سے انتقام کی بات کر رہا تھا۔“ اس کا لہجہ
طنزیہ ہو گیا۔

”فتح خان بیٹو کا حساب باقی ہے اور وہ بھی بے باق
ہوگا مگر ابھی میں مجبور ہوں۔“

”ہاں تم میرے ہاتھ آ گیا ہے۔“ فتح خان نے
کہا۔ ”اب تم کیا کرے گا؟“

میں نے شانے اچکائے۔ ”کچھ نہیں، میں بے بس
ہوں جو کرنا ہے تم نے کرنا ہے۔“

”تم نے تھیک جگہ ہاتھ ڈالا؟“ فتح خان نے سوال
کیا۔

”نہیں اس میں صرف گھونسل ہے۔“ میں نے
کہا۔ ”اب وہ بھی نہیں ہے میرا خیال ہے یہ اسی الو کا گھونسل
تھا جسے تم نے مار دیا۔ باقی تم خود دیکھ لو۔“

”جلال دیکھو۔“ فتح خان نے اپنے آدمی کو حکم دیا۔ وہ
آگے آیا اور اس نے سوراخ میں ہاتھ مارا۔ الو خود سے

گھونسلے نہیں بناتے ہیں بلکہ کسی درخت کے سوراخ میں بسیرا
کرتے ہیں یا کسی اور پرندے کے سنے بنائے گھونسلے پر

قبضہ کر لیتے ہیں۔ سوراخ میں الو نے گھونسلے کو آرام دہ
بنانے کے لیے خاصا کچرہ جمع کیا ہوا تھا اور اس میں انڈے

دیتے تھے۔ جلال نے وہ انڈے بیدردی سے باہر پھینک
دینے ویسے بھی اب انہیں خراب ہی ہونا تھا کیونکہ مادہ الو مر

چکی تھی۔ ایک بار روشنی گھومی تو میں نے اس کے بکھر جانے
والے جسم اور پروں کی باقیات دیکھی تھیں برسٹ نے اس

کے چھتھرے اڑا دیئے تھے۔ انڈوں کے بعد جلال نے
گھونسلے کا بقیہ حصہ بھی نکال دیا اور اندر اچھی طرح ہاتھ

برٹ شانے پھپھائے تھے۔ میری معلومات بس اسی حد تک ہیں۔“

”شہباز خان۔“ فتح خان کی آواز شک سے لبریز تھی۔ ”تم جھوٹ تو نہیں بول رہا ہے۔“

”تم میرے الفاظ مت سنو میرا عمل دیکھو۔“ میں نے کہا۔ ”میں بلاوجہ تو تنے ٹٹولتا نہیں پھروں گا؟“

”ہو سکتا ہے تم کو میری موجودگی کا شک ہو اور تم مجھے دھوکا دینے کے لیے ایسا کر رہا ہو۔“

”فتح خان شک کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔ بہر حال میں ایک بار پھر تمہارے قبضے میں ہوں اور تم اپنی من مانی کرنے کے لیے آزاد ہو۔“

فتح خان خاموش ہو گیا اور ہم تنے دیکھتے رہے۔ جلال خود دیکھ رہا تھا مگر میرے ساتھ فتح خان لگا ہوا تھا، جب میں کسی تنے کو چیک کرتا تو وہ بھی دیکھتا تھا۔ ظاہر ہے اسے مجھ پر اعتماد نہیں تھا۔ اس لیے میرے سر پر موجود تھا۔ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”تمہیں کیسے پتا چلا کہ میں راجا عمر دراز کے پاس جا رہا ہوں۔“

”بس پتا چل گیا۔“ اس نے عیاری سے کہا۔ ”تم کیا سمجھتا ہے کہ فتح خان کی نظروں سے بچ جائے گا۔“

”اس کا مطلب ہے کہ یہ اتفاق ہے۔“ میں نے جوابی عیاری کا مظاہرہ کیا۔ ورنہ مجھے یقین تھا کہ فتح خان ہمارے ٹھکانوں سے واقف ہو گیا تھا۔ کم سے کم فیض آباد والی کوٹھی سب کی نظروں میں تھی اور عین ممکن ہے کہ فتح خان بھی اس جگہ سے واقف ہو۔ ایک یہی وجہ ہو سکتی تھی۔ اس لحاظ سے ہم سب کا اس جگہ سے نکل جانا بہتر تھا میں امید کر سکتا تھا کہ ہمارے نئے ٹھکانے سے دشمن ناواقف ہوں گے۔ میں نے موضوع بدل دیا۔ ”فاضلی کا انجام تم جان گئے ہو گے؟“

”ہاں۔“ اس نے بے بردائی سے کہا۔ ”پہلے ڈیوڈ شانے نے مجھے قربانی کا بکرا بنانے کا کوشش کیا مگر میں نے انکار کیا تو اس نے فاضلی کو پکڑ لیا۔“

”فتح خان جو کام وہ فاضلی سے لے سکتا تھا وہ تم سے نہیں لے سکتا تھا۔“

”کیوں نہیں لے سکتا۔ میں فاضلی سے زیادہ مرشد کو جانتا ہے۔ اس کی ساری خوبی خای کا مجھ کو پتا ہے۔ پر مجھے معلوم تھا کہ ڈیوڈ شانے آگے کیا کرے گا؟“

”تم کو کیسے معلوم ہوا؟“

”دیکھ شہباز خان! سیدھا سا بات ہے۔ فاضلی اور

مجھ جیسا بندہ ہزار ملتا ہے۔ پر تم اور مرشد خان ہر کوئی نہیں ہوتا ہے۔ ڈیوڈ شانے اس گورا کی اولاد ہے جو یہاں سو سال حکومت کر کے گیا اور اسے مرشد جیسے لوگوں کا قدر خوب ہے۔“

”مجھ میں اور مرشد میں فرق ہے۔“

”ہاں وہ بہت برا ہے اور تم بہت اچھا ہے۔“ فتح خان کا لہجہ طنز یہ ہو گیا۔

”نہیں میری مراد کلاس سے ہے۔ مرشد الگ کلاس کا آدمی ہے یہ کلاس آزادی کے بعد بھی انگریزوں کی غلام رہی ہے لیکن میری کلاس متوسط طبقے کی ہے۔“

”ہاں پر انگریز میں یہ خوبی بھی ہے کہ وہ آدمی کی صلاحیت کی قدر کرتا ہے۔ اسے استعمال کرتا ہے۔“

میں ہنسا۔ ”تم بھی انگریزوں سے بہت متاثر لگ رہے ہو۔“

”سچ ہے۔“ وہ بولا۔ ”شہباز خان ذرا تیز کام کرو۔“

”اب تمہیں کس بات کی جلدی ہے؟“

”جلدی ہے۔“ وہ بولا۔ ”جتنا دیر ہوگا تمہاری طرف سے اتنا ہی خطرہ بڑھتا جائے گا۔“

دو گھنٹے میں ہم نے شمالی ڈھلان کے درمیان میں سارے ہی تنے دیکھ لیے تھے اور کہیں بھی کسی تنے میں سوراخ نہیں ملا تھا۔ صبح کی روشنی نمودار ہو رہی تھی اور میں تھکن محسوس کر رہا تھا۔ میں نے فتح خان سے کہا۔ ”اب ہمت نہیں ہے کچھ دیر آرام کرنے دو۔“

”ٹھیک ہے۔“ فتح خان مان گیا مگر کیسے اس نے جلال کو حکم دیا۔ ”اس کا ہاتھ پاؤں باندھ دو۔“

جلال نے اپنے پاس سے جدید قسم کی ہلکی فولاد اور فائبر کی ہوئی ہتھکڑی اور بیڑی برآمد کیں۔ اس نے میرے ہاتھوں میں بیڑوں کو ان سے جکڑ دیا۔ ایسا لگ رہا تھا فتح خان میرے حوالے سے پوری تیاری کر کے آیا تھا۔ مسلسل حرکت میں رہے تھے تو خشکی کا احساس نہیں تھا مگر بیٹھے تو سردی لگنے لگی۔ اس کا علاج انہوں نے آگ جلا کر کیا۔ ویسے بھی اب انہیں کسی کے دیکھ لینے کا خطرہ نہیں تھا۔ میں ایک درخت کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا اور پھر سو بھی گیا۔ آگ کی حرارت سے خشکی کا احساس ختم ہو گیا تھا پھر میری آنکھ چائے کی خوشبو سے کھلی۔ جلال راگہ ہو جانے والے انکاروں پر چھوٹی سی کیتلی میں چائے بنا رہا تھا۔ فتح خان نزدیک ہی خزانے لے رہا تھا۔ اسے دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ ہوٹل والے لڑکے نے اس کے ساتھ کسی خوب صورت عورت کا ذکر کیا تھا اور وہ اس کھر درے اور برہنہ قسم کے

مرد کو لے آیا تھا۔ وہ عورت کہاں تھی؟ شاید فتح خان اسے کہیں چھوڑ آیا تھا۔

روشنی اونے پر میں نے جلال کو ٹھیک سے دیکھا۔ اس کی عمر پچیس سے زیادہ نہیں تھی مگر جسامت اور چہرے کے نقوش ایسے تھے کہ اسے چالیس کا بھی تسلیم کیا جا سکتا تھا۔ اس نے سیاہ بلیشیا کا شلوار سوٹ پہن رکھا تھا اور اوپر گرم چادر تھی۔ کیونکہ اب خشکی نہیں رہی تھی اس لیے چادر تہہ ہو کر ایک شانے پر آگئی تھی۔ اس نے بغلی ہولسٹر پہن رکھا تھا جس میں پستول تھا۔ وہ انگاروں کو کریدتے ہوئے پشتوں میں کچھ گنگنارہا تھا۔ میں سیدھا ہو کر بیٹھا تو وہ چونک گیا۔ میں نے نارمل لہجے میں کہا۔ ”چائے ملے گی؟“

”کیوں نہیں ملے گی۔“ اس نے کہا اور اپنے تھیلے سے فابریکا بنا ہوا غیر ملکی مگ نکالا۔ یہ بہت اعلیٰ درجے کا تھا اور یقیناً اسمگل ہو کر آیا تھا۔ شمالی علاقے میں پچاس فیصد اشیائے ضرورت اور سو فیصد اشیائے تفریح اسمگل ہو کر آتی ہیں۔ اس نے گرم چائے مگ میں ڈال کر مجھے دی۔ مگر ساتھ ہی وہ پوری طرح ہوشیار بھی تھا اس نے دور رہ کر مگ مجھے تھمایا اور پھر جلدی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اسے بجا طور پر خدشہ تھا کہ کہیں میں گرم چائے اس پر پھینک کر اسے قابو کرنے کی کوشش نہ کروں؟ سچی بات ہے میرے ذہن میں خیال آیا تھا کیونکہ فتح خان سوراہا تھا اور میں ہاتھ پاؤں بندھے ہونے کے باوجود کوشش کر سکتا تھا مگر جلال کی احتیاط نے میرے خیال کو خیال ہی رہنے دیا میں اسے حقیقت میں نہ بدل سکا۔ بہر حال قیدی ہونے کے باوجود گرم چائے مل گئی جس کی اس وقت شدت سے طلب ہو رہی تھی۔ میں نے اسے گھونٹ گھونٹ کر کے پیا اور بہت لطف اٹھایا۔ یہی چائے گھر میں ناشتے کی میز پر ایک بھر پور اور پُر لطف ناشتے کے بعد وہ مزہ ہرگز نہیں دیتی جو اس نے اس وقت دیا تھا۔ کچھ دیر بعد فتح خان بھی ایک انگڑائی کے ساتھ اٹھ گیا اس نے میری طرف دیکھا۔

”تم زندہ ہے شہباز خان اس کا مطلب ہے تم نے مرنے کی کوشش نہیں کی؟“

”میں نے کبھی مرنے کی کوشش نہیں کی ہمیشہ زندہ رہنے کی کوشش کی ہے۔“

”شاید اسی لیے تم زندہ ہے۔“ فتح خان بولا اور اس نے اٹھ کر اپنے لیے چائے نکالی۔ ”تم میں اور مجھ میں یہ بات ایک جیسا ہے۔ میں بھی زندہ رہنے کی کوشش کرتا ہے۔“

”لیکن تم مٹھی بھر بے جان ہیروں کی خاطر بے شمار بار مرنے کے قریب پہنچ گئے تھے۔“

”میں نے دنیا میں دو ہی چیزوں سے پیار کیا ہے۔ ایک اب دنیا میں نہیں ہے اور دوسرا یہ ہیرا ہے۔“ میں سمجھ رہا تھا وہ شینا کی بات کر رہا ہے جسے اس نے خود اپنے ہاتھوں سے مار دیا تھا اور اس کی ٹوپی میرے سر رکھنے کی کوشش کی تھی۔ فتح خان نے میری طرف دیکھا۔ ”دیے تو تم بھی بہت بار موت کے منہ میں جا کر واپس آئے۔“

”ہاں لیکن اپنے کسی مفاد کی خاطر نہیں، ہاں اپنے کسی پیارے کی خاطر یا دشمنوں نے مجبور کیا ہو تو ایسا ہوا ہے۔“

جلال نے چائے کے بعد اپنے تھیلے سے روغنی نان نکالے اور ایک ایک سب میں تقسیم کیا۔ ہم نے چائے کے ساتھ یہ نان کھائے اور ناشتا مکمل کیا۔ بج جانے والی چائے انصاف سے ایک بار پھر ہم تینوں میں تقسیم ہوئی اور فتح خان نے مجھ سے کہا۔ ”برٹ شانے تم کو بتایا کہ ہیرا ادھر ہی کہیں ہے؟“

”میں نے بتایا کہ اس نے مجھے دو اشارے دیئے تھے اور یہ بھی اس کی مجبوری تھی ان درختوں پر نمبر تو لکھے نہیں ہیں کہ وہ کہتا فلاں نمبر کے درخت میں چھپائے ہیں۔ پھر درختوں کی کوئی واضح نشانی بھی نہیں ہے اس لیے اس نے شمالی ڈھلان کے سب سے بڑے تنے والے درخت میں ہیرے چھپا دیئے۔ مرتے ہوئے اس نے مجھے یہی نشانیاں بتائیں۔ میں اسی لحاظ سے تلاش کر رہا تھا کہ تم نے غلط وقت پر انٹری دی۔“

”ہم سمجھا تم نے ہیرا تلاش کر لیا ہے۔“ فتح خان نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ ”جلال اسے کھول دو ہم اب ہیرا تلاش کرے گا۔“

”تمہیں یاد ہے ہم رات کون سا حصہ دیکھ چکے تھے؟“

”یاد ہے پر اب دن میں سب شروع سے دیکھے گا۔“ فتح خان نے کہا۔ ”اب ہم طریقے سے تلاش کرے گا۔ جو درخت ایک بار چیک کر لے گا اس پر نشان لگا دے گا۔“

”لیکن اس میں بہت وقت لگے گا۔“

”بے شک لگے، تمہارا کون سا فلائٹ چھوٹ رہا ہے۔“ اس نے چالاکی سے کہا۔ ”ہم بھی فارغ ہے تو کیوں نا وقت کا اچھا استعمال کیا جائے۔“

میں نے اس کی وقت کے لیے قدر شناسی کی دل ہی

ہونے والی معلومات روانی سے بیان کیں۔ فتح خان تشویش زدہ نظر آنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ مجھ سے پوچھنے کا فائدہ نہیں ہے میں اسے سچ نہیں بتاؤں گا۔ مگر اسے خیال ضرور ہو گا کہ میرا کوئی ساتھی اس کے پیچھے تھا اور اسی نے مجھے یہ ساری معلومات فراہم کی ہوں گی۔ میں معنی خیز انداز میں مسکرا رہا تھا اور فتح خان کے خدشات کو تقویت دے رہا تھا کہ اسی میں میری بہتری تھی۔ اب تک فتح خان مجھ پر عمل جاوی تھا۔ مگر اس کی تشویش سے اس کی گرفت کمزور پڑ گئی تھی۔ میں نے پوچھا۔

”دیے خاتون ہے کون؟“

”تم کو میرا کزن یاد ہے تمہارا ہم نام تھا اور مرشد کے چکر میں مارا گیا تھا؟“

”بالکل یاد ہے غالباً اسی کی وجہ سے شہباز خان کا لفظ تمہارے منہ پر چڑھا ہے۔“

”گل شادا اسی کا بیوہ ہے۔“

”تم نے کزن کی بیوہ کو اپنی رکھیل بنا لیا؟“ میں نے ملاحت سے کہا۔

”نہیں وہ اب میرا بیوی ہے۔“ فتح خان نے اس لہجے میں کہا کہ اس رشتے کی حیثیت خود ہی واضح ہو گئی تھی۔

”تم اسے کہاں چھوڑ کر آئے ہو؟“

”فتح خان کے پاس یہاں ٹھکانوں کی کمی نہیں ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ ”اسے ایک جگہ چھوڑا ہے۔“

”وہ تم سے ڈرتی ہے جب میں نے تمہارے نمبر پر کال کی اور اس نے ریسیو کی تو پہلے تو فتح خان کو پہچاننے سے انکار کر دیا پھر بولی کہ تم سو رہے ہو اور اٹھایا تو مارو گے۔“

فتح خان مسکرایا۔ ”وہ سمجھدار عورت ہے ورنہ اس کے جسم پر میری چوٹ کا نشان رہتا۔ پر وہ پہلا عورت ہے جس پر اب تک میرا ہاتھ نہیں اٹھا ورنہ شہلانے بھی مجھ سے مار کھایا تھا۔“

”تم نے اس کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔“

”یہ بالکل ٹھیک کیا وہ اسی کا سحق تھا۔ کیا تم نہیں جانتا کہ وہ کس قسم کا عورت تھا۔“

”عورت صرف عورت ہوتی اسے قسموں میں ہم مرد بانٹتے ہیں۔“ میں نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔ ”تمہارے نزدیک عورت صرف جسم کا نام ہے۔“

”تم ٹھیک سمجھا۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”فتح خان نے صرف ایک عورت کو عورت سمجھا اس کے بعد یہ میرے لیے

دل میں دادوی۔ جلال نے میرے پاؤں اور پھر ہاتھ کھول دیئے۔ فتح خان نے یہ ظاہر بے پروائی سے لیکن درحقیقت پوری چوکھی کے ساتھ پستول نکال لیا تھا۔ وہ مجھ پر ذرا بھی اعتبار کرنے کو تیار نہیں تھا۔ شمالی ڈھلان کوئی پون کلو میٹر لمبی اور اوپر سے نیچے تک کوئی نصف کلو میٹر چوڑی تھی اور اس میں بلاشبہ ہزاروں کی تعداد میں بلند و بالا درخت تھے۔ ان سب کو نئے سرے سے دیکھنے میں کئی دن کا وقت لگ سکتا تھا۔ مگر فیصلہ میرے ہاتھ میں نہیں تھا۔ فتح خان نے پوری ڈھلان کا چھان بین کا فیصلہ کیا تھا اس لیے ہم نے ایک سرے سے شروع کیا۔ جلال نیچے واوی سے ایک سفید چوٹے جیسا پتھر لے آیا تھا اسے کسی چیز پر رکھا جاتا تو یہ سفید نشان چھوڑتا تھا اس سے نشان لگانے کا کام لیا جانے لگا۔ احتیاط کے طور پر فتح خان نے ایک وقت میں ایک درخت دیکھنے کی پالیسی اپنائی۔ ہم تینوں مل کر درخت دیکھتے تھے اور پھر فتح خان اس پر سفید پتھر سے نشان لگاتا۔

سورج چڑھنے کے ساتھ ہی تنگی غائب ہو گئی اور اس کی جگہ الٹی سی گرمی کا احساس ہونے لگا خاص طور سے جہاں دھوپ ہوتی تھی وہاں چند سیکنڈ میں وماغ گرم ہونے لگتا تھا اس لیے ہم سائے میں رہنے کی کوشش کر رہے تھے۔ موسم گرم ہونے کے ساتھ خشک بھی ہو رہا تھا اس لیے بار بار پیاس لگ رہی تھی اور دوپہر تک ہم پانی کا ذخیرہ تقریباً ختم کر چکے تھے اس لیے فتح خان نے آرام کے وقفے کا اعلان کیا اور جلال کو پانی لینے نالے کی طرف روانہ کر دیا۔ اب تک ہم کوئی دو سو درخت دیکھ چکے تھے اور یہ کل درختوں کا دس فیصد بھی نہیں بنتے تھے۔ جلال کے جانے کے بعد میں نے فتح خان سے کہا۔ ”اس عورت کو کہاں چھوڑا ہے جسے تم ساتھ لائے تھے؟“

وہ چونکا۔ ”تم کو کیسے پتا؟“

میں مسکرایا۔ ”میرے بھی ذرائع ہیں۔ اگر تم مجھ پر نظر رکھ سکتے ہو تو کیا میں تم پر نظر نہیں رکھ سکتا؟“

وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا۔ ”شہباز خان تم بلف کر رہا ہے۔ تم نے فون پر عورت کا آواز سنا اور اب مجھے بے وقوف بنا رہا ہے۔“

”آواز سے یہ تو معلوم نہیں ہوتا کہ بولنے والی کے بال گولڈن براؤن ہیں۔ قد تقریباً پانچ فٹ چار انچ اور وزن ساٹھ کلو گرام کے آس پاس ہے مگر اضافی وزن موزوں جگہوں پر ہے۔ اس نے نیلا شلوار سوٹ اور اس پر ہلکا نیلا دوپٹا لیا ہوا تھا۔“ میں نے ہونٹ والے لڑکے سے حاصل

نہیں ملا تو فتح خان چونکا نظر آنے لگا اس نے غرا کر مجھ سے کہا۔ ”کھڑے ہو۔“

”تالے کی طرف چلو۔“ فتح خان نے اشارہ کیا۔ ”میں تمہارے سین پیچھے ہوگا اور گولی مارنے میں ایک سیکنڈ کا دیر نہیں کرے گا۔“

”میرا قصور؟“

”ابھی تو نہیں ہے پر اگر جلال تیرا وجہ سے غائب ہوا تو پھر خیر نہیں ہوگا۔“ فتح خان نے واضح کیا۔ ”اب چلو۔“

میں ڈھلان کے ساتھ ساتھ تالے کی طرف بڑھا۔ دوپہر کے بارہ بج رہے تھے اور اس بیگار میں ناشتا کب کا ہضم ہو چکا تھا۔ میں نے فتح خان سے کہا۔ ”بچ کے بارے میں کیا خیال ہے۔“

”کلاشن کا گولی ملے گا۔“ اس نے رائفل کی ٹال گھمائی۔ ”کھائے گا؟“

”اگر تم بھی کھاؤ گے تو میں بھی کھا لوں گا۔“ میں نے گفتگو سے کہا مگر اندر سے میں فکر مند تھا۔ جلال کا غائب ہونا نیک شگون نہیں تھا۔ میں جانتا تھا میرے ساتھی تھیں بے خبر تھے کہ میں اس وقت کہاں ہوں مگر ہو سکتا ہے کہ کوئی اور پارٹی بھی ہو اور فتح خان سمجھے کہ میرے ساتھیوں نے کچھ کیا ہے۔ راستے میں فتح خان نے دو بار اور پرندے کی آواز والی سیٹی بجائی اور حسب سابق جواب نہیں آیا۔ ہم تالے کے پاس پہنچے۔ اس بار فتح خان نے عقل مندی سے کام لیا اس نے مجھے آگے رکھا مگر خود آڑ میں ہو گیا تھا۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”تالے میں دیکھو، پر بھاگنے کا مت سوچنا۔“

”میں سوچوں گا نہیں اگر موقع ملا تو عمل کروں گا۔“ میں نے کہا اور تالے میں اتر گیا۔ میں بھی محتاط تھا اور آواز پیدا کرنے سے گریز کر رہا تھا۔ وہاں اگر کوئی تھا تو ہماری آوازوں سے ہوشیار ہو جاتا۔ فتح خان سمجھ رہا تھا کہ وہاں میرے ساتھی ہو سکتے تھے اس لیے اس نے مجھے ڈھال اور برغمال کے طور پر آگے کیا تھا مگر میں جانتا تھا وہاں میرے کسی ساتھی کی موجودگی کا کوئی امکان نہیں تھا اگر وہاں کوئی تھا تو اس کے لیے میں اور فتح خان برابر ہوتے اور مجھے اس سے بھی خطرہ ہوتا۔ میرے لیے زیادہ بڑا خطرہ فتح خان تھا جو رائفل بدست میرے پیچھے موجود تھا اور کسی بھی گزبڑ کے موقع پر وہ دوسروں کے ساتھ مجھے بھی ٹھکانے لگانے کی پوری کوشش کرتا۔ اس سے پہلے ہیروں کے جائے وقوع کے بارے میں معلومات صرف میرے پاس تھیں لیکن اب یہ

بس جسم رہ گیا۔“

”غالباً گل شاد کا شتر بھی بھاگ بھری والا ہوگا۔“

”نہیں میرے ساتھ رہے گا بچہ بچہ پیدا کرے گا۔“

مجھے بھی تو اگلی نسل کا ضرورت ہے۔“

میرے خیال میں تو اسے خاصی تاخیر ہو گئی تھی کیونکہ وہ بچاس سے اوپر کا تھا اور اگر اس عمر میں اس کا بچہ ہوتا تو وہ امکان تھا کہ وہ اسے جوان دیکھے بغیر ہی دنیا سے رخصت ہو جائے۔ شراب کباب سے بے اعتدال شغل نے اسے نقصان پہنچایا تھا مگر اسے اصل خطرہ اپنے لاتعداد دشمنوں سے تھا جن میں سے ہر ایک اسے دنیا سے رخصت کرنا چاہتا ہوگا۔ اپنی نام نہاد بیوی کو بیوہ اور بچوں کو یتیم چھوڑ جاتا۔ شاید وہ اس معاملے میں تقدیر پر بھروسہ کرتا تھا کہ جیسے وہ پل گیا اس طرف اس کے بچے بھی پل جائیں گے۔ فتح خان نے کچھ دیر بعد سوال کیا۔ ”تم راجا کے پاس کیوں جا رہا تھا؟“

”وہ بیمار ہے، اس کی مزاج پر سی..... میرا مطلب ہے طبیعت کا معلوم کرنے جا رہا تھا۔“

”وہ ضدی آدمی ہے اس حال میں بھی تم کو ساتھ لے جانے کا بات کرے گا۔“

”ہو سکتا ہے۔“

”اگر اس نے کہا تو تم اس کے ساتھ چلا جائے گا؟“

”ہو سکتا ہے، کیونکہ میں احسان فراموش نہیں ہوں۔“

راجا عمر دراز کے مجھ پر خاصے احسانات ہیں۔“

”وہ اچھا آدمی ہے لیکن میرا جانی دشمن ہے میں اس کے ہاتھ آیا تو وہ مجھے مراد دے گا۔“

”اس کی نظر میں تمہاری کوئی اہمیت نہیں ہے جو وہ خاص طور سے تمہیں تلاش کرانے، ہاں تم خود اس کے ہاتھ آگئے تو تمہارا بچنا مشکل ہوگا۔“

گفتگو کے دوران میں ہمیں خیال نہیں رہا۔ اچانک فتح خان چونکا۔ ”یہ جلال اب تک واپس نہیں آیا؟“

”ہو سکتا ہے، اسے پانی ملنے میں دیر ہوئی ہو۔ اوپر کی طرف تالا تقریباً ختم ہو گیا ہے۔“

”پھر بھی اتنا دیر۔“ فتح خان نے کہا اور اپنے لباس سے ایک سیٹی نکال کر بجائی تو کسی پرندے جیسی آواز نکلی تھی۔ کچھ دیر آواز پہاڑوں میں گونجتی رہی پھر ختم ہو گئی۔ چند لمحوں کے وقفے سے فتح خان نے پھر سیٹی بجائی اور ساتھ ہی جلال خان کو ایک قب سے نوازہ جس میں اس کی والدہ کو ایک ناپاک جانور سے غلط ملط کیا تھا۔ دوسری بار بھی جواب

معلومات فتح خان تک پہنچ گئی تھیں اور میں اس کے لیے پہلے جیسا ناگزیر نہیں رہا تھا۔ نالا یہاں تقریباً بیس پچیس گز تک بالکل سیدھا تھا اور اس کے دونوں طرف گھاس اور جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔

جہاں تک نظر جاتی تھی کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ نالے کے بالکل وسط میں پٹی سی لکیر کی صورت میں پانی بہہ رہا تھا۔ میں نے جھک کر ہاتھوں کے پیلے لے سے پانی پیا اور آگے بڑھا۔ اچانک مجھے ذرا آگے پانی میں کوئی سیاہ سی چیز دکھائی دی۔ میں نے جھک کر اسے اٹھایا۔ یہ سیاہ رنگ کا تعویذ تھا جو سیاہ تین رنگ کی ٹوٹی ڈوری کے ساتھ تھا۔ یہ تعویذ یہاں گرا ہوا تھا۔ مجھے یاد آیا جلال کے گلے میں ایسا ہی سیاہ رنگ کا تعویذ تھا۔ یہ وحالت کا تھا اور ڈوری سے لگ رہا تھا کہ اسے قوت سے کھینچا گیا تھا جس کی وجہ سے یہ ٹوٹ گئی۔ میں نے مز کر فتح خان کو تعویذ دکھایا تو اس نے مجھے واپس آنے کا اشارہ کیا۔ میں واپس آ گیا۔ اب تک کسی طرف سے نہ تو مداخلت ہوئی تھی اور نہ ہی کسی کی موجودگی کے آثار دکھائی دیے تھے۔ فتح خان نے تریب آنے پر آہستہ سے کہا: ”شہباز یہاں تمہارا آدمی ہے۔“

”میرا کوئی آدمی اگر یہاں ہے تو میں اس سے بے خبر ہوں۔ ویسے لگ رہا ہے جلال کی حادثے کا شکار ہوا ہے۔“

”یہ تعویذ اسی کا ہے۔“ فتح خان نے تعویذ اپنی جیب میں رکھ لیا۔ ”ادھر سے چلو یہاں خطرہ ہے۔“

”فتح خان تمہارا خیال ہے کہ یہاں میرے آدمی ہیں جب کہ میرا خیال مختلف ہے۔“

”تمہارا کیا خیال ہے؟“

”تم نے ان ہیروں کی بازیابی کے لیے جتنی کوششیں کیں ان سے یہ ہوا کہ یہاں ہیروں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ لوگ جانتے چلے گئے۔ کیا ان میں سے کوئی تمہارا پیچھا کرتا نہیں آسکتا؟“

”ہیروں کے بارے میں جتنے لوگوں نے جانا ان میں سے زیادہ تر اس دنیا میں نہیں رہے ہیں۔“

”لیکن کچھ نہ کچھ ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”فتح خان معاملہ بہت بڑی رقم کا ہے جب یہ ہیروے سالوں پہلے غائب ہوئے تو ان کی مالیت پچیس ملین ڈالر تھی۔ یہ مالیت یقیناً اب کہیں زیادہ ہو گئی ہوگی۔ ایک اور شخص بھی ہے جو ان ہیروں کا دعویدار ہو سکتا ہے لیکن اس نے نیرت اٹکیز طور پر آج تک ان کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔“

”ڈیوڈ شا۔“ فتح خان بولا۔ ”اسے ہیروں سے دل

چسپی نہیں ہے۔“

”ایسا مت کہو تقریباً ڈھائی ارب روپے مالیت کے ہیروں میں کوئی فرشتہ ہی دل چسپی لینے سے انکار کر سکتا ہے۔ ڈیوڈ شا فرشتہ نہیں ہے۔“

”تب تم کو بھی دل چسپی ہونی چاہیے۔ تم بھی فرشتہ نہیں ہے۔“ فتح خان کا لہجہ طنزیہ ہو گیا۔ ہم دونوں آگے پیچھے اسی ڈھلان پر اوپر کی سمت جا رہے تھے اور میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ اس طرف کیوں جا رہا تھا۔

”درست کہا۔“ میں نے تسلیم کیا۔ ”لیکن تم جانتے ہو میری جان دوسرے معاملات میں الجھی ہوئی ہے اور میں فی الحال کسی نئے چکر میں نہیں پھنس سکتا۔“

”تب تم یہاں کیوں آیا؟“

”میں بتا چکا ہوں میں ان ہیروں کی مدد سے تم پر دباؤ ڈالنا چاہتا تھا۔ ذاتی طور پر مجھے ان ہیروں سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔“

دس منٹ میں ہم خاصی بلندی پر آ گئے تھے۔ یہاں پہنچ کر فتح خان نے مجھے زمین پر اٹنے منہ لینے کا حکم دیا اور اپنے لباس سے ایک چھوٹی مگر طاقتور دوور بین نکال لی۔ اب میں سمجھا کہ وہ یہاں کیوں آیا تھا۔ اس جگہ سے وادی اور اس سے نکلنے والے نالے کا منظر بہتر طور پر دیکھا جا سکتا تھا۔ دوور بین سے نیچے دیکھنے کے دوران میں وہ مجھ پر ٹھیک سے نظر نہیں رکھ سکتا تھا اس لیے اس نے مجھے نیچے لینے اور دونوں ہاتھ گردن پر رکھنے کا حکم دیا۔ میں نیچے لیٹ گیا اور دونوں ہاتھ گردن پر رکھ لیے۔ فتح خان دوور بین سے نیچے کا جائزہ لینے لگا۔ میں نے فتح خان سے کہا: ”ممکن ہے انسی کوئی چیز آنے والوں کے پاس بھی ہو اور وہ تمہیں دیکھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔“

”چپ رہو۔“ اس نے غرا کر کہا۔

”جب دشمن چھپا ہو اور سامنے آنے سے گریز کر رہا ہو تو سمجھ لو وہ تمہارے اعصاب آزما رہا ہے اور اس صورت میں کسی قسم کی عجلت یا بے صبری نقصان کا باعث بن جاتی ہے۔“

”میں سمجھتا ہے۔“ وہ جھنجھلا گیا۔ ”تم چپ نہیں رہ سکتا۔“

”ٹھیک ہے میں چپ ہوں۔ بلکہ اجازت ہو تو ذرا سو جاؤں رات بھی بس برائے نام نیند آئی تھی۔“

”میرا طرف سے ہمیشہ کی نیند سو جاؤ۔“ فتح خان نے بھنا کر کہا۔

فردی 2015ء

اونچائی۔ دس سے پچاس فٹ تک تھی۔ یہ درمیان سے اونچی تھیں اور کناروں سے کم اونچی تھیں۔ مسلسل بارشوں اور موسموں کا شکار ہو کر یہ اب زیادہ تیزی سے شکست ورنج کا شکار ہو رہی تھیں اور شاید کچھ عرصے بعد ان کا وجود ہی مٹ جاتا۔ میں نے فتح خان سے پوچھا۔ ”تم نے کس طرف حرکت دیکھی تھی؟“

”دائیں طرف جو نو کیلی چٹان نظر آ رہا ہے اس کے پاس۔“

میں نے دور بین اس طرف مرکوز کی اور تلاش کرنے لگا۔ اس طرف سورج کی روشنی زیادہ تھی اور وہاں معمولی سی چیز بھی نمایاں ہو رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر یہ دشمن ہی تھا تو اس نے نہایت احمقانہ حرکت کی تھی۔ اس وقت یہاں رہنا جہنم میں رہنے کے مترادف تھا اور پھر یہاں بے پناہ روشنی کی وجہ سے نظروں میں آنے کا بہت زیادہ امکان تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ اتفاق ہے، دھوکا ہے یا پھر دشمن کی کوئی چال ہے۔ اچانک فتح خان نے مجھ سے دور بین واپس لے لی اور بولا۔ ”ادھر چلو۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن یہ عقل مندی نہیں ہوگی۔“

”اس وقت عقل کا بات مت کرو۔“ اس نے غرا کر کہا۔ ”اگر ادھر کوئی موجود ہے تو وہ کل کا سورج دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہے گا۔“

مجبوراً میں حرکت میں آیا اور ہم ڈھلان پر ایک دائرے میں گھومتے ہوئے نیچے اترنے لگے۔ پہلے اس جگہ پہنچے جہاں جلال والا تھیلا موجود تھا۔ نیچے آتے ہوئے فتح خان اور میں نے سیر ہو کر پانی پی لیا تھا۔ ہمارے پاس پانی رکھنے والی واحد چیز پلاسٹک ربڑ کی بوتل جلال لے گیا تھا اور وہ اسی کے ساتھ غائب تھی۔ جب ہم مغربی سمت پہنچے تو یہاں سے چٹانیں زیادہ دور نہیں تھیں۔ ان کی پیش یہاں تک آ رہی تھی۔ ان چٹانوں میں گرمی کا عالم سوچا جا سکتا تھا۔ مجھے کئی بار ان چٹانوں کی گرمی کا تجربہ ہو چکا تھا اور میرے خیال میں یہ نخلستان میں ایک چھوٹا سا صحرا تھا۔ یعنی اس نے محاورہ الٹا کر دیا تھا۔ فتح خان نے مجھے بے بس کرنے کے لیے ایک درخت کی شاخ سے جھکڑی لگا کر مجھے کہا۔ ”اسے اپنا ہاتھ میں پکھن لو۔“

انکار کا فائدہ نہیں تھا اس لیے میں نے خاموشی سے پکھن لیا۔ یہ شاخ کوئی بہت مضبوط نہیں تھی میں اسے توڑ سکتا تھا مگر اس میں کچھ وقت لگتا اور فتح خان یہی وقت چاہتا

”وہ میرے دشمن سوئیں۔“ میں نے کہا اور سچ سچ آنکھیں بن کر لیس مگر اس بوز میں سونا بہت مشکل تھا۔ ذرا سی دیر میں میری گردن دکھنے لگی تھی کیونکہ سارا زور اس پر آ رہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ تک فتح خان وادی کا معائنہ کرتا رہا۔ پھر اس نے مجھے اٹھنے کا حکم دیا۔

”شہباز خان۔“ اس نے مجھ پر نظر جما کر کہا۔ ”اگر یہ تمہارا آدمی ثابت ہوا تو میں تم کو فوراً شوٹ کر دے گا۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے کہا۔ ”اگر میرے آدمی میرے لیے کوشش کر رہے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور ہے مگر میں ایک بار پھر یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ میرے آدمی نہیں ہیں۔“

”تب بلال کہاں ہے؟“

”مجھے کیا معلوم؟“

”تم کو معلوم ہے اس کا تعویذ بھی تم نے ڈھونڈا ہے۔“

”فتح خان اب تم پٹھان بن رہے ہو۔“ میں نے ملائمت سے کہا۔ ”مجھے تم جیسے ذہین آدمی سے ایسی بات کی توقع نہیں تھی۔“

اس کا موڈ خراب ہو گیا۔ ”یہ اس وقت کون خانہ خراب آ گیا ہے۔ ٹانگ اڑانے۔“

فتح خان ایک بار پھر دور بین سے دیکھنے لگا اور چند منٹ بعد وہ چوکا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میں نے دیکھ لیا۔“

”کیا اور کہاں دیکھ لیا؟“

”ادھر چٹانوں میں کوئی ہے۔“ اس نے وادی کی وسطی کھنڈر نما چٹانوں کی طرف اشارہ کیا۔

”ممکن ہے کوئی جانور ہو۔“

”اس وقت وہاں جتنی گرمی ہوتی ہے کوئی جانور ادھر کا رخ نہیں کر سکتا۔ کیا تم کو پتا نہیں ہے۔“

وہ درست کہہ رہا تھا اچھے موسم میں بھی یہ چٹانیں دوپہر میں گرم ہو جاتی تھیں اور آج تو ویسے ہی خاصی گرمی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”کیا مجھے دور بین دو گے؟“

اس نے دور بین میری طرف بڑھا دی۔ میں نے آنکھوں سے لٹائی۔ دور بین سچ سچ خاصی طاقتور تھی کیونکہ تقریباً پون کلو میٹر دور چٹانیں جیسے آنکھوں کے سامنے آ گئی تھیں۔ تقریباً دائرے میں اور کوئی تین سو میٹر قطر میں پھیلی یہ چٹانیں کسی زلزلے کا شکار ہو کر ایسا روپ اختیار کر گئی تھیں اور دور سے دیکھنے پر کسی قدیم شہر کے کھنڈرات کا منظر پیش کرتی تھیں۔ یہاں لبوترے بولڈرز پر مشتمل چٹانوں کی

اسے چوکنا ہونے کے لیے کافی وقت ملا۔ البتہ کسی ہنگامی صورت حال میں، میں اسے چند سیکنڈ میں توڑ سکتا تھا۔ فتح خان نے اس کا خیال رکھا تھا کہ میں سامنے نہ ہوں اس لیے اس نے مجھے درخت کے تنے کی آڑ میں باندھا تھا۔ میں نے شاخ کو اس کی جڑ تک ٹولا اور بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ”فتح خان میرا مشورہ مانو تو یہاں سے نکلنے کی کرو۔ اس کا خطرہ بہت زیادہ ہے کہ دشمن تمہاری موجودگی سے واقف ہے اور وہ تمہیں شکار کرنے کے لیے ہانک رہا ہے۔ ایک بار تم اور میں اس کے ہاتھ آگے تو شاید ہیرے تمہارے ہاتھ نہ آئیں۔“

”وہ کیسے؟“

میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ”دیکھو میں اور تم ایک دوسرے کو جانتے ہیں اگر ہم نے ایک دوسرے کو مارنا ہوتا تو ایسے کتنے ہی مواقع آئے تھے جب ہم ایک دوسرے کو مار سکتے تھے مگر مصلحت نے ہمارے ہاتھ روک لیے۔ ہر کوئی ایسا نہیں سوچتا ہے۔ اگر اس نے غلٹ دکھائی تو شاید ہم دونوں ہی مارے جائیں۔“

فتح خان نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں ہیرے لیے بغیر نہیں جائے گا۔“

”فتح خان تم بچکانہ ضد کر رہے ہو اور اتنے بڑے خطرے کو نظر انداز کر رہے ہو۔ تم جلد فیصلہ کر لو میرے حساب سے اب زیادہ وقت نہیں رہا ہے سورج ڈوبتے ہی یہ لوگ حرکت میں آجائیں گے اور ہم ان کے قابو میں ہوں گے۔“

فتح خان نے مڑ کر میری طرف دیکھا اور مشکوک لہجے میں بولا۔ ”تم کیسے جانتا ہے۔“

”میرا اندازہ ہے اور تم جانتے ہو میرا اندازہ اکثر درست نکلتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ تمہارے پیچھے کون ہے مگر میں یقین سے کہتا ہوں کہ وہ جو کوئی بھی ہے اصل میں ہیروں کے چکر میں ہے۔ اس کی تم سے کوئی براہ راست دشمنی ہے بھی تو وہ ہیروں کی خاطر تمہیں چھوٹ دے رہا ہے۔ ہاں جب تم اس کے قابو میں آگے اور اسے ہیرے ملے یا نہ ملے دونوں صورتوں میں تمہارے ساتھ اچھا نہیں ہوگا۔“

”تمہارے ساتھ بھی اچھا نہیں ہوگا۔“

”ہاں میں گیہوں کے ساتھ گھن کی طرح پسوں گا۔“

میں نے شخصہ سانس لی۔ ”حالانکہ گھن اصل میں تم ہو جو مجھے لگ گئے ہو۔“

فتح خان نے دور میں گلے میں لٹکالی اور ذرا پیچھے ہو کر

تھا۔ اس نے پھر دور میں سنبھال لی۔ یہ جگہ چٹانوں سے کوئی دوسو فٹ اونچائی پر تھی۔ فتح خان ایک چٹان پر اوندھے منہ لیٹ کر دور میں آنکھوں سے لگائے ہوئے تھا اور اسے آہستہ حرکت دے رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ چٹانوں کے درمیان کسی کو تلاش کر رہا ہو۔ اب دو بج رہے تھے اور پیٹ میں باقاعدہ چوہے دوڑنے لگے تھے۔ میں اپنے ساتھ جو زور اہ لایا تھا وہ بھی ان لوگوں کے قبضے میں جا چکا تھا۔ میرا اسلحہ ان کے پاس نہیں تھا اس کا مطلب تھا وہ انہوں نے کہیں چھپا دیا تھا۔ ورنہ شاٹ گن چھپانا مشکل کام تھا۔ پستول شاید فتح خان یا جلال کے پاس ہوتا۔ میں نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”فتح خان فرض کرو ہلال کسی کے ہتھے چڑھ گیا ہے تو کیا اس نے ہمارے بارے میں زبان بند رکھی ہوگی۔“

”جلال پکا آدمی ہے وہ کبھی زبان نہیں کھولے گا۔“

”فرض کرو جن لوگوں نے جلال کو قابو کیا وہ ہمارے

بارے میں پہلے ہی جانتے ہوں گے۔“

”تب وہ ہمارے پیچھے کیوں نہیں آیا؟“

”ممکن ہے وہ صرف نگرانی کر رہے ہوں کہ کب ہم

ہیرے حاصل کرتے ہیں اور جلال کسی غلطی سے ان کے

سامنے آگیا ہو۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ جلال کو کسی غلطی کی وجہ سے

پکڑا ہے۔“

”ہاں، ان کا ارادہ ہوتا تو جلال کے بعد ہمیں قابو کرنا

کون سا مشکل کام تھا وہ کہیں بھی آرام سے ہمیں ہینڈز اپ

کرالیتے۔ تم خود بتاؤ کیا دو تین چھپے سلیخ افراد کا مقابلہ کر سکتے

ہو۔“

”نہیں۔“ اس نے اقرار کیا۔ مگر اس نے اپنے انداز

میں تبدیلی نہیں کی اور بدستور چٹانوں کی طرف دیکھتا رہا۔

”اگر کوئی اس طرف موجود ہے تو یقین کر لو یہ ٹریپ

ہے۔“

”پیپ کرو میں بھی عقل رکھتا ہے۔“ وہ جھنجلا

گیا۔ ”سارا عقل تمہارے پاس نہیں ہے۔“

”یہ تو ہے مگر میں اس کا استعمال ذرا فراغ دلی سے

کرتا ہوں۔ تم جانتے ہو استعمال کرنے سے عقل کم

نہیں ہوتی ہے۔“

اس گفتگو کے دوران میں، میں شاخ کی مضبوطی بھی

آزمایا تھا کہ اگر میں اسے توڑنا چاہوں تو یہ کام اتنی دیر میں

ہو جائے گا مگر یہ مضبوط سبز شاخ تھی اسے توڑنا آسان نہیں

تھا کم سے کم فتح خان پر قابو پانے کے لیے توڑنا ممکن نہیں تھا۔

تھا۔ سورج اب مغرب کی طرف ڈھل رہا تھا اور تین بجے چکے تھے مگر تپش اور دھوپ کی تیزی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ البتہ درختوں کے نیچے گرمی کا احساس کم ہو گیا تھا۔ بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ شمالی علاقے میں اونچے پہاڑوں اور وادیوں میں گرمی نہیں پڑتی ہے۔ حالانکہ یہاں بھی گرمی پڑتی ہے اور اچھی خاصی پڑتی ہے جہاں جہاں چٹانیں وہاں تو گرمی صحرا کی مانند ہو جاتی ہے اور ایسا بھی ہوا کہ چٹانوں میں جانے والا کوئی ٹریکر یا سیاح ڈی ہائیڈریشن سے ہلاک ہو گیا۔ اس وادی کی کھنڈر نما چٹانیں اس کا جیتا جاگتا ثبوت تھیں کہ تقریباً چھ سات ہزار فٹ کی بلندی پر بھی اذیت ناک گرمی ہو سکتی ہے۔

میری نظر چٹانوں پر مرکوز تھیں۔ اگرچہ یہاں سے چٹانوں کے سارے حصے نظر نہیں آ رہے تھے مگر اس کا وسطی حصہ اور ہماری طرف والا حصہ واضح دکھائی دے رہا تھا اور اب تک مجھے اس حصے میں کوئی حرکت نظر نہیں آئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ فتح خان کو کوئی غلط فہمی ہوئی تھی یا اسے یہاں تک گائیڈ کیا گیا تھا مگر اس وقت وہاں کسی کا موجود ہونا بہت مشکل تھا۔ مجھے یاد ہے ہم جان بچانے کے لیے وہاں رہے تھے اور یہ وقت بڑی مشکل سے گزرا تھا۔ پانچ چھ کے بعد یہ چٹانیں اتنی ٹھنڈی ہوتی تھیں کہ ان میں رہا جاسکے۔ اچانک مجھے لگا کہ کوئی سیاہ سی چیز چٹانوں کے درمیان تیزی سے حرکت کر رہی ہو۔ مگر یہ جھلک ایک لمحے کے لیے تھی جو دو چٹانوں کے درمیان نظر آئی تھی اور شاید سیکنڈ کے تیسرے حصے کے لیے تھی۔ مگر میری نظروں نے صاف دیکھا تھا۔ مگر یہ واضح نہیں تھا کہ گزرنے والی چیز کوئی انسان تھا یا کوئی جانور، وہ بہت نیچے سے گزرا تھا تقریباً کتے جتنی بلندی تھی۔ اگر کوئی انسان جھک کر بھاگتا تو وہ بھی اسی طرح دکھائی دیتا۔ میں غور کر رہا تھا کہ فتح خان نے دیکھ لیا اس نے پوچھا۔ ”کیا نظر آیا ہے؟“

”جو تمہیں دکھائی دیا تھا۔“ میں نے کہا اور چٹان کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس جگہ وہ جو درمیان میں چھوٹا سا گپ نظر آ رہا ہے۔ اس سے کوئی سیاہ چیز گزری ہے۔“ فتح خان نے اس طرف دیکھا اور بولا۔ ”تم سچ کہہ رہا ہے کیا؟ یا مجھ کو بے وقوف بنانے کی کوشش کر رہا ہے۔“

”غالباً تم خود یہاں آئے ہو اور پہلے ہی بنے ہوئے ہو اس لیے مجھے کوشش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ میں واپس تے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ فتح خان مسکرایا۔

چٹان پر لیٹ گیا۔ اس نے مجھے کھولنے کی کوشش نہیں کی اور تھیلے سے ایک روٹی نکال کر ایسے ہی کھانے لگا۔ میں نے کہا۔ ”بے شک تم مجھے باندھ کر رکھو مگر بھوکا رکھنا کمینگی ہے۔“

”ہم کمینہ آدمی ہے۔“ فتح خان نے دانت نکالے مگر تھیلے سے ایک روٹی نکال کر مجھے بھی تھادی۔

”مجھے کھولو میں ایسے نہیں کھا سکتا۔“

”مت کھاؤ پر ابھی میں نہیں کھول سکتا۔“ اس نے انکار کیا۔ مجبوراً مجھے تنے سے ٹک کر ہی واحد ہاتھ سے روٹی کھانے پڑی تھی میں نے اسے گول کر کے روٹی کی شکل دے دی۔ اس طرح کھانے میں آسانی ہو رہی تھی۔ روٹی ختم کر کے میں نے خرا کا شکر ادا کیا۔ جو اپنے گناہ گار بندے کو ہر حال میں رزق دیتا ہے۔ اگرچہ ایک روٹی نے بھوک ختم نہیں کی تھی مگر پیپہ میں ہونے والی چوہا ریس ختم گئی تھی۔ فتح خان بھی روٹی ختم کر کے سستا رہا تھا۔ بے ظاہر اس نے میری بات کا زیادہ اثر قبول نہیں کیا تھا۔ کیونکہ اس کے رویے میں کوئی عجلت اور پریشانی نہیں تھی۔ وہ مزے سے لمبی تان کر لیٹا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔

”تم تقدیر پر ایمان رکھتے ہو؟“

اس نے طنز یہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے ادھر سکون سے ایسے ہی لیٹا ہے۔“

”تب مجھے کس بات کی سزا ہے؟“ میں نے بھٹا کر پوچھا۔

”یہ احتیاط ہے۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”تم کھلا دشمن ہے اور سامنے ہے تم کو آزاد نہیں چھوڑ سکتا ہے، جو دشمن سامنے نہیں اور آزاد ہے اسے اوپر والے پر چھوڑا ہوا ہے۔“

”وہی تمہیں جہنم رسید کرے گا۔“ میں نے کہا۔ ”مجھے کھولو ورنہ میں چلاؤں گا۔ میں اس طرح کھڑے کھڑے تھک گیا ہوں۔“

حالانکہ میں خاص نہیں تھکا تھا۔ مگر فتح خان پر ظاہر کر رہا تھا کہ میں چل چل کر کھڑے رہ کر تھک گیا ہوں۔ فتح خان کچھ دیر مجھے ٹھوکتا رہا پھر اس نے جھکڑی کھول کر مجھے آزاد کر دیا۔ جھکڑی تھیلے میں ڈال کر وہ دوبارہ اسی انداز میں لیٹ گیا تھا۔ مگر اس کا ہاتھ رانفل پر تھا۔ میں وہیں تنے کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا۔ یہ کم سے کم سات فٹ قطر کا تھا اور درخت کی اونچائی شاید سو فٹ ہوگی یا اس سے بھی زیادہ ہوگی نیچے سے اس کی اونچائی کا درست اندازہ نہیں ہو رہا

”کیا اسے نہیں معلوم کہ اس کے بھائی کو کس نے قتل

کیا ہے؟“

”ہو سکتا ہے معلوم ہو پر وہ اس قسم کا آدمی نہیں ہے کہ انتقام کے لیے خود کو خطرے میں ڈالے۔“

”کسی کے بارے میں اتنے یقین سے مت کہا کرو خاص طور سے جب الفاظ کے مقابلے میں تمہاری جان داؤ پر لگی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”فرض کر لو کہ اس وقت ان چٹانوں میں کوئی ہے تو تم اس کے خلاف کیا کر لو گے؟“

”ابھی تم دیکھے گا۔“ فتح خان نے کہا۔ ”چلو اٹھو۔“

”کہاں جانا ہے؟“

”پانی پی کر آئے گا۔“ وہ بولا۔

مجھے بھی پیاس لگ رہی تھی اور ہم ڈھلان سے گھومتے ہوئے نالے کی طرف روانہ ہوئے۔ ”تمہارے پاس پانی رکھنے کے لیے کوئی اور چیز نہیں ہے کیا؟“

”ہوتی تو یوں خوار ہوتا۔“

آدھے گھنٹے بعد ہم نالے میں تھے اور ہم نے دل بھر کر پانی پیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اب صبح تک پانی نہیں ملے گا۔ ویسے رات میں پیاس کا اتنا مسئلہ بھی نہیں ہوتا۔ جب تک ہم واپس آئے سورج تقریباً پہاڑ کے کنارے پر جا نکا تھا اور کچھ دیر بعد وادی سائے میں آ جاتی۔ فتح خان نے واپسی کے بعد مجھے حکم دیا۔ ”ہاتھ آگے کرو۔“

میں نے حکم کی تعمیل کی اور اس نے میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی اور پھر جھک کر پیروں میں بھی بیڑی پہنا دی۔ سب سے آخر میں اس نے تھیلے سے ایک کسی قدر پتلی لیکن بڑی زنجیر نکالی اور اسے ایک چھوٹے تھے والے درخت کے گرد گھما کر اور میرے پیروں سے گزار کر ایک تالے سے لاک کر دیا۔ گویا میں پوری طرح بے بس ہو گیا تھا۔ مگر میں کسی حد تک اس کا مقصد سمجھ رہا تھا۔ ”فتح خان اگر تم کسی ایڈونچر پر جا رہے ہو تو مجھے اس طرح باندھ کر کیوں جا رہے ہو؟“

”تا کہ تم واپسی میں اسی جگہ ملے۔“

”اور اگر واپسی نہ ہو سکی تو؟“ میں نے پوچھا۔

”تب کوئی دوسرا آئے گا اور تمہارا قسمت اس کے ساتھ ہوگا۔ ویسے ابھی تم نے پوچھا تھا تقدیر کے بارے میں تو تم خود بھی ایمان رکھتا ہوگا۔“

”ہاں لیکن ہوں تو کمزور انسان نا۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ فتح خان نے کھانے پینے اور دوسرے سامان والا تھیلا وہیں چھوڑ دیا تھا البتہ اسے میری دسترس سے دور کر دیا

”تم برامان گیا۔“

”میں اس وقت صبح سے برامانوں کا جب تمہاری وجہ سے مجھے کوئی نقصان ہوگا۔ تم مجھ پر اعتبار نہیں کرو گے اس لیے جو ہوگا دیکھا جائے گا۔“

”اتنا ناراض مت ہو۔“ اس نے گویا مجھے پچکار کر کہا۔ ”ابھی میں سوچ رہا ہے۔“

”میرا خیال ہے دشمن عمل کر رہا ہے اور تم ابھی تک سوچ ہی رہے ہو۔“

”تم فکر مت کرو فتح خان ترنوال نہیں ہے۔“

چار بجے کے بعد سورج تیزی سے چھٹنے لگا تھا اور اب اس طرف ڈھلان پر اندھیرا آرہا تھا۔ کیونکہ سورج مغرب کی طرف آرہا تھا اس لیے چٹانوں کا مغربی حصہ زیادہ روشن اور واضح ہو رہا تھا۔ شاید اسی لیے مجھے وہ سیاہ جھلک دکھائی دی ورنہ دو پہر کی تیز روشنی میں جہاں جہاں سائے بن رہے تھے وہ سیاہ تھے اور ان کے ہوتے ہوئے کسی الگ سی چیز کو تلاش کرنا بہت دشوار کام تھا۔ فتح خان نے مجھ سے کہا۔ ”میں مذاں کر رہا تھا مجھے یقین ہے تم نے بھی کچھ دیکھا ہوگا۔“

”تمہاری مہربانی۔“ میں نے تلخی سے کہا۔ ہم دونوں بیٹھے ہوئے تھے اور بہ ظاہر فارغ البال لگ رہے تھے۔ فتح خان نے وقت لزاری کے لیے پوچھا۔

”برٹ شا کا لڑکی ایمن تم سے ملتا ہے؟“

”نہیں لیکن اس سے ایک دو بار رابطہ ہوا۔“

”اچھا لڑکی ہے تم پر مرتا ہے۔“

”خیال ہے تمہارا، گورے کبھی اتنے جذباتی نہیں ہوتے کہ محبت کے چکر میں مریں یا مار دیں، یہ تو صرف ہم لوگ ہی اتنے جذباتی ہیں۔“

”تم ٹھیک کہتا ہے پر وہ لڑکی تم سے محبت کرتا ہے۔“

”تم اسے زیادہ سے زیادہ پسند کہہ سکتے ہو۔“

میں نے تردید کی۔ ”اس کی وجہ بھی تم جانتے ہو جب میں نے اسے تمہارے اور کرم خان کے چنگل سے نکالا تھا۔“

”کرم خان۔“ فتح خان نے سرد آہ بھری۔ ”وہ میرا بچپن کا دوست اور بچپا کا بیٹا تھا۔ ان ہیروں کے لیے وہ میرا دشمن بن گیا میں نے اپنے ہاتھ سے اس کا گلا گانا تھا۔“

”اگر کرم خان زندہ ہوتا تو میں سوچتا کہ یہ وہی ہے۔“

”کرم کا ایک ہی بھائی ہے۔ بیرم خان لیکن وہ ادھر نہیں ہوتا۔ بیس سال سے ادھر انگلینڈ میں ہے۔“

تھا۔ ہاں اس نے رونوں والا شاپر نکال کر میرے پاس رکھ دیا۔ ”یہ کھانے کے واسطے ہیں پر احتیاط کرنا اگر کوئی نہ آیا تو تم زیادہ دن زندہ رہ سکتے گا۔“

اس کی بات کا مفہوم سمجھ میں آیا تو میرے جسم میں خوف کی لہری دوڑ گئی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اگر کوئی نہ آیا تو میں بھوکا پیاسا مریں گا۔ روٹی ہوگی تو دیر تک زندہ رہوں گا۔ ”فتح خان میں بلاوجہ مارا جاؤں گا۔“

”بلاوجہ تو نہیں اگر تم پہلے ہم کو ہیرے تلاش کر دیتا تو اس مصیبت میں نہ پھنستا۔“ اس نے اپنی منطق کے مطابق بات کی اس کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔ لگ رہا تھا کہ وہ میری بات نہیں سنے گا اور اپنی من مانی کرے گا۔ میں زندگی میں بہت پچھتا یا لیکن اس وقت دل سے پچھتا یا کہ مجھے اس وادی میں آنے کی کیا ضرورت تھی اگر فتح خان راستے میں آیا تھا تو میں کسی اور راستے سے راجا عمر دراز کے پاس چلا جاتا۔ یقیناً میری مت ماری گئی تھی جو میں نے ایک احتمالہ خیال کے سہارے وادی کا رخ کیا۔ جیسے ہی جنگل کا یہ حصہ اتنے سائے میں آیا اس نے بہت تیزی سے درمیان کا فاصلہ طے کیا اور بھاگتا ہوا چٹانوں میں ٹھس گیا۔ عمر اور اپنی بھاری جسامت سے قطع نظر اس کی رفتار قابل دید تھی اور اسے دو سو میٹرز کا فاصلہ طے کرنے میں پون منٹ بھی نہیں لگا تھا۔ وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تھا اور جب وہ کھلی جگہ سے گزر رہا تھا تب نہ تو کسی نے اسے روکا اور نہ ہی اس پر گولی چلائی تھی۔

سائے بہت تیزی سے بڑھ رہے تھے اور چند منٹ بعد ہی چٹانیں پوری طرح سائے میں آچکی تھیں اور اب صرف وادی کی مشرقی ڈھلان پر دھوپ تھی وہ بھی تیزی سے سمٹ رہی تھی۔ میں جہاں بندھا ہوا تھا وہ جگہ تو تقریباً تاریکی میں آچکی تھی اور اگر کوئی آجاتا تو اسے شاید ہی میں نظر آتا۔ فتح خان اپنے طور پر دشمن کے شکار پر روانہ ہوا تھا مگر اس کا پورا امکان تھا کہ دشمن اسے ہی شکار کر لے۔ وہ ایک مفروضے کے ساتھ گیا تھا کہ دشمن اس سے بے خبر ہے لیکن اگر اس کے برعکس ہوتا تو فتح خان کی یہ حفاظت واپسی مشکل دکھائی دے رہی تھی۔ میں نہ زنجیر کا جائزہ لیا۔ یہ ہلکی لیکن غالص اسٹیل کی بنی ہوئی تھی اور مضبوطی میں کئی گنا موٹی زنجیر سے کم نہیں تھی اسی طرح تھلا بھی مضبوط تھا۔ میں کیا کوئی پہلوان بھی اس زنجیر کو نہیں توڑ سکتا تھا۔ بیڑی بھی اسی طرح بہت مضبوط قسم کی تھی۔ مجھے خیال آیا کہ کیا فتح خان

جاننا تھا کہ میں یہاں آؤں گا جو وہ اتنی تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ لیکن وہ کیسے جان سکتا تھا جب کہ خود میرا ارادہ بھی اس طرف آنے کا نہیں تھا بلکہ یہ خیال تو مجھے لینڈ سلائڈنگ کے بعد آیا تھا۔

اچانک مجھے ایک خیال آیا۔ دراصل فتح خان یہی سمجھ رہا تھا کہ میں ہیروں کے چکر میں وادی کی طرف جا رہا ہوں اور وہ اسی لحاظ سے تیاری کر کے آیا تھا مگر جب میں ہائی وے سے وادی جانے والے راستے کی طرف نہیں مڑا تو فتح خان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ پھر میرے پیچھے آیا اور غلطی سے آگے نکل گیا کیونکہ میں رات بٹام میں رک گیا تھا۔ فتح خان اس سے بے خبر تھا۔ اب پتا نہیں وہ لینڈ سلائڈنگ کھلنے پر واپس میرے پیچھے آیا تھا یا پھر اس نے کسی اور کو چھوڑا ہوگا جو اس راستے پر نگرانی کر رہا ہوگا اور اسی نے فتح خان کو اطلاع دی ہوگی کہ پچھلی دانے پر آ گیا ہے اور وہ دوڑا ہوا میرے پیچھے آیا۔ اس دوران میں اس نے گل شاد کو کہیں چھوڑ دیا ہوگا۔ یہاں اس نے مجھے گھیر لیا اور اب میں بے بسی کی حالت میں بندھا ہوا تھا۔ مگر مجھے کچھ کرنا تھا۔ کچھ کرنے کے لیے سب سے پہلے مجھے خیال آیا کہ تالا کھولنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

میں نے پتلون کے ساتھ جیکٹ اور جوتے پہنے ہوئے تھے اور ان میں ایسی کوئی چیز نہیں تھی جس کی مدد سے میں تالا کھول سکتا تھا۔ میں نے تمام چیزوں کا جائزہ لیا تو میری توجہ پتلون کی بیلٹ کی طرف گئی۔ اس کا ہکل بند کرنے والا ہک نوکیلا تھا۔ میں نے ذرا سی کوشش کر کے بیلٹ اتار لی اور پھر اس کا تنکے جیسا دھاتی ہک تھام کر پہلے پاؤں کی بیڑی کھولنے کی کوشش کا آغاز کیا۔ اتنی دیر میں اندھیرا ہو چکا تھا اور مجھے سب ٹول کر کرنا پڑ رہا تھا۔ ایک بارتالے کے سوراخ سے ہک پھسل جاتا تو بڑی مشکل سے تلاش کرنے پر ملتا تھا اور پھر اس سے بھی زیادہ مشکل سے میں اسے سوراخ میں داخل کرتا تھا۔ مگر میں لگا رہا۔ مسلسل ایک پوزیشن میں بیٹھ کر ایک ہی جیسا کام کرنے سے جسم دکھنے لگا تھا۔ جب دکھن زیادہ ہو جاتی تو میں کچھ دیر آرام کر لیتا تھا۔ ابتدائی جوش و خروش کے بعد جب مسلسل ناکامی نصیب ہوئی تو خالی ذہن کے عالم میں مشینی انداز میں لگ گیا۔

میری نظر چٹانوں کی طرف تھی۔ ان کا سفید رنگ تاریکی میں نمایاں ہو رہا تھا۔ فتح خان کو گئے ہوئے آدھے گھنٹے سے زیادہ وقت ہو گیا تھا اور اب تک اس کی یا اس کے مبینہ دشمنوں کی طرف سے کوئی رد عمل دیکھنے میں نہیں آیا

سب سے آسان تدبیر یہ تھی کہ میں نو دو گیارہ ہو جاتا۔ مگر مسلسل مشکل حالات سے گزر کر میرے اندر ایک پتنگے کی عادت سی آگئی تھی۔ وہ مجھے مجبور کر رہی تھی کہ میں ذرا اس کھیل کا مشاہدہ کروں جو ان چٹانوں کے درمیان کھیلا جا رہا تھا۔ پہلے فائر کے بعد خاموشی تھی شاید دونوں طرف سے محتاط رویہ اپنایا جا رہا تھا۔ میں دوسرے فریق کا رویہ سمجھنے سے قاصر تھا۔ اگر وہ فتح خان سے واقف تھا تو اسے اب تک اس پر قابو پالینا چاہیے تھا اور اگر وہ اس سے بے خبر تھا تو اسے ان چٹانوں کا رخ کرنا نہیں چاہیے تھا۔ دن میں یہ غیر محفوظ اور بے پناہ گرم ہو جاتی ہیں۔

اچانک مجھے چٹانوں کے درمیان کچھ حرکت محسوس ہوئی۔ وہاں سے دو افراد نکلے تھے۔ لیکن نہیں ان میں ایک تیسرا فرد بھی تھا۔ وہ ان کے پیچھے تھا۔ میں نے آنکھوں پر زور دیا کہ کیا فتح خان نے دو افراد کو قابو کیا ہوا ہے۔ مگر نہیں پیچھے موجود شخص فتح خان سے زیادہ طویل قامت تھا۔ جو دو آگے تھے ان میں سے ایک لڑکھارہا تھا اور دوسرا اسے سنبھالے ہوئے تھا اور وہ تینوں میری طرف ہی آرہے تھے۔ میں احتیاط سے پیچھے ہٹا اور درختوں کے درمیان میں جانے لگا۔ فتح خان نے ان پر قابو پایا تھا یا خود ان کے ہتھے چڑھ گیا تھا دونوں صورتوں میں اس پارٹی کو اس طرف آنا تھا جہاں فتح خان مجھے قید کر کے گیا تھا۔ میں نے دو ایسے درختوں کے درمیان جگہ سنبھالی جن کے تنے نہ صرف آس پاس تھے بلکہ ڈھلان والی طرف ایک بڑی چٹان تھی۔ مورچے کے لحاظ سے یہ جگہ بہت موزوں تھی۔ میں پستول نکال کر اس مورچے میں سمٹ کر بیٹھ گیا۔

وہ تینوں کچھ دیر بعد درختوں میں داخل ہوئے یہاں تاریکی زیادہ تھی اس لیے بس ان کے ہیولے محسوس کیے جا سکتے تھے۔ وہ اسی طرف بڑھے جہاں میں موجود ہوتا اگر زنجیر کا تالا نہ کھلتا۔ اس جگہ کے نزدیک پہنچ کر انہوں نے آپس میں کچھ تبادلہ خیال کیا۔ ان کی دھمی آواز میں مجھ تک آئیں اور پھر ان میں سے ایک کو دھکا دے کر نیچے گرا دیا گیا اور جب اس نے بلند آواز میں کراہ کر گرانے والے کو گالی دی تو میں نے شناخت کر لیا وہ فتح خان تھا اور اب پتا چلا کہ وہ ان کا قیدی ہی نہیں زخمی بھی تھا۔ البتہ گالی کے بعد اس نے جو نام لیا اس نے مجھے چونکا دیا۔ اس نے جلال کو گالی دی تھی۔ جواب میں جلال نے اسے ٹھوکر ماری۔ ”چپ کرو خنزیر کا بچہ، میں تمہارا نوکر ہے جو ایسے بات کرتا ہے۔“

تھا۔ نہ ہی فتح خان کے جانے کے بعد کوئی حرکت دکھائی دی تھی۔ پھر اچانک ایک فائر کیا اور مجھے چٹانوں کے درمیان ہلکی سی روشنی کی جھلک دکھائی دی۔ یہ فائر کے شعلے کی چمک تھی اور اسی لمحے بیڑی کے تالے سے کلک کی آواز آئی اور تالا کھل گیا۔ میں اس معزز فن یعنی تالے، وغیرہ کھولنے میں قطعی اناڑی ہوں۔ البتہ ماہرین فن کو اکثر دیکھا کہ وہ محض ایک تار کی مدد سے پیچیدہ تالے وغیرہ بھی کھول لیتے ہیں۔ یہ قطعی اتفاق تھا کہ میں نے تالا کھول لیا اور مجھے اس کی بے انتہا خوشی ہوئی تھی۔ میں نے ہلکی سی قلعاری ماری اور جلدی سے زنجیر پیروں سے نکالی۔ ایک تالا کھلا تھا یعنی ایک پاؤں کھلا تھا دوسری میں بدستور بیڑی تھی۔ وقت نہیں تھا کہ میں اسے بھی کھوتا اس لیے مجھے اس کے ساتھ ہی حرکت کرنی تھی۔

میں نے جلدی سے ہیلت واپس پتلون میں پہنی اور کھل جانے والی بیڑی اس کی ساتھی بیڑی کے ساتھ موڑ کر پتلون کے پانچے میں اڑس لی۔ ہاتھ بدستور بندھے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں کھولنے میں وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ کیونکہ پہلی کامیابی بھی اتفاق سے ملی تھی اور اتفاق ہر بار نہیں ہوتا۔ ہے دوسرے میں جلد از جلد اس جگہ سے دور جانا چاہتا تھا۔ میں نے تھملا چیک کیا یہ دیکھ کر میری پہلے سے کھلی ہاتھیں مزید کھل گئیں کہ تھلے میں میرا پستول تھا۔ اس کے ساتھ دو عدد اضافی میگزین بھی اسی میں تھے۔ مگر مجھے مزید کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس سے میں اپنی جھکڑیاں کھول سکتا۔ البتہ ایک عدد ایمر جنسی لائٹ کم نارچ نکل آئی۔ میں نے اس کے شیشے پر ہتھیلی رکھ کر اسے چیک کیا اور یہ کام کر رہی تھی۔ میں نے اسے بھی رکھ لیا۔ جیکٹ کی جیبوں سے آسانی ہو رہی تھی ایک جیب میں پستول اور دوسری میں اس کے اضافی میگزین آگئے تھے۔ نارچ میں نے جیکٹ کے اندر بیٹے سے لگالی۔ کچھ روٹیاں بھی نکال کر جیکٹ میں ڈال لیں۔ بھوک تھی مگر فی الحال اور بھی غم تھے زمانے میں روٹی کے سوا۔

میں ڈھلان سے اتر کر جنگل کے کنارے تک آیا۔ پہلے فائر کے بعد نہ تو مزید کوئی فائر ہوا تھا اور نہ ہی کوئی اور آواز یا حرکت سنائی یا دکھائی دی تھی۔ چٹانیں اوپر سے نمایاں لیکن اندر سے تاریک تھیں۔ ان میں اب کوئی حرکت کر بھی رہا تھا تو وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں آزاد ہو گیا تھا اور سرج بھی تھا۔ مگر یہاں فتح خان سمیت نامعلوم تعداد میں ایسے افراد تھے جن پر دوستی کا گمان بھی مشکل تھا۔ ایسے میں

سب بتا دیا ہوگا۔“ فتح خان نے جلال کی طرف اشارہ کیا تو وہ غرانے لگا تھا۔

”ہو سکتا ہے جب جلال تمہارے پاس سے نکلا ہو تو تم کو ہیرے مل گئے ہوں۔“

فتح خان نے اس بار قہقہہ مارا۔ ”اگر مجھے ہیرے مل گئے ہوتے تو میں تمہارے پیچھے آتا۔ اس جیسے دس کتوں پر لعنت بھیج کر ادھر سے جا چکا ہوتا۔“

جلال بے قابو ہو کر فتح خان کی طرف جھپٹا اور اس نے بے دریغ اس کے زخمی شانے پر ٹھوکریں رسید کیں۔ فتح خان کو خاصی تکلیف ہوئی مگر وہ جلال کو چڑانے کے لیے ہنستا رہا اور جب وہ ہانپتے ہوئے پیچھے ہٹا تو فتح خان نے حقارت سے کہا۔ ”تیرا کیا خیال ہے تو فتح خان سے معافی کی امید رکھتا ہے۔“

بیرم خان نے مدبرانہ انداز میں ہاتھ بلند کیا۔ ”بس، جاہلوں کی طرح لڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

”جاہل تم ہے۔“ فتح خان نے اسے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ”جو بندہ پڑھ لکھ کر بھی ایسا کرے وہ زیادہ بڑا جاہل ہوتا ہے۔ ہم تو ان پڑھ آدمی ہے۔ ایسا کرتا ہے تو ٹھیک کرتا ہے۔“

”تم جانتے ہو انتقام ہمارے خون میں ہے۔“ بیرم خان دھیمے لہجے میں بولا۔ ”ہم دنیا کی ہر چیز چھوڑ سکتے ہیں لیکن بدلہ نہیں چھوڑ سکتے۔“

”تب تم کو اب خیال آرہا ہے۔“

”نہیں یہ خیال کبھی میرے دل سے نہیں نکلا مگر میں موقع کا انتظار کر رہا تھا۔ میں یہاں کے حالات اور تمہارے بارے میں زیادہ نہیں جانتا تھا اس لیے معلومات حاصل کرنے اور تمہارے ارد گرد بندے تلاش کرنے میں کچھ وقت لگا تھا۔“

”مگر تم کو بس یہی ملا ہوگا۔“ فتح خان نے پھر حقارت سے جلال کی طرف اشارہ کیا۔

”نہیں تمہارے آس پاس سارے ہی لوگ لالچی نکلے، ان کو نوٹ کی جھلک دکھائی تو سب بکنے کو تیار ہو گئے تھے۔ مگر میں نے اسے چنا کیونکہ یہ تمہارے سب سے قریب تھا۔ ویسے کیا تم کوئی نیکی کا کام کر رہے ہو جو اپنے آدمیوں سے وفاداری کی توقع رکھتے ہو۔ تم بھی تو پیسے کے لیے سب کرتے ہو۔“

”سب پیسے کے لیے کرتا ہے۔“ فتح خان نے اپنا دفاع کیا۔ ”تم نے بولا تھا کام کا بات کر لو، وہ کر لیا اب

”وہ کدھر ہے۔“ طویل قامت نے مداخلت کی۔ ”یہ دیکھو زنجیر کھلی ہے اور وہ غائب ہے۔“

”میں نہیں جانتا میں اسے باندھ کر گیا تھا۔“ فتح خان بولا۔ اتنی دیر میں مجھے کسی قدر نظر آنے لگا تھا اور میں نے دیکھا کہ فتح خان نے اپنا دایاں شانہ تھام رکھا تھا۔ پتا نہیں اسے گولی لگی تھی یا کوئی اور زخم آیا تھا۔ طویل قامت فتح خان کی طرف آیا۔ ”اصاف لہجے میں اردو بول رہا تھا مگر لہجہ کہیں کہیں چغلی کھاتا تھا کہ وہ پشتو بولنے والا ہی تھا۔ اس نے جھک کر فتح خان سے کہا۔

”فتح تم مانتے ہو اس دنیا میں مجھ سے زیادہ تمہارے خون کا پیاسا کوئی نہیں ہوگا۔“

”خیال ہے تمہارا۔“ فتح خان نے اس حالت میں بھی استہزایہ لہجے میں کہا۔ ”لگتا ہے انگلینڈ جا کر بھی تم نے ابھی دنیا نہیں دیکھا۔“

میں چونکا کیونکہ انگلینڈ کا حوالہ اس نے کرم خان کے بھائی بیرم خان کے بارے میں بات کرتے ہوئے دیا تھا۔ طویل قامت کہہ رہا تھا۔ ”فتح تم بہت فضول باتیں کرتے ہو۔ کام کی بات کرو۔“

”کام کا کیا بات کرے بیرم خان۔“ فتح خان بولا۔ ”کام کا بندہ تو بھاگ گیا۔“

”یہی میں پوچھ رہا ہوں کہ وہ کہاں ہے؟“

”تم انگلینڈ پلٹ کر بھی جاہلوں کا سا بات کر رہا ہے۔“

اگر قیدی آزاد ہو جائے تو وہ کہاں جاتا ہے۔ وہ بھاگ گیا ہوگا۔ اب تک وٹالے میں پہنچ گیا ہوگا۔“

”تم نے کہا تھا اس کے پیروں میں بھی کف ڈالی ہے۔“

”تم پھر احمقانہ بات کر رہا ہے یہ زنجیر دیکھ رہا ہے یہ بند ہے تو اس نے بیڑی ہی کھولا ہوگا نا، اس کا مطلب ہے اب وہ بھاگ نکلتا ہے۔“

بیرم خان خاموش ہو گیا۔ میں دل میں ہنس رہا تھا کچھ دیر پہلے ہی بیرم خان کے بارے میں فتح خان نے فرمایا تھا کہ وہ اس چکر میں نہیں پڑے گا مگر حالات بتا رہے تھے کہ وہ اسی چکر میں تھا اور کچھ زیادہ ہی تھا کیونکہ جلال جسے فتح خان اپنے اعتماد کا آدمی قرار دے چکا تھا وہ اب بیرم خان کے ساتھ نظر آ رہا تھا۔ گویا وہ شروع سے بیرم خان کا آدمی تھا۔ نہ جانے فتح خان نے اس پر کیسے اعتبار کر لیا۔ کچھ دیر بعد بیرم خان بولا۔ ”مجھے ہر قیمت پر وہ ہیرے چاہئیں۔“

”تو لے لو، ابھی تک تو نہیں ملا ہے، اس گتے نے تم کو

تمہارا کیا ارادہ ہے۔ بدلہ لینا ہے تو اور جاؤ، دنت کیوں ضائع کرتا ہے۔“

”کیا تمہیں مرنے کی جلدی ہے؟“ جلال بولا۔ ”خان کی رحم دلی سے فائدہ اٹھاؤ۔“

جواب میں فتح خان نے قہقہے کے ساتھ جوثر مایا سے لکھنے سے میرا قلم معذرت رہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ اتنا بے جگر ہو رہا تھا اسے قطعی پروا نہیں تھی کہ اس کے سامنے اس کی جان کا دشمن تھا اور وہ ایک لمحے میں اسے دنیا سے رخصت کر سکتا تھا۔ مگر فتح خان کو جیسے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس نے جلال کو خان کی رحم دلی کے حوالے سے ایک ناقابل بیان مشورہ دیا تھا۔ بیرم خان مشتعل نہیں ہوا اور جلال پہلے ہی اپنا غصہ اتار چکا تھا اس لیے فتح خان مزید چونٹوں سے محفوظ رہا۔ بیرم خان نے کہا۔ ”فتح خان تم نے ٹھیک کہا تھا کہ پڑھ لکھ کر بھی آدمی جاہلوں کی سی حرکت کرے تو یہ زیادہ جہالت ہوتی ہے اس لیے میں تمہیں اپنے ہاتھ سے نہیں ماروں گا۔“

”مجھے معلوم ہے تعلیم نے تم کو بزدل بنا دیا ہے، شاید خون دیکھ کر تم کو لٹی آتا ہوگا۔ تم اس سے بولے گا۔ اسی لیے خریدتا ہے اسے۔“

”نہیں، میں تمہیں یہاں اسی زنجیر سے باندھ جاؤں گا اور تم بھوک پیاس سے مرو گے۔“

فتح خان ایک لمحے کو چپ ہوا پھر بولا۔ ”یہ کیسا انتقام ہے دشمن کو تو اپنے ہاتھ سے مار کر چین آتا ہے۔“

”یہی انتقام ہے۔“ بیرم خان عیاری سے بولا۔ ”یہ کیا کہ ایک گولی ماری اور آدمی ختم، مزہ تو اس وقت ہے جب دشمن سسک سسک کر زیادہ دیر میں جان دے۔“

”تم باندھ کر چلا جائے گا؟“

”نہیں میں یہیں رکوں گا اور اس دوران میں جلال کے ساتھ مل کر ہیرے تلاش کروں گا۔ یہاں کتنے درخت ہیں شاید دو ہزار ہوں۔ اگر ہم روز سو درخت بھی دیکھیں تو بیس دن میں یہ سارا جنگل چھان سکتے ہیں چلو مہینا لگ جائے گا۔ کم سے کم پچاس ملین ڈالرز کے ہیروں کے لیے ایک مہینا کچھ بھی نہیں ہے۔ اس دوران میں تم کو مرتے ہوئے دیکھتا رہوں گا۔“

”تم زیادہ سے زیادہ تین دن اس شو کو دیکھ سکتا ہے۔“ فتح خان نے خوفزدہ ہوئے بغیر کہا۔ ”اس کے بعد کیا کرے گا؟“

مگر بیرم خان جیسے سب طے کر کے آیا تھا اس نے کہا۔ ”تم فکر مت کرو میں تم کو پانی دیتا رہوں گا صرف

کھانے کو کچھ نہیں ملے گا تب تم کو مرنے میں بہت وقت لگے گا۔ کم سے کم تین ہفتے لگے گا تمہیں مرنے میں۔“

فتح خان کو تو نہیں پتا لیکن میرے جسم میں سردی لہر دوڑ گئی تھی۔ بیرم خان کا منصوبہ نہایت خوفناک تھا اور اگر اس پر عمل کیا جاتا تو فتح خان کو مرنے میں سچ سچ اتنا وقت لگ جاتا

اور یہ موت بہت خوفناک ہوتی۔ بیرم خان کے اشارے پر جلال نے فتح خان کو زنجیر سے یوں باندھا کہ پہلے اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈالی اور پھر اس کے دوسرے کڑے میں زنجیر ڈال کر اسے دوبارہ تالے سے بند کر دیا۔ اب فتح خان اسی طرح درخت کا قیدی بن گیا تھا جیسے اس نے مجھے بنایا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ میرے دونوں ہاتھ پاؤں ہتھکڑی اور بیڑی سے بند تھے جب کہ فتح خان کے صرف ایک ہاتھ میں ہتھکڑی تھی اور اس کے پاؤں بیڑی سے آزاد تھے مگر وہ بھی میری طرح درخت کا قیدی بن گیا تھا۔ ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں وقت نے پلٹا کھایا۔ جو آزاد تھا وہ قیدی بن گیا اور جسے قیدی بنایا تھا وہ آزاد ہو گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کیا مجھے یہاں سے چلے جانا چاہیے؟ میری بلا سے فتح خان کے ساتھ کچھ بھی ہوتا رہے۔ مگر میں دیکھنا چاہتا تھا کہ آگے کیا ہوتا ہے؟

فتح خان میرا دشمن تھا اور اس نے بہت سے مواقعوں پر مجھے زچ کیا تھا۔ اس نے منشی دل جی جیسے خبیث دشمن کا ساتھ دیا اور اس کا نتیجہ بالآخر بیٹو کی موت کی صورت میں نکلا

مگر فتح خان اس میں براہ راست ملوث نہیں تھا۔ بلکہ اس نے مجھے چھوڑ دیا تھا حالانکہ وہ مسلح تھا اور چاہتا تو مجھے آسانی سے شوٹ کر سکتا تھا مگر اس نے صرف فرار کو ترجیح دی۔ اس کا یہ

بوجھ مجھ پر باقی تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ بوجھ اتار دوں۔ بیرم خان نے فتح خان کو بے بس کرنے کے بعد اپنے

سامان سے ایک لمبل نکال کر بچھایا تھا اور اب اس پر محو آرام تھا۔ بہ ظاہر اس نے فتح خان کے لیے سزا تجویز کی تھی لیکن اس کے پس پشت اصل میں اس کا مقصد ہیروں کا حصول تھا

شاید اس کے ذہن میں تھا کہ ہیرے فتح خان کے پاس تھے اور جب وہ بھوک پیاس سے نڈھال ہو جائے گا تب وہ اس سے ہیروں کا پوچھے گا۔ ساتھ ہی وہ خود بھی ہیروں کی تلاش

جاری رکھتا۔ مجھے یقین تھا کہ اگر اسے ہیرے مل گئے تو وہ فتح خان کو قتل کرنے میں ایک منٹ کی دیر نہیں کرے گا۔

مجھے پیاس لگ رہی تھی لیکن فی الحال یہاں سے ہلنا مناسب نہیں تھا۔ بیرم خان اور جلال دونوں چوکنا تھے اور

اگر میرے پاؤں کی بیڑی کھنک جاتی تو وہ میری موجودگی

حفات سے بولا۔ ”میرا آدمی میرے اشارے پر اپنا جان قربان کر سکتا ہے۔“

”آج صبح تک تم بھی میرے بارے میں ایسا ہی سوچتے ہو گے۔“ جلال ہنسا۔ ”کیا میں نے جان قربان کی، نہیں کی نا..... فتح خان آج کل کوئی کسی کے لیے جان قربان نہیں کرتا۔ بڑا خراب دور ہے۔ لوگ بھائی کے مرنے کے بعد اس کی بیوی پر قبضہ کر لیتے ہیں۔“

جلال کا اشارہ یقیناً گل شاد کی طرف تھا۔ فتح خان اس کا طنز سمجھا یا نہیں لیکن وہ خاموش ہو گیا تھا۔ بیرم خان کچھ دیر بعد خزانے لینے لگا۔ جلال بھی جمائیاں لے رہا تھا مگر وہ لینا نہیں۔ مجھے بھی اونگھ آ رہی تھی مگر میں سونے کا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ ذرا سی بے احتیاطی میرا راز فاش کر دیتی۔ میں ان لوگوں سے بیس گز سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھا۔ اس لیے میں نیند کے جموں کوں سے ہوشیار رہا۔ میں نے اپنی پشت کھر درمی چٹان سے لگا لی تھی اور یہ بے آرامی مجھے جگائے رکھنے میں معاون ثابت ہو رہی تھی۔ کچھ دیر میں چاند طلوع ہو گیا۔ مگر یہ زوال پذیر چاند تھا اور روشنی اتنی زیادہ نہیں تھی خاص طور سے درختوں تلے اس کا اثر نہ ہونے کے برابر تھا البتہ سفید چٹانیں روشن ہو رہی تھیں۔ میں کبھی کبھی ان چٹانوں پر بھی نظر دوڑا لیتا تھا۔

ایک بار میں نے اس طرف دیکھا تو مجھے لگا وہاں کوئی چیز ہے جو حرکت کر رہی ہے۔ میں نے واضح نہیں دیکھا تھا۔ مگر مجھے احساس ہوا تھا اس بار میں نے نظر جما کر دیکھا۔ چند لمحوں بعد دو سائے حرکت کرتے دکھائی دیئے۔ وہ چٹانوں کے درمیان تھے اور جھک کر چل رہے تھے۔ ان کا رخ ہماری طرف نہیں تھا۔ بلکہ وہ شمالی ڈھلان کی طرف جا رہے تھے۔ میں چونکا ہوا گیا۔ یہ کوئی نئی مصیبت تھی یا فتح خان کے آدمی تھے جو اب آئے تھے۔ اگر وہ بیرم خان کے آدمی ہوتے تو انہیں اس طرح چھپ کر حرکت کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے ایک جگہ جہاں جھاڑیاں زیادہ تھیں وہاں سے میدان عبور کیا اور شمالی ڈھلان پر پہنچ گئے۔ میں چونکا ہوا گیا۔ یہ جگہ لائین کی روشنی کی وجہ سے نمایاں تھی اور یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ ان دو افراد نے اس روشنی کو نہ دیکھا ہو۔

میری نظر اب شمالی ڈھلان کی طرف تھی مگر درختوں تلے بالکل اندھیرا تھا اور اگر کوئی یہاں حرکت کرتا تو بھی اس کا نظر آنا محال تھا صرف آواز سے کسی آنے والے کا سراغ لگ سکتا تھا۔ خوش قسمتی سے میں جنوب کی طرف تھا اس لیے

سے واقف ہو جاتے۔ اس لیے مجھے انتظار کرنا تھا اور وقت گزری کے لیے میں خشک نان چبانے لگا۔ میری سرگزشت بڑھنے والے اکثر قارئین شکوہ کرتے ہیں کہ میں لذیذ کھانوں کا ذکر کچھ زیادہ ہی کرتا ہوں۔ مگر کسی اللہ کے بندے یا بندی کو اتنی توفیق نہیں ہوتی کہ جب میں دشمن کی قید میں ناتے کرتا ہوں یا اس طرح خشک نان چباتا ہوں تو مجھ سے اظہارِ ہمدردی ہی کر لے۔ دونان حلق سے اتار کر پیٹ کو تو افادہ ہو گیا تھا مگر حلق میں بیسے کانٹے پڑنے لگے۔ خشک نان رہی سہی تھی بھی چوس گئے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ رات کے نو بج چکے تھے۔ جلال نے ایک عدد لائین نما ایر جنسی لائٹ جلا کر ایک ایسی جگہ رکھ دی تھی جہاں سے اس کی روشنی ان کے بڑاؤ کو منور کر رہی تھی۔ پھر انہوں نے الاؤ جلا یا اور کھانا گرم کرنے کی تیاری کرنے لگے۔ بیرم خان کے پاس ٹن بند کھانے تھے اور وہ مچھلی کا ایک ٹن کھول کر اسے ہکا گرم کر کے کھا رہا تھا۔ جلال وہی روٹی اور چائے سے گزارا کر رہا تھا۔ فتح خان بندھا ہوا اپنی جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے شانے کے زخم کے بارے میں نہ تو اس نے بات کی تھی اور نہ ہی ان لوگوں نے کوئی بات کی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ زخم لولی کا نہیں ہے ورنہ وہ اسے اتنا ہلکا نہ لیتے اور گولی کا زخم وہ بے ہی جلد خراب ہونے لگتا ہے۔ اتنی دیر میں فتح خان کی حالت غیر ہو جاتی مگر ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ٹھیک ہے۔ وہ درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور کبھی کبھی آواز میں کچھ گتھاتا بھی تھا۔

پیاس کی شدت میں اضافہ ہوا تھا مگر مجھے معلوم تھا کہ کھانے کے بعد ایسا ہی ہوتا ہے۔ کچھ دیر میں یہ شدت دو بار کم ہو جائے گی۔ میں نے دوپہر میں اچھی طرح پانی پیا تھا اور اس بات کو سات گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں گزرا تھا اس لیے مجھے ڈمی ہائیڈریشن کا مسئلہ نہیں تھا۔ یہ صرف ایک نفسیاتی پہلو تھا میرے پاس چونکہ پانی نہیں تھا اس لیے مجھے پیاس کا خیال آ رہا تھا۔ کسی قدر حقیقی پیاس بھی تھی۔ کچھ دیر بعد کچھ پیاس کی شدت کم ہونے لگی۔ بیرم خان کھاتے ہی لیٹ چکا تھا۔ جب کہ جلال الاؤ کے پاس بیٹھا ہوا فتح خان کی نگرانی کر رہا تھا۔ فتح خان نے اس سے کہا۔ ”میرا آدمی جانتا ہے تم میرے ساتھ تھا جب میں واپس نہیں جاؤں گا تو وہ تم کو تلاش کرے گا۔“

”کوئی تلاش نہیں کرے گا۔“ جلال نے اطمینان سے کہا۔ ”آج کل کوئی کسی کا نہیں کرتا ہے۔“

”تم سب کو اپنے جیسا دوغلا سمجھتا ہے۔“ فتح خان

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

تلاشی پر اس کے پاس سے ایک عدد اضافی میگزین نکلا تھا۔ اس کے حلق سے آتی ہلکی سی خرخراتی آوازیں بتا رہی تھیں کہ وہ دم توڑ رہا ہے۔ گولی دل سے ذرا لگی تھی اور جان لیوا ثابت ہوئی تھی۔

اس کے پاس دوسری چیز پانی کی ایک بوتل نکلی تھی اور مجھے پانی کی ضرورت تھی۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کر کے اس میں سے ایک گھونٹ لیا اور رائفل سنبھال کر لڑائی کی طرف متوجہ ہوا۔ پڑاؤ میں الاؤ آخری دموں پر تھا۔ کیونکہ آگ بجھ گئی تھی اور اب انکارے بھی بجھ رہے تھے۔ ان کی ہلکی روشنی فائرنگ کے شعلوں کے سامنے بجھ سی گئی تھی۔ مارے جانے والے کا دوسرا سا بھی اوپر سے بے دریغ گولیاں برس رہا تھا اور پھر اس کی فائرنگ کام آئی۔ جلال جو بے احتیاطی سے کھلے میں آیا تھا وہ نشانہ بنا اور الٹ کر انکاروں پر آگرا اور پھر وہیں لوٹ پوٹ ہونے لگا تھا۔ دوسرے برسٹ نے اسے وہیں ٹھنڈا کر دیا مگر اس کی لاش انکاروں پر روسٹ ہونے لگی اور چند لمبے بعد فضا میں گوشت جلنے کی بو پھیلنے لگی۔ بیرم خان ایک درخت کی آڑ میں تھا۔ اس نے جلال کے مرنے کے بعد اوپری سمت چند فائر کیے اس کے پاس زیادہ بڑا ہتھیار نہیں تھا اور اوپر والے کو اس لحاظ سے برتری حاصل تھی۔

اوپر والا اب بالادست تھا۔ کیونکہ نیچے صرف ایک رہ گیا تھا اور وہ بھی پستول سے مسلح تھا۔ اس لیے وہ نیچے آنے لگا۔ وہ تیزی سے ایک درخت کی آڑ میں آیا۔ پھر دوڑ کر ذرا نیچے موجود دوسرے درخت کی آڑ میں آنے والا تھا کہ ٹھوکر کھا کر گرا۔ یہ اس کی بد قسمتی تھی کہ وہ سنبھل نہ سکا اور لڑھکتا ہوا نیچے آیا۔ بیرم خان نیچے آتے ہوئے اس پر مسلسل گولیاں برس رہا تھا اور بالآخر وہ نیچے آگرا اور اس کے ساتھ ہی بیرم خان کا پستول خالی ہو گیا۔ مجھے کلک کی آواز آئی۔ شاید بیرم خان میگزین بدل رہا تھا کہ دوسرے آدمی نے اپنی رہی سہی ہمت جمع کر کے اس پر برسٹ مارا اور وہ فوراً ہی مارا گیا کیونکہ وہ الٹ کر گرا تھا اور پھر ساکت ہو گیا۔ میں دم بہ خود سے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے رائفل حاصل کر لی تھی مگر اسے استعمال کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

دوپہر استعمال کر کے میں نے اپنے چار ممکنہ دشمنوں کا خاتمہ کر دیا تھا۔ بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ دشمن نے آپس میں ایک دوسرے کا کام تمام کر دیا تھا۔ اب ہر طرف خاموشی تھی۔ مگر میں نے حرکت نہیں کی۔ زنجیر چھٹکی تو اندازہ ہوا کہ فتح خان زندہ ہے۔ یہ اس کی قسمت تھی ورنہ وہ اس میدان

یہ امکان نہیں تھا کہ وہ میرے پیچھے سے آتے۔ اس کے باوجود میں آس پاس سے چوکنا تھا۔ مگر آنے والے بہت ہی محتاط تھے۔ وہ اس وقت نظر آئے جب وہ لائٹن کی روشنی کی حد میں آگئے تھے۔ ان کے سائے درختوں کے درمیان حرکت کر رہے تھے۔ پھر وہ ایک جگہ ر کے اور الگ الگ ہو کر دائیں بائیں چلے گئے۔ ایک میری طرف آیا تھا مگر وہ مجھ سے کچھ دور ایک درخت کی آڑ میں رک گیا اور دوسرا اس سے مخالف سمت میں کسی قدر نیچے تھا۔ ایسا لگ رہا تھا وہ ان لوگوں کو گھیر رہے تھے۔ ان کے پاس خود کار رائفلس تھیں۔ جلال اب اونگھ رہا تھا اسے لیے اسے قطعی خبر نہیں ہوئی۔

مجھے آنے والے خطرناک لگ رہے تھے۔ عین ممکن تھا وہ میرے پاس آجاتے اور مجھے دیکھ لیتے۔ اس لیے میں نے جلال کو خبردار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کے لیے ایک عدد پتھر تلاش کیا اور اسے پڑاؤ کی طرف اچھال دیا۔ پتھر الاؤ کے پاس گرا اور جلال نے بھڑک کر اپنی رائفل اٹھائی تھی۔ اس دوران میں، میں نے دوسرا پتھر ڈھلان کے اوپری حصے کی طرف پھینکا جس طرف وہ دونوں موجود تھے اور آواز آتے ہی جلال نے اس طرف ہلکا برسٹ مارا۔ بیرم خان بھی ہڑبڑا کر اٹھا تھا اور اس دوران میں جلال نے پھرتی سے لائٹ بجھا دی۔ فوراً ہی اوپر سے برسٹ چلا اور تاریکی میں پتا نہیں چلا کہ کون نشانہ بنا اور کون بچ گیا۔ ایک کے بعد دوسرا برسٹ چلا اور شعلوں سے اندازہ ہوا کہ اوپر والے دونوں افراد محفوظ تھے اور اپنی اپنی کمین گاہوں سے فائرنگ کر رہے تھے۔ پھر نیچے سے جوانی فائرنگ شروع ہو گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ بیرم خان اور جلال بھی بچ گئے تھے۔

میں سچ رہا تھا کہ اوپر والوں میں سے کوئی مورچہ بنانے کے لیے اس طرف نہ آئے۔ کیونکہ یہ جگہ بڑی موزوں تھی اور یہاں سے پڑاؤ کو زیادہ آسانی سے نشانہ بنایا جاسکتا تھا۔ پھر ایسا ہی ہوا جو آدمی میری پناہ گاہ کے نزدیک تھا وہ اس طرف آیا۔ میرے پاس بالکل موقع نہیں تھا اور اگر میں اسے ذرا موقع دیتا تو وہ مجھے شوٹ کر دیتا اس لیے میں نے پہلے یہ کام کیا۔ جیسے ہی وہ تنوں کے درمیان نمودار ہوا میں نے اس کے سینے میں گولی اتار دی۔ وہ ڈکرا کر پیچھے گیا مگر خوش قسمتی سے اس وقت فائرنگ کا بے پناہ شور جاری تھا اس لیے کسی نے ایک پستل فائر کی آواز نہیں سنی۔ وہ الٹ کر پیچھے گرا تو میں نے اس کی ٹانگیں پکڑ کر اسے اندر کھینچ لیا اور پھر ٹول کر اس کی رائفل اپنے قبضے میں لے لی۔ مزید

جنگ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بے تماشہ فائرنگ ہوئی تھی اور کوئی بھی گولی اس کا رخ کر سکتی تھی۔ مگر وہ محفوظ رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ”لگتا ہے خدائی خوار سب مر گیا۔ اب مجھے کون آزاد کرے گا۔“

میں آزاد کر سکتا تھا مگر فی الحال میرا یہاں سے ہٹنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ بہ ظاہر سب مر گئے تھے لیکن کیا کہا جا سکتا تھا کہ کوئی زندہ ہو اور مرتے مرتے بھی کسی ایک کو ساتھ لے جانے کی کوشش کرے۔ جلال کے انکاروں پر گرنے سے رہی آہا روشنی بھی ختم ہو گئی تھی میرے پاس ٹارچ تھی مگر اسے استعمال کرنے کا مطلب اپنی موجودگی کا راز خود فاش کرنا تھا۔ دوسرے مجھے ایک خدشہ اور تھا کہ اگر ان دو کے پیچھے کچھ افراد اور ہوئے تو وہ جلد بابر یہاں تشریف لے آتے۔ بے شک میں اب زیادہ مستح تھا مگر بندھے ہاتھوں سے میں اپنا دفاع اور حملہ بہت اچھے انداز میں نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے مجھے محتاط رہنا تھا اور فی الحال اپنی موجودگی ظاہر کرنا مناسب نہیں تھا۔ مجھے کوئی عجت بھی نہیں تھی۔ میں کھاپی چکا تھا اور اس جگہ آرام سے تھا۔ اپنے کشتے کی لاش میں نے آرام سے دکھیل کر تنوں سے باہر کر دی تھی۔

اب مجھے صبح کی روشنی کا انتظار تھا۔ فتح خان اپنی جگہ بے بسی سے بندھا ہوا تھا اور وہ بھی آرام سے بیٹھا ہوا تھا۔ شروع میں اس نے زیر لب کچھ کہا تھا مگر اب خاموش تھا۔ غالباً اسے بھی صبح کی روشنی کا انتظار تھا۔ میں کچھ دیر تو جاگتا رہا مگر پھر سکون اور خطرہ نہ ہونے کے احساس نے مجھ پر غلبہ پا لیا اور میں سو گیا۔ درمیان میں ایک بار آنکھ کھلی اور حالات کو جان کا تڑپا کر میں دوبارہ سو گیا۔ دوسری بار آنکھ کھلی تو شرقی افق سرخ ہو رہا تھا۔ سورج طلوع ہونے والا تھا۔ میں نے انگڑائیاں لے کر اپنا جسم کھولا اور باہر جھانک کر دیکھا۔ باہر ابھی تک تاریکی تھی مگر ہولے نظر آ رہے تھے۔ اب تک فتح خان کی آواز آئی۔ ”شہباز خاناں صبح ہو گئی ہے اب باہر آ جاؤ۔“

میں دنگ رہ گیا تھا کہ اسے یہاں میری موجودگی کا پتا کیسے چلا؟ مگر میں نے جواب نہیں دیا خاموش رہا تو اس نے کچھ دیر بعد پھر کہا۔ ”شہباز میں جانتا ہے تم یہاں ہے سوتے میں تم نے کچھ آواز نکالا تھا اس لیے اب ڈراما چھوڑو اور سامنے آ جاؤ۔“

”میں سامنے آؤں گا لیکن جب تم مجھے نظر آؤ گے۔“ میں نے اب بات کرنے میں حرج نہیں سمجھا۔ فتح خان یا ان دونوں کے ساتھ اور کوئی ہوتا تو وہ اب تک یہاں آچکا ہوتا۔

”میں سامنے ہے۔“
”صبر فتح خان، ذرا روشنی ہو جانے دو۔“ میں نے کہا۔ ”اتنی جلدی کی ضرورت کیا ہے۔ آخر میں کل رات سے یہاں بیٹھا ہوں اور سکون سے ہوں۔ ویسے جب تک روشنی نہیں ہو جاتی ہم آپس میں کچھ تبادلہ خیال نہ کر لیں۔“
”کیسا تبادلہ خیال؟“

”پہلی بات تو یہ کہ یہ دونوں کون ہیں جو مارے گئے ہیں۔“

”بیرم خان میرا چچا کا لڑکا اور جلال۔“
”میں ان دونوں کی بات کر رہا ہوں۔“ اس بار میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”جو خاموشی سے یہاں آئے تھے۔“
”میں ان کے بارے میں نہیں جانتا۔“ فتح خان نے صاف انکار کر دیا۔

”ایسا کیسے ہو سکتا ہے فتح خان، یا تو یہ بیرم خان کے ساتھی تھے یا پھر تمہارے ساتھی ہوں گے۔“
”میں نے کہا نا میرا ساتھی نہیں ہے۔“ فتح خان اپنے انکار پر قائم رہا۔

”اگر یہ بیرم خان کے ساتھی ہوتے تو اس پر حملہ نہ کرتے۔“

”ہو سکتا ہے کوئی تیسرا پارٹی بھی۔“ وہ عیاری سے بولا۔

”فتح خان بات حلق سے اتر نہیں رہی ہے۔ بہر حال جو بھی حقیقت ہوگی جلد سامنے آ جائے گی۔“

مشرق اب زیادہ روشن ہو گیا تھا اور رفتہ رفتہ یہ روشنی نیچے کی طرف آ رہی تھی کیونکہ ہم مغربی ڈھلان پر تھے اس لیے پہلے یہ روشن ہوئی۔ روشنی بتدریج بہتر ہو رہی تھی اور میں نے اٹھ کر پہلے اپنا جسم کھولا۔ رات بھر ایک محدود جگہ بیٹھے رہنے سے بند سا گیا تھا۔ پھر ٹھنڈ کا اثر بھی تھا۔ پانچ چھ منٹ کی محدود ایکسٹریسٹ نے مجھے چاک دچو بند کر دیا تھا۔ اب روشنی اتنی تھی کہ اس پاس سب صاف نظر آ رہا تھا۔ میں نے جھانک کر دیکھا تو فتح خان درخت کی اوٹ میں تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”فتح خان سامنے آؤ۔“

”میں سامنے نہیں آئے گا۔“ اس نے انکار کیا۔
”اس صورت میں تم یہیں بندھے رہو گے اور میں روانہ ہو جاؤں گا۔“ میں نے اسے دھمکی دی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے ہچکچا کر کہا۔

”کیا ضمانت ہے کہ تم ہم پر گولی نہیں چلاؤ گے۔“
”کوئی ضمانت نہیں۔“

جست کی کمی کی علامات

وہ انسان جن کے زخم ٹھیک ہونے میں زیادہ وقت لگتا ہو ان میں جست کی کمی ہوتی ہے۔ اس کی کو پہچاننا نہایت آسان ہے۔ نائٹوں پر سفید دھبے ہی جست کی کمی کو ظاہر کرتے ہیں۔ اسی طرح شدید یا مستعدی بیماری کے بعد مریض میں ڈانکے کی پہچان ختم ہونے کی وجہ بھی جست کی کمی ہے۔ ایسے مریض کی بھوک میں کمی بھی واقع ہو جاتی ہے جس سے وزن کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ جست کی کمی کو پورا کرنے کا سب سے بہترین طریقہ خوراک ہے۔ سب سے زیادہ جست اوسٹر اور میٹ (گوشت) میں ہوتا ہے جبکہ جست کی مناسب مقدار خشک پھلوں، مٹر، لوبیہ اور دالوں وغیرہ میں پائی جاتی ہے۔

مرسلہ: زویا فرہاد، جہلم

میں بیرم خان کے پاس آیا اور اس کے خون آلود لباس سے ہاتھ بچاتے ہوئے بہ مشکل اس کی جیبوں کا معائنہ کیا اور بالآخر چابی برآمد کر لی یہ ایک ہی چابی تھی جس سے تمام تالے کھلتے تھے۔ میں نے ہاتھوں اور پیروں کو آزاد کرانے کے بے انتہا سکون محسوس کیا۔ اس کے بعد میں نے سب سے پہلے اپنا سامان تلاش کیا۔ مجھے پرس، موبائل اور جیب کی چابیاں جلال کے پاس سے ملیں۔ مگر افسوس موبائل کی اسکرین اس کے نیچے دب کر ٹوٹ گئی تھی یہ بیکار ہو گیا تھا۔ میں نے سم نکال کر اسے وہیں پھینک دیا اور باقی چیزیں اپنے پاس رکھ لیں۔ فتح خان نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

”میرے کو پانی دو۔“

میں نے بوتل اسے تھما دی اس کے بعد میں نے مارے جانے والے افراد کا اسلحہ جمع کیا۔ اس میں چار عدد خود کار رائفلیں اور تین عدد پستول تھے۔ ان سب کو اپنی پناہ گاہ میں لے کر ڈال دیا۔ میرے لیے ایک رائفل اور ایک پستول کافی تھا۔ پھر میں نے چاروں لاشیں بھی اسی جگہ ڈال دیں۔ ان کو ایسے ہی چھوڑنا مناسب نہیں تھا کیونکہ گری تھی اور آسمان پر چٹیلیں منڈلا رہی تھیں۔ میں نے آس پاس سے پتھر جمع کر کے ان کو ڈھانپ دیا۔ اس کام میں خاصا وقت لگا مگر مجھے اطمینان ہو گیا کہ اب لاشیں مردار خورد پرندوں اور

”اچھا میں سامنے آتا ہے۔“ فتح خان نے کہا اور زنجیر چھنکاتا ہوا سامنے آ گیا۔ وہ خالی ہاتھ تھا اور زنجیر اس کے ہاتھ میں بندھی ہتھکڑی کے دوسرے حلقے سے گزر رہی تھی۔ میں نے پستول تھام لیا کیونکہ کلاشنکوف بندھے ہاتھوں سے استعمال کرنا ذرا مشکل کام تھا۔ فتح خان مجھے دیکھ کر مسکرایا۔ ”مجھے یقین تھا کہ تم آس پاس ہی ہوگا۔“

”تمہیں توقع ہو گی کہ میں تمہیں بچاؤں گا۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔ ”حالانکہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔“

”مجھے توقع نہیں ہے لیکن تم کو جانتا ہے تم رک گیا کہ دیکھے معاملہ کیا ہے۔“

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ مجھے اسی تجسس نے روک لیا تھا ورنہ اس حالت میں فرار بھی مشکل نہیں تھا۔ میں نے پستول اسی کی طرف رکھا اور پوچھا۔ ”ہتھکڑیوں اور بیڑی کی چابی کہاں ہے؟“

”اس کے پاس ہو گی۔“ فتح خان نے، مردہ بیرم خان کی طرف اشارہ کیا۔ ”اس نے میری تلاشی لے کر سب لے لیا تھا۔“

”تم اس کے ہاتھ کیسے آئے؟“

”اس نے دھوکا کیا۔ لیزر لائٹ سے ایسا دھوکا دیا کہ میں آدمی سمجھا اور اس پر فائر کر دیا۔ پیچھے سے اس داؤس نے رائفل کا بٹ مارا جو شانے پر لگا۔ گوشت پھٹ گیا اور ابھی تک یہ ہاتھ ٹھیک سے کام نہیں کر رہا۔“ اس نے اپنے زخمی شانے کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے جلال کا بتایا تھا کہ اس نے اس پر رائفل کا بٹ آزمایا تھا۔ جلال کی لاش اور اس کے نیچے انگارے ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ بیرم خان کے سینے پر پورا برسٹ لگا تھا اور وہ شاید فوراً ہی مر گیا تھا مگر اوپر سے آنے والے نے خاصی مشکل سے جان دی تھی کیونکہ دو گولیاں اس کے پیٹ اور ران پر لگی تھیں اور وہ خون بہنے سے مرا تھا۔ اسی وجہ سے اسے اتنا موقع ملا کہ وہ بیرم خان کو مار سکے۔ بیرم خان چلیے اور چہرے مہرے سے پڑھا لکھا شخص لگ رہا تھا۔ وہ یقیناً انگلینڈ میں اچھی زندگی گزار رہا ہو گا مگر لالچ اور انتقام کی خواہش نے اسے مردادیا تھا اور اب اس کی لاش یہاں بے گور و کنفرن پڑی تھی اور اگر اس کے اہل خانہ تھے تو ان کو کچھ علم نہیں تھا۔ میں فتح خان سے مطمئن نہیں تھا اس لیے میں نے سب سے پہلے ہتھیاروں کا جائزہ لیا کہ ان میں سے کوئی اس کے ہاتھ تو نہیں لگا ہے پھر حفظہ ما تقدم اس کی تلاشی لی۔ مگر اس کے پاس کچھ نہیں تھا اس کے بعد

جاتا لیکن فتح خان اب میں اپنے ساتھیوں پر مزید کوئی افتاد برداشت نہیں کر سکتا۔

فتح خان خاموشی سے سن رہا تھا۔ میں جذباتی ہو گیا تھا۔ جب میں خاموش ہوا تو شاید میرا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور میرا بلڈ پریشر بڑھ گیا تھا۔ اس نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”تو تم نے فیصلہ کر لیا ہے۔“

”ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”فتح خان اب میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتا۔ یہ قصہ اب یہیں ختم ہو جانا چاہیے۔“

”کیا کرے گا مجھے بھوکا پیاسا مرنے کے لیے یہیں چھوڑ جائے گا؟“ اس کا لہجہ کسی قدر تلخ ہو گیا۔

”میں کسی انسان کے ساتھ اتنا انسانیت سوز سلوک نہیں کر سکتا۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں اس کے مقابلے میں ایک گولی استعمال کرنے کو ترجیح دوں گا۔“

”تب دیر کس بات کا ہے گولی استعمال کرو اور جاؤ۔“ فتح خان نے کہا۔ میں اس کی بات کا جواب دینے کی بجائے ناشتے کی تیاری کرنے لگا۔ میں نے چائے بنائی اور نان کے ساتھ فتح خان کو دی اور خود بھی کھائی۔ اس دوران میں دھوپ یہاں تک آ چکی تھی اور آس پاس خوب روشنی ہو چکی تھی۔ ناشتے کے بعد میں کھڑا ہوا تو فتح خان کا چہرہ مست گیا تھا اس نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کہا۔

”شہباز کیا تم سچ سچ مجھے قتل کر دے گا؟“

”کیا تمہیں شک ہے؟“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”اپنی آخری خواہش بیان کر دو۔“

اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا اور پھر ہنسا۔ ”تم کیا سرکار ہے جو سزائے موت دینے سے پہلے آخری خواہش پوچھ رہا ہے؟“

”میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں اپنی آخری خواہش بیان کر دو۔ میرے بس میں ہوا تو میں ضرور پوری کروں گا۔“

وہ کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ ”اگر ایسا ہے تو شہباز خان مجھے ہیرا لادو۔ یہ میرا آخری خواہش ہے۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”فتح خان اب بھی وقت ہے سوچ لو اور کوئی اور خواہش کر دو۔“

”نہیں میرا یہی خواہش ہے۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”تمہاری مرضی۔“

میں شمالی ڈھلان کی طرف بڑھا تھا کہ فتح خان نے عقب سے پوچھا۔ ”شہباز تم ہیرا لانے جا رہا ہے؟“

”ہاں... تمہاری... آخری... خواہش... پوری کرنے۔“ میں نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔ شمالی ڈھلان ابھی

جانوروں کی دسترس سے دور تھیں۔ میں واپس آیا تو فتح خان پوری بوتل خالی کر چکا تھا۔ بہر حال وہاں اور پانی بھی تھا۔ میں نے چائے کا پانی چڑھایا اور بیرم خان مرحوم کے خوراک کے ذخائر کا جائزہ لیا۔ اس میں بہترین ٹونا فش، فرائی آلو، مٹر، حلال گوشت اور انٹاس کے پیک ٹن، کولڈ ڈرنک اور کافی چائے دونوں کا مکمل سامان تھا۔ میں کافی دیکھ کر خوش ہو گیا اور فوراً چائے بنانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ کافی تیار کر کے میں نے ایک گگ فتح خان کو دیا اور دوسرا خود سنبھال لیا۔ اس نے منہ بنا کر گونٹ لیا اور بولا۔

”اب تم کیا کرے گا؟“

”سوچا نہیں ہے ممکن ہے تمہیں اسی طرح چھوڑ جاؤں یا پھر ایک گولی مار کر تمہارا قصہ پاک کر دوں۔“

اس نے اپنی منگولوں جیسی آنکھیں سکیڑ کر پوچھا۔ ”تم اپنی دھمکی بریل کرے گا۔“

”میں دھمکی نہیں دیتا ہاں جو کرنا ہوتا ہے وہ کر گزرتا ہوں۔ فتح خان میں نے تم کو بہت چھوٹ دی۔ بار بار کہا کہ میرے راستے میں مت آؤ مگر تم نہیں مانے۔ ایک احمقانہ خیال کے تحت تم میرے پیچھے لگے رہے۔ ٹھیک ہے ہیرے اس وادی میں ہیں لیکن انہیں صرف میں ہی تلاش کر سکتا ہوں۔ تمہارے اس خناس نے مجھے بہت مشکلات سے دوچار کیا۔ صرف مجھے نہیں میرے ساتھیوں کو بھی اور وہ اس بات پر برا فروخت رہے ہیں کہ میں تمہیں چھوٹ کیوں دیتا رہا ہوں۔“

”چھوٹ تو میں بھی دیتا رہا ہوں۔“

”ہاں لیکن اپنے مفاد کے تحت۔“ میں نے کہا۔ ”میرا تم سے کوئی مفاد نہیں تھا۔ تم نے مجھ پر ذاتی حملے کیے۔ میری حویلی میں اس کر سوریہ کو اغوا کیا۔“

”تم نے بھی شینا کے ساتھ اچھا نہیں کیا۔“ وہ بولا۔

”میں نے حساب برابری...“

”نکو اس مت کرو۔“ میں اس کی بات کاٹ کر بولا۔

”سوریا اور شینا کا موازنہ مت کرو اس کا کردار تم خود بھی جانتے ہو اور اسی لیے تم نے اسے قتل کیا۔ پھر تم مسلسل میرے ساتھیوں کے پیچھے پڑے رہے۔ بھی تم مرشد اور کبھی ڈیوڈ شائے کے گماشتے بن کر میرے خلاف میدان میں رہے۔ حد یہ کہ تم نے نشی دل جی جیسے گھٹیا شخص سے بھی اتحاد کر لیا۔ تمہاری وجہ سے ہمارا منصوبہ ناکام ہوا۔ سو سے زائد افراد مارے گئے، اور سب سے قیمتی فرد بیوہ تھا۔ تمہارا کیا خیال ہے میں ہمیشہ اسی طرح یہ سب بھول جاؤں گا۔ شاید میں بھول بھی

تک سائے میں تھی مگر درختوں تلے روشنی ہو گئی تھی۔ مجھے اس درخت تک پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں پیش آئی جس کے تنے کے سوراخ میں اُلونے گھونسلایا بنایا ہوا تھا اور اسی اُلوکی باقیات وہاں زمین پر بکھری ہوئی تھیں۔ میں نے جڑ کے خلا میں ہاتھ ڈالا اور کسی قدر دقت سے وہ سیاہ دھاتی بکس نکال لیا جس میں وہ تابیاب ہیرے تھے جو روس کی ملکہ کی تھیں کے خزانے میں شامل تھے۔ انہیں ملکہ کے آنسو کہا جاتا تھا۔ ان کے علاوہ تیس تابیاب اور قیمتی ہیرے تھے۔ یہ ہیرے ایک روسی جنرل کے ہاتھ لگے اس نے افغانستان میں کمانڈ کی تھی۔ ان ہیروں کا سوئٹزر لینڈ کے کسی دولت مند سے سودا کیا اور برٹش شہ نے ان ہیروں کو پہنچانے کی ذمہ داری لی تھی۔ مگر برٹش شاہ کی شامت کہ اس نے فتح خان جیسے شخص کی خدمات حاصل کیں اور نہ صرف ہیروں بلکہ اپنی جان سے بھی ہاتھ دھولے تھے۔

میں اس سیاہ بکس کو دیکھ رہا تھا جو سالوں سے تنے کے سوراخ میں پڑا ہوا تھا۔ جب میں نے اس میں ہاتھ ڈالا تب بھی وہاں موجود تھا مگر جب فتح خان نے مجھے لکارا تو میں نے سیاہ بکس کی بجائے انڈا نکالا اور جب اسے رکھنے لگا تو صفائی سے سیاہ بکس نکال لیا۔ میرا پاؤں جڑ کے خلا میں گیا تو میں نے گرتے ہوئے پاؤں کھینچنے کے بہانے سیاہ بکس اس خلا میں ڈال دیا یہی وجہ تھی کہ وہ جلال کو تنے کے سوراخ میں نہیں ملا تھا۔ میں اسے لے کر واپس روانہ ہوا۔ اصولاً یہ ہیرے ایمین کو ملنے چاہیے تھے اگرچہ اس کی ملکیت بھی نہیں تھی۔ اس کے باپ کو کسی کو پہنچانے تھے۔ مگر مجھے برٹش شاہی ساکھ اور اس سربیس دولت مند کی کوئی پروا نہیں تھی جو ان ہیروں کی قیمت ادا کر چکا تھا۔ میں واپس آیا تو فتح خان کی حالت دیدنی تھی سیاہ بکس دیکھ کر وہ اچھل پڑا۔ ”یہ تمہارے پاس تھا تم دھوکا دے رہا تھا؟“

”فتح خان مجھے اس دولت یا اس سے کہیں زیادہ دولت کے لیے بھی کسی کو دھوکا دینے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ اس سے ہزاروں لاکھوں گنا زیادہ قیمتی میری جان ہے۔“ میں نے سیاہ بکس اس کی طرف اچھال دیا۔ اس نے کچھ کیا اور مایوسی سے ہلا۔

”فائدہ، جب میں مرجاؤں گا۔“

”فتح خان موت کی صورت الگ ہوتی ہے اور وہ صرف میری نہیں کسی بھی صورت میں آسکتی ہے۔ اسے اپنے وقت پر آنا ہوتا ہے اور انسان اس وقت سے ناواقف ہوتا ہے۔“

”تم نے کہاں چھپایا تھا؟“ میں نے اسے بتایا کہ سیاہ بکس کہاں تھا اور میں نے اس کے ساتھ کیا ہاتھ کی صفائی دکھائی تھی۔

”اب تم کیا کرے گا مجھے مارے گا اور ہیرا لے جائے گا؟“ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔

”ظاہر ہے جب تم مرجاؤ گے تو یہ تمہارے لیے بیکار ہو جائیں گے۔“ میں نے سر ہلایا۔ ”تب میں انہیں لے جاؤں گا۔“

”شہباز خان یہ تو چالاکی ہوا۔“

”نہیں فتح خان چالاکی تم نے کی۔ میں نے تم سے آخری خواہش کا اسی لیے پوچھا تھا کہ میں اسے پورا نہ کر سکوں تو تم بیچ جاؤ مگر تم نے چالاکی سے کام لیتے ہوئے ہیرے مانگ لیے جو تمہارے خیال میں، میں نہیں لاسکتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے تمہیں موقع دیا اور تم نے اصرار کر کے وہ بھی گنوا دیا۔ تو چالاکی میں نے کی یا تم نے؟“

”ٹھیک کہا تم نے چالاکی میں نے کی اور اب سزا بھی مجھے ملے گی۔“ فتح خان نے سنجیدگی سے کہا۔ ”شہباز مجھے مرنے کا کوئی افسوس نہیں ہے کیونکہ میں ایک بہادر دشمن کے ہاتھ سے مارا جاؤں گا۔“

میں نے پستول نکالا اور فتح خان کے پاس چلا آیا اس نے گھنٹوں کے بل بیٹھتے ہوئے اپنا سر جھکا لیا تھا میں نے پستول کا رخ اس کے سر کی طرف کیا تو نہ جانے کیوں میرے ہاتھ میں لرزش آئی تھی۔ اس سے پہلے جب میں نے کسی پر گولی چلائی تو میرا ہاتھ نہیں لرزتا تھا کیونکہ میں جانتا تھا کہ میں جوئل کر رہا ہوں وہ اپنی زندگی کے لیے کر رہا ہوں اور مجھے اپنے دفاع کا حق بھی ہے۔ مگر اس بار میں خود کو آمادہ نہیں کر پارہا تھا۔ فتح خان نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ میں نے دل کڑا کر کے لگا تار تین گولیاں چلائیں اور پلٹ کر چل پڑا۔ میں مزید نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بس آخری منظر یہ تھا کہ فتح خان گر گیا ہے۔ میرا سر گرم ہو رہا تھا اور قدم خود بخود تیز اٹھ رہے تھے۔ میں نے ہیروں والی بکس نہیں اٹھایا تھا۔ مجھے ان ہیروں سے نفرت محسوس ہو رہی تھی جو نہ جانے کتنے انسانوں کی موت کی وجہ بنے تھے۔ تالے تک آیا تو اس میں پانی تابیاب تھا۔ پانی کی تلاش میں مجھے کچھ آگے جانا پڑا تھا۔ ایک جگہ کچھ پانی جمع تھا۔ میں نے جھک کر اس سے منہ پر چھینے مارے اور سر پر ڈالا تاکہ میرے سر کی گرمی کچھ کم ہو۔

کچھ دیر میں اس بیخ پانی سے خود کو سرد کرنا رہا اور پھر کھڑا ہوا۔ پانی نے میری گرمی دور کر دی تھی اور اب میں پُر

آیا ہوا تھا اس لیے ملزم اردو استعمال کرنے پر مجبور تھا۔ وہ خالص سلطان راہی اسٹائل میں بڑکیں مار رہا تھا۔ مگر گالیاں وہ پولیس ڈکشنری سے ہی دے رہا تھا۔ اس شور سے مجھے لگ رہا تھا جیسے میرا سر یک دم بہت نازک ہو گیا ہو اور شور کسی ٹھوس شے کی طرح اس سے ٹکرا رہا ہو۔ مارنے والے نے رحم دلی کو بالائے طاق رکھ کر وار کیا تھا اور غالباً اسے میرے پاس موجود خطرناک اسلحے سے خدشہ تھا کہ وار بھاری ہو گیا تو میں جوابی کارروائی میں اسے یقینی طور پر فوت کر دوں گا اس لیے اس نے میرا سر پھاڑ ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو حوالات کا کرا ایک لمحے کو گھوما تھا اور پھر اپنی جگہ قائم ہو گیا۔ سر سے بہنے والا خون میری گدی تک آیا تھا اور یہ اچھی بات تھی ورنہ وار کی قوت اتنی تھی کہ اگر میرا سر نہ پھٹتا تو اندرونی جریان خون کا مسئلہ ہو سکتا تھا۔ میں بہ مشکل اٹھ کر بیٹھا اور پھر کونے میں رکھے پانی کے گھڑے سے پانی نکال کر پیا تو طبیعت میں بہت افاقہ ہوا تھا۔ اسلحے سمیت میرا پرس اور تمام چیزیں غائب تھیں صرف کپڑے اور جوتے ان لوگوں نے ہٹائیں کیسے چھوڑ دیئے تھے۔

میں پانی پی کر ایک طرف دیوار سے ٹک کر بیٹھ گیا کیونکہ اس دیہاتی تھانے کے حوالات میں فرش پر درمی بھی نہیں تھی۔ سوال یہ تھا کہ مجھے یہاں لایا کون تھا؟ آیا کہ یہ کارنامہ خیر پولیس والوں نے خود انجام دیا تھا یا جو کیدار کے لواحقین نے مجھے قاتل سمجھ کر بے ہوش کر کے پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔ بہر حال یہ طے تھا کہ میں ملزم کی حیثیت سے یہاں آیا تھا اور میرے کسی بھی عمل کا ردعمل بہت شدید ہو سکتا تھا۔ اس لیے مجھے جو کرنا تھا آگے کا سوچ سمجھ کر کرنا تھا۔ میں نے خود سے شور کرنے اور آئیل مجھے مار کہنے سے گریز کیا۔ کچھ دیر بعد ایک کانسٹیبل نے اندر جھانکا اس کی قمیص آدھی پتلون سے باہر تھی اور اس نے بیٹ بھی نہیں باندھی ہوئی تھی۔ وہ سوتے سے اٹھ کر آیا تھا اور مجھے بیدار دیکھ کر اس نے پہلے بلند آواز سے جماعی لی اور اس سے بھی بلند آواز سے بولا۔ ”بندے کو ہوش آ گیا ہے۔“

”میں کہاں ہوں؟“ میں نے سوال کیا تو اس نے استہزایہ انداز میں جواب دیا۔

”تجھے باہر شور سنائی نہیں دے رہا اور یہ وردی دکھائی نہیں دے رہی ہے کیا؟“

”میرا مطلب ہے کہ میں کون سے تھانے میں ہوں؟“

سکون تھا۔ میں بوتل ساتھ نہیں لایا تھا کیونکہ آگے مجھے پانی ملتا رہتا۔ ذرا آگے جا کر ٹالا گھومنا شروع ہوا تو اس میں دائیں بائیں سے آنے والے کچھ ٹالوں کا پانی شامل ہونے لگا تھا اور اب اس نے ندی کی صورت اختیار کر لی تھی۔ میری کوشش تھی کہ جلد از جلد ہل تک پہنچ جاؤں اور پھر اس جگہ سے روانہ ہو جاؤں کیونکہ مجھے اس سے وحشت ہو رہی تھی۔ ندی میں پانی کم ہونے سے مجھے سفر کرنا آسان لگ رہا تھا۔ آگے پانی زیادہ ملتا تو مجھے کناروں پر سفر کرنا پڑتا اور اس سے رفتار ذرا کم ہو جاتی۔ ایک گھنٹے بعد میں نصف راستہ طے کر چکا تھا۔ اس سے آگے ہل تک پہنچنے میں مجھے مزید ڈیڑھ گھنٹا لگا تھا اور تب تک آسمان بادلوں سے بھر گیا تھا۔ یہ گزشتہ دو دنوں سے پڑنے والی تیز دھوپ اور گرمی کا لازمی نتیجہ تھا۔ اس سے پہلے کہ بارش شروع ہوتی میں ہل کے چوکیدار کی کونٹری تک پہنچ گیا تھا۔ جیب اپنی جگہ موجود تھی۔ میں نے کونٹری کا دروازہ کھٹکھٹایا مگر اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے دروازہ دھکیلا تو وہ کھل گیا اور فوراً ہی اندر سے ایک کراہت آمیز بو آئی۔ یہ سڑھتے ہوئے خون اور گوشت کی بو تھی۔ اندر کھیاں بھن بھنار ہی تھیں۔ میں نے دل کڑا کر کے اندر جھانکا تو چوکیدار اپنے خون میں غطالیاں فرش پر اونڈھے منہ پڑا ہوا تھا۔ اسے مرے ہوئے کم سے کم تیس پینتیس گھنٹے گزر چکے تھے۔ اب نہیں معلوم کہ یہ فتح خان کا کام تھا یا بیرم خان کا۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر پیچھے ہٹا تھا کہ کسی نے عقب سے میرے سر پر وار کیا اور بے ہوش ہونے سے پہلے میں نے سنا۔ ”قاتل کا بچہ کیسے ہاتھ آیا؟“

☆.....☆

لگ۔ ایسا رہا تھا کہ پیچھے بیرم خان یا فتح خان کا کوئی آدمی رہ گیا تھا اور اسی نے میرے سر پر وار کر کے مجھے ہوش و حواس سے بیگانہ کیا تھا۔ مگر جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو تھانے میں پایا۔ آنکھیں کھولنے سے پہلے مجھے اس کا پتا چل گیا تھا کیونکہ تھانے میں دن دہاڑے ایک چور سے اعتراف رانے کی کوشش کی جا رہی تھی کہ اس نے خان کی گھوڑی ہزائی ہے۔ اعتراف جرم کرانے والے اس سے گھوڑی برآمد کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ میں ملزم کے ساتھ زور و شور سے تفتیش جاری تھی۔ زور پولیس والوں کا تھا اور شور میں یہ ملزم کا۔ ہر لڑکے جس کی آواز الگ سے سماعت تک آ رہی تھی وہ دل خراش بیچ کے ساتھ دہائی دیتا اور مصرع طرح کے بطور پردھراتا۔ ”اف ام مرگئی..... بالکل مر گئی۔“

یہاں کی مقامی زبان پشتو تھی مگر تھانیدار پنجاب سے

تھا۔“

”صرف چوکیدار کا قتل نہیں ہوا ہے۔ اس کی بیوی بھی غائب ہے۔ اسے کہاں لے گئے تم اور اس کے ساتھ کیا کیا؟“ کہتے ہوئے ایس ایچ او کے اندر کی खाياٹ لہجے میں آگئی۔ ”وہ کہاں ہے مرگئی ہے یا کہیں پڑی ہے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ میں چوکیدار کی بیوی کے بارے میں نہیں جانتا۔ دو دن پہلے میں یہاں آیا تھا اور جیب اس کے پاس چھوڑ کر چلا گیا۔“

”ملک صاحب ایسے کام نہیں چلے گا۔“ ایس ایچ او نے چالاکی سے کہا۔ ”تمہارے پاس کوئی شناختی دستاویز بھی نہیں ہے۔ اسلام آباد نمبر کی جیب لے کر گھوم رہے ہو۔“

”میرے شناختی کاغذات جیب سے ندی میں گر گئے۔“

”جیب بھی کسی شاہین ایاز کے نام پر ہے۔“

”ایاز میرا دوست ہے اور شاہین اس کی بیوی ہے جیب اسی کے نام پر ہے۔“

ایس ایچ او اب تک مجھ سے محتاط انداز میں بات کر رہا تھا غالباً اس نے اندازہ کر لیا تھا کہ میں چلتا پھرتا آدمی نہیں ہوں۔ یہ چھوٹا دیہاتی علاقہ تھا اور یہاں وہ کسی اثر د رسوخ والے بندے کے ساتھ زیادتی کر جاتا تو اسے آگے جواب دینا مشکل ہو جاتا۔ اس نے میز کے نیچے سے رائفل اور پستول اٹھا کر سامنے رکھ دیئے۔ ”تمہارے پاس سے یہ اسلحہ نکلا ہے۔ اس کا لائسنس کہاں ہے؟“

”بدقسمتی سے لائسنس بھی کاغذات کے ساتھ ندی میں ہی گر گیا۔“ میں نے کہا۔ ”ویسے یہاں ہر دوسرا بندہ ایسے ہی اسلحہ لے کر گھومتا ہے ان سے پوچھا بھی۔“

”ادھر والوں کو اجازت ہے۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ ”ملک صاحب مجھے مطمئن کرو ورنہ میں تین سو دو اور اغوا کی ایف آئی آر کاٹنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔“

یہ تو اس کے انداز سے واضح تھا کہ وہ کس قسم کا اطمینان چاہتا تھا۔ اسے چوکیدار یا اس کی کم شدہ بیوی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ وہ اپنی خوش قسمتی سمجھ رہا تھا کہ اس کیس میں پھنسانے کے لیے اسے ایک ایسا مرعہ ہاتھ آ گیا جس سے وہ خاصا مال کھینچ سکتا تھا۔ اس جگہ مال کمانے کے مواقع نہ ہونے کے برابر تھے۔ کیونکہ یہاں جن کے پاس پیسا تھا وہ اس جیسے تھانیدار کو جوتے کی نوک پر رکھتے ہوں گے اور باقی غریب غربا کے پاس کیا تھا زیادہ سے زیادہ اسے یہاں مرغ مسلم مل جاتا ہوگا۔ یقیناً اسے اپنی کسی غلطی کی وجہ سے

فروری 2015ء

175

”تجھے جلد پتا چل جائے گا۔“ اس نے کہا اور اپنی قمیص پتلون میں کرتا چلا گیا۔ غالباً تھانے میں ملزم کم تھے اور ان کو تختہ مشق بنانے کے لیے کم لوگ ملتے تھے اس لیے میری باری جلد آگئی۔ دو سپاہی آئے ایک نے لاک اپ کا دروازہ کھولا اور مجھے باہر آنے کا اشارہ کیا۔ جیسے ہی میں باہر آیا دوسرے نے مجھے بازو سے پکڑ لیا۔

”آرام سے میں بھاگ نہیں رہا اور نہ ہی بھاگنے والوں میں سے ہوں۔“ میں نے ذرا دبنگ لہجے میں کہا۔ مگر اس میں بد معاشی کا تاثر شامل کرنے سے گریز کیا۔

”کون اے تم جو اس طرا بات کرتا اے۔“ مجھے پکڑنے والے سپاہی نے کسی قدر مرعوب ہو کر کہا۔

”مجھے ایس ایچ او کے پاس لے چلو۔“

”اس کے پاس ہی لے جا رہے ہیں۔“ دوسرا معنی خیز انداز میں بولا۔ ایس ایچ او خالص پولیس والا تھا۔ اس کی توند کا حجم بتا رہا تھا کہ اس کی پرورش کیسے کی گئی تھی۔ وہ ایسی سفید رنگت رکھتا تھا جس میں اعمال کی سیاہی شامل ہو گئی تھی۔ کسی قدر بڑھی شیو اور سرخ آنکھوں کے ساتھ وہ خطرناک تھانیدار لگ رہا تھا۔ جب تک سپین ملزم کے ساتھ گفتیش جاری تھی اس نے لٹچ میں سالم مرغا تناول فرمایا تھا اور اس وقت ماچس کی تیلی سے خلال میں مصروف تھا۔ گھوڑی چور غالباً عارضی رخصت پر تھا اور اس دوران میں مجھے طلبہ کر لیا تھا۔ میں نے ایس ایچ او سے پوچھا۔

”مجھے اس الزام میں پکڑا ہے۔“

”الزام بھی بتا دیں گے۔“ اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ”پہلے اپنا تعارف تو کراؤ۔“

”میرا نام شہباز ملک ہے اور میں یہاں سیاحت کے لیے آیا ہوں۔“

”اس پل کے آس پاس کون سی جگہ ہے سیاحت والی؟“ اس کے لہجے کی معنی خیزی بڑھ گئی۔

”میر ندی کے ساتھ ساتھ ٹریک پر گیا تھا۔ اپنی جیب پل کے چوکیدار کی رکھوالی میں چھوڑ گیا تھا۔ واپس آیا تو کوٹھری میں اس کی لاش پڑی تھی اور پھر کسی نے مجھے سر پر دار کر کے باہر ہوش کر دیا۔“

”اپنے شریف شاہ نے کام کیا تھا۔“ ایس ایچ او نے مجھے لانے والے سپاہی کی طرف اشارہ کیا۔ ”بڑا ظالم ہاتھ مارتا ہے۔“

”اگر تمہارا خیال ہے کہ میں نے چوکیدار کو قتل کیا ہے تو تم غلطی پر ہو یہ کام کسی اور کا ہے اور اپنی جیب لینے آیا

ماہ نام سرگزشت

سم موبائل میں لگائی اور ندیم کا نمبر ملایا۔ اس نے پہلی نسل پر اٹھالیا اور ہانپتے ہوئے بولا۔ ”تو زندہ ہے۔“

”حسب معمول اور اللہ کے فضل سے۔“

”مار کو پولو کے گھوڑے، ابن بطوطہ کے فخر سنا ہے تو آتے ہی دولتیاں جھاڑتا ہوا شمالی علاقے کی طرف بھاگ نکلا۔ اب کہاں ہے؟“

”تھانے میں۔“ میں نے کہا تو ندیم نے اتنا بلند بانگ قبچہہ مارا کہ تھانیدار نے بھی سنا۔

”مجھے معلوم تھا تیرا یہی انجام ہونا ہے ایک دن، جتنے دی کھوتی اوتھے آن کھلوی۔“

”کو اس مت کر، یہاں ایک چودھری صاحب کرتا دھرتا ہے اور تین سو دو کے کیس میں مجھے شامل کرنا چاہتے ہیں۔ ساتھ ہی کچھ مغویہ کا معاملہ بھی ہے، مگر یہ زبردفعہ دس لاکھ کے تحت بات ختم کرنے کو تیار ہیں۔“

ندیم سنجیدہ ہو گیا اس نے کہا۔ ”میری بات کرا۔“

میں نے، موبائل سلمان چودھری کی طرف بڑھا دیا۔ پہلے تو ان دونوں میں گرما گرمی ہوئی کیونکہ دونوں نے اپنی اپنی اوقات جتانے کی کوشش کی پھر ذرا اعتدال میں آئے اور بالآخر نرمی سے بات کرنے لگے۔ جب بات قبچہوں اور گپ شب تک آئی تو میں نے اشارے سے سلمان چودھری کو یاد دلایا کہ موبائل میں بیلنس بھی ہوتا ہے جو خرچ ہو جاتا ہے۔ بادل ناخواستہ اس نے موبائل میرے حوالے کیا اور ندیم نے کہا۔ ”میں نے سیٹنگ کر لی ہے تیرے کسی گھوڑے کو دوڑاتا ہوں۔ بارہ گھنٹے مزید یہاں رہ اور مرے کر۔“

”وہ تو کر رہا ہوں سر پھٹا ہوا ہے اور خون تک صاف نہیں ہوا ہے۔“

”سب ہو جائے گا، تو بے فکر ہو جا، بندہ واقف کار نکل آیا ہے۔ بڑی حرامی چیز ہے میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ بہر حال اب تیرے ساتھ کچھ نہیں ہوگا۔“

میں نے سم نکال کر موبائل اسے واپس کرنا چاہا تو اس نے کہا۔ ”رہیں جی ہو سکتا ہے آنے والا ساھی آپ سے رابطہ کرے۔“

ایک تھنٹے بعد میں مرہم پٹی کے بعد بیٹھا ہوا مرغ مسلم کے مزے اڑا رہا تھا۔ یہ دیکھی مرغ تھا مگر کسی ماہر نے سنا تھا۔ اس کے ساتھ شمالی علاقے میں ملنے والی گاڑھے وہی جیسی لسی تھی۔ یہ میرا لچ بھی تھا اور ذرا بھی جو میں نے شام کے وقت کیا۔ خوش قسمتی سے میرا لباس صاف تھا اس

لیے دوسرے کپڑوں کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ مجھے ایک چارپائی دی گئی تھی اور کھانے کے بعد میں دو عدد پینا ڈول لے کر اس پر محو استراحت ہو گیا۔ اس دوران میں عبد اللہ سے بات ہوئی تھی اور وہی رقم لے کر آ رہا تھا۔ میں نے احتیاطاً صرف کام کی بات کی اور وادی کے ایڈ وچر کا ذکر کرنے سے گریز کیا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ صبح تک پہنچ جائے گا۔ اس کے بعد میں سو گیا۔ رات کسی قدر سردی لگی مگر گزارا ہو گیا تھا۔ کھانے پینے کے ساتھ مجھے باقی سہولتیں بھی مہیا کی گئی تھیں مگر ہر جگہ ایک سپاہی میرے ساتھ لگا رہا۔ جیب تھانے کے احاطے میں موجود تھی۔ خلاف توقع رات سکون سے گزری کیونکہ یہاں نفیث دن میں ہو جاتی تھی۔

صبح فجر کی اذان پر آنکھ کھلی تو میں نے اٹھ کر سوتے سپاہی کو بلایا اور اس سے وضو کرانے کو کہا۔ وہ مجھے تھانے کے ہاتھ روم تک لایا۔ وضو کر کے میں نے نماز پڑھی اور دوبارہ سو گیا۔ دل مطمئن تھا کہ آج اللہ نے نماز کی توفیق دی۔ پھر میری آنکھ سپاہی کے ہلانے سے کھلی۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ”اٹھ جا میں جی تھانیدار جی بلاتی ہے۔“

تھانیدار جی کو مرغ سے خاص دل چسپی تھی کیونکہ ناشتے میں بھی مرغ پراٹھے تھے۔ اس نے مجھے ناشتے پر مدعو کیا تھا۔ مرغ پراٹھے، پھر لسی اور آخر میں شیرہ جیسی دودھ پتی کی چائے نے مزہ دیا۔ ندیم سے بات کرنے اور معاملے طے پانے کے بعد سلمان چودھری کا روپ بالکل بدل گیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا ٹورزم کا بزنس کہاں تک پھیلا ہوا ہے اور میں اسے مزید کہاں تک پھیلانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ اس نے کہا۔ ”ادھر سوات تک تو سارا بزنس تباہ ہو گیا تھا۔ اب کچھ رونق لگی ہے ورنہ دہشت گردی کے ڈر سے لوگوں نے آنا چھوڑ دیا تھا۔“

میں نے چوکیدار کے بارے میں کرید اتوا میں نے مبہم انداز میں بتایا کہ اس کی لاش مقامی اسپتال پہنچا دی گئی تھی اور پوسٹ مارٹم کے بعد اسے لواحقین کے حوالے کر دیا جاتا۔ البتہ اس کی بیوی کا کچھ پتا نہیں تھا۔ اب مجھے ایک خدشہ ستانے لگا تھا کہ کہیں اگر پولیس والے ندی کے ساتھ ساتھ ہوتے وادی تک چلے گئے تو انہیں وہاں مزید کئی عدد لاشیں ہاتھ آجاتیں اس کے بعد میری گلو خلاصی پھر کھٹائی میں پڑ جاتی۔ اسے قاتل کی فکر نہیں تھی کیونکہ اس علاقے میں قاتل جلد یا بدیر پکڑا ہی جاتا ہے۔ چوکیدار کی لازمی کسی سے دشمنی تھی۔ اب یہ خاندانی تھی یا بیوی کی وجہ سے تھی کیونکہ اس کے قتل کے بعد وہ بھی غائب تھی۔ پیسا اس میں ملوث نظر

قصہ بھی ختم ہوا۔ اس سے پہلے کہ وہ تفصیلات میں جاتا۔ میں نے اس سے کہا۔ ”سب جلد از جلد اس علاقے سے نکل جاؤ اور ندیم سے کہنا کہ سلمان چودھری کی کال کے لیے تیار رہے اسے نوٹی کرانی ہے۔“

”میں بتا دوں گا۔“ عبداللہ نے کہا اور مجھ سے گلے مل کر رخصت ہو گیا۔ جیب ٹھیک ٹھاک حالت میں تھی۔ اس میں میرا سامان بھی جوں کا توں تھا۔ پرس والی رقم بھی گئی تھی اس لیے میں نے عبداللہ سے کوئی تیس ہزار روپے لیے تھے۔ اگرچہ خاص ضرورت نہیں تھی مگر کہیں کام بھی پڑ سکتا تھا۔ اس کے بعد میں ہر ممکن تیزی سے راجا عمر دراز کے محل کی طرف روانہ ہو گیا۔ عبداللہ پہلے ہی مخالف سمت جا چکا تھا۔ دین کی تیز روشنی میں مجھے تیز رفتار ڈرائیونگ کرنے میں مدد ملی تھی اور دو گھنٹے بعد میں اس کی سڑک تک پہنچ گیا تھا جو راجا عمر دراز کی وادی تک جاتی تھی۔ درے کو کراس کر کے میں نے وادی میں قدم رکھا جہاں میں برسوں پہلے آیا تھا۔ یہاں کے ایک تخلص رہائشی نے مجھے اپنا مہمان بنایا تھا اور شینا اس کے معذور بوڑھے باپ کی تیسری بیوی تھی۔ اسی وادی سے میری مشکلوں کا آغاز ہوا تھا۔ اگرچہ مرشد اور نادر کا اس وادی سے کوئی تعلق نہیں تھا جو میری اور میرے ساتھیوں کی پرسکون زندگی میں عذاب بن کر آئے تھے۔ مگر بہت سے معاملات کا تعلق تو یہیں سے تھا۔

وادی میں داخل ہونے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ وہاں اب پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ بہتری آئی تھی۔ اتفاق سے میرا جب بھی آتا ہوا تو بائی اتر ہوا یا پھر رات کے وقت آیا گیا تھا اس لیے وادی کی حالت دیکھنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ آبادی تو اتنی ہی تھی اور لوگوں کا طرز زندگی بھی تقریباً وہی تھا یعنی گھٹے ہوئے ہوا بند گھروں میں رہنا، البتہ کھیتوں و باغات کی سرسبزی و شادابی میں اضافہ ہوا تھا۔ اب کھیت اور باغات پہاڑوں پر زیادہ اور تنگ چلے گئے تھے۔ بانی کی نالیوں میں اضافہ ہوا تھا اور مجھے کئی مقامات پر اسکول کی نئی عمارت نظر آئیں۔ جب میں راجا عمر دراز کے محل کی طرف جانے والی پختہ سڑک پر پہنچا تو اسے شاندار حالت میں پایا۔ یہ پتھروں اور سینٹ سے بنائی ہوئی بہت مضبوط سڑک تھی اور یقیناً مقامی کاوش سے تیار ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ بھی کئی سڑکیں تھیں۔

محل سے ذرا نیچے ایک عمارت پر اسپتال اور ڈسپنسری کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ یہ خاصی بڑی ہو گئی تھی اور اس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے خوشنما بنگلے بھی بنے ہوئے تھے جو یقیناً

نہیں آتا تھا۔ اس لیے سلمان چودھری بھی کیس پر توجہ دینے کی بجائے جلد از جلد مجھ سے معاملہ کر لینا چاہتا تھا۔ ایک لحاظ سے یہ اچھا ہی ہوا۔ کیونکہ اس کا امکان تھا کہ جلد وادی کی لاشیں مل جائیں گی اور پھر سلمان چودھری کا دھیان میری طرف جائے گا مگر اس کے پاس صرف ایک نام ہوگا۔ ندیم کا وہ کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ وہ اس کا رخ کرتا تو ندیم خود اس کے گلے پڑ جاتا۔ البتہ میں راجا عمر دراز کا نام لے لیتا تو اس کے پاس ایک سر ہوتا۔

عبداللہ نوبے آیا۔ وہ مسلسل ڈرائیونگ کرتا رہا تھا اور تھکا ہوا تھا۔ مجھ سے گلے مل کر اس نے سلمان چودھری سے کہا۔ ”مجھے ندیم صاحب نے بھیجا ہے میں ان کا نائب اکرم چشتی ہوں۔“

عبداللہ نے روانی سے جھوٹ بولا اور میرے ایک دشمن کا نام بیا جو اتفاق سے ایس ایچ او کا بیٹی بھائی تھا۔ سلمان چودھری نے حریص نظروں سے اس کے ہاتھ میں موجود بیگ دیکھا۔ ”بسم اللہ جی۔“

”جی، میرا سامان دیا جائے۔“ میں نے مطالبہ کیا۔ اس نے بلا حیل و حجت ہتھیار، ایجوٹیشن، پرس اور جیب کی چابیاں سامنے رکھ دیں۔ میں نے پستول لے کر بیٹ سے ڈکایا اور کلاشکوف سامنے کر لی مگر دونوں بغیر گولیوں کے تھیں اس لیے سلمان چودھری مطمئن تھا۔ مزید اطمینان کے لیے باہر ایک مسلح سپاہی موجود تھا۔ عبداللہ نے بیگ اس کے سامنے رکھا۔

”اپنی تسلی کر لیں ایس ایچ او صاحب۔“ اس نے بیگ کھول کر دیکھا اور پھر اندر موجود ہزار کی گڈیوں کا جائزہ لیا۔ مطمئن ہو کر اس نے بیگ بند کر دیا۔ ”ٹھیک ہے ملک صاحب ڈیل ہو گئی۔“

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ سر پھٹا، رات تھانے میں گزارنا پڑی اور دس لاکھ روپے بھی دیئے مگر میری پولیس سے جان چھوٹ گئی تھی۔ سلمان چودھری نے گرم جوشی سے رخصت کیا اور ساتھ ہی پیشکش بھی کی کہ اب میں جب یہاں سے گزروں تو اس کا مہمان ہوں گا اور اس کے تھانے کی حدود میں مجھے کوئی مسئلہ ہو تو وہ ذمے دار ہوگا۔ باہر آتے ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ اب یہاں سے گزروں گا بھی نہیں۔ عبداللہ جس گاڑی میں آیا تھا یہاں آتے ہوئے اس نے اس کی نمبر پلیٹس بدل لی تھیں اور واپسی کے سفر میں دوبارہ بدل لیتا۔ میں نے اسے مختصراً حالات بتائے اور یہ بھی کہ فتح خان سے چھکارا مل گیا ہے۔ وہ خوش ہوا تھا کہ یہ

کہا۔ ”اچھا ایسا کریں آپ بیگ صاحب سے بات کر لیں۔“

”اگر بیگ صاحب کو مجھ سے بات کرنی ہوتی تو وہ خود یہاں موجود ہوتے۔“ میں نے کہا اور اس سے لے کر اپنا بیگ واپس جیب کے عقبی حصے میں ڈال کر دروازہ بند کر دیا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ راجا عمر دراز کے محل میں میرا استقبال یوں ہوگا۔ اگرچہ اس سے پہلے بھی کئی بار میرے ساتھ یہاں برا سلوک ہوا تھا مگر وہ حالات اور واقعات کی مناسبت سے تھا۔ مگر اس طرح میرا استقبال کبھی نہیں ہوا تھا کہ صرف ایک خادم مجھے ریسیو کرے اور مجھے ایک الگ تھلگ عمارت میں لے جایا جائے۔ جب میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ رہا تھا تو میں نے خادم کو ایک چھوٹے واکی ٹاک کی نما آ لے پر کسی سے بات کرتے پایا۔ میں نے جیب موڑی اور گیٹ کی طرف روانہ ہو گیا مگر جب وہاں پہنچا تو گیٹ بند تھا اور میرے ہارن دینے پر بھی نہیں کھلا۔ یہ آٹو بینک مشین سے کھلنے اور بند ہونے والا گیٹ تھا۔ پہلے یہ مینول ہوا کرتا تھا مگر اب اسے آٹو بینک کر دیا گیا تھا۔ دوبارہ ہارن دینے پر چھوٹی سی چوکی سے گارڈ باہر آیا اور اس نے مؤذب لہجے میں کہا۔

”جناب بیگ صاحب خود یہاں آرہے ہیں۔ ان کی درخواست ہے کہ آپ ایک منٹ ان کا انتظار کر لیں۔“

”ٹھیک ہے لیکن ایک منٹ بعد یہ گیٹ کھل جانا چاہیے۔“

اس وقت میرا سر گرم ہو رہا تھا اور شاید چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ ایک منٹ تو نہیں مگر دو منٹ بعد بیگ اپنا عبا یا نما رنگین گاؤن لہراتا ہوا وہاں آن موجود ہوا اور اس نے مجھ سے آہستہ سے کہا۔ ”شہباز صاحب پلیز میرے ساتھ آئیے۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”آپ نے جو بات کرنی ہے یہیں کر لیں۔“

”ان ملازموں کے سامنے۔“

”اب تک سب ملازموں کے سامنے ہی ہوا ہے۔“

میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”تو اب کیا مانع ہے بات کرنے میں ہے۔“

غالباً بیگ ملازموں کے سامنے معافی سٹافی نہیں کرتا چاہتا تھا۔ یہ اس کی سکی کا معاملہ تھا۔ مگر میرے ساتھ جو ہوا تھا اس کے بعد میں اسے اتنی آسانی سے معاف نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا وہ ایک طرف لے جا کر مجھے منالے گا مگر میں

یہاں کام کرنے والے ڈاکٹروں کے لیے تھے۔ یہ سب راجا عمر دراز نے کرایا تھا۔ محل کے گیٹ پر حسب معمول دو مقامی افراد گارڈ کی وردی میں مستعد موجود تھے۔ ان میں سے ایک اندر رہا اور دوسرا باہر آیا۔ میں نے پہلی بار اسے دیکھا تھا اور اس نے بھی شاید پہلی بار مجھے دیکھا تھا اس لیے ادب سے بولا۔ ”جی صیب آپ کا نام کیا ہے کس سے ملنا ہے؟“

”میرا نام شہباز ملک ہے اور مجھے راجا عمر دراز صاحب سے ملنا ہے۔“

اس نے اندر والے گارڈ کو بتایا اور خود مستعد ہو کر گیٹ کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کے پاس ایک چھوٹی لیکن جدید ماڈل کی ایس ایم جی تھی۔ چند منٹ بعد گیٹ کھلا اور گارڈ نے ہنٹ سے کہا۔ ”صاحب آپ وہ سفید عمارت تک جاؤ۔“

محل کی عمارت سرخ کپھریل والی تھی مگر اب دائیں طرف باغ کے ساتھ ایک چھوٹی سفید عمارت بھی بن گئی تھی۔ پتھروں اور سفید ہی رنگ کے کپھریل سے بنی چھت کی اس دو منزلہ عمارت کا رقبہ چھ سات مرلے سے زیادہ نہیں تھا اور بہ ظاہر یہ گیٹ ہاؤس جیسی لگ رہتی تھی۔ میں نے جیب اس کے سامنے روکی تو اندر سے ایک خادم برآمد ہوا جس نے راجا کے محل کے خادموں والی مخصوص یونیفارم پہن رکھی تھی۔ اس نے دروازہ کھولا اور جب میں نیچے اترا تو اس نے پوچھا۔ ”جناب سامان ہے؟“

”ہاں بھئی موجود ہے۔“

اس نے عجبی دروازہ کھول کر میرا بیگ نکال لیا۔ اسلحہ دیکھ کر وہ ٹھنکا اور پھر اس نے بدستور ادب سے کہا۔ ”جناب یہاں کسی باہر سے آنے والے کو اسلحہ رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔“

میں پہلے ہی اس استقبال پر کھڑکا ہوا تھا اور اس کی یہ بات سن کر میرے اندر غصہ سرسرا نے لگا۔ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میں پہلی بار نہیں آیا ہوں اور میں نے ہمیشہ اپنا اسلحہ اپنے پاس رکھا ہے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں جناب لیکن اب اصول بدل گیا ہے۔ آپ کو یہ اسلحہ یہاں جمع کرانا ہوگا آپ کو واپسی میں لے جائے گا۔“

”اسلحہ جمع کرانے کی بجائے میں واپس جانے کو ترجیح دوں گا۔“ میں نے کہا۔ میرا غصہ بڑھنے لگا تھا۔ ”میرا بیگ واپس رکھ دو۔“

”جناب آپ غصہ نہ کریں۔“ اس نے عاجزی سے

اپنے پاس رکھا اور کلاشکوف بیگ کے حوالے کر دی۔ میں نے کہا۔ ”پستول چوبیس گھنٹے میرے پاس ہوتا ہے اور اس کے چوری یا گم ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔“ بیگ بادل ناخواستہ اس کے لیے آمادہ ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ”لیکن پستول سامنے نہ ہو۔“

یوں معاملات سیٹ ہو گئے۔ ہم اندر آئے اور خادم نے ایک پڑعیش قسم کے کمرے میں میرا بیگ رکھا اور مجھ سے چائے پانی کا پوچھا۔ بارہ بج رہے تھے ابھی لنچ میں وقت تھا۔ بیگ مجھ سے کچھ رسمی گفتگو کر کے رخصت ہو گیا مگر اس نے راجا عمر دراز سے میری ملاقات کے بارے میں بھاپ نہیں نکالی تھی اس معاملے میں اس کا رویہ حسب سابق تھا۔ میں نے خادم سے قہوہ لانے کو کہا اور خود بستر پر دراز ہو گیا۔ چند دنوں کی تھکن تھی جو اب تک جسم میں موجود تھی۔ چند منٹ بعد قہوہ آ گیا اور ساتھ ہی خادم نے دریافت کیا۔ ”جناب آپ لنچ کب پسند کریں گے؟“ خادم کے پوچھنے سے ظاہر تھا کہ لنچ مجھے اکیلے کرنا تھا ورنہ مجھے وقت بتایا جاتا۔ ”ایک بجے اور یہیں کمرے میں۔“

اس نے سر ہلایا اور رخصت ہو گیا۔ قہوہ محل کا خاص مشروب تھا اور اسے پی کر طبیعت تازہ دم ہو جاتی تھی۔ میں نے بیگ سے دوسرے کپڑے نکال کر استری کروائے اور غسل کر کے جسم سے میل اتارا۔ تازہ دم ہوا تھا کہ لنچ ٹھیک ایک بجے آ گیا اور بہت پُرکلف قسم کا تھا۔ میں نے اس سے بھرپور انصاف کیا۔ اس کے بعد فطری طور پر خمار طاری ہونے لگا۔ سونے سے پہلے میں نے عبد اللہ کو کال کر کے اپنے خیریت سے پہنچ جانے کی اطلاع دینا چاہی تو پتا چلا کہ موبائل پر سگنل نہیں ہیں۔ مجھے یاد آیا کہ یہاں موبائل سروس نہیں ہے۔ محل میں تمام تر رابطہ لینڈ لائن فون، انٹرنیٹ اور سیٹلائٹ فون سے تھا۔ حالانکہ اس وادی کی اچھی خاصی آبادی تھی اور یہاں موبائل کی سروس ہونی چاہیے تھی کیونکہ یہاں بے شمار لوگ ملازمت کے لیے باہر گئے ہوئے تھے اور ان کا رابطہ موبائل سے ہی آسانی سے ہو سکتا تھا۔

میں اٹھ کر کال کرنے کا ارادہ کر کے سو گیا۔ میں تقریباً دو بجے سویا تھا۔ میں چھ سات بجے تک آرام سے جاگ جاتا۔ مجھے دن میں اس سے زیادہ سونے کی عادت نہیں تھی مگر جب میری اسلحہ کھسکی تو رات کے نو بج رہے تھے۔ میں حیران ہوا تھا کیونکہ مجھے دن میں اتنی طویل نیند کی عادت نہیں تھی اور نہ ہی تھکن اتنی زیادہ تھی کہ میں بے خبر سوتا

چاہتا تھا کہ وہ بیگام سب کے سامنے کرے۔ بیگ کے چہرے پر مسکینیت تھی۔ اس نے پھر التجا آمیز نظروں سے دیکھا مگر میں سامنے دیکھنے لگا۔ بادل ناخواستہ اس نے کہا۔ ”شہباز صاحب آپ کو میری وجہ سے جو زحمت ہوئی ہے اس کے لیے میں معذرت خواہوں اور آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ آپ واپس چلیں۔“

”ٹھیک ہے لیکن میں اس شرط پر واپس جاؤں گا کہ جلد از جلد راجا صاحب سے میری ملاقات کرادی جائے میں صرف ان کی خیریت پوچھنے آیا ہوں۔“

”آپ اندر تو آئیے۔“ اس نے کہا اور میرے ساتھ والی سیٹ پر آ گیا۔ میں نے جیب پھر واپس موڑی اور شکوہ کیا۔

”بیگ صاحب یہاں میرے ساتھ ہمیشہ غلط سلوک ہوتا ہے جب کہ راجا صاحب سے میرا خلوص عیاں ہے۔“

”میں جانتا ہوں اور اس کے لیے بھی معذرت خواہوں۔“ بیگ نے حسب معمول محتاط انداز میں کہا۔ ”بعض اوقات طریقہ کار کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے مگر مقصود آپ کی تضحیک نہیں ہوتی ہے۔“

”اس بار مجھے اس عمارت تک لے جایا گیا ہے۔“

”یہ مہمانوں کے لیے بنی ہے۔“ اس نے صفائی پیش کی۔ ”محل میں جو گیٹ ہاؤس ہے وہاں راجا صاحب کے کچھ رشتے دار مقیم ہیں اس لیے آپ کو یہاں بھیجا گیا اور کیونکہ آپ کی آمد غیر متوقع تھی اس لیے میں خود استقبال کے لیے نہ آ سکا۔“

”مجھے اسے اسلحہ طلب کیا گیا جب کہ پہلے ایسا کبھی نہیں ہوا تھا۔“

”شہباز صاحب آپ جانتے ہیں کچھ عرصے سے راجا صاحب کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں اور ایک موقع پر یہاں آنے والے مہمان کا پستول غائب کر کے اس سے راجا صاحب کی جان لینے کی کوشش کی جا چکی ہے۔ اس کے بعد سے یہاں سوائے گارڈز کے کسی کو اسلحہ رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ حد یہ کہ میں بھی نہیں رکھ سکتا کیونکہ ہم گارڈز کی طرح ہمہ وقت اسلحہ اپنے پاس نہیں رکھتے ہیں اور اس کے چوری ہونے کا مکان ہوتا ہے۔“

ظاہر ہے یہ محل کا پروٹوکول تھا اور مجھے بھی اس کی پابندی کرنی تھی اس لیے اسلحہ بھی جمع کرنا تھا۔ میں نے جیب اسی عمارت کے سامنے روکی وہی خادم منظر تھا اس نے پیچھے سے بیگ اور میرا دوسرا سامان اٹھایا۔ میں نے پستول

لیے مشکلات کم نہیں ہوں گی تو میں دینی شفٹ ہو جاؤں گا اور شادی کر کے سویرا کو بھی دیں لے جاؤں گا۔ یہ فیصلہ کر کے میں پُرسکون ہو گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اب میں راجا عمر دراز کا شکر گزار تھا کہ اس نے خود مجھے اس فیصلے پر پہنچنے میں مدد دی کہ اب میں اس کی کوئی احمقانہ بات تسلیم نہیں کروں گا۔

میں لیٹا اور سو گیا۔ ساری رات سوتے گزری اور صبح میری آنکھ دس بجے کے قریب کھلی تھی۔ مجھے تعجب ہوا کیونکہ میں اتنا سونے کا عادی نہیں تھا بہت تھکنے اور دیر تک جاگنے کے بعد بھی میں سات آٹھ گھنٹے کی نیند لے کر اٹھ جاتا تھا اس سے زیادہ دیر لیٹنا میرے لیے ممکن نہیں تھا۔ رات کو ہلکا کھانے کی وجہ سے اس وقت میرے پیٹ میں بھوک کا جن انگڑائیاں لے رہا تھا اور اسے جلد کھانے کو کچھ چاہیے تھا۔ میرے ساتھ کچھ گڑ بڑ تھی۔ شاید میں نے فتح خان کے ساتھ جو کیا تھا اس نے مجھے ذہنی طور پر ڈسٹرب کر دیا تھا۔ میں نے خادم کو بلانے کی بجائے انٹرکام پر ایک کاٹن دیا تو اسی سریلی آواز والی لڑکی نے جواب دیا۔ ”سر میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟“

میری جگہ کوئی ٹھہرکی ہوتا تو اس کے اس انداز سے پوچھنے پر اپنی کئی ناقص حسرتوں کو پورا کرنے کی فرمائش کر سکتا تھا۔ مگر میں نے صرف بیک کی فرمائش کی۔ ”میں بیک صاحب سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”سوری سر وہ اب تک اپنی رہائش گاہ سے نہیں نکلے ہیں۔“

میں نے دل میں سوچا کہ وہ اب ساری عمر وہیں رہے اور انٹرکام رکھ دیا۔ خادم کو بلا کر اسے بھر پور ناشتالانے کو کہا۔ میرا کل کا اتارا ہوا لباس دھل کر اور استری ہو کر سیلو فین میں پیک آ گیا تھا۔ میں نے اسے بیک میں رکھا اور واش روم میں آیا۔ جب تک میں غسل سے فارغ ہوا ناشتا آ گیا تھا۔ میں نے اس سے انصاف کیا اور پھر خادم کو بلا کر اس سے کہا۔ ”مجھے روانہ ہونا ہے۔ میں نے یہاں آنے کے بعد جو راتقل جمع کرائی تھی اسے گیٹ پر بھجواد میں وہاں سے لے لوں گا۔“

”یہ کام بیک صاحب کر سکتے ہیں۔“ اس نے ادب سے جواب دیا یہ کل دن والا خادم تھا۔ ”وہی اسلحہ لینے اور دینے کے مجاز ہیں۔“

راجا عمر دراز کے اس مجازی سیکریٹری نے صحیح معنوں میں میرا ناک میں دم کرنا شروع کر دیا تھا۔ میری راتقل اس

رہتا۔ بہر حال ذہن اور جسم ہلکا ہو رہا تھا۔ میں نے اٹھ کر منہ ہاتھ دھویا اور نیل بجا کر خادم کو طلب کیا۔ اس بار دن والے خادم کی بجائے دوسرا خادم تھا۔ میں نے اس سے بیک کے بارے میں پوچھا کہ براہ راست راجا عمر دراز کے بارے میں پوچھنا پروٹوکول کے خلاف تھا۔ مگر اسے بیک کے بارے میں علم نہیں تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”تب بیک صاحب کے بارے میں کیسے علم ہو؟“

”آپ انٹرکام سے ایک نمبر دبا کر پوچھ سکتے ہیں۔“ اس نے میری رہنمائی کی اور میں نے انٹرکام اٹھا کر ایک دبا دیا۔ دوسری طرف سے کسی سریلی آواز والی لڑکی نے پوچھا۔

”سر میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں۔“

”مجھے بیک سے ملنا ہے۔“

”سوری سر ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ سونے چلے گئے ہیں۔“

میں ہنچلا گیا۔ ”تب میں راجا صاحب سے ملنا چاہوں گا۔“

”سر راجا صاحب سے ڈاکٹر نے ملاقات پر مکمل پابندی عائد کی ہوئی ہے۔“ آپریٹر نے جواب دیا۔ ”اس کے باوجود کوئی ان سے براہ راست نہیں مل سکتا۔“

یہ سب میں پہلے سے جانتا تھا مگر اس وقت میں ہنچلا رہا تھا اور پچھتا رہا تھا کہ مجھے یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی اس سے اچھا تھا کہ میں حویلی چلا جاتا۔ بعض اوقات مردت بھی آدمی کو ذلیل کر دیتی ہے۔ شاید میں یہ سوچ کر آیا تھا کہ راجا عمر دراز مجھ سے ملنے کے لیے بے تاب ہو گا اور میں اس کے محل کے گیٹ میں بھی داخل نہیں ہوں گا اور وہ ملاقات کے لیے مجھے طلب کر لے گا۔ مگر راجا تو دور کی بات تھا بیک بھی دستیاب نہیں تھا۔ میں سوچتا رہا اور ٹھہرتا رہا۔ دس بجے جب خادم نے ڈنر کی یاد دلائی تو میں نے اس سے کچھ ہلکا پھلکا لانے کو کہا۔ میرا باقاعدہ کھانے کا موڈ نہیں رہا تھا۔ اس نے سینڈویچز کا پوچھا۔ میں نے اس سے کلب سینڈویچز لانے کو کہا۔ کچھ دیر بعد وہ کلب سینڈویچز اور کافی لے آیا۔ سینڈویچز سے ڈنر بھگتا کر میں نے کافی پی اور پھر ٹیبلٹ لگا۔ میں نے سوچ لیا کہ اگر کل صبح ناشتے کے بعد بیک نے راجا صاحب سے ملاقات کے حوالے سے مجھے کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا تو میں واپس روانہ ہو جاؤں گا۔ اس کے بعد میری ساری توجہ مرشد سے معاملات نمٹانے پر مرکوز رہے گی اور میں مزید کسی چکر میں نہیں پڑوں گا۔ اگر یہاں میرے

انتظار کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ راجا عمر دراز سے ملاقات نہ کرنے کا فیصلہ میں پہلے ہی کر چکا تھا۔ میں نے اندر آ کر اپنا بیگ اٹھایا تھا کہ خادم آ گیا۔ اس نے کہا۔ ”جناب بیگ صاحب آپ سے ملاقات کے منتظر ہیں۔“

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ جب میں جانے والا تھا تو وہ آ گیا۔ بہر حال اب میں انکار تو نہیں کر سکتا تھا اس لیے اس کے ساتھ روانہ ہوا اور محل کے اس حصے میں آیا جو دفتر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ بیگ وہاں اپنے دفتر میں میرا منتظر تھا اور وہ چہرے سے سچ سچ بیمار لگ رہا تھا۔ میں نے مزاج پرسی کی جسے اس نے ٹالنے والے انداز میں لیا اور بولا۔ ”معذرت شہباز صاحب، میں طبیعت خرابی کی وجہ سے کل جلد سونے چلا گیا تھا اور آج دیر سے آیا۔“

”اچھا ہوا آپ سے ملاقات ہو گئی کیونکہ میں جانے والا ہوں۔“

”اوہ۔“ اس نے کسی قدر مصنوعی سے انداز میں کہا۔ ”مجھے افسوس ہے کہ راجا صاحب سے آپ کی ملاقات نہیں ہو سکی ویسے اگر آپ کل تک رک جائیں تو شاید ان کی حالت اتنی بہتر ہو جائے کہ وہ آپ سے ملاقات کر سکیں۔“

”بیگ صاحب، کیا آپ محل کر مجھے راجا صاحب کی حالت بتا سکتے ہیں؟“

اس نے سر ہلایا۔ ”بد قسمی سے کینسر اپنی جڑیں پھیلا رہا ہے اور افاقہ عارضی ثابت ہوا۔ ڈاکٹروں کے مطابق ان کے پاس وقت کم ہے اور شاید اب دو مہینے بھی نہیں ہیں۔“

”اوہ۔“ مجھے افسوس ہونے لگا۔ ”لیکن اسلام آباد میں تو مجھے کچھ اور بتایا گیا تھا۔“

”وہ مجبوری تھی کیونکہ راجا صاحب خود رابطے میں تھے اور ان کے سامنے کوئی بھی ایسی بات نہیں کرتا جس سے ناامیدی جھلکے۔ ہم ہر جگہ یہی کہہ رہے تھے کہ راجا صاحب صحت یاب ہو رہے ہیں۔ مگر اس وقت میں آپ کے سامنے غلط بیانی نہیں کر سکتا۔ اس وقت محل میں نہ صرف راجا صاحب کی تمام اولادیں بلکہ دور قریب کے تمام ہی رشتے دار موجود ہیں۔ جہاں تک آپ کا تعلق ہے تو آپ کی آمد سے صرف میں واقف ہوں کیونکہ باقی نہ تو آپ سے واقف ہیں اور نہ ہی وہ آپ کی حیثیت جانتے ہیں۔ اس لیے کسی سے ملاقات مناسب نہیں ہوگی۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”میں اس اعتماد کے لیے شکر گزار ہوں۔ لیکن کیا راجا صاحب بھی میری آمد سے بے خبر ہیں۔“

”نہیں کل رات جانے سے پہلے میں نے انہیں آپ

کے پاس تھی اور وہ خود غائب تھا اپنے حجرہ خاص سے نکلنے کو تیار نہیں تھا۔ میں نے پھر نمبروں کو کال کی اور اس سے کہا۔ ”بیگ صاحب کی غیر موجودگی میں معاملات کون دیکھتا ہے؟“

”کوئی نہیں سر۔“

”اگر خدا نا خواستہ بیگ صاحب دنیا سے اچانک پردہ فرما جائیں تو کیا تب بھی کوئی ان کی جگہ نہیں لے گا؟“

وہ بے ساختہ ہنسی اور بے ساختہ ہی رک گئی۔ غالباً اسے اپنی حرکت کا احساس ہوا تھا۔ ”سوری سر..... میں اس بارے میں کسی پروسیجر سے لاعلم ہوں۔“

”کیا میں انٹرکام پر راجا عمر دراز سے بات کر سکتا ہوں؟“

”سوری سر۔“ اس نے پھر کہا۔ ”یہ بھی ممکن نہیں ہے۔“

”یہ بھی ممکن نہیں ہے تو پھر کیا ممکن ہے وہی بتا دو۔“ میں بہت ناگوار تھا۔ ”یہ راجا صاحب کا محل ہے یا پاکستان جس کا کوئی پرسان حال ہی نہیں ہے۔“

”سر آپ جو کہہ رہے ہیں وہ میرے بس میں نہیں ہے۔ پلیز آپ کچھ دیر ریٹ کر لیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر ریسپور

رکھ دیا اور اپنے لیے کیتلی سے تازہ چائے نکالنے لگا۔ سیکریٹری بیگ عمر میں راجا سے بڑا تھا اور وہ تھا بھی نجف و نزار سا، اس لیے طبیعت خرابی انہونی نہیں تھی۔ مگر اس کا حال بھی ہمارے سیاست دانوں اور سرکاری بابودوں جیسا ہے کہ جب تک دم میں دم ہے اختیارات نہیں چھوڑتا اور کسی کو جانشین بنانے کی کوشش بھی نہیں کرتی ہے۔ راجا عمر دراز کی طبیعت خرابی کی اطلاع جہاں ایک طرف تشریف ناک تھی وہیں مجھے یہ اطمینان بھی ہوا کہ فی الحال اس کی طرف سے کسی ایڈونچر کا کوئی امکان نہیں تھا۔ وقت گزاری کے لیے میں باہر نکل آیا۔ گزشتہ چوبیس گھنٹے میں یہاں شاید بارش ہوئی تھی کیونکہ پودے بہت صاف ستھرے ہو رہے تھے۔ ویسے تو یہاں ٹنڈا شاذ ہی نظر آتی ہے مگر بارش کے بعد پودوں کی جو کیفیت ہوتی ہے وہ الگ سے ہی محسوس کی جاسکتی ہے اور یہاں بھی ایسا ہی لگ رہا تھا۔

دو گھنٹے مزید گزر گئے اور میرے صبر کا پیمانہ ایک بار پھر لبریز ہونے لگا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ میں ایک ایسی رانفل کے چکر میں پھنسا ہوا ہوں جو اصل میں میری نہیں تھی اور میں اس پر با آسانی لعنت بھیج کر یہاں سے جاسکتا تھا تو مجھے اب

کی آمد کے بارے میں بتا دیا ہے۔ ڈاکٹرز نے صرف ایک گھنٹا ملاقات کی اجازت دی ہے۔ وہ بھی آدھے آدھے گھنٹے کے دو ادوار میں اور ہر دور میں کم سے کم چھ گھنٹے کا فرق لازمی قرار دیا ہے اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان کی طبیعت کس حد تک نازک ہے۔“

”اب میں سمجھ رہا ہوں۔“

”تو کیا میں سمجھوں کہ آپ کل تک رکنے پر آمادہ ہیں؟“ بیگ نے پُرائمید لہجے میں پوچھا۔ مکمل وضاحت کے بعد اور پھر بیگ کے لہجے پر میرا دل صبح گیا تھا اور میں نے اس سے کہا۔

”ٹھیک ہے میں کل تک دکھ لیتا ہوں۔“

”میں ذاتی طور پر آپ کا شکر گزار ہوں گا۔ بد قسمتی سے یہاں صرف میں اور راجا صاحب آپ کی اہمیت جانتے ہیں۔“

”میرا کوئی اہمیت نہیں ہے یہ اوپر والے کی مہربانی کے بعد آپ لوگوں کا حسن ظن ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہاں سوبائل سٹنڈل کام نہیں کر رہے ہیں کیا میں لینڈ لائن سے اسلام آباد کال کر سکتا ہوں۔“

”بد قسمتی سے کل رات بارش کے دوران میں بجلی گرنے سے محل کے کمیونیکیشن ٹاور کو نقصان ہوا ہے اور فی الحال لینڈ لائن سمیت باہر سے تمام رابطے منقطع ہیں۔“

”لینڈ لائن بھی؟“ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

”ہاں کیونکہ بجلی گرنے سے دائرہ تک جل گئی ہے اور اب پوری دائرہ پیچھے تک تبدیل ہو گی تب لائن ٹھیک ہو گی۔“ اس نے جواب دیا۔ ”آج شکایت کرا دی ہے کل تک عملہ آجائے گا۔“

”اور سیٹلائٹ فون؟“

”محل کے دو سیٹلائٹ فون دو دن سے مسلسل استعمال ہونے کی وجہ سے فی الحال ری چارج نہ ہونے کے باعث بند پڑے ہیں۔ مواصلاتی رابطہ نہیں ہے کہ ان کو ری چارج کے لیے کال کی جاسکے۔“ بیگ نے اس کا بھی معقول جواب دیا۔ ایک لمحے کو مجھے خیال آیا کہ یہ جوابات کہیں مجھے اسلام آباد رابطے سے روکنے کے لیے تو نہیں ہیں۔ مگر پھر میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا۔ بیگ کو ایسا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ کیونکہ کام کی بات ہو گئی تھی اس لیے میں اس کے پاس سے اٹھ گیا اور واپس مہمان خانے آ گیا۔ میرا ارادہ پھر بدل گیا تھا۔ یہ سارا دن بھی آرام

عابدناصہ سرگزشت

کرتے گزرا تھا اور دوپہر کا کھانا کھا کر میں ایک بار پھر لمبی تان کر سو گیا تھا۔ جب جاگا تو شام کے سات بج رہے تھے۔ جسم سست اور ذہن جیسے اونگھ میں تھا۔ کسی قدر سرد پانی سے غسل کے بعد میں چاک و چوبند ہوا مگر ایک بار پھر مجھے اپنی کیفیت پر تعجب ہوا تھا۔ میں نے نارمل حالات میں کبھی خود کو نیند کا اتنا رسیا اور سست نہیں پایا تھا۔ ذہن کو چونکا کرنے کے لیے میں نے چائے کی جگہ سیاہ کافی طلب کی اور اس سے میری حالت صبح بچ بہتر ہوئی تھی۔

میں باہر آیا تو موسم سرد ہو رہا تھا اور لان میں لائٹس روشن تھیں۔ محل میں جدید ترین لائٹس تھیں جن کے گرد لوہے کے تاروں کی باریک جالی تھی اور اندر خاص روشنی والے بلب روشن تھے۔ اڑنے والے کیڑے مکوڑے اس روشنی پر کھنچے آتے تھے اور لوہے کی باریک جالی سے ٹکرا کر کرنٹ سے مر جاتے تھے۔ جب وہ ٹکراتے تو ہلکی سی چرچاہٹ کی آواز آتی اور جلتے لیمب کی روشنی ذرا مدھم ہو جاتی تھی۔ کھلی جگہ پر ایسے کیڑوں کی کوئی کمی نہیں تھی اس لیے کسی نہ کسی طرف سے چرچرانے کی آواز مسلسل آرہی تھی۔ باہر کے ملکوں میں وق کرنے والے کیڑوں اور خاص طور سے پھمروں سے نجات کے لیے اس قسم کے لیمب عام ہیں مگر ہمارے ہاں اب تک باہر کی لائٹس میں ان کا استعمال نہ ہونے کے برابر ہے۔ حالانکہ یہ پھمروں اور ان سے پیدا ہونے والی بیماریوں سے سدباب کا ایک آسان اور ماحول دوست طریقہ ہے۔ جب کہ اسپرے اور سلگنے والے تمام پھمروں کو آلودہ کرتے ہیں اور جو لوگ ان کے قریب ہوتے ہیں ان کی صحت بھی متاثر ہوتی ہے۔

چہل قدمی کر کے میں واپس آیا تو ڈنر کا وقت ہو گیا تھا اور خادم نے اس بار بھی اکیلے ڈنر کی نوید سنائی۔ مگر بیگ مجھے بتا چکا تھا کہ محل میں موجود افراد میرے بارے میں بے خبر تھے۔ ڈنر کے بعد میں نے کافی کی بجائے چائے کا انتخاب کیا اور اس کے کچھ دیر بعد مجھے پھر جمائیاں آنے لگیں۔ میں فکر مند ہوا تھا مگر زیادہ نہیں ہوسکا کیونکہ آنکھیں بند ہوئیں اور میں سو گیا۔ اس بار میری آنکھ کھلی تو میں کچھ دیر بے حس اور سن کر دینے والی کیفیت میں رہا تھا۔ میری سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی جیسے سلب ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ میرے سوچنے کی صلاحیت بحال ہوئی تو میں نے آس پاس دیکھا۔ میں اسی کمرے میں تھا۔ گھڑی میں صبح کے دس بج رہے تھے۔ لیکن نہیں یہ صبح کے نہیں رات کے دس بجے تھے۔ کیونکہ گھڑی کے باہر اندھیرا نظر آ رہا تھا۔ مجھے تعجب ہوا کہ کیا میں چوبیس

فروری 2015ء

183

کھٹے سوتار ہاتھا؟ میرے ساتھ آخر ہو کیا رہا تھا؟

میں نے اٹھ کر انٹرکام اٹھایا تو اس سے ٹون نہیں آرہی تھی۔ وہ مرچکا تھا پھر میں نے دروازہ کھولنا چاہا تو انکشاف ہوا کہ دروازہ بھی باہر سے بند تھا اور میں اسے اندر سے نہیں کھول سکتا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹایا اور چٹا کر آواز دی۔ مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ دروازے سے ہاپوس ہو کر میں کھڑکی کی طرف آیا مگر اس سے باہر جانا بھی ممکن نہیں تھا کیونکہ شیشوں کے باہر مضبوط فولادی گرل تھی۔ اٹیچ ہاتھ تھا اور اس سے بھی باہر جانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ کل سے میرے اندر جو ایک وسوسہ سا ڈیرے ڈال رہا تھا وہ اچانک پوری طرح حقیقت بن کر سامنے آ گیا تھا۔ بیگ کا رویہ اور پھر ہر کھانے کے بعد نیند آنا اور میرا خوب سونا۔ یہ سب نارمل نہیں تھا۔ اگرچہ ایسا بھی نہیں تھا کہ مجھے شبہ ہوتا کہ کھانے میں کچھ شامل کر کے دیا گیا ہے۔ یہ سب بہت ہوشیاری اور پلٹنگ سے کیا گیا تھا۔ یہاں موہائل میں سگنل نہیں تھے اور مجھے لینڈ لائن استعمال کرنے نہیں دی گئی۔ حالات بتاتے تھے کہ بیگ نے اس بارے میں جھوٹ بولا تھا۔ مگر کیوں کہا گیا تھا میں سمجھنے سے بالکل قاصر تھا۔ یہ تو دشمنی والا رویہ تھا اور میں اس جگہ رہنے والوں سے گمان میں بھی دشمنی کی توقع نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے دوبارہ دروازہ بجانے کی کوشش نہیں کی۔ میرا پستول جو میں بیڈ کے ساتھ سائینڈ دراز میں رکھ کر لیٹا تھا وہ غائب تھا۔ یہی نہیں اس کمرے میں اب کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے میں ہتھیار کے طور پر استعمال کر سکتا۔ حد یہ کہ پھل کاٹنے والی چھری جو کل تک پھل والی ٹوکری کے ساتھ رکھی تھی اب وہ بھی غائب تھی۔ خود کو پتھر سکون کرنے کے لیے میں نے سرد پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔ دانت صاف کیے اور دوسری ضروریات سے فارغ ہوا۔ رفتہ رفتہ میرا دماغ سکون میں آنے لگا۔ میں نے اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ میں یہاں قید ہوں اور کیوں قید ہوں؟ جلد یا بدیر اس کی وجہ سامنے آ جائے گی۔ میرے جذباتی ہو کر شور مچا کر شہر بانی کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا اور نہ ہی میں نارزن باہر کو لیس ہوں جو دروازہ توڑ کر یہاں سے نکل سکوں۔ اول تو یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ میں دروازہ توڑنے کے بعد بھی یہاں سے نکل سکوں۔ محل کی سیکورٹی کا مجھے اچھی طرح علم تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ میں چوبیس گھنٹے سے زیادہ سوتار رہا اور لازمی بات ہے کہ اس دوران میں بے ہوشی کا دورانیہ کسی طریقے سے بڑھایا گیا ہوگا کیونکہ نارمل حالت میں انسان

کسی بھی دوا سے آٹھ گھنٹے سے زیادہ بے ہوش نہیں رہ سکتا اس دوران میں جسم دوا کا توڑ کر ہی لیتا ہے۔ اس لیے دوبارہ دوا دینا لازمی ہوگی۔ میں نے اپنا ہاتھوں کا جائزہ لیا مگر کوئی نشان نہیں تھا شاید مجھے گیس انجکشن سے دوا دی گئی تھی۔ یہ انجکشن کی جدید ترین قسم ہے اس میں سوئی نہیں ہوتی ہے بلکہ سرنج کا منہ سکے کی طرح چھینا اور گول ہوتا ہے اسے جلد پر رکھ کر بٹن دبانے سے انجکشن کے پیچھے موجود نائٹروجن گیس زبردست پریشر ڈالتی ہے اور اس پریشر سے دوا مساموں سے گزر کر براہ راست جسم اور خون میں شامل ہو جاتی ہے۔ اس کا کوئی نشان نہیں پڑتا اور نس تلاش کرنے کی زحمت بھی نہیں کرنا پڑتی ہے صرف وہ خاص انجکشن جو نس میں ہی دیئے جاتے ہیں وہ اس طریقے سے نہیں دیئے جا سکتے۔ نیند کی دوا کا انجکشن مسلز میں بھی دیا جا سکتا ہے جہاں سے یہ بتدریج خون میں شامل ہو جاتا ہے۔

دروازہ کھلا تو میں چونکا۔ سامنے سر سے پاؤں تک خاص لباس میں چھپے دو افراد کھڑے تھے اور انہوں نے ہاتھوں میں شیزر کن تمام رکھی تھی۔ یہ مغرب میں خاص پولیس اور ایجنسیوں کے افراد استعمال کرتے ہیں جب کسی مجرم کو زندہ پکڑنا ہو۔ وہ دونوں اپنے انداز سے بہت تربیت یافتہ لگ رہے تھے اور بیگ ان کے پیچھے تھا۔ میں کھڑا ہوا تو وہ دونوں چوکنے ہو گئے اور ان کی گنوں کا رخ میرے سینے کی طرف ہو گیا۔ میں نے بیگ کی طرف دیکھا۔ ”کیا میں اس رویے کی وجہ پوچھ سکتا ہوں۔“

”مجبوری۔“ اس نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ”شہباز صاحب مجھے افسوس ہے مگر بعض حالات کی وجہ سے آپ سے ایسا رویہ اختیار کرنا پڑا۔“

”حالات سے کیا مراد ہے، کیا آپ کا مرشد یا ڈیوڈ شاہ سے کوئی سمجھوتا ہو گیا ہے؟“

”ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔ ”میں نے کہا نا کہ مجبوری ہے اور آپ کو یہاں سے جانا ہوگا۔“

”میں خود یہاں سے جا رہا تھا تب مجھے کیوں روکا گیا؟“

”اس کی بھی وجہ ہے جو فی الحال بتائی نہیں جاسکتی مگر اب محل کے آدمی آپ کو اس علاقے سے باہر تک چھوڑ کر آئیں گے۔“

”شاید آپ یہ بھی کہنا چاہتے ہیں کہ اب میں دوبارہ یہاں کا رخ نہ کروں؟“ میرا لہجہ سنج ہو گیا۔

شاک کی کیفیت میں ہوں۔ ایک گھنٹے بعد گاڑی رکی اور مجھے اس سے اتارا گیا تھا۔ حالات نے پلٹا کھایا تھا اس بار وہ لوگ مخالف کے روپ میں سامنے آئے تھے جنہیں میں نے ہمیشہ دوست اور مشفق پایا تھا۔ میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بحال تھی اور کچھ زیادہ ہی کام کر رہی تھی۔ اس لیے اس سفر کے دوران میں ایک ممکنہ مفروضے پر پہنچ گیا تھا کہ شاید راجا عمر دراز کی ضد نے بیگ اور خاندان کے باقی افراد کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لے لیں اور راجا عمر دراز کو مجبور کرنے کے ساتھ انہوں نے یہ کام بھی کیا میرے ساتھ دشمنوں والا سلوک کر کے وہ راستہ ہی بند کر دیا جس سے گزر کر راجا اپنی خواہش پوری کر سکتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں نہ ٹومن تیل ہو گا اور نہ رادھا ناچے گی۔ مجھے جیب میں بٹھا کر میری ہتھکڑیاں کھول دی گئی تھیں۔ میرا پستول، رائفل اور دوسری چیزیں جیب میں پہلے ہی پہنچا دی گئی تھیں۔ مجھے جیب میں بٹھا کر وہاں پہنچانے والے نے معذرت کی۔

”معاف کرنا صاحب ہم حکم کے ملازم ہیں کوئی گستاخی ہوئی ہو تو معاف کر دینا۔“

میں نے جواب نہیں دیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا کہ حکم کا غلام تھا۔ اس کی ڈور بیگ اور راجا عمر دراز کے ہاتھ میں تھی۔ مجھے لانے والے تین افراد تھے اور انہوں نے مجھے راجا عمر دراز کے علاقے سے تقریباً باہر نکال دیا تھا۔ یہاں سے مجھے خود آگے جانا تھا۔ جیب میں ڈیزل فل تھا اور میں آرام سے واپس اسلام آباد پہنچ سکتا تھا۔ وہ واپس اپنی گاڑی میں بیٹھے اور گھوم کر واپس چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد میں نے دیکھا کہ عقب میں میرے بیگ کے ساتھ کھانے پینے کا ایک بنڈل اور اس کے ساتھ ایک لفافہ بھی تھا۔ میں نے انڈر کی لائٹ آن کر کے لفافہ کھولا۔ اس میں ایک چھوٹا سا رقعہ تھا۔

”شہباز صاحب، اس سلوک کے لیے معذرت کا لفظ یقیناً چھوٹا ہے لیکن میں نے بتایا کہ میری مجبوری ہے اور میں زندگی میں کبھی اتنا مجبور نہیں ہوا۔ شاید وقت حقیقت آپ کے سامنے لے آئے۔“ مخلص، بیگ۔“

میں نے رقعہ مٹھی میں جکڑ لیا اور پھر جیب سے کھانے پینے والا بنڈل نکال کر باہر سڑک پر رکھ دیا۔ میں اسے کھائی میں اچھال دینا چاہتا تھا مگر میرے دل میں رزق کا احترام ہے اس لیے میں چاہنے کے باوجود ایسا نہ کر سکا۔ میں نے یہاں رکھ دیا تھا کہ کسی غریب کا بھلا ہو جائے گا مگر میرے

”میں ایسی کوئی بات نہیں کہہ رہا۔“ بیگ نے کہا اور ان دونوں کو اشارہ کرتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔ ٹیڑ گنوں والے آگے آئے اور ایک نے ہتھکڑی نکالی۔

”سریہ بہن لیں۔“

میں نے دونوں ہاتھ آگے کیے اور جیسے ہی اس نے ان میں ہتھکڑی ڈالنا چاہی میں نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر کھینچے اور اسی گھماتے ہوئے گردن سے جکڑ لیا۔ اسی لمحے دوسرے نے فائر کیا اور تار آ کر جکڑے آدمی کے سینے سے چپکا۔ اسی لمحے میں نے اسے چھوڑ دیا اس لیے مجھے معمولی سا جھٹکا لگا مگر وہ کرنٹ کا شکار ہو گیا اور نیچے گر کر لرزنے لگا۔ دوسرے نے بدحواس ہو کر جلدی سے پستول سے تار نکالا اور مجھ پر فائر کرنے جا رہا تھا کہ میں نے تپائی اس پر کھینچ ماری۔ دوسرا فائر کہیں اور گیا۔ عام ٹیڑ گن ایک ہی فائر کر سکتی ہے یا اسے جسم سے لگا کر بٹن دبانا پڑتا ہے مگر یہ رائفل قسم کی ٹیڑ گن تھی جو کئی فائر کر سکتی تھی۔ تیسرے فائر سے پہلے میں نے بیٹھتے ہوئے لات گھمائی اور وہ دھڑام سے نیچے گرا۔ اس حالت میں بھی اس نے گن نہیں چھوڑی اور پھر فائر کرنے کی کوشش کی تھی کہ میں نے اگلی لات رائفل پر ماری اور وہ اس کے ہاتھ سے نکل کر دیوار سے ٹکرائی۔

میں نے پہلے شکار کی رائفل اٹھائی اور اس کا رخ دوسرے کی طرف کیا تھا کہ کوئی چیز میرے سینے سے آکر لگی اور مجھے شدید قسم کا جھٹکا لگا تھا۔ میں نیچے گر کر بالکل اپنے شکار کے انداز میں لرزنے لگا۔ یہ کام بیگ نے کیا تھا اس کے پاس بھی گن تھی۔ جب میں اس کے گروگوں سے نمٹنے میں مصروف تھا تو اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر وہ کام کیا جو ان دونوں سے نہیں ہو سکا تھا۔ شدید برقی صدمے نے میرے اعصاب شل کر دیئے تھے۔ دوسرے نے اٹھ کر جلدی سے میرے دونوں ہاتھ ہتھکڑیوں میں جکڑے۔ مزید گارڈز آگئے۔ تھے اور مجھے دونوں طرف سے پکڑ کر اٹھایا گیا اور چلاتے ہوئے لے جا کر کسی گاڑی کے عقبی حصے میں بٹھا دیا۔ اس وقت میں رو بوٹ بنا ہوا تھا اور میری لگام دوسروں کے ہاتھ میں تھی۔ مجھ میں مزاحمت کی سکت نہیں تھی۔ پھر گاڑی اشارت ہوئی اور روانہ ہو گئی۔ رات کا وقت تھا اور ستانے میں، میں نے ایک دوسری گاڑی کے انجن کی آواز بھی سنی۔ یہ میری جیب تھی۔ وہ بھی ساتھ جا رہی تھی۔

چند منٹ بعد برقی صدمے کے آثار کم ہونے لگے اور رفتہ رفتہ میں سنبھل گیا مگر میں ظاہر یہی کر رہا تھا کہ ابھی تک

باز بھی وہی چکر تھا۔

میں آہستہ سے نیچے اتر آیا۔ آواز ڈھلان کی طرف سے آئی تھی مگر یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا پہاڑوں میں آواز اس طرح گونجتی ہے کہ سمت کا تعین ذرا دشوار ہو جاتا ہے میں ایک درخت تک آیا اور اس سے ٹک کر آواز کے پھر آنے کا انتظار کرنے لگا۔ مگر اس بار آواز نہیں آئی بلکہ وہ خود آئی اور اس طرح آئی کہ میں دم بہ خود رہ گیا۔ وہ سامنے سڑک سے نمودار ہوئی اور ہلکی چاندنی میں اس کا چاندنی جیسا بدن یوں دکھ رہا تھا کہ وہ مجسم چاندنی کی بنی ہوئی لگ رہی تھی۔ یہ تشبیہ یوں دینا پڑی کہ اس کے بدن ایک سفید باریک کپڑے کا ایسا لباس تھا جس کے آر پار آسانی سے دیکھا جاسکتا تھا۔ اس لباس میں اس کا ایک ایک انگ یوں نمایاں تھا کہ دیکھنے کے لیے ذرا بھی زحمت کرنا نہیں پڑ رہی تھی۔ اس کے سنہری بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ عجیب سے انداز میں چلتی ہوئی جیب کی طرف آرہی تھی اس کی چال کو بیک وقت رقص اور کیٹ واک سمجھا جاسکتا تھا۔ وہ چلتی ہوئی جیب تک آئی اور اس کے ہونٹ پر سر جھکاتے ہوئے پھر اسی انداز میں ہنسی۔ تب مجھے لگا وہ نشے میں تھی۔ پھر اس نے سر گھما کر بہت دعوت انگیز انداز میں میری طرف دیکھا اور بوجھل لہجے میں بولی۔

”ادھر کیا کرتا ہے میرے پاس آ..... تا۔“

کوئی زاہد خشک بھی اس کی اس آفر کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ میں تو سرے سے کوئی دعویٰ ہی نہیں کر سکتا۔ اب تک میں اگر اس قسم کی ترغیبات سے بچتا آیا تھا تو یہ صرف اللہ کا کرم اور توفیق تھی کہ اس نے مجھے گناہ سے محفوظ رکھا۔ سچی بات ہے اس کی بات اور لہجے پر میرا جسم سننا گیا تھا اور رگوں میں خون کی روانی تیز ہو گئی تھی۔ صرف جسم ہی نہیں اس کا چہرہ بھی حسین ترین تھا۔ اوپر سے اس کی اوا میں اور آوازیں۔ لیکن میں جن حالات سے گزر رہا تھا اس وقت میں اپنے سائے پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔ میں پستول آگے رکھ کر اس کی طرف بڑھا۔ اس نے پستول کی طرف ایک لمبے کو نہیں دیکھا تھا، براہ راست میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ میں نے پاس جا کر دھیمی آواز میں پوچھا۔

”کون ہو تم؟“

”تجھے کیا نظر آتی ہوں؟“ اس نے اٹھلا کر پوچھا تو اس کے گداز بدن میں لہریں سی پیدا ہوئی تھیں۔ میں نے بہ مشکل نظر کو بھٹکنے سے روکا اور پستول اس کی گردن سے لگا کر دبا یا تو اس نے گردن اوپر کر لی۔ یہ ایک اور مصیبت تھی۔ وہ

لیے اب راجا سردراز کا کھانا پینا ممکن نہیں رہا تھا۔ میں نے جیب آگے بڑھانے سے پہلے موبائل نکال کر چیک کرنا چاہا تو پتا چلا موبائل جیب میں نہیں ہے۔ میں نے اسے شاید سائینڈ دراز پر رکھ دیا تھا اور اسے اٹھایا نہیں تھا۔ ان لوگوں کو بھی خیال نہیں رہا جب کہ میری ہر چیز واپس رکھ دی تھی۔ حد یہ کہ اسلحہ بھی تھا۔ صرف موبائل رہ گیا تھا۔ میں نے گاڑی آگے بڑھائی۔ رات کے بارہ بج رہے تھے۔ مگر طویل پیند کے بعد اب مجھے آرام کی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی البتہ بھوک لگ رہی تھی کیونکہ چوبیس گھنٹے سے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ کچھ ابر بعد جیب ایک جھرنے سے پاس سے گزری تو میں نے پانی پیا۔ مگر صرف پیاس بجھانے کی حد تک۔

میں نے سوچا اور اس سڑک سے نہ گزرنے کا فیصلہ کیا جس پر وہ پولیس اسٹیشن تھا جہاں میں رات گزار چکا تھا اور عین ممکن تھا کہ وادی میں لاشیں ملنے کے بعد میری تلاش پھر سے شروع ہو چکی ہو۔ اس لیے اس علاقے سے دور رہنا ہی مناسب تھا۔ مگر سیدھی اور صاف سڑک یہی تھی اس کے علاوہ باقی سڑکیں بہت خراب اور بس گزارے لائق تھیں۔ بعض مقامات پر تو سڑک ہی غائب ہوتی تھی اور کچے راستے پر سفر کرنا پڑتا تھا۔ میں نے متبادل سڑک پر مڑنے کے بعد خراب حصہ آتے ہی پڑاؤ ڈال دیا کیونکہ اب سفر کرنا بہت خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ میں نے جیب محفوظ جگہ روک کر بیک سے جیکٹ نکال کر پہن لی۔ سردی کا بھی علاج تھا اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ پھر سیٹ جہاں تک ہو سکی چھبے کی اور نیم دراز ہو کر آرام کرنے لگا۔ نیند نہیں آرہی تھی مگر نگلہ آنے لگی۔

اجانک مجھے لگا کہ کوئی عورت ہنسی ہو۔ میں چونک کر بیدار ہوا۔ مگر اب ہنسی رک گئی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ آواز بج بچ آئی تھی یا پھر میرا وہم تھا۔ بعض اوقات ان ویرانوں میں ہوائیں اٹھا چلتی ہیں کہ ان پر ایسی ہی انسانی آوازوں کا گماں ہوتا ہے۔ مگر چند لمبے بعد ہنسی کی آواز پھر آئی اور یہ بالکل واضح تھی۔ کوئی عورت بڑے دل سے ہنس رہی تھی۔ اس کی ہنسی میں خوشی اور جذبات کی کیفیت بالکل نمایاں تھی۔ میں چونکا ہو گیا اور پستول نکالتے ہوئے اس پاس کا جائزہ لیا مگر ہلکی چاندنی میں کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس ہنسی نے ایک پرانی یاد تازہ کر دی جب میں حویلی سے فرار ہو رہا تھا اور راستے میں نہر کے ساتھ گزر رہا تھا تب ایسی ہی ہنسی نے مجھ پر خوف طاری کر دیا تھا۔ ذہن میں حویلیوں کے قصبے تازہ ہو گئے تھے مگر قصہ مختصر یہ نکلا کہ کوئی جوڑا گھروالوں سے چھپ کر نہر کے ساتھ جھاڑیوں میں منہ کالا کر رہا تھا۔ کیا اس

ماہنامہ سرگزشت

ان عورتوں میں سے تھی جن کی ہر حرکت دوسروں کے لیے مصیبت بن جاتی ہے۔ مجھے ایک بار پھر نظروں کو روکنا پڑا تھا اور میں نے درشت لہجے میں کہا۔

”فضوں باتیں مت کر، تو اس حلے میں اور اس وقت یہاں کیا کر رہی ہے۔“

”تو یہ کیا کر سکتی ہوں؟“ اس نے ایک بار پھر خود کو نمایاں کیا تھا۔

”تیرے ساتھ اور کون ہے؟“

”بس میں ہوں۔“ اس نے پھر ایک ادا سے کہا۔

میں سوچ رہا تھا کہ اس قسم کی عورت کا اکیلے وجود کم سے کم

اس علاقے میں ممکن نہیں تھا۔ ہمارے ہاں کوئی عورت

چاہے وہ کتنی ہی آزاد خیال کیوں نہ ہو۔ اس حلے میں باہر

نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتی ہے۔ شہلا رضوی سچ سچ بہت آزاد

خیال تھی اور اس کا لباس واہیاتی حدود کو چھوتا تھا مگر باہر

نکلنے ہوئے وہ بھی خود کو ڈھک لیتی تھی۔ یہ عورت یہاں

اکیلی نہیں تھی بلکہ کسی دوسرے کی موجودگی بھی لازمی تھی۔ یہ

کسی چکر میں تھی۔ میں سوچ میں تھا اور ساتھ ہی چاروں

طرف دیکھ رہا تھا۔ اچانک میں نے اسے خاصی زور کا پھنٹر

مارا اور وہ الٹ کر سڑک پر جا گری تھی۔ اسی لمحے چاروں

طرف سے آہٹیں سنائی دیں اور چند سیکنڈ سے بھی پہلے مجھے

تین عدد حلے سے خطرناک نظر آنے والے مسلح افراد نے گھیر

لیا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں خود کار رائفلیں تھیں۔ ایک کھٹی

داڑھی والے نے گرج کر کہا۔

”تیری جرات کیسے ہوئی اسے ہاتھ لگانے کی؟“

”کیوں کیا یہ تمہاری بیوی ہے؟“ میں نے پوچھا۔ وہ

میرے سامنے تھا اور باقی دو دائیں بائیں سے آئے

تھے۔ عورت کو یقیناً چکر آ گیا تھا۔ وہ سنبھل کر اٹھ رہی تھی اور

پھر اس نے داڑھی والے سے کہا۔

”شیر خان اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے اس کے

ہاتھ توڑ دے۔“ عورت کہتے ہوئے میرے اور شیر خان کے

درمیان میں آئی تھی اور میں نے موقع سے فائدہ اٹھا کر شیر

خان پر گولی چلا دی۔ گولی عورت کے پاس سے گزر کر اس

کے بازو پر لگی تھی۔ فائر کے ساتھ ہی میں جھکا اور گھوم کر

جیب کے پیچھے آ گیا۔ مجھے ڈھلان کی طرف سے آنے

والے سے خطرہ تھا میں اس کی زد میں تھا مگر اس نے کسی قدر

تاخیر سے فائر کیا اور گولی جیب پر آ کر لگی تھی۔ آڑ میں آتے

ہی میں نے جوابی فائر کیا تو وہ عجلت میں بھاگ کر ڈھلان

سے اتر گیا۔ وہ اتنی تیزی سے گیا تھا کہ مجھے لگا وہ نیچے ہی

ماہنامہ سرگزشت

187

فروری 2015ء

لڑھک گیا ہوگا۔ اوپر کی طرف سے آنے والا جیب کے دوسری طرف تھا اور وہ میری طرف بے سود فائر کر رہا تھا کیونکہ میں کھل طور پر آڑ میں تھا۔ شیر خان اور عورت بھی بھاگ رہے تھے۔ اس وقت عورت رقص نما چال بھول گئی تھی اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنا چاہتی تھی مگر اس کا میکسی نما لباس رکاوٹ بن رہا تھا۔ اس نے بلا تکلف اسے کھینچ کر رانوں تک کیا اور تیز دوڑنے لگی۔ میں نے ڈرانے کے لیے ان کی طرف دو فائر اور کیے اور پھر پیچھے کی طرف سے جیب میں گھسا۔ سر نیچے رکھتے ہوئے میں نے چابی لگا کر انجن اشارت کیا۔ ڈیزل انجن کی وجہ سے انجن جلدی اشارت نہیں ہوا۔ یہ گرم ہونے پر ہی اشارت ہوتا۔ میں نے چابی دبا کر رکھی اور بالآخر انجن اشارت ہو گیا۔ میں نے پیچھے کا گیسٹر لگایا اور جیب پیچھے لے جانے لگا۔ سامنے سے برسٹ آیا اور کچھ گولیاں بونٹ سے پھسل کر گزر گئیں۔ ونڈ اسکرین سچ گئی تھی مگر دوسرے برسٹ نے اگلے دونوں وہیل برسٹ کر دیئے اور جیب آگے کی طرف بیٹھ گئی۔ میرے منہ سے ناگفتنی نکل گئی تھی۔

ایک تو میری قسمت ایسی تھی کہ جب پرانے دشمن ذرا سانس لینے کا موقع دیتے تو کوئی نہ کوئی نیا دشمن آ جاتا جو بلا وجہ گلے پڑ جاتا۔ یہ لوگ بھی کچھ ایسے ہی لگ رہے تھے۔ عورت کے انداز سے لگ رہا تھا کہ یہ لٹیروں کا کوئی گروہ تھا۔ عورت اپنے حسن کا جادو چلا کر مسافروں کو روک لیتی ہو گی اور پھر یہ لوگ آ کر اسے اس کی حسن پرستی کی سزا دیتے ہوں گے۔ بہت سے شریف مار کھا جاتے ہوں گے۔ میں تو پہلے ہی رکا ہوا تھا۔ نہ جانے کیوں یہ مجھے غیر ملکی لگے تھے۔ خاص طور سے عورت کے نقوش اور بالوں کا رنگ ہمارے ہاں نظر نہیں آتا ہے وہ شاید یورپ یا روس سے تعلق رکھتی تھی۔ جیب بیکار ہو گئی تھی۔ میں نے اپنا بیگ لیا۔ اس میں سے کلاشنکوف نکالی اور پیچھے سے نیچے اتر اور اوپر ڈھلان پر چڑھ گیا۔ اسی جگہ میں ان لوگوں سے محفوظ رہ سکتا تھا جو خود کار ہتھیاروں سے مسلح تھے۔

جیب کا کارہ کرنے کے بعد ان لوگوں کی طرف سے فائرنگ رک گئی تھی۔ مگر وہ بھاگے نہیں تھے بلکہ یہیں کہیں موجود تھے۔ چاند مغربی افق کی طرف جھک رہا تھا اور گزشتہ تین دن میں مزید چھوٹا ہو گیا تھا اس کی روشنی بس تاروں سے کچھ ہی بہتر تھی۔ اس لیے ڈھلان پر تو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا البتہ سڑک نمایاں تھی۔ میں دبے قدموں اس طرف بڑھنے لگا جہاں ان کی موجودگی کا امکان تھا۔ اگرچہ یہ آہٹل

لیے گھات لگائے بیٹھے تھے۔ جب میں نے شیرخان پر فائر کیا اور بھاگا تو ڈھلان سے آنے والے نے مجھ پر جو فائر کیا وہ خاصی دور سے گزر گیا تھا۔ اس وقت میں سمجھا کہ نشانہ خطا گیا ہے مگر اب سمجھ میں آرہا تھا کہ وہ مجھے مارنے یا لوٹنے نہیں بلکہ پکڑنے آئے تھے اور اسی لیے بجا کر صرف ڈرانے کے لیے فائر کیا تھا۔ بازو پر پٹی بندھوا کر شیرخان کھڑا ہو گیا اس نے عورت سے کہا۔ ”زینی تو یہیں رک، ہم اسے گھیرتے ہیں۔“

زینی وہیں رک گئی اور شیرخان ڈھلان سے اتر گیا۔ زینی ایک درخت سے ٹیک لگا کر سمٹ کر بیٹھ گئی تھی اسے یقیناً سردی لگ رہی تھی۔ یہ جگہ بلند تھی یا پھر گزشتہ روز ہونے والی بارش کا اثر تھا سردی اچھی خاصی ہو گئی تھی۔ شیرخان کے جانے کے بعد میں دبے قدموں زینی کی طرف بڑھا اور عقب سے آتے ہوئے میں نے اوپر سے اس کے سر پر کلا شکوف کی نال لگائی اور دھیسے لہجے میں بولا۔ ”آواز نہ نکلے۔“

وہ ساکت ہو گئی۔ پھر اس نے آہستہ سے کہا۔ ”تم بیکار کوشش کر رہے ہو ہم صرف چار نہیں ہیں اور بھی آدمی ہیں۔“

”تب تم لوگوں سے زیادہ احمق کوئی نہیں ہے۔ مجھے آرام سے گھیر کر پکڑ لیتے تمہیں کیٹ واک کرانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”ہاں نہیں یہ شیرخان کا پلان تھا؟“ وہ بولی ہم سرگوشی میں بات کر رہے تھے اور اس نے آواز بلند کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس بار میں نے اس کا لہجہ سمجھ لیا اور پوچھا۔

”تم رشین ہو؟“

”جارجین۔“ اس نے جواب دیا۔

”او کے شیرخان اور اس کے ساتھی کس کے لیے کام کر رہے ہیں۔“

”ہم اپنے لیے کام کرتے ہیں۔“

”میرا مطلب ہے کہ میرے لیے کس نے تمہیں ہائر کیا ہے؟“

”یہ بات شیرخان جانتا ہے۔“

”تم لوگ مجرم ہو؟“

”تم جو چاہے سمجھو۔“ اس نے بے پردائی سے کہا۔

ویسے وہ خوفزدہ نہیں تھی۔ اچانک میرے سر سے کوئی چیز آ کر لگی اور پھر شیرخان کی آواز آئی۔

”بانی میں بتاؤں گا۔“

جاری ہے

مجھے مار کہنے والی بات تھی مجھے مخالف سمت کا رخ کرنا چاہیے تھا۔ مگر میں دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ لوگ موجود تھے اور میرے خلاف مزید کیا ارادہ رکھتے تھے؟ میں دبے قدموں چل رہا تھا اور تقریباً پچاس گز کے بعد مجھے کسی کے کراہنے کی آواز آئی۔ وہ شیرخان ہی ہو سکتا تھا جس کے بازو میں گولی لگی تھی۔ پھر میں نے عورت کی آواز سنی۔ ”مجھے پٹی باندھنے دو خون بہ رہا ہے۔“

”چھوڑو۔“ شیرخان غرایا۔ ”میں اس کو چھوڑوں گا نہیں۔“

”مجھے یہ شخص خطرناک لگ رہا ہے۔“ عورت کی سہمی آواز آئی۔ ”یہ نہ تو مجھ سے متاثر ہوا اور نہ ہی تم لوگوں سے ڈرا۔“

”چپ کر۔“ شیرخان نے اسے پھنکارا۔ اب میں نے عورت کی آواز سنی تو مجھے لگا کہ وہ سچ سچ غیر ملکی ہے۔ ”اسے پکڑتا ہے ورنہ پارٹی کو کیا جواب دے گا؟“

میں چوہکا تھا۔ یہاں کوئی پارٹی نکل آئی تھی۔ میرا اندازہ غلط تھا۔ وہ لٹیرے نہیں تھے بلکہ کسی کے لیے انہوں نے مجھے روکا تھا۔ البتہ طریقہ نہایت احمقانہ تھا۔ شاید میری فرمائش کرنے والوں نے انہیں میرے بارے میں بریف نہیں کیا تھا ورنہ شاید وہ اس عورت کو یوں استعمال نہ کرتے۔ اس کی بجائے وہ مجھے سوتے میں خاموشی سے پنڈز اپ کرا لیتے تو میں ان کے قابو میں آجاتا۔ مجھے پہلے بیک کا خیال آیا مگر اسے ایسا کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے عملاً بہت بے آبرو کر کے راجا کے کوچ محل سے رخصت کیا تھا۔ یہ کوئی اور پارٹی تھی۔ فتح خان کے آدمی خود ان سے گم نہیں تھے یعنی انہیں کسی کو ہائر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پھر کون رہ جاتا تھا۔ مرشد سے توقع نہیں تھی کہ وہ اتنی تیزی سے حرکت میں آئے گا۔ مگر کیا کہہ جا سکتا تھا ہو سکتا ہے کہ مرشد نے سچ سچ اس ٹولے کو ہائر کر لیا ہو کیونکہ اس کے اپنے بد معاش دنیا سے جا چکے تھے اور اسے افراد کی کمی کا سامنا تھا۔

میری نظر تاریکی سے مانوس ہوئی تو میں نے شیرخان اور عورت کو دیکھا۔ وہ اس کے بازو کی مرہم پٹی کر رہی تھی اور اس کے لیے اس نے اپنے لباس سے ایک پٹی الگ کر لی تھی۔ نبی الحال اس کے اوپری جسم پر ایک ہلکی جیکٹ نظر آرہی تھی۔ ستر پوشی سے زیادہ سردی سے بچاؤ کے لیے جیکٹ لی تھی۔ ورنہ پچلا حصہ بدستور عریاں تھا۔ ان کے دونوں ساتھی غائب تھے اور وہ غالباً سڑک پر میرے

(نامہ تحریم کراچی کا جواب)

زویا..... کراچی
اشکوں کی ضمانت بھی جہاں کام نہ آئے
اس بزم میں باتوں کا یقین کون کرے گا

راجا ابریز خان..... ملتان
اٹھ کر تو آگئے ہیں تری بزم سے مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں

نزهت احمد..... گجرات
اب تو ہی بتا کیسے میں دیکھوں تری جانب
اس بزم کا ہر شخص مجھے دیکھ رہا ہے

عزیز ملک..... حاصل پور
لک شب کو جگمگائے ہماری بھی جھونپڑی
مانگیں گے ہم بھی چاندنی اس ماہتاب سے

عکبت جبین..... ساہیوال
اچھی گزر رہی ہے دل خود کفیل سے
لنگر سے روٹی لیتے ہیں پانی سبیل سے
(عدنان حسین خان کراچی کا جواب)

اسحاق بٹ..... میرپور آزاد کشمیر
وصل کی چھاؤں ہو یا ہجر کی دھوپ
ہر تخیل کا ہے رستا مجھ میں

کاوش علی..... نگر گلگت
وہ منٹ خاک ہوا نے جسے بکھیر دیا
سمیٹنے کی تک و دو ہے آدمی کیا ہے

نوشین اختر..... لاہور
وہ اتفاق سے بھی دوبارہ نہ مل سکے
رستہ کسی نے روک دیا ممکنات کا

دائمنہ علی..... جھنگ
وہ زلفیں جیسے لہراتی ہوئی راتیں
وہ گیسو جیسے بدلی گھر کے آئے

رضوان حمزہ..... لاہور
وہ رہا حسہ رگ جاں کے قریب
جس کو اپنے سے جدا سمجھے تھے ہم

محمد ندیم اختر..... گلگت

فتنہ و شر ہیں اسی دامن میں زیر تربیت
جس کو اب تک سایہ امن و اماں سمجھا ہے تو
(راجا ابریز خان ملتان کا جواب)

طالب حسین طلحہ..... ملتان
رضا کا خاتمہ بالآخر ہو جانا مبارک ہو
ہر اٹھان آپ کے گھر میں رہے گا مہرباں کب تک

نیاز حسین..... سرانے سدھو
روئے تو اپنی یاد کی کھیتی پری ہوئی
بارش ہوئی تو نخل تمنا ٹھہر گئے

ایس مصطفیٰ..... پشاور
روح بھی ذات کی اسیر دل بھی اسیر ذات کا
اپنی ہی قید میں ہوں میں صدیوں سے اس سزا کے ساتھ
(رضوان حمزہ لاہور کا جواب)

فہیم انصاری..... کراچی
گدگداتی ہے کبھی جو اس کے دامن کی ہوا
سبز جنگل کی طرح شاہد لہک جاتے ہیں خواب
(ماہ رخ لطیف آباد کا جواب)

منظر علی خان..... لاہور
اب اس میں رہنا مرے لیے محال مرشد
مجھے بدن کے کنویں سے باہر نکال مرشد

سعید احمد چاند..... کراچی
بدن میں پڑ گیا اب نظام میکدہ ساقی
ہزاروں رند ہیں دو ایک پیانے سے کیا ہوگا

(فہیم انصاری کراچی کا جواب)

علی رضا..... کورنگی کراچی
میں بھی اس بحر کی موج سرگشتہ ہوں
ہے اسی کی عطا میرا نام و نشان

امجد اکرام..... بہاولپور
مہمان بن کے ہم بھی کہاں آگئے رضا
ہر میزبان بے سروسامان ہے اور ہم

(کاشف ظہیر مظفر گڑھ کا جواب)

محمد کامل..... سکھر
تا خدا کا کرم نہ ہو جن پر
وہ کناروں پہ ڈوب جاتے ہیں
عرفان مروت..... خان پور
نہ کرنا دولت و حشمت پر ناز جیتے جی
میں تو جانے کفن بھی کسے کہاں سے ملے
(مرزا ہادی بیگ حیدر آباد کا جواب)

نوازش علی سید..... لاہور
نگہ مہر کے ہوتے ہی وہ وحشت نہ رہی
قابل دید مرا حال پریشاں نہ رہا
رام چند مکانی..... سکرنڈ
نہیں سنتا کسی کی بات ہی جب وہ سلیقے سے
سحر اس سنگ دل سے ہم کو تاب التجا کیا ہو
آفتاب حیدر..... کوٹری
نمود صبح کا پیغام لا رہے ہیں چراغ
اندھیری رات کے دامن پر چھا رہے ہیں چراغ
(قاضی شرف معروف حمیدی کا جواب)

مہوش سلطان..... سکھر
میری پلکوں پر وہ سو ننھے ستاروں کی قطار
ان کے آنے کی قیامت ہے خوشی آج کی رات
فرخندہ قاضی..... لاہور
مجھ پر بھی کرم ہو جائے ترا امید لگا کر آیا ہوں
میں نے یہ سنا ہے در پر ترے تقدیر بتائی جاتی ہے
نکارا کبر..... گجرات
مصلحت کہتی ہے چپ ہو جا نہ اپنا غم سنا
دل بھند رہتا ہے جو کچھ آنکھ سے دیکھا سنا
(نزیہت احمد کا جواب)

عمران جوانی..... کراچی
اک بار ہی جینے کی سزا کیوں نہیں دیتے
گر حرف غلط ہوں تو مٹا کیوں نہیں دیتے
آصفہ بتول..... واہ کینٹ
اگر آسکو تو آؤ انہی پتھروں پہ چل کے
مرے گھر کے راستے میں کوئی کہکشاں نہیں ہے

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی
لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس
اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے
جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

فروری 2015ء

190

احمد علی صدیقی..... ملتان

مجھ کو بھی ماہر بہ رنگ حافظ رہیں خیال
آب رکنا یاد، گلشنِ مصلیٰ چاہیے
فروغ محسن..... گجرات
مظلوم نہ گھبرائیں کہ برحق ہے قیامت
دنیا ہے یہ انصاف یہاں ہو نہیں سکتا
(عبد الغفور خان ساغری انک کا جواب)

ابرار احمد..... کراچی
یوں نہ چلتی ہوا جو نفرت کی
کوئی بھی در بدر نہیں ہوتا
انیس الحق..... لاہور
یہ سمجھ لیتا کوئی مشکل نہ تھا میرے لیے
ورد کی پہچان کا رشتہ ہے کیا میرے لیے
نازش انصاری..... کراچی
یادِ محبوب اک عبادت ہے
ذکر بھی بندگی میں شامل ہے
(نشی محمد عزیز سے لڈن کا جواب)

محمد عمران جوانی..... کراچی
انجان ناناہوں کی یہ مانوس سی خوشبو
کچھ یاد سا پڑتا ہے کہ پہلے بھی ملے تھے
(شاہد جہانگیر شاہد پشاور کا جواب)

کائنات ناظمہ..... لاہور
لوگ آج نئی زندگی کی خواہش میں
نکل رہے ہیں دھواں بن کے کارخانوں سے
ندیم اختر..... حیدرآباد
یہ رنگ جو ہر دانش کو چاٹ جائے گا
مری لغت میں کچھ الفاظ معتبر ہیں ابھی

برہیں احمد..... جہلم
تیرا سدا کا اک تعلق ہے ابد اہر کا رشتہ
نہ تو غم نے ہم کو چھوڑا نہ تو ہم نے غم کو چھوڑا

عزیز ملک..... حاصل پور
یوں بلاوجہ دھڑکتا نہیں دل
آپ نے پیار سے دیکھا ہو گا
فیاض حسین..... لاہور

یہ ساری زندگی تو کئی قید میں مگر
مرنے کے بعد بھی درزنداں کھلا نہیں

ماہنامہ سرگزشت



میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام ہے۔

نام:

پتا:

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی سہنس پاکیزہ سرگزشت بھجوا یا جائے کسی ایک پر کیجیے۔

کوہن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 26 فروری 2015 تک علمی آزمائش 111 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

اگر آپ کو

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ،

ماہنامہ سہنس ڈائجسٹ،

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت،

کے حصول میں دقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

شکایت فیکس کریں

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کر سکتے ہیں

شمر عباس 0301-2454188

سرکولیشن مینیجر 35802552-35386783-35804200

فیکس نمبر 35802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 نیو 111 - سٹیشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

فروری 2015ء

191

ماہنامہ سرگزشت

مقابلہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام

پتا

محترم! متحرمہ..... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شائبہ امتناع کر لیں (شعرا لگ کاغذ پر ہے) **71**

مقابلہ بیت بازی

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

علمی آزمائش 111

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی مسئلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری ”یک علمی سرگزشت“ کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچئے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجئے کہ آپ کا جواب ہمیں 28 فروری 2015ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

ایک مشہور شاعرہ جو اپنے بارے میں لکھتی ہے۔ ”24 نومبر 1956ء میں اس عالم رنگ و بو میں پہلی سانس لی، ابھی گڑیاں کھیلنے، پہلے دوج اور کوڑا جمانا شاعری کے لطف سے دل بھرا بھی نہ تھا کہ کاغذی زنجیر پیروں میں ڈال دی گئی۔ پہلے اسلامیہ کمرج اسکول میں تعلیم حاصل کی اور پھر راننگ سن اسکول سے اکتساب نور کیا۔ اس کے بعد رضویہ گورنمنٹ اسکول کا وائس پکڑا جو میٹرک کے بعد ہی چھوٹا، پھر سرسید کالج نے اپنے دائرے میں پناہ دی۔ جامعہ کراچی سے انگریزی میں ایم اے کیا اور انیشیت لیکچرار سرسید گورنمنٹ کالج سے وابستہ رہی، ابتدا میں پیناٹکس رکھا۔“

علمی آزمائش 109 کا جواب

رو بندر ناتھ ٹیکور نے کلکتہ کے ایک زمیندار گھرانے میں آنکھ کھولی۔ بچپن سے ہی اسے ڈراما سٹیج کرنے کا شوق تھا۔ خود ہی لکھتا پھرا۔ اپنے ہم عمر ساتھیوں کے ساتھ مل کر گھر ہی کے ایک بڑے دالان میں اسے پیش کرتا، کچھ اور بڑا ہوا تو اسے شاعری کا شوق ہوا۔ اس صنف سخن میں اس نے اتنی مہارت حاصل کی کہ اس کے مجموعہ کلام پر نوبل انعام دیا گیا۔

☆☆☆

انعام یافتگان

1- علی ترمذی۔ ملتان 2- زویا حبیب۔ فیصل آباد 3- عباس خاص خلی۔ حیدرآباد

4- نواز بٹ، کوئٹہ 5- زاہد علی سید۔ پشاور

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے سنیل جنیس، محمد یامین، اکبر علی رئیسانی، نعمان اشرف، علی زبیر سید، مختار بٹ، رسول بخش پلہجو، زاہد

حیات، کاوش ارشد، علی نظیر، ارباز حسن، کبکھت گل، صدف فاطمہ، نیاز احسن ملکائی، ہارون صدیقی، عنبرین احمد، انعام حیات، اکبر حسین، اشرف اللہ خان، کلیم صدیقی، خاقان احمد، نذر حسین، اسرار احمد، عنایت نجر، فرحت عباس نقوی، سبیلین سید، غلام حسن، باسط فاروقی، یاسین خان، مولانا بخش بٹ، نیل اختر، عنایت مسیح، الیاس محمد، طفیل احمد، صباہت مرزا، قیام الدین انصاری، تنویر حسین، محمد احمد، منظر حسن، وردہ بتول، ہارون محمد، انیس احمد، سعید الدین مریت، محمد فتح یاب خان اچکزئی، فہیم بٹ، محمد فیضان، خواجہ خیر محمد، نواز سلیم کھوکھر، فرحین بشیر، مہوش علی خان، فیروز رحمانی، انیسہ خاتون، فرحت فاطمہ، نصیب فاروقی۔ خیر پور سے عباس مانھی، عنایت علی ماتلی، احمد علی زیدی، ارشاد حسین، نورین اصغر، نیابت علی زیدی، فاطمہ بخش علی، ناہید ماچھی، نسیم خان، یاور علی مرزا۔ کجرات سے انیس احمد، ذیشان علی سید، فرقان احمد، رفیق بٹ۔ شادی پور سے ارباز کمال۔ خانوال سے نیاز کھوسو، ارشد علی۔ ڈی آئی خان سے محمد شاد خان، یاور حسین، زاہد علی، سلیم کھوکھر۔ ڈی جی خان سے ایاز سومرو، محمد شادا خان، یونس احمد، طاہر خان۔ جہنگ سے عطاء المصطفیٰ، نورین ملک، التماس عباس۔ تلہ گنگ سے مسیح الدین خان۔ شجاع آباد سے خالد یاسر، پرویز احمد، غلام بخش زیدی۔ چنیوٹ سے خورشید رضوی، فتح یاب خان۔ سرگودھا سے رشید نسیم محمد یا مین، بشیر احمد، الیاس طارق بٹ، ایاز احمد۔ حاصل پور سے فرمان الیاس قادری۔ لڈن سے غلام حسن۔ بھکر سے محمد عارف قریشی۔ میر پور خاص سے زاہد حامد، نوشین فاطمہ زیدی، مجاہد علی ایس بنسی۔ اسلام آباد سے نیلو فر شاہین، فرمان حسین، علی عباس، یاسر حسن خان، آصف حسن۔ راولپنڈی سے ڈاکٹر سعادت علی خان، ظفر اسماعیل، نعیم احمد، سرفراز خان، یاسین محمد، بلقیس فاطمہ، نذر محمد، غلام الشکین، قیام احسن، اشرف ممتاز، انصار الدین انصاری، ابرار احمد، غلام حسن عثمانی، وصی احمد خان، ہارون محمد، سید تقی عباس تقی، نوید حسن خان، کاظم جعفری۔ احمد جان، محمد افضل، خوشی طینت، اسلم ملک، نور علی شاہ، ملک خورشید، ثناء اللہ بخاری، شاد علی، میاں احتشام، زاہد سلیم عرف گلو بٹ، احسان خان، شاہدہ بتول۔ بھکر سے طوبی اسلم۔ اسلام آباد سے خالد آفریدی، زیب النساء، فرحت رحمن، انور یوسف، راشد خان، فرحان احمد، باز خان آفریدی، کلیم احسن، فریحہ مرتضیٰ، سید زاہد حسین زیدی الواسطی شہزاد اکبر، نعمان عباس، شمیم عابدی، جعفر سعید انصاری، نمینہ گل عباس، ذیشان مصطفیٰ۔ واہ کینٹ سے محمد فیض، عباس عباسی، ذیشان مرزا۔ لاہور سے کائنات مرزا، منظر علی خان، فہد علی خان، ظفر احسنین، عباس علی سید، سرفراز بٹ، فرحین نیاز، قائم فریدی، فصیح احمد، کائنات بھٹ، نیاز چوہان، مصباح الرضا، نوید احسن، اصغر علی اصغر، مسین لاہوری، نعیم عباس، نواز کبیر، سلمان احمد، موٹی، پہلوان گیلانی، اشرف علی، تاثیر احسن، رحیم بخش، فہیم احمد، نجم الدین خان، گل فرحندہ سید۔ ساہیوال سے محمد افضل حکیم الدین، کاظم علی، ارباز خان، غلام رضا، زویا بتول۔ لڈن و ہاڑی سے منشی عزیز مئے۔ شیخوپورہ سے مبارک علی۔ پشاور سے عزیز اللہ خان، گل فرراز خان، عباس طوری، نذر علی سید، الیاس گل، انعام علی، یاسین محمد، قیام بخش، نوشین ملک، ارشد مہدی، سرفراز خان۔ جہلم سے نعیم علی، اسرار خان، منظر حسین، بھیکو، شاہد خان آفریدی، نعمان خان۔ بہاولپور سے منشی نوروز علی، کاظم علی، ایس اقبال، ثناء کوثر، چودھری رحیم داد، نور الہی فضل اللہ، نواز کھوکھر، اللہ بخش زرگر، فیضان مصطفیٰ، اسماعیل علی۔ مظفر گڑھ سے عباس سولنگی، مسرت علی، یاسین نقشبندی، حبیب علی مصطفیٰ، عتیق احمد، صابر حسن، برجیس مرزا، انور علی سید، تنویر احسن۔ جامشورو سے فیاض سومرو، برجیس کلہوڑو، عباس پھولہوٹو، منصور احمد (کرگزی)۔ حیدرآباد سے ناعمہ تحریم، جاوید عطاری، کوكب خان، فیض عثمانی، عرفان عباسی۔ ملتان سے محمد یحییٰ معین، فرحین گل، ابرار احمد خان، شیر گل۔ کوہاٹ سے فدا حسین طوری، نصیر عباسی، ریاض کوہاٹی۔ ہاڑی چم ہوتی مردان سے م انور۔ راجن پور سے ملک محمد ظفر اللہ۔ سیالکوٹ سے بابو باسط، کائنات مرزا۔ سرگودھا سے ملک نوشین، اصغر سید، بانو صدیق، ڈیرہ اسماعیل خان سے اصغر حسین سید۔ ڈیرہ غازی خان سے اشفاق علی، کاجل، فرحت، نیاز، اکبر حسین۔

بیرون ملک سے نیابت مرزا، اسرار خان (شارجہ)۔ زید علی (عمان)۔ احمد سہیل (قطیف، سعودیہ)۔ انصار ملک (العین)۔ ذاکر حسین (ماچھڑ بوکے)۔ محمد جنید انصاری الہندی (دہلی)۔ عباس علی، ایاز سومرو (بیٹنورڈ)۔ خالد ارشد آرائیں (اومان، مسقط)۔ نیاز کھوکھر (جرمنی)۔ ناصرہ احمد (166E, New York)

سفاک محسن

جناب معراج رسول
السلام علیکم

میں ایک پڑھا لکھا ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔ کراچی میں ٹیکسی چلانا کتنا رسکی ہے۔ یہ آپ بھی جانتے ہوں گے۔ میرے ساتھ ایک ایسا واقعہ گزرا ہے جسے میں بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ واقعہ کتنا عجیب اور دہلا دینے والا ہے یہ آپ کو پڑھ کر ہی اندازہ ہو جائے گا۔

تنویر حسن
(کراچی)

میں انٹر پاس ہوں۔ والد صاحب اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ انہوں نے سول انجینئرنگ کی تھی۔ میرے دونوں بڑے بھائی بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ ایک نے کیمسٹری میں باہر سے پی ایچ ڈی کی ہے اور ایک یونیورسٹی میں پڑھا رہے ہیں۔ دوسرے والد کی طرح سول انجینئر ہیں اور ایک سرکاری ادارے میں اچھے عہدے پر فائز ہیں۔ میری واحد بڑی بہن بھی گریجویٹیشن ہیں اور انہیں بھی آگے پڑھنے کا ارمان تھا مگر امی کو ان کی شادی کی جلدی تھی اس لیے وہ مزید تعلیم حاصل نہیں کر سکیں۔ گھر میں واحد میں ایک بچہ تھا جسے شروع سے تعلیم سے کوئی خاص دل چسپی نہیں تھی۔ اسکول کی حد تک بس پاس ہو جاتا تھا اور یہ بھی اللہ کا کرم ہے کسی مضمون میں فیل نہیں ہوا۔ البتہ مجھے کم نمبروں کی وجہ سے ایک عام سے کالج میں داخلہ ملا۔ وہاں کا ماحول اچھا نہیں تھا۔ سیاست تھی اور اکثر کلاسز بند رہتی تھیں۔ اس لیے میرا رہا سہا دل بھی نہ رہا اور میں نے بہت مشکل سے انٹر کر کے آگے پڑھنے سے انکار کر دیا۔ اس وقت والد صاحب نے کہا۔

”بیٹا اگر پڑھو گے نہیں تو روزگار کی بجائے ٹیکسی رکشا

مسلل بے روزگاری سے تنگ آ کر جب میں نے ٹیکسی چلانے کا فیصلہ کیا تو اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ اس شعبے میں مجھے اتنے انوکھے اور عجیب و غریب تجربات، ہوں گے جن کا میں نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔ ٹیکسی میں موت سے لے کر پیرائش تک سب دیکھا۔ ایک بہت نوجوان آدمی جو میری فرنٹ سینٹ پر میرے ساتھ بیٹھا ہوا گپ شپ کر رہا تھا اچانک ہی ساکت ہوا اور جب میں نے ٹیکسی روک کر اسے چیک کیا تو دنیا سے گزر چکا تھا۔ اسی طرح ایک دردزہ میں مبتلا خاتون نے ٹریفک جام کی وجہ سے میری ٹیکسی میں بچے کو جنم دیا۔ خوش قسمتی سے اس کی ماں اور ایک دوسری خاتون ساتھ تھیں اور اللہ نے خیریت کی کہ اسپتال پہنچنے پر زچہ بچے دونوں سلامت رہے تھے۔ اس دن سیٹ کور سے میں نے ٹیکسی کے پچھلے حصے کا پردہ کیا تھا۔ یہ دونوں واقعات صرف یہ بتانے کے لیے ہیں کہ میں نے کیا کچھ نہیں دیکھا۔ البتہ زیر نظر واقعہ ایسا ہے جس نے براہ راست مجھے متاثر کیا اور اگر اللہ کا کرم شامل حال نہ ہوتا تو شاید آج میں زندہ نہ ہوتا۔



چلا تا پڑے گا۔
ان کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔
اگرچہ مجھے بڑے بھائی کے توسط سے ایک
رائیویٹ کمپنی میں ریکارڈ کیپر کی جاب مل گئی
مگر یہ جاب اس وقت تک ہی مناسب رہی
جب تک کہ شادی نہیں ہوئی اور بچے دنیا میں
نہیں آگئے۔ اس کے بعد یہ جاب ناکافی ہو گئی
کیونکہ اس میں تنخواہ اتنی کم تھی کہ اب گزارا
نہیں ہوتا تھا۔ آسیہ میری کزن ہے اور اسی وجہ
سے میری شادی بھی ہو گئی ورنہ ہمارے
خاندان میں تو کوئی بھی انتر نہیں ہے۔ والد
صاحب ایک اچھا گھر چھوڑ گئے جس میں اوپر
تین تین پورشن ہیں۔ میرا پورشن سب سے اوپر
ہے۔ دونوں بھائی سپورٹ کرتے تھے اور مل
وغیرہ وہی اور آردیتے مگر وہ میرے بیوی بچے
تو نہیں پال سکتے تھے اور خود مجھے بھی یہ اچھا
نہیں لگتا تھا۔ پریشانی کے عالم میں میں نے
کمپنی والوں سے تنخواہ بڑھانے کی بات کی اور
ایک جھگڑے کے بعد نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے
ملازمت سے خواب دے دیا گیا۔

جب تک جاب تھی اس کی قدر نہیں
تھی۔ جب جاب نہیں رہی اور اس کی تلاش
میں دھکے کھانے پڑے تب جا کر مجھے اندازہ
ہوا کہ میں نے کفران نعمت کیا تھا۔ بے شک تنخواہ کم تھی مگر
گزارا تو ہو رہا تھا۔ بجائے اس کے کہ میں اور آسیہ اپنے
اخراجات پر قابو پاتے میں نے مزید کے چکر میں جاب ہی
گنوا دی۔ میر خیال تھا کہ مجھے دوسری جاب آسانی سے مل
جائے گی مگر اس کے بعد بے روزگاری کا ایک طویل دور
شروع ہوا جو اب مجھے کسی بھی نیک خواب کی طرح لگتا
ہے۔ دفتر بہ دفتر جاب کے لیے پاراہرا پھرتا رہا۔ بھائیوں
نے کوشش کی مگر نہ جانے کیا بات تھی جہاں جاتا انکار ہو جاتا
یا کوئی ایسا مسئلہ سامنے آ جاتا کہ ملازمت ملنے سے رہ جاتی۔
ایک بار تو اپائنٹ منٹ لیٹر بھی مل گیا تھا کہ اجا تک کمپنی کے
مالک بھائیوں میں جھگڑا ہو گیا اور کمپنی ہی بند ہو گئی۔

تنگ آ کر میں نے محنت مزدوری کا سوچا مگر یہ میرے
بس کی بات نہیں تھی۔ بچپن سے ناز و نعم میں پرورش پائی، کبھی
کوئی سختی نہیں دیکھی۔ اس لیے جب جوانی میں مشکل ہوئی تو

عادت نہیں تھی اس لیے سخت کام نہیں کر سکا۔ تب آسیہ نے
ٹیکسی کا مشورہ دیا۔ میں نے پہلے تو انکار کر دیا۔ ”تمہارا
دماغ خراب میں، میں اصغر علی کی اولاد ٹیکسی چلاؤں گا۔“
”تو ٹیکسی چلانا کون سی بری بات ہے۔ آپ محنت کا
کام کرنا چاہ رہے ہیں تو یہ بھی تو محنت ہی ہے۔“

جب میں نے غور کیا تو آسیہ کی بات درست
پائی۔ ٹیکسی چلانا بھی تو محنت کا کام تھا۔ پھر اس میں محنت تھی
مگر مشقت نہیں تھی۔ مجھے ڈرائیونگ آتی تھی اور میرے پاس
لائسنس بھی تھا۔ میں نے بھائیوں سے مشورہ کیا اور میرا
خیال تھا کہ وہ مخالفت کریں گے کہ ان کا بھائی ٹیکسی چلائے تو
یہ ان کی بے عزتی کے مترادف ہو گا۔ مگر انہوں نے میری
حوصلہ افزائی کی۔ ان کا کہنا تھا کہ کام سارے اچھے ہوتے
ہیں اس میں آدمی اپنی محنت اور قابلیت سے جگہ بناتا
ہے۔ اس میں آگے بڑھنے کا امکان بھی تھا۔ میں تیار ہو گیا۔
رقم کا مسئلہ آیا تو وہ بھی آسیہ نے حل کر دیا۔ اس کے پاس

فروری 2015ء

195

ماہنامہ سرگزشت

Copied From Web

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY

خاصا گولڈ تھا۔ اس نے اپنا ایک بڑا سیٹ دے دیا۔ اتفاق سے اس وقت سونے کی قیمت اپنے عروج پر تھی اور شاید پینسٹھ ہزار روپے تو لہ بک رہا تھا۔ چار تو لے کے سیٹ کے دو لاکھ ستائیس ہزار روپے مل گئے۔ کیونکہ یہ سیٹ آسیہ کے بھائی نے دنیا سے لیا تھا اس لیے اس کا گولڈ بہت اچھا تھا اور اسی وجہ سے اس کی قیمت بہت اچھی ملی۔

رقم کا مسئلہ حل ہوا اور میں نے مناسب گاڑی کی تلاش شروع کی۔ میں بلوکیب لینا چاہتا تھا۔ مگر مارکیٹ میں موجود تمام بلوکیب پرانی ہو چکی تھیں کیونکہ وہ گزشتہ بائیس سال سے مسلسل ٹیکسی کے طور پر استعمال ہو رہی تھیں۔ پھر ایک دوست کے توسط سے ایک بلوکیب لی جو ایک صاحب نے اپنے استعمال کے لیے رکھی تھی اور وہ بھی کم استعمال ہوئی تھی۔ گاڑی اچھی حالت میں تھی۔ بڑی گاڑی تھی اس لیے مناسب قیمت میں مل گئی۔ کچھ رقم اوپر سے خرچ کی اور گاڑی بہترین حالت میں آگئی۔ یوں میں نے ٹیکسی ڈرائیور کے طور پر کام شروع کیا۔ ان دنوں سی این جی کا بحران شروع ہوا تھا اور ہفتے میں دو دن سی این جی اسٹیشن بند رہنے لگے تھے۔ میں نے اس کا یہ حل نکالا کہ ایک سلینڈر اضافی لے لیا اور اسے بھروا کر رکھ لیتا تھا جب ضرورت ہوتی تو اسے فٹ کر لیتا۔ مگر اس کی نوبت کم آتی تھی۔

شروع میں کام اتنا نہیں تھا۔ میری رہائش ایک پوش علاقے میں ہے اور یہاں اکثر گھروں میں ایک سے زیادہ گاڑیاں ہیں۔ اس لیے ٹیکسی کی ضرورت اتنی زیادہ نہیں تھی۔ اس لیے میں نزدیک ہی ایک ایسے علاقے میں اسٹاپ پر کھڑا ہونے لگا جہاں لوگ تو کھاتے پیتے رہتے تھے مگر فلیٹ یا سی دوسری مجبوری کی وجہ سے گاڑی نہیں رکھ سکتے تھے۔ یہاں ٹیکسی کا کام خوب چلتا تھا۔ کم تعلیم کے باوجود میری شخصیت میں کوئی کمی نہیں تھی۔ اللہ نے اچھی شکل و صورت دیا ہے۔ میرے گھرانے کا علمی پس منظر اور شائستگی مجھ میں بھی آئی ہے۔ میں خود بھی صاف ستھرا رہتا تھا اور گاڑی بھی صاف ستھری رکھتا تھا۔ پھر کسٹمر سے اس طرح پیش آتا کہ جو ایک بار بیٹھتا وہ لازمی میرا نمبر لے لیتا تھا۔ اس کے بعد جب اسے ضرورت ہوتی کال کر کے گھر بلو لیتا۔ یوں مجھے جلد ہی کئی سواریاں میسر آ گئیں۔

ایک دولت مند فیملی نے مجھے اسکول سے بچے لانے لے جانے کے لیے رکھ لیا۔ اس خاندان کے کمانے والے مرد ملک سے باہر تھے اور گھر میں صرف خواتین، بچے اور

ایک معمر صاحب تھے۔ جب میں بچے چھوڑنے اور لینے جاتا تو وہی میرے ساتھ ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے میں یہ ذمے داری لینے پر آمادہ ہوا کیونکہ خدا نا خواستہ کوئی واردات ہو جاتی تو کون میری بات کا یقین کرتا کہ میں اس میں ملوث نہیں ہوں۔ معمر صاحب کی وجہ سے میری ذمے داری صرف ڈرائیور کی حد تک تھی۔ اس گلی بندھی ڈیوٹی سے مجھے اتنا مل جاتا تھا کہ ٹیکسی کی گیس اور مرمت کا خرچہ اسی سے نکل آتا تھا اور باقی کمائی خالص ہو جاتی۔ شروع میں بچوں کو لاتا لے جاتا تھا۔ پھر گھر کی خواتین کو بھی لانے لے جانے لگا۔ میری وجہ سے انہوں نے اپنے ڈرائیور کو نوکری سے نکال دیا۔ مجھے اس کا افسوس ہوا مگر اس میں میرا قصور نہیں تھا۔ میں ایک طرح سے ان کا بغیر تنخواہ کا ڈرائیور ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ بھی فائدے میں تھے کہ جتنا استعمال کرتے اتنا ہی معاوضہ دیتے تھے اور گاڑی کا خرچہ بھی بچتا تھا۔ جلد میں تقریباً اسی خاندان کے لیے انگیج ہو کر رہ گیا اور دن میں دو تین بار لازمی جانا ہوتا تھا۔ صرف گرمیوں کی چھٹی میں میری طلبی کم ہوتی تھی۔ ان دنوں میں دوسری سواریاں دیکھتا۔

میں نے محنت کی اور ایمان داری سے کام کیا تو اللہ نے جلد اس کا صلہ دیا اور میں اپنی سابق آمدنی سے دو گنا سے بھی زیادہ کمائے لگا تھا۔ عید اور شادیوں کے سیزن میں آمدنی مزید بڑھ جاتی تھی۔ پھر میں گھر میں زیادہ وقت دے سکتا تھا۔ آسیہ، بچوں کو کہیں لانا لے جانا ہوتا تو اپنی گاڑی موجود تھی ورنہ پہلے بھائیوں سے لینی پڑتی تھی۔ سب سے بڑھ کر اب مجھے بھائیوں سے مدد نہیں لینی پڑتی تھی۔ میری خود دار طبیعت کو پہلے بھی یہ بات کھلتی تھی۔ اس لیے اب میں مطمئن تھا۔ صرف اچھے طریقے سے گزارا نہیں ہو رہا تھا بلکہ میں کچھ نہ کچھ بچت بھی کرتا رہتا تھا۔ یہ نہ سمجھیں کہ ٹیکسی کے کام میں بہت پیسا ہے۔ کسی زمانے میں ایسا تھا مگر جب سے ایندھن اور دوسری چیزوں کی قیمت بڑھی ہے۔ یہ بھی بس گزارے لائق کام رہ گیا ہے۔ مجھے اس وجہ سے زیادہ آمدنی ہوتی تھی کہ میرا اچھی پارٹنر سے رابطہ ہو گیا تھا اور میں ان کے لیے کام کرتا تھا۔

میں عام طور سے صبح سات بجے نکلتا تھا۔ پہلے بچوں کو اسکول چھوڑتا اور اس کے بعد اسی فیملی کے ساتھ کچھ کام اور نمٹاتا۔ پھر بچوں کو اسکول سے لا کر واپس گھر آتا۔ کھانا وغیرہ کھا کر کچھ دیر آرام کرتا۔ ورنہ کال آنے پر چلا جاتا تھا۔ اس کے بعد میں شام سات آٹھ بجے تک باہر رہتا اور پھر گھر آ جاتا

جنت

باغ۔ نیک انسانوں کا مرنے کے بعد دائمی گھر۔ جنت ہر اس باغ کو بھی کہتے ہیں جس کی زمین درختوں کی وجہ سے نظر نہ آئے۔ بعض کے نزدیک ان گنجان درختوں کو بھی جنت کہا جاتا ہے جو زمین کو چھپائے ہوئے ہوں اور بہشت کو جنت یا تو دنیاوی باغات سے تشبیہ دے کر کہا گیا ہے۔ یا اس لیے کہ بہشت کی نعمتیں ہم سے غلی رگھی گئی ہیں جیسا کہ قرآن مجید کے اس ارشاد سے ظاہر ہے۔ ”کوئی تنفس نہیں جانتا کہ ان کے لیے کیسی آنکھوں کی ٹھنڈک چھپا رکھی ہے۔“ (17:32) جنت کی جمع جنات ہے۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ جنات کہنے کی وجہ یہ ہے کہ بہشت سات ہیں۔ (1) جنت الفردوس۔ (2) جنت عدن۔ (3) جنت النعیم۔ (4) دارالخلد۔ (5) جنت الماویٰ۔ (6) دارالسلام۔ (7) علیین۔ بعض اہل تحقیق نے بہشت کے آٹھ درجات قائم کیے ہیں۔ جو یہ ہیں۔ (1) عدن۔ (2) جنت الماویٰ۔ (3) فردوس۔ (4) نعیم۔ (5) دارالقرار۔ (6) دارالخلد۔ (7) دارالسلام۔ (8) دارالجلال۔ محققین نے یہ بھی لکھا ہے کہ سات درجے تو انسانوں کی قیام گاہ کے لیے ہیں لیکن آٹھواں دیدار حق تعالیٰ کے لیے لیکن دیدار حق کے لیے کون سا درجہ ہے اس بارے میں اختلاف ہے۔ حضرت ابن عباسؓ کے نزدیک یہ مقام علیین ہے۔ علامہ زحمری صاحب کشف نے جنت کے نام اس ترتیب سے بیان کیے ہیں۔ ”دارالخلد، دارالقمام، دارالسلام، جنت عدن، دارالقرار، جنت نعیم، جنت الماویٰ، جنت فردوس۔“ علامہ موصوف نے سورۃ الزاریات کی تفسیر میں لکھا ہے کہ عدن کو زمر دبیز سے بنایا گیا ہے۔ اس میں سخی و عادل و نمازی و زاہد اور آئمہ مساجد رہیں گے۔ جنت الماویٰ کو نور سے تیار کیا گیا ہے اور یہ مقام ہے شہید حقیقی، خیرات کرنے والوں، غصہ کھانے والوں اور تفسیروں کے معاف کرنے والوں کا۔ فردوس کو جلال کبرائی کے نور سے بنایا ہے۔ اس میں انبیاء علیہم السلام رہیں گے۔ اس کے درمیان ایک غرفہ نور رضا کا بنایا ہے۔ اسے مقام محمود کہتے ہیں۔ آنحضرتؐ اس میں تشریف رکھیں گے۔ نعیم کو زبرجد دبیز سے بنایا ہے۔ اس میں شہید اور مؤذن رہیں گے۔ دارالقرار کو مردارید روشن سے بنایا ہے۔ اس میں عام مومنین رہیں گے۔ دارالسلام کو یا قوت سرخ سے بنایا ہے۔ اس میں فقیر، صابر رہیں گے۔

مرسلہ: نعیم عطاری۔ کراچی

اس کے بعد صرف جاننے والوں کی کال پر جاتا اور رات دس بجے کے بعد پناہ موہا نکل بند کر دیتا۔ صرف ایک اور نمبر تھا جو اسی فیملی کو دیا ہوا تھا کہ کوئی ہنگامی ضرورت ہو تو مجھے کال کر لیں۔ مگر اس کی نوبت شاذ ہی آتی تھی۔ فیملی جانتی تھی کہ میں رات دس بجے کے بعد نہیں نکلتا ہوں اس لیے وہ بلا ضرورت کال نہیں کرتی تھی۔ ملازمت چھوٹنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا جب میں سکون سے زندگی گزار رہا تھا اور خوش تھا۔

ان داؤں گرمیوں کی چھٹیاں تھیں اور یہ دو سال پرانی بات ہے۔ شدید گرمی کی وجہ سے دن میں لکنا مشکل ہوتا تھا۔ دن بھر لو چلتی اور رات بھی خاصی دیر میں جا کر ٹھنڈی ہوتی تھی۔ لوگ بارش کی دعائیں مانگ رہے تھے مگر شہر کراچی میں ابر باراں مشکل سے ہی برستا ہے۔ اس دن موسم بہت گرم تھا اور اتفاق سے میں سارا دن مصروف رہا تھا۔ اس لیے جب شام میں گھر آیا اور نہادھو کر ذرا سکون میں آیا تو میں نے پھر گھر میں رہنے کا فیصلہ کیا۔ بچے خوش ہو گئے کہ میں ان کے ساتھ تھا۔ میری چھوٹی بیٹی عالیہ مجھ سے بہت اسیج ہے وہ فوراً اپنے اسکول کی چیزیں لے آئی اور مجھے دکھانے لگی۔ آٹھ بجے رات کا کھانا کھا کر میں ٹی وی دیکھنے لگا۔ اچانک موبائل نے بیل دی تو میں نے دیکھا۔ اسی فیملی کا نمبر آ رہا تھا۔ ان کے کئی نمبر تھے جو میرے پاس محفوظ تھے۔ میں نے کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے کس مرد نے کہا۔

”تنویر حسن۔“

”بات کر رہا ہوں جناب؟“ میں نے محتاط انداز میں کہا۔ ”آپ کون ہیں۔“

”پہچانا نہیں۔“ آدمی نے بے تکلفی سے کہا۔ ”میں ابھی آیا ہوں۔“

”صباحت صاحب۔“ میں نے کہا۔ صباحت اس فیملی میں بڑے بیٹے تھے۔

”ٹھیک پہچانا۔“ آدمی بولا۔ ”سوری یار اس وقت کال کی ہے، لیکن ایبر جنسی ہے۔ تم نے..... اسپتال دیکھا ہے۔“ اس نے ایک نجی اسپتال کا نام لیا۔

”جی صباحت صاحب، باقی کو وہاں لے جاتا رہا ہوں۔“

”بس یہاں آ جاؤ۔ امی کو ساتھ لایا ہوں مگر گاڑی میں مسئلہ ہو گیا ہے۔ ان کو دوسرے اسپتال لے جاتا ہے۔

ممکن ہے تمہیں آج رات میرے ساتھ رہنا پڑے۔“

کوئی اور ہوتا تو میں انکار کر دیتا مگر اس فیملی کو انکار

مزاحمت کی کوشش نہیں کی۔ اس نے حکم دیا۔ ”اب یہاں سے چلو۔ گلشن کی طرف جانا ہے۔“

میں نے نیکی نکالی اور اس اُمید پر آس پاس دیکھا کہ شاید صباحت صاحب نظر آجائیں اور وہ سمجھ جائیں کہ میں کس مشکل میں پڑ گیا ہوں۔ اگرچہ وہ دیکھ لیتے اور اگر سمجھ جاتے تب بھی زیادہ سے زیادہ پولیس کو کال کر سکتے تھے۔ ہماری پولیس کی کارکردگی سب کے سامنے ہے کہ پارکٹ کلرزان کے سامنے اپنا کام کر کے نکل جاتے ہیں اور یہ دیکھتی رہ جاتی ہے۔ مگر جب انسان ڈوبنے لگتا ہے تو تنکے کا سہارا بھی تلاش کرتا ہے۔ اگرچہ میں جس مشکل میں پڑ گیا تھا اس سے مجھے اللہ ہی نکال سکتا تھا۔ میں نے شاہراہ پر آتے ہوئے کہا۔ ”جناب، میں ایک نیکی ڈرائیور ہوں میرا کسی جھگڑے یا چکر سے تعلق نہیں ہے۔“

”فکر مت کرو۔“ اس نے کہا۔ ”تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ بس جو ہم کہیں وہ کرتے رہو تو کچھ دیر بعد تم کو چھوڑ دیں گے اور معاوضہ بھی دیں گے۔“

مجھے اس کی بات پر قطعی اعتبار نہیں آیا۔ اول تو وہ کسی چکر میں مجھے ساتھ لے جا رہے تھے اور اگر چھوڑتے تو امکان تھا کہ معاوضہ ایک گولی کی صورت میں ملتا تاکہ کوئی عینی گواہ باقی نہ رہے۔ میں نے پھر فریاد کی۔ ”میرے چھوٹے بچے ہیں اور میں ہی اپنے گھر کا واحد نفیل ہوں۔“ وہ ہنسا۔ ”مرتے کیوں ہو، جوان آدمی ہو حوصلہ کرو۔ بندے کو یقین رکھنا چاہیے کہ جب تک اوپر والے کی طرف سے طے کیا ہوا وقت نہیں آتا کوئی مرتا نہیں ہے اور جب وقت آجائے تو بچتا نہیں ہے۔“

میں چپ ہو گیا۔ وہ ٹھیک کہہ رہا تھا مگر انسان کی فطرت ہے وہ ڈرتا ضرور ہے۔ عقب میں بیٹھے دونوں افراد آپس میں بات کر رہے تھے۔ ایک نے کہا۔ ”تم نے اچھی گاڑی اٹھائی، عین موقع پر جواب دے گئی۔“

”تو اسے بھی میں نے ہی بلوایا تا۔“ دوسرے نے جواب دیا۔ ”میرے ذہن کی داد دو کہ بروقت خیال سوچا۔“

میں چونکا۔ ”مجھے کال تم نے کی تھی؟“

”ہاں یہ موبائل چند دن پہلے لیا ہے اس کی میموری میں تمہارا نام شامل تھا۔“ پیچھے سے جواب آیا۔ ”نام ہے نیکی تنویر حسن۔ بس تم اس وجہ سے بلائے گئے ہو۔“

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ اس فیملی کا اپنا

مشکل تھا اس لیے میں تھکن کے باوجود جانے کو تیار ہو گیا۔ آسیر نے دبے لفظوں میں کہا بھی کہ میں نہ جاؤں۔ کوئی لازمی تو نہیں تھا کہ میں ہی جاتا ان کے اور بھی جاننے والے تھے ان کو بلا لیتے۔ مگر مجھے اچھا نہیں لگا کہ وہ مجھ پر اعتماد کرتے ہیں تو میں انکار کر دوں۔ میں روانہ ہوا اور آدھے گھنٹے بعد مذکورہ اسپتال کے سامنے تھا۔ یہ ایک مرکزی شاہراہ پر واقع ہے اور سروس روڈ پر پارکنگ مشکل سے ملتی ہے۔ میں نے ایک جگہ نیکی روک کر صباحت صاحب کو کال کی۔ انہوں نے ریسپونڈ کی تو میں نے کہا۔

”میرا آ گیا ہوں۔“

”کہاں رہو؟“

میں نے جگہ بتائی جہاں میں نے گاڑی پارک کی تھی۔ انہوں نے کہا کہ وہ آرہے ہیں۔ مگر اس کے بعد میرے ساتھ جو ہوا اس کا میں نے سوچا بھی نہیں تھا۔ میں نے گرمی کی وجہ سے آگے کے دونوں شیشے نیچے کر رکھے تھے۔ اچانک ایک شخص سائیز پر آیا اور اس نے آہستہ سے کہا۔ ”تم میرے پستول کی زد پر ہو۔ پیچھے کا دروازہ ان لاک کر دو۔ غلط حرکت مت کرنا ورنہ مر جاؤ گے اور اس سے پہلے کہ کوئی ہمیں دیکھے ہم یہاں سے جا چکے ہوں گے۔“

مجھے اس سے پہلے بھی ایسی صورت حال سے واسطہ نہیں پڑا تھا۔ کبھی موبائل چھیننے کی واردات بھی نہیں ہوئی تھی اور اب ایسا لگ رہا تھا کہ وہ گاڑی سمیت مجھے لے جانے آئے تھے۔ رتنہ مجھ سے چابی مانگ کر نیچے اتار دیتے۔ سچی بات ہے پستول کا سن کر میرے ہوش اڑ گئے تھے۔ پہلے ہی پسینا آ رہا تھا اور اس لیے مزید پسینے کے بارے میں کہہ نہیں سکتا۔ البتہ جسم کا پسینہ لگا تھا۔ آج کل ہمارے ہاں انسانی جان سب سے سستی ہو گئی ہے کیونکہ قاتلوں کو کوئی پکڑنے والا اور سزا دلوانے والا نہیں ہے۔ میں نے لرزتے ہاتھوں سے پچھلے دروازے کا لاک کھولا اور بولا۔ ”دیکھو تمہیں گاڑی چاہیے تو لے جاؤ۔“

”ہمیں گاڑی تمہارے ساتھ چاہیے۔“ میرے سر پر موجود شخص نے کہا۔ ایک تو وہاں نیم تار کی تھی جس میں صورت نظر نہیں آرہی تھی دوسرے میں اس کی طرف دیکھنے کی جرات بھی نہیں کر پا رہا تھا۔ عجبی دروازہ کھلا اور دو افراد اندر آ گئے۔ اس کے بعد میرے سر پر موجود آدمی گھوم کر آیا اور فرنٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تب میں نے اس کے ہاتھ میں پستول دیکھا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ میں نے بلف سمجھتے ہوئے

میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور ایک بار پھر اپنی عافیت کی دعا مانگنے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ فائرنگ کی آوازوں کا ان تینوں سے کوئی تعلق تھا تب ہی پیچھے بیٹھے آدمی نے مجھے انجن اشارت کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس نے چند لمحے بعد کہا۔ ”گاڑی سیدھی نکالنا اور مین روڈ پر سیدھے پر موڑ لینا۔“

مشکل سے ایک منٹ بعد اس طرف سے دو سائے نمودار ہوئے جس طرف وہ دونوں گئے تھے۔ وہ بھاگ رہے تھے مگر ان میں سے ایک لڑکھڑا رہا تھا۔ عقب میں موجود آدمی ایک دم چوکننا ہو گیا اور اس نے سیٹ کی پناہ میں خود کو چھپا لیا تھا۔ میں ایک بار پھر کانپ اٹھا تھا۔ پتا نہیں آنے والے کون تھے اور وہ کیا کرتے۔ مگر نزدیک آنے پر وہ وہی دونوں ثابت ہوئے جو ٹیکسی سے گئے تھے۔ فرنٹ سیٹ والا اپنی جگہ آ گیا اور دوسرا اندر گھستے ہوئے بولا۔

”جلدی نکلو وہ آنے والے ہیں۔“

میں نے ایکسی لیٹر دیا اور عجلت میں ٹیکسی بھاگائی۔ ابھی ہم کچھ دور گئے ہوں گے کہ عقب سے چند افراد اٹکلے اور انہوں نے ٹیکسی کی طرف فائرنگ کی۔ سب نے سر نیچے کر لیے اور ٹیکسی لہرائی تھی مگر میں نے اسے قابو کر لیا اگلے لمحے ہم مین روڈ کی طرف مڑ گئے تھے اور یہاں ٹیکسی کو لائن میں لانے کے دوران کئی گاڑیوں سے نکر ہوتے ہوتے بچی تھی۔ جب ٹیکسی اور میرے ہاتھ پاؤں قابو میں آئے تب میں نے محسوس کیا کہ فرنٹ سیٹ والا زخمی تھا اور وہی کراہ رہا تھا۔ پیچھے رہ جانے والے نے پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”کام ہو گیا مگر مجھے بھی گولی لگی ہے۔“ فرنٹ سیٹ والے نے جواب دیا۔

”وہ کتے کے بچے بھی مسلح تھے۔“ فرنٹ سیٹ والے کا ساتھی بولا۔ ”پرسب کو ٹپکا دیا۔“

”لائٹ جلاؤ۔“ فرنٹ سیٹ والے نے کہا تو میں نے اندر کی لائٹ آن کر دی۔ اس نے اپنی شرٹ کے نچلے ٹین کھول کر اسے اوپر کیا تو اس کے پیٹ اور سینے کے درمیان والی جگہ دائیں طرف گولی کا نشان نظر آیا۔ زخم سے رہ رہ کر خون ابل رہا تھا۔ اس نے رد مال نکال کر اس پر رکھا اور بولا۔ ”کسی میڈیکل اسٹور کے پاس رکنا۔“

ذرا آگے ایک میڈیکل اسٹور تھا۔ میں نے سروس روڈ پر لیتے ہوئے اس سے ذرا دور ٹیکسی روک لی۔ ان میں سے ایک اتر کر گیا اور میڈیکل اسٹور سے دوائیں اور مرہم پٹی کا

کوئی موبائل گم ہو گیا اور وہ ان کے پاس پہنچ گیا انہوں نے مجھے دھوکے سے کال کر کے بلوایا تھا۔ میرا ابتدائی خوف کم ہو گیا تھا اور میں کسی قدر پرسکون تھا۔ ”دیکھو تم میری ٹیکسی میں کوئی واردات کرو گے اور بھاگ جاؤ گے۔ پولیس مجھے پکڑے گی۔“

”نہیں پکڑے گی۔“ میرے برابر والے نے کہا۔ وہ نوجوان اور خوش نکل آدمی تھا۔ ”مجبوری تھی ورنہ ہم خود کسی شریف آدمی کو تکلیف نہیں دیتے ہیں۔“

گلشن پہنچ کر اس نے ایک جگہ ٹیکسی رکوائی۔ یہ کبھی آبادی تھی جو چاروں طرف سے پوش آبادی میں گھری ہوئی تھی اور بہت بدنام تھی۔ یہاں منشیات کا کاروبار ہوتا تھا اور اکثر مفروضہ ملزم یہیں روپوش ہوتے تھے۔ آئے دن یہاں پولیس چھاپے مارتی تھی مگر پکڑے جانے والے چند دن میں چھوٹ کر واپس آ جاتے اور اپنے دھندے پھر سے شروع کر دیتے تھے۔ ان میں سے دو ٹیکسی سے اتر گئے اور ایک پیچھے بیٹھا رہا۔ برابر والے نے اترنے سے پہلے کہا۔ ”کوئی حماقت مت کرنا مجھے تمہارے بیوی بچوں کا خیال آ رہا ہے مگر تم بھی ان کا خیال رکھنا۔ میرا آدمی یہاں موجود ہے۔“

وہ دونوں کچی گلیوں میں غائب ہو گئے اور میں دوسرے آدمی کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھا اپنی عافیت کی دعا میں مانگتا رہا۔ لہجے سے وہ تینوں پڑھے لکھے لگ رہے تھے مگر ساتھ ہی ان کے لہجے میں ہلکی سی جھلک تھی جس سے لگتا تھا کہ اردو ان کی مادری زبان نہیں ہے۔ ٹیکسی انہوں نے ایسی جگہ رکوائی تھی جہاں تاریکی تھی اور دور سے دیکھنے سے یہ پتا چلانا مشکل تھا کہ ٹیکسی میں کوئی ہے یا خالی ہے۔ رات کے ساڑھے نو بجے تھے مگر رہائشی تعلقہ ہونے کی وجہ سے یہاں سناٹا اور ویرانی تھی۔ ایک دو گاڑیاں گزر رہی تھیں اور پیدل جانے کی ہمت صرف اسی چنی آبادی کے لوگوں کی ہوتی تھی کیونکہ یہاں لوٹ مار کی وارداتیں بھی بہت ہوتی تھیں۔ اس لیے لوگ یہاں سے پیدل گزرنے سے گریز کرتے تھے۔ گاڑی والے بھی بس وہی گزرتے تھے جن کی مجبوری ہوتی تھی۔ ان دونوں کو گئے ہوئے دس منٹ ہونے کو آئے تھے اور اب تک ان کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ اچانک ذرا دور سے فائرنگ کی آواز آئی۔ یہ سن کر فائر تھے۔ پیچھے موجود آدمی نے مضطرب لہجے میں کہا۔

”انجن اسٹارٹ کرو مگر روشنیاں بند رکھنا۔“

سامان۔ لے آیا۔ اس نے آتے ہی فرنٹ سیٹ والے کو طاقتور پین کلر کو اڈ ڈرنک کے ساتھ دی۔ مگر اسے باقاعدہ علاج کی ضرورت تھی میں نے کہا۔ ”تمہیں اسپتال جانا ہوگا۔“

”اپنا منہ بند رکھو۔“ وہ غرایا۔ ”گاڑی چلاؤ۔“

میں نے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ وہ دو اکھا کر اپنے زخم پر خون جذب کرنے والی پٹی رکھ رہا تھا۔ پھر اس نے اوپر سے ٹیپ کر کے اسے بند کر دیا۔ چند منٹ بعد میں نے کہا۔ ”تم نے کہا تھا کہ کام ہو جانے کے بعد مجھے جانے دو گے؟“

”اپنا منہ بند کر۔“ اس بار پیچھے والے نے خون خوار لہجے میں کہا۔ ”ابھی بندے ٹپکا کر آرہے ہیں ایسا نہ ہو تجھے بھی ٹپکا دیں۔“

”خدا کے لیے۔“ میں کانپ گیا۔

”ڈرو مت۔“ اس پار فرنٹ، سیٹ والا نرمی سے بولا۔ ”یہ مسئلہ ہو گیا ہے ورنہ تمہیں جانے دیتے۔ اب تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہوگا۔“

”کہاں؟“

”اسی راستے پر چلتے رہو آگے سے چورنگی سے دائیں طرف موڑ لینا۔“

میں کلر مند ہو گیا۔ اس چورنگی سے دائیں طرف چند کلومیٹرز کے بعد شہر کا بیرونی حصہ آ جاتا اور وہاں کی آبادیوں کی اچھی شہرت نہیں تھی۔ جرائم پیشہ اور پیشہ ور قاتل وہیں آبادیوں میں رہتے تھے کیونکہ ان جگہوں پر ان کی حکومت تھی۔ پولیس والے وہاں جاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ مجھے ایک بار پھر اپنی عافیت شدید خطرے میں نظر آنے لگی تھی۔ وہ مجھے ساتھ لے کر گئے تھے اور انہوں نے کچھ لوگوں کو قتل کیا تھا۔ میں یعنی گواہ تو نہیں تھا مگر اس کے خلاف گواہی دے سکتا تھا اس لیے وہ مجھے چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ مجھے اب واپس آنا نصیب نہیں ہوگا۔ مگر میں انکار نہیں کر سکتا تھا۔ مرنا کیا نہ کرتا اس کے حکم کی تعمیل کی۔ یہاں تک خاصی ٹریفک تھی مگر دوسری سڑک پر مڑتے ہی ٹریفک یک دم کم ہو گیا اور جیسے جیسے ہم آگے جا رہے تھے اس میں مزید کمی آ رہی تھی۔ میں نے ہمت کر کے پوچھا۔ ”تمہیں کہاں جانا ہے؟“

”اسی سڑک پر ذرا آگے ایک جگہ ہے۔“ فرنٹ سیٹ والے نے جواب دیا۔ پین کلر لینے کے بعد اس کی تکلیف میں کمی آئی تھی اور وہ اب سکون میں تھا۔ مگر میں اس کی ہمت

کی داد دے رہا تھا۔ جسم میں گولی کی موجودگی برداشت کرنا یقیناً آسان کام نہیں ہوتا ہے۔ وہ حوصلہ مند نوجوان تھا۔ شکل صورت سے اچھا لگ رہا تھا۔ مگر آج کل جرائم کے معاملے میں شکل و صورت پر اعتبار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ میں نے خود گین پوائنٹ پر ایسے لڑکوں کو سہراہ لوگوں سے موبائل اور رقم چھینتے دیکھا ہے جو صورت سے نہایت شریف اور اچھے گھرانوں کے لگتے ہیں۔ ان کو دیکھ کر لگتا ہے کہ انہوں نے کبھی مکھی بھی نہیں ماری ہوگی مگر وہ بندے مار دیتے ہیں۔ چند کلومیٹرز بعد سڑک سنسان ہو گئی اور اب سوائے میری ٹیکسی کے کوئی اور گاڑی نہیں تھی۔ اس سڑک پر لوگ دن میں بھی جاتے ہوئے ڈرتے تھے اور صرف وہی جاتے تھے جن کو یہاں کام ہوتا تھا۔ اس سڑک پر آگے ماربل اور پتھر کرش کرنے والی فیکٹریاں تھیں جو شہر میں تعمیراتی کاموں کے لیے ماربل اور کرش مہیا کرتی ہیں۔ مزید چند کلومیٹرز سفر کے بعد وہ فیکٹریاں بھی آگئیں اور انہوں نے ابھی تک ایسا کوئی اشارہ نہیں دیا تھا کہ انہیں کہاں جانا تھا؟

میری پریشانی اور خوف بڑھ رہا تھا۔ جب فیکٹریاں بھی ختم ہو گئیں تو میں نے ہمت کر کے پھر پوچھا۔ ”اب کہاں جانا ہے؟“

”آگے سے جو سڑک جھیل کی طرف جاتی ہے اس طرف مڑ جانا۔“ پیچھے موجود آدمی نے کہا۔

”لیکن اس طرف تو ویرانہ ہے۔“ میں نے گھبرا کر کہا۔

”اسی طرف ہمیں جانا ہے۔“ فرنٹ سیٹ والا بولا۔ ”بس زیادہ دور نہیں ہے مشکل سے ایک کلومیٹر دور ہو گا۔“

”مجھے لگا کہ وہ مجھے دلا سہ دے کر میری قتل گاہ تک لے جا رہا ہے اس ویرانے میں مجھے مار کر خاموشی سے دفن کر دینا کون سا مشکل کام تھا کسی کو پتا بھی نہیں چلتا کہ میں کہاں چلا گیا۔ اس وقت مجھے آسید اور بچے بہت یاد آئے اور میں نے اللہ سے دعا کی کہ اگر میری زندگی ہے۔ تو میرے بیوی بچوں کی خاطر مجھے بچانا۔“

میں بیوی بچوں کو یاد کر رہا تھا کہ اچانک میرے موبائل کی بیل بجی اور وہ تینوں چونکے۔ میں نے موبائل نکال کر دیکھا تھا کہ فرنٹ سیٹ والے نے چھین کر اسے آف کر دیا۔ اس پر آسید کی کال آ رہی تھی۔ اس نے موبائل آف کر کے ڈیش بورڈ کے خانے میں ڈال دیا اور میں بے بسی

”اس وقت تمہارے لیے جانا ٹھیک نہیں ہے۔“ اس نے کہا۔ ”دوسرے تم نے ہمارا ٹھکانا دیکھ لیا ہے۔“

”تت..... تم مجھے قتل کر دو گے۔“ میں نے ہلکا کر کہا۔

”نہیں..... یہ ہمارا عارضی ٹھکانا ہے اور صبح سے پہلے ہم یہاں سے چلے جائیں گے تب تمہیں بھی جانے کی اجازت ہوگی۔“

”یار کیوں اتنی وضاحت کر رہا ہے۔“ عقیبی نشست والا بولا۔ ”نہیں مان رہا تو اسے گولی مار۔“

”نہیں۔“ میں جلدی سے چابی نکال کر نیچے اتر آیا۔ ”مان تو رہا ہوں۔“

وہ تینوں مجھے گھیرے میں لے کر ایک مکان کی طرف بڑھے۔ چار دیواری میں بڑا سالو ہے کا رنگ آلود گیٹ لگا ہوا تھا۔ انہوں نے اس کا چھوٹا دروازہ کھولا اور ہم اندر آئے۔ یہاں ایک بڑی سی کھلی جیب موجود تھی اور کونے میں دو کمرے بنے ہوئے تھے ان کے ساتھ ایک لیٹرین یا غسل خانہ تھا۔ وہ مجھے ایک کمرے میں لائے اور میری جینسی لائٹ جلائی۔۔۔ فرنٹ سیٹ والے نے کہا۔ ”ابھی تم کچھ دیر یہاں رہو گے۔ میں پھر کہہ رہا ہوں کوئی حماقت مت کرنا ہم تمہیں مارنا نہیں چاہتے ورنہ کب کا مار چکے ہوتے۔ ذرا صبر کرو پھر تم آزاد ہو گے۔“

وہ دروازہ باہر سے بند کر کے چلے گئے۔ جس اور گرمی سے زیادہ خوف اور گھبراہٹ سے میرا دم گھٹنے لگا تھا۔ میرا دل چاہا کہ چلانا شروع کر دوں اور ان سے کہوں کہ اگر مجھے مارنا ہے تو ابھی مار دیں یوں اذیت نہ دیں۔ نہ جانے کیسے میں نے خود پر قابو پایا۔ اب تک انہوں نے مجھ سے جو وعدے کیے تھے ان میں سے ایک بھی پورا نہیں کیا اور وہ مجھے یہاں تک لے آئے تھے۔ مجھے یہاں قید کر دیا تھا اور شاید یہیں مار کر مجھے دفن کر دیتے۔ اس کمرے کا فرش کچا تھا۔ دیواریں اینٹوں سے بنی تھیں اور اوپر سینٹ کی شیٹ تھی۔ دروازہ لوہے کا تھا اور اسے کھولنا کسی صورت ممکن نہیں تھا۔ کمرے میں صرف لوہے کی چار پائی تھی۔ ایمر جنسی لائٹ کیل کی مدد سے دیوار برنگی تھی۔ میں چار پائی پر بیٹھ گیا۔ ابھی ان لوگوں کو گئے ہوئے کچھ دیر گزری تھی کہ کسی کی گھنٹی گھنٹی چیخ سنائی دی اور پھر وہ کرائے لگا۔ شاید فرنٹ سیٹ والے کے جسم سے گولی نکالی جا رہی تھی۔ اس کی کراہیں دس پندرہ منٹ تک سنائی دیتی رہیں پھر خاموشی چھا گئی۔

سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔ یقیناً آسپہ فکر سے کال کر رہی تھی کہ میں کہاں تھا؟ جلد وہ سڑک بھی آگئی جس پر مجھے مڑنا تھا۔ یہ کبھی پکی سڑک رہی تھی مگر اب بارشوں کی وجہ سے اس کا حشر ہو گیا تھا اور جگہ جگہ جمپ اور کھڈے تھے۔ ٹیکسی اس پر مڑتے ہی اچھلنے لگی تھی۔ اچانک ہی روشنی میں سڑک کے ساتھ ایک جوڑا دکھائی دیا۔ وہ یوں کھڑے تھے جیسے کسی گاڑی کے منتظر ہیں۔ ٹیکسی دیکھ کر انہوں نے ہاتھ لہرایا۔ مگر میں روک نہیں سکتا تھا۔ فرنٹ سیٹ والے نے انہیں اس وقت دیکھا جب ٹیکسی ان کے پاس سے گزرنے لگی تھی۔ اس نے بے ساختہ گالی دی۔ ”..... یہ یہاں موجود ہیں۔“

عقبی نشست والے نہیں دیکھ سکے تھے۔ ایک نے پوچھا۔ ”کون کس کی بات کر رہے ہو؟“

”وہی جوڑا..... کاش کہ یہ مسئلہ نہ ہوتا تو آج انہیں نہیں چھوڑتا۔“

”دفع کرو۔“ پیچھے والے نے کہا۔ ”ہمیں کیا؟“

”نہیں ایسے لوگوں کو بالکل نہیں چھوڑنا چاہیے۔“ وہ غرایا۔ نہ جانے کیوں اسے اس جوڑے سے اتنی پر خاش تھی اور وہ انہیں مارنے کی بات کر رہا تھا۔ مجھے ان دونوں سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا کہ یہ زخمی تھا ورنہ ان بے چاروں کی شامت آجاتی۔ گاڑی گزرنی تو میں نے عقبی آئینے میں دیکھا وہ مین روڈ کی طرف جا رہے تھے۔ ویسے مجھے تائب ہوا تھا کہ یہ جوڑا اس ویرانے میں کیا کر رہا تھا؟ مگر مجھے زیادہ سوچنے کا موقع نہیں ملا۔ میری توجہ ڈرائیونگ پر مرکوز تھی ذرا سی غلطی سے گاڑی کو نقصان ہو سکتا تھا اور میں واپسی کے قابل بھی نہ رہتا اگر یہ مجھے واپس جانے کی اجازت بھی دے دیتے۔

سڑک سے تقریباً ایک کلومیٹر اندر آنے کے بعد فرنٹ سیٹ والے نے رکنے کو کہا۔ مجھے سڑے ہوئے پانی کی بدبو آ رہی تھی گویا ہم قبیل کے آس پاس کہیں تھے۔ یہاں نیم تاریکی میں چند مکانوں کے ہیولے دکھائی دے رہے تھے۔ وہاں لائٹ نہیں تھی یا اگر کسی طرح سے بجلی لی ہوئی تھی تب بھی لائٹ غائب تھی۔ میں نے سکون کا سانس لیا کہ ان کا ٹھکانا آ گیا تھا۔ اب مجھے جانے کی اجازت مل جانی چاہیے تھی۔ مگر فرنٹ سیٹ والا کسی قدر وقت سے نیچے اتر اور اس نے مجھ سے کہا۔ ”نہیں۔“

”کیوں؟“ میں چلا اٹھا تھا۔ ”تم نے کہا تھا کہ تم مجھے جانے کی اجازت دو گے۔“

کمرے میں جس اور گرمی کی وجہ سے مجھے پیاس لگنے لگی تھی اور دروازہ بجا کر ان سے پانی مانگتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ مگر کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک شاہراہ پر اندر رکھ دیا۔ دروازہ بند ہونے پر میں نے اسے اٹھا کر دیکھا تو اس میں پانی کی ایک بوتل اور دو عدد سیب تھے۔ میں نے پانی پیا اور سیب کھانے کا خیال بھی ذہن کے کسی گوشے میں نہیں تھا۔ پانی پی کر میں خود کو کسی قدر بہتر محسوس کرنے لگا اور مجھے خیال آیا کہ اس سے پہلے میری قسمت کا فیصلہ ہو جائے مجھے آزاد ہونے کی کوشش کرنی چاہیے تھی۔ پہلی بار میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ اس میں ایک طرف لوہے کی گرل اور پٹ والی کھڑکی لگی تھی۔ میں نے اپنا سر پٹ لیا اتنی دیر سے گرمی اور جس برداشت کر رہا تھا اور کھڑکی کی طرف دیکھا بھی نہیں تھا۔ کھڑکی مسلسل بند رہنے کی وجہ سے کسی قدر جام تھی مگر زور لگانے پر کھل گئی۔

اس کے کھلتے ہی باہر سے جاں نتر اور تازہ ہوا کا جھونکا آیا اور مجھے لگا جیسے میں قبر سے باہر آ گیا ہوں۔ باہر اس وقت تیز ہوا چل رہی تھی اور ایسی آواز آرہی تھی جیسے کہیں مٹی گر رہی ہو۔ یہ کھلا علاقہ تھا اور یہاں ہوا تیز ہی چلتی ہے۔ کھڑکی کھولتے ہوئے ذرا آواز ہوئی تھی میں ڈرا کہ کہیں کوئی متوجہ نہ ہو مگر کسی نے توجہ نہ دی۔ چند گہرے سانس لے کر میں نے کمرے کا جائزہ لیا۔ دیواریں بغیر پلاسٹر کی لیکن مضبوط تھیں اور ان میں کہیں رخندہ تک نہیں تھا۔ اسی طرح واحد دروازہ لوہے کا اور یہ بھی ایسا تھا کہ اسے توڑنے کا سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ میں مایوس ہوا تھا کہ اس قید خانے سے باہر جانے کی کوئی راہ نہیں تھی۔ دروازے کے نیچے تین انچ کا خلا تھا اور اس سے صرف کوئی ٹلی باہر جاسکتی تھی۔ کسی انسان کا نکلنا ممکن نہیں تھا۔ میں چار پائی پر آ بیٹھا اور انتظار کرنے لگا کہ قدرت میرے لیے کیا سامنے لاتی ہے۔

باہر سنا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ سو گئے تھے تو یہ میرے لیے موقع تھا کہ یہاں سے فرار ہو جاؤں۔ مگر کیسے یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کمرے سے نکل جاتا تو اس کے بعد یہاں سے فرار ہونا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ کیونکہ اس گھر کی چار دیواری زیادہ اونچی نہیں تھی اور باہر میری ٹیکسی تھی جس کی چابی بھی میرے پاس تھی۔ سوچتے ہوئے ایک بار میری نگاہ دروازے کے نیچے کے خلا تک گئی اور اسے دیکھ کر میں آگے آیا۔ انگلیوں سے چوکھٹ کا حصہ کھرچا تو پتا چلا کہ یہ بھی زمین کا حصہ ہے۔ یعنی دروازے کے نیچے زمین بھی

تھی۔ اگر مجھے کوئی مٹی کھودنے والی چیز مل جاتی تو میں یہاں سے آزاد ہو سکتا تھا۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور چابی نکالی اس کی کی چین کے ساتھ کئی اوزاروں والا پیک تھا میں نے اس میں سے چاقو باہر نکالا اور مٹی کھودنے لگا۔

شروع میں ذرا مشکل ہوئی کیونکہ مٹی سخت تھی اور اس پر گرنے والا پلاسٹر اور سینٹ بھی جم گیا تھا مگر ایک بار اوپر کی پرت اکھڑی تو نیچے سے نرم مٹی نکل آئی۔ مجھے دو فٹ چوڑا اور ایک گہرا اور دو فٹ لمبا سوراخ کرنے میں تقریباً آدھا گھنٹا لگ گیا۔ میں بہت احتیاط سے کام کر رہا تھا اور مجھے ڈر تھا کہ کوئی باہر سے مجھے دیکھ نہ لے۔ اگر کوئی کمرے کے دروازے کی طرف دیکھ لیتا تو میں اسے مٹی کھودتا ہوا صاف نظر آ جاتا۔ میں نکلنے والی مٹی اندر کھینچ رہا تھا۔ پھر ہر چند سینکڑے بعد رک کر باہر کی سن گن لیتا تھا۔ جب باہر سنا محسوس ہوتا تو دوبارہ کام شروع کر دیتا۔ اس وجہ سے یہ چھوٹا سا حصہ کھودنے میں اتنی دیر لگ گئی۔ جب میں نے محسوس کیا کہ میں اب کسی قدر دقت کے ساتھ اس سے نکل جاؤں گا تو پہلے میں نے سر نکال کر باہر دیکھا۔ صحن خالی تھا یعنی وہ تینوں دوسرے کمرے میں تھے۔ میرے لیے موقع تھا کہ میں باہر جاسکوں۔

میں نے پشت کے بل لیٹ کر باہر کی طرف سر کنا شروع کر دیا۔ پہلے سر باہر نکالا اور صحن میں جھانک کر دیکھا۔ پھر جسم کو نیچے کی طرف دباتے ہوئے سینہ نکالنے لگا۔ لوہے کے دروازے کا نچلا حصہ زنگ آلود اور کھردرا تھا۔ جسم پر لگ رہا تھا اور خراشیں ڈال رہا تھا۔ ابھی میں نے کچھ ہی سینہ باہر نکالا تھا کہ اچانک برابر والے کمرے سے کوئی نکلا اور میری طرف دیکھے بغیر لیٹرین کی طرف چلا گیا۔ وہ اتنا اچانک آیا کہ میں دنگ رہ گیا کوئی آہٹ بھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے جاتے ہی میں نے عجلت میں باہر نکلنا شروع کیا کیونکہ جاتے ہوئے اس کا رخ دوسری طرف تھا اور وہ عجلت میں بھی تھا اس لیے مجھ پر نظر نہیں گئی مگر واپس آتے ہوئے اس کی نظر لازمی اس طرف ہوتی اور وہ مجھے دیکھ لیتا۔ اس کی واپسی سے پہلے مجھے نکل جانا تھا۔ لوہے کی رگڑنے سے سینے کو جگہ جگہ سے چھیل ویا مگر موت کے مقابلے میں یہ تکلیف کچھ نہیں تھی۔ سینہ ہی مشکل تھا۔ جیسے ہی یہ نکلا کام آسان ہو گیا۔ پیٹ نکال کر میں نے کسی قدر دقت سے ٹائیکس بھی نکال لیں اور اٹھ کر جلدی سے کمرے کی آڑ میں آ گیا۔

اب میں لیٹرین جانے والے کا منتظر تھا۔ وہ اندر چلا

متوقع عمر کا نیا پیمانہ

اس جہان فانی سے کوچ کرنے والے تین لاکھ افراد کا میڈیکل ڈیٹا اور ان سے متعلق اعداد و شمار کا تجزیہ کرنے کے بعد "کاس بزنس اسکول لندن" کے محققین نے ایک سادہ سا فارمولا وضع کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اگر آپ اندازہ لگانا چاہتے ہیں کہ آپ کتنی عمر پائیں گے تو اس وقت اپنی عمر ناب لیجیے۔ برطانیہ میں اس وقت اوسط عمر 81 سال سمجھی جاتی ہے۔ پاکستان اور اس جیسے دیگر ممالک میں اوسط عمر 70 سے بھی کم ہے۔ بہر حال، برطانوی حساب سے اگر 30 سال کے ایک شخص کا قد پانچ فٹ دس انچ ہے تو اس کی عمر 35 انچ ہونی چاہیے۔ تب وہ اوسط طبعی عمر تک پہنچنے کی امید رکھ سکتا ہے۔ اگر اس کی عمر 42 انچ ہے تو اسے اپنی متوقع اوسط عمر میں سے دو سال کم کر لینے چاہئیں لیکن اگر عمر 56 انچ تک پہنچ چکی ہو تو پھر اسے متوقع اوسط عمر میں سے 20 سال کم کر لینے چاہئیں۔ اس حساب کتاب کی بنیاد پر اس نظریے پر رکھی گئی ہے کہ آپ کے جسم کے درمیانی حصے پر موجود چربی، فاضل کولیسٹرول کی موجودگی اور بہت سی بیماریوں کے امکانات کی نشاندہی کرتی ہے۔

مرسلہ: نادیا عمر۔ لاہور

طرف آیا۔ یہ پرانی طرز کی بڑے تاروں والی کھلی جیب تھی۔ میں نے اس کا جائزہ لیا تو اس کی عقبی سٹیش مجھے نکلنے والی لگیں۔ انہیں ہلایا جلا یا تو میرا اندازہ درست نکلا۔ یہ نٹ بولٹ کی مدد سے جیب کے فرش پر فکس تھیں۔ اوزار مجھے جیب کے نول بکس سے مل گئے۔ موزوں کی تلاش کر کے میں نے ایک سیٹ کے بولٹ کھولنے شروع کیے۔ تار کی اور گھبراہٹ میں یہ کام آسان نہیں تھا۔ ہر لمحہ ایسا لگ رہا تھا کہ ابھی کوئی آجائے گا اور میں پکڑا جاؤں گا۔

بہ مشکل میں نے ایک سیٹ کے بولٹ کھولے اور اسے نکالنے لگا تو کچھ آوازیں ہوئی تھیں۔ میں خوف سے ساکت رہ گیا۔ جب ان آوازوں پر کوئی ردعمل نہیں ہوا تو میں پھر حرکت میں آیا اور بہت آہستہ سے سیٹ نکالی اور دیوار تک آیا۔ سیٹ کے ساتھ رکھ کر میں اوپر چڑھا اور دیوار پر بازو جما کر خود کو اوپر اٹھانے لگا۔ آدی کو جس کام کی پریکٹس نہ ہو اور

جاتا تو پھر میں یہاں سے نکلنے کی کوشش کرتا۔ وہ چند منٹ بعد نمودار ہوا اور کمرے کی طرف آیا۔ میرا سانس رک گیا کہ ابھی وہ کمر اٹھول کر دیکھے گا اور مجھے غائب یا بے گاتو فوراً ہی میری تلاش شروع ہو جائے گی اور میں بھاگنے سے پہلے پکڑا جاؤں گا۔ ایک لمحے کو مجھے پچھتاوا ہوا کہ اس کا انتظار کرنے کی بجائے میں نے فوراً ہی بھاگنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ میں سانس روکے کھڑا تھا کہ ابھی وہ کنڈی کھولے گا مگر اس نے کنڈی نہیں کھولی صرف اسے ہلا کر چیک کیا کہ وہ لگی ہے اور واپس اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے سکون کا طویل ترین سانس لیا تھا۔ اب مجھے یہاں سے نکلنا تھا اور ان حالات میں یہ کام آسان نہیں تھا ذرا سی آہٹ سے ان کو پتا چل جاتا کہ میں آزاد ہو گیا ہوں اور مجھے ذرا بھی شبہ نہیں تھا کہ وہ مجھے فوراً گولی ادریں گے۔ میں ان کے لیے خطرہ تھا وہ تو اس بے چارے جوڑے کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ جو کسی وجہ سے ان کے لیے ناپسندیدہ تھا۔ میں دبے قدموں گیٹ تک آیا مگر جب یہ گیٹ کھلا تھا اور اندر آ کر انہوں نے کنڈی لگائی تب ہی میں نے دیکھ لیا تھا کہ اس کی زنگ آلود کنڈی کتنا شور کر رہی تھی۔ اسے کھولنا تو اپنا پول خود کھولنے کے برابر تھا۔ بڑا گیٹ تالے سے بند تھا۔ اندر سے یہ سپاٹ چادر والا تھا اور اس کا اوپری حصہ اتنا بلند تھا کہ وہاں تک میرا ہاتھ نہیں جاسکتا تھا۔ اس کے نیچے اینٹوں کی چوکت تھی اس لیے کھدائی کر کے باہر جانا بھی ممکن نہیں تھا۔ اب مجھے دیوار پھلانگی تھی۔ دیوار کوئی آٹھ فٹ اونچی تھی۔ میں نے ایک جگہ جہاں کچھ مٹی جمع تھی اچھل کر اس کے منڈیر پر ہاتھ بنائے اور خود کو اوپر اٹھانے کی کوشش کی مگر مجھے اس کی کوئی پریکٹس نہیں تھی اور نہ ہی میرے بازوؤں میں اتنا زور تھا۔ مجھے دیوار پر چڑھنے کے لیے کئی سہارے کی ضرورت تھی۔ اس کے بغیر یہ کام ممکن نہیں تھا۔ ایک مشکل ختم ہوتی نہیں تھی کہ دوسری سامنے آجاتی تھی۔ میں آزاد ہو کر بھی اس چادر دیواری میں قید تھا۔

میں نے کوئی ایسی چیز تلاش کرنا شروع کی جسے دیوار کے ساتھ رکھ کر میں اوپر چڑھ سکوں۔ مگر احاطے میں ایسی کوئی چیز نہیں تھا۔ حد یہ کہ اینٹ پتھر تک نہیں تھے۔ میں اپنے کمرے کا دروازہ کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس کی زنگ آلود کنڈی بھی اتنا ہی شور مچاتی اور ان لوگوں کو پتا چل جاتا۔ ورنہ میں اندر سے چار پائی اٹھالاتا اور اسے دیوار سے لگا کر باآسانی اوپر چڑھ جاتا۔ صحن میں موجود جیب کی

کرنے لگا۔ زمین پر ہاتھ مارتے ہوئے میں دل ہی دل میں چابی ملنے کی دعا کر رہا تھا اور پھر دعا پوری ہوئی میرے ہاتھ میں چابی آئی اور اسی لمحے اندر سے چلانے کی آواز آئی۔
”وہ نکل گیا ہے۔“

”تلاش کرو اسے۔“ فرنٹ سیٹ والے کی مضطرب آواز آئی۔ ”کہیں وہ ان لوگوں کے ہاتھ نہ لگ جائے۔“
”ہماری طرف سے جہنم میں جائے۔“ دوسرے نے غصے سے کہا۔ ”اب یہاں سے نکلنا ہوگا۔ سامان سمینو اس سے پہلے کہ پولیس یہاں آئے۔“

میں ان کی آوازیں سن کر سن رہ گیا تھا۔ وہ باہر نکلتے اور میں ان کی نظروں میں آجاتا۔ ٹیکسی تک جانے کا وقت نہیں تھا کیونکہ وہ گیٹ کھول رہے تھے اور جلد باہر آجاتے۔ میں نزدیک نظر آنے والی ایک جھاڑی کی طرف سرکنے لگا۔ یہ زیادہ بڑی نہیں تھی مگر میں اس کی اوٹ میں لیٹ جاتا تو کوئی نزدیک آئے بغیر مجھے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ میں بروقت جھاڑی کی اوٹ میں ہوا کیونکہ وہ لوگ ایمر جنسی لائسنس لے کر باہر نکل آئے تھے۔ ان کی روشنی میں مجھے آس پاس تلاش کر رہے تھے۔ اگر میں جھاڑی سے باہر ہوتا تو ان کی نظروں میں آجاتا۔ انہوں نے ہر طرف دیکھا اور جب میں نظر نہیں آیا تو ایک نے کہا۔ ”شاید وہ جھیل اور مزار کی طرف بھاگا ہے۔ اس کی گاڑی یہیں کھڑی ہے۔ جیب نکالو اسے تلاش کرنا ہے۔“

انہوں نے ٹیکسی بھی دیکھی۔ پھر اندر چلے گئے۔ ان کے جاتے ہی میں جھاڑی سے نکلا اور لنگڑاتا ہوا ٹیکسی تک پہنچ گیا اور اس کے نیچے گھس گیا۔ یہی ایک جگہ تھی جہاں میں محفوظ تھا۔ چند منٹ بعد اندر سے جب نکلی اور ایک نے گیٹ بند کیا اور جیب میں سوار ہو گیا وہ گھوم کر جھیل کی طرف چلی گئی۔ میں ٹیکسی کے نیچے سے نکلا اور ڈرائیونگ سیٹ پر آیا۔ انجن اشارت کیا مگر روشنیاں بند رکھی تھیں۔ ٹیکسی واپس موڑ کر سڑک کی طرف چل پڑا۔ تاریکی میں راستہ نظر نہیں آ رہا تھا اس لیے میں دھیمی رفتار سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ جیسے ہی عقب میں جیب کی روشنیاں غائب ہوئیں میں نے ٹیکسی کی ہیڈ لائٹس آن کیں اور ہر ممکن تیزی سے سڑک کی طرف روانہ ہوا۔ تاہم سڑک پر ٹیکسی اچھل رہی تھی مگر میں پہلی بار اس کی پروا کیے بغیر ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس وقت میری جان پر بنی ہوئی تھی اور اگر وہ پیچھے سے آجاتے تو میری سی این جی والی ٹیکسی اس ڈیزل جیب کا مقابلہ نہیں

اسے پہلی بار کرنا ہوتا جتنی مشکل اسے پیش آسکتی ہے مجھے اس سے زیادہ ہی مشکل پیش آئی تھی۔ ہاتھ پیروں پر خراشیں ڈلوا کر میں کسی طرح اس پتلی سی دیوار کے اوپر چڑھا کیونکہ اوپر مشکل سے تین اونچ والی اینٹیں لگی تھیں۔ اوپر جانے کے لیے زیادہ زور لگایا تو ایک دم اوپر گیا اور باہر گرتے گرتے بچا۔ بڑی مشکل سے خود کو بچایا اور ایک پاؤں دوسری طرف لٹکایا پھر ہاتھوں سے دیوار پکڑتے ہوئے دوسرا پاؤں لٹکایا اور ممکن حد تک نیچے ہو کر ہاتھ چھوڑ دیئے۔

میں ایک فٹ کی بلندی سے گرا کر زمین نیچے کوئی پتھر تھا سیدھا پاؤں اس پر گیا اور ایسی ٹیس ٹھکی کہ میں نے بہت مشکل سے اپنی چیخ روکی تھی۔ ایک لمحے کو لگا کہ لٹخنے ٹوٹ گیا ہے۔ میں نے نیچے بیٹھ کر پاؤں ٹولا تو ویسے ٹھیک لگا۔ مگر تکلیف زیادہ تھی۔ کچھ دیر بیٹھا رہا پھر ہمت کر کے اٹھا۔ میں مکان سے نکل آیا تھا مگر اس ویرانے سے نکلنا باقی تھا۔ کھڑا ہونے پر مجھے اندازہ ہوا کہ چوٹ شدید ہے مگر ہڈی محفوظ ہے ورنہ میں کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کے باوجود پاؤں رکھنا محال ہو رہا تھا اور ہر قدم پر مجھے جیسے قیامت سے گزرنا پڑتا تھا۔ کسی نہ کسی طرح میں ٹیکسی تک پہنچ گیا۔ اندر گھس کا چابی نکالنا چاہتا تو پتا چلا کہ جیب میں چابی نہیں ہے۔ میرے پیروں تلے سے زمین نکل گئی تھی۔ میں نے دیوانہ وار تمام جیبیں ٹول لیں۔ مجھے اچھی طرح یاد تھا میں نے بتلون کی سامنے والی پاکٹ میں چابی ڈالی تھی مگر وہ اس میں نہیں تھی۔ شاید دیوار پر چڑھتے یا اترتے ہوئے گر گئی۔

ماپوسی اور بے بسی سے مجھے رونا آ گیا تھا۔ پاؤں کی تکلیف کے ساتھ واپس دیوار تک جانا محال لگ رہا تھا اور میں اس تاریکی میں چابی کہاں سے تلاش کرتا۔ مگر چابی لازمی تھی اس کے بغیر میں یہاں سے نکل نہیں سکتا تھا۔ اگر پاؤں میں چوٹ نہ لگی ہوتی تو میں چابی اور ٹیکسی کی پروا کیے بغیر یہاں سے بھاگ کھڑا ہوتا۔ مگر اس حالت میں چند قدم چلنا بھی مشکل تھا۔ میں کسی نہ کسی طرح اتر کر واپس دیوار تک پہنچا۔ اپنی کراہیں ضبط کرنے کے لیے مجھے منہ پر ہاتھ رکھنا پڑا تھا اور دیوار کے پاس پہنچ کر میں گر ہی گیا۔ اب مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ یہ مشکل اٹھ کر بیٹھا اور بیٹھے بیٹھے ہی زمین پر ہاتھ مار کر چابی تلاش کرنے لگا۔ میں اندازے سے واپس آیا تھا کہ میں کہاں سے اتر تھا اور چابی اسی جگہ گری ہوگی۔ مجھے اس پتھر کی تلاش تھی جس پر میرا پاؤں آیا تھا۔ بالآخر پتھر مل گیا اور میں اس کے آس پاس چابی تلاش

کر سکتی تھی۔

”تو تم لوگ اتنی دیر سے یہیں موجود تھے؟“ میں نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔

”ہاں ادھر بہت خطرناک لوگ ہوتے ہیں۔ میرے ساتھ میری عورت بھی ہے۔ اس لیے ہم جھاڑیوں میں چھپ گئے کہ رات یہیں گزار کر صبح جائیں گے۔“

”تم نے ٹھیک کیا، مجھے جو لوگ لے گئے تھے وہ بھی بہت خطرناک اور قاتل ہیں۔ انہوں نے مجھے زبردستی ساتھ لے کر واردات کی اور پتا نہیں کسی کو مارا یا زخمی کیا۔ ان میں سے بھی ایک زخمی ہوا اور اس نے تم دونوں کو دیکھ کر کہا کہ وہ اگر زخمی نہ ہوتا تو تمہیں آج رات نہ چھوڑتا۔ تمہاری اس سے کیا دشمنی ہے؟“

عورت کھڑکی کی طرف جھکی۔ ”یہ لوگ مجرم ہیں ایک بار ہم نے ان کے خلاف پولیس میں رپورٹ کرائی تھی تب سے یہ ہمارے دشمن ہو گئے ہیں۔“

میں نے صرف سنا کہ اس نے کیا کہا ہے کیونکہ میری نظر تو اس نظارے میں الجھ کر رہ گئی تھی جو وہ دکھا رہی تھی۔ پھر میں چونکا وہ کہہ رہی تھی۔ ”تم بتاتے کیوں نہیں ہو ہمیں شہر تک لے جاؤ گے؟“

میں ایک بار پھر چونک کر کھسیا پا اور بولا۔ ”ہاں آ جاؤ۔ جلدی کرو اس سے پہلے کہ وہ آ جائیں ان کے پاس طاقتور چیپ ہے میری ٹیکسی رفتار میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے۔“

عورت نے دروازہ کھولا اور یوں بل کھا کر اندر آئی کہ میرا ذہن ایک بار پھر بھٹکا۔ حالانکہ میں لاجول پڑھ رہا تھا مگر وہ ان عورتوں میں سے تھی جو مرد کے ہوش اڑا دیتی ہیں اور میرے حواس تو پہلے ہی گم تھے۔ نزدیک آتے ہی اس کے پاس سے بہت انوکھی اور تیز خوشبو آئی تھی۔ وہ جان بوجھ کر دروازے کی طرف ہونے کی بجائے میری طرف ہو کر بیٹھی تھی۔ مرد پچھلی نشست پر آ گیا۔ میں نے اندر کی لائٹ بند کی اور ٹیکسی اشارت کر کے آگے بڑھا دی۔ ”اس خطرناک علاقے میں تمہارا کون رشتے دار رہتا ہے۔“

”رشتے دار نہیں ہے۔“ عورت بولی۔ ”ایک واقف کار ہے اس نے ادھار لیا تھا اور ہم واپس لینے آئے تھے۔ وہ گھر پر نہیں تھا انتظار میں دیر ہو گئی اور پھر نکلتے ہوئے یہ وقت ہو گیا تھا جب تم نے جاتے ہوئے ہمیں دیکھا تھا۔“

میں نے عورت کی طرف دیکھا۔ ”تمہارے شوہر کو آنا چاہیے تھا۔ یہ جگہ تم جیسی عورت کے لیے بالکل ٹھیک نہیں

چند منٹ بعد میں سڑک پر پہنچ گیا اور پھر میں نے پیچھے دیکھا تو دور تک۔ تاریکی تھی۔ مجھے اطمینان ہوا کہ وہ واپس نہیں آئے تھے اور شاید آتے بھی نہیں۔ انہیں میرے فرار کے بعد پولیس کا خوف تھا اور وہ اب یہاں نہیں رک سکتے تھے۔ خطرہ مجھے یہ تھا کہ وہ میرے پیچھے نہ آ جائیں۔ میں عقب میں دیکھ رہا تھا اس لیے مجھے پتا نہیں چلا کہ وہ جوڑا کب میری ٹیکسی تک آ گیا۔ میں نے جب سامنے دیکھا تو ان کی موجودگی محسوس کر کے ایک بار پھر میری ٹھکی بندھ گئی تھی۔ یہ سوچ کر کہ وہ تینوں کسی اور طرف سے یہاں سڑک پر آ گئے تھے اب میرے منتظر تھے۔ انہیں معلوم ہو گا کہ میں اسی سڑک سے نکلوں گا۔ مگر جلد مجھے محسوس ہوا کہ ان میں ایک عورت تھی۔ انہوں نے بھی میرا خوف محسوس کر لیا تھا۔

مرد بولا۔

”ڈرو مت، ہم بے ضرر لوگ ہیں۔“

میں نے ٹیکسی کی اندرونی لائٹ آن کی تو پہلی بار ان کو پاس سے دیکھا۔ یہ وہی جوڑا تھا جس کے بارے میں زخمی نے کہا تھا کہ اگر وہ زخمی نہ ہوتا تو آج وہ ان دونوں کو قتل کر دیتا۔ مرد تقریباً چالیس سال کا اور عام جسامت اور صورت والا بے ضرر نظر آنے والا آدمی تھا۔ البتہ عورت بہت خوب صورت تھی۔ گوری چٹی اور کسی قدر لمبی و صحت مند تھی۔ اس نے نیلے رنگ کا پھولدار اور خاصا بہت لباس پہن رکھا تھا۔ اس میں اس کے نشیب و فراز اور کمر کے نیچے کا حصہ بہت نمایاں تھا۔ میٹھی کا گریبان بھی خاصا کشادہ تھا اور اس سے اس کی دودھیارنگت جھلک رہی تھی۔ اس نے چھوٹا سا دوپٹا بے پروائی سے لے رکھا تھا۔ اس کے شانے پر ایک ہینڈ بیگ لٹکا ہوا تھا اور مرد خالی تھا۔ مرد کھنکارا تو مجھے احساس ہوا کہ میں بد تہذیبی سے عورت کو گھور رہا تھا۔ میں نے کھسیا کر جلدی سے کہا۔

”تم لوگ اس خطرناک جگہ کیا کر رہے ہو؟“

”ہم یہاں کسی سے ملنے آئے تھے۔“ عورت نے ایک ادا سے کہا۔ اس نے جسم کو یوں حرکت دی کہ میں بے اختیار نظریں چرا نے پر مجبور ہو گیا۔ ایک لمحے کو میرے ذہن سے پیچھے رہ جانے والا خطرہ بھی نکل گیا تھا۔ مرد نے بتایا۔

”واپس جا رہے ہیں مگر کوئی سواری نہیں مل رہی۔ تمہاری ٹیکسی دکھائی دی تھی۔ سوچا کہ تم واپس آؤ گے مگر تم نے بھی اتنی دیر کر دیا۔“

”ہے۔“

”میرے لیے کیوں ٹھیک نہیں ہے۔“ اس نے معنی خیز انداز میں پوچھا اور گیسٹر پر جسے میرے ہاتھ پر اپنا نرم و گداز ہاتھ رکھ دیا۔ ساتھ ہی وہ خاص انداز سے میری طرف جھکی تھی۔

”تم خوب صورت عورت ہو اور یہاں بہت خطرناک لوگ رہتے ہیں۔“ میں روانی میں کہہ گیا اور پھر مجھے احساس ہوا کہ اس کا شوہر پیچھے موجود ہے۔ ”معاف کرنا میرا مطلب یہ نہیں ہے۔“

”مطلب کو چھوڑو۔“ وہ بے تکلفی سے بولی۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو یہ جگہ ٹھیک نہیں ہے مگر میں مراد کے ساتھ رہتی ہوں، ہم ہر جگہ ساتھ ساتھ جاتے ہیں۔“

”تم لوگوں کی رہائش کہاں ہے؟“

”تم ہمیں..... چورنگی پر اتار دینا۔“ عورت بولی پھر اس نے ناز بھرے انداز میں چیخ ماری۔ ”ہائے اللہ میری انگلی گر گئی ہے۔ گاڑی روکو۔“

”کیوں کیا باہر گری ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں اندر ہے مگر چلتی گاڑی میں کیسے تلاش کروں روک کر لائٹ آن کرو۔“ وہ بولی۔ ”سو نے کی ہے اس پر زبرد لگا ہوا ہے۔“

ہم اس جگہ سے خاصا آگے نکل آئے تھے اور اب فیکٹریوں کا علاقہ شروع ہونے والا تھا۔ میں نے بیک لگائی اور ٹیکسی رُک گئی۔ میں نے ہاتھ اوپر کر کے اندر کی لائٹ آن کی اور جیسے ہی ہاتھ نیچے کیا عقب سے کوئی چیز آ کر میری گردن سے لپٹ گئی۔ میں نے تڑپ کر اسے گردن سے الگ کرنا چاہا تھا مگر اتنی سی دیر میں وہ اتنی س گئی کہ میری انگلیاں رسی میں نہیں جا رہی تھیں۔ عورت نے پھرتی سے اندر کی لائٹ آف کی اور میرے ہاتھ پکڑ لیے۔ اس میں بھی بڑی جان تھی میں ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا اور ناکام رہا تھا۔ اب مجھ میں آیا کہ عورت میرے برابر میں کیوں آئی اور مرد عقب میں کیوں بیٹھا اور زخمی ہونے والا ان میاں بیوی یا جوڑے کے بارے میں کن خدشات کا اظہار کر رہا تھا۔ مگر اب دیر ہو گئی تھی۔ میری گردن میں آنے والی رسی ہرگز رتے لمحے ٹنگ ہوئی جا رہی تھی اور میں اسے کناروں سے تھام کر مزید تنگ ہونے سے روکنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

دم گھٹنے لگا تو میں پاؤں مارنے لگا۔ خود کو پیچھے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا مگر سیٹ اور عقب میں موجود مرد میری

ساری کوششیں ناکام بنا رہے تھے۔ اس نے جتنی مہارت سے کام کیا تھا صاف لگ رہا تھا کہ اس کے لیے اور عورت کے لیے یہ سب نیا نہیں تھا۔ مجھے قابو کرنے کی کوشش میں عورت مجھ پر تقریباً سوار ہو گئی تھی مگر مجھے اس وقت اس کے وجود کی کشش کا خیال تک نہیں تھا۔ میری جان پر بنی ہوئی تھی اور میں ڈوبتے آؤمی کی طرح ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اب سانس رکنے سے آنکھوں کے آگے اندھیرا چھانے لگا تھا۔ میں اسے دم گھونٹنے سے تو نہیں روک پایا تھا مگر میں نے رسی کو اتنا تنگ ہونے سے ضرور بچا لیا تھا کہ میرا زخراہ پھنسنے نہ پائے ورنہ میں جلد مر جاتا۔ اس کے باوجود موت اب زیادہ فاصلے پر نہیں تھی۔ رفتہ رفتہ اندھیرا گہرا ہوتا چلا گیا اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔

مجھے لگا جیسے میں مر گیا ہوں۔ تاریکی بہت گہری تھی مگر اچانک ہی جیسے میں تاریکی سے نکل آیا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ گلے میں شدید درد تھا مگر سانس لی جا رہی تھی۔ زندگی بخش ہوا میرے جسم میں جا کر مجھے پھر سے زندہ کر رہی تھی۔ رفتہ رفتہ میرے حواس بھی بحال ہونے لگے اور پھر میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو آواز آئی۔ ”لپٹے رہو ابھی تمہاری حالت ٹھیک نہیں ہے۔ اسی طرح سانس لیتے رہو۔“ میں سن ہو گیا کیونکہ آواز اسی زخمی کی تھی جس کی قید سے میں آزاد ہوا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھولیں تو خود کو سڑک پر دراز پایا۔ وہ میرے پاس ہی کھڑا ہوا تھا۔ کچھ فاصلے پر سڑک کے ساتھ کچے میں دونوں میاں بیوی سروں پر ہاتھ رکھے بیٹھے تھے اور زخمی کے دونوں ساتھی ان کے سروں پر سوار تھے۔ ان کے ہاتھوں میں ہتھیار نظر آرہے تھے۔ ٹیکسی کی روشنیاں آن تھیں اور اسی وجہ سے یہ سب صاف دکھائی دے رہا تھا ورنہ رات تو اور بھی گہری ہو گئی تھی۔ میرا گلا صحرا کی طرح خشک ہو رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کنویں سے نکل کر کھائی میں گرا ہوں یا کھائی کے بعد کنویں میں بھی گر گیا ہوں۔ میں ان لوگوں کی قید سے فرار ہوا تھا اور اب یہ نہ جانے میرے ساتھ کیا سلوک کرتے؟ اس نے میری تشنگی محسوس کر لی تھی اور پانی کی بوتل میری طرف بڑھائی۔ میں نے بے تالی سے پانی پیا۔ پانی نے حیرت انگیز طور پر گلے کے درد کو کم کر دیا تھا۔ میں نے اسے بوتل واپس کی تو اس نے جوڑے کی طرف اشارہ کیا۔

”تم کو منع کیا تھا کہ ابھی مت جانا اور تم باہر نکلے اور ان کے ہتھے چڑھ گئے۔“

تمہارے لیے یہی بہتر ہوگا کہ اپنا منہ بند رکھو اور اس واقعے کو بھول جاؤ۔“

”میں ایسا ہی کروں گا۔“ میں نے اسے یقین دلایا۔ پھر ان میاں بیوی کی طرف دیکھا۔ عورت کی قمیض شاید مزاحمت کی وجہ سے پھٹ گئی تھی اور اس کا بدن جھلک رہا تھا لیکن یقین کریں اس وقت وہ مجھے ایک ناگن لگی جس کے حسین بدن میں زہر بھرا ہوتا ہے۔ مرد خونخوڑا تھا مگر وہ بے خوف لگ رہی تھی۔ اس نے زخمی سے کہا۔ ”ہمیں جانے دے، ہمارے راستے میں مت آ۔“

”بکو اس مت کرو۔“ زخمی غرایا۔ ”تمہاری وجہ سے ہمارے لیے حالات خراب ہوئے اور اب پولیس اس طرف زیادہ آنے لگی ہے۔ ویسے بھی تم لوگ مجرم نہیں شیطان ہو۔ میں اس معصوم بچی کو نہیں بھول سکتا جسے تم لوگ لے گئے تھے اور اسے زیادتی کے بعد قتل کر کے اس کی لاش پھینک دی تھی۔ آج تم لوگوں کا یوم حساب ہے۔“

”تم کیا سمجھتے ہو ہم اکیلے ہیں۔“ عورت چیخ کر بولی۔ ”ہمارے پیچھے لوگ ہیں اور وہ تم سے حساب لیں گے۔“

”انہیں جھاڑیوں میں لے جاؤ۔“ زخمی نے عورت کی بات نظر انداز کر کے اپنے ساتھیوں کو حکم دیا اور وہ انہیں ہانک کر جھاڑیوں میں لے گئے۔ زخمی نے مجھ سے پوچھا۔ ”تم ڈرائیو کر لو گے؟“

”ہاں کیا مجھے جانے کی اجازت ہے؟“

اس نے سر ہلایا اور جیب سے پرس نکال کر اس میں سے دو ہزار روپے میری طرف بڑھائے۔ میں نے انکار کیا۔ ”اس کی ضرورت نہیں ہے تم نے مجھ پر احسان کیا ہے۔“

”رکھ لو یار۔“ اس نے بے تکلفی سے کہا۔ ”مارنے اور بچانے والی اللہ کی ذات ہے۔“

اس نے تقریباً زبردستی دو ہزار میری جیب میں ڈال دیئے۔ میں نے شکر یہ ادا کیا تو اس نے کہا۔ ”بس اب جاؤ اور کسی سے ذکر مت کرنا۔ بہتر ہے گھر والوں کو بھی مت بتانا ورنہ بات پھیل جاتی ہے۔ یہ عورت ٹھیک کہہ رہی ہے ان لوگوں کا پورا گروہ ہے وہ تمہارے پیچھے آسکتے ہیں۔“

”میں خود سے بھی نہیں کہوں گا۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

”بس اب جاؤ۔“

میں ٹیکسی میں بیٹھا اور اسے آگے بڑھا دیا۔ زخمی

”آگے جانا چاہتے تھے اس لیے میں نے بٹھا لیا۔“ میں نے سرگوٹھی نما آواز میں کہا۔ اگلے کئی دن تک میں اسی طرح بات کرتا رہا تھا۔

”بے وقوف یہ شکاری ہیں۔“ اس نے جھڑک کر کہا۔ ”شکر کرو کہ ہم بروقت آگئے۔ ورنہ اس وقت تمہاری لاش جھاڑیوں میں پڑی ہوتی اور یہ تمہاری ٹیکسی لے کر نو دو گیارہ ہو چکے ہوتے۔“

”تم لوگ مجھے تلاش کر رہے تھے؟“

”صرف میں۔“ اس نے تصحیح کی۔ ”میرے ساتھی تو کہہ رہے تھے کہ لعنت بھیجو اور یہاں سے چلو ابھی تمہیں دور جانا ہے مگر مجھے تمہارا خیال تھا کیونکہ ہم تمہیں یہاں لائے تھے۔ تم ہماری ذمے داری تھے۔ اس لیے تم کو تلاش کرتے رہے۔ پہلے جمیل کے پاس دیکھا پھر واپس آئے تو ٹیکسی غائب تھی۔ ہم سڑک کی طرف آئے اگر ٹیکسی چورنگی تک نہ ملتی تو ہم سمجھ جاتے کہ تم بچ کر نکل گئے ہو اور ہم واپس چلے جاتے۔ مگر تمہاری ٹیکسی یہاں کھڑی تھی اور ہم پہنچے تو تم بس دنیا سے گزرنے ہی والے تھے۔“

”یہ دوڑوں ڈا کو ہیں۔“

”ڈا کو ان سے اچھے ہوتے ہیں۔“ اس نے نفرت سے کہا۔ ”یہ دینوں درندے ہیں۔ لوگوں کو دھوکا دے کر ان گاڑیوں میں بیٹھتے ہیں۔ یہ گھنیا عورت اپنے حسن و شباب کو استعمال کرتی ہے۔ پھر یہ گاڑی میں موجود افراد کو ہلاک کر دیتے ہیں اور ان کی لاشیں جھاڑیوں میں پھینک کر گاڑی اور دوسری چیزوں سمیت فرار ہو جاتے ہیں۔ ایک آدمی ہو تو تمہارے ساتھ ہونے والا سلوک کرتے ہیں اور زیادہ ہوں تو گولی باردیتے ہیں۔ یہ دو سال سے یہاں سرگرم ہیں اور اب تک کئی وارداتوں میں کم سے کم ایک درجن لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار چکے ہیں۔“

مجھے اس کے ایک ایک لفظ کا یقین تھا کیونکہ میں خود ان میاں بیوی کا شکار ہوتے ہوتے بچا تھا۔ میری زندگی تھی ورنہ انہوں نے مار ڈالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ میں کھڑا ہو گیا۔ اب میں بہتر محسوس کر رہا تھا۔ ”میں تمہارا شکر گزار ہوں اور یقین کرو میں صرف اس ہتھیار سے نکلنا چاہتا تھا ورنہ میرا کوئی ارادہ نہیں تھا کہ پولیس کے پاس جانے کی حماقت کروں۔“

”اگر تم چلے بھی جاتے تو کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ یہ عارضی ٹھکانا ہے اور یہاں ہمیں کوئی نہیں جانتا ہے۔ ہاں

ٹیکسی کہیں روک لو تو لوگ شور مچانا شروع کر دیتے ہیں۔ کار کا معاوضہ بھی زیادہ ملتا کیونکہ لوگ گاڑی میں خود کو زیادہ معزز ظاہر کر سکتے ہیں۔ مجھے بلنگ مل جاتی۔ میں سوچ ہی رہا تھا مگر اس واقعے کے بعد میں نے اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔ جیسے ہی طبیعت ذرا بہتر ہوئی میں نے گاڑی کی تلاش شروع کر دی اور جلد مجھے دس سال پرانی لیکن بہت اچھی حالت میں ایک لکڑی کار مل گئی۔ کچھ رقم جمع بھی اور کچھ بھائیوں سے قرض لے کر میں نے کار لے لی اور ٹیکسی کو ٹھیک ٹھاک کر کے سیل کر دیا۔ میرا کام ایک دن کے لیے بھی نہیں رکا تھا۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ کار کی وجہ سے جلد مجھے ایک ہی دفتر میں کام کرنے والی چار لڑکیوں کی سواری مل گئی۔ بچوں کو اسکول چھوڑنے کے بعد میں انہیں ان کے دفتر تک چھوڑتا۔ اسکول آٹھ بجے لگتا اور آفس ٹائم نو بجے تھا اس لیے مجھے آسانی ہوتی اور پھر وہ ہمارے ہی علاقے میں پاس پاس رہتی تھیں اس لیے انہیں یک اور ڈراپ کرنا بھی آسان تھا۔ انہیں دفتر چھوڑ کر میں گھر آتا۔ ناشتا کر کے آرام یا کچھ کام کرتا پھر بچوں کو لینے چلا جاتا۔ اس کام سے فارغ ہو کر دوپہر کا کھانا گھر میں کھاتا اور پھر خواتین کو لینے ان کے دفتر چلا جاتا۔ آفس کلنشن میں تھا۔ درمیان میں، میں کہیں نہیں جاتا تھا کیونکہ پھنس جانے کی صورت میں اپنی ڈیوٹی مکمل نہیں کر سکتا تھا۔ ہاں شام کو جب لڑکیوں کو ان کے گھروں پر ڈراپ کرویتا تو اس کے بعد فارغ ہوتا اور ٹیلی یا کسی جانے والے کے ساتھ کہیں جا سکتا تھا۔ اللہ کا شکر ہے اب ٹیکسی سے زیادہ اچھا مل رہا ہے۔

اس واقعے کو دو سال ہو چکے ہیں اور میں شاید اب بھی اپنی زبان بند رکھتا۔ لیکن چند دن پہلے اخبار میں خبر دیکھی کہ شہر کی ایک بڑی ہائی وے کے پاس ویرانے سے دو افراد کی لاشیں ملیں اور ان کی تصویریں بھی تھیں۔ میں نے تصویریں دیکھیں اور شناخت کر لیا۔ ایک میرا محسن تھا جس نے زخمی ہونے کے باوجود مجھے ان میاں بیوی سے بچایا تھا اور دوسرا اس کا ساتھی تھا۔ پتا نہیں وہ کس کا نشانہ بنے تھے۔ میاں بیوی کے ساتھیوں کا یا اپنے ہی کسی دشمن کا۔ مجھے دکھ ہوا کہ بہر حال میرا تو وہ محسن تھا اور تب میں نے سوچا کہ اپنی کہانی لکھوں۔ وہ تو کسی مجبوری کی وجہ سے جرائم کی دنیا میں آ گیا تھا اسی لیے اس نے میرے ساتھ برا سلوک نہیں کیا تھا۔

جھاڑیوں کی طرف جا رہا تھا میں کچھ آگے نکلا ہوں گا کہ عقب سے فائرنگ کی آواز آئی۔ چند فائر ہوئے اور پھر سناٹا چھا گیا۔ میں نے ٹیکسی کی رفتار تیز کر دی۔ گھر جانے سے پہلے میں نے مناسب سمجھا کہ ڈاکٹر کو دکھا دوں۔ ڈاکٹر نے نکلے کا معائنہ کیا اور کہا کہ کوئی خاص مسئلہ نہیں ہے دباؤ سے مسلز سوچ گئے ہیں۔ اس نے دوا اور غرارے کے لیے لیکویڈ دیا جسے گرم پانی میں ڈال کر غرارے کرنے سے مگلا جلد ٹھیک ہو جاتا۔ میں نے گھر جاتے ہوئے فیصلہ کیا کہ صرف آسیر کو بتاؤں گا کہ میرے ساتھ کیا ہوا۔ وہ پیٹ کی مضبوط تھی اور میں منع کر دیتا تو کسی سے نہ کہتی۔ جب میں نے اسے بتایا تو وہ اس وقت شکرانے کے نقل پڑھنے کھڑی ہو گئی کہ اللہ نے اس کا سہاگ اور اس کے بچوں کا باپ سلامت رکھا۔ میں دوا لے کر اور غرارے کر کے سویا تو رات سکون سے گزری۔

صبح میں آسیر کے روکنے کے باوجود معمول کے مطابق کام پر چلا گیا۔ بچوں کو اسکول چھوڑ کر میں واپس آیا اور آتے ہوئے ایک ذرا دیر سے شائع ہونے والا اخبار لیتا آیا اس میں رات والے واقعے کی خبر تھی۔ پولیس کے مطابق رات گئے جھاڑیوں سے نامعلوم افراد کی دو لاشیں ملیں۔ ان میں ایک مرد کی اور ایک عورت کی لاش تھی۔ دونوں کو سر پر گولی مار کر ہلاک کیا گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ انہیں اغوا کر کے کہیں سے لایا گیا تھا اور یہاں شوٹ کر کے لاشیں پھینک دیں۔ پولیس قاتلوں کی تلاش میں ہے۔ گویا زخمی اور اس کے ساتھیوں نے اپنا کہا پورا کیا تھا۔ میں نے پھر اللہ کا شکر ادا کیا کہ ایسے سفاک لوگوں نے مجھے ہنس دیا ورنہ وہ ایک گولی اور چلا سکتے تھے اور میری لاش بھی ان جھاڑیوں سے ملتی۔ آسیر نے خبر دیکھی تو اس کی ہوائیاں اٹھ گئی تھیں۔ اس نے جذباتی ہو کر کہا۔

”پلیز آپ ٹیکسی کا کام چھوڑ دیں یہ بہت رسکی ہے۔“
”میں بھی یہی سوچ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”ٹیکسی چھوڑ دوں لیکن نام یہی کروں۔“
”کیا مطلب؟“

ٹیکسی چلانے کے دوران میں نے محسوس کیا کہ اب ٹیکسی کا کام مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ سڑکوں پر ٹریفک کا ازدحام ہونے لگا ہے اور ٹیکسی ہر جگہ جا بھی نہیں سکتی ہے۔ اس لیے میں نے سوچا کہ ایک اچھی لکڑی کار لے لوں اور اسے چلاؤں۔ کار کی وجہ سے پارکنگ کی آسانی ہو جاتی۔ ورنہ



قسمت

محترماً، عذرا رسول صاحبہ
آداب

اس بار سرگزشت کے قیمتی صفحات کے لیے میں نے نایاب کی
روداد لکھی ہے۔ قسمت نے اسے کس طرح اوج پر پہنچایا یہ سبق ہے
ہر انسان کے لیے۔ اُمید ہے قارئین بھی پسند کریں گے۔

خورشید اختر
(لاہور)

”ہم آپ فلموں میں ناولوں میں جو کچھ دیکھتے
بڑھتے ہیں یہ سب ہماری ہی زندگی سے اخذ کردہ ہوتا ہے۔
لاکھوں واقعات میں سے کسی ایک منفرد واقعے پر فلم بنا دی
جاتی ہے یا ناول لکھ دیا جاتا ہے۔ میری زندگی بھی کسی فلم کی
کہانی جیسی ہے مگر ابھی تک اسے کوئی فلم ڈائریکٹر نہیں ملا
ورنہ سپر ہٹ فلم بن جاتی۔“ نایاب نے میری طرف دیکھ کر
کہا۔

”تم مجھے سناؤ میں لکھوں گی، اس اُمید پر کہ شاید کسی

فروری 2015ء

209

ماہنامہ سرگزشت

Copied From Web

فلم والے کو پسند آجائے۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا تو اس نے اپنے حالات زندگی سنانے شروع کر دیے جسے میں اسی کی زبانی لکھ رہی ہوں تاکہ پڑھنے والے کو مزہ آئے۔

.....☆.....

اس دن میں نے بیک میں کتابیں رکھیں اور ماما کو آواز دی۔ ”میں کالج جا رہی ہوں۔“
 ماما بیڈروم سے باہر آ کر بولیں۔ ”کتنی بار کہا ہے کہ تم یہ ڈائمنڈ سیٹ پہن کر ایسے کھلے عام کالج نہ جایا کرو۔ زمانہ بہت برا ہے۔“

میں نے اٹھلا کر کہا۔ ”اب اتنا برا بھی نہیں ہے کہ کالج میں کوئی چھین لے۔ گاڑی میں جانی ہوں گاڑی میں آتی ہوں۔ ذرا کالج میں دھاک ہی بیٹھ جاتی ہے۔ میرے ڈائمنڈ سیٹ کی“ کہہ کر میں بھاگتی ہوئی گاڑی میں آ کے بیٹھ گئی اور گاڑی کالج کی جانب چل پڑی جیسے ہی کالج میں داخل ہوئی حضمہ مسکرا کر آگے بڑھی۔

”لو جی مل اونز آگئی۔“

میں نے انکساری سے سر جھکا کر مسکرانے پر اکتفا کیا۔ ہر کوئی ڈائمنڈ سیٹ کی جو مجھے میری مگنی پر میرے منگیتر رضوان نے پہنایا تھا اس کی تعریف ضرور کرتا۔ میں ہمہ وقت مسکراتی رہتی۔ فخر سے میرا سر بلند ہو جاتا۔ آخر میں دلدار خان کی بیٹی تھی۔ پاپا کی فیکٹری کی ہم دو ہی تو وارث تھیں۔ ایک میں اور دوسری مجھ سے دو سال بڑی رباب۔ پاپا اور ماما کی ہم دونوں لاڈلیاں تھیں۔

میرے پاپا اب سے دو سال پہلے تک ایک سرکاری محکمے میں جنرل منیجر کی پوسٹ پر تھے۔ زندگی بہت مزے میں گزر رہی تھی۔ سچی حالات کا دور دور تک بتانا تھا۔ پاپا ریٹائر ہوئے تو ان کو گریجویٹ کے نام پر اچھی خاصی رقم ملی تھی۔ احمد، مومن کے دو بیٹے تھے، بڑے بیٹے عرفان سے رباب اور چھوٹے بیٹے رضوان سے میری مگنی زبانی طور پر ہو چکی تھی۔ ماموں کا دھاگا بنانے کا کاروبار تھا اور دونوں بیٹے تعلیم مکمل کر کے ماموں کے ساتھ کام کر رہے تھے۔ ممانی ذرا چالاک، فطرت کی تھیں مگر پھر بھی ہم سب میں خاصی انڈراستینڈنگ تھی۔ پاپا کو گریجویٹ ملی تو ماموں نے مشورہ دیا کہ ان ٹائیٹوں میں کمپیوٹر ایبھریٹری مشینیں منگوا کر بڑے پیمانے پر کارخانے بنالیں۔ پاپا نے ایک کروڑ روپيا اس کام پر خرچ کر دیا۔ گاؤں میں کچھ زمینیں تھیں انہیں بیچ کے رباب کی شادی بھی کر دی۔ یہ شادی بہت راجوم دھام سے ہوئی

ماہنامہ سرگزشت

تھی۔ اس فکر سے آزاد ہو کر انہوں نے فیکٹری کی طرف توجہ دی۔ فیکٹری چلانے کے لیے دو کینال کی جگہ کرائے پر لی تھی جس کا کرایہ دو لاکھ ماہوار تھا۔ ابتدا میں فیکٹری خوب چلی پھر گھانا ہونے لگا تو اپنی ساکھ برقرار رکھنے کے لیے پاپا نے گھر گروی رکھ دیا اور مزید قرضہ لے کے فیکٹری میں لگا دیا۔ دونوں مشینوں پر کمپیوٹرائزڈ کڑائیاں ہوتی تھیں۔ پارٹیوں کو لاکھوں کا کام تیار کر کے دیا جاتا تھا مگر پارٹیاں آدھے پیسے بھی ادا نہیں کرتی تھیں بلکہ مزید کام تیار کرنے کو دے دیتی تھیں۔

فیکٹری کے لیے دھاگا ماموں کے ہاں سے آتا تھا جس کا پیسہ وہ نقد وصول کرتے تھے۔ اس طرح ان کا کاروبار بھی خوب چمک اٹھا تھا۔ یہ بات ابھی چھپی ہوئی تھی کہ پاپا کا کاروبار گھٹانے میں جا رہا ہے اس لیے ماموں مسلسل مجبور کر رہے تھے کہ میری مگنی رضوان سے کر دی جائے۔ ماما بھی یہی چاہتی تھیں اس لیے گزشتہ سال میری مگنی کر دی گئی۔ اس موقع پر رضوان نے مجھے ڈائمنڈ کا لاکٹ سیٹ، ٹاپس اور انگوٹھی تحفے میں دی تھی جسے میں ہمہ وقت پہنے رہتی تھی۔

دیکھتے دیکھتے ایک سال اور گزر گیا۔ میں دیکھ رہی تھی کہ پاپا کا بلڈ پریشر حد سے زیادہ ہائی رہنے لگا ہے۔ رہی سہی کسر شوگر کی بیماری نے پوری کر دی تھی۔ پاپا فیکٹری میں ہونے والی پریشانی کی باتیں صرف ماما کو ہی بتاتے تھے اس لیے میں لاعلم تھی مگر مجھے کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا۔ کوئی بڑا حادثہ ہونے والا ہے۔ میرا خیال تھا کوئی بینک کا معاملہ ہوگا کیونکہ کچھ عرصے سے بینک کی اقساط نہیں دی گئی تھیں۔ آج بھی جب میں کالج سے گھر آئی تو ماما نے بتایا کہ فیکٹری کی ایک مشین کسی خرابی کی وجہ سے بند ہو گئی ہے اور دوسری مشینیں مال تیار کر کے دینے کے لیے ناکافی ہے۔

شام کو پاپا گھر آئے تو وہ بے حد پریشان تھے۔ ماما انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ ڈاکٹر نے بلڈ پریشر اور شوگر کنٹرول میں رکھنے کی ہدایت دی اور ٹینشن لینے سے منع کیا۔ بھلا انسان کو پریشانیاں ہوں اور وہ ٹینشن نہ لے، یہ کیسے ممکن ہے۔ ایک ہفتے پاپا نے بیماری اور پریشانی میں گزارا مگر فیکٹری سے وہ چھٹی نہیں کر سکتے تھے۔ آج بھی وہ صبح سے فیکٹری گئے ہوئے تھے۔ ماما بار بار فون کر کے ان کی طبیعت پوچھ رہی تھیں۔ میں بھی چونکہ بی اے کے سپردے کے فارغ تھی اس لیے گھر میں ہی تھی۔ ابھی میں اپنی پہلی رانیہ

فروری 2015ء

210

Copied From Web

تین ماہ کا فیکٹری کی جگہ کا کرایہ ادا کیا۔ گاڑی بھی بک گئی اور گھر تو نہ جانے کب قرتی ہو چکا تھا۔ کسی بھی وقت بینک والے آکر قبضہ کر لیتے۔

پاپا کو ہم گھر لے آئے تھے۔ وہ بالکل بے حس اپنے بیڈ پر پڑے رہتے تھے۔ ہم نے انڈنٹ میل نرس نہیں رکھا۔ ہم خود ہی دیکھ بھال کر لیا کرتے۔ سارا دن ہم پاپا کی خدمت میں لگے رہتے۔ گھر پر خاموشی سی چھائی رہتی کہ ایسے میں رباب آگئی۔ ہم نے محسوس کیا کہ وہ کچھ کہنا چاہ رہی ہے۔ آخر ماما نے پوچھ ہی لیا۔ ”رباب کوئی بات ہے تو بتاؤ؟“

وہ جھجکتے ہوئے بولی۔ ”ماما رضوان نے تایاب سے معافی تو ڈدی ہے۔“

میں نے سر جھکا لیا۔ وہی رضوان جو میرے چہرے کو دیکھتے نہیں تھکتا تھا۔ ہمارے حالات برے ہونے پر مجھ سے دستبردار ہو گیا۔ میں نے یہ غم بھی اپنے اندر اتار لیا۔ تب ہی میری نظر پاپا کے چہرے پر پڑی۔ میں نے دیکھا پاپا کی ایک آنکھ سے آنسو کا قطرہ نکلتا تھا۔ میں تڑپ کر پاپا کے پاس لپٹی اور ان کے ماتھے کو بے اختیار چومنا شروع کر دیا۔ ”پاپا..... میرے پاپا مجھے کوئی دکھ نہیں۔ پاپا پلیز آپ غم نہ کریں۔ میں سنبھال لوں گی۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ میرا آپ سے وعدہ ہے۔“

میں نہیں جانتی تھی کہ جو وعدہ میں پاپا سے کر رہی ہوں اس وعدے کا کیا مقصد ہے۔ مجھے کیا کرنا ہے۔ بس میں اپنے پاپا کا ایک آنسو دیکھ کر تڑپ گئی تھی۔ ماما اپنے بیڈ پر رو رہی تھی اور میں فیصلہ کر چکی تھی۔

صبح ہوتے ہی میں نے ماما سے فیکٹری کی چابیاں لیں اور رکشے میں بیٹھ کر فیکٹری کی طرف روانہ ہو گئی۔ اتنے ماہ بند رہنے کی وجہ سے فیکٹری میں ایک عجیب سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ مشینیں بند پڑی تھیں۔ شیشے کا دروازہ کھول کر میں پاپا کے آفس میں داخل ہو گئی۔ پاپا کی کرسی پر بیٹھ کر میں بلک بلک کر رو دی۔ پھر ساری لائسنس آن کر دیں۔ اپنے پاپا کی ایک چیز کو چھو کے دیکھتی رہی کہ ایسے میں باہر کے دروازے کی تیل بجی۔ میں نے باہر جا کر دروازہ کھولا تو ایک نو عمر سالڑ کا کھڑا تھا۔ وہ کوئی کار میگر لگ رہا تھا۔ میں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ بولا۔ ”میں ابو بکر ہوں۔ یہاں دلدار صاحب کی فیکٹری میں کام کرتا تھا۔ جب یہ فیکٹری بند ہو گئی تو میں نے دوسری فیکٹری میں کام شروع

سے فون پر مصروف تھی کہ مجھے ماما کی پیج سنائی دی۔ میں بھاگ کرئی اسی لاؤنج میں آئی۔ ”کیا ہوا۔“

ماما فون ہاتھ میں پکڑے رو رہی تھیں۔ آگے بڑھ کر میں نے انہیں اپنے ساتھ لگایا اور پوچھا۔ ”ماما کیا ہوا؟“ ”تمہارے پاپا بے ہوش ہو گئے ہیں۔ فیکٹری سے فون آیا ہے۔ ڈرائیور اور کچھ ملازمین انہیں اسپتال لے گئے ہیں۔ چلو جلدی کرو۔“ پریشانی کے عالم میں ہم اسپتال پہنچے۔ پاپا آئی سی یو میں تھے۔ انہیں فالج کا شدید ایفیک ہوا تھا۔ ہم سب باہر برآمدے میں بیٹھے تھے۔ پاپا کی حالت سیریس تھی۔ میں نے ڈرائیور سے پوچھا۔ ”انہیں کیا ہوا تھا۔“

”بی بی جب صاحب کو بتایا گیا کہ دوسری مشین بھی چلتے چلتے بند ہو گئی ہے تو صاحب مینشن میں ٹھٹھنے لگ گئے۔ پھر اچانک گر گئے اور تڑپنے لگے ہم لوگوں نے دیکھا تو وہ بے ہوش ہو چکے تھے۔ ہم انہیں یہاں لے آئے۔“

رباب اور عرفان بھی آگئے تھے۔ ماموں، ممانی اور رضوان بھی ساتھ تھے۔ سب حوصلہ دے رہے تھے۔ ڈاکٹر نے بتا دیا تھا کہ 72 گھنٹے انتہائی اہم ہیں۔ اگر یہ ہوش میں آگئے تو قسمت اچھی ورنہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ وہ 72 گھنٹے ہم تینوں مارا بیٹیوں نے اسپتال میں ہی گزارے۔ کبھی ایک دوسرے کو دلا سے دیتے کبھی خوب روتے۔ 72 گھنٹے گزر گئے تھے۔ جب ڈاکٹر نے یہ افسوس ناک خبر دی تھی کہ میرے پاپا کو ماش چلے گئے ہیں۔ کب تک یہ حالت رہے گی۔ کوئی نہیں جانتا۔

مشینیں بند ہونے سے فیکٹری بالکل بند ہو گئی تھی۔ ماما نے ماموں کو مشورے کے لیے بلایا۔ ماموں کے تو مزاج ہی کچھ اور تھے۔ انہوں نے سارا الزام پاپا کی نااہلی پر ڈال دیا۔ میرا دل چاہا کہ میں کہوں کہ یہ فیکٹری لگانے کا مشورہ بھی تو آپ کا ہی تھا مگر جب ماما خاموش تھیں تو میری کیا جرات۔ ماموں نے کہا جب تک مشینیں نہیں بکتیں جگہ کا کرایہ تو لازمی ادا کرنا ہوگا۔

”مشینیں کیسے بکتیں گی؟“ ماما نے پوچھا۔ ”ارے بھائی اگر چلتی ہوئی مشینیں ہوتیں تو میں کسی سے بات بھی کرتا۔ اب دیکھو پچھلے دو ماہ سے مشینیں بند پڑی ہیں۔ کیا ہتا کہوں کہاں کیا کیا نقص ہے۔ اب تو لوہے کے بھاؤ ہی بکتیں گی۔“ ماموں پر اسامہ بنا کے اٹھ گئے۔

ایک ماہ مزید گزر گیا۔ ماما نے اپنا سارا زور بیچ کے

”باجی پہلے بھی میں نے دو مرتبہ صاب سے حسن کے بارے میں بات کی تھی مگر ماسٹر کی بات صاب زیادہ سنتے تھے۔“

میں نے اس سے پوچھا۔ ”حسن کون ہے؟“
 ”حسن صاب کو بڑا تجربہ ہے جی مشینیں ٹھیک کرنے کا۔ شہر میں جتنی بھی مشینیں چل رہی ہیں زیادہ تر لوگ انہی کو بلا تے ہیں۔ ان کا ہاتھ لگنے کی دیر ہوتی ہے اور مشینیں چل پڑتی ہیں۔“

نہ جانے میں نے کیوں کہہ دیا۔ ”اسے بلا سکتے ہو۔“
 ”ہاں جی۔ یہ میرے موبائل میں ان کا نمبر ہے مگر میرے پاس بیلنس نہیں ہے جی۔“ وہ بولا۔

”اچھا مجھے بتاؤ میں اپنے موبائل سے نمبر ملا کے تمہیں دیتی ہوں۔“ میں نے نمبر ملایا۔ اس نے ساری بات اسے سمجھائی۔ اسے بتایا کہ اس کی شدید ضرورت ہے۔ اس نے دو گھنٹے بعد آنے کا کہا۔ ابو بکر میرے پاس ہی بیٹھا رہا۔ وہ ٹھیک دو گھنٹے کے بعد آ گیا۔ وہ سانولے رنگ کا لمبے قد کا ٹھکڑا مضبوط جسم اور ٹھنڈے بالوں والا ایک جاذب نظر نوجوان تھا۔ اس نے مجھ سے پاپا کی بیماری کے بارے میں بہت افسوس کیا اور مشینوں کی طرف بڑھ گیا۔ میں اور ابو بکر بھی اس کے پیچھے پیچھے ہال میں بڑھے۔ ابو بکر نے مجھے پاپا کے آفس سے ایک کرسی لا کے بیٹھنے کو دی۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے وہ مشینوں کے پرزے کھول کھول کے دیکھتا رہا۔ میں نے دیکھا اس کے ہاتھ سیاہ ہو گئے تھے مگر وہ اپنے کام میں مگن تھا۔ پھر وہ ہاتھ دھو کر میرے سامنے آ کے کھڑا ہو گیا۔ ”دیکھیے مس تاپاب ان دونوں مشینوں سے یہ پانچ پرزے غائب ہیں۔ دیکھیں اس طرح کے ہوتے ہیں یہ۔“ اس نے مجھے دکھائے۔

”کتنے کے آئیں گے۔“ میں نے اٹکتے ہوئے پوچھا۔

”تقریباً ساڑھے پانچ لاکھ کے۔“ اس نے حساب کرتے ہوئے بتایا۔

”کیا!“ مجھے تو کرنٹ سالگ گیا۔

اس نے شاپر میں ڈال کر وہ پرزے میرے سامنے رکھ دیے اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ”اچھا تو میں جاؤں۔“

میں پریشان ہو گئی۔ کیا کروں کیا نہ کروں۔ پاپا کی آنکھ میں انکا آنسو میری نظروں میں لہرا گیا۔ میں پُر عزم ہو گئی مگر میں اس پر اور نہ ہی ابو بکر پر اتنی جلدی اعتماد کر سکتی

کر دیا۔ یہاں سے گزر رہا تھا تو بتیاں جلتی دیکھ کر تیل بجا دی۔“

میں نے سے غور سے دیکھا۔ لڑکا شریف اور سمجھ دار لگ رہا تھا۔

”اندر آ جاؤ۔“ میں نے کہا۔

وہ اندر آ گیا۔ اسے لے کر پاپا کے آفس میں آئی پھر ایک کرسی کی جانب اشارہ کر کے کہا۔ ”بیٹھ جاؤ۔“ وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔

”صاب کا کیا حال ہے؟“ اس نے پوچھا۔

میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”سنو ابو بکر کیا تم مجھے بتا سکتے ہو پاپا کی فیکٹری جس پر کروڑوں روپے لگے تھے وہ کیوں ختم ہو گئی، کیوں برباد ہو گئی۔“

وہ کچھ ٹھہر کر بولا۔ ”باجی اصل میں مشینیں چلانے کے لیے جتنا پیسہ فیکٹری پر لگایا جاتا ہے اتنا ہی سائیڈ پر ہونا چاہیے۔ شروع کے دو تین سال فیکٹری پر پیسہ ہی لگے جاتا ہے کمائی نہیں ہوتی۔ وہ ہمارے پنڈ میں کہتے ہیں ناں کہ پہلے ہی پھر جتنی پھر کھٹی۔“

مجھے سمجھ نہیں آئی۔ وہ ہنس پڑا۔ ”باجی! صاحب جی

بہت معصوم تھے۔ وہ ہر کسی پر بھروسہ کر لیتے تھے۔ انہوں نے جو ماسٹر رکھا تھا ان کے ذمے ہر نقصان نہ لگایا اور نہ تو فیکٹری مالک جب ماسٹر رکھتے ہیں تو اس کو تنخواہ اسی ہنڈ کی دیتے ہیں کہ کام نہیں رکے گا اور کوئی نقصان ہو تو اسی کے سر ہوگا۔ وہ خود بڑا چور تھا جی۔ پرزے چوری کر لیتا تھا۔ پھر صاب کو وہی پرزے لاکھوں میں لا کے دیتا تھا۔ صاب کو اس کام کا کچھ پتا نہ تھا جی وہ اس کے ہاتھوں بلیک میل ہوتے گئے۔ سارے ورکرز اتنی کی ٹیم کے تھے۔“

میں نے اس کی طرف غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”تو

کیا تم اس کی ٹیم کے نہ تھے؟“

اس نے مسکرا کے سر جھکتے ہوئے کہا۔ ”نہیں تھا نا اسی لیے تو تک نہیں۔ کا۔“

میں نے سر گھما کے مشینوں کی طرف دیکھا اور افسوس سے کہا۔ ”اب ان مشینوں کو کوئی لوہے کے بھاؤ بھی نہیں لے گا۔“

وہ تڑپ گیا۔ ”ایسے نہ کہیں جی، یہ چل سکتی ہیں اب بھی چل سکتی ہیں۔“

”لو بھلا اب کیسے یہ چلیں گی۔“ میں نے افسردگی سے کہا۔

کے دیکھ سکتی ہیں کہ کار میگر فارغ تو نہیں بیٹھے اور کسی نے کچھ چوری تو نہیں کیا۔“

مجھے اس کے مشوروں میں وزن نظر آیا۔ میں نے کہا۔ ”آپ منگوائیں میں ادا کر دوں گی۔ مگر کام کیسے ہوگا۔ لیبر تو نہیں ہے۔“

”سب ہو جائے گا۔ آپ بس ہمت اور حوصلہ کریں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا انشاء اللہ۔“ اس نے تسلی دی۔ وہ پھر بولنے لگا۔ ”میں انشاء اللہ دو دن میں آپ کی دونوں مشینوں کے لیے کار میگروں کا انتظام کر دوں گا۔ ماسٹر کی ضرورت نہیں ہے ہاں اگر اس لڑکے ابوبکر کو بھی رکھ لیں تو اچھا ہوگا ایماندار بھی ہے اور محنتی بھی۔“

میں فوراً بولی۔ ”بھئی مجھے کیا پتا کس کو رکھنا ہے اور کیا کیا کام کس کس طرح لینے ہیں۔ آپ ایسا کریں آپ ہی ماسٹر بن جائیں۔“

وہ ہولے سے مسکرا دیا اور دھیمے لہجے میں بولا۔ ”آپ یہ ہی سمجھیں میں ماسٹر ہی ہوں۔ بس آپ بے فکر ہو جائیں۔ حالانکہ میرے لاتعداد اور کلائنٹس ہیں، دیکھا نہیں صبح سے کتنے فون آچکے ہیں۔“

ابوبکر چائے کے ساتھ کافی کچھ لایا تھا۔ میں نے پیے دینے چاہے تو اس نے بتایا کہ حسن صاحب نے سب کچھ منگوایا ہے۔

لائٹ آگئی تھی۔ اس نے مشینیں اشارت کیں تو وہ دونوں چلنے لگیں۔ ابوبکر نے کپڑا لگا کر ٹیسٹ کیا۔ میرا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ میں نے اس کا شکر یہ ادا کیا۔ خوشی سے میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ”آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ باقی کل انشاء اللہ۔“ اس نے کہا اور خدا حافظ کہہ کے روانہ ہو گیا۔

میں گھر پہنچی تو ماما پاپا کے کمرے میں ہی تھیں۔ میں نے اندر جا کر خوشی سے پاپا کا ہاتھ تھام کر آنکھوں سے لگایا اور رونے لگی۔

ماما نے گھبرا کر پوچھا۔ ”کیا ہوا؟ خیریت تو ہے نا۔“

میں نے ساری بات بتائی۔ میں نے دیکھا بابا کے چہرے پر آسودگی تھی۔ سکون تھا۔ میں خود سکون میں آگئی۔ ایک ہفتے میں حسن نے میری فیکٹری کو ٹھیک ٹھاک فیکٹری بنا دیا۔ کام کے لیے آرڈر دلوا دیے تھے اور وہ بھی ایسی پارٹیوں سے جو کام وصول کرتے ہی فوراً پے منٹ کر دیتیں۔ حسن ہی کے کہنے پر میں نے پارٹ ٹائم ایک

تھی۔ میں نے اسے کہا۔ ”حسن آپ میرے ساتھ جیولرز مارکیٹ تک جا سکتے ہیں۔ پیسے وہیں سے ارنج ہوں گے۔“

میں نے لاکٹ کو ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

اصل میں مجھے اکیلے چیزوں کو بیچتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا۔ ایسے میں کسی مرد کی ضرورت تھی وہ فوراً بولا۔ ”جی ضرور، چلیے۔“

میں نے فیکٹری کو تالا لگایا اور سڑک کی طرف کسی رکشے کے لیے ادھر ادھر دیکھا۔ ”تم جا کے رکشالے آؤ۔“

میں نے ابوبکر سے کہا۔

وہ ہنس پڑا۔ ”حسن صاحب کے پاس گاڑی ہے جی۔“

میں نے دیکھا حسن گاڑی بیک کر کے میری طرف لا رہا تھا۔ اس نے اتر کر آگے کا دروازہ کھولا مگر میں پیچھے کا دروازہ کھول کر بیٹھ گئی۔ اگلی سیٹ پر ابوبکر بیٹھ گیا۔ میں نے انگوٹھی، ٹاپس اور لاکٹ اتار کر جیولرز کے سامنے رکھے۔ جیولرز نے غور سے میری شکل دیکھی اور پھر میرے ساتھ دو فرد تھے ”تولا کھ“ اس نے کہا۔

میں نے کہا دے دو۔ پیسے لے کر ہم پھر گاڑی میں بیٹھ گئے۔ گاڑی اب بہت بڑی ایک بلڈنگ کے باہر رکھی۔ وہاں ایک دکان، میں ہم نے ان پرزوں کا سہل سامنے رکھا۔ دکاندار نے حساب لگا کر کہا۔ ”ساڑھے پانچ لاکھ۔“

میں نے ساڑھے پانچ لاکھ اس کو دیے۔ حسن نے ابوبکر سے پرزے اٹھوا کر گاڑی میں رکھوائے اور ہم واپس فیکٹری کی طرف چل پڑے۔ مزید ایک گھنٹے میں حسن نے مشینیں تیار کر دیں۔ اب ان کو چلانا تھا مگر لائٹ چلی گئی تھی۔ ہم پاپا کے آفس میں آئے۔ بیٹھ گئے تھے۔ ابوبکر کو ہم نے چائے اور کچھ کھانے کی چیزیں لانے کے لیے بھیج دیا تھا۔

”ایک مشورہ دوں۔“ اچانک حسن بولا۔

”اب تو آپ کی ہر بات ہی ماننی ہوگی بولیں۔“ میں پہلی بار مسکرائی تھی۔

وہ بھی مسکرا دیا۔ ”ایک لاکھ اور بیس ہزار روپے کا جزیرہ آئے گا جو دونوں مشینوں کو چلائے گا۔ لائٹ جانے سے جو نقصان ہو رہا ہے۔ وہ بھی نہیں ہوگا۔ دوسرا ساٹھ ہزار روپے کے دونوں مشینوں کے سائڈ میں چھپے ہوئے دو کیمرے لگائے جائیں اگر آپ یہاں اس کمرے سے لیبر کو کام کرتا دیکھنا چاہیں تو لیپ ٹاپ پر دیکھ سکتی ہیں اور اگر آپ موجود نہیں ہیں تو بھی جب آپ آئیں کیمرا یورس کر

کی عادت پڑ گئی تھی۔

اس کے بغیر چھ ہفتے کیسے میں نے گزارے وہ میں ہی جانتی ہوں۔ وہ مجھے روز فون کرتا تھا۔ فیکٹری کے معاملات میں مدد کرتا تھا اور بہت ساری محبت کی باتیں بھی کرتا تھا اور پھر اللہ تعالیٰ نے انتظار کی گھڑی ختم کیں۔ وہ آ گیا اور ڈیپری سارے ختم بھی لایا اور ایک ڈائمنڈ کالکٹ سیٹ، انگوٹھی اور ٹاپس بھی لایا جو اس نے خود مجھے پہنائے۔ میں نے کوئی بات ماما اور پاپا سے نہ چھپائی۔ ماما کے کہنے پر میں نے اسے کھانے پر اپنے گھرانو امیٹ کیا۔ وہ بڑی دیر تک پاپا کے پاس بیٹھا ان سے میرے ہی انداز میں ڈیپری ساری باتیں کرتا رہا۔ ماما اس سے مل کر بے حد خوش ہوئیں۔ رباب بھی آ گئی۔ اس کو بھی حسن بے حد اچھا لگا۔

اس کا دھیما لہجہ، بے ساختہ مسکراہٹ میرے دل پر اثر کرتی جا رہی تھی۔ میں بے حد خوش تھی۔ رباب نے اس سے کہا اگر نیا ب کو حاصل کرتا ہے تو اپنے والدین کو بھیج دو۔ اس نے مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے ہامی بھری۔ جاتے ہوئے وہ پاپا کے پاس آ بیٹھا۔ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ کر کافی دیر تک باتیں کرتا رہا۔ اگلے دن میں فیکٹری میں اسے ملی تو مجھے اس سے شرم آ رہی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس سنڈے کو وہ اپنی والدہ کے ہمراہ ہمارے گھر آئے گا اور میرا ہاتھ طلب کر لے گا۔

میرے سر جھکانے سے اسے میرے اقرار کا اندازہ ہو گیا تھا۔ مجھے بے چینی سے سنڈے کا انتظار تھا۔

اتوار کو ماما نے اس کے والدین کے لیے کھانے کا انتظام کیا تھا۔ میں نے آج بڑی دیر آئینے کے سامنے کھڑے ہو کے خود کو سنوارا تھا۔ مجھے بچے میں اور ماما پاپا کے کمرے میں تھے کہ ملازمہ نے آ کے اطلاع دی کہ حسن اور اس کی والدہ آ گئی ہیں۔ انہیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا ہے۔ ماما سیدھی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئیں۔ میں پردے کے پیچھے سے چھپ کے ان کو دیکھنے لگی جس صوفے پر حسن کی ماں بیٹھی تھی وہ صوفہ پردے کے آگے تھا۔

اس طرح ان کی بیک میری طرف تھی۔ ماما کے اندر داخل ہونے پر وہ دونوں اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اچانک ماما کے منہ سے نکلا۔ ”تم..... تم یہاں!“ پھر تیز گج میں بولیں۔ ”تم میری بیٹی کا رشتہ لینے آئی ہو۔“

حسن نے گھبرا کے مجھے دیکھا۔ مجھے بھی کچھ سمجھ نہیں آیا۔ میں بے ساختہ کمرے میں داخل ہو گئی اور ان کے

اکاؤنٹ بھی رکھ لیا تھا جو سارے کام کا حساب کتاب کرتا تھا۔ پہلے ہی ماہ میں خرچہ نکال کر 5 لاکھ بیچ گئے جن میں سب سے پہلے ہم نے بینک جا کر لون کی اقساط جمع کروائیں۔ اگلے چھ ماہ میں کام بہت بہتر چل نکلا تھا۔ میں نے گاڑی لے لی تھی۔ فیکٹری میں کبھی کوئی چوری نہ ہوئی۔ لڑکے بہت اچھا کام کر رہے تھے۔ احسن ہی کے کہنے پر میں نے عید پر سارے کاری گروں کو عید بونس بھی دیا۔ میرا اسٹاف مجھ سے بے حد خوش تھا۔ چھ ماہ تک پتا نہیں چلا کہ حسن کی اپنی ذاتی دو مشینوں کی فیکٹری بھی ہے لیکن وہ خود لوگوں کی مشینوں کے فالٹ ٹھیک کرنا پھرتا تھا۔ وہ بہت سادہ اور سختی تھا۔ اس کے مجھ پر بے حد احسان تھے ایک وہی تو تھا جس کی وجہ سے میری کباڑیوں کو دینے والی مشینیں فیکٹری کی شکل اختیار کر گئی تھیں۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ میں کبھی اتنی پختل ہو جاؤں گی کہ زیادہ سے زیادہ وقت فیکٹری کو دوں گی۔ فیکٹری کے زیادہ تر معاملات احسن ہی حل کرتا تھا۔ ہر کام میں ہر مسئلے میں ہر سلسلے میں مجھے اس کی مدد دے کر تھی۔ وہ میری کتنی بڑی ضرورت بن گیا ہے اس کا احساس تو مجھے اس وقت ہوا جب ایک بار وہ میرے دفتر میں بیٹھا تھا اور لپ ٹاپ پر کام کر رہا تھا۔ سرسری سے انداز میں اس نے کہا۔ ”میں گل گوریا جا رہا ہوں۔“

”کیا“ میں بے حد حیران ہوئی تھی۔ ”کیوں کتنے عرصے کے۔ یہ۔ واپس کب آؤ گے۔“

وہ ہنس پڑا۔ ”بھئی ایک دم اتنے سارے سوال، اچھا میں ایک ایک کر کے تینوں سوالوں کے جواب دیتا ہوں۔ پہلا سوال کیوں تو اس کا جواب ہے کہ میں گوریا میں ورک شاپ اٹینڈ کرنے جا رہا ہوں۔ دوسرا سوال کتنے عرصے کے لیے، اس کا جواب ہے چھ ہفتے کے لیے اور تیسرے سوال کا جواب تو تمہیں پتا ہی لگ گیا ہو گا۔ چھ ہفتے کے بعد واپس آ جاؤں گا انشاء اللہ۔“

مجھے لگا جیسے میرا دل بند ہو جائے گا۔ اسے شاید خبر ہو گئی تھی۔ وہ بولا۔ ”میں روز تم سے بات کروں گا تم فکر نہ کرنا، ہر لمحے ہر وقت تم سے ایچ رہوں گا۔“

میرے منہ سے نکلا ”مجھے بھول تو نہیں جاؤ گے۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”یہ جو روزانہ یہاں حاضری دیتا ہوں یہ کافی نہیں ہے کیا، ضروری ہے کہ اتر رہی کروں۔“ میں مسکرا دی۔ وہ چلا گیا۔ حالانکہ اب میں اس قابل ہو گئی تھی کہ فیکٹری کے معاملات خود سنبھال سکوں مگر مجھے اس

ساٹنے جائے کھڑی ہوگئی اور خود بھی پریشان ہوگئی تھی۔ کیوں کہ حسن کی ماں کے روپ میں دلشاد تھی۔

آج سے پانچ سال پہلے تک دلشاد ہماری ملازمہ تھی۔ ہمارے گھر کے سارے کام اسی کے ذمے تھے۔ وہ پچھلے سات سال سے ہمارے گھر کام کر رہی تھی۔ ان سات سالوں میں ہمارے اور اس کے بڑے اچھے تعلقات رہے کیوں کہ وہ شاید کسی اچھے بیک گراؤنڈ سے تعلق رکھتی تھی۔ ہمارے علاوہ بھی وہ کچھ اور گھروں کے کام بھی کرتی تھی۔ جب وہ ہمارا کام ختم کر کے واپس جاتی تو ماما اسے گھر کا بچا کچھا سالن دیتا چاہتے تھے مگر وہ رسائیت سے انکار کر دیتی۔ کہہ دیتی کہ گھر کے تازہ سالن بتائے گی کیوں کہ اس کا بیٹا گڈو تازہ سالن پسند کرتا ہے۔ وہ ایماندار بھی تھی۔ چھٹیاں بھی نہیں کرتی تھی اور صاف ستھری نظر آتی تھی۔ گھر کی صفائی ستھرائی کرنا، کچن صاف کرنا، کپڑے دھونا، کپڑے استری کرنا، ہانڈی روٹی کرنا سب کام وہی کرتی تھی۔ وہ زیادہ تر اپنے بیٹے گڈو کا تذکرہ کرتی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ وہ کمپیوٹر کا کام کرتا ہے۔ ماما اور پاپا نے اس سے کبھی اس کی فیملی کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں پوچھی مگر وہ خود ہی ذکر کرتی کہ باپ کے مرنے پر بھی گڈو بگڑا نہیں اس نے بی اے کر لیا ہے۔ کمپیوٹر کا ماہر ہے پھر ایک بار اس کا گڈو کسی ٹریننگ پر ملک سے باہر چلا گیا اور وہاں سے اتنا پیسا بھیجے لگا کہ دلشاد نے سب گھروں کے کام چھوڑ دیے۔ ہمیں اس کے بغیر بے حد پریشانی ہوئی مگر جب وہ کام ہی نہیں کرنا چاہتی تھی تو زبردستی تو ہم اسے نہیں لگا سکتے تھے۔ اس وقت میں میٹرک میں تھی اور دلشاد ہم سب کی پسندیدہ کام والی تھی۔ اس کے جانے کے بعد ہمیں اس جیسی کام والی کوئی نہ ملی۔ پھر پاپا کا ٹرانسفر لاہور ہو گیا۔ حالانکہ اس کے بعد ہم نے بہت کام والیاں بدلیں مگر ہم لوگ دلشاد کو نہ بھول سکے۔ آج دلشاد حسن کی ماں کی حیثیت سے ہمارے گھر میں تھی۔ وہ خود ہمیں دیکھ کے حیران تھے جب کہ ماما پریشان تھے۔ پھر بھی ماما نے عزت سے ان کو کھانا کھلایا۔ سب ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ دلشاد نے بتایا کہ اس کا بیٹا حسن تین سال کو ریا میں ایمر ایڈری مشینوں کی ٹیکنیکل ٹریننگ لے کے آیا ہے۔ یہاں پر لاہور کی ساری مشینیں وہی ٹھیک کرتا ہے اور اس کی اپنی ذاتی دو مشینوں کی فیکٹری بھی ہے اس نے بتایا کہ انہوں نے اپنی کوٹھی بنالی ہے۔ گاڑی وغیرہ کے علاوہ سب سہولیات ہیں۔ میں تو اس کے لیے کوئی پڑھی لکھی لڑکی ڈھونڈ

رہی تھی کہ حسن کو تاپا پسند آگئی۔ ماما نے اس کی ساری بات سنی اور کہا۔ ”دیکھو دلشاد تم نے سات سال ہمارے گھر کام کیا ہے۔ تم کو میرا سارا خاندان جانتا ہے اور تم ہمارے اسٹینس سے بھی واقف ہو۔ اب یہ تو ہونے لگا کہ جو عورت ہمارے گھر سات سال تک کام کرتی رہی ہو۔ اسی کے بیٹے کو ہم اپنی بیٹی دے دیں۔ ہم مانتے ہیں کہ حسن کے ہم پر بے حد احسانات ہیں مگر بیٹی احسان کے بدلے میں تو نہیں دی جاسکتی تھی۔ اس رشتے سے میری طرف سے انکار ہے۔“

دلشاد تنگ ہو کر رہ گئی۔ وہ کچھ نہ بولی۔ میں نے حسن کی طرف دیکھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں ایک محرومی نظر آئی۔ اٹھتے ہوئے دلشاد نے کہا۔ ”صاحب کو دیکھ لوں۔“ ماما اٹھ کھڑی ہوئیں اور انہیں پاپا کے کمرے میں لے گئیں۔ اس کے بعد وہ لوگ چلے گئے۔ ماما نے مجھے سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر میں رات گئے تک روتی رہی۔ پھر میں پاپا کے پاس آگئی۔ پاپا کا ہاتھ پکڑ کر آنکھوں سے لگا کر میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ میں نے ان کو ساری بات بتادی۔ بے چارے پاپا کوئی جواب تو نہیں دے سکتے تھے۔ اگلے دن مجھے بخار ہو گیا۔ میں فیکٹری نہیں گیا مگر پتا چلا کہ حسن آج بھی فیکٹری آیا تھا اور آج کے کام بھی اسی نے سمجھائے تھے۔ میں کب تک چھٹیاں کرتی۔ ایک ہفتے حد فیکٹری جانا پڑا۔ حسن میرے سامنے لا تعلق بنا یہ پاپا پر کام کر رہا تھا۔ میں نے بات کا آغاز کیا۔ ”حسن اب کیا ہوگا۔“

وہ پھکی ہنسی ہنس دیا۔ اس کے لہجے میں زمانے بھر کا درد تھا۔ وہ بولا۔ ”کیا ہو سکتا ہے تمہاری والدہ نے تو صاف جواب دے دیا ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”حسن تم کو دو بارہ بات کر کے دیکھوں۔“

وہ ناامیدی سے بولا۔ ”کوشش کر کے دیکھ لو مگر میں جانتا ہوں وہ نہیں مانیں گی۔“

میں گھر گئی تو پاپا کے کمرے میں ماما بیٹھی تھیں۔ مجھے یقین تھا پاپا سب کچھ سن رہے ہیں میں نے بات کا آغاز کیا۔

”ماما! میں آپ سے بات کرنا چاہتی ہوں۔“

وہ تنگ کر بولیں۔ ”میں جانتی ہوں تمہیں کیا بات کرنی ہے۔ اسی حسن نے تمہیں مجھ سے بات کرنے کا کہا ہو گا۔“ میرے کچھ بولنے سے پہلے ہی انہوں نے فیصلہ سنا دیا۔ ”مجھ سے بات کرنے کا کچھ فائدہ نہیں کیوں کہ ایک کام

والی کے بیٹے سے، میں اپنی بیٹی بیاہ نہیں سکتی۔ کوئی اور کام والی ہوتی تو میں سوچتی چلو کون جانتا ہے اسے مگر یہ تو میری ہی ماسی ہے۔ میرا سارا خاندان اسے جانتا ہے۔ سب اس سے واقف ہیں۔ رباب کے سسرال میں بھی ایک بار کام کر کے آئی ہے یہ۔ تم چاہتی ہو کہ ہم اپنی بچی بچی عزت داؤ پر لگا دیں۔“

میں غصے میں بولی۔ ”جو کچھ آپ کے پاس بچا ہے اسی کام والی کے بیٹے نے بچایا ہے اگر وہ نہ ہوتا تو آج نہ یہ گھر ہوتا نہ یہ عیشر آرام۔ صرف اسی کی وجہ سے ہم پہلے سے زیادہ اچھے مقام پر آگئے ہیں۔“

وہ میرے پاس آ کے بیٹھ گئیں اور مجھے سمجھاتے ہوئے بولیں۔ ”نایاب! میری بیٹی دیکھو پیسے کو دوبارہ کمایا جاسکتا ہے۔ گیا، واپس دوبارہ لوٹ کے آجاتا ہے مگر عزت خراب ہو جائے تو واپس نہیں آتی۔ ہمارے اپنے کیا کہیں گے۔“

میں نے ان کی بات کاٹ دی۔ ”کون سے اپنے وہی اپنے نا جنہوں نے ہمارے برے وقت میں ہمارا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ جنہوں نے اس لیے ملگنی توڑ دی تھی کہ ہم تلاش ہو گئے تھے۔ کیا وہی اپنے ہیں، آپ کے اپنے؟“

وہ رسوائیت سے بولیں۔ ”اپنوں میں ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ اپنے اپنے ہی ہوتے ہیں۔ آج رباب آئی تھی اس نے کہا ہے کہ بھئی احمد اب دوبارہ رضوان کا رشتہ تمہارے ساتھ کرنے کو تیار ہیں۔“

”کیا!“ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”اور آپ نے ہاں کر دی؟“

”ہاں۔“ انہوں نے مطمئن انداز میں کہا۔ ”میں نے ہاں کر دی ہے۔ آخر گھننے پیٹ کی طرف ہی جھبکتے ہیں۔“

میں تڑپ کے بولی۔ ”ہرگز نہیں، میں رضوان سے کبھی شادی نہیں کر سکتی۔ میں اگر شادی کروں گی تو صرف حسن سے۔“ میں نے اپنا فیصلہ سنا دیا۔

وہ بولیں۔ ”میں یہ ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔“ پھر وہ خوف زدہ سے، انداز سے بولیں۔ ”کیا تم اس سے کورٹ میرج کر لو گی؟“

میں نے غصے میں کہا۔ ”ہو سکتا ہے یہ ہی کر گزروں۔“

”جس دن تمہارے پاپا کو ایسی کسی بات کا پتا چلا اسی وقت ان کی سانس بند ہو جائے گی۔ بے شک یہ بول نہ سکیں

گے مگر دیکھتے سنتے تو سب کچھ ہی ہیں۔“

میرا عزم جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ میں پاپا کا ہاتھ ہاتھوں میں لے کے پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ ”پاپا میں آپ کو کھونا نہیں چاہتی۔ آپ مجھے اس حالت میں بھی نظر تو آتے ہیں۔“

ماما غصے میں کمرے سے باہر نکل گئی۔ انہوں نے ہتھلی پر سروسوں جمانے کے مصداق اگلے ہی منٹے میرا نکاح طے کر دیا میں نے ان سے کچھ نہ کہا۔ صبح کو خاموشی سے فیکٹری چلی جاتی۔ حسن مشینیں چیک کرنے آجاتا۔ میں نے اسے ساری بات بتا دی۔ وہ آنسو چھپاتا ہوا چلا گیا۔ وہ یہ بات سمجھ گیا تھا کہ پاپا کی زندگی مجھے بہت عزیز ہے۔ نکاح سے ایک دن پہلے ماما نے مہندی کا انتظام کر دیا تھا۔ ماموں احمد، ممانی، رباب، عرفان اور رضوان ہمارے گھر میں تھے۔ ماما نے اپنے بھائی کو ہاں کہہ دی تھی۔ میرے جیسی بیٹی دوبارہ ان کی جھولی میں ڈال رہی تھیں۔ طے یہ ہوا تھا کہ میں شادی کے بعد بھی اسی طرح فیکٹری چلاؤں گی۔ یعنی ماں کے گھر سے ماموں کے گھر میری ٹرانسفر ہو جائے گی۔ باقی ذمہ داریاں میری وہی رہیں گی۔

میں خاموشی سے اٹھ کر پاپا کے پاس چلی آئی اور رو رو کر اپنے دل کا حال پاپا کو کہہ سنایا۔ میرے دل کو یقین تھا کہ پاپا میری تڑپ سے آگاہ ہیں۔ اگلے دن میں ماما کے منع کرنے کے باوجود فیکٹری چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد حسن بھی آ گیا۔ میری سوچی ہوئی آنکھیں دیکھ کر بولا۔ ”نہ رویا کرو جو مقدر میں ہوتا ہے۔ وہی ملتا ہے۔ انسان اپنی قسمت سے نہیں لڑ سکتا۔ راضی بہ رضا ہونا پڑے گا۔“

میں نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کا چہرہ غم کی تصویر بنا ہوا تھا مگر وہ مرد تھا تا ضبط کی حدیں پار کر گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”حسن میں کیا کروں۔ اب تو ایک زندہ لاش ہی رضوان کے حوالے ہوگی۔ خوشیاں مجھ سے دور جا چکی ہیں۔ میں ساری زندگی ایسے ہی روٹی رہوں گی۔“

وہ بولا۔ ”اللہ نہ کرے۔ میری دعا ہے تم ہمیشہ خوش رہو۔“

میں رونے لگی۔ وہ دور سے ہی بولا۔ ”اب تم کسی اور کی ہونے جا رہی ہو میں تمہارے قریب آ کے تم کو چب بھی کروانے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔“ اس کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہو گئے کہ ایسے میں ماما کا فون آ گیا۔ ”اب گھر آ جاؤ، دولہا والے آنے والے ہیں ابھی تم کو بیوی پارلر بھی جانا

ہے۔“

میں نے آرام سے کہا۔ ”بیوٹی پارلر تو میں نہیں جاؤں گی۔ ہاں تھوڑی دیر تک گھر آ جاؤں گی۔“

انہوں نے غصے میں فون بند کر دیا۔ حسن نے مجھے سمجھایا۔ ”نایاب تم گھر چلی جاؤ اور ہاں اب نہ رونا میں ہوں یہاں پر سارا کام کروالوں گا۔ تم فکر نہ کرنا کل جب تم یہاں آؤ گی تو کسی اور کی نایاب بن کے آؤ گی۔“ اس نے اپنے بپتے ہوئے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”ہم پھر بھی اچھے دوست رہیں گے کبھی بھی کوئی مشکل کوئی پریشانی ہو میں پہلے کی طرح تمہارے ساتھ ہی ہوں گا۔“

میں خرا حافظ کہہ کر گھر آ گئی۔ گھر بقیع نور بنا ہوا تھا۔ مجھے رباب پر غصہ آ رہا تھا۔ جو شخص اپنے سسرال میں عزت بنانے کے لیے مجھے پھنسا رہی تھی۔ ماما نے بہت زور دیا کہ میں بیوٹی پارلر سے تیار ہو جاؤں۔ میرا دل غم سے بھرا ہوا تھا۔ رباب بھی بہت زور دے رہی تھی مگر میں نے ان کی ایک نہ مانی اور روتے ہوئے پاپا کے کمرے میں آ گئی۔ پاپا کے چہرے کو غور سے دیکھ کر میں ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ اپنی بے بسی پر مجھے بے حد رونا آیا۔ میں پاپا کے پاؤں تھام کے پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔

”پاپا! میں کیا کروں۔ مجھے حسن سے محبت ہے مگر مجھے آپ سے، بہت زیادہ محبت ہے۔ میں جانتی ہوں حسن کے بغیر زندگی گزارنا میرے لیے بے حد مشکل ہے اور پاپا اس صورت میں جب کہ مجھے اس سے روز ملنا ہو میں کہاں جاؤں۔ پاپا میں کیا کروں۔ اے میرے اللہ! میرے پاپا کو ٹھیک کر دے۔“ میں رو رو کر بلک بلک کر اللہ سے اپنے پاپا کے لیے دعا کرتی رہی۔ اچانک مجھے محسوس ہوا پاپا کا پاؤں ہلا ہے۔ میں ساکت ہو گئی۔ پاپا کا پاؤں واقعی ہل رہا تھا۔ میں نے پاپا کے ہاتھوں کی طرف دیکھا پاپا کی انگلیاں بھی ہل رہی تھیں۔ میں بھاگ کے پاپا کی سائیڈ پر آ گئی۔ پاپا کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ پھر مجھے، ان کی آواز سنائی دی۔ ”نایاب۔“

میں نے بے اختیار ان کے چہرے کو چومنا شروع کر دیا۔ میرے پاپا نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میرے پاپا کو سے باہر نکل آئے تھے۔ وہ ہوش میں آ گئے تھے۔ انہوں نے مجھے سینے سے لگا لیا۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر تڑپ تڑپ کے رو دیے۔ میرے پاپا اٹھ کے بیٹھ گئے۔ انہوں نے میرا ہاتھ چوما اور ایک بار مجھے گلے سے لگا لیا۔

میں نے پاپا کی مدد کرتے ہوئے ان کے پاؤں بیڈ سے نیچے اتارے اور ان کو کھڑے ہونے میں مدد کی۔ تھوڑی دیر وہ میرے سہارے سے کمرے میں چلتے رہے۔ مجھے یہ سب کچھ ایک خواب سا لگ رہا تھا۔ پھر ہم صوفے پر بیٹھ گئے۔ میرے پاپا نے میرا ہاتھ ہاتھوں میں لے کے کہا۔ ”میری جان! میں اب تمہیں برباد نہیں ہونے دوں گا۔ مجھے سب علم ہے میں سب سنتا تھا۔ بس بول نہ سکتا تھا۔ تمہاری ماں صرف اپنے بھائی کو خوش رکھنے کے لیے تمہاری قربانی دے رہی ہے۔ تم بے فکر رہو اب میں ٹھیک ہو گیا ہوں۔ اللہ نے مجھے تمہارے لیے ٹھیک کیا ہے۔ جاؤ تم اپنی ماں کو بلاؤ۔“

میرا موبائل پاپا کے پاس ہی رکھا تھا۔ میں اسے وہیں چھوڑ کر دوڑ کر ماما کے پاس پہنچی۔ ماں اور رباب کمرے میں تیار ہو رہی تھیں۔ میں بھاگ کر ان کے کمرے میں داخل ہوئی۔

”ماما وہ پاپا.....!“ میرے منہ سے نکلا۔ وہ دونوں سمجھیں کہ پاپا کو کچھ ہو گیا ہے۔ وہ دونوں بھاگ کے میرے سے پہلے پاپا کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ بیڈ پر پاپا نہیں تھے۔ وہ صوفے پر بیٹھے مسکرا رہے تھے اور میرے موبائل سے کسی کو فون کر رہے تھے۔ ماما اور رباب دونوں حیران اور خوش ہو کے پاپا کے ساتھ صوفے پر بیٹھیں۔ پاپا نے کسی کو خدا حافظ کہا اور ماما سے کہا۔ ”نایاب کے آنسوؤں میں اتنی جان تھی کہ اللہ نے مجھے اس کے لیے ٹھیک کر دیا۔“

رباب، پاپا کے گلے لگ گئی۔ ماما نے بھی خوشی سے پاپا کے ہاتھ تھام لیے اور پاپا کو لے کے باہر نکل آئیں۔ ایک ہی لمحے میں پہلے ملازموں اور پھر سارے رشتے داروں میں یہ خبر پھیل گئی کہ دلا اور صاحب کو مے سے باہر آ گئے ہیں۔ تھوڑی دیر میں ماموں احمد، عرفان، ممانی، رضوان وغیرہ ڈھیر سارے لوگوں کو بارات کی شکل میں لے کر آ گئے اور پاپا کے گلے لگ کے ٹھیک ہونے کی مبارک باد دی۔ پاپا ان کو صرف گہری نظروں سے دیکھتے رہے۔ جب کہ میں، ماما اور رباب تو حقیقت میں بے انتہا خوش تھے۔

دو گھنٹے ایسے ہی گزر گئے۔ نہ ہی میں تیار ہوئی اور نہ ہی کسی نے مجھے تیار ہونے کو کہا۔ ہاں البتہ ماما پاپا کو ان کے کمرے میں لے گئیں۔ بوسکی کی شلواری میض پہنے خوب صاف ستھرے جب سامنے صوفے پر آ کر بیٹھے تو ان کی مسکراہٹ دیکھ کے میرا دل خوشی میں جھوم اٹھا اور بھی مہمان آتے گئے۔ ماما اور رباب بھی پاپا کے ساتھ صوفے پر بیٹھی

تھیں۔ پاپا نے میرے کان میں کہا۔ ”تم تیار ہو کے آ جاؤ۔“

یہ میرے پاپا کا حکم تھا۔ میں نے ذرا سی بھی چوں چرا نہ کی۔ رہا اب مجھے میرے کمرے میں تیار کرنے چل دی اور ایک گھنٹے کے بعد میں تیار ہو کے اپنے پاپا کے ساتھ بیٹھی گئی۔ ماموں احمد نے، پاپا سے کہا۔ ”بھائی دلاور مولوی کو تو بلوالیں اور اب نکاح پڑھو ادیس۔ پہلے ہی کافی دیر ہو چکی ہے۔“

پاپا نے کہا۔ ”کس کا نکاح؟ کس کے ساتھ؟“

ممائی تیزی سے بولیں۔ ”رضوان کا نکاح نایاب کے ساتھ اور کس کے لیے یہاں سب جمع ہوئے ہیں۔“

پاپا نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ ”رضوان اور نایاب کی منگنی تو ٹوٹ چکی تھی ناں اور یہ منگنی آپ لوگوں نے ہی توڑی تھی۔“

ممائی ہنکلا کر بولیں۔ ”وہ..... وہ تو بس ایک غلط فیصلہ تھی اب دوبارہ یہ رشتہ سیما آپا نے اپنی مرضی سے کیا ہے۔“ انہوں نے ماما کی طرف اشارہ کیا۔

”اللہ کا شکر ہے کہ یہ نکاح ہونے سے پہلے ہی اللہ مجھے ہوش میں لے آیا۔“

ماموں نے پاپا کی طرف غور سے دیکھ کر کہا۔ ”ہاں شکر ہے اللہ کا۔ اب دیر کس بات کی ہے۔ بلائیں مولوی کو۔“

پاپا غصے میں بولے۔ ”ابھی میری بات مکمل نہیں ہوئی ہے احمد میاں، تم نے جب یہ دیکھا کہ میں تو کوسے میں ہوں نہ جانے زندہ رہوں یا مرجاؤں۔ فیکٹری ختم ہو گئی ہے۔ گھر بینک والے۔ لے جائیں گے تو نایاب کے پاس کیا رہ گیا۔ یہ سوچ کے تم نے منگنی توڑ دی مگر اللہ نے ایک فرشتہ بھیج دیا۔

اس کی مدد اور اللہ کی مہربانی نے میری نایاب کو اتنا اونچا مقام دے دیا۔ پھر جب تم نے دیکھا کہ اب تو سب کچھ ٹھیک ہو گیا ہے بلکہ پہلے سے بھی زیادہ ٹھیک ہو گیا ہے تو تم نے سوچا نایاب فیکٹری بھی چلاتی رہے گی اور تمہارا گھر بھی۔

اس لیے تم نے اپنی بہن سے دوبارہ نایاب کا ہاتھ مانگ لیا۔ اس کی ماں۔ یہ دتوف اس نے اس فرشتہ جیسے ہیرے کو ٹھکرا کر یہ پتھر پھر سے اپنے سر پر مارنے کا ارادہ کر لیا۔ بھائی

احمد! میری نایاب..... نایاب ہے۔ یہ آپ جیسے لوگوں کے لیے نہیں ہے۔ اس کا نکاح رضوان جیسے فضول شخص سے نہیں ہو رہا۔“

ماموں احمد بھونچکے سے رہ گئے۔ کچھ نہ بولے مگر

رہا اب کا شوہر عرفان فوراً بول اٹھا۔ ”اگر آپ نایاب کا نکاح رضوان سے نہیں کریں گے تو میں بھی رہا اب کو چھوڑ دوں گا۔“

پاپا مسکرائے اور بولے۔ ”ضرور چھوڑ دینا مگر رہا اب کا نکاح نامہ ابھی تک میرے پاس موجود ہے جس پر تمہارے سائن ہیں اور تم نے نکاح نامہ میں 50 لاکھ حق مہر کے ساتھ ساتھ 50 تونے زیور بھی لکھا ہے۔ سوچ لو میں تم کو چھوڑوں گا نہیں۔“ عرفان نے چہرے سے پسینا صاف کیا اور بیٹھ گیا۔ پاپا نے مزید کہا۔ ”ناایاب کا نکاح ہونے والا ہے حسن کے ساتھ۔ حسن کو آپ لوگ نہیں جانتے۔ حسن

ہی وہ فرشتہ ہے جس نے نایاب کو سہارا دیا۔ فیکٹری کے ہر مسئلے میں اس کی مدد کی۔ ہر مشکل میں ساتھ دیا۔ اسی حسن سے تھوڑی دیر میں نایاب کا نکاح ہو جائے گا وہ لوگ برأت لے کے آنے ہی والے ہیں۔“

ماموں احمد نے پریشانی سے ممائی کو دیکھا۔ ممائی نے انہیں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئے۔ پاپا نے مزید کہا۔

”آپ لوگ حسن سے تو واقف نہیں ہوں گے، مجھے بہت بعد میں پتا چلا کہ حسن کون ہے آپ لوگوں نے ہمارے گھر ایک کام والی برسوں تک دیکھی ہوگی۔ دلشاد نام تھا اس کا۔ حسن اسی کا بیٹا ہے۔ بہت مہنتی ہے۔ خود دار ہے۔ شریف ہے۔

میں نے حسن کو اپنی نایاب کے لیے پسند کیا ہے۔“

سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ میری آنکھوں سے خوشی کے آنسو بہ رہے تھے۔ ماما بھی کچھ نہ بول سکی تھیں۔ پاپا پھر بولے۔ ”آپ لوگ اگر تقریب میں خوشی سے شامل ہونا چاہیں تو موسٹ ویلکم! اجا تک لان میں گیٹ پر نگاہ پڑی تو دلشاد آئی، حسن اور کچھ لوگ اندر داخل ہو رہے تھے۔ پاپا جلدی سے اٹھے مگر امی نے آگے بڑھنے سے انہیں روک لیا۔ وہ ان کے اعصاب کو آرام دینے کی فکر میں تھیں۔ دو

ڈھائی سال بعد ان کے اعصاب کام کر رہے تھے۔ اس لیے اعصاب پر زیادہ بوجھ ڈالنا بھی مناسب نہ تھا۔ پاپا نے کھڑے کھڑے ہی فون کر کے مولوی کو بلوالیا اور میرا نکاح حسن کے ساتھ ہو گیا۔ چھ ماہ بعد میری رخصتی بھی ہو گئی اور

میں بیاہ کے حسن کے گھر آ گئی۔ پاپا نے اپنی فیکٹری خود ہی سنبھال لی۔ حسن اب بھی پاپا کی فیکٹری میں چکر لگاتا رہتا ہے۔ اللہ کا شکر ہے میں حسن کے ساتھ بہت خوش ہوں۔ اللہ

سب کو ایسا باپ اور ایسا شوہر دے، آمین!!“



سون

محترم مدیر اعلیٰ سرگزشت
السلام علیکم

میں ایک معروف گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں اس لیے میں نے اپنا اور اس سرگزشت میں بیان کردہ تمام نام بدل دیے ہیں۔ ساتھ ہی گزارش ہے کہ میرا اصل نام بھی شائع نہ کریں۔ یہ سرگزشت صرف اس لیے بھیج رہی ہوں کہ ہر بیوی پوشیاریے۔ میری ماں کی طرح نادانی سے کام نہ لے۔

ثنا
(کراچی)

میں ہدایات دے رہی تھیں۔ ان کے لہجے میں بھی بوکھلاہٹ نمایاں تھی۔ مجھے حیرت کا شدید جھٹکا لگا کیوں کہ اس وقت امی عموماً اپنے کمرے میں ہوتی تھیں۔ انہیں دنیا میں صرف دو ہی کام تھے۔ آرام کرنا یا پی وی دیکھنا۔ انہیں پی وی دیکھنے

اس روز کالج سے واپس آئی تو گھر میں غیر معمولی چہل پہل دیکھ کر حیران رہ گئی۔ ورنہ اس وقت تو عام طور پر سناٹا ہوا کرتا تھا۔ انجم بو پورے گھر میں بولائی بولائی پھر رہی تھیں جب کہ امی لاؤنج میں صوفے پر بیٹھی ملازمہ کو تیز آواز

فروری 2015ء

219

مہنامہ سرگزشت

Copied From Web

بیچھے شادی ہو گئی تھی اور وہ بیاہ کر لاء ہور چلی گئی۔ چند ماہ تک اس کے خطوط آتے رہے۔ تم تو جانتی ہی ہو کہ میں ہمیشہ سے ہی خط لکھنے کی چور ہوں۔ کبھی جواب دیتی اور کبھی نہیں۔ البتہ ہمارے درمیان کبھی کبھار فون پر بات ہو جاتی پھر بد قسمتی سے اسے طلاق ہو گئی۔ شوہر سے نہ نبھ سکی دونوں کے درمیان زمین آسمان کا فرق تھا۔ اس کے بعد اس کا دل یہاں نہیں لگا اور وہ انگلینڈ چلی گئی۔ جب تک اس کی والدہ زندہ تھیں تو خیر خیریت معلوم ہو جاتی تھی۔ ان کے انتقال کے بعد فرزانہ سے کوئی رابطہ نہ رہا۔ اب وہ واپس آئی ہے تو اس نے فون کر کے اپنی آمد کی اطلاع دی۔ میں نے اسے کھانے پر بلایا ہے۔ اب وہ آئے گی تو معلوم ہوگا کہ وہ اتنا عرصہ کہاں رہی اور کیا کرتی رہی؟“

”آپ نے بتایا ہے کہ ان کی امی کا انتقال ہو گیا تھا۔ پھر وہ یہاں کس کے پاس ٹھہری ہوئی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔
”اپنے بھائی کے پاس۔“ امی نے جواب دیا۔ ”اب تم زیادہ سوال جواب مت کرو اور جلدی سے فریش ہو کر کپڑے تبدیل کر لو۔ بس وہ آتی ہی ہوگی اور ہاں اس کے سامنے ذرا تیز سے رہنا۔ الناسیدھا بولنے کی ضرورت نہیں۔“

میں دل ہی دل میں امی کی دوست کو برا بھلا کہتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ اب مجھے ان محترمہ کے انتظار میں بھوکا رہنا ہوگا جب کہ میں کالج سے واپس آنے کے بعد فوراً ہی کھانا کھانے بیٹھ جاتی کیوں کہ مجھ سے بھوک بالکل برداشت نہیں ہوتی تھی۔ یہی حال چھوٹے بھائی احمر کا بھی تھا۔ ہم دونوں عموماً ساتھ ہی کھانا کھاتے تھے لیکن ابھی تک وہ بھی نہیں آیا تھا۔ شاید پریکٹیکل کی وجہ سے اسے گھر آنے میں دیر ہو گئی تھی۔

کچھ دیر بعد فرزانہ آئی آگئیں۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنی گریس فل عورت نہیں دیکھی تھی۔ امی نے بتایا تھا کہ وہ اور آنٹی اسکول، کالج میں ساتھ بڑھتی تھیں۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ دونوں ہم عمر بھی ہوں گی لیکن فرزانہ آنٹی امی کے مقابلے میں کم عمر اور جوان نظر آ رہی تھیں۔ ان کے باتیں کرنے کا انداز بڑا دل نشیں تھا۔ ان کی مسکراہٹ بڑی جان دار اور ہنس میں ایک خاص کھنک شامل تھی۔ میں تو پہلی نظر میں ہی ان کی گردیدہ ہو گئی۔ انہوں نے بھی مجھ سے خوب کھل مل کر باتیں کیں۔ میری پڑھائی، فرصت کے مشاغل اور فلموں وغیرہ کے بارے میں باتیں کرتی رہیں۔ آج تک کسی عورت نے مجھ سے اتنی محبت اور اہمیت کا

کا بہت شوق تھا۔ اگر رات کو سونا ضروری نہ ہوتا تو وہ شاید چوبیس گھنٹے ہی وی ہی دیکھا کرتیں۔ کون سا ایسا ڈراما تھا جو انہوں نے نہ دیکھا ہو۔ پڑوسی ملک کے ساس بہوشوز سے لے کر اپنے ملک میں بنے ہوئے روتے دھوتے ڈرامے۔ وہ بڑی پابندی سے دیکھا کرتیں اور صبح کا وات کو کنگ شوز کی نذر ہو جاتا۔ نہیں جو ترکیب پسند آتی اسے وہ کاپی میں لکھ لیا کرتیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس ترکیب کو آزمانے کی نوبت کبھی نہیں آتی۔ جب سے انجم ہوا ہمارے گھر آئی تھیں۔ امی نے کچن سے ریٹائرمنٹ لے لی تھی اور گھر کے سارے کام انجم ہوا کے سپرد کر دیے تھے۔ یہاں تک کہ صبح کے وقت ابو کو ناشتا بھی وہی دیتی تھیں کیوں کہ اس وقت امی سو رہی ہوتی تھیں۔ انہیں دیر تک سونے کی عادت تھی اور ان کی صبح گیارہ بجے سے پہلے نہیں ہوتی تھی۔

میں نے محوں میں ہی صورت حال کا اندازہ لگا لیا اور سمجھ گئی کہ دوپہر کے کھانے کا اہتمام ہو رہا ہے لیکن کھانا تو روز ہی بنتا تھا پھر یہ اتنی تیاریاں کس سلسلے میں ہو رہی تھیں۔ کچن سے آنے والی اشتہا انگیز خوشبو بتا رہی تھی کہ آج ضرور کسی کی دعوت ہے۔ اب میرے لیے ضبط کرنا مشکل ہو گیا تھا۔ اس لیے پوچھ بیٹھی۔

”امی، کوئی مہمان آرہا ہے یا؟“
”ہاں۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولیں۔ ”بہت خاص مہمان آرہے ہیں۔“

”یا اللہ!“ میں سر سے پاؤں تک لرز گئی۔ ابھی تو میں اٹھارہ کی بھی نہیں ہوئی تھی اور امی کو میری شادی کی فکر ستانے لگی۔ میں نے دل ہی دل میں تہیہ کر لیا کہ اگر امی کا ایسا کوئی ارادہ ہے تو صاف انکار کر دوں گی۔ ابھی میں انٹرسٹنس کے دوسرے سال میں تھی اور میرا ارادہ ڈاکٹر بننے کا تھا۔ لہذا پانچ چھ سال تک تو شادی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں نے اپنے غصے پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ ”کیا میں اس خاص مہمان کا حدود اور بعد جان سکتی ہوں۔“

”ہاں! میری ایک بہت پرانی سہیلی ہیں۔ آج برسوں بعد ان سے ملاقات ہو رہی ہے۔“
”لیکن پہلے تو آپ نے کبھی کسی ایسی سہیلی کا ذکر نہیں کیا جو کئی برس سے آپ سے نہ ملی ہو۔“

”تو یہ ہے تم تو ہال کی کھال نکالنے بیٹھ جاتی ہو۔ یہی وہ میرے بچپن کی دوست ہے۔ اسکول اور کالج میں ہم ساتھ ہی تھے پھر ہم دونوں کی تقریباً ایک ہی سال میں آگے

اظہار نہیں کیا تھا۔ یہاں تک کہ امی نے بھی نہیں۔ دوپہر سے شام ہو گئی لیکن ان کی باتیں کسی طرح ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں۔ میں کچھ دیر ان کے پاس بیٹھنے کے بعد اپنے کمرے میں آگئی تاکہ برسوں کی پھڑکی سمیلیوں کو کھل کر باتیں کرنے کا موقع مل جائے۔

شام کی چائے کے بعد فرزانہ آنٹی نے واپس جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو امی نے انہیں روک لیا۔ وہ ابو سے انہیں ملوانا چاہ رہی تھیں جو چھ بجے تک گھر آتے تھے۔ میرے خیال میں امی نے آنٹی کو روک کر اچھا نہیں کیا تھا کیوں کہ ابو انتہائی خنک اور کھردرے انسان تھے۔ انہیں پیسا بنانے کے علاوہ کسی بات سے دلچسپی نہیں تھی۔ وہ دن بھر دفتر میں کاروباری معاملات دیکھتے اور گھر آنے کے بعد بھی کمر بند کر کے فاطمیں دیکھنے بیٹھ جاتے۔ کسی کو ان کے کمرے میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ ہم لوگوں سے ان کی ملاقات صرف صبح کے ناشتے اور رات کے کھانے پر ہوتی۔ اگر ان کا دل چاہتا تو ہم سے ایک آدھ بات کر لیتے ورنہ خاموشی سے اٹھ کر چلے جاتے۔ امی کے ساتھ بھی ان کا رویہ بے گانوں جیسا تھا۔ دونوں میں بہت کم بات چیت ہوتی۔ ہم لوگ کسی رشتے دار کے گھر یا کہیں گھومنے پھرنے نہیں جاتے تھے اور نہ ہی کوئی ہمارے گھر آتا تھا۔ صرف ایک ماموں تھے جو کبھی کبھار امی کی خیریت معلوم کرنے آجاتے البتہ امی کے میکے جانے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ وہ جب چاہتیں ہم دونوں بہن بھائیوں کو لے کر تانا تانی سے ملنے چلی جاتیں۔ باقی رشتہ داروں سے ہماری ملاقات صرف شادی بیاہ کے موقع پر ہی ہوتی تھی۔ ابو محض دکھاوا کرنے کے لیے ان تقاریب میں چلے جاتے لیکن ان کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ جیسے ہی کھانا ختم ہوا اور وہ ہم لوگوں کو لے کر گھر واپس آجائیں۔

گھر میں روپے پیسے کی کوئی تکلیف نہیں تھی۔ ابو نے ہم لوگوں کے لیے تمام آسائشیں مہیا کر رکھی تھیں۔ وہ ہر مہینے گھر کے خرچ کے لیے ایک معقول رقم امی کے ہاتھ پر رکھ دیتے۔ ہمیں باقاعدگی سے جیب خرچ ملتا اور ہماری ہر فرمائش پوری کی جاتی۔ میں اکثر ابو کے رویے کے بارے میں غور کرتی لیکن میری سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ ایک دو مرتبہ امی سے پوچھا تو انہوں نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ شروع سے ہی ان کا مزاج ایسا ہے۔ انہیں نوجوانی میں ہی پیسا کمانے کی دھن سوار ہو گئی تھی اور وہ ابھی تک اس پتھر سے نہیں نکلے اسی وجہ سے سب لوگوں سے کٹ کر رہ گئے تھے۔

میں سوچ رہی تھی کہ فرزانہ آنٹی کو ابو سے مل کر خاصی مایوسی ہوگی۔ اس سے تو بہتر تھا کہ امی انہیں جانے دیتیں۔ کم از کم ہمارا بھرم تو رہ جاتا لیکن میرا اندازہ غلط نکلا۔ شام کو ابو گھر میں داخل ہوئے تو لاؤنج میں ایک اجنبی چہرے کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ انہوں نے سوالیہ انداز میں امی کی طرف دیکھا تو وہ بولیں۔ ”احمد یہ میری بہت پرانی کنبلی فرزانہ ہے۔ ہم کئی سالوں بعد ملے ہیں۔ یہ انگلینڈ چلی گئی تھی۔ اس لیے رابطہ نہ ہو سکا۔ یہ تو شام کو ہی واپس جا رہی تھی لیکن میں نے روک لیا کہ اتنی جلدی کیا ہے۔ کم از کم میرے شوہر سے تو ملتی جاؤ۔“

”بہت اچھا کیا۔“ ابو صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ ”اس وقت اگر گرم گرم چائے مل جائے تو اس ملاقات کا لطف دو بالا ہو جائے گا۔“

میں نے ہوش سنبھالنے کے بعد پہلی بار یہ منظر دیکھا تھا کہ ابو اپنے کمرے میں جانے کی بجائے لاؤنج میں رک گئے اور گھر آئے ہوئے مہمان کو کہنی دینے پر تیار ہو گئے۔ یہ شاید فرزانہ آنٹی کی کراثاتی شخصیت کا سحر تھا جس نے ابو کو اپنے کمرے میں جانے سے روک دیا۔ اس موقع پر بھی امی اپنی روایتی کاہلی کا مظاہرہ کرنے سے باز نہ آئیں اور انہوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے بو کو چائے لانے کے لیے کہہ دیا۔ کچھ دیر بیٹھنے کے بعد فرزانہ آنٹی چلی گئیں۔ امی انہیں ایک دو روز کے لیے اپنے پاس روکنا چاہ رہی تھیں کیوں کہ بقول ان کے ابھی دل نہیں بھرا تھا لیکن فرزانہ آنٹی دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد امی نے فرزانہ آنٹی کے بارے میں جو کچھ بتایا اسے سننے کے بعد مجھے ان سے ہمدردی محسوس ہونے لگی۔ فرزانہ آنٹی نے محبت کی شادی کی تھی اور وہ اپنے انتخاب پر بے حد خوش تھیں لیکن شادی کو ایک سال بھی نہ ہوا تھا کہ ان کی خوشیوں بھری زندگی کو کسی کی نظر لگ گئی۔ ان کا شوہر دفتر میں کام کرنے والی کسی طرح دارحسینہ کی زلفوں کا اسیر ہو گیا اور اس نے فرزانہ آنٹی سے بے رخی برتاؤ شروع کر دی۔ جب انہیں حقیقت کا علم ہوا تو وہ غصے سے آگ بگولا ہو گئیں کیوں کہ انہوں نے والدین اور خاندان والوں کی مخالفت مول لے کر یہ شادی کی تھی۔ اس لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنے شوہر کو گل کھیلنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتیں۔ انہوں نے اپنے شوہر کے سامنے دو شرطیں رکھیں کہ وہ اس لڑکی کو چھوڑ دے یا انہیں طلاق دے دے۔ اس شخص کی نظر اپنی محبوبہ کے باپ کی دولت پر تھی کیوں کہ وہ اکلوتی اولاد تھی اور باپ کے

کہہ دیا کہ اگر اسے روکنے کی کوشش کی گئی تو وہ قانون کی مدد حاصل کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔ وہ ایک پڑھی لکھی، عاقل بالغ اور خود مختار عورت ہے اور کوئی بھی اسے اس کی مرضی کے خلاف زندگی گزارنے پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اس نے اپنے والدین کو یقین دلایا کہ وہ تعلیم مکمل کر کے وطن واپس آجائے گی۔ تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے وہ پارٹ ٹائم ملازمت کرے گی اور کسی پاکستانی فیملی کے ساتھ رہائش اختیار کر لے گی تاکہ اخراجات کم سے کم ہوں اور اسے اکیلے پن کا احساس بھی نہ ہو۔

گھر والوں نے اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور وہ لندن چلی گئی۔ اس نے صرف اپنی بھانجی کی سازشوں سے بچنے کے لیے یہ قدم اٹھایا تھا لیکن انگلینڈ پہنچ کر اسے احساس ہوا کہ اس سے کتنی بڑی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ ایک اجنبی ملک میں کسی سہارے کے بغیر رہائش اختیار کرنا آسان نہ تھا۔ وہ اپنے ساتھ جو پیسے لے کر گئی تھی وہ چند ہی روز میں ختم ہو گئے۔ تعلیم حاصل کرنے کا سہارا دھوڑا رہ گیا اور اسے گزراوقات کے لیے ایک اسٹور میں ملازمت کرنا پڑی۔

چند روز وہ ایک ہاسٹل میں رہی پھر اسٹور میں کام کرنے والی ایک انڈین لڑکی کے ساتھ کمراشیئر کر لیا تھوڑے سے حالات بہتر ہوئے تو اسے اپنے مستقبل کی فکر لاحق ہوئی۔ اس کے سامنے ابھی پوری زندگی تھی اور تنہائی کا عذاب سہنا اس کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس کی روم میٹ نے بھی یہی مشورہ دیا کہ وہ شادی کر لے لیکن یہ اتنا آسان نہ تھا۔ کئی پاکستانیوں سے اس کی دوستی ہوئی لیکن کسی نے بھی اسے شادی کے لیے پر بلوز نہ کیا سب وقتی عیاشی کے خواہاں تھے۔ وہ بھی اس حقیقت سے واقف تھی کہ دیار غیر میں رہنے والی ایک بے سہارا اور تنہا لڑکی سے کون شادی کرے گا۔

اس طرح دو سال گزر گئے۔ اس دوران میں اس کی شادی ہوئی اور نہ ہی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا خواب پورا ہو سکا۔ اس نے ایک دو یونیورسٹیوں میں داخلہ لینے کی کوشش کی لیکن وہاں کے اخراجات اتنے زیادہ تھے کہ وہ اسے انورڈ نہیں کر سکتی تھی۔ اسٹور سے اسے جو تنخواہ ملتی تھی۔ اس سے بمشکل کمرے کا کرایہ اور کھانے پینے کے اخراجات ہی پورے ہوتے تھے۔ اس کا ویزا بھی ختم ہو رہا تھا۔ ملٹی پل ویزا لینے کے لیے اسے ایک مرتبہ پاکستان واپس آنا پڑتا۔ البتہ اگر وہ کسی یونیورسٹی میں داخلہ لے لیتی تو اسٹوڈنٹ ویزا مل سکتا تھا لیکن یہ اس کے بس میں نہیں تھا چنانچہ ہر طرف سے

مرنے کے بعد سب کچھ اسی کا تھا۔ ویسے بھی وہ لڑکی باتوں باتوں میں ان کے شوہر کو جتا چکی تھی کہ اس کے والدین جہیز میں روایتی ساز و سامان کے علاوہ ایک لگژری فلیٹ، زیرو میٹر کار اور دس لاکھ روپے نقد دیں گے چنانچہ شوہر نامہ دار نے آئی کی دوسری شرط بخوشی مان لی اور وہ ماتھے پر طلاق کا لیبل سجائے میکے واپس آ گئیں۔

اپنے گھر واپس آنے کے بعد بھی ان کی مشکلات میں کوئی کمی نہیں آئی اور بھانجی نے اٹھتے بیٹھتے انہیں طعنے دینا شروع کر دیے: بے نسب کہ فرزندہ آئی بار بار یہ بات دہرا چکی تھیں کہ وہ کسی بے بوجھ نہیں بنا چاہتیں اور عدت ختم ہونے کے بعد کوئی ملازمت کر لیں گی۔ انہوں نے اسٹرز کر رکھا تھا اور کسی بھی کالج میں انہیں لیکچرار کی جاب با آسانی مل سکتی تھی لیکن بھانجی انہیں ایک منٹ بھی گھر میں رکھنے کی روادار نہیں تھی۔ اس نے ساس، سر اور شوہر کو بھی اپنا ہم خیال بنا لیا کہ اس معاشرے میں تنہا عورت کے لیے زندگی گزارنا بہت مشکل ہے لہذا جتنی جلد ممکن ہو سکے فرزندہ کی دوسری شادی کر دی جائے۔ اس نے عدت ختم ہونے کا بھی انتظار نہیں کیا اور فرزندہ کی رضا مندی کے بغیر ہی رشتے کرانے والی عورت کو اس کام پر لگا دیا۔

فرزندہ اس ناکام شادی کے تلخ تجربے کے بعد اندر سے بری طرح ٹوٹ پھوٹ گئی تھی اور فی الحال ذہنی طور پر شادی کے لیے تیار نہیں تھی لیکن گھر میں کسی نے اس کی مرضی جاننے کی کوشش نہیں کی اور سب اپنے اپنے طور پر اس کے لیے رشتہ تلاش کرنے میں لگ گئے۔ اس دوران اس کے لیے کئی رشتے آئے لیکن ان میں کوئی بھی اس کے معیار اور مزاج کے مطابق نہیں تھا۔ کیوں کہ اس پر طلاق یافتہ کا لیبل لگ چکا تھا اس لیے کوئی بھی کنوارا اور معقول شخص اس سے شادی کرنے پر تیار نہ ہوتا۔ البتہ رنڈوے، ادھیز عمر، دو تین بچوں کے باپ اور کسی نہ کسی جسمانی معذوری کے شکار لوگ اس کے امیدواروں میں ضرور شامل ہو گئے تھے۔ وہ اس صورت حال سے سخت بریشان تھی اور اسے اندیشہ تھا کہ گھر والے کہیں جلد بازی میں آکر اس کی شادی کسی نامعقول شخص سے نہ کر دیں۔

اس نے ویسے ویسے عدت کے دن پورے کیے اور انگلینڈ جانے کی تیاری شروع کر دی۔ گھر والوں نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی اسے طرح طرح کی دھمکیاں دی گئیں۔ طرح طرح کی خوشامد اور لالچ کا سہارا لیا گیا لیکن وہ اپنے ارادے سے باز نہ آئی اور اس نے صاف صاف

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو م ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

مابوس ہو کر اس نے پاکستان واپس آنے کا ارادہ کر لیا۔

اس بار اس نے کراچی آنے کی بجائے لاہور میں قیام کو ترجیح دی۔ جہاں رشتے کی ایک خالہ رہتی تھیں۔ ان کا صرف ایک ہی بیٹا تھا جو عمر میں فرزانہ سے دو سال چھوٹا تھا۔ خالہ نے کچھ دن تو اسے برداشت کیا پھر آئے دن اسے کراچی جانے کا مشورہ دینے لگیں۔ اس دوران میں فرزانہ کو ایک کالج میں پیکچرار کی جاب مل چکی تھی اور وہ خالہ کو ہر مہینے ایک معقول رقم کھانے اور کرائے کی مدد میں دینے لگی۔ اس کے بعد خالہ نے کبھی اسے کراچی جانے کے لیے نہیں کہا۔ البتہ ان کا بیٹا ارشد اس کے وہاں رہنے سے خوش نہیں تھا لیکن خالہ کے سمجھانے بھجانے پر خاموش ہو گیا۔

خالہ کی کوششوں سے اس کی دوسری شادی ہو گئی۔ اس کا شوہر اعجاز خاصا دولت مند لیکن انتہائی ظالم اور سنگ دل انسان تھا۔ شروع شروع میں تو اس نے فرزانہ کی بہت ناز برداری کی لیکن بہت جلد اس کا اصل روپ سامنے آ گیا۔ سب سے پہلے تو اس نے فرزانہ کو حکم دیا کہ وہ ملازمت چھوڑ دے اور مکمل طور پر گھرداری سنبھال لے لیکن وہ اس پر تیار نہ ہوئی کیوں کہ چند ہی روز میں اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ گاڑی چلنے والی نہیں۔ یہ ملازمت اس کے لیے بہت بڑا سہارا تھی اور وہ اس سے محروم نہیں ہونا چاہتی تھی۔ اسی بات کو لے کر ان کے درمیان جھگڑے شروع ہو گئے اور نوبت مار پیٹ تک پہنچ گئی۔ اس کے بعد یہ روز کا معمول بن گیا۔ اعجاز انتہائی بد زبان، بد تمیز اور ظالم شخص تھا۔ بات بات پر اسے روئی کی طرح دھنک دیتا۔ گالیاں اس کی زبان پر دھری رہتیں اور وہ اس کے پورے خاندان کو بڑے بڑے القاب سے نوازتا۔ ایک دن یہ انکشاف ہوا کہ اعجاز پہلے سے شادی شدہ اور دو بچوں کا باپ ہے اس کے بیوی بچے ملتان میں رہا کرتے تھے اور وہ ہر ہفتے کام کا بہانا بنا کر ملتان جایا کرتا تھا۔ فرزانہ اس کے لیے محض ایک رکھیل تھی اور پھر ایک دن یہ بات اس کی زبان پر آئی گئی اور اس نے کھل کر کہہ دیا کہ وہ اسے ایک داشتہ سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتا۔ اس نے ذرا حیرت سے اس لیے کیا ہے تاکہ زنا کی تہمت سے بچ سکے۔

فرزانہ سے یہ گالی برداشت نہ ہو سکی اور اس نے اعجاز سے طلاق کا مطالبہ کر دیا۔ پہلے تو وہ اس پر تیار نہ ہوا لیکن خالہ اور ارشد کے دباؤ ڈالنے پر اسے طلاق دینا پڑی۔ فرزانہ نے بھی اسے دھمکی دی تھی کہ اگر اس نے سیدھی طرح

طلاق نہ دی تو وہ عدالت سے خلع کے لیے رجوع کرے گی۔ اعجاز کورٹ پکچری کے چکر سے بہت ڈرتا تھا۔ اس لیے اس نے فرزانہ کو آزاد کر دیا۔

جب اس کے والدین اور بھائی کو ان حالات کا علم ہوا تو انہوں نے فرزانہ پر زور دیا کہ وہ اپنے گھر واپس آ جائے لیکن اس نے انکار کر دیا۔ وہ لاہور میں خالہ کے گھر بہت خوش تھی اور دوبارہ اپنی بھانجی کے چنگل میں نہیں پھنسنا چاہتی تھی۔ وہ ایک دو مرتبہ اپنے والدین سے ملنے کراچی آئی لیکن مہمانوں کی طرح چند دن گزار کر واپس چلی گئی۔

چند دن بعد خالہ کو پھر اس کی شادی کی فکر ستانے لگی لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ دو مرتبہ کے تلخ تجربات کے بعد اب وہ کسی مرد کی غلامی کرنے پر تیار نہ تھی چنانچہ اس نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ چند دن سکون سے گزرے لیکن پھر اسے پریشانیوں نے آن گھیرا۔ ارشد کی شادی ہو گئی تو خالہ کا گھر چھوٹا پڑنے لگا۔ ویسے بھی اس گھر میں دو ہی تو کمرے تھے۔ ایک میں ارشد اور اس کی دلہن رہنے لگے۔ دوسرا خالہ اور فرزانہ کے حصے میں آیا۔ اس گھر میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں کسی مہمان کو بٹھایا جاتا۔ ارشد کی بیوی کو بھی فرزانہ کا رہنا ناگوار گزرنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر فرزانہ وہاں سے چلی جائے تو وہ ایک کمرے کو ڈرائنگ روم بنا لے گی۔ خالہ کا کیا ہے۔ وہ تو برآمدے میں بھی بستر ڈال سکتی ہیں۔ یہی پٹی اس نے ارشد کو پڑھائی تو وہ بھی اس کا ہم نوا ہو گیا اور ایک دن اس نے فرزانہ سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ اپنا انتظام کہیں اور کر لے۔

فرزانہ کے سامنے اب دو ہی راستے تھے۔ وہ کراچی آ جائے یا کسی ہوٹل میں رہائش اختیار کرے۔ اس نے دوسرے راستے کا انتخاب کیا اور عورتوں کے ہوٹل میں چلی گئی۔ بھائی کو معلوم ہوا تو اس نے بہت واویلا مچایا اور اسے لینے لاہور پہنچ گیا لیکن فرزانہ نے ایک بار پھر کراچی آنے سے انکار کر دیا۔ اس دوران میں اس کے والدین کا انتقال ہو گیا۔ وہ ان کے مرنے پر آئی لیکن چند دن رہ کر واپس چلی گئی۔ اسے تنہا رہنے کی عادت ہو گئی تھی۔ اب اس کی تنخواہ بھی بڑھ گئی تھی اور بینک میں خاصے پیسے جمع ہو گئے تھے۔ وہ بے فکری کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ اسی طرح دس سال گزر گئے۔ پھر اچانک ہی اس کی ملازمت ختم ہو گئی۔ جس پر ایسویٹ کالج میں پڑھانی تھی وہ کسی وجہ سے بند ہو گیا۔ مجبوراً فرزانہ کو کراچی واپس آنا پڑا اسے یہاں ملازمت مل

گئی لیکن اس نے بھائی بھانج کے سامنے یہ شرط رکھ دی ہے کہ وہ اس کی ذاتی زندگی میں مداخلت نہیں کریں گے اور نہ ہی اس سے شادی کے لیے کہیں گے۔

☆.....☆

اب فرزانہ آئی ہر دوسرے تیسرے روز ہمارے گھر آنے لگیں۔ ان کی وجہ سے کافی رونق ہو گئی تھی۔ وہ ہمیشہ لدی پھندی آتیں اور اکثر رات کا کھانا کھا کر واپس جاتیں۔ ہم لوگوں سے تو خیر وہ بے تکلف، ہو ہی گئی تھیں لیکن اب بھی ان سے خوب کھل مل کر باتیں کیا کرتے۔ مجھے ابو کے رویہ پر بڑی حیرت تھی۔ وہ تو کسی کو مت ہی نہ لگاتے تھے۔ فرزانہ آئی بہت خوش قسمت تھیں کہ ابو انہیں لفٹ کرانے لگے تھے۔

ایک دن فرزانہ آئی آئیں تو خاصی پریشان نظر آ رہی تھیں۔ امی کے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ بھابی نے پھر انہیں تنگ کرنا شروع کر دیا ہے حالانکہ وہ اپنی تنخواہ کا ایک بڑا حصہ ان کے ہاتھ پر رکھ دیتی ہیں اور ان کے بچوں کے لیے بھی آئس کریم، چاکلیٹ، پھل اور چھوٹے موٹے تحفے لاتی رہتی ہیں لیکن پھر بھی بھابی کو ان کا وجود ناگوار گزرتا ہے اور وہ انہیں اپنے گھر میں رکھنا چاہتیں حالانکہ یہ ان کے باپ کا بنایا ہوا مکان ہے اور اس میں ان کا بھی حصہ ہے۔

امی تو ان کے حالات سن کر بہت افسوس ہوا اور انہوں نے اصرار کر کے آئی کو روک لیا۔ وہ ایک ہفتہ ہمارے یہاں رہیں۔ انہیں بیٹھ کر کھانے کی عادت نہیں تھی۔ وہ علی اسح اٹھ جاتیں اور ابو کے ساتھ مل کر ناشتا تیار کرتیں۔ ان کو دیر تک سونے کی عادت تھی۔ اس لیے بو ابی ہم لوگوں کے لیے ناشتا تیار کرتیں۔ ابو کو دفتر جانے کی جلدی ہوتی تھی۔ اس لیے وہ سلاکس اور چپانے پر ہی گزارا کر لیتے تھے۔ پہلے روز آئی نے ان کے سامنے پراٹھا اور آلیٹ رکھا تو وہ بہت حیران ہوئے۔ شاید شادی کے بعد پہلی بار ناشتے میں انہیں پخت نصیب ہوئی تھی۔

آئی ایک ہفتہ رہ کر واپس چلی گئیں اور ہماری زندگی میں پھر وہی سونا پن لوٹ آیا۔ ابو مزید چڑچڑے ہو گئے اور انہوں نے ایک بار پھر ہم سب سے قطع تعلق کر لیا۔ کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ وہ ناشتا کیے بغیر ہی گھر سے چلے گئے لیکن امی کو اس کی پروا نہیں تھی۔ وہ اپنی ہی دنیا میں مگن تھیں۔ میں نے اس جانب ان کی توجہ دلائی تو وہ تنگ کر بولیں۔

”وہ کوئی بچے نہیں ہیں جو میں انہیں اپنے ہاتھ سے

ناشتا بنا کر کھلاؤں۔ میز پر ڈبل روٹی، مارجرین، جلی اور ابلے ہوئے انڈے موجود ہوتے ہیں۔ بوا چائے بنا کر دے دیتی ہیں۔ اب انہیں اور کیا چاہیے۔“

چند دنوں بعد فرزانہ آئی دوبارہ آگئیں۔ اس مرتبہ وہ اپنے ساتھ ایک چھوٹا سا سوٹ کیس بھی لائی تھیں۔ انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں امی کو بتایا کہ وہ بھائی کا گھر چھوڑ کر آگئی ہیں اور چند دن ہمارے یہاں قیام کریں گی جیسے ہی ان کی رہائش کا کوئی بندوبست ہو گیا تو وہ ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر چلی جائیں گی۔ امی نے انہیں تسلی دی اور کہا کہ یہ بھی ان کا ہی گھر ہے۔ کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ یہاں آرام سے رہ سکتی ہیں لیکن فرزانہ آئی بار بار یہی کہتی رہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتے کے اندر چلی جائیں گی۔

آئی نے امی کے احسان کا بدلہ یوں چکایا کہ مہمان کی بجائے گھر کی فرد بن گئیں۔ وہ علی اسح اٹھ جاتیں اور ہم لوگوں کو ناشتا دینے کے بعد ابو کے لیے انڈے پراٹھے بنا تیں۔ ہماری دین پہلے آ جاتی اور اس کے چندہ میں منٹ بعد ابو دفتر جانے کے لیے نکلتے تھے۔ ایک دن ہماری گاڑی نہیں آئی تو ہم دونوں بہن بھائی گھر واپس آگئے ہمارا خیال تھا کہ ابو کے ساتھ نکل جائیں گے۔ دیکھا تو آئی اور ابو اکٹھے میز پر بیٹھے ناشتا کر رہے تھے۔ آئی وقادار بیوی کی طرح ابو کی تاز برواری کر رہی تھیں۔ امی حسب معمول گہری نیند سوئی ہوئی تھیں اور بو ابن میں کھڑی بڑ بڑا رہی تھیں۔ اس وقت میں چھوٹی تھی۔ اس لیے بہت سی باتیں نہیں سمجھ سکی لیکن اتنا ضرور جان گئی کہ کچھ نہ کچھ گڑ بڑ ضرور ہے۔

ابو نے ہمیں دیکھا تو سنبھل کر بیٹھ گئے اور آئی تیار ہونے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ ابو نے گھڑی پر نظر ڈالی اور بولے۔ ”بیٹا تم لوگوں کو تھوڑا انتظار کرنا پڑے گا۔ تمہاری آئی تیار ہو جائیں تو انہیں بھی کالج چھوڑ دیں گے۔“ ان کی بات سن کر میں حیران رہ گئی۔ یا ابی! یہ کیسا انقلاب آ گیا۔ ابو تو اپنے معمول میں ایک منٹ کی تاخیر برداشت نہیں کرتے تھے اور گھڑی کی سوئی کے مطابق چلتے تھے۔ آئی نے ان پر ایسا کیا جادو کر دیا کہ وہ ان کی خاطر آدھا گھنٹا تاخیر سے جا رہے تھے۔ شام کو بو ابانے بتایا کہ فرزانہ آئی جس دن سے آئی ہیں، روزانہ ہی ابو کے ساتھ کالج جاتی ہیں۔ انہوں نے بڑے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔ ”بیٹا! اپنی امی کو سمجھاؤ۔ میں تو اس گھر کی ملازمہ ہوں۔ اس لیے یہ بات نہیں کہہ سکتی کہ کسی پر اتنا اعتبار کرنا ٹھیک نہیں

ہوتا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بے خبری میں ماری جائیں۔“

میں امی سے کیا کہتیں۔ انہوں نے خود ہی اپنی آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ مانا کہ وہ صبح کے وقت جلدی نہیں اٹھ سکتی تھیں لیکن انہیں تو جانتے میں بھی کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ فرزانہ آنٹی دو بجے کے قریب کالج سے گھر آئیں اور کھانا کھا کر اپنے کمرے میں آرام کیا کرتیں۔ شام کو وہ فریش ہو کر باہر آئیں تو ان کا چہرہ گلاب کے پھول کی طرح کھلا ہوتا تھا۔ شام کی چائے پر وہ کوئی نہ کوئی چیز ضرور تیار کرتیں۔ کبھی پکوڑے، کبھی آلو کے چپس تو کبھی چکن ٹیکنیس۔ اب ابو باقاعدگی سے شام کی چائے ہمارے ساتھ بننے لگے تھے۔ اسی طرح وہ رات کے کھانے کے لیے بھی کوئی نہ کوئی خاص ڈش ضرور تیار کرتیں۔ ابو ان کے پکائے ہوئے کھانوں کی دل کھول کر تعریف کرتے اور امی اس طرح خوش ہوتیں جیسے یہ داد انہیں مل رہی ہو۔

فرزانہ آنٹی کو ہمارے گھر آئے ہوئے ایک ہفتہ بھی نہیں ہوا تھا کہ بوا کو اچانک جھٹی پر جانا پڑ گیا۔ ان کی بہو اُمید سے تھی اور ڈیوری میں ابھی ایک مہینا باقی تھا اور وہ اس وقت تک اس کے پاس ہی رہتیں۔ امی کے تو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ انہوں نے عرصہ دراز سے گھر کے کسی کام کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ سب کچھ بوا کے ذمے تھا۔ جیسا کہ پہلے بتا چکی ہوں کہ امی کو دیر تک سونے کی عادت تھی اور وہ گیارہ بجے سے پہلے بیدار نہیں ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ ان کے گھٹنوں میں بھی تکلیف رہنے لگی تھی۔ اس لیے وہ کھڑے ہو کر کوئی کام نہیں کر سکتی تھیں۔ ناشتا کرنے کے بعد وہ بوا کو دوپہر کے کھانے کے لیے ہدایات دے کر ٹی وی کے آگے بیٹھ جاتیں اور کاپی قلم سنبھال کر کھانا پکانے کی ترکیبیں لکھا کرتیں۔ بعض اوقات مجھے ہنسی بھی آتی کہ جب انہیں کچھ پکانا ہی نہیں تو وہ ترکیبیں کیوں لکھتی ہیں اور جواب میں وہ کہا کرتیں کہ بس دعا کرو۔ جلدی سے اچھی ہو جاؤں پھر تم لوگوں کو مزے مزے کی ڈشیں بنا کر کھلاؤں گی۔ اس موقع پر بھی فرزانہ آنٹی نے اپنی خدمات پیش کر دیں اور کہا کہ جب تک بوا واپس نہیں آجاتیں۔ وہ گھر کا سارا کام دیکھ لیں گی۔ ویسے اوپر کے کام کے لیے ایک ملازمہ موجود تھی اور بوانے اسے اچھی خاصا ٹریننگ دے دی تھی۔ اس لیے آنٹی کو اس سے بھی مدد مل سکتی تھی۔

امی اٹھتے بیٹھتے آنٹی کی تعریفیں کیا کرتی تھیں لیکن میرے کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ بوا کے

جانے کے بعد آنٹی نے خوب پر پرزے نکالے تھے اور اب وہ کھل کر کھیل رہی تھیں۔ پہلے ابو ساڑھے سات بجے ناشتے کی میز پر آتے تھے لیکن اب انہیں سات بجے ہی ناشتے کی طلب ہونے لگی تھی۔ اس طرح وہ دونوں تقریباً ایک گھنٹے تک خوش گپیوں میں مصروف رہتے۔ پھر وہ تیار ہونے جاتیں اور پندرہ بیس منٹ بعد باہر آتیں تو ان کی سچ دھج ہی ترالی ہوتی۔ وہ ٹیکچرار کی بجائے انڈین ایکٹریس نظر آتیں۔ پہلے وہ عموماً شلوار قمیص پہنا کرتی تھیں لیکن اب انہوں نے ساڑھی کا استعمال زیادہ کر دیا تھا۔ پھول دار شیٹون کی ساڑھی میں ان کا بھرا بھرا جسم خوب غضب ڈھاتا تھا۔ وہ کھلے گلے کا مختصر سا بلاؤز پہنا کرتیں۔ اپنے لمبے بالوں کو سمیٹ کر وہ جوڑے کی شکل دیتیں۔ گلے میں سفید موتوں کی مالا اور آنکھوں پر سیاہ گلاسنرچھائے وہ گھر کی مالکن معلوم ہوتی تھیں اور امی اگر ان کے سامنے آجاتیں تو سب انہیں نوکرانی سمجھتے۔

پھر کبھی کبھی یوں ہونے لگا کہ وہ دوپہر کو دیر سے گھر آتیں۔ ان کے ہاتھ میں بڑے بڑے شاپرز ہوتے تھے جن میں وہ ہمارے لیے بازار سے کھانا لے کر آتی تھیں۔ ان کے پاس دیر سے آنے کے کئی بہانے تھے۔ کبھی کالج میں مینٹنگ تو کبھی وہ شاپنگ کے لیے چلی جاتیں۔ اکثر یہ بھی ہوتا کہ وہ رات کے کھانے پر ایک ایکسٹرا ڈش تیار کر لیتیں تاکہ اگلے روز دوپہر میں ہمارے کام آسکے۔

کچھ دنوں سے مجھے آنٹی کے تیور بدلے نظر آرہے تھے۔ وہ امی سے زیادہ بات نہیں کرتی تھیں البتہ ابو کی موجودگی میں خوب چپکا کرتی تھیں۔ انہیں بے شمار اشعار زبانی یاد تھے اور وہ بات بات پر شعر پڑھا کرتی تھیں۔ ابو ان اشعار کو سن کر اس طرح داد دیتے جیسے یہ آنٹی کا اپنا کلام ہو۔ اب مجھے آنٹی کے رویے پر شک ہونے لگا تھا۔ ابو سے ان کی بے تکلفی خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی اور ابو کو بھی اس عمر میں چونچلے سوچنے لگے تھے۔ وہ شادی شدہ اور نو عمر بچوں کے باپ تھے۔ انہیں ایک غیر عورت سے اتنا بے تکلف نہیں ہونا چاہیے تھا۔

چند روز بعد ہی میرا شک یقین میں بدل گیا۔ ہوا یوں کہ اس روز آنٹی اپنے وقت پر گھر آگئی تھیں۔ کوئی تین بجے کے قریب وہ ہاتھ روم میں گئیں۔ ان کا موبائل ڈائمنگ ٹیبل پر رکھا ہوا تھا اور میں سامنے صوفے پر بیٹھی ایک میگزین پڑھ رہی تھی کہ ان کے فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے یہ سوچ کر فون

”یہ موقع آپ نے خود ہی نہیں دیا ہے۔“ میں تنہی سے بولی۔ ”اب بھی وقت ہے کہ آپ خود کو سنبھالیں اور اس عورت کو یہاں سے چلنا کریں۔“

”کیا یہ ممکن ہے؟“ وہ سادگی سے بولیں۔ بالکل اسے یہ احساس دلا دیں کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں اور ہم اپنا کام خود کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے آپ کو اپنے معمولات میں تبدیلی لانا ہوگی۔ صبح جلدی انھیں۔ کچن سنبھالیں۔ اپنے ہاتھ سے سب کو ناشتا بنا کر دیں۔ اس عورت کو مہمانوں کی طرح میز پر بٹھا کر کھلائیں اور اسے گھر کے کاموں سے الگ کر دیں تاکہ وہ اپنے آپ کو ہم پر بوجھ سمجھنے لگے۔ شروع شروع میں آپ کو تکلیف تو ہوگی لیکن بہت جلد آپ اس معمول کی عادی ہو جائیں گی۔ میں بھی آپ کا ہاتھ بناؤں گی۔ کچھ دنوں بعد بوا بھی واپس آجائیں گی۔ کوشش کریں کہ ان کے آنے سے پہلے یہ عورت یہاں سے چلی جائے۔

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔“ وہ خجالت سے بولیں۔ ”میری غفلت نے یہ دن دکھایا ہے۔ میں نے تو اس کی مظلومیت پر ترس کھا کر اسے اپنے گھر میں پناہ دی تھی مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ بدو کا اونٹ ثابت ہوگی۔“

”خیر اب آپ خاموشی اختیار کر لیں اور یہ ظاہر کریں کہ جیسے آپ کو کچھ معلوم ہی نہیں۔ ابو کے قریب ہونے کی کوشش کریں اور آنٹی کو ان سے دور کر دیں۔“

امی کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ اس روز آنٹی کی واپسی رات دس بجے کے قریب ہوئی۔ ابو اس کے پندرہ منٹ بعد گھر میں داخل ہوئے۔ دونوں کے چہروں سے ایک اندرونی جوش جھلک رہا تھا۔ مجھے ابو پر سخت غصہ آیا۔ انہیں اس عمر میں ایک غیر عورت کے ساتھ ڈیٹ پر جاتے ہوئے ذرا بھی شرم نہیں آئی۔ آنٹی بھی اب کسی ہمدردی کی مستحق نہیں رہی تھیں بلکہ وہ مجھے ایک ایسی ڈائن لگیں جو دوسروں کا گھرا جائزے کے درپے ہو۔

میں نے امی کے ساتھ مل کر دوسرے دن سے ہی اپنے منصوبے پر عمل شروع کر دیا۔ امی فجر کی اذان پر ہی اٹھ کھڑی ہوئیں اور نماز کے بعد کچن میں مصروف ہو گئیں۔ سات بجے کے قریب آنٹی اپنے معمول کے مطابق کچن میں تشریف لائیں تو امی ناشتا تیار کر چکی تھیں۔ آنٹی انہیں دیکھ کر حیران رہ گئیں اور بولی۔ ”ارے شہلا! تم کیوں آگئیں۔ میں ہوں ناں۔ میرے ہوتے ہوئے تمہیں فکر کرنے کی کیا

اٹھا لیا کہ شاید آنٹی کے لیے کوئی ضروری پیغام ہو لیکن اسکرین پر ابو کا نمبر دکھ کر حیران رہ گئی۔ اب میرے کچھ بولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں فون بند کرتی۔ ابو کی بھاری آواز سنائی دی۔

”فرزات! پانچ بجے تک اسی ریستوران میں آ جاؤ جہاں ہم لنچ کیا کرتے ہیں۔ میں بھی وہیں آ رہا ہوں۔ آج فلم دیکھنے کا موڑ ہے۔ اس کے بعد کسی اجنبی ہوٹل میں ڈنر کریں گے۔“ اسی اثناء میں آنٹی آگئیں۔ میں نے فون انہیں پکڑا لیا اور تیزی سے اپنے کمرے میں آگئی۔ ابو نے ان سے کیا کہا اور آنٹی نے کیا جواب دیا اس سے مجھے کوئی غرض نہیں تھی۔ میں نے جو سنا وہی بہت تھا۔

کمرے میں آ کر میں خوب روئی۔ ہمارے گھر میں یہ کیسا کھیل کھیلا جا رہا تھا۔ امی کی بے پروائی، بے خبری اور آنٹی پر اندھا اعتبار رنگ لایا اور آنٹی نے وہ کام کر دکھایا جس کی کسی سہیلی سے توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ امی تو یہ سن کر ہی پاگل ہو جائیں گی لیکن انہیں خواب غفلت سے بیدار کرنا بہت ضروری تھا۔ ایسا نہ ہو کہ پانی سر سے اونچا ہو جائے اور آنٹی اپنے عزائم میں کامیاب ہو جائیں۔

پانچ بجے سے کچھ پہلے آنٹی بن ٹھن کر باہر جانے کے لیے نکلیں۔ امی سے یہ بہانا بنایا کہ وہ اپنی کولنگز کے ساتھ فلم دیکھنے جا رہی ہیں اور رات کے کھانے پر ان کا انتظار نہ کیا جائے۔ تھوڑی دیر بعد ابو کا فون بھی آ گیا کہ انہیں ایک کاروباری ڈنر میں جانا ہے۔ اس لیے وہ دیر سے گھر آئیں گے۔

اب مجھ سے ضبط کرنا مشکل ہو گیا اور میں نے امی کو ساری بات بتا دی۔ وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئیں اور ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس مسئلے سے کیسے نمٹا جائے۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ بولیں۔ ”اب ہم یہاں ایک دن بھی نہیں رہیں گے۔ تم دونوں بہن بھائی اپنا سامان باندھو اور تانا کے گھر چلنے کی تیاری کرو۔“

”یہ مناسب نہیں ہوگا۔“ میں نے انہیں سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”اس طرح تو آپ ان دونوں کے لیے میدان کھلا چھوڑ دیں گی۔ کوئی ایسی ترکیب سوچیں کہ سانپ مر جائے اور لاش بھی نہ ٹوٹے۔“

”اب یہ ممکن نہیں۔“ وہ غصے سے بولیں۔ ”میں یہ کیسے برداشت کر سکتی ہوں کہ وہ میری نظروں کے سامنے رنگ رلیاں مناتے رہیں۔“

ضرورت ہے۔“

”کچھ اچھا نہیں لگتا فرزانہ۔“ امی نے بے رخی سے کہا۔
”یہ میرا گھر ہے اور مجھے ہی اپنی ذمے داریاں پوری کرنا
چاہئیں۔ تم تو وچاردن بعد چلی جاؤ گی۔ اس کے بعد بھی سب
کچھ مجھے ہی دیکھنا ہے پھر تمہیں کیوں تکلیف دی جائے۔“
فرزانہ آنٹی کچھ کہنا چاہتی تھیں لیکن امی نے انہیں
موقع نہیں دیا اور بولیں۔ ”یہ بتاؤ کہ تمہاری رہائش کا
بندوبست ہو یا نہیں۔ میری مانو تو بھائی کے گھر واپس چلی
جاؤ۔ آخر کب تک ادھر ادھر ماری ماری پھرتی رہو گی۔“

دوسرے الفاظ میں امی نے انہیں اپنے گھر سے
جانے کا کہہ دیا تھا۔ فرزانہ آنٹی بچی نہ تھیں جو اتنی معمولی سی
بات بھی نہ سمجھ سکتیں۔ امی کے سرد لہجے اور بے رخی کو محسوس
کر کے ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور وہ سمجھ گئی کہ امی کو
کچھ شک ہو گیا ہے لیکن وہ بھی اول درجے کی مکار عورت
تھیں۔ چہرے پر دنیا جہاں کی مظلومیت لاتے ہوئے
بولیں۔ ”تم فریاد نہ کرو شہلا، میں کوشش کر رہی ہوں جیسے ہی
رہائش کا بندوبست ہو گیا میں یہاں سے چلی جاؤں گی۔“
”آپ کہیں نہیں جائیں گی۔“ ابو نے گرج دار آواز
میں کہا۔ وہ نہ جانے کب سے کچن کے دروازے پر کھڑے
ان دونوں کی باتیں سن رہے تھے۔ ”یہ میرا گھر ہے اور کسی کو
یہ حق نہیں کہ وہ آپ سے جانے کے لیے کہے۔“

امی حیران ہوتے ہوئے بولیں۔ ”یہ ہم دونوں کا
معاملہ ہے۔ آپ کیوں بیچ میں بول رہے ہیں۔“
”اب یہ میرا معاملہ بھی بن گیا ہے۔“ ابو کھڑی دیکھتے
ہوئے بولے۔ ”مجھے دفتر جانا ہے۔ تم سے شام کو بات ہوگی۔“
یہ کہہ کر وہ ناشتا کیے بغیر چلے گئے۔ آنٹی نے فاتحانہ
انداز میں امی کو دیکھا اور ایک ادا سے بالوں کو جھٹکتی ہوئی
اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ امی حیران پریشان کھڑی یہ
سب دیکھ رہی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ بل بھر
میں کیا ہو گیا لیکن انہیں یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ کچھ بڑی کئی
روز سے یک رہی تھی اور اب ابو کسی فیصلے پر پہنچ چکے تھے۔
میں امی کو تسلی دلا سے دینے کے سوا کیا کر سکتی تھی۔ اب ہمیں
شام کا انتظار تھا۔

دفتر سے آنے کے بعد ابو نے امی کو کمرے میں بلایا
اور گل لپٹی۔ بے بغیر کہہ دیا کہ وہ فرزانہ آنٹی سے شادی
کر رہے ہیں کیوں کہ امی ایک بیوی کی منیثیت سے اپنے
فرائض ادا کرنے میں ناکام ہو گئی ہیں۔ وہ نوکروں کے ہاتھ

جمعیت

جدید عربی زبان میں یہ اصطلاح جماعت یا
انجمن کے معنوں میں استعمال ہوتی ہے۔ اس
اصطلاح کا استعمال موجودہ دور ہی میں شروع ہوا اور
پہلی بار یہ اصطلاح غالباً ان منظم خانقاہی فرقوں یا
اجتماعات کے لیے جو سترہویں صدی کے آخر اور
اٹھارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں شام اور لبنان
کے مشرقی یونانی کلیساؤں میں منظر عام پر آئے۔ مثلاً
جمعیت المخلص یعنی ایک یونانی کیتھولک فرقہ جس کی
بنیاد 1708ء کے قریب رکھی گئی۔ وسط انیسویں
صدی میں لبنان اور ازاں بعد عربی بولنے والے
دوسرے ممالک میں بھی اس اصطلاح کا استعمال عام
ہو گیا اور علمی، ادبی، فلاحی اور سیاسی مقاصد کے لیے
رضا کارانہ طور پر قائم ہونے والی جماعتوں پر بھی اس
نام کا اطلاق ہونے لگا۔ سب سے پہلی جماعت جماعت
الجمعیۃ السوریہ کے نام سے 1847ء میں قائم ہوئی
اس کی بنیاد ان امریکی پروٹسٹنٹ مبلغین نے جو علمی
انداز رکھتے اور تہذیب و ثقافت کے معیار کو بلند کرنا
چاہتے تھے بیروت میں قائم کی۔ 1857ء میں اس
کی جگہ الجمعیۃ العلمیۃ السوریہ نے لی جو ایک بڑی
جماعت تھی۔ 1968ء میں عثمانی حکومت نے اس کا
وجود سرکاری طور پر تسلیم کر لیا۔ اسی قسم کی ایک تنظیم
1850ء میں الجمعیۃ الشرقیۃ قائم کی گئی۔ پہلی انجمن
اخوانین جو بیروت میں 1881ء میں جمعیت باکوریہ
ہو رہی تھی۔ جمعیۃ الخیریۃ الاسلامیۃ غالباً سب سے پہلی
مسلمان فلاحی انجمن تھی اس کی بنیاد 1878ء میں
اسکندریہ میں رکھی گئی۔ اس کے اغراض و مقاصد میں
لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے قومی مدارس کا قیام تھا لیکن
اعرابی تحریک اور برطانوی قبضے کی وجہ سے اس کا
خاتمہ ہو گیا۔ بعد میں 1892ء میں ایک اور جماعت
الجمعیۃ الخیریۃ الاسلامیۃ کی بنیاد ڈالی گئی۔ مصر کے مشہور
عالم شیخ محمد عبدہ، اس جمعیت کے سرگرم رکن تھے۔ اس
جمعیت کے ماتحت کئی مدارس قائم کیے گئے۔

مرسلہ: ساجد حنیف۔ لاہور

شامل تھے کیوں کہ ہم دونوں بہن بھائی کسی بھی صورت ابو کی شفقت سے محروم نہیں ہونا چاہتے تھے۔ امی پہلے تو کسی طرح تیار نہیں ہو رہی تھیں لیکن سب کے سمجھانے بھجانے پر وہ راضی ہو گئیں اور انہوں نے ابو کو دوسری شادی کی اجازت دے دی لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی رکھ دی کہ وہ اپنی عزیز ترین سہیلی کی شکل بھی دیکھنا نہیں چاہتیں جو ان کی سوکن بننے والی تھی۔ لہذا ان کے لیے علیحدہ رہائش کا بندوبست کیا جائے۔ ابو نے یہ شرط مان لی اور چند ہی دنوں بعد ہم لوگ نکلشن اقبال کے ایک بنگلے میں شفٹ ہو گئے اور ابو نے فرزانہ آنٹی سے شادی کر لی۔

شادی کے بعد بھی ابو اپنی اولاد سے غافل نہیں رہے۔ وہ ہفتے میں ایک دو مرتبہ ہمارے گھر کا چکر ضرور لگاتے۔ امی تو انہیں دیکھتے ہی دوسرے کمرے میں چلی جاتیں۔ ابو کو بھی ان کی کوئی پروا نہیں تھی۔ وہ ہم دونوں بہن بھائی سے بیٹھے باتیں کرتے رہتے، ہماری پڑھائی کے بارے میں پوچھتے اور بغیر کہے ہماری ہر فرمائش پوری کر دیتے تھے لیکن ابھی چند ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ مجھے ابو کے چہرے پر ریشانی کے آثار نظر آنے لگے۔ ان سے پوچھنے کی ہمت نہیں بنتی لیکن اتنا ضرور سمجھ گئی کہ وال میں کچھ کالا ہے۔ امی سے ذکر کیا تو وہ چیخ کر بولیں۔ ”میری بد عارنگ لاکر رہے گی۔ اللہ نے چاہا تو وہ بھی سکون سے نہ رہ سکیں گے۔“ ایک سال سے بھی کم وقت میں اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہو گیا۔ فرزانہ آنٹی نے ابو کو پوری طرح اپنے جال میں جکڑ لیا تھا اور وہ ان کی ہر فرمائش بلا چوں و چراں پورا کیا کرتے تھے۔ ایسے ہی ایک رومان پرور لمحے میں فرزانہ آنٹی نے وہ مکان اپنے نام کرنے کی خواہش ظاہر کر دی جو ابونے بڑے شوق اور چاؤ سے بنوایا تھا۔ ڈیفنس کے علاقے میں ہزار گز پر بنے ہوئے اس مکان کی قیمت کروڑوں میں تھی۔ ابو بخوشی آنٹی کے نام کرنے پر تیار ہو گئے اور دوسرے دن ہی وکیل کو ضروری کارروائی کے لیے گھر بلا لیا۔ ایسا کرتے وقت وہ یہ بالکل بھول گئے کہ اس مکان میں ان کی پہلی بیوی اور بچوں کا بھی حصہ ہے۔

دوسرے دن وکیل صاحب مکان کے کاغذات پر دستخط کروانے کے لیے گھر آئے اور جیسے ہی ان کی نظر آنٹی پر پڑی وہ کچھ پریشان نظر آنے لگے لیکن انہوں نے اپنے آپ پر قابو پالیا اور بریف کیس کھول کر مکان کی منتقلی کے کاغذات نکالے تاکہ اس پر ابو اور آنٹی کے دستخط کروا سکیں۔ پھر انہوں

کا بنا ہوا کھانا کھا کر تنگ آچکے ہیں۔ فرزانہ ان کی ویران زندگی میں بہار کے جھونکے کی مانند آئی ہے اور انہیں پہلی بار اس گھر میں کسی عورت کی موجودگی کا احساس ہوا ہے۔ ان کے لیے امی کا وجود ہونے نہ ہونے کے برابر ہے۔ اس لیے بہتر ہو گا کہ وہ انہیں دوسری شادی کی اجازت دے دیں ورنہ دوسری صورت میں امی کو طلاق بھی ہوسکتی ہے۔

امی بہت روئیں، گڑ گڑائیں۔ ابو کے آگے ہاتھ جوڑے۔ معافیاں مانگیں۔ آئندہ کے لیے ان کی خدمت کرنے کا وعدہ کیا لیکن پانی سر سے اونچا ہو چکا تھا۔ ابو پوری طرح فرزانہ کے جال میں پھنس چکے تھے۔ انہوں نے امی کی کوئی بات نہیں سنی اور صاف صاف کہہ دیا کہ یہ ان کا اہل فیصلہ ہے۔ وہ فرزانہ سے شادی کا وعدہ کر چکے ہیں اور اس سے پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔ امی چاہیں تو اسی گھر میں رہ سکتی ہیں ورنہ وہ ان کے لیے دوسرے مکان کا بندوبست کر دیں گے اور معمول کے مطابق گھر کے اخراجات اور بچوں کی تعلیم کے لیے انہیں ہر ماہ ایک معقول رقم ملتی رہے گی۔

امی شدید غصے اور طیش کے عالم میں ہم لوگوں کو لے کر میکے چلی گئیں۔ نانا، نانی اور ماموں نے جب یہ ماجرا سنا تو وہ بھی پریشان ہو گئے لیکن بڑی عجیب بات تھی کہ نانا نے امی سے ہمدردی کرنے کی بجائے انہیں ہی برا بھلا کہا۔ وہ ہمیشہ ہی امی کے دیر سے سو کے اٹھنے پر ناراض رہا کرتے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ امی کی یہی عادت ان کی بربادی کا سبب بن گئی۔ وہ سوتی رہ گئیں اور اس عورت کو ان کے گھر میں نقب لگانے کا موقع مل گیا۔ لیکن جو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔ تیر مکان سے نکل چکا تھا۔ امی کے میکے والے ابو کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھے اور جانتے تھے کہ وہ پیچھے ہٹنے والے نہیں۔ اگر امی نے انہیں دوسری شادی کی اجازت نہیں دی تو وہ واقعی انہیں طلاق دے دیں گے۔ اس کے بعد کا منظر نامہ بہت خوفناک تھا۔ امی بقیہ زندگی کس طرح گزاریں گی۔ بچے جو ان ہو رہے تھے۔ ان کی تعلیم اور شادی بیاہ کے۔ یہ بھاری رقم کی ضرورت تھی۔ نانا رینا ر ہو چکے تھے اور ان سے کسی مدد کی توقع نہیں تھی۔ ماموں بھی بہت پیسے والے نہیں تھے۔ ان کی اپنی فیملی تھی اور وہ جیسے تیسے سفید پوشی کا کرم رکھے ہوئے تھے۔

ان حالات کے پیش نظر سب نے امی کو یہی مشورہ دیا کہ وہ اپنے بچوں کے بہتر مستقبل کی خاطر ابو کو دوسری شادی کی اجازت دے دیں۔ میں اور اصر بھی اس مشورے میں

کھول رکھا ہے۔ وہاں بھی اس نے شناختی کارڈ کی فوٹو کاپی
 ہی دی تھی اور اس اکاؤنٹ میں اچھی خاصی رقم بھی جمع کروا
 دی تھی تاکہ وہ بوقت ضرورت پیسے نکال سکے۔“
 ”اس اکاؤنٹ میں اندازاً کتنی رقم ہوگی؟“ وکیل
 صاحب نے پوچھا۔

”مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں۔ اندازاً بیس پچیس لاکھ تو
 ہوں گے۔“

”آپ ابھی بینک مینیجر کو فون کر کے معلوم کریں کہ
 اکاؤنٹ میں کتنی رقم ہے۔“

”مینیجر کا جواب سن کر ابو کے ہوش اڑ گئے۔ اس نے
 بتایا کہ مختلف تاریخوں میں تقریباً ساری رقم نکال لی گئی ہے
 اور اب اکاؤنٹ میں صرف ایک لاکھ روپے باقی ہیں۔“ ابو
 نے فوراً آنٹی کا نمبر ملا لیا لیکن انہوں نے فون نہیں اٹھایا۔ وہ
 وکیل صاحب کے ساتھ گھر آئے تو آنٹی گھر میں نہیں تھیں۔
 البتہ ڈائنگ ٹیبل پر گلاس کے نیچے ایک خط ضرور رکھا ہوا تھا۔
 ابو نے وہ خط اٹھایا۔ اس میں لکھا تھا۔

”احمد صاحب! مجھے افسوس ہے کہ میرا منصوبہ
 ادھورا رہ گیا۔ تاہم آپ کے اکاؤنٹ سے نکالی ہوئی رقم
 کافی دنوں تک میرے کام آئے گی۔ اس کے لیے تمہارے
 سے آپ کی مشکور ہوں۔ اس کاغذ پر بھائی کا ایڈریس لکھا
 ہے۔ طلاق نامہ اسی پتے پر بھیج دیں۔ مجھے ڈھونڈنے کی
 کوشش نہ کی جائے۔ ویسے بھی قانونی طور پر میں جوائنٹ
 اکاؤنٹ سے رقم نکالنے کی حق دار تھی۔ اس لیے آپ
 میرے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکتے۔ میری وجہ سے
 عزیز از جان سہیلی کو جو اذیت برداشت کرنا پڑی اس کے
 لیے معذرت خواہ ہوں، میری دعا ہے کہ وہ اپنے گھر میں
 خوش اور آباد رہے۔“

ابو کے پاس اب دکھ اور پشیمانی کے سوا کچھ نہ بچا تھا۔
 وہ شرمندہ شرمندہ سے آئے اور معافی طلبی کر کے ہم سب کو
 اپنے ساتھ لے گئے۔ فرزانہ آنٹی نے انہیں اور امی کو ٹھیک
 ٹھاک سبق سکھایا تھا۔ ابو کے رویے میں حیرت انگیز تبدیلی
 آچکی ہے اور وہ گھر آنے کے بعد سارا وقت ہم لوگوں کے
 ساتھ گزارتے ہیں۔ امی نے بھی دیر تک سونے کی عادت
 ترک کر دی ہے اور صبح سے شام تک گھر داری کے معاملات
 میں الجھی رہتی ہیں۔ انہیں بہت دیر بعد یہ بات سمجھ میں آئی
 ہے کہ جو سوتا ہے وہ کھوتا ہے۔

نے دونوں سے شناختی کارڈ مانگے۔ ابو نے تو فوراً ہی اپنا کارڈ
 ان کے حوالے کر دیا لیکن آنٹی آئیں بائیں شائیں کرنے
 لگیں پھر کچھ سوچتے ہوئے بولیں کہ شاید ان کا شناختی کارڈ
 بھائی کے گھر رکھا ہے وہ ایک دو روز میں لے آئیں گی۔

یہ سن کر وکیل صاحب نے کاغذات دوبارہ بریف
 کیس میں رکھ لیے اور بولے۔ ”شناختی کارڈ کے بغیر یہ
 کارروائی نہیں ہو سکتی۔ جب آپ کا شناختی کارڈ مل جائے تو
 مجھے فون کر دیجئے گا میں دوبارہ حاضر ہو جاؤں گا۔“

آنٹی کے چہرے سے پریشانی جھلک رہی تھی۔
 انہوں نے کچھ چکچکاتے ہوئے کہا۔ ”کیا شناختی کارڈ بہت
 ضروری ہے۔ اس کے بغیر کام نہیں ہو سکتا۔“

وکیل صاحب طنزیہ لہجے میں بولے۔ ”محترمہ آج
 کل تو اس کے بغیر قبر کے لیے بھی جگہ نہیں ملتی۔ یہ تو پھر
 کروڑوں کی چایداد کا معاملہ ہے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔
 اگر شناختی کارڈ مل ہو گیا ہے تو دوسرا بن جائے گا۔ اصولاً تو
 شادی کے بعد آپ کو یہ کام فوراً کر لینا چاہیے تھا۔“

یہ کہہ کر وکیل صاحب چلے گئے لیکن دوسرے ہی دن
 وہ ابو کے دفتر پہنچ گئے اور انہوں نے جو انکشاف کیا وہ کسی
 دھماکے سے کم نہیں تھا۔ انہوں نے ابو کو بتایا کہ فرزانہ آنٹی
 ان کے لاہور میں مقیم کلائنٹ اعجاز احمد کی بیوی ہیں۔ انہوں
 نے اس کے ساتھ بھی یہی حرکت کی تھی اور اسے اپنے حسن
 کے جال میں پھنسا کر اس کی ماڈل ٹاؤن والی کونٹری اپنی نام
 کروالی تھی۔ اس نے ان کے نام سے ایک الگ اکاؤنٹ
 بھی کھول رکھا تھا جس میں لاکھوں روپے جمع تھے۔ پھر اس
 عورت نے لڑ جھگڑ کر اعجاز سے طلاق لے لی۔ چیکے سے کونٹری
 کا سودا کیا اور ہماری دولت سمیٹ کر غائب ہو گئی۔ وہ تو
 اسے دیکھتے ہی پہچان گیا تھا۔ اسی لیے انہوں نے کارروائی
 نالنے کی غرض سے شناختی کارڈ کی شرط رکھ دی۔ شاید اس
 نے ابھی تک نیا شناختی کارڈ نہیں بنوایا اور پرانے شناختی کارڈ
 میں شوہر کے خانے میں اعجاز احمد کا نام ہی لکھا ہوا ہے اسی
 لیے وہ نال منول کر رہی تھی۔

”لیکن اس نے تو نکاح کے وقت شناختی کارڈ کی کاپی
 جمع کروائی تھی۔“ ابو بولے۔

”یہ کمپیوٹر کا دور ہے۔ بڑی آسانی سے شوہر کی جگہ پاپ
 کا نام لکھا جاسکتا ہے۔ فوٹو کاپی میں یہ تبدیلی محسوس نہیں ہوتی۔“
 ”غضب ہو گیا۔“ ابو سر پکڑتے ہوئے بولے۔
 ”میں نے تو اس کے ساتھ بینک میں جوائنٹ اکاؤنٹ بھی

آسیبِ محبت

مکرمی مدیر سرگزشت

سلام مسنون

مرسلہ سچ بیانی میرے ایک عزیز کی ہے۔ کیسی انوکھی ہے اس کا ادراک پڑھ کر ہوگا۔ ذرا الگ انداز کی سچ بیانی ہے۔ اس لیے مزہ خوب دے گی۔ انوکھے پن کا لطف آئے گا۔

صائمہ اقبال
(کراچی)



چاند بچھ گیا تھا۔ ستارے غائب ہونے لگے۔
چار سو ویرانی تھی۔ جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوتی، تو
لگتا کہ کوئی حرکت کر رہا ہے۔ میری آنکھیں بھاری ہونے
لگیں۔ سرگھوم رہا تھا۔ سینے میں کئی سوالات تھے۔

وہ پہاڑی کی چوٹی پر واقع ایک اجڑا ہوا پارک
تھا۔ گھاس بڑھی ہوئی، دیواریں ٹوٹی ہوئیں۔ سامنے ایک
منحوس بنا تھا۔ اس سردرات وہ میرے پہلو میں بیٹھی تھی۔
زلفیں ہوا میں لہرا رہی تھیں۔ اس کا سیاہ لباس پراسرایت بڑھا



فروری 2015ء

231

ماہنامہ سرگزشت

Copied From Web

رہا تھا۔

میں مسکرایا۔ تجربے نے مجھے خاصا ماہر بنا دیا تھا۔
نوجوان کا نام ناصر تھا۔ وہ ایک کال سینٹر ایجنٹ تھا۔
اس نے صاف ستھری قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کے آتے ہی کمر
مردانہ پرفیوم سے مہک اٹھا۔ ہاتھ میں موٹر سائیکل کی چابیاں
اور یہ باتیں عکاسی کرتی تھیں کہ وہ معاشی مسائل کا شکار نہیں۔
یہ محبت کا معاملہ ہے۔

”آنکھیں سب کہہ دیتی ہیں۔“ میں نے ایک ایک لفظ
پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”تم خوش لباس ہو، مگر تمہارے چہرے
پر خوشی نہیں۔ تاخن اور شیو بڑھی ہوئی۔ اس کا فقط یہی مطلب
ہے کہ جسے تم چاہتے ہو، وہ پری دس تم میں دلچسپی نہیں رکھتی۔
کسی اور سے محبت کرتی ہے۔ چائے لوگے؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے ریسپور اٹھالیا۔
”ہیلو۔“ مجھے اپنی سیکریٹری نازیہ کی شیریں آواز سنائی

دی۔

”محترمہ، ایک عاشق ہمارے سامنے ہے۔ ذرا اس کی
تواضع کیجیے۔“

ریسپور رکھ کر میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ”مکالمہ سب سے
اچھی دوا ہے دوست۔ بولو، میں سن رہا ہوں۔“

☆☆☆

ناصر کی کہانی میری توقع سے تھوڑی مختلف ضرور تھی، مگر
مجھے قطعی اندازہ نہیں تھا کہ یہ کیسے مجھے نامعلوم کھائی میں دھکیل
دے گا۔

واقعی وہ ایک لڑکی سے محبت کرتا تھا۔ سدرہ اس کی
دور پرے کی رشتے دار تھی۔ بلا کی حسین۔ شوخ اور چنچل۔
شاعری کی دلدادہ۔ ان کے گھرانے فقط تہواروں ہی پر ملتے۔
دو برس قبل ناصر کی اس سے ایک تقریب میں ملاقات ہوئی۔
سوشل میڈیا نے مزید رابطے کی سہیل پیدا کی۔ جلد ہی ناصر اس
کا گرویدہ ہو گیا۔ سدرہ کا کالج ناصر کے آفس کے قریب ہی
تھا۔ دھیرے دھیرے ملاقاتیں بھی ہونے لگیں۔ رشتے داری
تو تھی ہی۔ وہ اس کے گھر آنے جانے لگا۔ ناصر نے فیصلہ کر لیا
تھا کہ ویلنٹائن ڈے پر وہ اپنی محبت کا اظہار کرے گا، مگر پھر...
کہانی میں ایک ڈرامائی موڑ آیا۔

سدرہ کا رویہ بدلنے لگا۔ شوخی ماند پڑ گئی۔ بھٹی بھٹی سی
رہنے لگی۔ شاعری میں دلچسپی جاتی رہی۔

ایک روز ناصر نے پوچھ ہی لیا۔ پہلے اس نے ٹالنے کی
کوشش کی۔ مگر ناصر اصرار کرتا رہا۔ اور بعد میں اپنے اصرار پر
بہت پچھتایا۔

چانک وہ چونکی۔ ”کیا آپ نے وہ آواز سنی؟“
”نہیں۔“ میری دھڑکن تیز ہو گئی۔

وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور جھاڑیوں کی سمت بڑھنے لگی۔
”وہ... نہیں ہے۔“

یہی وہ پریشان کن لمحہ تھا جب میں... ڈاکٹر وحید خان،
جو خود کو ایک ذہین ماہر نفسیات سمجھتا تھا، ایک معصے میں الجھ گیا۔
ایک پیچیدہ کیس میرے سامنے آن کھڑا ہوا جس نے میری
زندگی بدل ڈالی۔

سدرہ شیخ کا کیس جسے میں کبھی حل نہیں کر سکا۔
یہ محبت کی کہانی ہے۔ جس کا آغاز ایک اجنبی کی آمد
سے ہوا۔ بعض واقعات اور باتیں محل کی کسوٹی پر کھری نہ اتریں مگر انہیں
جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ یہ واقعہ۔

☆☆☆

فلینک میں داخل ہونے والے نوجوان کے چہرے
سے بوکھا ہٹ عیاں تھی۔

’بلد جلی ہوئی۔ آنکھوں کے نیچے حلقے۔ میرا پہلا اندازہ
یہی تھا کہ اس پر ایک آسیب سوار ہے۔“

میں کئی برس سے کراچی کے ایک متمول علاقے میں
پریکٹس کر رہا تھا۔ گزشتہ کچھ عرصے میں بد امنی، معاشی مسائل
اور عدم برداشت کے باعث نفسیاتی عوارض میں خاطر خواہ
اضافہ ہوا ہے۔ مجھ جیسے ماہرین اچھا خاصا کما لیتے ہیں۔

میں نے اجنبی کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ نظریں چرا رہا
تھا۔ کچھ دیر کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ بالآخر میں آگے کو
جھکا۔ ”تو تمہیں کسی سے محبت ہو گئی ہے؟“

نوجوان اچھل پڑا۔ حیرت آنکھوں سے عیاں۔ کھڑکی
سے آنے والی دھوپ چہرے پر پڑ رہی تھی۔

میں نے بات جاری رکھی۔ ”تمہارا تاثر بتا رہا ہے کہ
میری بات درست ہے۔ شاید یہ رقابت کا معاملہ ہے۔ جس
سے تم محبت کرتے ہو، وہ لڑکی کسی اور کے عشق میں مبتلا ہے۔“
کچھ دیر وہ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر آنکھوں میں آنسو
آ گئے۔

”رفیق صاحب کیسے ہیں۔“ میں نے بات کا رخ
موڑا۔ ”انہوں نے مجھے تمہاری آمد سے مطلع کیا تھا۔“

”جی... ٹھیک ہیں۔“ وہ کچھ سنجلا۔ ”انہوں نے کہا تھا
کہ آپ ان کے دوست ہیں اور میری مدد کر سکتے ہیں۔ مگر آپ
نے کیسے اندازہ لگایا کہ میں...“

اپنی ڈگر پر جا رہا تھا کہ ایک سانحہ ہوا۔ شائستہ ایک کار حادثے کا شکار ہوئی۔ اس واقعے کے بعد فیاض اور سدرہ کا رابطہ منقطع ہو گیا۔ کچھ عرصے بعد پتا چلا کہ فیاض اور اس کے اہل خانہ نے وہ مکان چھوڑ دیا ہے۔ فیاض کی جدائی نے اُسے یاسیت میں دھکیل دیا۔ ہر چیز سے جی اچاٹ ہو گیا۔ وہ اداس رہنے لگی اور پھر ایک روز میں اُس کی اداسی کا سبب پوچھ بیٹھا تو اس نے اپنے عم کی کتاب کھول کر سامنے رکھ دی۔

ناصر پھر چپ ہو گیا۔ مجھے اُس کی خاموشی کھلنے لگی تھی۔
”تو پھر... کیا تم نے ایک اچھے دوست کی طرح اس کے محبوب کو تلاش کرنے کا فیصلہ کر لیا؟“ میں بھنپا۔

”میں ایسا کرنا چاہتا تھا، مگر اس کی ضرورت پیش نہیں آئی۔“ وہ مسکرایا۔ اب وہ ایک بدلا ہوا انسان نظر آ رہا تھا۔ اس نے راز دارانہ انداز میں کہا۔ ”کیونکہ سدرہ کو پراسرار خطوط موصول ہونے لگے۔ ایسے خطوط، جن پر کسی کا پتہ درج نہیں ہوتا۔“

☆☆☆

یہ انکشاف کہ جو اجنبی میرے سامنے بیٹھا ہے، وہ میری مدد کا طلب گار نہیں، بلکہ اصل مریض تو وہ لڑکی ہے، جسے وہ ٹوٹ کر چاہتا ہے، مجھے پریشان کرنے کے لیے کافی تھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب میرا اندازہ یکسر غلط ثابت ہوا۔

ناصر نے بات جاری رکھی۔ یہ پراسرار خطوط اسے یاسیت سے باہر نکال لائے۔ وہ زبردنگ کے پرانے لفافوں میں موصول ہوتے، جنہیں سدرہ اسٹڈی میں چھپ کر پڑھتی اور پھر اپنی دراز میں ڈال کر تالا لگادیتی۔ اُس نے اپنی بہن اور والدہ کو بتایا کہ یہ فیاض کے خطوط ہیں جو شہر لوٹ آیا ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

سدرہ کی ہنسی واپس آ گئی۔ سب خوش تھے، مگر جلد اس کے اہل خانہ کو ایک پریشانی نے آن لیا۔ یہ سدرہ کی چھوٹی بہن سارہ تھی، جس نے اتفاق سے ایک روز دراز کھلا دیکھ کر اندر جھانکا اور اس نے اُن زرد لفافوں کو دراز میں پڑا دیکھ لیا۔ ان پر سدرہ کا نام اور پتا تو درج تھا مگر بھیجنے والے کا ایڈریس نہیں لکھا تھا۔ تجسس کے زیر اثر اس نے لفافہ اٹھایا۔ یہ کیا ہوا خط نکالا۔ اسے کھولا۔ اگلے ہی لمبے اس کے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ ورق خالی تھا۔ بالکل سفید۔ اس پر ایک بھی لفظ درج نہیں تھا۔

اس نے دوسرا خط نکالا۔ وہ بھی خالی۔ پھر تیسرا۔ پھر چوتھا۔ ہر ورق خالی تھا۔ کوئی تحریر نہیں تھی۔

”میں کسی سے محبت کرتی ہوں۔“ سدرہ کا یہ جملہ سنتے ہی اس کی دھڑکن رک گئی۔ زندگی کے رنگ ماند پڑنے لگے۔
”کون ہے وہ؟“ ناصر کے اندرون میں کرب کے دھماکے ہو رہے تھے۔

سدرہ دھیرے سے مسکرائی۔ ”اس کا نام فیاض ہے۔“
فیاض اُس کی سبیلی شائستہ کا بڑا بھائی تھا۔ شائستہ کی سالگرہ والے روز وہ اُس سے ملی اور دل دے بیٹھی۔ وہ ایک دراز قد، وجیہہ اور بااخلاق آدمی تھا۔ ایک بڑی میڈیسن کمپنی میں مینیجر۔ سدرہ اب شائستہ کے گھر جانے کے بہانے تلاش کرنے لگی۔ فیاض کو جلد اندازہ ہو گیا کہ نیلی آنکھوں والی یہ لڑکی اُسے چاہنے لگی ہے۔ وہ بھی سدرہ کو پسند کرتا تھا۔ جلد ہی یہ معصوم رشتہ محبت کی خوشبو سے مہکنے لگا۔

ناصر یہاں تک کہہ کر چپ ہو گیا۔
میں نے اسے گھورا۔ ”یہ تو روایتی کہانی ہے۔ ہر لو اسٹوری میں ایسا ہی ہوتا ہے، مگر تمہاری پریشانی کی وجہ کچھ اور ہے۔“

میری چھٹی حس بتا رہی تھی کہ یہ رقابت کا معاملہ نہیں۔ جس طرح ناصر نے فیاض کا تذکرہ کیا تھا، اس میں کہیں نفرت یا غصے کی جھلک نہیں تھی۔

لڑکا آگے کو بٹھکا۔ ”ہاں، پریشانی کی وجہ کچھ اور ہے۔“
میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ وہاں فکر مندی اور کرب کے ساتھ کچھ ایسا تھا، جسے میں پہلی نظر میں نہیں جانچ سکا تھا۔ اُن آنکھوں میں خوف تھا۔

”یہ انکشاف رب ناک تھا کہ جس لڑکی کو میں چاہتا ہوں، وہ کسی اور کے عشق میں جھلا ہے مگر میں نے حالات سے سمجھوتا کر لیا ہے۔ اس وقت تو مجھے اس پُرچھ صورت حال نے پریشان کر رکھا ہے، جو سدرہ کو درپیش ہے۔“

تازہ چائے۔ لیے اندر داخل ہوئی۔ وہ ناصر کو دیکھ کر مسکرائی۔ جو اب ناصر نے سر ہلایا۔ چائے کا گھونٹ بھر کر اس نے کہا۔ ”سدرہ کے گھر والے کبھی اس کی شادی فیاض سے نہیں کریں گے۔“

”اور اس کا سبب؟“ مجھے بے چینی محسوس ہو رہی تھی۔
”فیاض لاپتا ہے۔“ اس نے اچانک کہا۔
میں نے گہرا سانس لیا۔ کہانی میں ایک موڑ آ گیا تھا۔
ناصر نے بات جاری رکھی۔ ”جیسا کہ میں نے بتایا کہ فیاض اس کی سبیلی شائستہ کا بھائی تھا۔ شائستہ اکثر اس کے گھر آیا کرتی۔ اس نے سدرہ کی والدہ کو قائل کر لیا تھا۔ سب کچھ

روز ٹیلی فون کے ارد گرد منڈلاتی رہی کہ جونہی بجے، ریسیور اٹھا لے۔ بہت دیر انتظار کیا مگر کوئی فون نہیں آیا۔ پیاس نے ستایا تو فریج تک گئی۔ لونی تو دیکھا، سدرہ کسی سے ہنس کر بات کر رہی ہے۔ کچھ دیر بعد وہ ریسیور رکھ کر چلی گئی۔

سارہ نے دھڑکتے دل سے فون ریکارڈ چیک کیا۔ نہیں، وہاں کوئی نمبر نہیں تھا۔

وہ ڈر گئی۔ کیا سدرہ پاگل ہو گئی ہے؟ سارہ نے اپنی بہن کے کمرے میں وہ پڑا سرخ خطوط تلاش کرنے کی کوشش کی، مگر وہ غائب ہو چکے تھے۔

اگلے روز جب سدرہ فیاض سے بات کر رہی تھی، تو سارہ پاس آ کر کھڑی ہو گئی۔ ”میری بھی بات کروائیں ناں۔“ سدرہ کی ہنسی غائب ہو گئی۔ ”کیوں بات کرو گی تم؟“ ”کروائیں ناں میری بات۔“ اس نے جھٹ سے ریسیور لے لیا، مگر اس سے پہلے کہ وہ ہیلو کہہ پاتی، سدرہ نے لائن کاٹ دی۔

”بڑی آئی بات کرنے والی۔“ وہ اپنے کمرے کی سمت جا رہی تھی۔

اگلے دن سے ٹیلی فون کا لڑکا سلسلہ بند ہو گیا۔ کچھ روز بعد سدرہ نے ضد کر کے اپنے والد سے موبائل فون منگوا لیا۔ اب وہ بیٹھک میں پڑے ٹیلی فون کی محتاج نہیں تھی۔ وہ اچانک گھر میں کہیں کم ہو جاتی۔ سارہ تلاش کرتی، تو کبھی وہ اسٹور میں دیکھی ہوتی، کبھی تارک گیلری میں کھڑی ہوتی۔ وہ موبائل فون ہمیشہ اپنا پاس رکھتی۔ سارہ کبھی اس کا ریکارڈ چیک نہیں کر سکی۔ اب وہ اکثر تیار ہو کر باہر جانے لگی۔ جب ماں اور بہن نے پوچھا، تو وہ مسکرائی۔ ”آپ کے داماد سے ملنے جاتی ہوں۔ جلد رشتہ لے کر آ رہے ہیں۔“

سارہ کو اندیشے کھائے جا رہے تھے۔ ایک روز اس نے سرسری طور پر سدرہ سے ان ملاقاتوں کا احوال پوچھا۔ پہلے تو سدرہ خوشی خوشی واقعات بیان کرنے لگی، مگر جلد ہی چہرے کا رنگ بدل گیا۔ یوں لگتا تھا، جیسے وہ تفصیلات بھول گئی ہے۔ وہ یہ بتانے سے بھی قاصر تھی کہ ان کی آخری ملاقات کس ریستورنٹ میں ہوئی۔ فیاض نے کس رنگ کی ٹیبلٹ پہن رکھی تھی۔ ان کے درمیان کیا باتیں ہوئیں۔

سدرہ کی والدہ ایک سیدھی سادی عورت تھیں۔ وہ سمجھیں کہ ان کی بیٹی پر کسی نے تعویذ کروا دیا ہے۔ وہ کسی عامل کو بلوانا چاہتی تھیں کہ سارہ درمیان میں آگئی۔

”مجھے لگتا ہے کہ یہ کوئی نفسیاتی مسئلہ ہے۔“ اس نے

اس نے یہ بات اپنی والدہ کو بتائی۔ احتیاط کے پیش نظر وہ دونوں خاموش رہے۔ پھر ایک روز سارہ نے باتوں باتوں میں سدرہ سے ان خطوط کا تذکرہ کرتے ہوئے انہیں پڑھنے کی خواہش ظاہر کی۔

”کسی کے لویئر نہیں پڑھتے۔“ سدرہ مسکرائی۔ ”خیر، میں تمہیں یہ بتا دیتی ہوں کہ وہ انتہائی خوبصورت الفاظ میں محبت کا اظہار کرتا ہے۔ شاعرانہ پیرائے میں۔ یوں لگتا ہے، جیسے کسی ادیب کا خط ہے۔“

”آپ نے کبھی ان خطوں کا جراب نہیں لکھا؟“ سارہ نے لائق سے پوچھا۔

”نواب؟“ وہ یکدم چپ ہو گئی۔ چہرے پر تذبذب تھا۔ جیسے کسی گمشدہ چیز کے بارے میں سوچ رہی ہو۔

”کیا آپ دونوں کی کبھی ٹیلی فون پر بات ہوئی؟“ اب وہ سنجیدہ تھی۔ سدرہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔ پھر اٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

تین دن بعد اس نے اپنی بہن کو ٹیلی فون پر کسی سے بات کرتے ہوئے پایا۔ سدرہ کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ وہ کبھی شرماتی۔ کبھی مسکراتی۔ کبھی ہنس پڑتی۔ جب اس نے ریسیور رکھا تو سارہ سامنے کھڑی تھی۔

”کس کا فون تھا؟“ اس نے اپنے اندیشے چھپاتے ہوئے کہا۔

”تمہارے دو لہا بھائی کا۔“ اس نے قہقہہ لگایا۔

”انہوں نے فون کیا تھا؟“ سارہ نے پوچھا۔

”ہاں۔“ اس نے خوشی سے تالی بیٹائی۔

”تو نہیں گھر نکلتی کبھی۔“ سارہ نے اصرار کیا۔

”بلو آؤں گی۔ اتنی جلدی کیا ہے۔“ سدرہ نے اس کے

گال پر چپت، لگائی۔

دو روز بعد سدرہ پھر ڈرائنگ روم میں کھڑی کسی سے ٹیلی فون پر بات کر رہی تھی۔ پوچھنے پر یہی بتایا کہ فیاض کا فون تھا۔ اس ٹکڑ میں تو اتر آتا گیا۔ خطوط کا سلسلہ یکدم بند ہو گیا تھا۔

شک کا سانپ سارہ میں کندلی مارے بیٹھا تھا۔ فیاض کا روز ہی فون آیا، مگر حیران کن طور پر اس نے کبھی ٹیلی فون کی گھنٹی نہیں سنی تھی۔ ایک روز سدرہ کے ریسیور رکھنے کے بعد اس نے چیکے سے فون کا لڑکا ریکارڈ چیک کیا۔ اس پر ایک بھی ایسی نمبر نہیں تھا۔ آخری کال چند گھنٹے پہلے اس کے چچا کے گھر سے آئی تھی۔ اپنے شک کو یقین میں بدلنے کے لیے وہ اگلے

اپنی ماں سے کہا۔ ”آپ ناصر بھائی کو بلوائیں۔ ہمیں ان کی مدد درکار ہوگی۔“

☆☆☆

”تو انہوں نے تمہاری مدد لینے کا فیصلہ کیا۔“ میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا لیا۔

ناصر اب خاصا مطمئن ہو گیا تھا۔ ”جی ہاں۔ انہوں نے مجھے تمام تفصیلات سے آگاہ کیا۔ مجھے اندیشوں کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ پھر سارہ نے ایک منصوبہ تیار کیا۔ اگلی بار جب سدرہ یہ کہتے ہوئے آئینے کے سامنے کھڑی میک اپ کر رہی تھی کہ وہ فیاض سے ملنے جا رہی ہے، سارہ نے فوراً میرا نمبر ڈائل کیا۔ میں موٹر سائیکل لیے سدرہ کے گھر کے سامنے پہنچ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ اپنی ٹھنی گھر سے نکلی اور اسٹاپ کی سمت چلی گئی۔ کچھ ہی لمحوں بعد سارہ دروازے سے برآمد ہوئی اور سیدھی میری طرف آگئی۔“

آگے کی کہانی کچھ یوں ہے:

انہوں نے سدرہ کا تعاقب کیا۔ وہ رکشے میں سوار ہوئی، جو ایک ریستورنٹ کے سامنے جا کر رکا۔ وہ ریستورنٹ کے اندر چلی گئی۔ سارہ اور ناصر باہر ہی ٹھہرے۔ وہ ہر آنے جانے والے پر نظر رکھ رہے تھے۔ مگر ان میں کوئی ایسا نہیں تھا، جسے سدرہ کے بیان کردہ فیاض کے چوکھٹے میں فٹ کیا جا سکا۔ آخر اکتا کر ناصر اندر داخل ہوا۔ ریستورنٹ میں حیرت اس کی منتظر تھی۔ سدرہ غائب تھی۔ اس نے ایک ویٹر کو اس کا حلیہ بتایا۔

”جی وہ آئیں تو تمہیں، مگر فوراً یہاں سے چلی گئیں۔“

”مگر کہاں کیسے۔ دروازے پر تو...“ ناصر نے جملے

ادھورا چھوڑ دیا۔

”جی بچن میں ایک دروازہ ہے۔ انہوں نے وہی

استعمال کیا۔“ ویٹر نے کہا۔ ”جب ہم نے پوچھا تو کہنے لگیں

کہ اس گلی میں ان کا ایک سہیلی رہتی ہے۔“

”ان کے ساتھ کوئی اور تھا؟“ دل تیزی سے دھڑک رہا

تھا۔

”نہیں۔“ اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ”وہ اکیلی

تھیں۔“

یہاں تک پہنچ کر ناصر خاموش ہو گیا۔

میں نے اپنا جسم ڈھیلا چھوڑ دیا اور سگریٹ سلگائی۔

”دلچسپ۔ یعنی تم ایک ایسی لڑکی سے محبت کرتے ہو، جس کا

محبوب ایک آسیب ہے۔ ایک التباس۔ ایک گمشدہ شخص، جسے

اس نے اپنی یادوں میں زندہ کر رکھا ہے۔“

”اچھا۔“ میں نے قہقہہ لگایا۔ ”مگر اس کا دوسرا زاویہ

بھی ہے۔ ذرا سوچو، ممکن ہے کہ فیاض نے واقعی خطوط لکھے

ہوں، جنہیں احتیاط کے پیش نظر سدرہ نے چھپا دیا ہو اور ان کی

جگہ خالی ورق رکھ دیے ہوں۔ ممکن ہے، فیاض حقیقتاً فون کرتا

ہو اور سارہ کو ٹیلی فون ریکارڈز کے بارے میں غلط فہمی ہوئی۔

اس بات کا بھی امکان ہے کہ جس ریستورنٹ سے وہ اچانک

غائب ہوئی، اس کی پچھلی گلی میں واقعی اس کی سہیلی رہتی ہے۔“

”میں نے اس زاویے سے نہیں سوچا۔“ ناصر تذبذب

کا شکار ہو گیا۔ ”اس کا امکان تو ہے مگر سدرہ کا مجموعی رویہ بدل

گیا ہے۔ وہ پہلے والی سدرہ نہیں رہیں۔ مطالعے میں اس کی

دلچسپی دم توڑ چکی ہے۔ ایک بات اور۔ فیاض پہلے جس کمپنی

میں کام کرتا تھا، میں وہاں گیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ لگ

بھگ دس ماہ پہلے اچانک غائب ہو گیا تھا۔ پھر اس کی کوئی خبر

نہیں ملی۔ اس نے اپنی تنخواہ بھی نہیں لی۔“

”ہوں۔ یہ معاملہ پریشان کن ہے۔“ میں نے

سگریٹ کا کش لیا۔

”میں چاہتا ہوں کہ آپ اس سے ملیں۔“ اس نے

بالآخر کہا۔ ”میں شدید اندیشوں کا شکار ہوں۔“

”ویسے میں اپنے کلینک کے علاوہ کہیں کسی سے نہیں

ملتا، مگر تمہاری کہانی دلچسپ لگی۔ ٹھیک ہے اس سے ملنا چاہوں

گا۔“

آج سوچتا ہوں، میں نے خود اپنے پیروں پر کلباڑی

ماری۔ اگر میں انکار کر دیتا، تو بے سکونی کے عفریت سے محفوظ

رہتا۔

☆☆☆

کھڑکی میں لگے گلوں میں بہار کے پھول کھلے تھے۔

مکان سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ باروچی خانے سے اٹھتی خوشبو خبر

دے رہی تھی کہ چائے کے ساتھ پکوڑے تلے جا رہے ہیں۔

سدرہ میرے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ واقعی حسین تھی۔ گہری

نیلی آنکھوں میں ذہانت کی چمک۔ ناصر پہلو میں بیٹھا تھا۔ میں

یہاں سارہ کا مہمان تھا، جس نے مجھے اپنے کالج ٹیچر کی

حیثیت سے متعارف کروایا تھا۔ طے شدہ منصوبے کے مطابق

سدرہ کی والدہ مجھ سے مل کر چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد ناصر بھی کسی

بہانے اٹھ گیا۔

اب سدرہ سامنے تھی اور مجھے فیصلہ کرنا تھا کہ آیا وہ نفسیاتی مریض ہے یا اس کے اہل خانہ کسی غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔

گفتگو کا آغاز اس کی پسندیدہ کتابوں سے ہوا۔ ان شعراء کا تذکرہ ہوا، جنہیں پڑھ کر اس کے دل میں جل ترنگ بجتے لگتا۔ ان رائٹرز کا ذکر آیا، جن کی کہیں سے بھرپور کہانیاں اسے کسی اور دنیا میں لے جاتی۔ اس کا اعتماد جیتنے کے لیے میں نے اپنے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں۔ کہ جلد بے تکلفی کی فضا قائم ہو۔ اور تب میں نے، چالیس چلتی شروع کیں۔ اسے تعریف کی رسی میں باندھنا شروع کیا۔ اس کے ادنی ذوق کی تعریف کی، تہذیبی طور طریقوں کو سراہا، پھر لباس کا ذکر کیا، میرا نے اپنی ایک کلاس فیلو کا تذکرہ کیا، جس کی نیلی آنکھیں ٹھیک، سدرہ کی آنکھوں کے مانند حسین اور دل کش تھیں۔

پہلے وہ فقط مسکرا رہی تھی۔ مگر اب دھیرے دھیرے شرمانے لگی۔ یہی حملے کا وقت تھا۔

”کیا فیاض بھی تمہاری آنکھوں کی تعریف کرتا ہے؟“

میں نے تیزی سے پوچھا۔
اسے جو نکالنا آگے آگے میں تذبذب تھا۔ میں نے خود کو نارمل رکھا۔ ”سارہ نے مجھے بتایا تھا۔ دراصل میرے ایک دوست کا نام بھی فیاض ہے۔ بہت عرصے سے ملاقات نہیں ہوئی۔ نہ جانے اب کہاں ہو، وہ ایک میڈیسن کمپنی میں ملازم تھا۔“

”اوہ... اچھا۔“ سدرہ نے گردن ہلائی۔ اطمینان لوٹ آیا۔ اب وہ گفتگو کے لیے تیار تھی۔ وہ فیاض کے بارے میں بتانے لگی۔ اس سے ہونے والی پہلی ملاقات۔ اس کے ٹھکرے لے لے بال۔ دراز قدم۔ بھاری آواز۔ خوش لباسی۔ اس کی ہوی بانیک۔ اس دوران میں شائستہ کی موت کا اور پھر فیاض سے جدائی کا بھی تذکرہ آیا، مگر میں نے اس پر زور نہیں دیا۔ مجھے موجودہ حالات میں دلچسپی تھی۔

”مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی کہ فیاض تمہاری زندگی میں لوٹ آیا ہے۔ آج کل مہذب اور سمجھ دار لڑکوں کی ویسے بھی کمی ہے۔ تو اب اس کی رہائش کہاں ہے؟“

”رہائش...“ وہ ایک لمحے کو رکھی۔ ”جی وہ بیرون شہر چلے گئے تھے۔ پہلے تو ناظم آباد میں رہتے تھے۔ اب لوٹے ہیں تو... دراصل میں نے کبھی پوچھا نہیں۔“

”اور تم نے اس کی کمپنی کا نام کیا بتایا تھا؟“ میں نے

چائے کا گھونٹ لیا۔

”کمپنی۔ لائف سیونگ میڈیسن...“

”وہ تو پہلے اس کمپنی میں کام کرتا تھا۔“ میں نے نفی میں

گردن ہلائی۔ ”اب کہاں ہے؟“

”اب۔“ اس نے یادداشت پر زور ڈالا۔ ”وہ...“

”اب تو اس نے کار لے لی ہوگی۔“ میں نے لا تعلق

سے کہا۔ ”یا اب بھی موٹر سائیکل پر آتا ہے؟“

سدرہ خالی خالی نظروں سے مجھے دیکھتی رہی۔

”سنا ہے، وہ تمہیں بہت ہی رومانوی خطوط لکھتا ہے۔“

ضرور شاعری میں دلچسپی ہوگی۔ تو کون ہے اس کا پسندیدہ شاعر؟“

”وہ شاعر۔ جی شاید غالب...“ وہ بڑبڑائی۔ اس کے

پاس کسی سوال کا جواب نہیں تھا۔ فقط پرانی یادیں۔

”سدرہ۔“ بالآخر میں آگے کوچھا۔ ”فیاض فقط تمہاری

ذہنی اختراع ہے۔ تم نے اسے اپنے ذہن میں تراشا ہے۔“

”سن نہیں۔ فیاض ہے۔“ وہ چلائی۔

”وہ صرف ایک جھوٹ ہے۔ تمہارے ذہن...“ میرا

جملہ ادھورا رہ گیا۔ چہرہ جھلس گیا۔ اس نے چائے کی پیالی

میرے چہرے پر الٹ دی تھی۔ ناصر اور سارہ بھاگے بھاگے

آئے۔ سدرہ کھڑی کانپ رہی تھی۔

”تم لوگ سمجھتے ہو کہ میں پاگل ہو گئی ہوں۔“ اس نے

منٹھیاں بھینچ رکھی تھیں۔ ”نہیں۔ تم لوگ پاگل ہو گئے ہو۔ میرا

فیاض...“ وہ ہچکیاں لینے لگی اور دوڑتی ہوئی کمرے سے نکل

گئی۔

ڈرائنگ روم میں خاموشی کا بسیرا تھا۔ وہاں ایک معما

تیر رہا تھا۔ ناصر اور سارہ چپ چاپ صوفے پر بیٹھ گئے۔ ہمیں

اوپری منزل سے اس کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ میرے

ذہن میں طوفانوں نے ڈیرا ڈال لیا۔ یہ جذبات کا ریلہ تھا،

جس میں یہ احساس بھی تھا کہ میں نے نیلی آنکھوں والی اس

لڑکی کو تکلیف پہنچائی۔ میں کھڑا ہو گیا اور زینے کی سمت بڑھنے

لگا۔ سارہ نے ساتھ آنے کی کوشش کی، مگر میں نے ہاتھ کے

اشارہ سے روک دیا۔ سدرہ کے دروازے پر پہنچ کر میں نے

ہلکی سے دستک دی۔ ہچکیوں میں وقفے آنے لگے۔

میں نے دروازے پر دباؤ ڈالا۔ وہ کھلا تھا۔ میں اندر

داخل ہوا۔ میرے سامنے ایک پری وٹس، آنکھوں میں نمی لیے

اپنے بستر پر بیٹھی تھی۔ وہ پہلے سے زیادہ حسین لگ رہی تھی۔

مجھے اس کا اعتماد بحال کرنا تھا اور اس کے لیے میں ایک

میں اس کے کمرے سے باہر آ گیا۔ ڈرائنگ روم میں سارہ منتظر تھی۔ اس نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”معاملہ پیچیدہ ہے۔“ میں نے گہرا سانس لیا۔ ”لیکن ہم کوئی نہ کوئی حل نکال لیں گے۔ ایک بار وہ اس سحر سے نکل آئے تو ناصرا سے سنبھال لے گا۔“

”ناصر؟“ سارہ کا لہجہ سپاٹ تھا۔ ”بے چارہ۔ میرے نزدیک وہ سدرہ آپ کی دیوانگی سے کچھ زیادہ کا حقدار ہے۔“ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک نامعلوم جذبہ تھا۔

”کیا ایک گلاس پانی ملے گا سارہ۔“
”ضرور۔“ وہ پکن کی طرف چلی گئی۔ میں تیزی سے ٹیلی فون سیٹ تک گیا۔ اس کا سی ایل آئی خاموش تھا۔ میں نے سیٹ پلٹا۔ بیٹری نصب کرنے کی جگہ میں دھول بھری تھی۔ لگتا تھا، جیسے اسے برسوں سے استعمال نہیں کیا گیا ہو۔
میری پریشانی دو چند ہو گئی۔

☆☆☆

موسم نے غیر متوقع کروٹ لی۔ کوئٹہ کی سرد ہوائیں یکدم شہر میں داخل ہو گئیں۔ سورج کی روشنی ماند پڑ گئی تھی۔ دن مختصر ہونے لگے اور راتوں کا دورانیہ بڑھ گیا۔

سارہ کا فون آیا تھا۔ اس نے فیاض کی کہنی سے اُس کا ایڈریس حاصل کر لیا۔ حیران کن طور پر یہ ناظم آباد کے اسی علاقہ کا پتا تھا، جہاں سدرہ کے بقول فیاض کچھ برس پہلے رہا کرتا تھا۔ یعنی اس نے کبھی رہائش گاہ تبدیل نہیں کی تھی۔ واضح تھا کہ سدرہ نے اس کے بیرون شہر جانے کی کہانی گھڑی تھی۔ مگر کیوں؟

ہفتے والے روز سدرہ کو میرے کلینک آتا تھا۔ اس سے قبل میری اس سے ٹیلی فون پر بات ہوئی۔ اس نے فیاض کو میرے نیک جذبات سے مطلع کیا تھا۔ جواب میں فیاض نے شکریہ ادا کیا اور جلد ملاقات کی توقع ظاہر کی۔

جب سدرہ کلینک آنے کے لیے گھر سے نکلی، ناصر اور سارہ اس علاقے کی سست روانہ ہو گئے، جہاں فیاض مقیم تھا۔ وہیں اس کہانی کا راز چھپا تھا۔

سدرہ کی آمد سے چند لمحات قبل ایک لطیف خوشبو نے میرے کمرے کو گھیر لیا۔ تازہ اور میں کوشش کے باوجود اس کا سراغ نہیں پاسکے۔ شام جلدی اتر آئی تھی، جس میں ٹھنڈ تیر رہی تھی۔ موسم کی تبدیلیوں نے مجھے بخار میں مبتلا کر دیا۔ سردرد کی بھی شکایت تھی۔

کہانی گھڑنے والا تھا۔ پہلے میں نے معافی مانگی۔ چہرے پر ادا سی سجائے اُسے اپنی اچھوتی بہن کے بارے میں بتایا، جسے ایک بے وفا شخص نے شدید اذیت دی، وہ ذہنی توازن کھو بیٹھی اور اس نے خودکشی کرنا۔ اسی وجہ سے محبت کے سحر میں مبتلا ہر لڑکی کو دیکھ کر میرے دل میں اندیشے پنپنے لگتے ہیں۔

اس نے میری کہانی پر یقین کر لیا۔ آنسو پونچھے۔ ”وحید صاحب۔ فیاض مجھے دھوکا نہیں دے گا۔ اور آپ، میرا یقین رکھیں کہ وہ ایک جیتا جاگتا انسان ہے، کوئی واہمہ نہیں۔“

”مجھے یقین ہے۔“ میں نے گردن ہلائی اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ اگلے کئی منٹوں تک ہم باتیں کرتے رہے۔ میں نے اس کا اعتماد حاصل کر لیا۔ اس نے بتایا کہ گھر والوں کے خوف سے اس نے فیاض کے خطوط ایک سیمپلی کے گھر چھپا دیے ہیں۔

”میں وہ خط آپ کو دکھاؤں گی۔“ وہ بولی۔ ”اور فیاض سے چھپ کر ملنے کی بھلائی ایک وجہ ہے، جس کا میں نے کسی سے تذکرہ نہیں کیا۔“

میں خاموشی سے سنتا رہا۔
”اس کی جان کو خطرہ ہے۔“ اس نے زارداری سے کہا۔ ”اس کا بزنس پائیز اُس کا دشمن بن گیا ہے۔ وہ اسے قتل کرنا چاہتا ہے۔“

”بزنس پارٹنر؟ اچھا۔“ میں نے دلچسپی ظاہر کی۔
”ہاں، فیاض اپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس کرتا ہے۔ چند روز پہلے اس کی گاڑی پر حملہ ہوا تھا۔ اس کی بہن کو بھی اسی شخص نے قتل کروایا تھا۔ اسی وجہ سے انہوں نے اپنی رہائش بدل لی تھی۔“

”ہونہ۔“ میں نے گہرا سانس لیا۔ اب وہ ایک کہانی گھڑنے کی کوشش کر رہی تھی۔ سدرہ تخیل کی دنیا میں تھنس گئی تھی۔ اس کا علاج ضروری تھا۔

”سدرہ، میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اور قسم کھاتا ہوں کہ تمہیں اور فیاض کو مارا کر دم لوں گا۔“ میں کھڑا ہو گیا۔ ”کیا یہ ممکن ہے کہ تم ہفتے والے روز میرے کلینک چلی آؤ۔ میری سیکرٹری تازہ تم سے مل کر خوش ہوگی۔ وہ بھی ہماری مدد کرے گی۔ اور وہ خط بھی وہیں لے آتا۔ سوچ رہا ہوں کہ فیاض سے مل کر کوئی ایسی صورت نکالی جائے، جس سے تمہاری اور اس کی جلد از جلد شادی ہو جائے۔“

”اوہ۔ میں آپ کا کس منہ سے شکریہ ادا کریں۔“ اس کی آنکھوں میں تشکر تھا۔

وہ سیاہ لباس میں ملبوس تھی۔ ہونٹوں پر گہرے رنگ کی لب اسٹیک۔ آنکھوں کی نیلا ہٹ کہیں غائب ہو گئی تھی۔ آواز بھی کچھ بدلا ہوئی تھی۔ اس نے پرس سے ایک زرد رنگ کا بوسیدہ لفافہ نکالا اور میرے سامنے رکھ دیا۔

میری دھڑکن تیز ہو گئی۔ لفافہ کھولا۔ اس میں ایک کاغذ تھا، جس سے دھیمی دھیمی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ سدرہ گہری نظروں سے میرا جائزہ لیتی رہی۔

میں نے تہ کھولی۔ وہ انتہائی عمدہ خط میں لکھی تحریر تھی۔ ایک محبت نامہ۔ جس کی زبان میں چاشنی تھی۔ جسے رومانوی اشعار سے سجایا گیا تھا۔ جس میں وعدے تھے۔ ارادے تھے۔ وہ ایک خط تھا، جسے وصول کرنے کی خواہش ہر لڑکی کے دل میں ہمکنی ہے۔ ایک ایسا خط، جسے وہ ہر رات تکیے کے نیچے چھپا کر رکھ دے اور جب سب سو جائیں، تو بار بار پڑھے۔ ہاں، وہ پڑھنے کے قابل تھا۔

خط کے آخری میں درج تھا: ”تمہارا فیاض۔“ میرے سیم کا درجہ حرارت کچھ بڑھ گیا۔ شاید کوئی کھڑکی کھلی رہ گئی تھی۔ سدرہ خاموش بیٹھی رہی۔ پھر اس نے ایک اور لفافہ میرے سامنے رکھا۔ ایک اور عمدہ تحریر۔ ایک اور پریم سُر میں ڈوبا ورق۔

ٹھنڈ بڑھتی جا رہی تھی۔ میرا سر جھنکنے لگا۔ ”وہ کچھ بری بعد فون کرے گا۔“ سدرہ کی آواز دور سے آتی محسوس ہوئی۔ ”میں چاہتی ہوں کہ آپ اس سے مل لیں۔“

”ہاں ضرور۔“ میں نے ہتھیلیاں رگڑیں، تاکہ کچھ گرمائش حاصل کر سکوں، مگر میری کوشش رائیگاں گئی۔ اسی اثنا میں نازیہ چائے لیے اندر داخل ہوئی۔ میں اسے سدرہ کے ہرے میں بتا چکا تھا۔ وہ سدرہ سے باتیں کرنے لگی۔ کچھ بری بعد دونوں اٹھ کر باہر چلی گئیں۔ ان کی آوازیں مجھ تک پہنچ رہی تھیں اور میری بے چینی بڑھ رہی تھی۔ یہ وہ سدرہ نہیں تھی، جس سے چار روز پہلے میں ملا تھا۔ وہ ایک بدلی ہوئی روح تھی۔

مجھے ناصر کی ٹیلی فون کال کا انتظار تھا۔ موبائل سامنے رکھا تھا اور اس کی خاموشی اذیت ناک تھی۔ ہرگز رتا پل بھاری تھا۔ اچانک کہیں سے شیشہ ٹوٹنے کی آواز آئی۔ میں نے کھڑکی کی سمت دیکھا۔ وہ سلامت تھی۔ اور تب۔ فون پر پوری قوت سے چلایا۔

دوسری طرف۔ ناصر تھا۔ ”ڈاکٹر صاحب، ایک عجیب خبر

ہے۔“

”بولو میں سن رہا ہوں۔“ میں نے آواز دھیمی رکھی۔ ”ایڈریس صحیح تھا۔ یہ فیاض ہی کا گھر ہے۔ مگر یہاں صرف ایک بوڑھی عورت رہتی ہے۔ جب ہم نے کہا کہ ہم فیاض سے ملنے آئے ہیں، تو اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور وہ صدمے سے زمین پر۔“ ناصر کی آواز کٹ رہی تھی۔ شاید نیٹ ورک کا مسئلہ تھا۔

”میں اور سارہ اسے مکان کے اندر لے گئے۔ گھر کی حالت بہت خستہ تھی۔ لگتا ہے کئی ماہ سے صفائی... کچھ دیر بعد عورت کی حالت سنبھلی تو... نے بتایا کہ فیاض... ہے۔ اس نے...“

”کیا؟ فیاض کیا؟ میں سن نہیں سکا۔“ ناصر نے شاید میری بات نہیں سنی۔ وہ کہتا رہا۔ ”اس نے اپنی بیٹی شائستہ کا بھی بتایا، جو کچھ عرصے پہلے ایک کار حادثے میں... وہ مجھے اور سارہ کو فیاض کے کمرے تک لے گئی... وہ دھول سے اٹا تھا... اور وہاں... دیوار پر ایک تصویر لگی... ایک لڑکی کی تصویر... فیاض کی ماں نے بتایا کہ وہ اس کی منگیتر...“

”منگیتر؟“ میرا سر جھنکنے لگا۔ ”فیاض کی منگیتر؟“ ”ہاں سر۔ عجیب بات۔ وہ تصویر میرے لیے اجنبی تھی...“

”اسے چھوڑو۔ فیاض سے ملاقات ہوئی؟“ ”فیاض؟“ ناصر کی آواز میں بلا کی حیرت تھی۔ مجھے باہر سے سدرہ کا تہقہ سنائی دیا۔ وحشی تہقہ۔ ”سر فیاض تو... آپ نے شاید سنا نہیں۔ میں نے بتایا نا، اس کا انتقال ہو چکا... وہ اس نے خودکشی کر لی تھی... دس ماہ پہلے ایک برتج سے کود...“

میں ٹھٹھرنے لگا۔ ٹھنڈ میری رگوں میں اترنے لگی تھی۔ ”ایک بات اور... عورت نے بتایا کہ چند ماہ پہلے ایک لڑکی یہاں آئی... وہ کچھ چیزیں لے... جو طیبہ بتایا وہ سدا...“ ایک سیاہ بیولا کمرے میں داخل ہوا۔ ایک جھونکا مجھ سے ٹکرایا۔ وہ سدرہ تھی۔ اس کی آنکھیں مجھ پر تکی تھیں۔ ان کی نیلا ہٹ غائب تھی۔ اس کے لب داہوئے اور ایک اجنبی آواز میرے کانوں میں اتری۔

”فیاض سے بات ہوئی ہے۔ ہم آدھے گھنٹے بعد لائٹ پارک میں ملیں گے۔“ ”لائٹ پارک؟“ میں نے دھیرے سے کہا۔

”ہاں، جو گرین برتج کے عین سامنے ہے۔“ وہ آگے کے جھکی۔ ”آپ چلیں گے ناں؟“

☆☆☆

جاندار غائب ہو گیا اور ستارے چھپ گئے۔ پارک میں ایرانی کا سیرا تھا۔ جھاڑیوں میں سرسراہٹ ہوتی تو لگتا کہ کوئی دروچ ہے۔ ٹھنڈ بڑھ چکی تھی۔ ہم جس بیچ پر بیٹھے تھے، وہ برف کی سیل معلوم ہو رہی تھی۔ میری آنکھیں بند ہو رہی تھیں اور سر میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ میں اپنے کیریر کے سب سے عجیب موڑ پر کھڑا تھا۔ کئی سوالات تھے، جن کا جواب میرے پاس نہیں تھا۔

وہ پہاڑی چوٹی پر واقع ٹوٹی ہوئی دیواروں والا ایک خاموش پارک تھا۔ جب سے سامنے برتج تعمیر ہوا تھا، اس کی رونق ماند پڑ گئی تھی۔ اس رات بھی سناٹا تھا۔ برتج پر ٹریفک کم تھا۔ ایک گاڑی کا گاڑیاں بنی دکھائی دیتیں۔

سدرہ بالکل خاموش تھی۔ تاریکی میں اس کا سیاہ لباس پر اسرایت بڑھار ہانپا۔ اس کے سینے میں کئی راز چھپے تھے۔ اچانک وہ چونکی۔ نظریں چاروں طرف گھما میں۔ ”کیا آپ نے اس کی آواز سنی؟“

”آواز؟ اوہ نہیں۔“ اس نے جھاڑیوں کی سمت دیکھا۔ وہاں سرسراہٹ ہوئی۔ دور کہیں موٹر سائیکل کا انجن گڑگڑایا۔ وہ میری طرف پلٹی۔ ”وہ آ گیا ہے۔“ اگلے ہی پل وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور جھاڑیوں کی سمت بڑھنے لگی۔

میں تو ہم پرست نہیں تھا، مگر میں نے اس کے پیروں کی طرف دیکھنے سے اجتناب برتا۔

”رکوسدرہ۔ اہاں کوئی نہیں۔“ اس نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ ”کیا آپ نے اس کی آواز نہیں سنی؟ وہ مجھے پکار رہا ہے۔“ وہ ٹوٹی ہوئی دیوار کی سمت بڑھی، جس کے آگے کھائی تھی۔

”سدرہ ٹھہرو۔“ میں چلایا۔ اس کے پیچھے دوڑا۔ اچانک میرا پاؤں ایک پتھر سے ٹکرایا۔ میں منہ کے بل زمین پر گرا۔ سر پر شدید چوٹ آئی۔ درد کی شدت سے منظر دھندلانے لگا۔ ہر نئے گھوم رہی تھی۔ میں نے قورت یکجا کی۔ ہاتھوں کے بل اٹھا، مگر کوئی پراسرار قوت مجھ پر سوار ہو گئی تھی۔ جسم نے انکار کر دیا۔

تاریکی گہری ہونے لگی۔ بیخ بستہ ہواؤں نے حواس معطل کر دیے۔ میں نے جھاڑیوں میں دو سائے حرکت کرتے دیکھے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو تھام رکھا تھا۔ عین اس لمحے پل سے ایک گاڑی گزری۔ ہیڈ لائٹس کی روشنی جھاڑیوں پر پڑی۔

ایک دراز قد شخص نے سدرہ کو تھام رکھا تھا۔ آدمی کے ہتھکریا لے ہال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ اگلے ہی پل وہ سائے غائب ہو گئے۔

میں غنودگی کی دنیا میں اتر چکا تھا۔

☆☆☆

”سدرہ۔“ میں چلایا۔ سر میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ سامنے تیز دودھیا روشنی تھی۔ سفید لباس میں ملبوس ایک شخص مجھ پر جھکا ہوا تھا۔ ”لینے رہو وحید۔“ اس نے میرے سینے پر ہاتھ رکھا۔ میرے حواس لوٹنے لگے۔ وہ میرا دوست ڈاکٹر اعظم تھا۔ اس کے پیچھے ناصر کھڑا تھا۔ تیز تیز قدموں کی آواز سنائی دی۔ کچھ کرخت چہرہ لوگ کمرے میں داخل ہوئے۔

میں نے پھراٹھنے کی کوشش کی۔ ”سدرہ کہاں ہے؟“ اعظم نے میرے سینے پر ہاتھ رکھ کر مجھے لینا دیا۔ ”وہ... مر چکی ہے وحید۔ لینے رہو۔“

”کیا؟ نہیں۔ وہ تو...“ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”اس نے خودکشی کر لی...“ ایک سسکی سنائی دی۔ یہ ناصر کے الفاظ تھے۔

”یہ ناممکن ہے۔ وہ فیاض کے ساتھ...“

”فیاض؟“ ناصر کے چہرے پر الجھن تھی۔ ”میں نے آپ کو بتایا تھا کہ وہ مر چکا ہے۔ وہیں گرین برتج...“

ایک لمبا چوڑا شخص ناصر کو دھکیلتا ہوا آگے بڑھا۔ ”ڈاکٹر وحید۔ میں انسپکٹر طاہرا عوان۔ مجھے سدرہ کی خودکشی سے متعلق آپ کا بیان لینا ہے۔ آخری لمحات میں وہ آپ کے ساتھ تھی۔ آپ بتا سکتے ہیں کہ اس نے کیوں خودکشی کی؟“

”خودکشی؟ نہیں وہ...“ میں رُک گیا۔ ”وہ کسی کے ساتھ تھی انسپکٹر... کوئی اس سے ملنے آیا تھا۔“

انسپکٹر نے مجھے گھورا۔ ”ہم نے چوکیدار کا بیان لیا ہے۔ وہ چیخ سن کر چوٹی کی طرف آیا۔ آپ زمین پر گرے ہوئے تھے... اس نے سدرہ کو وہاں سے کودتے دیکھا۔“

”مگر... اس کے ساتھ ایک دراز قد آدمی تھا۔“

”پولیس کو اس کے پرس سے کوئی خط نہیں ملا۔“ اعظم نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ”اس کی بہن نے گھر میں جو زور لگانے دیکھنے کا دعویٰ کیا تھا، وہ بھی تلاش نہیں کیے جاسکے۔“

تو ڈاکٹر اعظم نے ایک سیدھی سا وہ رپورٹ بنائی۔ سدرہ ایک ذہنی مریض تھی اور میں مخلص معالج، جو اس کا نفسیاتی مسئلہ حل کرنے کے لیے آخری حد تک گیا مگر ناکام رہا۔

میں نے خاموشی سے رپورٹ پر دستخط کر دیے اور اس کیس کو بھولنے کی کوشش کرنے لگا، مگر وہ ذرا اونے خوابوں کی صورت میرا تعاقب کرتا رہا۔ ایک عفریت میرے پیچھے پڑ گیا تھا۔

اس سانحے کے ڈیڑھ برس بعد، جب میں سدرہ کا چہرہ دھیرے دھیرے بھولنے لگا تھا، ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا، جس نے یکدم بہت سی یادیں تازہ کر دیں۔

میں دفتر میں داخل ہوا، تو سامنے نیلے رنگ کا ایک لفافہ رکھا تھا۔ شادی کا دعوت نامہ۔ ناصر اور سارہ کی شادی۔

اچانک میرے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ مجھے بیٹری سے محروم ایک ٹیلی فون سیٹ یاد آیا... پھر ایک لڑکی کا سر لہجہ ذہن میں تازہ ہوا... کہانی کے ستم عیاں ہونے لگے۔

میں نے ڈاکٹر اعظم کا نمبر ڈائل کیا۔ سدرہ کا نام سنتے ہی وہ سنجیدہ ہو گیا۔ ”کیوں گڑے مردے اکھاڑ رہے ہو۔ شاید فیاض کا واہمہ اب بھی تمہارے ذہن میں زندہ ہے؟“

”نہیں۔ بس ایک بات پوچھنی تھی۔“ میں نے کھٹکھار کر گلا صاف کیا۔ ”ٹھیک ہے، خطوط نہیں ملے۔ مگر سدرہ کے پاس ایک موبائل فون بھی تھا... جس پر وہ فیاض سے باتیں کیا کرتی تھی۔ تو ان کے ریکارڈ...“

”وحید۔ میری بات غور سے سنو۔“ اس کا لہجہ سرد تھا۔

”سدرہ کے پاس کوئی موبائل فون نہیں تھا۔“

”مگر اس کی چھوٹی بہن نے تو ناصر کو بتایا تھا کہ سدرہ نے اپنے والد سے ضد کر کے...“

”نہیں وحید۔ اس کے گھر والوں سے میری تفصیلی بات ہوئی ہے۔ انہوں نے کسی موبائل فون کا ذکر نہیں کیا۔ بہتر ہے کہ تم اس کیس کو اب بھول جاؤ۔“

میں نے فون رکھ دیا۔ شادی کا دعوت نامہ میرے سامنے رکھا تھا۔ اس کا رنگ نیلا تھا، ٹھیک سدرہ کی آنکھوں کی مانند۔

انسپکٹر نے آنکھیں سکیڑ لیں۔ ”چوکیدار نے ایسے کسی شخص کے بارے میں نہیں بتایا۔ اس وقت ایک گاڑی برقع سے گزر رہی تھی۔ اس کے ڈرائیور نے بھی بیان دے دیا ہے۔ سدرہ چھلانگ لگاتے ہوئے بالکل اکیلی تھی۔“

”ایسا نہیں ہو سکتا۔“ میرا سر جھٹکنے لگا۔

”مسٹر وجیر، مجھے لگتا ہے کہ آپ کو ایک ماہر نفسیات کی ضرورت ہے۔ خیر آپ کا بیان...“

”وحید ابھی صدمے میں ہیں انسپکٹر۔“ ڈاکٹر اعظم نے مداخلت کی۔ ”بیان لینے کے لیے یہ وقت مناسب نہیں۔“

انسپکٹر پاؤں جھٹکتے ہوئے چلا گیا۔

”میں یہاں کیسے پہنچا؟“ میں نے بدن ڈھیلا چھوڑ دیا۔

”میں آپ کو اسپتال لایا۔“ ناصر نے کہا۔ ”میں آپ سے ٹیلی فون پر بات کر رہا تھا، جب مجھے دوسری طرف سدرہ کی آواز سنائی دی۔ اس نے گرین برقع کہا تو میں چونکا۔ دراصل اسی مقام سے فیاض نے گود کر خودکشی...“

میں پھر نیند میں اتر گیا۔

☆☆☆

میں گزشتہ بارہ برس سے پریکٹس کر رہا ہوں اور اس عرصے میں کبھی میرا کسی ایسے کیس سے سامنا نہیں ہوا، جسے میں حل نہ کر سکا ہوں۔ ایسا کوئی معما، کوئی پیچیدہ کیس نہیں، جسے میں سلجھانہ سکا ہوں، ماسوائے سدرہ شیخ کی خودکشی کے۔

میں نے پوئیس کو حقیقت نہیں بتائی۔ اعظم کے کہنے پر زبان بند کر لی۔ اسے خدشہ تھا کہ میری بیان کردہ کہانی کی بنیاد پر میرا لائسنس بھی منسوخ ہو سکتا ہے۔

اس نے خود ہی ایک رپورٹ تیار کی۔ ایک سیدھی سا وہ رپورٹ۔ جس میں سدرہ کو ایک ذہنی مریض کے طور پر پیش کیا، جو ایک ایسے شخص سے محبت کرتی تھی، جس نے کسی نامعلوم وجہ سے خودکشی کر لی۔ سدرہ نے اس حقیقت کو قبول نہیں کیا اور اپنے بچل میں فیاض کو دوبارہ زندہ کر لیا۔ فیاض کی ماں نے تصویر دیکھ کر تصدیق کر دی تھی کہ سدرہ اس کے بیٹے کی موت کے بعد دوبارہ اس کے گھر آئی تھی۔ زور لگانے اور تاریخی رائٹنگ پڑ فیاض ہی استعمال کرتا تھا۔ سدرہ اپنے نام خود ہی خط پوسٹ کرتی تھی۔ ٹیلی فون بھی ایک ڈھونگ تھا۔ فقط اس کے تحیل کی پیداوار۔ فیاض سے ملاقاتوں کا تعلق حقیقت کی دنیا سے نہیں تھا۔

”مگر اس نے مجھے ایک خط دکھایا تھا۔“ میں نے اعتراض کیا۔



محقرمه عذرا رسول

سلام تهنیت

یہ سرگزشت جسے میں نے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے، میری اپنی نہیں ہے۔ یہ خود ہی سنہری دھوپ سے نکل کر چلچلاتی دھوپ میں آجانے والی مہری ایک کم عقل سہیلی کی ہے۔ میری بروقت ایک کال نے اس کو تباہ ہونے سے بچالیا اور آج وہ میری بھابی ہے۔ جس نے مجھے یہ واقعہ سنایا اس کا اور اس روداد کے مرکزی کردار کا نام میں نے بدل دیا ہے۔

آصفہ ضیا احمد
(حیدرآباد)

سنہری دھوپ

خود تمہیں کال کروں گی۔“
”اس نے تشبیہی لہجے میں کہا۔“ بھول مت جانا مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“
میں نے اسے اطمینان دلاتے ہوئے کہا ”شوہر

میرے سیل فون اسکرین پر حسنی کا نام جھلک رہا تھا۔
دل تو چاہا کہ فوراً اس سے گٹ پٹ شروع کر دوں لیکن موقع کی نزاکت کے سبب، میں نے آہستہ سے کہا۔ ”حسنی میں معذرت چاہتی ہوں ذرا مصروف ہوں تھوڑی دیر بعد میں

فروری 2015ء

241

ماہنامہ سرانژشت

Copied From Web

حسنى ميرى بہت اچھی دوست اور پڑوسی تھی۔ ہم دونوں ایسے علاقے کے رہائشی تھے جہاں لوگ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہونا اپنا فرض اولین سمجھتے ہیں۔ گھر بھلے ہی چھوٹے اور تنگ و تاریک تھے لیکن دل سب کے بڑے اور کشادہ تھے۔ میرے اور حسنى کے گھرانوں کے مراسم بھی قرابت داروں جیسے تھے۔ میرے گھر میں جتنے افراد تھے اتنے ہی افراد پر مشتمل حسنى کا خاندان تھا۔ یعنی میں، میرے والدین اور ایک بڑا بھائی حارث۔ کچھ اسی طرح حسنى کے یہاں اس کے والدین، وہ خود اور ایک بھائی انصر۔ میرے اور حسنى کے والدین غریب ضرور تھے لیکن شعور اور آگہی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اسی لیے جہاں میرے والدین نے ہم دونوں بہن بھائی کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا وہیں حسنى اور اس کے بھائی انصر نے بھی تعلیمی میدان میں نمایاں کامیابی حاصل کر کے اپنے والدین کا نام روشن کیا۔ میں اور حسنى بی ایس سی کر چکے تھے۔ میرے بھائی حارث حصول تعلیم کے بعد ایک فارما سیکل کمپنی میں سیلز منیجر کے عہدے پر فائز ہو چکے تھے۔ حسنى کے بھائی انصر کا بی ای فائنل تھا۔ بذات خود حسنى کا ارادہ بوٹنی میں ماسٹر کرنے کا تھا۔ ارادہ تو میرا بھی یہی تھا لیکن ان ہی دنوں احمر کی واندہ نے رشتے کی بات چلا دی اور بقول میری امی کے آج کل اچھے رشتے اسی طرح ناپید ہو گئے ہیں جیسے اس جہان فانی سے خوشیاں، محبتیں اور امن و امان رخصت ہو چکے ہیں۔

میرى اعلیٰ تعلیم کی تمنا دل ہی دل میں رہ گئی۔ کیوں کہ حارث بھائی بھی امی کے ہموار تھے۔ چٹ مٹکی پٹ بیاہ کے مصداق سب کام انجام پایا اور میں بائبل کے گھر سے رخصت ہو کر سسرال سدھاری۔ حسنى میرى شادی کے ہر کام میں پیش پیش رہی۔ اس کی تعریفیں کرتے کرتے امی کی زبان خشک ہو رہی تھی کیوں کہ اس نے شادی کی آدمی ذمہ داریاں اپنے سر لے رکھیں تھیں۔ حارث بھائی کی آنکھوں میں بھی اس کے لیے اظہارِ تشکر تھا کیوں کہ وہ انصر کو ساتھ لے کر باہر کے بھی کئی کام نمٹا رہی تھی۔ شادی کی تقریبات سے فارغ ہونے کے بعد سب نے سکھ کا سانس لیا اور مہمان بھی اپنے اپنے گھر رخصت ہوئے تو گھر میں ہونے والا شور وغل اور ہنگامہ آرائی ختم ہوئی۔ میں اپنی سسرال میں ہی تھی کہ اچانک حسنى کا فون آیا۔ اس کی آواز آنسوؤں میں بھیگی

نامدار کے آفس، روانہ ہوتے ہی سارے کام پس پشت ڈال کر سب سے پہلے تم سے بات کروں گی۔“
مطلب ہو کر اس نے موبائل آف کر دیا۔ احمر کے دفتر جانے کے بعد میں نے فوراً اپنا وعدہ پورا کیا۔ وہ شاید میرى کال کے انتظار میں ہی بیٹھی تھی۔ ہوائے دوش پر اس کی آواز لہرائی جو کافی کمنک دار اور پُر جوش تھی۔ اس نے اشتیاق بھرے لہجے میں کہا۔ ”میرى جان بلکہ میرى جان جگر یہ تو مجھے اچھی طرح علم ہے کہ تم ایک عدد شوہر اور ایک عدد بیٹا رکھتی ہو لیکن اے خانہ بر انداز چمن کچھ ہم پر بھی نظر عنایت ڈال لیا کر۔ تم تو ماضی کے تمام رشتے ناتوں پر پانی پھیر کر پیا گھر ایسی سدھاری کہ پلٹ کر خبر ہی نہیں لیتیں۔“ اس نے شکوے شکایتوں کا ایسا ڈھیر لگایا کہ میرى بولتی ہی بند ہو گئی۔ وہ بول رہی تھی اور میں سن رہی تھی جیسے ہی وہ سانس لینے کے لیے رکی میں نے فوراً استفسار کیا۔

”اور کچھ کہتا ہے؟“

اس بار اُن نے قدرے تیز آواز میں کہا۔ ”جان من حد ہو چکی بس اب تم فوراً اپنی خوشدامن صاحبہ اور شوہر نامدار سے اجازت لے کر آ جاؤ۔ عرصہ ہوا تمہیں دیکھے ہوئے اور مجھے تم سے ایک اہم معاملہ شیئر کرنا ہے اس لیے میں تمہاری راہوں میں آج بھی بچھائے بیٹھی ہوں تمہیں کیا پتا کہ.....“
میں نے سچ میں ہی جملہ اچک لیا اور تجسس آمیز لہجے میں سوال کیا۔ ”تم پہلے بھی یہ بات کہہ چکی ہو کہ کسی خاص مسئلے پر ڈسکس کرنا ہے۔ ایسا کیا ٹاپ سیکرٹ ہے کہ فون پر نہیں بتا سکتیں۔“

اس نے نقلی بھرے انداز میں الفاظ چباتے ہوئے کہا۔ ”بس کہہ دیا تاکہ ملنے پر روبرو بیٹھ کر ساری روداد تمہارے گوش گزار کروں گی۔ میں بہت بے چینی سے تمہاری منتظر ہوں۔“ اس کے بعد الوداعی کلمات کہتے ہوئے اس نے موبائل آف کر دیا۔

میں نے بھی اپنا موبائل سائیڈ ٹیبل پر رکھا اور سوچنے لگی کہ حسنى پر ایسا کیا افتاد آن پڑی کہ وہ مجھے مسلسل آنے لگی تاکید کر رہی ہے۔ بہت سوچنے کے بعد بھی کوئی سراپا تھ نہیں آیا تو میں سر جھٹک کر اپنی روزمرہ کی مصروفیات میں گم ہو گئی لیکن کام کے دور ان بھی میرے خیالات حسنى کے تعاقب میں رہے۔ شام اُنیں جب احمر دفتر سے آئے تو میں نے ان سے اور اپنی ساس صاحبہ سے میکے جانے کی اجازت طلب کی جو مجھے باآسانی مل گئی۔

دواں تھی۔ میری اور حسنیٰ کی راہیں جدا جدا ضرور ہو گئی تھیں لیکن جب بھی ملاقات ہوتی ہم دونوں اپنا اپنا دل کھول کر ایک دوسرے کے سامنے رکھ دیتے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے کھلی کتاب کی طرح تھے۔ گو ہمیں ملنے جلنے کا موقع اب بہت کم ملتا تھا اور ٹیلی فونک گفتگو بھی بہت کم ہوتی تھی لیکن دل ایک دوسرے کی یاد سے غافل نہیں تھے۔

☆.....☆

میرے بڑے بھائی چونکہ برسر روزگار ہو چکے تھے۔ اس لیے دنیا کی تمام ماؤں کی طرح امی کے دل میں بھی گھر میں بھولانے کی خواہش کلبلانے لگی۔ چونکہ حسنیٰ انہیں شروع سے بے حد پسند تھی اس لیے قرعہ فال اسی کے نام نکلا۔ حارث بھائی کی آنکھوں میں بھی حسنیٰ کے لیے میں پسندیدگی کی جھلک دیکھ چکی تھی لیکن حسنیٰ کی والدہ کے پاس جانے کے لیے قدم نہیں اٹھ رہے تھے کیوں کہ گھر کے تمام اخراجات کا دارومدار حسنیٰ کے ناتواں کندھوں پر تھا۔ معاشی مسائل سے پورا کنبہ نبرد آزما تھا۔ اس لیے رشتے کی بات چھیڑنے کے لیے زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اس کے علاوہ حارث بھائی نے بھی امی کو یہ کہہ کر روک دیا کہ فی الحال آپ اس تذکرے کو رہنے ہی دیں کیوں کہ میں کسی اچھے علاقے میں اپنا ذاتی گھر یا تو خریدوں گا یا پلاٹ خرید کر گھر تعمیر کرواؤں گا۔ اس کے بعد ہی یہ سلسلہ چھیڑیے گا۔ امی کے جوش اور دلوں پر برف پڑ گئی لیکن ہم دونوں بہن بھائی کے سامنے انہوں نے اپنے خدشے کا اظہار کر دیا کہ اگر ہم اسی طرح ٹال مٹول سے کام لیتے رہے تو کہیں حسنیٰ ہاتھ سے نہ نکل جائے کیوں کہ حسنیٰ کروڑوں میں ایک نہیں تو ہزاروں میں ایک ضرور تھی۔ مناسب جسم، دلکش قد و قامت اور انتہائی جاذب نظر چہرہ اس کے علاوہ تعلیم یافتہ اور سلیقہ مند لڑکی تھی۔ امور خانہ داری میں بھی کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا تھا۔ میں نے امی کو ہتھی دیتے ہوئے کہا۔ ”آپ یہ خدشات اور خوف اپنے دل سے نکال دیجیے۔ انشاء اللہ حسنیٰ ہی آپ کی بہو بن کر آئے گی۔“

امی نے بظاہر تو ہم دونوں کے آگے ہتھیار ڈال دیے لیکن دل ہی دل میں وہ مجھ سے اور حارث بھائی سے سخت براہم تھیں۔ ان کا چہرہ اس بات کی غمازی کر رہا تھا۔ حارث بھائی بھی امی کو دلاسا دیتے رہے لیکن امی کا موڈ آف ہو گیا تھا۔

☆.....☆

ہوئی تھی۔ میں اس کے کہے ہوئے الفاظ نہ سمجھ پا رہی نہ ٹھیک سے سن پا رہی تھی۔ بدقت تمام میں صرف ایک جملہ سن پائی کہ اس کے والد ہو سہلا نرڈ ہیں۔ میں احمر کو ساتھ لے کر اس کے بتائے ہوئے تھے پر پہنچی تو پتا چلا کہ اس کے والد کو انتہائی نگہداشت میں رکھا گیا ہے کیوں آج ہی ان پر فالج کا زبردست ایک ہوا تھا۔ حسنیٰ کے خاندان کے لیے یہ گھڑی کسی قیامت سے کم نہیں تھی۔ میرے بھائی حارث بھی ان کے ساتھ تھے۔ میں اور احمر بھی وہاں رہے اور ان لوگوں کو مسلسل اسی نشئی دیتے رہے لیکن سارا کنبہ ہی اس ناگہانی آفت کی وجہ سے زبردست شاک میں تھا۔ کچھ عرصہ اسپتال میں رکھنے کے بعد انہیں ڈسچارج کر دیا گیا لیکن اب وہ مکمل چار پائی سے لگ گئے تھے۔ گھر کے سربراہ اور واحد کفیل ہی جب بستر پکڑ لے تو گھر کا چولہا خود بخود ٹھنڈا ہو جاتا ہے اور نہ ہی سب کچھ ان لوگوں کے ساتھ ہوا۔ نا آسودگی پریشانیاں، محرومی اور تنگدستی نے اس گھر میں ڈیرے ڈال لیے۔ حسنیٰ نے وقت کی نبض پہچان کر ایم ایس سی کرنے کے خواب کو بالائے طاق رکھ اور ہوم نیوشن اکیڈمی سے رابطہ کر کے مناسب اور مہنگی ٹیوشن حاصل کیں۔

یہ اکیڈمی مخصوص اور خطیر نیوشن فیس کے بدلے اپنی ضمانت پر ہوم نیوشن مہیا کرتی تھی۔ حسنیٰ کی تعلیمی قابلیت کو دیکھتے ہوئے اکیڈمی نے اسے ایسے گھرانوں کی ٹیوشن فراہم کی تھیں جہاں کے بچے کوچھیوں اور بنگلوں کے رہائشی تھے اور کانونٹ اسکولز میں زیر تعلیم تھے۔ ان کے سلیبس دیکھنے کے بعد حسنیٰ نے فوراً ہامی بھری لیکن ساتھ ہی زبردست نیوشن فیس کی ڈیمانڈ رکھی جو تھوڑی سی روکد کے بعد طے پا گئی کیوں کہ تقریباً سب ہی پوش علاقے میں رہنے والے باحیثیت لوگ تھے اور اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم دلانے کے خواہاں تھے اس لیے منہ مانتی نیوشن فیس دینے پر مجبور تھے۔ حسنیٰ نے اپنی تعلیم کو خیر باد کہہ دیا تھا لیکن اس نے انصر کی تعلیم کا سلسلہ منقطع نہیں ہونے دیا۔ وقت کے چھیڑوں کی زد میں آ کر جو خاندان خس و خاشاک کی طرح بکھرنے والا تھا وہ حسنیٰ کی وجہ سے دوبارہ جی اٹھا۔ اپنے والد کے علاج معالجے میں بھی اس نے کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ گھر کا بجھا چولہا بھی پھر سے جلنے لگا۔ انصر بھی فارغ اوقات میں خالی نہ بیٹھتا بلکہ کچھ نہ کچھ کر کے اپنی کمائی ماں کی ہتھیلی پر رکھ دیتا۔ دونوں بہن بھائی اپنے بل بوتے پر جینا سیکھ گئے تھے لیکن اتنی سخت محنت کے باوجود زندگی غربت کی پگڈنڈی پر رواں

مسائل سے لڑتے لڑتے اس لیے ایسے موقع کی تلاش میں تھی جس سے مجھے ایک آرام دہ محفوظ اور خوش گوار مستقبل مل جائے۔ سہرے خواب میرے ہو جائیں اور بس رب نے میری سن لی۔ تمہیں تو اچھی طرح علم ہے کہ میرے پاس تمام ٹیوشنز امیر کبیر گھرانوں کی ہیں۔ تم ان لوگوں کی زندگی قریب سے دیکھو گی تو تمہیں احساس ہو گا کہ یہ زندگی کتنی حسین ہے۔ ہم لوگ تو اس دنیا میں آ کر صرف عمر کاٹ رہے ہیں۔ زندگی تھوڑی گزار رہے ہیں۔ میں تکلی لگائے حیران نظروں سے اسے دیکھے جا رہی تھی اور وہ بلا تکان بولے جا رہی تھی۔ میرے بغور دیکھنے پر وہ چونکی اور کہنے لگی ”اوہ، وہ ایک بات تو رہی گئی۔“

میں نے ایک استہزائیہ قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ ”تو تم اتنی دیر سے کیا کر رہی ہو۔ جب سے آئی ہو مسلسل باتیں ہی تو کر رہی ہو۔“

اس نے جھینپتے ہوئے کہا۔ ”میں دراصل تمہیں شوکت کے بابت کچھ بتانا چاہ رہی ہوں۔“

میں نے تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے نہایت بھولپن سے کہا۔ ”کون شوکت؟“

حسنی نے جھلاتے ہوئے خفگی بھرے لہجے میں کہا۔ ”تمہارے سامنے تو رات بھر کوئی یوسف زینجا پڑھے اور صبح اٹھ کر تم اس سے سوال کرو گی زینجا آدمی تھا یا عورت۔“

اس کی اس تمثیل پر میں بے ساختہ ہنس پڑی۔ پھر اپنی ہنسی کو بریک لگاتے ہوئے استفسار کیا۔ ”اوہ یاد آیا تو موصوف کا اسم گرامی شوکت ہے اور کرتے کیا ہیں؟“

اس نے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”وہ کیوں کچھ کرنے لگے، کروڑوں کا بزنس ہے۔ ان کے ورکرز ان کے ملازمین تمام کاروبار سنبھالتے ہیں۔ الواحد بلڈرز کا نام سنا ہے جن کے کئی تعمیراتی پروجیکٹ پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں پائے تکمیل کو پہنچ چکے اور کئی ابھی زیر تعمیر ہیں۔ میں الواحد والوں کے یہاں گئی تو تھی بحیثیت ٹیوشن لیکن عنقریب اب میں عبدالواحد صاحب کی بہو بن جاؤں گی۔“

کیوں کہ میں اور ان کا بیٹا شوکت ایک دوسرے کو بے تحاشا پیار کرنے لگے ہیں۔ ایک دوسرے کے بغیر ہم جینے کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بس یہ سمجھو حسنی اور شوکت ایک جان دو قالب ہیں۔ ہم دونوں جب تک ایک دوسرے کو دیکھ نہ لیں قرار نہیں آتا۔“

میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور وھڑکتے دل

حسنی مجھ سے ملنے کے لیے کچھ زیادہ ہی بے تاب تھی کیوں کہ جیسے ہی بپے میکے پہنچ کر میں نے اسے کال کی وہ فوراً چراغ کے جن کی طرح حاضر ہو گئی۔ اس کا چہرہ ایک انجانی خوشی سے جگمگا رہا تھا۔ انگ انگ سے مسرت پھوٹ رہی تھی۔ کچھ دن پہلے میری اس سے ملاقات ہوئی تھی تو وہ عجیب سی پڑمردہ اور بیمار لگ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر میرا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا کہ اس کے گھرانے پر یہ افتادہ پڑتی تو وہ یوں نہ مرجھاتی لیکن آج تو جو بن پر بہا رہی۔ رنگ روپ ہی بدلا ہوا تھا۔ میرے اپنے دل نے چپکے سے سرگوشی کی ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ اس سے بغلگیر ہوتے ہوئے میں کہے بنا نہیں رہ سکی۔ ”کیا بات ہے بہت خوش نظر آ رہی ہو۔“

اس نے ٹھکانے ٹھکانے کھلے کھلے لہجے میں آہستہ سے کہا۔ ”میری بہنا مجھے بھرے خوابوں کی تعبیر مل گئی۔ زندگی بھر ساتھ بھاننے والا وہ حسین ساتھی مل گیا۔ جس کے خواب دنیا کی ہر لڑکی ہوش سنبھالتے ہی دیکھتی ہے۔“

میرے دل میں ایک برجھی سی اتر گئی۔ اس کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ آنسی سیال بن کر میرے سارے وجود کو بھسم کر گئے۔ بڑوں کے تجربات کتنے صحیح ہوتے ہیں مجھے اس روز احساس ہوا لیکن میں نے حسنی پر کوئی بات ظاہر نہیں ہونے دی بلکہ اس کی خوشی میں خوش ہونے کی بھرپور اداکاری کی اور نہایت گرم جوشی سے اسے لپٹاتے ہوئے کہا۔ ”واؤ زبردست اب بتا بھی دو کون ہے؟ کیا نام ہے؟ کہاں رہتا ہے؟ کیا رشتہ لے کر اس کے والدین تمہارے گھر آچکے ہیں؟“

میرے تابڑاؤں سوالوں پر اس نے ایک بھرپور قہقہہ لگایا اور کہا۔ ”سارانی داستان سانی ہوں اسی داستان میں تمہیں اپنے سارے سوالات کے جوابات مل جائیں گے۔“ اور پھر جو اس نے کہانی شروع کی وہ کوئی عام روداد یا داستان نہیں بلکہ کھلم کھلا فسانہ عشق تھا جس کا ہیرو ایک امیر زادہ اور ہیروئن حسنی تھی۔ اس نے اپنی داستان کا آغاز کچھ اس طرح کیا۔

☆.....☆

میری دوست! میں نے زندگی کی راہوں میں ہمیشہ دھول ہی دھول دیکھی ہے۔ کبھی پھول نہیں دیکھے۔ انتھک محنت، جدوجہد اور اس کے بعد دو وقت کی روکھی سوکھی روٹی اور جسم پر مونے کھر دے پڑے، تنگ آگئی تھی میں ان

☆.....☆

☆.....☆

☆.....☆

☆.....☆

☆.....☆

”جب وہ تمہاری نند بن جائے اور تم بھوج بن جاؤ اس وقت بھی چھنے اور بنے تو ہم آپ کے حضور میں کورٹس بجائیں گے۔“

اس نے اٹھلاتے ہوئے کہا۔ ”اے بس تم دیکھتی رہنا مستقبل قریب میں اس وسیع و عریض کوٹھی پر راج ہوگا میرا۔ یقین کرو مجھے تو یقین ہی نہیں آتا کہ میرے نصیب، میرے بخت اچانک اتنی بلندی پر کس طرح پہنچ گئے۔ کہاں ہم زمین پر رہنے والے اور کہاں وہ ستاروں میں بسنے والے لوگ مگر وہ کہتے ہیں نا کہ عشق نہ دیکھے ذات پات۔ یہ مثل شوکت پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ بخدا انہوں نے نہ میرے معاشی و مالی حالات کریدنے کی کوشش کی اور نہ میرے خاندان اور رہائش کے بارے میں کوئی سوال کیا۔ ہاں البتہ ایک بار انصر مجھے اپنی بانیک پر چھوڑنے کے لیے گیا تھا تو شوکت کوٹھی کے گیٹ سے نکل رہے تھے۔ نہایت تپاک اور گرم جوشی سے انصر سے ملے۔ انصر بھی ان سے بے حد متاثر ہوا اور وہ خود بھی.....“

میں نے قطع کلامی کرتے ہوئے ایک اور لٹھ مارا۔ ”اچھا ایک بات تو بتاؤ تمہارے شوکت، شان و شوکت سے تمہاری دلہیز پر کب تشریف لارہے ہیں؟“ میرے اس سوال پر حسنی کے چہرے کا رنگ اڑ گیا، کترنی کی طرح چلنے والی زبان کو ایک دم تالا لگ گیا۔ چند لمحوں تو قف کرنے کے بعد مدھم لہجے میں کہا۔ ”اس سلسلے کو لے کر تو میں بھی اشارتا کنا یا کہہ چکی ہوں لیکن شوکت کہتے ہیں ابھی ایسی کیا جلدی ہے پہلے دل بھر کر کوٹ شپ کریں گے بعد میں شادی بیاہ کریں گے۔“

حسنی کے اس جواب سے میرے کان فوراً کھڑے ہو گئے۔ میں فوراً سمجھ گئی کہ کوئی بہت خوب صورت جال بچھا کر اسے جھانسنے میں لے رہا ہے۔ میں نے اپنے طور پر زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتے ہوئے اسے ہوشیار رہنے کی تلقین کی لیکن وہاں تو عشق کا بھوت سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ میری نصیحتوں پر اس نے ناک بھوں چڑھائی اور تبتکا کر کہا۔ ”میں تو سمجھ رہی تھی میری پریم کتھاسن کر تم خوشی سے جھوم اٹھو گی لیکن یہاں تو بقول غالب دوست ہی ناصح بن بیٹھے ہیں تو ہم غم گسار اور چارہ گر کہاں تلاش کریں۔“ پھر وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔ میں دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس کے جانے کے بعد بھی میں اس کے ہی متعلق سوچتی رہی کہ کل تک جو لڑکی ڈری سبھی گھر کی چار دیواری

کے ساتھ کہا۔ ”سنی الواحد والوں کے یہاں تم کتنے بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی ہو اور شوکت کا ان سے کیا رشتہ ہے؟“

اس نے جواب دیا۔ چار بچے۔ تین بچے شوکت کے بڑے بھائی کے بچے ہیں اور ایک بڑی بہن کا بچہ ہے۔ چاروں پرائمری اسٹینڈرڈ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن چونکہ کانونٹ کا سلیپس ہے اس لیے کام محنت طلب ہے۔ شوکت صاحب اور ان کے گھر کے سارے افراد پہلے پہل تو میری ٹیچنگ اور علمی قابیلیت سے بہت متاثر ہوئے۔ سب ہی مجھ سے نہایت ادب احترام اور خلوص سے پیش آتے ہیں اگر کسی دن چھٹی کر لیتی ہوں تو گھر کے سارے افراد مجھے مس کرتے ہیں۔ بچوں کو پڑھانے کے دوران میں میرے لیے ریفر-شمنٹ اور ہائے میز پر لگا دی جاتی تھی لیکن رفتہ رفتہ اب تو شام کی چائے میں ان کے فیملی ممبرز کے ساتھ ہی بیٹی ہوں اور ان کے خاندان میں، میں اس طرح کھل مل گئی ہوں کہ نہ اب مجھے اجنبیت کا احساس ہوتا ہے اور نہ غیریت کا۔ سب اپنے اپنے سے لگتے ہیں خصوصاً شوکت تو اب میری زندگی ہے۔ بس میری دل کی دنیا ان ہی سے شاد و آباد ہے۔ گفتگو کے دوران میں اس نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا تو میں نے بھی اسے کریدتے ہوئے پوچھا۔

”ان کے گھر میں جو خواتین ہیں وہ تمہیں پسند کرتی ہیں۔“

حسنی نے ایک ادائے ناز سے اپنے بالوں کو جھٹکا دیا اور فخریہ انداز میں کہا۔ ”یہ پوچھو کون نہیں پسند کرتا۔ ان کے گھر کی بزرگ خواتین یعنی ان کی والدہ اور بیوہ پھوپھی وہ دونوں تو مجھے بیٹیوں کی طرح چاہتی ہیں۔ ان کی بھابی یعنی میرے اسٹوڈنٹس کی والدہ سے بھی میری اچھی انڈر اسٹینڈنگ ہے۔ شوکت کی سب سے چھوٹی بہن سے تو خوب یارانہ ہو گیا ہے۔ ہم دونوں بہت اچھی دوست بن گئی ہیں حالانکہ یقین کرو اتنی ضدی، سرکشی اور شاہانہ مزاج رکھنے والی لڑکی ہے کہ میں تمہیں بتا نہیں سکتی۔ غرور سے ہمیشہ گردن اکڑی ہوئی رہتی ہے لیکن اب تو یہ حال ہے کہ مجھے پہنچنے میں ذرا سی تاخیر ہو جانی ہے تو فوراً میرے موبائل پر کال آ جاتی ہے کہ اپنا پتا بتاؤ ڈرائیور کو بھجوا رہی ہوں۔ ویسے کوکب کو سمجھنا ذرا مشکل کام ہے، کبھی نرم کبھی گرم لیکن اس کی سائیکی میری سمجھ میں آگئی ہے۔ اس لیے فی الحال تو ہم دونوں کی خوب گاڑھی چھن رہی ہے۔“

میں نے بھی اپنے ترکش میں سے ایک تیر چھوڑا۔

رنگین نظر آرہی ہے تا بعد میں یہ اتنی ہی سنگین ہو جائے گی۔“
جواب میں وہ غرائی۔ ”تم تو پاگل ہو۔ پتا نہیں کون
سی بوڑھی روح تمہارے بدن میں حلول کر گئی ہے۔ بہر حال
میں آرہی ہوں۔“

تھوڑی ہی دیر بعد وہ میرے پاس بیٹھی پھر اپنی بیٹی سنا
رہی تھی۔ تھوڑی دیر تو جھجک مائع رہی اس کے بعد اس نے
راز فاش کیا کہ شوکت اس سے تنہائی میں ملنے کا خواہاں ہے
اور آج شام کا وقت دیا ہے۔ ڈنر بھی کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں
ہوگا اور اس کے بعد لمبی ڈرائیو اور پھر گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر
آگے کا لائحہ عمل طے کریں گے۔

میں نے حسب عادت پھر اس کی بات کاٹتے ہوئے
کہا۔ ”آگے کا لائحہ عمل میں سمجھی نہیں۔“

اس نے پھر برا سامنہ بنایا اور جیس بہ جیس ہو کر بولی۔
”اوہ بھئی شادی بیاہ کے معاملات طے کرنا ہیں نا۔“

میں نے حیران نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ تو
ہمارے یہاں گھر کے بڑے اور بزرگ طے کرتے ہیں۔

لڑکایا لڑکی کسی پکنک پوائنٹ پر جا کر نہیں کرتے۔“
اب وہ بری طرح بھٹائی تھی اس نے ورشت لہجے

میں جواب دیا۔ ”ایک تو تمہاری یہ عادت بہت خراب ہے۔
بات کو گھما پھرا کر کدھر سے کدھر لے جاتی ہو۔“

میں نے اس کی حقیقی اور ناراضگی کا کوئی اثر نہیں لیا بلکہ
اس بار میں نے بھی ذرا سخت لہجہ استعمال کرتے ہوئے کہا۔

”تم جانو اور تمہارا کام جانے مجھے بس اتنا بتاؤ کہ میں اس
سارے معاملے میں تمہاری کیا مدد کر سکتی ہوں۔ میرے لائق

جو بھی خدمت ہو مجھے بتاؤ۔ اگر میرے بس میں ہو تو ضرور
کروں گی۔“

میرے بدلے موڈ کو دیکھ کر وہ بھی ذرا نرم پڑی اور
نہایت لجاجت آمیز لہجے میں کہا۔ ”میری اچھی دوست میری

پیاری بہن ناراض ہو گئی ہو۔ پلیز تمہارے پاس ایک بہت
ضروری کام سے آئی ہوں۔“

میں نے بھی اپنی حقیقی برقرار رکھتے ہوئے قدرے تیز
آواز میں کہا۔ ”جی فرمائیے۔ کیا خدمت کر سکتی ہوں میں

آپ کی۔“
اس نے دبی دبی سی آواز میں ملتجیانہ لہجے میں کہا۔

”مجھے دراصل تمہارا عبا یہ اور نقاب چاہیے تمہیں معلوم ہے نا
میں تو چادر بھی استعمال نہیں کرتی۔ لیکن آج شوکت کے

ساتھ گھومنے پھرنے کا پروگرام ہے۔ جانے انجانے میں کسی

میں مقید تھی۔ آج کتنی اونچی اڑان اڑ رہی ہے۔ اتنی بلندی
پر اڑتے اڑتے زمین پر گر کر اپنا وجود ہی نہ کھو بیٹھے۔ میں
اپنے ہی خیالوں میں غلطاں و پچواں تھی کہ امی کی آواز پر
ہوش میں آئی۔ وہ مست سر تھی۔

”یہ تمہاری دوست یوں آئی اور یوں چلی گئی۔ آج
حسنی کچھ جلدی میں تھی کیا میں تو اسے کھانے پر روکنا چاہ رہی

تھی لیکن وہ بجلی کی سی سرعت سے نکل گئی۔“
میں نے ایک افسردہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ ”امی

اب اپنے دسترخوان کا کھانا اسے کہاں اچھا لگے گا۔“ امی
نے استعجاب انگیز نظروں سے مجھے دیکھا اور کہا۔

”میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی کیا کہہ رہی ہوں تم۔“
میں نے بات ٹال کر امی کو دوسری باتوں میں الجھالیا

اور بات آئی گئی ہو گئی۔
☆.....☆

اس کاراز کھل طور پر میرے سینے میں دفن تھا۔ نہ میں
نے اس کی ہوا امی کو لگنے دی اور نہ حادث بھائی کو۔ اب امی

میرے سرسوار تھیں کہ ”کب چل رہی ہو حسنی کے گھر اس کی
والدہ سے بات کرنے۔ اب تو میرے بیٹے نے پلاٹ بھی

خرید لیا ہے اور عنقریب تعمیری کام شروع ہو جائے گا۔ کوئی
نیک ساعت دیکھ کر بات چھیڑ دیں گے۔“

میں نے فوراً حسنی کے والد کی بیماری کو مزاحمتی کارڈ بنا
کر امی کے بڑھتے ہوئے قدم روک دیے۔ امی کا پارہ پھر

چڑھ گیا۔ بڑی مشکل سے میں نے انہیں منایا سمجھایا۔ اسی
اثناء میں، میں نے اپنی سسرال سے دو تین بار حسنی کو کال کیا

لیکن فوراً نمبر کاٹ دیا گیا۔ میں فوراً سمجھ گئی کہ محترمہ مجھ سے
سخت ناراض اور خفا ہیں۔ کیوں کہ میں نے سب کچھ سننے

کے بعد اختلاف رائے جو کی تھی ہاں اگر داستان عشق سننے
کے بعد ہاں میں ہاں ملاتی تو وہ خوشی سے نہال ہو جاتی۔

ایک اچھی دوست کھانے کا مال ضرور تھا۔ لیکن میں اپنی جگہ
خاموش رہی۔ پھر اچانک ایک دن خود ہی کال کی اور حکم

صادر کیا کہ جلدی سے آ جاؤ تمہارے ساتھ ایک خفیہ میٹنگ
کرنی ہے۔

میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”محترمہ حسنی صلیبہ آپ کی
اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں کل ہی امی کے گھر آئی

ہوں۔ آپ کو ملاقات کرنی ہے تو آپ ہی فوراً آ جائیے اور
مجھ سے یہ اُمید مت رکھنا کہ میں ان سب خرافات میں تمہارا

ساتھ دوں گی۔ نیور۔ تمہاری داستان عشق بظاہر تمہیں جتنی

کی نظر پڑ گئی تو میرا کہیں کی نہ رہوں گی۔“

”اوہ۔ میرے لہجے میں گہرا طنز تھا، دریا بھی اتر رہی ہو اور چاہتی ہو کہ کپڑے بھی نہ بھینگیں۔ واہ حسنی واہ! خوب منطقی ہے۔ وہ جو تمہارا عاشق زار ہے وہ اگر تمہیں لے جا کر کہیں قتل کرتا ہے تو عدالت میں اپنی چیزوں کی وجہ سے میں بھی کھسکا جاؤں گی اور تم کیا سمجھ رہی ہو پھر احمر مجھے اپنے گھر میں کھینے دیں گے۔ کبھی بھی نہیں۔ وہ بہت غیور اور غیرت دار انسان ہیں مجھ سے میرا بچہ چھین کر ہمیشہ کے لیے مجھے میکے بھیج دیا جائے گا اور میکے میں مجھے نہ میری ماں برداشت کریں گی اور نہ بھائی۔ ہمارے یہاں یہ باتیں انتہائی معیوب سمجھی جاتی ہیں۔ اس لیے اس سارے معاملے سے مجھے تو تم دور ہی رکھو بلکہ امی اور بھائی کو تمہاری ان حرکات کا پتا چل گیا تو شاید میرا اور تمہارا ملنا جلنا اور دوستی ہمیشہ کے لیے ختم ہی سمجھو۔ میرا گھر اتنا کیا کوئی بھی شریف خاندان اپنی بہو بیٹی کے قریب تمہاری پرچھائیں بھی برداشت نہیں کرے گا۔ ایک غیر مرد سے تمہاری میں ملنے جاری ہو تو شرم و حیا پر تو پڑ گئی خاک اب رہ گیا جسے عبائے اور نقاب سے ڈھانکا جا رہا ہے۔ میں تو کہتی ہوں جاتے جاتے اپنے بیمار، مفلوج اور بوڑھے باپ اور دکھاری ماں کو زبردستی جاؤ۔ کیوں کہ تمہاری بے حیائی کا پردہ چاک ہونے پر بے عزتی کی موت سے تو یہ موت زیادہ بہتر رہے گی اور تم سے میری آخری گزارش ہے کہ اپنے دل سے میرا نام کھرچ کر پھینک دینا اور اپنے سیل فون سے میرا نمبر بھی ڈیلیٹ کر دینا۔ بڑی مہربانی ہوگی۔ اب تم میرے گھر سے دفع ہو جاؤ۔“

حسنی کا چہرہ غصے اور احساس تذلیل سے سرخ ہو رہا تھا۔ محنت سے کیا ہوا میک اپ اعصابی کشیدگی سے بد نما اور بھدا لگ رہا تھا۔ اس کا غصہ اور اشتعال اپنے عروج پر تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں لیکن مسکارا اور آئی شیڈ کا خیال بھی دامن گیر تھا۔ اس لیے جلدی سے پرس میں سے نشو پیر نکال کر ہو۔ ہولے نم آنکھوں کو صاف کیا اور تھناتی ہوئی نکل گئی۔ اس کے جاتے ہی میری آنکھیں بھی ساون بھا دوں بن گئیں۔ آج برسوں کے یارانے اور خوب صورت تعلقات دونوں دم توڑ گئے تھے۔ ہماری دوستی کا یہ انجام ہوگا کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ میں اپنے خیالوں میں کم، دل برداشتہ وہیں صوفے پر بیٹھ گئی۔ امی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے گئی تھیں۔ میرا

بیٹا بھی گہری نیند سو رہا تھا۔ حارث بھائی بھی ابھی تک گھر نہیں لوٹے تھے۔ اس لیے کسی کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ میرے اور حسنی کے درمیان کس بات پر گرما گرمی اور بحث و مباحثہ ہوا ہے۔ امی کی علالت کی وجہ سے کھانا پکانے کی ذمہ داری میری تھی اس لیے دل نہ چاہتے ہوئے بھی بھاری بھاری قدموں سے چلتی ہوئی میں کچن میں جا کر مصروف ہو گئی۔ سب سے پہلے آنا گوندھا اور اپنا سارا غصہ، جلال اور تھناتھاٹ آٹے پر نکالی۔ اتنے زور زور سے ٹنگی دی کہ آٹا تھوڑی ہی دیر میں نرم و ملائم ہو گیا۔ ہنڈیا کرنے کے لیے کھڑی ہوئی تو پھر اس بے وقوف کا خیال آ گیا اور بقول شاعران کے خیال آئے تو آتے چلے گئے۔ لاکھائے دل کو سمجھانا چاہا اپنے آپ کو کام میں بہلانے کی کوشش کی لیکن پتا نہیں دل زور زور سے دھڑک کر کسی خطرے کی پیش گوئی کر رہا تھا۔ سانس بے ترتیب ہوئی جا رہی تھیں۔ موسم سرما کی آمد آمد تھی لیکن پیشانی اور ہتھیلیوں میں پسینے کی چھبھاہٹ کا احساس ہو رہا تھا۔ بمشکل کچن سے فارغ ہو کر امی کے کمرے کی راہ لی۔ انہیں بخار کی غفلت تھی وہ اسپتال سے واپس آ کر بے خبر سو رہی تھیں۔ میں نے جگانا مناسب نہ سمجھا کچھ دیر موبائل پر احمر سے ادھر ادھر کی باتیں کیں اور پھر موبائل آف کر دیا کیوں کہ صاحبزادے بیدار ہو گئے تھے۔ انہیں فیڈ کروایا اور اس سے اسی کی زبان میں غوں غاں کرتی رہی۔ اس کی معصوم شرارتوں سے دل بہلانے کی کوشش کرتی رہی لیکن لے دے کر خیالی روح حسنی کی طرف مڑ جاتی۔ جب دھڑکنیں بالکل ہی بے قابو ہو گئیں اور اس کی یادوں کا مدد جزر طوفان کی شکل اختیار کر گیا تو میں نے بے ساختہ اس کا نمبر ڈائل کرنے کی کوشش کی لیکن پھر معاً خیال آیا کہ ہمارے درمیان تو اب کچھ نہیں رہا۔ سارے رشتے ہی ختم ہو گئے۔ پھر بھلا میں اس کا نمبر کیوں ملا رہی ہوں۔ موبائل ایک طرف پٹخا اور ٹی وی لگا کر بیٹھ گئی لیکن سوچوں کے دھارے پھر اس بے وفا کی طرف مڑ گئے۔ بالآخر میں ہار گئی اپنے آپ سے محبت سے۔ ایک بار موبائل پھر میرے ہاتھ میں تھا اور میں اسے کال کر رہی تھی۔ میں ہار گئی تھی محبت جیت گئی تھی اور پھر حسنی کی خوف زدہ اور گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔

☆.....☆

اس کے ساتھ ہوا کیا تھا یہ اس نے بعد میں بتایا تھا جسے الفاظ کا پیرا بن دے رہی ہوں۔

فروری 2015ء

247

ماہنامہ سرگزشت

Copied From Web

طویل سے طویل تر ہو جائیں۔ اس لیے اس نے فوراً ہاٹی بھر لی۔ شوکت نے فوراً گاڑی کی رفتار تیز کر دی۔ اب گاڑی تیز رفتاری سے رواں دواں تھی۔ حسنی پھر خیالوں کی دنیا میں مجبور ہوا۔ وہ سوچ رہی تھی شوکت کی سنگت میں گزارے ہوئے یہ گھڑیاں اتنی دلقریب اور دل آویز ہیں تو پھر آئندہ زندگی کتنی دلکش، خوب صورت اور حسین ہوگی۔ اچانک گاڑی ایک زیر تعمیر بلڈنگ کے سامنے رکی تو حسنی کو ہوش آیا۔ اس نے چاروں طرف ایک طائرانہ نظر ڈالی تو خوف کی ایک خفیف سی لہر سارے جسم میں سرایت کر گئی۔ علاقہ قریب قریب غیر آباد اور سنسان تھا۔ بلڈنگ کے قریب الیکٹرک پول سے عارضی طور پر بجلی لی گئی تھی۔ اس لیے روشنی ٹھیک ٹھاک تھی۔ اینٹوں اور ریت پتھر کے ڈھیر دور دور تک بکھرے ہوئے تھے اور نگرانی کے لیے کرسیوں پر دو چوکیدار بیٹھے ہوئے تھے۔ شوکت کی گاڑی دیکھتے ہی دونوں بھاگتے ہوئے آئے اور منسوب کھڑے ہو گئے۔ شوکت نے ان کا حال احوال پوچھنے کے بعد ان سے چابی طلب کی اور چابی لے کر حسنی کو اپنے عقب میں آنے کا اشارہ کیا۔ حسنی سحر زدہ سی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگی۔ شوکت نے اپنا آفس وکھایا اور آفس سے منسلک کمرہ جو کہ سنگ روم کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ وہاں حسنی کے ساتھ داخل ہوا اور ایک نرم و گداز صوفے پر نیم دراز ہو کر ایک طویل انگڑائی لی اور حسنی کو بھی بیٹھنے کا اشارہ کیا لیکن حسنی بجائے بیٹھنے کے کھڑکی کے پاس جا کر باہر کا نظارہ کرنے لگی۔ حد نظر تک ہو کا عالم تھا۔ وہ متوحش نظروں سے اطراف کا جائزہ لے رہی تھی۔ دونوں چوکیداروں کے بھی یہاں سے ہولے ہی نظر آرہے تھے۔ ماحول برعکس ہی ویرانی اور رُاسراریت چھانی ہوئی تھی۔ شوکت سگریٹ کے لمبے لمبے کش لیتے ہوئے حسنی کو بغور دیکھے جا رہا تھا۔ معاوہ اٹھا اور دبے پاؤں چلتا ہوا اس کے عقب میں آن کھڑا ہوا۔ حسنی کو جیسے ہی آہٹ محسوس ہوئی وہ فوراً پلٹی اور ہڑبڑا کر بولی۔ آپ وزٹ کر چکے ہوں تو واپس چلتے ہیں۔“

شوکت نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔ ”اتنی جلدی، یہاں آ کر تو میں کچھ دیر آرام کرتا ہوں۔ شہر کے شور و غل اور ہنگامہ آرائیوں سے دور یہ پرسکون علاقہ مجھے بے حد پسند ہے۔ آدھے گھنٹے اپنا ریٹ روم دکھاتا ہوں۔ سنگ روم سے ملحقہ کمرے کا دروازہ جب شوکت نے کھولا تو حسنی کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ کمرہ ادیل ڈیکور بیڈ اور قیمتی

شوکت نہایت نفیس اور بیش قیمت سوٹ میں اپنی نئی ماڈل کی مہنگی گاڑی سے ٹیک لگائے اس کی آمد کا منتظر تھا۔ حسنی کو دیکھتے ہی اس نے ایک پرتسکس سانس لی اور اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ شوکت کو دیکھتے ہی حسنی کے موڈ میں بھی یکدم تبدیلی رونما ہوئی۔ پیشانی پر پڑی شکنیں اور تیوریوں کا اب نام و نشان نہیں تھا۔ ٹھوڑی دیر پہلے ہونے والی تو تو میں میں حرف غلط کی طرح ذہن سے ٹو ہو چکی تھی۔ موڈ نہایت خوشگوار اور شگفتہ ہو گیا تھا۔ پرستائش اور پیار بھری نظروں سے اس نے شوکت کو دیکھا۔ نئے تلمے قدموں سے چلتی ہوئی وہ شوکت کی گاڑی کے پاس آ کر رک گئی۔ شوکت نے جھک کر نہایت مہذب طریقے سے فرنٹ سیٹ کا دروازہ کھولا اور حسنی کو بیٹھنے کی پیشکش کی۔ حسنی احساسِ تقاخر کے ساتھ اکڑی ہوئی گردن سے شوکت کے برابر براجمان ہو گئی۔ گاڑی فوراً ہی کشادہ سڑک پر سبک روی سے چلنے لگی۔ حسنی نہایت مسرور اور شادماں تھی اپنی چشم تصور سے وہ اپنا مستقبل دیکھ رہی تھی جہاں وہ بھی شوکت تھا اور آسائشوں اور عیش و عشرت کے سامان تھے۔ اپنے خیالوں سے وہ تب چونکی جب شوکت نے ایک مہنگے اور عالی شان ہوٹل کے سامنے گاڑی روکی۔ شوکت نے نہایت باوقار انداز سے اس کے پھول جیسے ہاتھ کو تھاما اور اپنی بانہوں کا سہارا دے کر اسے گاڑی سے اتارا۔ حسنی کے آن چھوئے اور کنوارے بدن میں بجلیاں سی کوندنے لگیں۔ رگ و پے میں ایک ایسا ارتعاش برپا تھا کہ وہ بن پے جھوم رہی تھی۔ قدم لڑکھڑاہے تھے لیکن پھر بھی شوکت کی معیت میں شانہ بشانہ چل رہی تھی۔ شوکت اس کے نازک وجود کو سنبھالنے ہوٹل کی لابی میں داخل ہوا۔ یہاں ان کے لیے ایک ٹیبل بک تھی۔ دونوں نے انتہائی خواب ناک ماحول میں ڈنر کیا۔ دونوں کے درمیان خاموشی تھی لیکن آنکھیں بہت کچھ کہہ رہی تھیں۔ جانی انجانی کہانیاں سنا رہی تھیں۔ ڈنر کے بعد دونوں وہاں سے نکل کھڑے ہوئے۔ اب چونکہ لاٹنگ ڈرائیور بھی کر چکے تھے کھانا بھی کھا چکے تھے۔ اس لیے حسنی نے استفسار کیا۔

”اب جناب کا کیا پروگرام ہے؟“

شوکت نے بہکی بہکی گستاخ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”یہاں سے کچھ فاصلے پر ہمارا تعمیری کام جاری ہے۔ مصروفیت کی وجہ سے کئی دن سے ادھر کا دزٹ نہیں کیا اگر تمہیں کوئی اعتراض نہ ہو تو کام پر ایک نظر ڈال لوں۔ حسنی تو خود بھی چاہ رہی تھی کہ یہ مسافت یہ لمحات

جنبہ

عمان کے سربر آوردہ قبائل میں سے ایک قبیلہ۔ ایک زمانے میں اس قبیلے کو عمان کے بدوی قبائل میں سب سے زیادہ فوقیت اور قوت حاصل تھی۔ موجودہ دور میں بھی اس قبیلے کی تعداد اتنی ضرور ہے کہ صحرا میں ان کا درجہ امرائے دروع اور آل وہبہ سے کسی طرح بھی کم نہیں۔ اس قبیلے کے بڑے بڑے حصے ہیں جو یہ ہیں۔ مجالہ، فوارس، آل دبیان اور آل ابو غالب۔ ان میں مجالہ کو دوسرے تمام گروہوں پر برتری حاصل ہے۔ جنبہ ایک وسیع و عریض علاقے پر قابض ہیں۔ یہ عام طور پر دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک مشرقی اور دوسرا مغربی۔ مشرق میں یہ لوگ خلیج عمان میں صور کے مقام پر ساحلوں کے ساتھ ساتھ بستے چلے گئے ہیں۔ یہاں بوعلی ان کے شریک ہیں۔ ساحل بحیرہ عرب کی چھوٹی بندرگاہوں میں جازر کی حد تک کی آبادی بحری امور سے خاص دل چسپی رکھتی ہے۔ یہاں کے بعض باشندوں نے تاجروں کی حیثیت سے دوسرے ممالک میں بڑی کامیابیاں حاصل کی ہیں۔ اس گروہ کے خانہ بدوش اونٹوں اور بکریوں کے بڑے بڑے گلوں کے مالک ہیں۔ سردیوں میں یہ لوگ ساحلوں پر ڈیرے ڈالتے ہیں اور گرمیوں میں اندرون ملک منتقل ہو جاتے ہیں۔ ماہی گیری بھی بہت سے افراد کا پیشہ ہے جو شارک پکڑنے میں بڑے ماہر ہیں۔ جنبہ کا دوسرا گروہ جو مغربی گروہ کہلاتا ہے ان میں سے بعض لوگوں کی کچھ نہ کچھ املاک بھی ہیں۔ قبیلے کا سردار جاسر محمود عز میں جو قبیلے کا دار الحکومت سمجھا جاتا ہے کچھ اراضی کا مالک ہے۔ اس گروہ کی دل پسند جائے سکونت سلسلہ کوہ اور شہراوم کی نواحی وادیاں کوہستان و روع کے مشرق میں واقع ہیں۔ جنبہ کا تعلق غافر فریق سے ہے۔ یہ لوگ وہبہ کے خلاف ہیں۔ دروع کے حلیف ہیں۔ اگرچہ اب ان قبائل کی باہمی عداوت پہلے جیسی شدید نہیں رہی۔

مرسلہ: عرفان ارشد۔ جہلم

ساز و سامان سے آراستہ تھا۔ جدید طرز کا بیڑ، سائینڈ میں ڈیک، محلی صوف، اور قیمتی فانوس لائٹ۔ نہایت سحر انگیز ماحول تھا جو کہ دعوتِ عیش دے رہا تھا۔ حسنی آنکھیں پھاڑے کمرے کو دیکھے جا رہی تھی۔ شوکت نے ایک جھٹکے کے ساتھ اس کے پچھلے بدن کو اپنی طرف گھسیٹا اور دروازے کو زور سے بند کر کے چھٹی لگا دی۔ حسنی وحشی ہرنی کی طرح اچھلی اور لرزتی کپکپاتی سہمی سہمی سی دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ بری طرز، خائف تھی۔ اس کی حالت زار پر شوکت نے ایک تہقید لگایا اور کہا۔ ”تم تو خوف زدہ ہو گئی ہو۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے تو بالکل ٹھیک ٹھاک تھیں۔ چلو تمہاری دل بستگی اور ماحول کو خدگھگوار بنانے کے لیے کچھ ہنستے ہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے ڈب ڈب کا شن آن کر دیا۔ ہوا کے دوش پر خوب صورت گیت کا ارتعاش تھر تھرانے لگا۔

یہ پرتوں کے دائرے یہ شام کا دھواں ایسے میں کیوں نہ چھینڑیں دلوں کی داستاں یہ روپ رنگ یہ پھین چکتے چاند سا بدن برا نہ ماو تم اگر تو چوم لوں کرن کرن کہ آج حوصلوں میں ہیں بلا کی گرمیاں یہ پرتوں کے دائرے یہ شام کا دھواں جیسے ہی نغمہ فضا میں بکھرا اور گیت کے بول سماعت سے ٹکرائے۔ پل ہی پل میں حسنی کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا کہ شوکت اسے یہاں کیوں لے کر آیا ہے۔ خواب گاہ کی مدہوش کن فضا میں شوکت دل میں خواہشوں اور شوق کا طوفان لیے آہستہ آہستہ حسنی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ حسنی کے قدموں میں جنبش ہوئی اور وہ پیچھے سرکتی سرکتی کمرے میں گئے قیمتی طلسمی پردے میں چھپنے لگی۔ اس وقت حسنی سہمی ہوئی فاختہ تھی تو شوکت ایک ماہر شکاری جو تاک کر نشانہ لگانا جانتا تھا۔ حسنی بے بس اور التحا آمیز نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ مدد کی طالب تھی لیکن یہاں اگر شوکت اس کا گلا بھی گھونٹ دیتا تو کسی کو پتا بھی نہیں چلتا۔ اس کے اور شوکت کے درمیان چند قدموں کا فاصلہ رہ گیا تھا کہ اچانک اس کا موبائل جینچ اٹھا۔ اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں ”ہیلو“ کہا اور پھر دوسری جانب سے آنے والی آوازیں کر کہا۔ ”تم..... تم..... کہاں ہو..... اچھا مجھے پتا بتاؤ۔ گھبرانا بالکل نہیں..... میں شوکت کو لے کر آ رہی ہوں..... تم اطمینان رکھو۔ آج میں انصر کو چھوڑوں گی نہیں۔ بس یہ سمجھ لو آج وہ میرے ہی ہاتھوں مارا جائے گا۔ بس ہم دونوں نکل رہے

ہیں۔“

حسنی کی طرف بڑھتے ہوئے شوکت کے قدم فوراً رک گئے۔ وہ حیرت اور تعجب سے حسنی کو دیکھنے لگا۔ دوران گفتگو جب حسنی نے اس کا نام لیا تو بری طرح چونکا۔ بڑھ کر پہلے ڈیک آف کیا اور پھر حسنی کی طرف استفسار نہ نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ حسنی نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور تھوک نگلتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں کہا۔ ”کوکب کا فون تھا۔“

شوکت کو زبردست شاک لگا۔ اس نے قدرے تیز آواز میں کہا۔ ”کون کوکب؟“

حسنی نے سر جھکا کر آہستہ سے کہا۔ ”جی آپ کی بہن کوکب۔“

شوکت اچھل پڑا۔ حیران کن لہجے میں دوسرا سوال داغ دیا۔ ”میری بہن..... میری بہن کوکب کا کیا تذکرہ ہے۔“

حسنی نے پنے ہونٹ کاٹتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا۔ ”شوکت صاحب جس طرح آپ اور میں ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح میرا بھائی انصر اور آپ کی بہن کوکب بھی دیوانگی کی حد تک ایک دوسرے کو پیار کرتے ہیں۔ ان دونوں کی پیار کہانی بھی ہماری طرح ہے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پہلی ہی نظر میں دل دے بیٹھے اور آج وہ بھی انصر کے ساتھ ڈیٹ پر ہے۔“

”کیا کہہ رہی ہو۔“ شوکت دہاڑا۔ اس کی آنکھوں میں خون کی چادر تپتی ہوئی تھی۔ آتش فشاں پھٹ کر شعلہ بن چکا تھا۔ حسنی جھگی جلی بنی کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں زمین پر مرکوز تھیں۔ اس نے لرزیدہ لہجے میں استدعا کی۔ ”تاخیر نہ کیجیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرا بھائی کوکب کی عصمت پامال کر ڈالے۔ خدارا جلاری کیجیے۔“

”ناممکن... ناممکن.....“ شوکت اتنی زور سے چیخا کہ گلے میں پھندا سا لگ گیا۔ حسنی نے فوراً جگ میں سے پانی انڈیل کر گلاس اس کے سامنے پیش کر دیا۔ شوکت نے گلاس چھین کر پوری قوت سے دیوار پر دے مارا۔ زوردار چھناکے کی آواز ہوئی اور شیشے کی کرچیاں تالین پر بکھر گئیں۔ وہ آگ بگولہ ہو رہا تھا۔ لہجے کی ملائمت اور شائستگی رخصت ہو چکی تھی۔ موقع اور وقت اس کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ وہ تو حسنی کو اپنی بانہوں میں بھر کر اپنی ہوس کو تسکین دینا چاہتا تھا

لیکن ہل ہی ہل میں صورت حال بدل چکی تھی۔ وہ ہذیبانی انداز میں غرایا۔ ”جلدی چلو، کہاں ہیں دونوں۔ آج میں انہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔“ لہجہ ایسا خونخوار اور خوف ناک تھا کہ حسنی کا ایک ایک تھرا اٹھا۔ وہ نہ صرف حسنی اور انصر کو گالیوں سے نوازا رہا تھا بلکہ اپنی چہیتی بہن کے لیے بھی ایسے گستاخانہ کلمات زبان سے نکال رہا تھا کہ حسنی نے اپنے ہاتھوں سے اپنے کان بند کر لیے۔

دروازہ کھول کر اس نے پوری قوت سے حسنی کو باہر کی جانب دھکیلا۔ حسنی منہ کے بل گرتے گرتے بچی۔ بڑی مشکل سے اس نے سنبھالا اور باہر کی طرف دوڑی اور کار کے قریب جا کر اپنی سانسیں درست کرنے لگی۔ دونوں چوکیدار حیرت زدہ سے اسے دیکھ رہے تھے۔ شوکت بھی اس کے پیچھے لپکا۔ دونوں وہاں سے کچھ ایسی عجلت سے نکلے کہ شوکت نے اپنے دونوں ملازمین کے سلام کا جواب بھی نہیں دیا۔ وہ دونوں تیر آ میز نگاہوں سے جاتی ہوئی کار کو دیکھتے رہے۔ ایک چوکیدار نے ٹھنڈی گہری سانس لی اور کہا۔

”اس قسائی کی چھری سے یہ بکری کیسے بچ گئی۔“

دوسرے نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا۔ ”ایسا لگتا ہے آج شکاری خود ہی شکار ہو گیا۔ لڑکی ہوشیار لگتی ہے۔“

☆.....☆

شوکت جنونی انداز میں کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ حسنی خوفزدہ سی بیٹھی تھی۔ اس وقت شوکت کی ڈرائیونگ دیکھ کر اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی بڑا ایکسیڈنٹ ہونے والا ہے اور اس کا اور شوکت کا وقت پورا ہو چکا ہے۔

باہر ہوا کے جھونکے سائیں سائیں کر رہے تھے۔ موسم سرد ہو چکا تھا لیکن شوکت کا مزاج اور گاڑی کی رفتار دونوں گرم اور تیز تھے۔ اس نے ہونٹ چباتے ہوئے کرخت اور تیز لہجے میں کہا۔ ”تم دو نکلے کے لوگوں کو منہ لگانا ہی غضب ہو جاتا ہے۔ اپنی اوقات بھول کر اونچے اونچے خواب دیکھنے لگتے ہو۔ انسان کی سوچ اس کی حیثیت کے مطابق ہونا چاہیے۔“

حسنی نے خشکی اور خون آلود نگاہوں سے اسے گھورا اور ایک گہری سانس خارج کی۔ اس وقت وہ شوکت کے ہر کڑوے بول کو شربت سمجھ کر پی رہی تھی۔ گاڑی اب ایسے علاقے سے گزر رہی تھی جہاں رات میں بھی دن کا سماں ہوتا ہے۔ روشنی و نور کا سمندر تھا۔ رات کے بارہ بج رہے تھے لیکن لوگوں کی سرگشتی اپنے عروج پر تھی۔ پیٹرول پولیس پر

لبی گہری آسودہ سانس لی۔ دل مطمئن اور خوش تھا کہ بھکتے قدم اور بھکتے جذبات جلد ہوش میں آگئے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو..... آگے کا سوچ کر ہی وہ کانپ گئی۔ پھر سیدھا میرے گھر کے دروازے پر آرکی۔

☆.....☆

اچانک کسی نے زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا اور میرا دل بھی یکبارگی زور سے دھڑکا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ انصر اور اس کی والدہ میرے دروازے پر آگئے ہیں اور اب مجھ سے پوچھ گچھ شروع ہو جائے گی اور پھر..... امی اور حارث بھائی بھی نیند سے بیدار ہو جائیں گے اور مجھے سب کچھ بتانا پڑے گا۔ اف میرے اللہ۔ تو نے مجھے کس امتحان میں ڈال دیا ہے۔ اس بے وقوف کی وجہ سے سب کس قدر پریشان ہوں گے۔ ڈرتے ڈرتے کپکپاتے ہاتھوں سے میں نے دروازہ کھولا تو وہاں انصر کی بجائے حسنی کھڑی تھی۔ میں پتھر کی مورت بنی اسے حیران پریشان نظروں سے نکلے جا رہی تھی اور وہ شرمسار بدحواسی خجالت آمیز نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان اعصاب شکن خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ طرح طرح کے اندیشے زہر۔ بے سانیوں کی طرح دماغ میں پھنکار رہے تھے۔ بدقت تمام میں نے تھر تھراتے لبوں سے پکارا۔ ”حسنی تم۔“ میری زبان سے اپنا نام سنتے ہی وہ میرے کندھے پر سر رکھ کر بلک بلک کر رو پڑی اور گلوگیر آواز میں کہا۔

”تمہاری قدر و قیمت کا احساس آج مجھے ہوا ہے۔ تمہاری ہر بات سچ اور صحیح ثابت ہوئی۔ میرے پاس واقعی عقل نام کی چیز نہیں۔ اگر آج میں تم سے ملے بغیر چلی جاتی تو شاید کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتی۔ یا تو خودکشی کر لیتی یا وہ خبیث انسان ہی مجھے قتل کر کے کہیں دفن کر چکا ہوتا۔“

میں نے اپنی دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کانپتی آواز میں استفسار کیا۔ ”حسنی تم ٹھیک تو ہونا، میرا مطلب..... آئی مین..... اس نے کوئی دست درازی تو نہیں کی۔“

اس نے دوپٹے سے اپنی نم آنکھوں کو پونچھتے ہوئے آہستہ سے جواب دیا۔ ”نہیں میری بہن میں بالکل ویسی ہی پاک و صاف ہوں جیسے پہلے تھی۔ اس نے تو برباد کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔“

اس کا تقدس اور پاکیزگی محفوظ ہے۔ یہ سن کر نہ صرف مجھے خوشی ہوئی بلکہ سارا ذہنی انتشار کا نور ہو گیا۔ سارے

نظر پڑتے ہی اس نے شوکت کو ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور دروازہ کھول کر کار سے چھلانگ لگائی۔ اس کے چہرے پر چھائی بے بسی مسکینی اور عاجزی یکسر غائب ہو چکی تھی۔ آنکھیں شیرنی کی طرح بے خوف چمک رہی تھیں۔ ساری سرایتیگی دور ہو چکی تھی۔ تحفظ کا احساس ہوتے ہی اس نے کچھلی بدلی اور دنگ آواز میں کہا۔ ”مسٹر شوکت! آج جو کچھ بھی ہوا اس سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اگر میرے ہمدرد میرے چاہنے والے مجھے زندگی بھر بھی سمجھاتے تو میں انہیں غلط سمجھتی اور آپ کی ہم قدم بن کر اس سنہری دھوپ میں چلتی رہتی جو مجھے تاریک اور اندھیری کھائیوں کی جانب لے جا کر میرے تقدس اور عصمت کی دھجیاں اڑا دیتی۔ آج اگر عین وقت پر میری دوست کا فون نہ آیا ہوتا تو اس وقت میں کسی ریلوے ٹریک پر لیٹی اپنی موت کا انتظار کر رہی ہوتی۔“

شوکت نے غور سے حسنی کو دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ اس نے جو شاطرانہ جہاں چلی تھی اب بہ خوبی اس کی سمجھ میں آگئی تھی۔ اس کا چہرہ متغیر اور غضب ناک ہو گیا لیکن قہر درویش برجان درویش سارا غصہ اپنے آپ پر اتارتے ہوئے ٹھکست خوردہ لہجہ میں کہا۔ ”مکار ہو لو مڑی کی طرح۔“

حسنی نے اپنے بکھرے بالوں کو سمیٹتے ہوئے بیئر پن لگایا اور کہا۔ ”اگر اپنی حفاظت کے لیے او مڑی نہ بنتی تو آج تم جیسے درندے کی بربریت کا شکار ہو چکی ہوتی۔ تمہاری بہن پر جو الزام تراشی کی تھی اس میں ذرا برابر صداقت نہیں ہے۔ میرے بھائی نے آج تک آپ کی بہن کو دیکھا بھی نہیں ہے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے قطعاً اجنبی ہیں۔“

شوکت کی شعلہ بارنگاہیں حسنی پر ٹھہری ہوئی تھیں۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ اسے اٹھا کر کچا کھا جائے۔ اس کی نظر میں حسنی پختلے اور اہمندانہ طبقے کی ایک معمولی سی لڑکی تھی اور بہت آسانی سے اس کے دام میں آچکی تھی لیکن اس معمولی اور کمتر لڑکی نے اسے جو ڈرا ج دیا تھا اور اس کے اندر کے ہوس ناک مرد کو جو ٹھکست دی تھی اس پر وہ انکار سے چبارہا تھا۔ طیش میں آکر وہ پلٹا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور ایک جھلکے سے گاڑی اشارت کی اور یہ جاوہ جا۔ حسنی اس کی جانی ہوئی گاڑی کو دھتی رہی۔ اس کے لبوں پر ایک زخمی مسکراہٹ تھی لیکن آنکھوں میں فاتحانہ چمک تھی۔ ایک ٹیکسی ڈرائیور سے بات کرنے کے بعد وہ ٹیکسی میں بیٹھی اور ایک

شیطانی دسوں اور خدشات ایک سینڈ میں ختم ہو گئے۔

وہ سائت اور حواس باختہ سی ابھی تک دروازے میں ہی لٹک رہی تھی۔ اسے کھینچتے ہوئے میں اپنے کمرے میں لے کر آئی اور اپنے نرم گرم بیڈ پر نیکیے کے سہارے اسے بٹھایا تو مجھے احساس ہوا کہ اس کے ہاتھ پیر بالکل ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔ وہ خالی خالی نگاہوں سے مجھے دیکھے جا رہی تھی۔ اس سرد موسم میں بھی اس کی پیشانی عرق آلود ہو رہی تھی۔ میں سردیوں میں ہمیشہ کافی سے بھرا تھرماں اپنے کمرے میں رکھتی تھی۔ کیوں کہ مجھے مطالعے کا شوق جنون کی حد تک تھا اور دورانِ مطالعہ کافی پینے کا اپنا ہی مزہ ہوتا ہے۔ میں نے جلدی سے اسے کافی کا ایک گگ تھما دیا جسے پی کر اس کی جان میں جان آئی۔ گھبراہٹ کم ہوئی تو ہوش ٹھکانے آئے۔ کافی نے آپ حیات کا کام کیا۔ اس کے بدن میں زندگی کی رود وڑ گئی۔ میرے اصرار اور استفسار پر اس نے بلا کم و کاست ہر وہ بات دہرا دی جو پچھلے چند گھنٹوں میں اس پر گزری تھی۔ میں نے سب کچھ سننے کے بعد اس کی پشت تھپتھپاتے ہوئے اسے حوصلہ دیا اور کہا۔ ”حسنی بزرگوں سے سنتے آئے، ہیں جہاں ایک مرد اور عورت ہوتے ہیں، تنہائی اور سناٹا ہوتا ہے تو مرد و عورت کے ساتھ تیسرا شیطان ہوتا ہے۔ تم آج اس شیطان کو شکست دے کر آئی ہو۔ حسنی نے ڈبڈبائی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور زار و قطار روتے ہوئے نیم مردہ آواز میں کہا۔ ”میں اپنے سابقہ رویے کی وجہ سے تم سے بہت شرمندہ ہوں۔ خدا را مجھے معاف کر دینا۔ پتا نہیں اس نے کیا جادو کر دیا تھا کہ میں نے آگے پیچھے کچھ نہ سوچا۔ خاندان اور ماں باپ کی عزت و ناموس کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ اگر بد وقت، تمہاری کال اور صحیح سوچ اور عقل نہ آتی تو اس کے آگے بولنے کے لیے شاید اس کے پاس الفاظ ہی ختم ہو گئے تھے۔ آنسوؤں سے سارا چہرہ تر ہو رہا تھا۔ بدقت تمام میں نے اسے غاموش کر دیا اور اس کی توجہ وال کلاک کی جانب مبذول کروائی رات کا تقریباً ڈیڑھ بج چکا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑی۔ معاً کسی نے دروازے پر زور دار دستک دی۔ ہم دونوں نے بیک وقت ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا خوف کے مارے حسنی کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ اس نے سرگوشیاں لہجے میں کہا۔ ”یقیناً انصر ہوگا۔“

میں نے محبت اور گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دبایا اور آہستہ سے کہا۔ ”پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں نمٹ لوں گی۔ آؤ میرے ساتھ۔“ دروازے پر حسنی کی والدہ اور

انصر تھے۔ دونوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ مجھ پر اور حسنی پر نظر پڑتے ہی دونوں ایک ساتھ برس پڑے۔ شور و غل کی آواز پر امی اور حارث بھائی بھی جاگ گئے تھے۔ اب ان کی صلواتیں بھی مجھ پر پڑ رہی تھیں۔ میں نے بمشکل صورت حال کو قابو میں کیا اور سب سے یہ کہہ کر معافی مانگی کہ کافی عرصے سے حسنی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اس لیے آج رات اپنے پاس روک لیا تھا۔ بس غلطی یہ تھی کہ چونکہ موبائل میں بیلنس نہیں تھا اس لیے اطلاع نہیں دے سکی۔ انصر نے فوراً شکایت کی۔ میں تو آپ کے موبائل پر کافی دیر سے کال کر رہا ہوں۔ آپ اٹھائی نہیں رہی تھیں۔ میں نے فوراً اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے جلدی سے کہا۔ ”بس بھئی ہو گئی غلطی۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔“ پھر میں نے حسنی کی والدہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”خالہ میں اور امی عنقریب آپ کے پاس ایک ضروری کام سے آنے والے ہیں۔“

حسنی کو دیکھنے کے بعد ان کی فکر و پریشانی دور ہو چکی تھی۔ چہرے سے اطمینان اور خوشی عیاں تھی۔ انہوں نے نہایت خوش دلی سے جواب دیا۔ ”ضرور آؤ تمہارا اپنا گھر ہے۔ شادی کے بعد تو تم نے آنا ہی بند کر دیا۔“ میں نے حارث بھائی کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور مسکرا کر کہا۔ ”اس بار تو آپ سے ایک قیمتی چیز مانگنی ہے سوالی بن کر آ رہے ہیں۔“

حسنی نے میری ڈھکی چھپی باتوں کو فوراً تاڑ لیا۔ اس کا چہرہ گلابی ہو رہا تھا۔

☆.....☆

آج حسنی میری بھالی ہے۔ یہ راز ہم دونوں کے علاوہ کسی کو نہیں معلوم کہ اس رات حسنی کہاں گئی تھی، کس کے ساتھ گئی تھی اور کس طرح وہاں سے نکلی۔ آپ لوگوں کے ساتھ اس لیے شیئر کر رہی ہوں کہ اس دنیا میں قدم قدم پر شوکت جیسے بھیڑیے ہیں۔ ہمیں آنکھیں کھلی رکھ کر ایسے درندوں سے ان معصوم کلیوں کو بچانا ہے۔ انہیں تحفظ دینا ہے۔ انہیں عقل و شعور اور آگاہی دے کر یہ سمجھانا ہے کہ چوکنارہ کر اپنے گرد و پیش ہونے والی آہٹوں کو پہچانیں۔ نیک دید اور اچھے برے میں تمیز کریں۔ کاش میری یہ خواہشات اور دعائیں بارگاہِ الہی میں شرف قبولیت پا جائیں۔





خانہ بدوش

جناب ایڈیٹر صاحب
السلام علیکم

ایک عجیب و غریب واقعہ نظر نواز ہوا اور میں نے اسے حرف بہ
حرف لکھ لیا۔ آپ خود اندازہ کریں کہ اس لڑکی کی زندگی کس
درجے پر آکھڑی ہوئی ہے۔
انور زکی
(کراچی)

قسم کے اسٹورز میں کبھی نہیں جاتا۔ کیوں کہ میری جیب ہی
اجازت نہیں دیتی۔

بہر حال میں نے اس لڑکی کو پرفومز والے حصے میں
سے نکلتے ہوئے دیکھا۔ اس کے پاس ایک ٹرائی تھی جس میں
دنیا بھر کے سامان رکھے ہوئے تھے۔

ہائے! یہ پیسا بھی کیا چیز ہے جو ہر قسم کی خریداری کا
شوق ولا دیتا ہے۔ اس لڑکی نے ذرا سی دیر میں ہزاروں کا
سامان خرید لیا ہوگا اور ایک میں تھا جو صرف شیونگ کریم لینے
آیا ہوا تھا۔

وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی۔

لڑکیاں تو عام طور پر خوب صورت ہی ہوتی ہیں۔
خاص طور پر وہ جو حاصل نہ ہو سکیں اور جو حاصل ہو جاتی ہیں
کچھ دنوں کے بعد ان کی خوب صورتی ختم ہو جاتی ہے پھر وہ
صرف بیویاں رہ جاتی ہیں۔ بہر حال میں نے اسے اس
وقت دیکھا جب بس شیونگ کریم لینے ایک بڑے اسٹور میں
داخل ہوا۔ اس قسم کی چیزیں میں عام طور پر محلے کی دکانوں
سے ہی لے لیا کرتا ہوں لیکن اس دن نہ جانے کون سی ترنگ
آئی کہ میں ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور میں داخل ہو گیا۔ میں اس

فروری 2015ء

253

ماہنامہ سرگزشت

Copied From Web

نہیں تھی۔ اس لیے مجبوراً مجھے آگے بیٹھنا پڑ گیا۔
اب کیا اس سے خاک گفتگو ہوتی۔ بہر حال اس نے
اتنا ضرور بتایا کہ اس کا نام سارا تھا اور وہ ڈیفنس کالج میں
پڑھتی تھی۔ اس کے پاپا کوئی بزنس میں تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔
جب کہ میں نے بھی اپنے بارے میں یہ بتایا کہ میرا نام انور
ہے اور میرا اپنا بزنس ہے۔ (حالانکہ میں ایک فرم میں
ملازمت کر رہا تھا)۔

میرا خیال تھا کہ وہ کم بخت ڈیفنس کے شروع میں ہی
رہتی ہوگی لیکن اس کا مکان خدا کی پناہ۔ بالکل ساحل کے
پاس تھا۔ بہر حال ٹیکسی ایک شاندار سے مکان کے پاس آ کر
رک گئی۔ اس نے میرا شکر یہ ادا کیا۔ اپنا سامان سمیٹا اور اندر
چلی گئی۔

”صاحب اب کدھر جانا ہے؟“ ڈرائیور نے پوچھا۔
”اس علاقے کی جو مارکیٹ ہے نا وہاں اتار دو۔“
میں نے کہا۔

”صاحب آپ تو بولا تھا کہ ڈیفنس فیزو جانا ہے؟“
”نہیں جانا ہے فیزو مارکیٹ میں ایک کام ہے۔“
مارکیٹ پہنچ کر میں نے جب کرایا پوچھا تو اس نے
سات سو بتایا۔

”سات سو.....!“ میری توجان ہی نکل گئی۔ ”سات
سو تو بہت ہیں۔“

آپ یہ تو دیکھو صاحب کہ میڈم کیسے کیسے راستے
سے لائی تھی۔ اگر ہم کو بولا ہوتا تو میں مارٹ کٹ لے آتا۔
”چلو تم چھ سو دے دو۔“

اپنے آپ کو دل ہی دل میں برا بھلا کہتے ہوئے میں
نے چھ سو نکال کر اس کے حوالے کیے اور وہاں سے کوچ پکڑ
کر صدر آ گیا اور وہاں سے دوسری بس پکڑ کر ناظم آباد اور
وہاں سے اپنے فلیٹ۔

میں گیا تھا ساٹھ روپے کی شیونگ کریم لینے اور ایک
ہزار خرچ کر کے ٹھنڈے ٹھنڈے واپس آ گیا تھا۔ پتا نہیں
کس قسم کی بدبختی میرے سر پر سوار ہو گئی تھی۔

اس کے بارے میں صرف اتنا معلوم تھا کہ اس کا نام
سارا ہے۔ وہ ایک بڑے مکان میں رہتی ہے۔ اس کا باپ
ایک پیسے والا آدمی ہے جب کہ میں ایک مٹھلو انسان تھا۔
پھر میں اس سے دوبارہ کیسے مل سکتا تھا۔

اس کے شاندار مکان میں جانے کی ہمت نہیں تھی۔
وہاں جاتا تو کیا بہانہ لے کر جاتا۔ میرا اس سے واسطہ ہی کیا

میرے قریب سے گزرتے ہوئے اس لڑکی نے ایک
نظر میری طرف دیکھا پھر ٹرائی دکھلیتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔
ظاہر ہے میرا اس سے تعلق ہی کیا تھا۔

میں نے اپنی پسند کی شیونگ کریم اٹھائی اور کاؤنٹر پر
آ گیا۔ کاؤنٹر پر بیٹھے شخص نے اس طرح میری طرف دیکھا
جیسے میرے حال بہترس کھا رہا ہو کہ بے چارہ صرف شیونگ
کریم کے لیے آیا تھا۔ میں نے قیمت ادا کی اور باہر آ گیا۔
وہ لڑکی اپنی ٹرائی کے ساتھ باہر کھڑی تھی اور کچھ مضطرب ہو
کر ادھر ادھر دیکھ رہی تھی جیسے اسے کسی کا انتظار ہو۔ میں اس
سے کچھ فاصلے پر جا کر کھڑا ہو گیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اس لڑکی
کی جھنجلاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر اس نے مجھے دیکھا اور
زیر لب کچھ بول کر رہ گئی۔

مجھے نہ جانے کیا سوچھی کہ میں اس کے پاس پہنچ گیا۔
میں نے شاید پہلی بار ایسی ہمت کی ہوگی۔ ”معاف کیجیے گا
آپ کچھ پریشان سی معلوم ہو رہی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔
”اوہ..... وہ میرا ڈرائیور نہ جانے کہاں چلا گیا
ہے۔“ اس نے کہا۔ ”میں فون بھی کر رہی ہوں لیکن فون
ریسیو نہیں کر رہا۔“

”اوہ..... ہو سکتا ہے کسی پر اہلیم میں ہو۔“
”پتا نہیں۔“ اس نے اپنے شانے اچکائے۔ پھر
اچانک ہی مجھ سے پوچھ بیٹھی، ”ایکسکیوز می! آپ کے پاس
تو گاڑی ہوگی۔“

”میرے پاس..... جی! جی..... جی ہاں، گاڑی ہے۔“
میرے پاس۔ لیکن آج میں نہیں لاسکا ہوں۔ آج ٹیکسی پر
جاؤں گا۔“

”آپ رہتے کہاں ہو۔“
”ڈیفنس۔“ میں نے بتایا۔ ”اور آپ؟“
”میں بھی ڈیفنس میں رہتی ہوں۔“ اس نے خوش ہو
کر بتایا۔ ”خیابان شہباز۔ اگر آپ برا نہ مانیں تو مجھے
ڈراپ کر دیجیے گا۔“

میری توجان ہی نکل گئی۔ کیوں کہ میں بالکل ہی
مخالف سمت یعنی ناظم آباد کی طرف رہتا تھا۔ لیکن اس لڑکی
سے جھوٹ بول چڑا تھا۔ اس لیے ایک ٹیکسی کرنی پڑی۔
میرا خیال تھا کہ کم از کم اتنا تو ہوگا کہ ہم دونوں پھپھلی
سیٹ پر بیٹھ جائیں گے۔ لیکن اس نے بڑی پھرتی اور
ہوشیاری کے ساتھ اپنا سارا سامان سیٹ پر ایک طرف رکھ
ویا اور خود برابر میں بیٹھ گئی اب پھپھلی طرف بیٹھنے کی جگہ ہی

تھا لیکن اتنا ضرور ہے کہ میں اسے بھلا نہیں سکتا تھا۔

کئی دن گزر گئے۔ ایک دن میں اپنے دوست سے ملنے ناظم آباد بڑے میدان کی طرف گیا (کراچی کے رہنے والے اس لوکیشن سے اچھی طرح واقف ہیں)۔ یہ ادسط درجے کی اچھی خاصی آبادی ہے۔ کسی زمانے میں کراچی میں سرگھر ٹرین چلا کرتی تھی۔ وہ ٹرین میرا لائنڈمی سے چل کر مختلف اسٹیشنوں سے ہوتی ہوئی لیاقت آباد اور ناظم آباد کے درمیان سے گزرا کرتی۔ وہ سروس عرصے سے ہوا ختم ہو چکی ہے لیکن ریل کی پٹریاں ابھی تک باقی ہیں جن کے دونوں جانب کچروں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں اور خانہ بدوش مختلف شہروں سے آکر وہاں ڈیرہ ڈالا کرتے ہیں۔ میرے دوست کا مکان ریلوے پٹریوں کی دوسری طرف، ناظم آباد کے علاقے میں تھا۔ جب کہ ایک طرف پاپوش نگر کا علاقہ ہے۔ میں پٹریوں کو عبور کرتا ہوا دوسری طرف جا رہا تھا کہ میں نے خانہ بدوشوں کی ایک بستی دیکھی۔ یہ بستی خالی میدان میں بسائی گئی تھی۔ ان کی بستیوں کو دیکھنا بھی ایک دل چسپ عمل ہوتا ہے۔ رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس عورتیں، مختلف کام کرنی ہوئی نظر آتی ہیں کوئی ریلین چکھے بنا رہی ہے، کوئی بچوں کی ڈگدگی بنا رہی ہے۔ یہ شاید ان کا صدیوں پرانا مشغلہ اور کاروبار ہے۔ ایک طرف بچے میلے کپیلے لباسوں میں کھیل رہے ہیں۔ ایک طرف ان کے مرد بیٹھے حقے پی رہے ہیں۔ غرض یہ کہ بہت عجیب زندگی ہوتی ہے ان کی اور انہی کے درمیان مجھے وہ لڑکی دکھائی دے گئی۔

جی ہاں وہی لڑکی جو مجھے ایک ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں ملی تھی۔ جس نے بہت سا سامان خریدا تھا۔ جس نے مجھ سے لفٹ مانگی تھی۔ جس نے اپنا نام سارا بتایا تھا۔ جو ڈیفنس کالج میں پڑھتی تھی۔ بس کا گھر بہت شاندار تھا۔ وہی لڑکی ان خانہ بدوشوں کے درمیان تھی۔

لیکن یہ تو انہیں سکتا تھا۔ دونوں کی صورتیں ایک جیسی تھیں اور یہ حیرت انگیز مماثلت تھی۔ ایسے کم ہی دیکھے ہوں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ خانہ بدوش لڑکی وہ تو نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر بھی وہ اس جیسی تھی۔

میں اس کی طرف دیکھتا ہی رہا۔ اس نے بھی میری دل چسپی محسوس کر لی تھی۔ ایک لمحے کے لیے مجھے ایسا لگا جیسے وہ بھی مجھے پہچان رہی ہو۔ میں نے اس کی آنکھوں میں شناسائی کی جھلک دیکھی تھی۔

پھر کیا ہوا۔ وہ لڑکی بہت تیزی سے میرے پاس آگئی۔ ”کیا بات ہے رے۔“ اس نے غصے سے پوچھا۔ اس کا لہجہ ہی خانہ بدوشوں جیسا تھا۔ اکڑا اکڑا سا۔ ”یہ تو اتنی دیر سے مجھے کا دیکھے جا رہا ہے؟“

”معاف کرنا۔“ میں جلدی سے گڑبڑا کر بولا۔ ”میں نے اس شہر میں تم جیسی ایک لڑکی دیکھی تھی۔ اس لیے حیران ہو کر تمہیں دیکھ رہا تھا۔ تم دونوں بالکل ایک جیسی ہو۔“

”ارے جاتا ہے یا بلاؤں بابا کو۔“ اس نے کہا۔ ”اچھا بہانہ لے کر آیا ہے۔ ہجارتوں ایک جیسی صورت کے ہووے ہیں تو پھر۔ اس کا کیا مطلب؟“

ظاہر ہے کہ یہ وہ لڑکی نہیں تھی۔ اس کا لہجہ یہ بتا رہا تھا۔ صرف اتنا تھا کہ یہ اس کی ہم شکل تھی لیکن ایسی زبردست مماثلت کہ اگر یہ اپنی زبان نہیں کھولتی تو میں اس کو وہی لڑکی سمجھتا رہتا۔

میں نے جلدی جلدی اس سے معذرت کی اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ اگر اس نے اپنے باپ کو آواز دے کر بلا لیا تو پورا خانہ بدوش قبیلہ مجھ پر ٹوٹ پڑے گا۔

میں نے بہت آگے جا کر سڑک دیکھا تو وہ لڑکی اسی جگہ کھڑی ہوئی میری ہی طرف دیکھ رہی تھی۔ نہ جانے کیوں میرا دل چاہا کہ میں اس کے پاس واپس جاؤں۔ اس سے کہوں اے لڑکی جھوٹ مت بول تو وہی ہے۔ میری آنکھوں کو اتنا بھی دھوکا نہیں ہو سکتا۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ تو وہی ہے۔ اب تو خانہ بدوشوں کے ساتھ کیسے آگئی ہے۔ میں یہ نہیں جانتا۔

بہر حال وہ لڑکی اپنی جھوپڑی کی طرف جا چکی تھی۔ اس لیے میں بھی واپس آ گیا۔

میں اپنے دوست کے پاس بھی نہیں گیا۔ حالانکہ اس کے پاس جانے کا ارادہ لے کر نکلا تھا لیکن اس لڑکی نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔

مشابہت میں نے صرف کہانوں میں پڑھی تھی۔ یہاں میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا تھا۔ عقل تو یہ ماننے کو تیار ہی نہیں تھی کہ دونوں ایک ہو سکتی ہیں۔ لیکن دل کہہ رہا تھا کہ دونوں ایک ہیں۔ کیسے ہیں اس کا فی الحال کوئی جواب نہیں تھا۔

میں نے پھر فیصلہ کر لیا کہ اس بھید سے پردہ اٹھانے کا ایک طریقہ ہے کہ میں اس لڑکی سارا کے گھر پہنچ جاؤں کسی

دکھائی دے رہی تھی۔

وہ مجھے اپنے خیمے میں لے آئی۔ وہاں موجود خانہ بدوش مرد اور عورتیں مجھے بہت حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ میں بھی کچھ عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ شرمندگی سی ہو رہی تھی۔ یہ کن پکڑوں میں پھنس گیا تھا۔ میرا کیا واسطہ تھا ان لوگوں سے۔

اس کے خیمے میں گندے کپڑوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ایسی بدبو تھی کہ جس سے دماغ کی چولیس ہل کر رہ گئی تھیں۔ ایک طرف گندے سندے برتنوں کا ڈھیر تھا۔ ایک طرف ٹین کا ایک بڑا سا صندوق تھا اور ایک چارپائی تھی جس پر ایک بوڑھا بیٹھا تھا۔

اس نے لنگی اور بنیان پہن رکھا تھا۔ بوڑھا ہونے کے باوجود وہ ایک مضبوط جسم کا آدمی تھا۔ بڑی بڑی مونچھیں اور سرخ سرخ آنکھوں نے اسے خاصا ہیبت ناک بنا دیا تھا۔ وہ بہت حیران ہو کر میری طرف دیکھ رہا تھا۔

”بابا!“ اس لڑکی نے اسے مخاطب کیا۔ ”یہ وہی بابو ہے جس نے آپ کو بتایا تھا۔“
”اچھا اچھا۔“ بوڑھا چارپائی پر سنبھل کر بیٹھ گیا۔
”آؤ بیٹا، بیٹھو۔“

میں اس کے لہجے کی نرمی اور شفقت کو محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے جس انداز سے مجھے بیٹھا کہہ کر مخاطب کیا تھا اس سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ ول کا اچھا آدمی ہے۔ میں اس کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ وہ لڑکی سامنے ایک موٹا ٹھکانا کھینچ کر بیٹھ گئی تھی۔

”بابا! یہ بابو ہم کو یہاں دیکھ کر بہت حیران ہو رہا ہے۔“ لڑکی نے کہا۔ ”اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میرا وہ روپ سچ ہے یا یہ روپ سچ ہے۔“

”اس کے دونوں روپ ہی سچ ہیں بیٹا۔“ بوڑھے نے کہا۔ ”یہ پارو وہاں بھی ہے اور یہاں بھی ہے۔ وہاں اس کا نام سارا ہے اور یہاں اس کا نام پارو ہے۔“

میرے خدا تو پھر یہ وہی لڑکی تھی لیکن اگر یہ خانہ بدوش تھی تو پھر اس بڑے گھر میں اتنی ماڈرن بن کر کیا کر رہی تھی۔ پتا نہیں کیا بھید تھا۔

”بابو! یہ بھی اچھا ہوا کہ یہ پارو تمہیں اپنے ساتھ لے آئی ہے۔“ بوڑھے نے کہا۔ ”اب تم اس کو سمجھا سکتے ہو شاید تمہاری بات اس کی سمجھ میں آجائے۔“

”مجھے کچھ نہیں سمجھنا بابا۔“ سارا پارو نے جلدی سے

بہانے اس سے جا کر ملوں۔ اس کو بتاؤں کہ اس شہر میں ایک اس کی ہم شکل بھی ہے۔ بالکل اسی جیسی۔ اگر سارا چاہے تو میرے ساتھ چلا کر اس لڑکی کو دیکھ لے۔ لیکن سارا کے پاس جانے کا بھی کوئی جواز نہیں تھا۔ میں اس سے کیا کہتا کہ میں اس سے کیوں بلنا چاہتا ہوں۔ بس ایک پارہی تو میں نے اسے لفٹ دی تھی۔ اس کے علاوہ تو اس سے اور کوئی تعلق نہیں تھا۔

میں ذہنی کوفت میں مبتلا ہو کر رہ گیا۔ کیا تھا یہ سب۔ اگر کوئی عام سی نمائندگی ہوتی تو شاید میں ان دونوں کو بھول بھی جاتا لیکن یہ تو ایسا ہی تھا جیسے شہر کی ماڈرن لڑکی نے یوں ہی تفریحاً خانہ بدوش لڑکی کا لباس پہن لیا ہو۔

بہر حال کئی دنوں کی بے چینی کے بعد جب مجھ سے برداشت نہیں ہو تو ایک بار پھر وہیں پہنچ گیا۔ جہاں خانہ بدوشوں نے پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔

وہ پڑاؤ موجود تھا اور وہ لڑکی بھی موجود تھی۔ وہ اس وقت ریلوے لائن کے پاس کھڑی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ پھر میرے پاس آ گئی۔ ”اے تو وہی ہے نا جو اس دن میرا و ماگ کر رہا تھا؟“

”دیکھو مجھے غلط مت سمجھو۔“ میں نے کہا۔ ”میں تو پاگل ہونے لگا ہوں۔ میں نے جس لڑکی کو دیکھا ہے وہ بالکل تمہاری طرح ہے۔ بلکہ تم ہی ہو۔ اس لیے تو میں حیران ہو کر پھر آ گیا ہوں۔“

”تو پھر یہ سن لے بابو کہ میں وہی ہوں۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔

”کیا!“ میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔
”تم وہی ہو۔ تم یہ خود کہہ رہی ہو۔“

”ہاں میں اس لیے کہہ رہی ہوں مسٹر کہ تم میرے پیچھے ہی پڑ گئے ہو۔“ اس نے کہا۔ اب اس کا لہجہ ویسا ہی تھا جیسا شہر کی لڑکیوں کا ہوتا ہے صاف ستھرا۔

”میرے خدا میں پاگل ہو جاؤں گا۔ کیا ہے یہ سب! اگر تم وہی ہو تو پھر یہ خانہ بدوش قبیلہ۔“

”یہ میرا تپا قبیلہ ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”آؤ میرے ساتھ میں تمہیں بابا سے ملوادوں۔ پھر تمہاری سمجھ میں آجائے گا۔“

اب تو اس بھید کو معلوم کرنا ہی تھا۔ اس لیے میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ میں کسی خانہ بدوش لڑکی کے ساتھ اس کے خیمے کی طرف جا رہا تھا۔ بالکل فلمی سچویشن

کہا۔ ”سو بارت کی ایک بات ہے کہ میں تمہیں چھوڑ نہیں سکتی۔“

”دیکھیں میری سمجھ میں ہی نہیں آرہا ہے کہ یہ سب کیا ہے۔“ میں اس بوڑھے سے مخاطب ہوا۔ ”اگر یہ سارا ہے تو پارو کیسے ہوگئی۔ اگر پارو ہے تو پھر سارا کیسے ہوگئی۔“

”بیٹا! میں تمہیں بتاتا ہوں۔“ بوڑھے نے ایک گہری سانس لی۔ ”تم یہ کہانی سن لو گے تو تمہیں سب پتا چل جائے گا۔“

بوڑھے نے اپنی گردن جھکالی جیسے گزرے دنوں کو یاد کر رہا ہوں۔ پھر اس نے حقے کے دو چار گہرے گہرے کس لگائے اور دھواں بکھیرتا ہوا آہستہ آہستہ بتانے لگا۔

☆.....☆

یہ بہت پہلے کی بات ہے بابو، تقریباً اٹھارہ سال پہلے۔ ہم خانہ بدوش لوگ ہیں۔ ہمارا کنبہ بہت بڑا ہے۔ ہماری برادری کے کئی حصے ہیں اور ہر حصے کا ایک سردار ہوا کرتا ہے۔

میں اپنے حصے کا سردار تھا اور آج تک ہوں۔ ہمارا کام پورے ملک میں گھوم پھر کر اپنے لیے روزی پیدا کرنا ہے۔ ہم ہاتھوں کے کاریگر ہوتے ہیں۔ ہم مسلمان بھی ہوتے ہیں اور ہندو بھی۔ ہم ہاتھوں سے بچوں کے لیے رنگین کھلونے بنا کر بیچتے ہیں۔

خیر تو اس زمانے میں ہم نے ملتان سے آگے ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ پڑاؤ کیا ہوا تھا۔ شام کا وقت تھا میں پٹریوں کے ساتھ ساتھ سیر کرتا ہوا جارم تھا کہ میں نے جھاڑیوں کے پیچھے سے کسی کے رونے کی آواز سنی۔ کسی بچے کی آواز تھی بابو۔ میں پریشان ہو کر جھاڑیوں کی طرف گیا اور وہاں مجھے ایک بچی دکھائی دے گئی۔ وہ زخمی ہو رہی تھی۔ میرے دل میں اس کے لیے محبت پیدا ہوگئی۔ میں اسے اٹھا کر اپنے پڑاؤ میں لے آیا۔ وہ بہت خوب صورت تھی بابو۔ بہت حسین۔ ایسی کوئی ہمارے خانہ بدوشوں میں نہیں ہوگی۔“

بوڑھا بولتے بولتے خاموش ہوا تو اس لڑکی نے بتانا شروع کیا۔ ”اب تھوڑی سی کہانی مجھ سے سن لو۔ میں اس وقت صرف چار سال کی تھی۔ چار سال کی کیا عمر ہوتی ہے لیکن مجھے اپنا گھر یاد تھا۔ اپنے ماں باپ کے نام یاد تھے۔ میرا دو سال کا بھوٹا بھائی تھا وہ بھی یاد تھا مجھے۔“

”کیا وہ بچی تم تھیں؟“ میں نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں وہ میں ہی تھی۔“ اس نے بتایا۔ ”میرے والدین بہت پیسے والے لوگ تھے۔ باپ کا نام ارشد سلطان تھا۔ جو مجھے اس وقت بھی یاد تھا اور ماں کا نام عابدہ تھا۔ چھوٹا بھائی اولیس تھا۔ ہم کراچی سے لاہور ٹرین کے ذریعے جا رہے تھے۔ ایک جگہ کسی وجہ سے ٹرین کی رفتار کم ہوگئی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ میں پورے ڈبے میں اچھلتی پھر رہی تھی۔ ریل کے سفر میں بڑا مزہ آرہا تھا کہ اچانک نہ جانے کس طرح میں ڈبے سے نکل کر باہر جاگری اور لڑھکتی ہوئی ایک بڑی سی جھاڑی کے پیچھے چلی گئی۔ بس مجھے اتنا ہی ہوش ہے۔ اس کے بعد کیا ہوا یہ میں نہیں جانتی۔“

”اس کے بعد یہ ہوا بیٹا کہ میں اسے اٹھا کر اپنے پڑاؤ میں لے آیا۔ تیرے ماں باپ نے ریل رکوا دی ہوگی۔ تجھے ہر جگہ تلاش کیا جا رہا ہوگا لیکن تو تو ایک جھاڑی کے پیچھے تھی اور بے ہوش ہوگئی تھی۔ اسی لیے تو آوازیں نہیں سن سکی اور نہ وہ تجھے دیکھ سکے۔“

”کیا تم نے اپنے طور پر تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی؟ میں نے بوڑھے سے پوچھا۔

”بہت کوشش کی بابو۔“ اس نے کہا۔ ”ہم غریب خانہ بدوش لوگ کہاں جاتے۔ کس کے پاس جاتے۔ لیکن ہم نے اس کے ماں باپ کا نام یاد رکھا اور اس کو اپنے سینے سے لگا کر اس کی پرورش کی۔ ہمارے پاس تھا کیا۔ سوائے پیار کے۔ تو وہ پیار ہم نے اس کے نام کر دیا۔“

”ہاں بابا اور ماما نے مجھے اتنا پیار دیا کہ میں بھول ہی گئی کہ میں کون ہوں کہاں سے آئی ہوں۔ میرے اصل گھر والے کون ہیں۔ میں ان ہی لوگوں کے درمیان پرورش پائی رہی۔“

”پھر ایسا ہوا بابو کہ ہمارا قبیلہ ایک بار کراچی آ گیا۔ یہ اب سے پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ یہ بھی میرے ساتھ تھی۔ اس کو یہ تو یاد نہیں تھا کہ اس کا مکان کہاں تھا، کس محلے میں تھا۔ لیکن مجھے اس کے ماں باپ کا نام یاد تھا۔ بس اسی نام سے میں انہیں تلاش کرتا رہا اور کہتے ہیں ناں کہ تلاش کرنے سے خدا بھی مل جاتا ہے۔ آخر ایک دن اس کے باپ کا پتا چل گیا۔ میں اس کے مکان پہنچ گیا۔ وہی مکان جو تم نے دیکھا ہوا ہے۔“

”تو کیا تمہارے ماں باپ پہلے سے اسی مکان میں رہتے تھے؟“ میں نے سارا یا پارو سے پوچھا۔

”نہیں وہ پہلے نار تھ نار تھ آباد میں رہتے تھے۔“ اس

حادثے نے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔
 ”اب بقیہ کہانی مجھ سے سن لیں۔“ سارا یا پارونے
 کہا۔ ”میرے لیے تو یہ بہت عجیب مرحلہ تھا۔ اچانک ہی پتا
 چلا تھا کہ میں نے جن کی آغوش میں پرورش پائی جنہوں نے
 مجھے سونے کا نوالہ کھلایا جو مجھ سے بے انتہا پیار کرتے تھے وہ
 میرے حقیقی والدین نہیں تھے۔ میرا گھر کوئی اور تھا۔ میرے
 ماں باپ کوئی اور تھے۔ یہ کیسی عجیب بات تھی۔“

”ظاہر ہے۔“ میں نے اپنی گردن ہلائی۔ ”میں
 تمہارے احساسات کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“
 ”بہر حال میرے ماں باپ نے مجھے سینے سے لگا
 لیا۔ کیوں کہ ایک عرصے کے بعد ان کی کھوئی ہوئی بیٹی ان
 کے پاس واپس آگئی تھی۔“

اتنا بتا کر وہ خاموش ہو گئی۔ میں اندازہ کر رہا تھا کہ
 اس کے ذہن میں کیسی آندھیاں چل رہی ہوں گی۔ وہ اپنے
 آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔

کچھ دیر بعد اس نے پھر بتانا شروع کیا۔ ”میرے
 ماں باپ نے میری تعلیم کا بندوبست کر دیا۔ میں ذہین تھی۔
 مجھ میں ایک جذبہ یہ بھی تھا کہ میں اپنے شہری والدین کی
 توقعات پر پوری اتروں۔ اس لیے میں نے خوب محنت کی
 اور پرائیوٹ میٹرک کر لیا۔“

”اس کے بعد تم ڈیفنس گریڈ کالج چلی گئیں۔“ میں
 نے کہا۔

”ہاں میں نے غلط نہیں کہا تھا۔“

”اور یہ سب کتنے دنوں کے مرحلے تھے۔“

”پانچ سال کے۔“ اس نے بتایا۔ ”میرے بابا مجھے
 پانچ سال پہلے میرے شہری والدین کے حوالے کر گئے
 تھے۔ ہوتا تو یہ چاہیے تھا کہ میں ان کے رنگ میں رنگ جاتی
 لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔ مجھے اپنے بابا اور اپنے قبیلے کے
 درمیان گزارے ہوئے دن ہمیشہ یاد رہے۔ میں انہیں کبھی
 نہیں بھلا سکی اور کیسے بھلاتی یہ میری احسان فراموشی ہوتی
 اگر میں ان کو بھول جاتی جنہوں نے میری پرورش کی تھی۔
 میرے اندازہ ہی رہے۔ وہی خانہ بدوش لڑکیوں جیسے۔ وہ تو
 میری فطرت میں شامل ہو چکا تھا۔ وہ کیسے ختم ہوتا اور یہی
 بات میرے گھروالوں کو بری لگ رہی تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ
 میں ان میں اینڈ جسٹ ہی نہیں ہو پارہی تھی اور ابھی تک نہیں
 ہو سکی ہوں۔“

اور اسی وقت اس خانہ بدوش سردار نے بولنا شروع

نے بتایا۔ ”یہ سب مجھے اس گھر میں جا کر معلوم ہوا ہے۔“
 ”بابو جی جب میں اس مکان کے گیٹ پر پہنچا تو وہاں
 چوکیدار کھڑا ہوا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”کس سے ملنا ہے۔“
 ”اکبر صاحب سے۔“ میں نے اس کے باپ کا نام بتایا۔
 چوکیدار اوپر سے نیچے تک مجھے دیکھنے لگا۔ ظاہر ہے
 اسے تعجب ہوا ہو گا کہ ایسے علیے کا خانہ بدوش صاحب سے
 کیوں ملنا چاہتا ہے۔

شاید وہ مجھے ملنے ہی نہیں دیتا لیکن اسی دوران
 میں اس کا باپ اندر سے گیٹ پر آگیا اس کا ڈرائیور گاڑی
 نکال رہا تھا۔ چوکیدار نے جب اسے میرے بارے میں بتایا
 تو وہ میرے پاس آگیا۔ ”کیا بات ہے کون ہو تم! مجھ سے
 کیوں ملنا چاہتے ہو؟“

”صاحب ایک بات بتائیں۔ کیا اب سے چندرہ
 سولہ سال پہلے کراچی سے لاہور جاتے ہوئے آپ لوگوں
 کے ساتھ کوئی حادثہ ہو گیا تھا؟“

”ہاں ہاں۔“ وہ مضطرب ہو گیا تھا۔ ”بہت بڑا
 حادثہ ہوا تھا۔ ہمارا بیٹی ہم سے ٹھنڈی تھی۔“

”آپ کی وہ بیٹی ہمارے پاس ہے صاحب۔“ میں
 نے کہا۔ ”اس کو اپنے سینے سے لگا کر پالا ہے اور اب آپ کی
 امانت آپ لوگوں کو واپس کرنے آیا ہوں۔“

”کیا کہہ رہے ہو! میری بیٹی تمہارے پاس ہے؟“
 اس کی بے چینی دیکھنے والی تھی۔

”جی صاحب۔“

”کہاں ہے وہ۔“ اس نے پوچھا۔

”ہماری خیمہ بستی میں۔“ میں نے بتایا۔ ”ہم اسے
 اپنے ساتھ لے کر آئے ہیں۔“

”چلو۔ ہمارے ساتھ چلو۔ کہاں ہے وہ۔ کہاں ہے
 تمہاری خیمہ بستی۔ ٹھہرو میں اس کی ماما کو بھی ساتھ لے لیتا
 ہوں۔ میرے خد یہ کتنی بڑی بات ہو رہی ہے۔ ہماری سارا
 مل گئی ہے۔ چلو۔“

”مختصر یہ ہے صاحب کہ ان دونوں نے اپنی بیٹی کو پہچان
 کر اسے سینے سے لگا لیا۔ بلکہ بلکہ کر روتے رہے۔ پھر میرا
 شکر یہ ادا کر کے اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ وہ مجھے بہت سی
 رقم بھی دے رہے تھے صاحب لیکن میں نے نہیں لی۔ کیوں
 کہ یہ تو اولاد کا سودا ہو جاتا اور پارو تو ہماری اولاد تھی
 صاحب۔“

کیا عجیب کہانی تھی اس لڑکی کی۔ ایک لمحے کے

جاؤں۔“

اس کے سوال کا میرے پاس تو کیا کسی کے پاس بھی کوئی جواب نہیں ہو سکتا تھا۔

”بابو۔“ بوڑھے نے میری طرف دیکھا۔ ”تم ہی اس کو سمجھاؤ۔ ہمارا دھیان چھوڑ دے۔ اپنے ماں باپ کے پاس پہنچ چکی ہے بس وہیں دل لگائے۔“

”نہیں بابا میں تمہیں نہیں چھوڑ سکتی۔“

”پاگل مت بن۔“ بوڑھا دکھ اور غصے سے بولا۔

”اپنے آپ کو سنبھال لے۔“

پھر میں بھی اسے سمجھانے لگا۔ میں نہیں جانتا کہ میرے سمجھانے کا اس پر کیا اثر ہوا ہوگا لیکن اس وقت وہ خاموش ہو گئی تھی۔

میں بھی کچھ دیر بیٹھ کر چلا آیا۔ وہ اچھی لڑکی تھی۔ میں نے اسے پسند کیا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ جس قسم کے حالات تھے۔ ان کا کیا ہو سکتا تھا۔ کئی دنوں تک میں اس کی طرف نہیں جاسکا۔ میرا مطلب ہے اس کی خیمہ بستی کی طرف۔ ویسے اس کی یاد آتی رہی تھی۔

بالآخر ایک دن جب برداشت نہیں ہوا تو میں خیمہ بستی پہنچ ہی گیا لیکن اب وہاں کچھ بھی نہیں۔ بنجارے اپنی بستی لپیٹ کر کسی طرف کو جا چکے تھے۔

میں ایک خاموشی کے عالم میں کھڑا ہی رہ گیا تھا۔ وہ لڑکی تو کسی خواب ہی کی طرح میری زندگی میں آئی اور خواب ہی کی طرح چلی بھی گئی تھی۔

کیا عجیب کہانی تھی اس کی۔ نہ جانے کیوں قدرت کبھی کبھی ایسے تماشے دکھاتی ہے۔ اب اس کے بھید وہی جانے۔

نہ جانے اس میں اس کی کیا مصلحت ہوگی۔ میں اس مکان کی طرف بھی نہیں جاسکتا تھا جو اس کے ماں باپ کا مکان تھا۔ نہیں معلوم۔ وہ وہاں واپس گئی یا خانہ بدوشوں کے ساتھ چلی گئی۔

بہر حال یہ ایک ایسی داستان ہے کہ اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود میں اس کے ٹرانس میں ہوں۔

اور میں جب بھی ریلوے پٹریوں کے ارد گرد کسی خیمہ بستی کو دیکھتا ہوں تو یہی گمان ہوتا ہے کہ شاید وہ ان میں ہی سے کسی میں ہو۔ لیکن کون جانے وہ کہاں ہوگی۔

”کیا۔“ ہم نے تو کراچی کی طرف آنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ پاگل ہماری محبت کو اپنے سینے سے لگائے رکھے۔ سب بھول جائے اور اپنے گھر والوں کے ساتھ ایک نئی زندگی شروع کر دے۔ لیکن یہ ایک دفعہ گھر سے چل کر ہماری بستی رحیم یار خان تک پہنچ گئی تھی۔“

”ہاں۔“ اس لڑکی نے بتایا۔ ”بابا اپنے قبیلے کو لے کر جب دو سال تک کراچی نہیں آیا تو میں خود اس کے پاس پہنچ گئی۔“

”تو جی بابو اب تم ہی اس کو سمجھاؤ کہ ہمارے پیچھے کیوں اپنا دماغ خراب کر رہی ہے۔ اللہ نے ہمیں ایک امانت دی تھی ہم نے اس کی خدمت کر کے اس کے اصل مالکان تک پہنچا دیا۔ اب دعا ہے کہ جہاں رہے خوش رہے اور ہم کو بھول جائے۔“

سارا نے اپنی گردن جھکالی۔ میں نے دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں اس کی ذہنی حقیقت کو بہت اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔

قدرت نے اسے دو کشتیوں کا مسافر بنا دیا تھا۔ ایک طرف اس کے حقیقی ماں باپ تھے اور دوسری طرف یہ خانہ بدوش قبیلہ تھا۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اس کو مان دیا تھا۔ پیار دیا تھا۔ وہ انہیں کیسے بھول سکتی تھی۔

”سارا ایک بات بتاؤ۔ تمہارے ماں باپ کا تمہارے ساتھ کیا رویہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”انہی جیسا۔“ اس نے بتایا۔ ”میں ان کی سگی اولاد تو ہوں لیکن میں ان کے لیے غیر جیسی ہوں۔ کیوں کہ میں ان سے بہت مختلف ہوں وہ مجھے اپنے مہمانوں کے سامنے نہیں آنے دیتے کہ کہیں ان کی سگی نہ ہو جائے۔ میں نے کئی بار دیکھا ہے جیسے اگر وہ آپس میں باتیں کر رہے ہیں اور میں اچانک پہنچ جاؤں تو بالکل خاموش ہو جاتے ہیں۔ جیسے انہیں میرا آنا برا لگا ہو۔ اس لیے ان کے درمیان میرا دل نہیں لگتا۔ ہم ایک دوسرے کے لیے بدل چکے ہیں اور یہ ایک بڑی تلخ حقیقت ہے۔“

”یہ سب درست ہے سارا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ تمہارا خمیر کہیں اور کا ہے۔ تم ان خانہ بدوشوں کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتیں۔“

”تو پھر کیا کروں میں؟“ وہ اچانک پھر انہی۔

”قدرت نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا ہے۔ میں اپنی مرضی سے تو دو کشتیوں پر سفر نہیں کر رہی ہوں۔ پھر میرے ساتھ ایسا مذاق کیوں ہوا؟ میں کیا کروں کس کے پاس

شیطان، فرشتہ

محترم و مکرم معراج رسول

سلام تہنیت

میں کوئی رائٹر نہیں مگر سرگزشت سے عشق ہے۔ شاید ہی کوئی شمارہ مجھ سے چھوٹا ہو۔ میں مصروفیت میں بھی سرگزشت کا مطالعہ ترک نہیں کرتا۔ دوسروں کی سچ بیانی پڑھتے پڑھتے میں نے بھی اپنا ایک واقعہ لکھ ڈالا۔ اگر اسے دوبارہ کسی رائٹر سے لکھوا کر شائع کر دیں تو نوازش ہو گی۔
فرخ جمال
(کراچی)

بوجھ ڈھونے والا گدھا سمجھ لیتے ہیں اور اس سے توقع کرتے ہیں کہ وہ یہ کام کرے گا۔ ہم یہ کام گھر میں کر رہے تھے اور اسے آگے کے لیے تیار کرتے جاتے۔ ہم نے اس کے لیے ایک ایسا پلنگہ اور نظام الاوقات ترتیب دیا تھا جس میں اس کی رضامندی اور خوشی بھی شامل تھی اور اس کے ساتھ ساتھ وہ تمام قاعدے اور اصول بھی تھے جو ایک بچے کی اچھی پرورش کے لیے لازمی ہوتے ہیں۔ مگر کوئی چیز ہم نے لازمی نہیں رکھی تھی۔ تھوڑی بہت گنجائش چھوڑی تھی جو کہ انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔

میں اور سارہ شاہ رخ کے لیے حساس تھے لیکن اپنی حساسیت اس پر ظاہر نہیں کرتے تھے۔ ہم چاہتے تھے کہ ہمارا بچہ ایک عام بچے کی طرح پرورش پائے اور وہ خود کو خاص نہ سمجھے۔ یہ حساسیت قدرتی نہیں تھی بلکہ حالات نے پیدا کی تھی۔ اسکول اور گھر سے باہر ہمیں شاہ رخ کی فکر لگی رہتی تھی۔ جب وہ باہر کھیل رہا ہوتا تھا تو سارہ یا میں گھر میں ہوتا تو بار بار باہر جھانک کر اسے دیکھتے مگر یوں کہ شاہ رخ کو احساس نہ ہو کہ ہم اصل میں اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔ اگر وہ اتفاق سے گلی میں نظر نہ آتا تو ہم بے قرار ہو کر اس کو دیکھنے نکل جاتے۔ ہماری یہ حساسیت غیر منطقی نہیں تھی کیونکہ نہ صرف اس ملک اور شہر بلکہ ہمارے علاقے میں ایسے واقعات ہو چکے تھے جب درندہ صفت لوگوں نے معصوم بچوں اور بچیوں کو اپنی درندگی کا نشانہ بنایا اور راز افشا ہونے کے خوف سے معصوم بچوں کو قتل بھی کر دیا۔

آج کل جب میں آئے دن معصوم بچوں کے ساتھ شیطان صفت لوگوں کے بہیمانہ سلوک اور پھر ان کے قتل کی خبریں دیکھتا، سنتا اور پڑھتا ہوں تو میرے اندر خوف سا پیدا ہونے لگتا ہے کیونکہ میں خود ایک باپ ہوں اور میری کل

کائنات میرا بیٹا شاہ رخ ہے۔ اس نے اسی سال سے اسکول جانا شروع کیا ہے۔ میں اور سارہ اس کے معاملے میں اتنے حساس ہیں کہ ہم نے اسکول کے لیے دین بھی نہیں لگوائی ہے۔ آج اسے اسکول میں کلاس تک چھوڑ کر آتا

ہوں اور دوپہر میں سارہ خود جا کر اسے لے آتی ہے۔ اسکول ہمارے علاقے میں ہی پیدل مسافت پر ہے۔ ہمارے محلے سے کئی بچے یہاں پڑھنے آتے ہیں اور شاہ رخ ان کے ساتھ بھی آ جاسکتا ہے کیونکہ وہ ماشا اللہ سے چھ سال کا ہو رہا تھا۔ پانچ سال کی عمر تک تو ہم نے اسے اسکول میں داخل ہی نہیں فرمایا تھا کیونکہ ہم دونوں کے خیال میں اس سے کم عمر بچے کو اسکول بھیجنا اس کے بچپن کے ساتھ زیادتی ہو گی۔

ہم نے اسے گھر میں ہی پڑھایا اور جب وہ اسکول پہنچا تو اس کا ٹیسٹ لینے کے بعد ٹیچر نے اس کے لیے دوسری کلاس تجویز کی تھی مگر میں نے اور سارہ نے پہلی کلاس کو ترجیح دی۔ وجہ وہی تھی کہ ہم اس پر بوجھ ڈال کر اسے مشقت میں مبتلا کرنا نہیں چاہتے تھے جیسا کہ آج کل بچوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ ماں باپ اور اسکول والے انہیں علم کا

بال سامنے سے اڑ گئے تھے۔ مچکے سے اس کا منہ لال رہتا تھا۔ آنکھیں یوں سرخی لیے ہوئے تھیں جیسے وہ نیند کی کمی کا شکار ہو۔ اپنے پرانے خستہ حال گھر میں اکیلا رہتا تھا۔ دو کمروں کے اس مکان کا بڑا حصہ مہمن پر مشتمل تھا جو اب اس علاقے میں آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکا ہے۔ چھت پر نین کی شینیں تھیں۔ وہ کوئی کام کرتا تھا کیونکہ صبح جاتا اور شام کو آجاتا تھا۔ محلے میں کسی سے اس کی میل ملاقات نہیں تھی اور لوگ اسے منہ لگانا پسند بھی نہیں کرتے تھے۔ وہ خود کسی میں دل چسپی نہیں لیتا تھا۔ جب گھر سے نکلتا تو سر جھکائے تیز قدموں سے چلا جاتا۔ بچی کی لاش جس خالی پلاٹ سے ملی تھی وہ عبدال کے مکان سے کچھ ہی دور تھا۔ یہ ثابت ہونے کے بعد کہ بچی کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی اور اسے سانس گھونٹ کر مارا گیا تھا تو پولیس نے قاتل کی تلاش شروع کی اور شبے میں عبدال کو بھی پکڑ کر لے گئی۔ مگر دو دن اسے زیر تفتیش رکھ کر چھوڑ دیا کہ اس نے نہ تو اقرار جرم کیا تھا اور نہ ہی اس کے خلاف کوئی ثبوت ملا۔

تھانے سے آنے کے بعد وہ کئی دن اسے گھر سے نہیں نکلا تھا کیونکہ اس کی حالت ہی ایسی نہیں تھی۔ محلے والے اس

ایسا ہی ایک واقعہ چند مہینے پہلے ہمارے محلے میں پیش آیا جب ایک چار سالہ بچی غائب ہو گئی اور تلاش کے بعد اس کی لاش ایک خالی پلاٹ میں جھاڑیوں سے ملی۔ کسی زمانے میں شہر کے وسط میں ہونے کے باوجود اس علاقے کی اہمیت نہیں تھی۔ یہاں پلاٹ اور مکان سستے مل جاتے تھے اس لیے یہاں نچلے طبقے کے افراد زیادہ تھے اور اکاؤنٹ ہی اچھے گھرانے تھے مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہاں سہولتیں آئیں، بریکیں اور فلٹس بنے۔ ان کے نیچے شاپنگ سینٹر بنے تو علاقے کی اہمیت اور قیمت خود بہ خود بڑھتی چلی گئی اور جب قیمتیں بڑھیں تو نچلے طبقے کے لوگوں نے یہاں سے پراپرٹی سیل کر کے دوسرے علاقوں کا رخ کیا اور مشکل سے ایک عشرے میں یہ علاقہ نچلے طبقے سے اوپری متوسط طبقے کا بن گیا۔ اب یہاں اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے۔ تقریباً سب کے پاس اپنی گاڑی تھی۔ اس کے باوجود کچھ گھروں میں اب بھی پرانے لوگ رہ رہے تھے۔

ان میں ایک عبدال بھی تھا۔ اس کا پورا نام کسی کو نہیں معلوم تھا۔ وہ تقریباً پینتالیس برس کا سیاہ رنگ اور اکھڑے نقوش والا دبلا ما آدمی تھا۔ اس کے ہاتھوں کی نیس ابھری ہوئی تھیں جیسے کسی درخت کی جڑیں ابھرتی ہیں۔ سر کے



Copied From Web

خاندانوں تک آئی تو دونوں خاندانوں نے اس رشتے سے انکار کر دیا۔ اس وقت تک بات اتنی بڑھ گئی تھی کہ ہم ایک دوسرے کے بغیر رہ نہیں سکتے تھے۔ اس لیے ہم نے اپنے اپنے گھر والوں کے سامنے کورٹ میرج کا آپشن رکھ دیا تب وہ بادل ناخواستہ اس شادی پر رضامند ہوئے مگر کسی تقریب کے بغیر نکاح کیا گیا اور سارہ کے گھر والے اسے تین کپڑوں میں ہمارے پاس چھوڑ گئے اور نکاح کے فوراً بعد والد صاحب نے حکم دیا کہ میں اپنا بندوبست کر لوں، اب میرا اس گھر سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔

میرا اور سارہ کا خاندان پڑھا لکھا ہے مگر دونوں کے ہاں رواج ہے کہ خاندان سے باہر شادی نہیں کرتے۔ اس لیے ہمارے بڑے اس رشتے پر آمادہ نہیں ہوئے تھے۔ میں نے اور سارہ نے شادی کی اولین رات میرے ایک دوست کے گھر میں گزار لی۔ چند مہینے تک ہم کرائے کے ایک فلیٹ میں رہے پھر میری والدہ کو ترس آیا اور انہوں نے چپکے سے مجھے کچھ رقم دی جس سے میں نے یہاں نیم تعمیر شدہ پلاٹ خرید لیا اور پھر جہاں جا ب کرتا تھا وہاں سے اور کچھ دوستوں سے قرض ادھار لے کر اسے مکمل کرا کے اس میں آ گیا۔ چند سال تک میں قرض اتارتا رہا۔ مگر اپنے گھر میں آنے سے سکون آ گیا۔ پھر تنخواہ بڑھی تو مالی مشکلات کم ہوئیں۔ پہلے میرے پاس باینک تھی پھر ایک چھوٹی گاڑی لے لی۔ ابتدائی مشکلات میں اولاد کا خیال نہیں آیا مگر جب اپنے گھر میں آئے اور ذرا سکون ہوا تو سارہ کو تنہائی پریشان کرنے لگی۔ ہم نے ڈاکٹروں سے رجوع کیا۔ ٹیسٹ ہوئے مگر سب کلیئر آیا۔ اب قدرت کی طرف سے دیر تھی اور ہم دونوں ہی قدرتی طریقے کے قائل تھے اس لیے صبر سے انتظار کرنے لگے کہ کب اوپر والا ہمارے مقدر میں اولاد لکھتا ہے۔ یہ موقع چار سال بعد آیا۔

شاہ رخ نے آکر ہمارا گھر کھل کر دیا۔ سارہ کو پہلے فراغت کی شکایت تھی تو اب اسے فرصت نہیں ملتی تھی۔ میں پہلے کہتا تھا کہ گھر میں کتنی خاموشی ہے اور اب بعض اوقات جب بر خوردارنی وی پر گیسز لگا کر کھیل رہے ہوتے تھے تو مجھے سکون کے لیے باہر کا رخ کرنا پڑتا تھا۔ شاہ رخ کی پیدائش کے بعد گھر والوں سے تعلق کسی قدر بحال ہوا تھا۔ نواسے اور پوتے کی خوشی میں وہ آئے تھے اور ہم بھی گئے تھے۔ یوں آنا جانا ہوا مگر تعلق بس اسی حد تک تھا۔ نہ تو والد نے مجھے واپس آنے کو کہا اور نہ ہی سارہ کے گھر والوں نے

سے نفرت کرنے لگے تھے۔ خاص طور سے جن کی بچی کے ساتھ یہ سانحہ پیش آیا تھا انہوں نے باقاعدہ پولیس کانسٹبل کر کے الزام لگا باکہ پولیس نے اسے ملی بھگت سے چھوڑ دیا ہے ورنہ وہی ان کی بچی کا قاتل ہے۔ پولیس کا کہنا تھا کہ وہ اس کے خلاف کوئی ثبوت حاصل نہیں کر سکی اس لیے اسے کیسے قاتل قرار دے سکتی ہے۔ کچھ دن اس پر ہنگامہ ہوا۔ علاقے کے مستحق نوجوانوں نے ایک بار اس کے گھر پر پتھراؤ بھی کیا مگر بزرگوں نے انہیں قابو کر لیا۔ پھر مقتول بچی کی وراثت علاقہ چھوڑ گئے اور کچھ عرصے بعد لوگوں کے جذبات بھی ٹھنڈے پڑ گئے اور اب اہل علاقہ نے پھر اسے نظر انداز کر دیا تھا۔ اس کا وہی معمول تھا کہ صبح جاتا اور شام کو آ جاتا۔ مگر لوگ اپنے بچوں کے سلسلے میں محتاط تھے اور کوئی بچہ اس کے گھر کے پاس بھی نہیں جاتا تھا۔ بڑوں کی طرف سے اس معاملے میں سخت ہدایات تھیں۔

عبدال کا گھر ہمارے گھر سے دو گلی آگے نالے کے ساتھ آخری سرے پر تھا۔ اس سے آگے چند غیر آباد پلاٹ تھے جن پر جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ وہاں کوئی نہیں جاتا تھا۔ بچی والے واقعے کے بعد اہل محلہ نے یہ جھاڑیاں کٹوا دی تھیں۔ نالے کی طرف پہلے ہی دیوار کھڑی کر دی گئی تاکہ علاقہ محفوظ رہے۔ جب یہاں اچھی فیملی آئیں تو چور ڈکیتوں نے بھی ادھر کا رخ کیا تھا۔ اس لیے اہل محلہ نے مل کر اس کا سدباب کیا۔ آنے جانے کے لیے صرف ایک راستہ چھوڑ کر باقی سارے راستے بند کر دیئے اور آنے جانے والے راستے پر بیریز لگا کر اس پر چوہیں گھنٹنے کے لیے رسک گاڑ ڈھٹھا دیا۔ اس کے بعد سے امن و سکون ہو گیا تھا۔ پہلے وہ لوگ پریشان رہتے تھے جن کے چچھے گھروں میں صرف عورتیں اور بچے رہ جاتے تھے۔ یہاں ایسے واقعات بھی ہوئے کہ مردوں کے جانے کے بعد اگو گھروں میں گھسے اور مال کے ساتھ آبرو بھی لوٹ لیا۔

مگر اتنی یکسوئی میں بچی والا واقعہ پیش آیا تو اہل علاقہ اور خاص طور سے والدین میں تشویش کی لہر دوڑ گئی تھی۔ ان میں سارہ بھی شامل تھی۔ دس سال پہلے ہم نے محبت کی شادی کی تھی۔ اس وقت میں نے ایم بی اے کیا تھا اور جا ب کر رہا تھا۔ حالانکہ مجھے جا ب کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ہمارا خاندانی کاروبار تھا مگر میں پہلے تجربہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ سارہ سے یونیورسٹی میں ملاقات ہوئی تھی۔ جلد یہ ملاقات پسندیدگی میں ڈھل گئی۔ مگر جب بات

باہر کھیل رہا ہے تو میں اس کے آس پاس ہی موجود رہوں۔
میں نے سارہ کو سمجھایا۔
”اس طرح وہ کھل کر کھیل نہیں سکے گا بچہ نگرانی سے
گھبراتا ہے۔“
”میں کچھ نہیں جانتی بس آپ باہر رہا کریں میں ایک
دن تو سکون سے رہوں۔“

مجبوراً میں باہر آ جاتا مگر میں نے اس کا طریقہ یہ نکالا
کہ براہ راست نگرانی کی بجائے کسی محلے والے سے گپ
شب کرنے لگتا یا اخبار لے آتا تاکہ شاہ رخ یہ نہ سمجھے کہ میں
اس کی نگرانی کر رہا ہوں۔ تھوڑا بڑا ہوا اور ہوشیار ہو گیا تو
ہمیں اس طرف سے اطمینان ہو گیا کہ وہ اب خود اپنی
حفاظت کر سکتا ہے۔ پھر اس کا بچوں کے ساتھ گروپ بن گیا
تھا وہ سب مل کر کھیلتے تھے۔ اس کے باوجود ہم یہ فکر کرتے
رہتے تھے کہ وہ گلی سے باہر نہ جائے۔ اس کے لیے وقفے
وقفے سے باہر دیکھتے رہتے تھے۔ مگر جب بچی والا واقعہ ہوا
تو ہماری فکر حدوں کو چھونے لگی تھی۔ سارے ہی لوگ ہم
گئے تھے۔ کچھ دن تو بچوں کو گھر سے باہر جانے کی اجازت
بھی نہیں ملی تھی۔ مگر سارہ نے شاہ رخ کو پورے مہینے گھر سے
باہر جانے نہیں دیا تھا۔ وہ بہت بچتا اور کبھی کبھی رونے لگتا تھا
مگر سارہ کا دل نہیں مان رہا تھا۔ یہ مشکل میں نے اسے رضا
مند کیا اور شاہ رخ کو باہر جانے کی اجازت ملی تھی۔

حساس تو میں بھی تھا لیکن مرد ہونے کے ناطے میں
اپنے جذبات پر بہتر قابو رکھ سکتا تھا اور اسی لیے میں نے دل
پر جبر کر کے شاہ رخ کو باہر جانے کی اجازت دلوائی۔
میں نے سارہ سے کہا کہ ہم اسے ہمیشہ کے لیے گھر میں قید
نہیں رکھ سکتے اور اسی عمر میں بچے باہر کے ماحول.... سے
آشنائی اختیار کرتے ہیں اور یہ چیز بعد میں ان کے کام آتی
ہے جن بچوں کو اس عمر میں باہر جانے سے روک دیا جائے تو
وہ باقی ساری عمر گھر سے نکلتے ہوئے اور لوگوں سے تعلقات
قائم کرتے ہوئے جھجکتے ہیں۔ یہ چیز ان کی معاشرتی اور
معاشرتی ترقی میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ شاہ رخ گھر میں بند
تھا تو چیز چیز اہو گیا تھا بات بات برڑتا اور الجھتا تھا۔ کہنا مشکل
سے ماننا اور زیادہ تر وقت منہ سجا کر رکھتا تھا مگر باہر جانے کی
اجازت ملنے ہی اس کی فطری شوخی اور خوش مزاجی لوٹ آتی
تھی۔ میں نے سارہ سے کہا۔ ”تم نے اس کے رویے میں
فرق دیکھا؟“

”لیکن کیا کروں خوف مجھے مارے ڈالتا ہے۔ فرخ

زیادہ گرم جوشی دکھائی خاص طور سے اس کے بہن بھائی اس
معالے میں سرد مہری دکھا رہے تھے۔ شاید ان کا خیال تھا کہ
سارہ کہیں دولت اور جاہلاد میں حصے دار نہ بن جائے۔ مگر ہم
اپنی زندگی سے مطمئن تھے اس لیے ہم نے پروا نہیں کی۔ جو
ہم سے مل رہا تھا ہم بھی اس سے مل رہے تھے اور جو نہیں مل
رہا تھا تو وہ اپنے گھر میں خوش اور ہم اپنے گھر میں خوش تھے۔
شاہ رخ کی پرورش کے سلسلے میں ہم نے طے کیا تھا
کہ میں اپنا رعب رکھوں گا مگر اسے جسمانی سزا نہیں دوں گا
اور یہ کام سارہ کرے گی مگر وہ اس سے بے تکلفی رکھے گی۔
ماں باپ کا بنیادی کردار یہی ہوتا ہے۔ اس لیے شاہ رخ مجھ
سے ڈرتا تھا اور صراحتاً ایک آواز دینے کی دیر ہوتی فوراً
سیدھا ہو جاتا مگر ساتھ ہی اسے پورا اعتماد تھا کہ میں صرف
اسے ڈانٹوں گا ماروں گا نہیں۔ میں نے اسے کبھی مذاق میں
بھی ہلکا سا تھپڑ نہیں لگایا تھا۔ میں باپ والا بھرم برقرار رکھنا
چاہتا تھا۔ اس لیے کسی شرارت یا نقصان کے بعد وہ میرے
آس پاس ہی رہتا تھا اسے معلوم تھا کہ اب ماں سے پٹے
گا۔ جب اسے میرا خوف ہوتا کہ میں ڈانٹوں گا تو وہ ماں
کے پاس گھستا تھا۔ بڑا ہونے پر اس کی شرارتیں اور چیزوں
میں گھسنے کی عادت بڑھی تو سارہ نے اسی حساب سے اس پر
ختی شروع کر دی۔

ہم نے طے کیا ہوا تھا جب ایک اپنے طریقے سے
شاہ رخ کی کلاس لے رہا ہوگا تو دوسرا اس میں دخل نہیں
دے گا۔ میں اسے کبھی اکیلے میں سمجھاتا کہ وہ ایک حد سے
زیادہ ختی نہ کیا کرے ورنہ پھر اس پر ختی بھی بے اثر ہو جائے
گی۔ سارہ کو شش کرتی مگر جب اسے غصہ آتا تو وہ بے قابو ہو
جاتی تھی۔ سارہ کو زیادہ غصہ اس وقت آتا جب شاہ رخ
پڑھنے کے اوقات میں کوتاہی کرتا تھا مگر ہم نے طے کیا ہوا
تھا کہ تعلیم کو اس پر ٹھونسا نہیں ہے اس لیے سارہ اس وقت تو
اسے کچھ نہیں کہتی تھی مگر بعد میں جب وہ کوئی شرارت یا
حرکت کرتا تو تب کا غصہ بھی اسی وقت نکال لیتی۔ چھوٹا تھا تو
ہمارے ہاتھ میں تھا اور ہمیں اس کی اتنی فکر نہیں تھی مگر تین
چار سال کی عمر میں وہ باہر نکلنے لگا۔ گلی کے بچوں کے ساتھ
کھیلتا تھا۔ سارہ بہت فکر مند رہتی تھی کہ گلی میں گاڑیاں آتی
جاتی رہتی تھیں اور بعض لوگ ایسے تھے جو یہاں بھی تیز
رفتاری سے ڈرائیو کرتے تھے۔ شاہ رخ کو باہر جانے سے
روک بھی نہیں سکتے تھے اس لیے سارہ کی جان باہر ہی انکی
رہتی تھی۔ چھٹی والے ان میری ڈیوٹی ہوتی کہ جب شاہ رخ

یہ ہمارے معاشرے میں کیا ہو رہا ہے؟“

”بے راہ روی اور انتشار کا نتیجہ یہی نکلتا تھا۔“
میں نے کہا۔ ”بعض لوگ کہتے ہیں کہ آزاد خیالی نے یہ دن دکھائے ہیں حالانکہ آزاد خیالی تو اس معاشرے میں ہمیشہ سے رہی ہے۔ ایلٹ کلاس خود کو مذہب اور معاشرے سے بالاتر سمجھتی ہے۔ یہ سب اصل میں اجتماعی نفسی اور نظام انصاف کے ناکارہ ہونے سے ہوا ہے۔ آج کا مجرم سمجھتا ہے کہ وہ جرم کر کے آسانی سے بچ جائے گا اور دیکھا جائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ اسی لیے معاشرے کے وہ آسودہ لوگ جو اپنے اندر کئی رکھتے ہیں وہ اس طرح سے اپنی کٹی نکال رہے ہیں۔“

”آپ کے خیال میں یہ انفرادی فعل نہیں ہے؟“

”نہیں کوئی فعل انفرادی نہیں ہوتا ہے۔ ہمیشہ معاشرے کے رویے کا مظہر ہوتا ہے۔“ میں نے انکار کیا۔ ”ہاں جب ایسا ہو جاتا ہے تو لوگ اسے انفرادی قرار دے کر صرف کرنے والے کے سر تھوپ دیتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ اس کے پیچھے معاشرے کی اجتماعی نفسیات کا کتنا حصہ ہے۔“

”تو کیا ایسا کرنے والوں کو چھوڑ دینا چاہیے؟“

”نہیں ان کو فوری اور سخت سزا دینی چاہیے لیکن اتنے عرصے میں ایسے سینکڑوں واقعات ہوئے ہیں اور مجھے نہیں یا وہ کسی ایک فرد کو بھی سزا ہوئی ہو یا اس کا اعلان ہوا ہو کہ فلاں کو اس جرم میں سزا دی جا رہی ہے۔ جیلوں میں سزائے موت کے ہزاروں قیدی ہیں مگر یہاں تو مغرب کو خوش کرنے کے لیے سزائے موت پر ہی پابندی لگائی ہوئی ہے۔ یقین کرو صرف سزائے موت پر عمل درآمد ہو جائے تو جرائم میں آدمی کی آجائے۔“

میں کوئی دانش ور یا بہت گہری سوچ رکھنے والا شخص نہیں ہوں۔ میں وہی باتیں کر رہا تھا جو ہمارا میڈیا ہمارے ذہنوں میں ڈالتا ہے اور ہمیں مزید منتشر کرتا ہے کہ جو بات ایک عام آدمی سمجھ سکتا ہے وہ ارباب اختیار کی سمجھ میں کیوں نہیں آ رہی ہے؟ عوام اور ملک کے مفاد میں بہت آسان فیصلے کرتے ہوئے وہ اتنی سوچ بچار کرتے ہیں کہ ان کی حکومت کی مدت ہی پوری ہو جاتی ہے مگر ایسا فیصلہ جو ان کے مفاد میں ہو اور اس سے ملک و قوم کو کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو رہا ہو وہ فوراً کر لیتے ہیں۔ حکمرانوں کی اس روش نے لوگوں میں اعتماد ختم کر دیا ہے۔ وہ ایسی کیفیت میں زندگی گزار

رہے ہیں جس میں خوف ہی خوف ہے۔ نہ ان کے پیروں تلے زمین ہے اور نہ ہی وہ اپنے سروں پر آسمان دیکھتے ہیں۔ میں خود ایسی زندگی گزار رہا ہوں۔ مگر اسے گزارنا بھی مجبوری ہے۔

اس معاملے میں عورتیں اور بچے خوش قسمت ہیں کہ باہر کی دنیا سے ان کا واسطہ کم پڑتا ہے اور وہ اس سنگینی حالات کو اتنا محسوس نہیں کرتے ہیں۔ ان کے لیے گھر ٹھیک ہے تو سب ٹھیک ہے۔ مگر ہم مردوں کا واسطہ باہر کی دنیا سے پڑتا ہے اور اتنی آسانی سے پرسکون نہیں ہوتے ہیں۔ میرا خیال ہے دنیا کا کوئی مرد اتنی ٹینشن برداشت نہیں کرتا ہے جتنی کہ پاکستانی مرد کرتا ہے۔ گھروں سے لے کر دفاتروں اور روزگار کے مقامات تک اس کے لیے ٹینشن ہی ٹینشن ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ وہ جب یہاں سے نکل کر کسی دوسرے ملک میں جاتا ہے تو زندگی اس کے لیے یک دم ہی بہت سہل ہو جاتی ہے اور وہ ساری توجہ کمانے پر لگاتا ہے اور نہ صرف اپنی بلکہ اپنے گھر والوں کی زندگی بھی بنادیتا ہے۔ دیکھا جائے تو ہمارا ملک چل ہی ان لوگوں پر رہا ہے جو باہر ہیں اور کما کر بھیجتے ہیں ورنہ یہاں تو آدمی اپنا گزارہ نہیں کر پارہا ہے۔ بات اصل واقعے سے کہیں اور نکل گئی ہے۔ میں اس کی طرف آتا ہوں۔ اس دن میں آفس میں تھا کہ دو پہر تین بجے سارہ کا فون آیا وہ پریشان تھی۔

”فرخ، شاہ رخ پتا نہیں کہاں چلا گیا ہے؟“

”کیا مطلب کہاں چلا گیا ہے کیا وہ گھر سے نکلا تھا؟“

”سیماباجی کے گھر گئی تھی۔“ سارہ نے پڑوسن کا ذکر کیا۔ ”شاہ رخ نے ان کی بیٹی کو دھکا دیا تو اسے چوٹ لگی۔ سر سے ہلکا سا خون نکل آیا تھا۔ میں نے اسے سخت سناٹیں اور کہا کہ میں اسے بتاتی ہوں۔ میں سیماباجی اور بچی کو دیکھ رہی تھی۔ جب میں اس سے فارغ ہوئی تو دیکھا شاہ رخ غائب ہے۔ میں گھر پر تالا لگا کر آئی تھی اس لیے وہ گھر تو نہیں جا سکتا میں نے اسے گلیوں میں دیکھ لیا ہے اس کے دوستوں کے ہاں پوچھ لیا ہے مگر وہ کہیں نہیں ہے۔“ سارہ رونے لگی تھی۔

”رو نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں آ رہا ہوں۔“

”پلیز جلدی آئیں میرے بچے کو تلاش کریں مجھے لگ رہا ہے میرا دل رک جائے گا۔“

”میں آتا ہوں۔“ میں نے کہا اور دفتر میں ایمر جنسی کا

بتایا جو واحد بھائی بتا چکے تھے۔ میں نے اسے وقت بھی بتایا تو اس نے کہا۔ ”اس وقت میں اکیلا تھا دوسرا گاڑ گشت پر تھا۔“

”وہ ابھی کہاں ہے؟“

”اس وقت بھی گشت پر ہے۔“

گاڑ ایک کھنٹے میں ایک چکر لگاتے تھے۔ یعنی ہر گاڑ دو کھنٹے بعد ایک چکر لگاتا تھا۔ یہ سات آٹھ گھنٹے اور ان

کہہ کر گھر روانہ ہوا۔ عام طور سے شام کے وقت آنے میں پون گھنٹا لگتا ہے۔ چونکہ رش بے پناہ ہوتا لیکن اس وقت سڑکیں خالی تھیں اور میں نے بھی گاڑی تیز دوڑائی تھی صرف بیس منٹ میں گھر پہنچ گیا۔ اس وقت تک گھر کے آگے محلے والے بھی جمع ہو گئے تھے اور ان کو یوں جمع دیکھ کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔ میں کار سے اتر کر لپکا اور گھر کے سامنے موجود واحد بھائی سے پوچھا۔ ”کیا ہوا شاہ رخ ملا؟“

”نہیں یار ہم سب نے پورا محلہ دیکھ لیا ہے۔“ وہ بولے۔ واحد بھائی کا تعلق ایک سیاسی تنظیم سے تھا اور وہی محلے کی سیورٹی کے معاملات دیکھتے تھے۔ مسائل کے لیے بھی لوگ ان کے پاس آتے تھے۔ ذاتی طور پر بہت اچھے اور مہذب انسان تھے۔ ان کی ہر ممکن کوشش ہوتی تھی کہ ان کے پاس جو مسئلہ آیا ہے اسے حل کر دیں۔ ”ایک ایک گھر میں گئے ہیں۔ مگر بچہ نہیں ہے۔“

میں اندر گیا تو سارہ محلے کی عورتوں کے ساتھ تھی اور اس کا رور و کر برا جا رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی وہ جھلبلائی۔ ”فرخ میرا بچہ لا کر دیں، کہیں سے بھی لا کر دیں۔“

میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے اسے تسلی دی کہ میں جلد شاہ رخ کو تلاش کر لوں گا۔ میں باہر آیا تو واحد بھائی کے ساتھ چند افراد اور تھے۔ واحد بھائی نے انہیں ذمے داریاں سونپ دیں کہ وہ آس پاس کی مسجدوں میں اعلان کرا دیں۔ سارہ پہلے ہی شاہ رخ کا حلیہ بتا چکی تھی۔ واحد بھائی نے اسے کاغذ پر لکھ لیا تھا اور اس کی کاپیاں کرا کے انہوں نے سب کو دے دیں۔ پھر مجھ سے کہا۔ ”گر تم کہو تو پولیس کو اطلاع دیں۔ ویسے تو ہماری پولیس کچھ نہیں کرتی لیکن بعض اوقات اس کی دہشت سے بھی کام ہو جاتا ہے۔“

”پہلے بیریز پر موجود گاڑ سے پوچھتے ہیں۔“ میں نے کہا کیونکہ گاڑ کو کونتی سے ہدایت تھی کہ وہ کسی بھی چھوٹے بچے کو اکیلے باہر جانے کی اجازت نہ دے۔

”اس سے میں پہلے ہی پوچھ چکا ہوں اور اس نے یقین سے کہا ہے کہ اس عمر اور حلیے کا کوئی بچہ باہر نہیں گیا ہے۔ وہ شاہ رخ کو نام اور چہرے سے بھی پہچانتا ہے۔“

دن اور رات، میں دو گاڑز بیریز پر ہوتے تھے تاکہ ایک کسی وجہ سے بیریز پر نہ ہو تو دوسرا ضرور ہو اور پھر وہ باری باری گلیوں کا ہنجر بھی لگاتے تھے۔ واحد بھائی نے اپنا اطمینان کر لیا تھا مگر میں اپنا اطمینان کرنا چاہتا تھا۔ میں خود گاڑ کے پاس گیا اور اس سے پوچھا، اس نے تقریباً وہی

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

- ☆ **بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔**
- ☆ **شہر اور ضلع کا نام۔**
- ☆ **ممكن ہونے پر بک اسٹال کا PTCCL یا سولیا گزٹل فون نمبر**

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

نصر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سٹنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگشت

C-63 فیروز ٹی وی سٹیشن ڈسٹری بیوٹرز اتھارٹی میں کورنگی روڈ، کراچی

35802552-35386783-35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

تھیں ان میں بھی ایسے رخنے تھے کہ پیدل لوگ گزر سکتے تھے صرف گاڑی، بائیک اور سائیکل سے گزرنے کا امکان نہیں تھا۔ شاہ رخ ان راستوں سے بھی باہر جاسکتا تھا۔ مگر وہ خود گیا تھا تو اسے آجانا چاہیے تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ علاقے سے واقف نہیں تھا جب میں کوئی چیز لینے نزدیکی مارکیٹ تک جاتا تو لازمی اسے بھی لے کر جاتا تھا۔ وہ تمام راستوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ یہاں سیدھی سیدھی گلیاں تھیں جن میں راستہ بھولنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے دل سے دعا کی کہ میرا بچہ خیریت سے گھر آجائے۔ یا اگر کسی کو ملے تو وہ انسان ہو کوئی ورنہ نہ ہو۔ پولیس اسٹیشن میں پولیس کار وہی تھا اگر واحد بھائی ساتھ نہ ہوتے تو شاید وہ ایف آئی آر بھی نہ کانتے۔ ایف آئی آر کائنات کے باوجود انہوں نے کوئی خاص دل چسپی نہیں لی، ایس ایچ او نے نکاسا جواب دیا۔

”ادھر نفری ابھی کم ہے۔ ابھی بندے آتے ہیں تو آپ کی طرف بھیجتے ہیں۔“
 ”آج ہی بھیج دیجئے گا۔“ واحد بھائی نے کہا۔ ”معاملہ بچے کا ہے مگر اب تک گھر پر میڈیا والے پہنچ گئے ہوں۔“

اس بار ایس ایچ او الٹ ہو گیا۔ اس نے جلدی سے کہا۔ ”نہیں جی جلدی آئیں گے۔ ہمارے بھی بچے ہیں۔“
 ”اگر آپ لوگوں کو یہ احساس ہوتا تو آئے دن لوگوں کے بچے نہ غائب ہوتے۔“ میں نے کسی قدر تیز لہجے میں کہا۔ ”میرا اکلوتا بیٹا غائب ہے اور وہ ابھی چھ سال کا بھی نہیں ہوا ہے۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ پولیس آئے گی تو آپ بھیجیں گے۔ ابھی کسی بڑے آدمی کا بچہ غائب ہوا ہوتا تو پورے شہر کی پولیس پہنچ جاتی۔“

اس بار وہ مجبور ہوا اور اس نے ایک اے ایس آئی کو ہمارے ساتھ ہی بھیجا۔ میں اس اُمید کے ساتھ گھر واپس آیا کہ شاید شاہ رخ مل گیا ہو یا اس کے بارے میں کہیں سے خبر آئی ہو مگر کچھ بھی نہیں ہوا۔ میرے اور سارے گھر والے آگئے تھے۔ وہ سارے کو دیکھ رہے تھے کیونکہ اس کی طبیعت اتنی خراب ہو گئی تھی کہ وہ بار بار بے ہوش ہو رہی تھی۔ میرے ایک برادران لاڈا کٹر ہیں وہ اسے دیکھ رہے تھے۔ اب وہ ہوش میں تھی مجھے دیکھتے ہی اس نے کہا۔ ”فرخ میرا بچہ۔“
 ”مل جائے گا۔“ میں نے لہجے میں اُمید بھر کر کہا۔ ”ہم کوشش کر رہے ہیں۔ دیکھو سب آگئے ہیں میں

کا چکر لگانے میں پندرہ بیس منٹ ضرور لگ جاتے تھے۔ مگر اس سے پوچھنا بیکار تھا کیونکہ جس وقت شاہ رخ غائب ہوا۔ یہی گاڑی بیڑ پر تھا۔ اس دوران میں آس پاس کی مسجدوں سے اعلان ہونے لگے تھے اور واپس آنے والوں نے بتایا کہ اعلان آج عشا کی نماز تک ہر آدمی گھنٹے بعد نشر ہوتے رہیں گے۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس مشکل وقت میں میں اکیلا نہیں تھا بلکہ محلے والے بھی ساتھ ہیں۔ چار بجے ہم پولیس اسٹیشن روانہ ہوئے۔ راستے میں میں نے کال کر کے اپنے اور سارے گھر والوں کو اطلاع دی۔ وہ بھی پریشان ہو گئے تھے اور انہوں نے کہا کہ وہ جلد از جلد پہنچ رہے ہیں۔ دوسری طرف واحد بھائی نے سیاسی پارٹی کے مقامی آفس کال کر کے کہا کہ وہ چند لڑکے محلے کی طرف بھیج دیں۔ وہ اپنے طریقے سے شاہ رخ کو تلاش کریں۔

جب یہ سب ہو رہا تھا تو میرے اندر رہ رہ کر دل اٹھ رہے تھے اور وہ تمام واقعات میرے ذہن میں تازہ ہو رہے تھے جو معصوم بچوں کے بارے میں ٹی وی پر دیکھتا اور اخبار میں پڑھتا آیا تھا۔ محلے کی معصوم بچی کی لاش میں نے خود دیکھی تھی۔ نہ جانے کس ظالم نے اس ننھی سی کچی کو یوں مسل دیا تھا۔ اب میرا بچہ غائب تھا اور نہ جانے کہاں اور کس کے پاس تھا۔ اگر اس کے ساتھ کچھ ہو جاتا تو میں اور سارے جیتے جی مر جاتے۔ یہ سوچ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے اور میں اللہ سے دعا کرنے لگا کہ وہ خیریت سے ہو۔ میں نے اپنے گناہوں کی معافی مانگی کہ ان کا سایہ میرے بچے پر نہ پڑے، وہ یہاں کہیں بھی ہو خیریت سے ہو۔ واحد بھائی میری کیفیت محسوس کر رہے تھے انہوں نے مجھے تسلی دی۔ ”حوصلہ کرو یار بچہ مل جائے گا اللہ نے چاہا تو کچھ نہیں ہوگا۔“

”میں جانتا ہوں لیکن کیا کروں واحد بھائی شاہ رخ کی کم شدگی سے زیادہ مجھے یہ خوف ہے کہ وہ کسی درندے کے پاس نہ پہنچ گیا ہو، یہ سوچ ہی مجھے مارے ڈال رہی ہے۔“

”وہ علاقے سے باہر نہیں نکلا ہے۔“ واحد بھائی نے سوچتے ہوئے کہا۔

”مگر وہ کسی دوسری جگہ سے بھی تو نکل سکتا ہے آنے جانے کے سارے راستے بند نہیں ہیں نا۔“ اشفاق بھائی بولے۔

وہ ٹھہر کر کہہ رہے تھے کہ جو گلیاں بیڑ لگا کر بند کی گئی

تصویریں لیں اور پورے علاقے میں ہر جگہ دکھا کر پوچھنے لگے کہ کسی نے اسے دیکھا ہے؟ میرے گھر والے اور سارے کے گھر والے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر رہے تھے۔ میں نے اپنی شادی کے بعد پہلی بار والد صاحب کو پشیمان دیکھا۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔

”کاش میں نے تمہیں واپس بلا لیا ہوتا۔“
میں نے سرد آہ بھری۔ ”اس سے کیا ہوتا یہ تو قسمت کا لکھا ہے۔“

”اللہ کرے میرا بچہ مل جائے.....“ والد صاحب بولتے بولتے رک گئے ان کی آنکھوں میں آنسو لڑ رہے تھے۔ ”میں نے کیبل ٹی وی پر ایڈ دلوایا ہے اور اطلاع دینے والے کو پانچ لاکھ روپے انعام دینے کا وعدہ کیا ہے۔“

سب ہو رہا تھا۔ مسجدوں میں اعلان ہو رہے تھے۔ محلے والے تلاش کر رہے تھے۔ اثر و رسوخ پولیس تک پہنچا تو مزید پولیس بھی آگئی تھی۔ اب وہ پورے علاقے میں لوگوں سے پوچھ گچھ کر رہے تھے۔ مگر شاہ رخ کا کہیں سے کوئی اتا پتا نہیں چل رہا تھا۔ سیماباجی تب سے ہمارے گھر میں تھیں۔ محلے میں سارے کی ان سے سب سے زیادہ بنتی تھی۔ ان کی بھی ایک ہی بچی تھی اور وہ ہمارا دکھ سمجھ رہی تھیں۔ ان کے شوہر ایک ٹیکسٹائل مل میں انجینئر تھے اور وہ بارہ گھنٹے کی ڈیوٹی کے بعد رات آٹھ نو بجے تک آتے تھے۔ مغرب کی اذان ہوئی تو مجھے بے ساختہ اللہ کی یاد آئی۔ میں گنڈے دار نمازی ہوں کبھی پڑھ لی اور اکثر نہ پڑھی لیکن اس وقت میں بہت خصوع و خشوع سے نماز کے لیے گھر سے نکلا۔

مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کی اور پھر بہت دل سے اللہ سے دعا مانگی کہ اگر ہمارے بچے کی زندگی ہے تو ہمیں اس سے ملو ا دے۔ دعا مانگتے ہوئے میں رونے لگا تھا۔ جاننے والے میرے آس پاس جمع ہو گئے۔ مجھے تسلی دینے لگے کہ شاہ رخ مل جائے گا۔ مگر میرا دل نہیں مان رہا تھا۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ یہ بوجھ کہیں مجھے مار نہ ڈالے۔ اس مسجد سے بھی متواتر شاہ رخ کے بارے میں اعلان ہو رہا تھا جو ہر گھنٹے بعد دہرایا جاتا تھا۔ نماز کے بعد پھر یہ اعلان دہرایا گیا تو میں نے ایک بار پھر دعا کی کہ یہ آخری اعلان ہو اور میرا بچہ مل جائے۔ ہم باہر نکلے تو لوگ میرے ساتھ ہی تھے۔ مسجد علاقے سے کچھ ہی دور تھی اور جب ہم وہاں پہنچے تو کچھ شور سنائی دیا۔ شور عبدل والی گلی میں تھا۔ ہم وہاں تک پہنچے تو عبدل کے گھر کے آگے ہجوم موجود تھا۔ ہجوم کے

پولیس لے کر آیا ہوں۔ مسجدوں میں اعلان کر دیا ہے۔ اللہ نے چاہا تو کچھ ہی دیر میں ہمارا شاہ رخ مل جائے گا۔“
سارے کے بچھے بہرے پر رونق آگئی۔ میں جانتا تھا کہ وہ کیا سنتا چاہتی تھی میں نے اس سے وہی کہا تھا۔ ہمارے ساتھ آنے والا اے ایس آئی نوجوان تھا اور وہ اس وقت گارڈز سے تفتیش کر رہا تھا۔ اس نے آتے ہی کہہ دیا کہ گارڈز نہیں جائیں گے، جب تک پولیس انہیں اجازت نہ دے۔ جس سیکورٹی کمپنی کے یہ گارڈز تھے اسے بھی اطلاع کر دی گئی تھی۔ ان کی ڈیوٹی شام چھ بجے بدلتی تھی اور دوسرے گارڈز آتے تھے۔ ان سے بات کرنے کے بعد اس نے ہماری گلی کے لوگوں کے کوائف پوچھنا شروع کر دیئے۔ میں اسے بتا رہا تھا کہ کس گھر میں کون رہتا تھا اور کیا کرتا تھا۔ اتفاق سے اپنی گلی کے تمام ہی لوگوں سے میری بہت اچھی واقفیت اور سلام دعا تھی اور یہ سب اچھے، شریف اور فیملی والے لوگ تھے۔ مگر اے ایس آئی نے ان سے اپنے انداز میں پوچھ گچھ شروع کر دی۔

جو لوگ اس وقت گھر پر تھے وہ ان سے بات کر رہا تھا۔ اگرچہ اس کا انداز بہت جارحانہ تھا مگر میں اسے روک نہیں سکتا تھا۔ لوگوں کے منہ بند رہے تھے البتہ وہ اس کے سوالوں کے جواب دینے پر مجبور تھے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ اس گلی کی بجائے علاقے پر توجہ دے۔ ایک دو بار میں نے کہا تو وہ جھنجھلا گیا اس نے کہا۔ ”دیکھیں جناب اگر تفتیش آپ نے کرنی ہے تو آپ کر لیں یا پھر مجھے کرنے دیں۔“
”میں ان لوگوں کو جانتا ہوں۔“

”جناب اس قسم کے نوٹے فیصد کیسز میں ہرم قریمی رشتے دار یا محلے والے نکلتے ہیں اس لیے ہمیں سب سے پہلے ان پر توجہ دینی پڑتی ہے۔“
میں مجبوراً خاموش ہو گیا۔ واحد بھائی کی پارٹی کے لڑکے آگئے تھے اور وہ ان سے بات کر رہے تھے۔ میں ان کے پاس آیا تو ایک لڑکے نے مجھ سے کہا۔ ”فرخ بھائی عبدل کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

”وہ اس وقت گھر میں نہیں ہوتا ہے۔“ میں نے کہا۔
”ہم معلوم کرتے ہیں۔“ لڑکے بولے اور عبدل کے گھر کی طرف چلے گئے۔ واحد بھائی کب سے میرے ساتھ لگے تھے وہ فریٹس ہونے کا کہہ کر گھر چلے گئے۔ اس دوران میں محلے کے بچوں نے اپنی کارکردگی دکھانی شروع کی۔ انہوں نے ہمارے گھر سے آکر شاہ رخ کی گلی

وہ وحشت زدہ لہجے میں بولا۔ ”کوئی میرے گھر میں نہیں جائے گا۔“

”تم کیوں منع کر رہے ہو۔“ میں نے اسے جھنجھوڑا۔ ”تم نے اندر کیا چھپایا ہے؟..... بولو دو پہر میں کیا لے کر گئے تھے اندر؟“

”یہ ایسے نہیں بتائے گا۔“ شہزاد نے اسے پھر پکڑ لیا۔ ”یہ کیا سمجھتا ہے ہم تالا نہیں توڑ سکتے۔“

”اگر تم نے تالا توڑا تو میں پولیس میں رپورٹ کرا دوں گا۔“ عبدال چٹایا۔ ”خبردار جو کسی نے میرے گھر کو ہاتھ بھی لگایا۔“

”میرا بیٹا غائب ہے۔“
”تمہارا بیٹا میرے پاس نہیں ہے۔“ عبدال نے یقین سے کہا۔ ”تم بلا وجہ میرے پیچھے پڑے ہو۔“

کچھ لڑکے ایسی چیز کی تلاش میں دوڑے جس سے وہ تالا توڑ سکیں۔ باقی ایک بار پھر عبدال کی دھناتی میں مصروف ہو گئے تھے۔ اتنی مار کھانے کے باوجود اس کی اکڑ کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ چلا رہا تھا اور تالا توڑنے والوں کو دھمکیاں دے رہا تھا۔ ایک لڑکے نے مشتعل ہو کر اس پر وہ سلاح اٹھائی جو وہ تالا توڑنے کے لیے لایا تھا مگر ایک آدمی نے بروقت اس کا ہاتھ روک لیا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ کیا شاہ رخ اندر تھا اور اسے عبدال نے اغوا کیا تھا؟ لڑکے اب تالا توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مزے کی بات ہے کہ پولیس جس نے گاڑی سے یہ معلومات حاصل کی تھیں وہ خود منظر عام سے غائب تھی۔ اسی لیے لوگوں نے قانون اپنے ہاتھ میں لیا ہوا تھا۔ تالا خاصا مضبوط قسم کا تھا اور ٹوٹنے کا نام نہیں لے رہا تھا کسی نے یہ نہیں سوچا کہ دیوار سے اندر کود کر چابی لے آئے۔ بالآخر اس میں سلاح پھنسا کر دو لڑکوں نے زور لگایا تو وہ ٹوٹ گیا۔ کنڈی کھلتے ہی میں اندر داخل ہوا تھا۔ میں نے چلا کر شاہ رخ کو آواز دی۔

اندر دو کمرے تھے اور دونوں پر تالے لگے ہوئے تھے۔ مگر اب آسانی سے تالے کھل سکتے تھے کیونکہ چابیوں کا کچھا وہیں محن میں موجود تھا۔ باہر سے شور شرابے کی آوازیں آرہی تھیں۔ اچانک اے ایس آئی کے گرجنے کی آواز آئی۔ ”تالا کس نے توڑا ہے..... تم لوگوں کو پتا نہیں ہے..... قانونی لحاظ سے یہ جرم ہے؟“

”پولیس.....“ میرے ساتھ اندر آنے والے دو لڑکوں نے گھبرا کر کہا اور وہ باہر نکل گئے تھے۔

درمیان میں کچھ ہو رہا تھا۔ ہم بھیڑ کو چیرتے ہوئے وہاں پہنچے تو واہد بھائی کے بلائے لڑکوں کے ساتھ محلے کے لڑکوں نے بھی عبدال کو گھیر رکھا تھا اور بے دریغ مار رہے تھے۔ میرے ساتھ آنے والے کچھ بزرگ آگے بڑھے اور انہوں نے پوچھا۔

”یہ کیا کر رہے ہو اسے کیوں مار رہے ہو؟“
میں دیکھ رہا تھا کہ عبدال کا حلیہ بگڑ گیا ہے۔ اس کی ناک منہ سے خون بہہ رہا تھا اور اس کا لباس پھٹ گیا تھا۔ لڑکوں نے جو بتایا اس کے مطابق عبدال نہ صرف آج گھر میں رہا تھا بلکہ گشت کرنے والے گاڑی نے اسے دو پہر میں یوں گھر میں داخل ہوتے دیکھا کہ اس کے شانے پر کچھ تھا۔ مگر گاڑی صرف ایک جھلک دیکھ سکا تھا اور پھر عبدال گھر میں چلا گیا اس وقت گاڑی نے اس پر توجہ نہیں دی۔ یہ وہی وقت تھا جب شاہ رخ غائب ہوا تھا۔ مگر جب شاہ رخ کی کم شدگی کا چرچا ہوا اور وہ نہیں ملا تو گاڑی نے یہ بات اے ایس آئی کو بتائی اور پولیس سے یہ بات محلے کے لڑکوں کے علم میں آئی تو وہ مشتعل ہو کر عبدال کے گھر پہنچ گئے۔ گاڑی کے مطابق عبدال نے شانے پر جو چیز لا رکھی تھی اس میں نیلا سارنگ جھلک رہا تھا اور شاہ رخ نے نیلی اور سفید لائنوں والی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ جب لڑکے عبدال کے گھر پہنچے تو وہ تالا لگا کر کہیں جا رہا تھا لڑکوں نے اسے روکا اور پوچھا تو وہ اس نے انہیں گالیاں دیں اور لڑکے اس پر ٹوٹ پڑے تھے۔ میں نے کہا۔

”تم لوگوں نے اس سے شاہ رخ کے بارے میں پوچھا؟“

”اسی کے بارے میں تو پوچھا تھا تو یہ بکواس کرنے لگا فرخ بھائی۔“ محلے کے ایک لڑکے شہزاد نے کہا۔ وہ مار پیٹ کرنے والوں میں پیش پیش تھا۔ میں نے کہا۔
”اس کے گھر کی تلاشی لو۔“

”میرے گھر میں کوئی نہیں جائے گا۔“ عبدال نے پھر کر کہا تو لڑکوں نے ایک بار پھر اسے مارنا شروع کر دیا۔ ایک بزرگ نے انہیں روکا۔

”مارومت پہلے اس کے گھر میں دیکھو۔“
لڑکے رکے تھے کہ عبدال نے عجیب حرکت کی اس نے اپنی نیب سے گھر کی چابیاں نکال کر گھر کے اندر پھینک دیں۔ اس بار میں اس کی طرف بڑھا اور اس کا گریبان پکڑ کر پوچھا۔ ”تم نے چابیاں اندر کیوں پھینکی ہیں اندر کیا ہے جو تم دیکھنے نہیں دے رہے؟“

گیا ہے۔“

مجھ پر شادی مرگ کی سی کیفیت طاری ہو گئی تھی اور میرے ہاتھ سے رضائی چھوٹ رہی تھی کہ میری نظر اس کے نیچے گئی جہاں دو ننھے منے سے پاؤں جھاٹک رہے تھے اور وہ ابل رہے تھے۔ میں نے بے ساختہ رضائی اٹھی تو ایک چار پانچ سال کی بہت پیاری اور معصوم سی بچی اس حالت میں لٹھی ہوئی تھی کہ اس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ اس کے منہ پر ٹیپ چپکا ہوا تھا اور اس کی آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں لیکن وہ سانس لے رہی تھی اور کسی قدر ہوش میں تھی۔ میں نے رضائی ایک طرف پھینک کر اسے پیٹی سے نکالا تو اس کا جسم بالکل سرد ہو رہا تھا۔ حالانکہ وہ خاصی گرمی میں رضائی تلے لٹھی ہوئی تھی۔ میں نے پہلے اس کے منہ سے ٹیپ اتارا۔ وہ سسکیاں لینے لگی تھی اور میں اس کے نازک سے ہاتھ پیروں سے بندھی رہی کھول رہا تھا کہ مجھے خیال آیا اور میں نے چلا کر کہا۔

”یہاں ایک بچی ہے عبدل کو پکڑو۔“

بچی کا سنتے ہی پولیس والے اندر گھس آئے تھے۔ ایک پولیس والا جلدی سے پانی لے آیا اور میں نے تھوڑا تھوڑا کر کے بچی کو پلایا تو وہ ہوش میں آئی اور پھر چیخ چیخ کر رونے لگی۔ میں اسے تسلیاں دیتا اور بہلاتا ہوا باہر آیا۔ لوگ بچی کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ جیسے ہی شاہ رخ کے ملنے کی اطلاع آئی لوگوں نے عبدل کو چھوڑ دیا اور وہ خاموشی سے سرک رہا تھا جب میں نے چلا کر اسے روکنے کو کہا تب اس نے بھاگنے کی کوشش کی مگر لڑکوں نے اسے پھر پکڑ لیا اور میں نے بتایا کہ میں نے بچی کو اندر کس حال میں پایا تو ایک بار پھر لوگوں نے اشتعال میں آکر اسے مارتا شروع کر دیا تھا۔ پولیس نے بروقت آکر اسے چھڑایا ورنہ لوگ اسے مار ہی ڈالتے۔

میں نے کہا۔ ”یہی بتائے گا کہ بچی کو کہاں سے لایا ہے۔“

”اس کا تو باپ بھی بتائے گا۔“ اے ایس آئی بھی مشتعل تھا۔

بچی نے نیلے رنگ کا فرائک پہنا ہوا تھا اور تیلی نیکر تھی میں نے محسوس کیا کہ اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی ہے۔ اس لحاظ سے وہ محفوظ تھی شاید عبدل کو موقع نہیں ملا اور شاہ رخ کی گم شدگی کا شور ہوا تو وہ ڈر گیا تھا۔ ورنہ شاید اب تک وہ اپنی شیطانیت پوری کر چکا ہوتا۔ بچی اب خاموش تھی اور مجھ سے لپٹی ہوئی تھی اس نے کسی اور کے پاس جانے سے انکار کر دیا تھا۔ مجھے شاہ رخ کی بے تاب تھی اس لیے

مگر میں نے چابیاں اٹھائیں اور ایک کمرے کا تالا کھولنے کی کوشش کی۔ دوسری چابی اس میں لگ گئی۔ دروازہ کھول میں نے اندر دیکھا اور تاریکی میں سوچ بورد تلاش کرنے لگا مگر دیوار کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں ملی۔ میں نے موبائل نکال کر اس کی تاریخ آن کی اور اندر داخل ہوا تو پتا چلا کہ وہاں سوچ بورد نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ دیواروں پر بے ہنگم بجلی کی تاریں بکھری ہوئی تھیں اور ان سے لائٹ اور پتکھا منسلک تھا یہ تاریں فرش پر بڑے ایکسٹینشن بورڈ میں لگی ہوئی تھیں۔ کمرے میں کچھ نما سامان بھرا ہوا تھا اس میں پرانے گدے، رضائیاں، بورے اور نہ جانے کیا کیا تھا۔ میں شاہ رخ کو آوازیں دیتے ہوئے سامان دیکھنے لگا۔ ان چیزوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنا آسان نہیں تھا میں نے پہلے یہ مشکل بلب آن کیا اس کا تار بورڈ سے نکلا ہوا تھا۔ روشنی ہوئی تو میں سامان الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ یہاں بہت سی چیزیں ایسی تھیں جن کے نیچے ایک پانچ چھ سال کے بچے کو آسانی سے چھپایا جاسکتا تھا۔ چیزیں ہٹانے کے دوران میں شاہ رخ کو آوازیں دے رہا تھا۔ مگر نہ تو کوئی جواب آیا اور نہ ہی کہیں کوئی حرکت ہوئی تھی۔ ہینڈ منٹ میں میں نے پورا کمرہ دیکھ لیا پھر میں باہر آیا تو صحن میں اے ایس آئی دو پولیس والوں کے ساتھ کھڑا تھا اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

”جناب آپ غیر قانونی کام کر رہے ہیں۔ کسی کے گھر میں یوں گھستا جرم ہے۔“

”میں اپنے بیٹے کو تلاش کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا اور دوسرے کمرے کا تالا کھولا۔ باہر سے عبدل کا شور بدستور سنائی دے رہا تھا مگر اب کوئی اس کے ساتھ مار پیٹ نہیں کر رہا تھا۔ البتہ اسے اندر بھی نہیں آنے دیا تھا۔ میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اس کمرے کا حال زیادہ براتھا۔ یہ رہائشی کمرہ تھا مگر اس میں بھی کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ میں نے پھر شاہ رخ کو آواز دی۔ میرے اندر مایوسی سے آنے لگی تھی شاید وہ یہاں نہیں گاڑا کو غلط بھی ہوئی تھی۔ عبدل کچھ اور لے کر آیا ہوگا مگر گاڑ سمجھا کہ کوئی بچہ ہے۔ مایوسی کے باوجود میں چیزیں الٹ پلٹ رہا تھا۔ ایک طرف لکڑی کی پیٹی تھی۔ اس کا ڈھکن کھلا ہوا تھا میں نے ڈھکن اٹھایا تو اندر بھی گندی پرانی رضائیاں اور کپڑے تھے۔ میں انہیں اٹھانے جا رہا تھا کہ باہر شور سنائی دیا میرا ہاتھ اوپر ری رضائی کا سرا پکڑ چکا تھا اور میں اسے اٹھا رہا تھا کہ کوئی چلا کر بولا۔

”شاہ رخ مل گیا..... فرخ بھائی کو بتاؤ ان کا بیٹا مل

ہو گئی تھی۔ اس کے بعد شور مچ گیا۔ میری تلاش میں لوگوں کو دوڑایا گیا اور کسی نے اتنا نہیں سوچا کہ مجھے کال کر کے اطلاع دے۔ میرے پاس موبائل تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ اگر باہر سے چند سیکنڈ پہلے بھی اطلاع آجاتی تو میں بیٹی کی رضائی نہ اٹھاتا جس کے تلے ایشل تھی۔ اس بار پولیس نے عبدال کے ساتھ صحیح سے تفتیش کی اور اس نے اگل دیا کہ اس نے بیٹی کہاں سے اٹھائی تھی۔ وہ اسے چپس اور ٹافیوں کے بہانے لے آیا تھا۔ علاقے تک وہ اسے چلا کر لایا اور جب گھر کے پاس آیا اور بیٹی نے رونا شروع کیا کہ اسے امی کے پاس جانا ہے تو اس نے اسے کلوروفارم سونگھا کر بے ہوش کیا اور کندھے پر لاد کر گھر میں لے گیا۔ اس کی بد قسمتی اور ایشل کی خوش قسمتی کہ گارڈ نے عبدال کو دیکھ لیا۔ پھر شاہ رخ کی گم شدگی کا شور اٹھا تو وہ گھبرا گیا اور اس نے ایشل کو ہاتھ پاؤں باندھ کر بیٹی میں رضائی تلے ڈال دیا۔ اس کے باوجود اس کے دل میں چور تھا اور اس نے گھر کو تالا لگا کر وہاں سے نکلنا چاہا مگر محلے والے بروقت پہنچ گئے۔

شاہ رخ محفوظ تھا مگر اس کے توسط سے اللہ نے اس معصوم بیٹی کو محفوظ رکھا۔ اس نے مجھے وسیلہ بنایا۔ پولیس نے جلد اس کے ماں باپ کا پتا چلا لیا۔ وہ بھاگتے دوڑتے ہمارے گھر تک آئے تھے کیونکہ سارہ نے بیٹی کو پولیس کی تحویل میں دینے سے انکار کر دیا تھا اور وہ بھی سارہ اور مجھ سے مانوس ہو گئی تھی بلکہ رات گئے وہ شاہ رخ کے ساتھ کھینے اور شوخیاں دکھانے لگی تھی۔ ایشل کے ماں باپ میرا شکریہ ادا کرتے نہیں تھک رہے تھے کہ میں نے جیسے انہیں نئی زندگی دے دی مگر یہ سب خدا کا کرم تھا۔ وہ سب کے بچوں کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ شاہ رخ کے ملتے ہی بابا نے مجھ سے کہا۔

”تم ہمارے ساتھ چلو گے۔ بس اب تم الگ نہیں رہو گے۔“

مزید چند دن بعد عبدال نے اس بیٹی کے قتل و زیادتی کا اقرار بھی کر لیا جس کی لاش جھاڑیوں سے ملی تھی۔ وہی اسے اغوا کر کے لے گیا تھا مگر سخت نگرانی کی وجہ سے وہ لاش باہر نہیں لے جاسکا اور اس نے وہیں جھاڑیوں میں پھینک دی۔ ان دنوں اس کے خلاف مقدمہ چل رہا ہے اسے یقیناً سزائے موت ہوگی مگر سچ سچ کی سزائے موت کب ہوگی اس کا کچھ پتا نہیں ہے۔

میں اسے لے کر ہی روانہ ہو گیا۔ گھر میں جشن کا سماں تھا۔ شاہ رخ سارہ کی گود میں دبا ہوا تھا اور سب اس کے گرد جمع تھے۔ سب میری گود میں بیٹی کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ سارہ نے پوچھا۔ ”یہ کون ہے؟“

میں نے مختصر لفظوں میں بتایا کہ بیٹی کہاں سے اور کس حالت میں ملی تھی۔ باقی یہ کس کی بیٹی تھی یہ تو میں بھی نہیں جانتا تھا۔ سارہ ابھی کچھ دیر پہلے اس مرحلے سے گزر چکی تھی اور اسے اندازہ تھا کہ بیٹی کے ماں باپ پر کیا گزر رہی ہوگی۔ اس نے شاہ رخ کو الگ کر کے بیٹی کو گود میں لے لیا۔ اس بار وہ آرام سے چلی گئی۔ ورنہ پہلے مجھے نہیں چھوڑ رہی تھی۔ میں نے شاہ رخ کو سینے سے لگا لیا۔ میرے دل میں جیسے ٹھنڈ سی پڑ گئی۔ سارہ بیٹی کو پیار کرتے ہوئے اس سے پوچھ رہی تھی کہ وہ کون ہے۔ اس کا خوف کم ہوا تو اس نے بولنا شروع کیا مگر اسے بس اتنا بتانا آ رہا تھا اس کا نام ایشل ہے اور اس کی ماں کا نام شمینہ ہے باپ کو وہ پاپا کہہ رہی تھی۔ اپنے لباس اور انداز سے وہ کسی اچھی فیملی کا حصہ لگ رہی تھی۔ اچھی اس کے ماں باپ کو تلاش کرنا تھا مگر وہ ہمارے پاس محفوظ ہی تھی۔ جلد یا بدیر اس کے گھر والے بھی مل جاتے۔

شاہ رخ کی گم شدگی کی کہانی حیران کن تھی۔ جب اس نے سیما باجی کی بیٹی کو دھکا دیا اور سارہ نے اسے دھکی دی کہ وہ ابھی اسے دیکھتی ہے تو وہ ڈر کے مارے ان کے بیڈ کے نیچے چھپ گیا۔ پھر اس کی ڈھونڈ کا شور مچا تب بھی وہ یہی سمجھا کہ اسے سزا کے لیے تلاش کیا جا رہا ہے۔ وہ بیڈ کے نیچے ہی چھپا رہا۔ پھر سیما باجی گھر کو تالا لگا کر ہمارے ہاں آئیں اور سارہ کے ساتھ رہیں۔ شاہ رخ ان کے گھر میں بند رہا۔ پورا مکتلہ دیکھ لینے کے بعد بھی کسی کو خیال نہیں آیا کہ سیما باجی کے ہاں دیکھ لیا جائے۔ سب نے یہی سوچا کہ وہیں سے تو نائیب ہوا تھا اس لیے وہاں دیکھ لیا ہوگا مگر سارہ کبھی تھی کہ وہ باہر نکل گیا ہے۔ یوں بچہ بغل میں تھا اور ہم اسے سارے شہر میں تلاش کر رہے تھے۔ کچھ دیر پہلے سیما باجی کے شوہر رمیز بھائی گھر آئے اور تالا کھول کر اندر گئے تو انہیں بیڈروم میں کسی بچے کے رونے کی آواز آئی اور جب انہوں نے آواز کے تعاقب میں بیڈ کے نیچے دیکھا تو وہاں شاہ رخ موجود تھا۔ اتنی دیر سے بند رہنے کی وجہ سے وہ خوفزدہ تھا اور جب اس نے کسی کے آنے کی آواز سنی تب بھی باہر نہیں نکلا اور رونے لگا تھا۔ اسے پا کر رمیز بھائی بھاگتے ہوئے ہمارے گھر تک لائے۔ سارہ شاہ رخ کو دیکھ کر پاگل

حوادثِ زمانہ

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم

یہ روداد میرے پڑوس میں رہنے والی نصرت کریے۔ اس نے جب اپنی
رودادِ زندگی سنائی تو مجھے کہانی جیسا مزہ آیا اور میں نے اسے
سرگزشت کے لیے رقم کر دیا اگر مناسب سمجھیں تو اسے
سرگزشت کا حصہ بنا دیں۔
ڈاکٹر عبدالحفیظ



میرے ابو کو یورپ جانے کا اس قدر شوق تھا کہ وہ
اس کی خاطر زندگی کی بازی لگا بیٹھے۔ ہمارا اچھا خاصا گزارہ
ہو رہا تھا۔ اپنا فلیٹ تھا اور ابو ٹھیک ٹھاک کھاتے تھے۔ یہ
بات سمجھ سے باہر ہے کہ 45 سال کی عمر میں بھی وہ یہ فیصلہ
کرتے ہوئے ذرا ہنچکچائے اور نہ ہی ان کو کچھ خوف آیا۔ وہ
اسی کے لاکھ منج کرنے کے باوجود ایک ایجنٹ کے ذریعے
براہ راست ایران ترکی پہنچے اور وہاں سے لانچ کے ذریعے کسی
یورپی ملک جا رہے تھے کہ چالیس آدمیوں کا یہ قافلہ سمندر کی



Copied From Web

لوگوں کا بچا ہوا کھانا ہمیں دیتے ہوئے ان کے دل پر قیامت گزر جاتی ہوگی۔ یہ وہ کھانا ہوتا تھا جو لوگ اپنے بچوں کو کھلانا پسند نہیں کرتے اور اپنے نوکروں کو دے دیتے ہیں۔

مجھ سے امی کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ میں نے ان سے بات کی کہ میں ملازمت کر لیتی ہوں اس طرح ان کا کچھ بوجھ ہلکا ہو جائے گا اور میری تعلیم کسی کام آجائے گی۔ تھوڑی سی رددقد کے بعد انہوں نے مجھے ملازمت کرنے کی اجازت دے دی۔

میں نے نوکری کے لیے گھر سے قدم باہر نکالے تو اندازہ ہوا کہ لوگ کس طرح کے جال بچھائے بیٹھے ہیں۔ یہ ہوس پرست مجھے لوٹ کا مال سمجھتے اور مختلف ذریعے سے اپنا الوسیدھا کرنے کی کوشش میں لگے رہتے۔ کوئی باتوں ہی باتوں میں مجھے پھانسا چاہتا تھا تو کوئی دولت کے سنہری جال میں قید کر کے میری عزت سے کھیلنے کے درپہ تھا۔ میں نے دو مختلف جگہوں پر ملازمت کی اور بمشکل ایک ایک ماہ ہی گزار سکی۔ یہ دو ماہ مجھ پر کچھ اس طرح گزرے کہ بسا اوقات میں خودکشی تک کا سوچنے لگتی تھی مگر پھر یہ خیال آتا کہ زندگی ایک بار ملتی ہے، مشکلات سے گھبرا کر اسے موت کی نذر کر دینا کسی بھی طرح مناسب نہیں ہوتا۔

یہ میری تیسری ملازمت تھی۔ امپورٹ ایکسپورٹ فرم تھی۔ انہوں نے نوکری کے لیے اخبار میں اشتہار دیا تھا جس کے جواب میں، میں نے ایلانی کیا اور ریکی کارروائیوں کے بعد مجھے ملازمت مل گئی تھی۔ تنخواہ بہت اچھی تھی۔ دیکھنے میں نجی صاحب جو کمپنی کے پارٹنر اور میرے باس تھے۔ نیک اور بردبار نظر آتے تھے۔ میں بہت خوش تھی کہ خدا نے میری سن لی ہے۔ دفتر میں میرے اور نجی صاحب کے علاوہ ایک بزرگ چہرہ اسی تھا۔ نجی کا پارٹنر مسٹر حمید تو باہر کے کام ہی میں مصروف رہتا تھا۔ کبھی گھنٹے آدھ گھنٹے کے لیے آ جاتا تھا۔ کام مشکل نہ تھا۔ پھر بھی نجی صاحب نے مجھے بڑے خلوص سے سمجھایا۔ میں بھی کام محنت سے کرتی تھی اور اگر کچن کی صفائی چہرہ اسی ٹھیک طرح سے نہیں کرتا تھا، میں وہ بھی فارغ وقت میں کر دیتی تھی۔

ہمارا دفتر چوتھے فلور پر تھا۔ نجی صاحب میرے کام سے بہت خوش تھے۔ حمید صاحب سے میری بڑی تعریفیں کرتے۔ حقیقت یہ تھی کہ کام میں وہ میری ابھی تک بہت مدد کر رہے تھے اور بڑے نرم لہجے میں مجھے سمجھاتے۔ میں

نذر ہو گیا۔ لوگ۔ میری اس بات کو مانیں یا نہ مانیں مگر میں تو ان کے اس قدم کو سراسر خودکشی ہی کہوں گی۔

ہم تین بہن بھائی تھے۔ میں سب سے بڑی تھی۔ میرا نام نصرت ہے مجھ سے چھوٹا بھائی تھا جس کا نام امجد اور چھوٹی بہن مسرت ہے۔ یہ دونوں مجھ سے بہت چھوٹے ہیں۔ ان کی عمریں بالترتیب 10 اور 8 سال تھیں۔ یہ خدا کا بڑا احسان تھا کہ اس مہنگائی کے زمانے میں ہمارے سر پر چھت موجود تھی۔ ابو نے یہ خوب صورت فلیٹ خریدا تھا۔ یہ شہر کے عین وسط میں ہے۔ ابتدائی ایام میں تو گھر میں موجود جمع پونجی سے گزارہ ہوا پھر بعد میں بگڑتے حالات اور مہنگائی کے باعث امی کو اپنے زیور فروخت کرنا پڑے جس کے بعد دوسری اشیاء کی باری آتی رہی۔ نوبت یہاں تک پہنچی تھی کہ گھر کے فالتو کبل اور میرے ان سلعے کپڑے تک اپنے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے بیچ دیے گئے۔ ہمارے زیادہ تر رشتے دار بھارت میں تھے جو چند ایک یہاں تھے وہ خود ہماری طرف سے اس مہنگائی میں بمشکل اپنا گزارہ کر پارہے تھے۔ امی کے لیے مصیبتوں کا گویا ایک پہاڑ کھڑا تھا۔ گھر میں دو بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ بیٹا بہت چھوٹا تھا۔ اب میں ہی وہ واحد فرد تھی جسے اپنے کاندھوں پر یہ بوجھ اٹھانا تھا۔ میں سب سے بڑی تھی یا شاید ابو کی موت کے بعد بڑی ہو گئی تھی۔ کیوں کہ میں نے ابھی صرف انٹری پاس کیا تھا۔ لہذا سمجھ لیں کہ میں کتنی بڑی رہی ہوں گی۔ مجھے اس بے رحم اور سفاک معاشرے اور زمانے کی کچھ خبر نہیں تھی۔ جب گھر کا سامان بھی ٹھکانے لگ چکا تب فلیٹ کے بارے میں سوچا جانے لگا۔ وہ ہماری ضرورتوں سے زائد تھا۔ اچھے علاقے میں ہونے کے باعث اس کی قیمت زیادہ مل سکتی تھی۔ یہی فیصلہ کیا گیا کہ اسے فروخت کر کے کسی چھوٹے اور پسماندہ علاقے میں مکان لے لیا جائے۔ جہاں پر اشیاء ضرورت بھی سستی ہوتی ہیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ امی خود کچھ کام کرنا چاہتی تھیں جو اس علاقے میں رہتے ہوئے ممکن نہ ہوتا چنانچہ ہم سب یہاں سے ایک دوسرے علاقے میں منتقل ہو گئے۔ امی کی تعلیم کچھ بھی نہ تھی۔ لہذا وہ سوائے گھروں میں کام کرنے کے کچھ بھی نہ کر سکتی تھیں۔ چنانچہ اس علاقے میں آ کر انہوں نے نہ ہمت کی اور اس باس کے اچھے گھروں میں اوپری کام کرنے لگیں۔ وہ صبح کو نکلتیں اور دوپہر 4 بجے تک لوگوں کے گھروں کا بچا کھچا کھانا لے کر گھر واپس آ جاتیں۔ میں نے کئی مرتبہ انہیں چوری چوری روتے دیکھا تھا۔ یقیناً

مشکل میں نہ ہوتی۔ ابو مجھے اکثر بیٹی نہیں بیٹا کہا کرتے تھے اور حقیقت میں اب مجھے اس چھوٹے سے خاندان کا بیٹا بن کر زندہ رہنا تھا۔ میں کچھ دیر تذبذب کے عالم میں کھوٹی رہی۔ پھر میں نے چائے کا ایک گھونٹ لے کر کام شروع کر دیا۔

دو پہر دو بجے نجی اور حمید صاحب دونوں ہاتھ میں کچھ کھانے کی چیزیں لے کر آگئے۔ مجھے کام میں مصروف دیکھ کر نجی بولے۔ ”بھئی کام وام چھوڑ دو۔ پہلے پیٹ پوجا پھر کام دو جا۔ جلدی سے اٹھ جاؤ اور یہ کھانا لگاؤ۔“

وہ کچھ زیادہ شوخ ہو رہے تھے۔ میں آہستہ آہستہ اٹھ کر کچن میں گئی تو وہ بھی آگئے اور خود ہی برتنوں کو ترتیب سے رکھ کر مجھے اندر والے روم میں آنے کو کہا۔ یہ روم صرف حمید صاحب کے لیے مخصوص تھا۔ نجی نے میرے سے پہلے ہی کمرے میں دسترخوان بچھا دیا تھا۔ میں کھانا وغیرہ رکھ کر آگئی کیوں کہ میں اپنا بیچ گھر سے ساتھ لاتی تھی۔ میں ابھی کرسی پر بیٹھ بھی نہیں پائی تھی کہ نجی نے مجھے بلایا۔ ”یہ کیا ہے؟ میں نے کل کہا تھا کہ اب تم خود کو اس ٹیم کا حصہ سمجھو، ایسی بے رخی، حمید کیا سوچے گا۔“

وہ ایسے بول رہے تھے جیسے ہم سال دو سال سے ساتھ ہیں۔ مجھے سات، آٹھ دن جیسے تیسے کاٹنے تھے۔ میں ان کے ساتھ جا کر ایک طرف بیٹھ گئی۔ کھانا کھاتے ہی نجی اٹھ کھڑا ہوا اور بولا۔ ”آج میں آپ لوگوں کو چائے بنا کر پیش کروں گا۔ کیوں کہ ان یادگار خوشگوار لمحوں کو میں مزید تقویت دینا چاہتا ہوں۔“ مگر اس سے پہلے کہ نجی کچن میں جاتے، میں کھڑی ہوئی اور بولی۔

”نہیں سر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ میرے ہوتے ہوئے آپ کچن میں کام کریں۔ آپ پلیز بیٹھئے۔“

”جیسے آپ کی مرضی۔“ نجی نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا اور بیٹھ گئے۔ پھر چائے پر ہلکی پھلکی باتیں ہوتی رہیں۔ یوں ایک دن خیریت سے اور گزر گیا۔

رات کو میں خود سے سوالوں جوابوں کی جنگ لڑتی رہی مگر سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ نجی مجھ سے اب بات کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے تھے۔ ویسے بھی وہ نمبر 2 قسم کا آدمی تھا۔ اچھا خاصا پڑھا لکھا بندہ ایسے کام کیوں کرتا ہے؟ میری سمجھ سے باہر تھا۔ اس کی اپنی ایک چھوڑ دو بیٹیاں تھیں جو ہائی اسکول میں پڑھتی تھیں۔ آج نہ سہی کل وہ جوان ہو جائیں گی۔ اس دن آتے ہی نجی نے نحوست پھیلا دی۔

کیس دن ہوئے تھے مجھے یہاں کام کرتے ہوئے کہ میری بد نصیبی مجھے یہاں لے آئی۔ ہوا یوں کہ میں کافی بنا کر لائی تو نجی صاحب بڑے خوش گوار موڈ میں تھے۔ کیوں کہ میں تو 9 بجے آجاتی تھی، وہ 11 بجے کے بعد آتے تھے۔ نور محمد آج نہیں آیا تھا۔ وہ بیمار تھا۔ انہوں نے ضد کر کے مجھ سے کافی بنوائی اور ساتھ بیٹھ کر پینے کے لیے بھی کہا۔

”دیکھو نصرت تم مجھے ہر وقت صاحب صاحب کہہ کر مت مخاطب کیا کرو۔ ہم سب ایک ہیں اور تم ابھی تک ماحول کو سمجھ نہیں پا رہی ہو۔ اس لیے ضروری ہے ہم اب ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں اور تم مجھے بھی کہہ کر مخاطب کر سکتی ہو۔“

میں ابھی تک ان کے پاس ہی کھڑی تھی۔ میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر بیٹھنے کو کہا تو میری پیشانی عرق آلود ہو گئی۔ بجائے میں خوش ہوتی مجھے بد نصیبی کی بو آنے لگی۔ میں نے جلد ہی خود کو بیجان سے نکالا اور ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ سلاکس کا ایک ٹکڑا کاٹ کر کھاتے ہوئے نجی کی طرف دیکھا تو وہ مجھے پھر سمجھانے لگے۔ ”یہ دنیا کیا عجیب دنیا ہے۔ یہاں ہر انسان غیر محفوظ ہے۔ کوئی غربت سے پریشان ہے، کوئی اپنی بیوی کی بیماری سے پریشان ہے اور کوئی.....“ نجی نے جان بوجھ کر جملہ ادھورا چھوڑا تھا اور کافی کا گگ اٹھاتے ہوئے بڑی رکھائی سے بولے۔ ”میں تمہارا دکھ سمجھتا ہوں۔ تم دل چھوٹا نہ کرو۔ میں تمہاری تنخواہ جلد ڈبل کروا دوں گا۔ تم ذرا، جب حمید آیا کرے تو ان سے تھوڑا مسکرا کر میرا مطلب ہے.....“

میں چند سیکنڈ تو مبہوت رہی نجی کی باتیں مجھ پر بڑی شاق گزر رہی تھیں لیکن میں نے یہ محسوس نہیں ہونے دیا تھا۔ یہ اس لیے کہ مجھے پہلے بھی ایسا تجربہ ہو چکا تھا۔ اس وقت میں نے اشتعال میں آ کر نوکری چھوڑ دی تھی لیکن اب ایسا نہیں تھا۔ تنخواہ تک خود کو جیسے تیسے بھی ان لوگوں کو برداشت کرنا تھا۔ نور بابا دوسرے دن بھی آفس نہیں آیا تو مجھے کچھ گڑبڑ سی لگی۔ پھر میں نے دل میں سوچا کہ میں کوئی ہاٹ کیک نہیں ہوں۔ دیکھا جائے تو آج میں نے صفائی بھی نہیں کی۔ صرف اپنی میز اور کرسی پر کپڑا مار کر بیٹھ گئی اور اپنا کام کرنے لگی مگر میرے ذہن میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ میں پٹی سیٹ سے اٹھ کر کچن میں گئی اور ایک کپ چائے بنا کر میز پر رکھ دی۔ اگر والدہ صاحبہ آدمی چھوڑ پوری کے چکر میں نہ پڑتے تو آج ان کی لاڈلی بیٹی اس

”بیٹا! میں تو اسی دن سمجھ گیا تھا جس دن تمہیں جاب ملی تھی مگر میری مشکل یہ ہے کہ مجھے نوکری کرنی ہے اور اس کے لیے حکم زباں بندی ہے مگر تمہاری خاطر میں زبان بند نہیں رکھوں گا۔ کیوں کہ تم حتم ہو اور مجبوری میں آتی ہو۔ حمید صاحب بہت بڑے بزنس مین ہیں۔ ان کی ٹرانسپورٹ کمپنی ہے۔ میں بچپس گاڑیاں چلتی ہیں اور شیئرز کا کام بھی کرتے ہیں مگر عیاش ہیں۔ میں تو حیران تھا کہ تمہارے ساتھ اتنے دنوں میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی۔ یہ بہت عیاش لوگ ہیں۔ تین مہینے پہلے حمید صاحب کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ جو این کے چہرے پر نشان ہے یہ ایکسیڈنٹ میں ہی چوٹ لگی تھی اور بھی بہت چوٹیں آئی تھیں مگر بچ گئے۔ ایک ہفتہ اسپتال میں رہے۔ جب سے انہوں نے تو یہ کر لی ہے۔ شاید اسی لیے شادی کا کھیل کھیلنا چاہ رہے ہیں۔ اگر دولت کا لالچ ہے تو دولت یہاں بہت ہے مگر ان وحشیوں کا کیا بھروسا؟“

میں نے بابا نور محمد کا شکر یہ ادا کیا اور آج بھی اس بزرگ کی احسان مند ہوں۔ تنخواہ کے بعد میں نے نوکری چھوڑ دی۔ دوسرے دن میری سیکلی یا سمین بھی آگئی۔ یہ میری چوٹی کلاس کی کلاس فیلو ہے۔ بہت ہی انس کھ، گورا رنگ اور بڑی بڑی عثمانی آنکھوں نے اسے اور حسین بنا دیا تھا۔ کھاتے پیتے لوگ تھے۔ ان کے والد کا اپنا کاروبار تھا۔ ابو کی وفات کے بعد جب بھی وہ آتی دوپہر کے وقت آتی اور ہمارے لیے بریانی اور فروٹ وغیرہ ضرور لاتی۔ یہ سارا دن فلک شکاف قہقہے لگاتی اور ہنسا ہنسا کر ہمارے پیٹ میں درد کر دیتی۔ بہت زندہ دل ہے۔ آج بھی وہ کھانا ساتھ لے کر فلک شکاف قہقہوں کے ہمراہ گھر میں داخل ہوئی۔ امی کو سلام کرنے اور کھانا ہنگن میں رکھنے کے بعد مجھے میرے کمرے میں دھکیلتے ہوئے بولی۔ ”اب بتاؤ کیوں نوکری چھوڑی؟“

”وہی پرانی کہانی یار۔“ میں نے چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے بتایا تو اس نے ایک لمبی سانس لی اور تھوڑی سی خاموشی کے بعد بولی۔

”اس طرح تو بڑی مشکل ہو جائے گی نوکری تمہاری ضرورت ہے مگر تم فکر نہ کرو اللہ بہتر کرے گا۔“ اس نے مجھ سے ساری کہانی مزے لے کر سنی۔ پھر زردار قہقہہ مارتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”مجھے ای کو لے کر ڈاکٹر کے پاس بھی جانا ہے۔“ ہاتھ ملا کر خدا حافظ کہہ کر چلی گئی۔ میرے

ایک فائل لانے کو کہا اور ساتھ بیٹھنے کی فرمائش کر دی۔ میں ان کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ فائل کے اندر سے ایک انوائس ہاتھ میں لیتے ہوئے بولے۔ ”نصرت ہر لڑکی نے شادی تو کرنی ہی ہوتی ہے اور ایسے اچھے موقعے بار بار نہیں ملتے۔ حمید صاحب تم کو کہاں سے کہاں پہنچانا چاہتے ہیں یہ تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔“ پھر میرے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے تھوڑے توقف کے بعد بولے۔ ”وہ کوئی بوڑھا تھوڑی ہے۔ وہ تم سے شادی ضرور بنا کر رہا ہے۔ اس کی بیوی بیمار رہتی ہے۔ بیماری نے اسے چڑھی بنا دیا ہے۔“ وہ مسلسل بولے جا رہے تھے کہ میں نے کہا۔ ”میں چائے بناؤں؟“

”ہاں ہاں کیوں نہیں مگر دو کپ بنا کے لانا اکیلے چائے پینے میں مزہ نہیں آتا۔“ ابھی نجی نے بات ختم بھی نہیں کی تھی کہ میں چائے بنانے کے لیے اٹھ گئی۔ میرا دل تو چاہ رہا تھا۔ چائے نہیں کچلا کھلا دوں۔ مرنی کیا نہ کرتی۔ مجھے یہ باتیں کچھ دن برداشت کرنی تھی۔ میں ابھی چائے بنا ہی رہی تھی کہ نور محمد آ گیا۔ نجی نے بلند آواز میں مجھے پکارا۔ ”نصرت تم آ جاؤ نور محمد آ گیا ہے۔“

میں آ کر سامنے بیٹھ گئی۔ ”ہاں تو تم نے کیا سوچا؟“ ”سر میری امی ابھی بیمار ہیں اور یہ میری سمجھ تو.....“ ”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ تمہاری امی اللہ کرے جلد تندرست ہو جائیں پھر تم بات کر لینا کوئی پر اہم ہو تو کسی تکلف کے بغیر ہمیں بتا دینا۔ ہم شیئرز کر لیں گے۔“

نجی کی بات ختم ہوتے ہی موقع ضائع کیے بغیر میں نے آہستہ سے کہہ دیا۔ ”سر کچھ ایڈوائس رقم مل جائے.....!“

”ٹھیک ہے میں سمجھ گیا۔“ نجی نے پانچ ہزار روپے میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔ ”ان سے کام چل جائے گا؟“

”جی ہر چل جائے گا۔ بہت بہت شکریہ۔“ ”اس میں شکرے کی کیا بات ہے۔ تم ہمیں ہر مشکل میں کام آنے والا پاؤ گی۔“ تھوڑی دیر بعد ہی نجی کچھ کاغذات لیے، چلے آئے۔ نجی کے جانے کے بعد میں نے آج کا کام جلدی ختم کر کے بابا نور محمد، جنہوں نے کئی دن بعد آفس جوائن کیا تھا ان کو بلا کر ساری بات بتائی تو وہ بولے۔

دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا تھا۔

چار بجے میں ماریہ سے ملنے اس کے اسکول چلی گئی۔ ماریہ اسکول کی پرنسپل ہے۔ اس نے مجھے پڑھانے کی آفر دی تو میں نے ہاں کر دی۔ کیوں کہ اسکول کا ماحول بہت اچھا تھا۔ یہ دوپہر کی شفٹ کا اسکول تھا۔ 15 سو روپے تنخواہ کے ساتھ دونوں بہن بھائیوں میں سے ایک کی فیس الاؤنس میں ہو گئی۔ اس طرح اٹھارہ سو روپے بن جاتے تھے۔ اس ملازمت سے میرا نے خود کو بڑا ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ یہاں وقت کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔ صبح گھر کا کام کاج ختم کرتے ہی اسکول ٹائم ہو جانا پھر میں تیار ہوتی۔ بہن بھائیوں کو ساتھ لیتی اور اسکول پہنچ جاتی۔ جیسے تیسے چھ ماہ گزر گئے۔ رفیق صاحب کی دکان سے دال، چاول، آٹا، تیل اور ضروریات کی چیزیں آتی ہیں۔ ان سے پرانے تعلقات تھے وہ منح نہیں کرتے تھے ورنہ عام لوگوں کا تو وہ پانچ تاریخ تک اگر پیسے نہ آئے تو کھانا بند کر دیتے تھے۔ ہمارے ساتھ ایسا نہیں تھا۔ امجد علی کو جب بھی جیتی تو وہ سامان دے دیتے۔ انہوں نے مل بھی بھیج دیا تھا۔ ہماری طرف چار ہزار نکل رہے تھے۔ جس کا مطلب تھا پیسے ادا کر دیے جائیں۔ میں نے مل اپنے پاس ہی رکھا۔ امی کو نہیں دیا۔ امی کو ویسے بھی اب ہائی بلڈ پریشر رہتا تھا۔ بات سمجھ سے باہر تھی۔ ادھر مسرت اور امجد کے یونیفرم کا بھی مسئلہ تھا۔ کتابیں تو اسکول سے پرانی دستیاب ہو گئی تھیں۔ اس کشمکش میں ایک ہفتہ گزر گیا۔ اس دوران میں سو روپے کی خاص ضرورت پیش نہیں آئی مگر اب ضرورت تھی۔ اس بار سووا لینے میں خود گئی۔

”سلام انگل۔“ میں نے مسکراتے ہوئے ایک ہزار روپے دیے اور آٹھ سامان کی لسٹ بھی تھما دی۔ وہ ولیم السلام کہہ کر مسکراتے ہوئے بولے۔ ”ایک ہزار لائی ہو اور بارہ سو کے سامان کی لسٹ ہے۔“

جواب میں، میں نے مسکرانے کے سوا کوئی جواب نہ دیا اور اس طرح میں سامان لے کر آ گئی۔ وقت زیادہ جب بھی مشکل ہو تو خدا ہم پر مہربان ہو گیا۔ نعمان صاحب، ابو کے دور کے رشتے دار اچانک ایک دن ہمارے گھر تشریف لائے اور جاتے ہوئے ایک لفافہ امی کو دے گئے۔ لفافہ کھولا تو اس میں تین ہزار روپے تھے۔ اس کے بعد نعمان صاحب ہر ماہ باقاعدگی سے تین ہزار روپے بند لفافے میں دینے لگے۔ انکل کشم میں اچھے عہدے پر فائز تھے۔ ہم ایک بار گلشن اقبال میں ان کی کوشی میں ان کی بڑی صاحبزادی

ایک دفعہ مجھے ایک دوست کے پوتے کی شادی پر اسلام آباد جانا ہوا۔ اسلام آباد پہنچ کر مجھے پیغام ملا کہ ایک بابا آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ میں بابوں کا بڑا دیوانہ ہوں۔ چنانچہ میں ان سے ملنے ان کے پاس گیا۔ جب میں ان کے پاس گیا تو کہنے لگے۔ تم بڑی مٹھا مٹھا باتیں بتاتے ہو۔ میں تم کو Warn کرتا ہوں۔ (یہی لفظ انہوں نے استعمال کیا)۔ تم لوگ بہت بے خیال ہو گئے ہو اور ایک بہت خوفناک منزل کی طرف رجوع کر رہے ہو۔ میں تم کو بتاتا ہوں یہ پاکستان ایک معجزہ ہے، یہ جغرافیائی حقیقت نہیں ہے۔ تم بار بار کہا کرتے ہو ہم نے یہ کیا، پھر یہ کیا، پھر سیاست کے میدان میں یہ کیا، پھر اپنے قائد کے پیچھے چلے، ہم نے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ ایسے مت کہو۔ پاکستان کا وجود میں آنا ایک معجزہ تھا، اتنا بڑا معجزہ ہے جتنا بڑا قوم شہود کے لیے اونٹنی کے پیدا ہونے کا تھا۔ اگر تم اس پاکستان کو حضرت صالح کی اونٹنی سمجھنا چھوڑ دو گے تو نہ تم رہو گے نہ تمہاری یادیں رہیں گی۔ تم نے صالح کی اس اونٹنی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ ہاون برس گزر گئے تم نے اس کے ساتھ وہی رویہ اختیار کیا ہوا ہے جو شہود نے کیا تھا۔ اندر کے رہنے والوں اور باہر کے رہنے والوں دونوں کو Warn کرتا ہوں، تم سن سنبھل جاؤ، ورنہ وقت بہت کم ہے۔ اس اونٹنی سے جو تم نے چھینا ہے اور جو کچھ لوٹا ہے۔ اندر کے رہنے والوں کو لوٹاؤ اور اس کو دو اور باہر کے رہنے والوں۔ ساؤتھ ایشیا میں سارے ملکوں کو Warn کرتا ہوں، اس کو کوئی عام چھوٹا سا، معمولی سا جغرافیائی ملک سمجھنا چھوڑ دیں۔ یہ حضرت صالح کی اونٹنی ہے۔ ہم سب پر اس کا ادب اور احترام واجب ہے۔ اس کو ایک معمولی ملک نہ سمجھنا اور اس کی طرف رخ کر کے کھڑے رہنا اور اب تک جو کوتاہیاں ہوئی ہیں ان کی معافی مانگتے رہو اور اس کو Recompensate کرو۔ میں ان کی کسی بات کا کوئی جواب نہ دے سکا اور خوف زدہ ہو کر کھڑا رہا اور پھر ان کو سلام کر کے سر جھکا کے واپس چلا آیا۔

افتباس: زاویہ از اشفاق احمد

ہی کہنے لگی۔ ”ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے تم غم کیوں کرتی ہو۔ ہم مرتھوڑی گئے ہیں۔“ پھر ایک زوردار قہقہہ مارتے ہوئے بولی۔ ”تم نے تو گھر بیٹھے ہی مرغا کاٹ ڈالا ہے۔ چلو اٹھو میرے لیے ایک اچھی سی چائے بنا کر لاؤ۔“

میں کچن میں چلی گئی تو اس نے امی کو سمجھایا جو انکل کو فرشتہ کہہ رہی تھیں۔

یاسمین جاتے ہوئے کہہ گئی تھی کہ ”یہ ڈریس سلوانا نہیں، ابھی اس مہذب اور عزت دار انسان کا دوسرا روپ کھل کر سامنے آجائے دو۔“

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے چلی گئی مگر مجھے پھانسی کا پھندا قریب سے قریب ہوتے ہوئے دکھائی دے رہا تھا۔

ابھی ہفتہ بھر بھی نہیں گزرا تھا کہ سانپ کھیلے سے باہر آ گیا۔ اس روز میں بالکونی میں بیٹھی چاول چن رہی تھی کہ امی میرے پاس آ کر بیٹھ گئیں اور چاول چننے لگیں پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔ ”میں دو تین روز سے تم سے کچھ کہنا چاہ رہی تھی کہ نعمان ابھی جوان ہے اور امجد، مسرت کا خیال بھی رکھتا ہے۔ اچھی تنخواہ ہے۔ کار، بنگلا ہے۔ وہ اگر تم سے شادی کرنا چاہتا ہے تو.....“ امی ابھی پوری بات بھی نہ کہہ پائی تھیں کہ مجھے ایسا لگا میرے سر سے جھت ہی نہیں پاؤں سے زمین بھی کسی نے سمجھ لی ہے۔ امی مسلسل نعمان صاحب کے لیے تعریفوں کے پل بانڈھے جا رہی تھیں اور مجھے یہ باتیں شاک گزر رہی تھیں۔ میں نے چاول کا تھال ای کو پکڑا تے ہوئے غصے سے کہا۔ ”جو آپ کی مرضی وہ کریں، اب پلیز کچھ اور مت بولیے۔“ میں روتے ہوئے اپنے بیڈ پر آ کر ڈھس گئی اور رات کا کھانا کھائے بغیر ہی سو گئی۔

میں یہ بات یاسمین کو ابھی بتانا نہیں چاہتی تھی۔ جب گھر کو آگ لگ جائے گھر کے چراغ سے تو پھر کسی سے کیا گلا کیا شکوہ۔ میں نے تو خود فیصلہ کیا ہوا تھا۔ مسرت کی شادی سے پہلے شادی نہیں کروں گی اور بھائی کی تعلیم مکمل ہونے تک اس گھر کو نہیں چھوڑوں گی۔ یہاں تو معاملہ ہی اور تھا۔ ماں نے فیصلہ صادر کر دیا تھا اور یہ زہر کا پیالہ مجھے بہر حال پینا تھا۔

نعمان صاحب نے گھر کی حالت ہی بدل دی تھی۔ پرانا صوف پھینکوا دیا تھا، فرنیچ، ٹی وی سب نئے آگئے تھے۔ اس دن نعمان صاحب جیسے ہی گھر میں آئے دس منٹ بعد تیل بجی۔ ہم ابھی سوچ ہی رہے تھے کہ نعمان صاحب خود اٹھ کر باہر والے دروازے پر گئے مگر دروازہ

نورین کی شادی پر گئے تھے۔ بڑے بڑے چار بیڈروم بڑا سا ٹی وی لائونڈرائز اور لان میں بہت سے پھولوں کے پودے تھے جن میں گلاب کے پودے بہت نمایاں تھے۔ نعمان صاحب ہمارے لیے فرشتے سے کم نہ تھے۔ بھائی کو الگ خرچی دے جاتے۔ اگر دوران میں، میں نے بی اے کا امتحان پاس کر لیا تھا۔ امی اب کام پر نہیں جاتی تھیں۔ میں نے منع کر دیا تھا۔ آج اسکول کی چھٹی تھی۔ شام کے چار بجے میں کمرے سے باہر نکلی تو میں نے دیکھا نعمان صاحب آئے ہوئے ہیں۔ میں سلام کر کے واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد ہی انکل نے امجد کو مجھے بلانے کے لیے بھیجا۔ میں آ کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئی۔ میں ابھی کچھ استفسار کرتی پائی تھی کہ نعمان صاحب بول پڑے۔ ”ان دونوں کو تو میں ساتھ لے جا رہا ہوں شاپنگ پر۔ تم بتاؤ ساتھ چلو گی یا پھر اپنی پسند کے کپڑے تمہارے لیے لے آؤں۔“

”جی ہاں ان کو لے جائیے۔“ میں میز پر سے چائے وغیرہ کے برتن لے کر کچن میں چلی گئی۔ انکل ان دونوں کو ساتھ لے کر چلے گئے۔

”امی یہ سب کیا ہے؟“ میں برتن رکھتے ہوئے بولی۔

”کیا ہے؟“ امی نے الٹا مجھ سے سوال کر ڈالا۔

”امی یہ سب مجھے اچھا نہیں لگ رہا ہے۔ انکل اب آئے دن چلے آتے ہیں۔ کتنی قیمتی چیزیں مسرت کو اور امجد.....“

”خدا ترس آدمی ہے۔“ امی نے میری بات کاٹ کر اتنا ہی کہا تھا کہ میں بولی۔

”نہیں امی ایسا نہیں ہے کچھ گڑبڑ ہے۔“

امی میرا منہ دیکھتی رہ گئیں اور میں اپنے کمرے میں چلی آئی۔

انکل درگھنے بعد شاپنگ سے واپس آگئے تھے۔ بھائی کو کپڑے، مسرت کو گڑیا، سوٹ اور میرے لیے تین عدد ڈریس اور ایک گولڈ کینیسلکس لائے تھے۔ سامان دے کر فوراً چلے گئے تھے کہ ان کے گھر سے فون آ گیا تھا۔ میں نے ساتھ والے فلیٹ سے فون کر کے یاسمین کو بلا لیا تھا۔ یاسمین آدھے گھنٹے میں پہنچ گئی تھی۔ میں نے جب اسے ساری چیزیں دکھائیں تو وہ بولی۔ ”دال میں کچھ کالا ہے۔ بنو میری ذہن بنے گی۔“

میں پہاڑ تھمیر ہو رہی تھی۔ مجھے پریشان دیکھ کر وہ خود

کھولنے کی بجائے پریشان سے لوٹ آئے انہوں نے اپنی بیگم کی آواز پہچان لی تھی۔ خوف کے مارے ان کی پیشانی عرق آلود ہو گئی تھی۔ وہ جلدی سے اوپر چھت پر چلے گئے۔ کیوں کہ ہمارا قلیہ آخری منزل پر تھا۔ اس لیے لگڑی کھڑکی سے چھت پر جانے کا راستہ تھا۔

امی نے جا کر دروازہ کھولا تو ماں بیٹا سلام کر کے اندر آ گئے۔ امی بھی آ کر ان کے ساتھ بیٹھ گئیں۔ سلام دعا کے بعد خود مسز نعمان بولیں۔ ”ہم آپ کا فلیٹ دیکھنے آئے ہیں کیوں کہ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ علاقہ چھوڑ کر کوئی اچھا سا فلیٹ خرید لیں وہاں آئے دن چوریوں، ڈاکہ بڑنے لگے ہیں۔“ پھر اٹھتے ہوئے بولیں۔ ”اگر آپ برات مانیں تو میں بیڈروم اندر سے دیکھ سکتی ہوں۔“

ہماری بھی شکی کم ہو گئی تھی۔ میں نے انہیں ایک ایک کر کے سارے کمرے حتیٰ کہ بالکونی بھی دکھا دی۔ امی اتنے میں چائے اور کچھ لوازمات ڈرائنگ روم میں میز پر رکھ چکی تھیں۔ پھر وہ ہاتھ روموں کے دروازے غور سے دیکھتے ہوئے میرے ساتھ آ کر ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئیں۔ کیوں کہ دروازے سارے کھلے ہوئے تھے اس لیے انہیں ہاتھ روموں کو دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ کچن دیکھنے کی خود ہی انہوں نے ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ پھر وہ جلدی جلدی چائے ختم کر کے یہ کہہ کر چلی گئیں کہ مجھے ذرا جلدی ہے پھر بھی۔

امی نے باہر کا دروازہ بند کر کے نعمان کو اوپر جا کر بتا دیا کہ چلی گئی ہے۔ نعمان صاحب نیچے آئے تو ان کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ بات تک نہیں ہو پارہی تھی۔ پانی کا ایک گلاس پینے کے بعد ٹیڈ پیر جیب سے نکال کر پیشانی کو صاف کر کے تھوڑا ہنستے ہوئے بولے۔ ”اس سے تو بدلہ میں لوں گا ذرا شادی ہو لینے دو۔ میری جاسوسی کرتی ہے۔ الو کی بچی۔“ قہر بنا دوں گا۔“ پھر بات کرتے کرتے آنکھیں بند کر کے صوفے پر جوتوں سمیت ڈھیر ہو گئے۔ کوئی آدھ گھنٹے بعد ہاتھ روم گئے اور ہاتھ روم سے نکلے تو کچھ نارمل نظر آئے۔ امی کو ایک لفافہ دے کر چلے گئے۔ میں نے فوراً امی سے لفافہ لے لیا۔ پورے پچاس ہزار روپے تھے۔ میں نے لفافہ واپس امی کو دے دیا اور اپنے نصیبوں کے لکھے کے بارے میں سوچنے لگی۔ اللہ تعالیٰ اگر اولاد دے تو پہلی اولاد لڑکا دے۔ میں نے یاسمین کو بلانے اور بتانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یاسمین کو جب میں نے فون پر بتایا کہ نعمان کی بیوی آئی

تھی، باقی آنے پر بتاؤں گی تو وہ دوڑی چلی آئی۔ آتے ہی امی کو سلام کرتے ہوئے میرے کمرے میں چلی آئی۔ میں نے اول تا آخر ساری کہانی سنا دی۔ شادی والی بات سنتے ہی وہ اچھل پڑی۔ ”تم سے بڑا بے وقوف نہ کوئی پیدا ہوا ہے نہ ہوگا۔ اتنا اچھا موقع ضائع کر دیا۔ تم سیدھی اس کو چھت پر لے جاتیں اور پھر تماشا دکھائیں۔ مسز نعمان اس کا وہ حال کرتی کہ وہ عمر بھر اس طرف کا رخ نہ کرتا۔“ پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ”ہاں تم بتاؤ تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

”میں کیا بتاؤں؟ ماں نے مجھے مہلت ہی نہیں دی ہے۔ میری قسمت میں ہی لکھا ہے کہ بس شمع بن جلا کروں۔“ اس نے گردن کو ہلاتے ہوئے تعریفی نگاہوں سے مجھے دیکھا اور تالی بجاتے ہوئے بولی۔ ”ہم مشرق کی بیٹیوں کے ساتھ یہ بڑا معاملہ ہے۔“ وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ ادھر ادھر دیکھنے لگی پھر ذرا توقف سے بولی۔ ”مجھے نہیں معلوم تھا ایسا ہو جائے گا۔ سچ پوچھو نصرت امی تمہیں بہو بنانے کے خواب لیے ہوئے ہیں احسان بھائی کا آخری سال ہے ایل ایل بی کرنے کے بعد جیسے ہی وہ پریکٹس شروع کریں گے۔ امی رشتہ لے کر آ جائیں گی۔ پلیز ابھی کچھ نہیں ہوا ہے۔ یہ پیسے واپس کر دو۔“

وہ بولے جا رہی تھی اور میں نے جا رہی تھی۔ میری سمجھ میں کوئی بات نہیں آ رہی تھی۔ وہ اس روز رات تک ہمارے ساتھ رہی اور پھر کل آنے کا کہہ کر چلی گئی۔

رات بھر میں سوچوں میں غرق رہی۔ احسان ہینڈ سٹم بھی ہے اور جوان بھی اور میری پیاری سہیلی کا بھائی بھی۔ مگر ایک بات مجھے اس کی پسند نہ تھی وہ بہت خود سر تھا۔ موڈی کچھ ضرورت سے زیادہ ہی تھا۔ اس لیے میں نے غور و فکر کے بعد فیصلہ ماں کی ہاں میں بدل دیا۔ کیونکہ نعمان دس ہزار ماہوار اور دو لاکھ حق مہر ایڈوائس دینے کے لیے تیار تھا اور ایک لاکھ پانچ ہزار روپے کا گولڈ کا سیٹ بھی میرے لیے بنوایا تھا۔ یہ ضرور ہے پیسا ہی سب کچھ نہیں ہوتا مگر یہاں تین افراد کی کفالت کا مسئلہ درپیش تھا۔

دو روز بعد میں خود ہی تیار ہو گئی تھی۔ نعمان کے آنے سے پہلے ہمیں ہائی کورٹ جانا تھا۔ یہ شادی عجلت میں اس لیے ہو رہی تھی کہ مسز نعمان نے ہمیں ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وکیل سے نعمان صاحب نے ٹائم لے لیا تھا۔ ہم کار میں بیٹھ کر گیارہ بجے کے قریب کورٹ پہنچ گئے تھے۔ کاغذات پہلے ہی تیار ہو چکے تھے۔ ہم دونوں نے دستخط کیے اور وکیل کی فیس

گہرے پانی میں نہانے والوں کی آنکھیں سرخ ہو جاتی ہیں۔ اس طرح مجھے آنکھیں صاف کرتے دیکھ کر نعمان صرف یہی سمجھا کہ آنکھ میں پانی کا چھینٹا چلا گیا ہے۔ وقت کا بتانا ہی نہ چلا۔ ہم پانی سے باہر آئے تو اونٹوں والوں نے گھیر لیا۔ ہم دونوں ایک اونٹ پر بیٹھ گئے۔ اونٹ پر بیٹھنے کا میرا پہلا تجربہ تھا۔ بڑا عجیب سا لگ رہا تھا۔ ہم ساحل سمندر پر بہت دور نکل آئے تھے کہ اچانک اونٹ تیز تیز دوڑنے لگا۔ اونٹ بے قابو ہو گیا تھا اور ہم دونوں اونٹ سے گر گئے۔ میں تو فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی مگر جب نعمان کو اٹھانے کی کوشش کی تو وہ ڈھسے سے گئے لوگوں کا ایک ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ جب نعمان کو اٹھایا تو وہ جہاں گرے تھے وہاں ایک پتھر تھا اور اس پتھر نے ان کا کام تمام کر دیا تھا۔ لوگوں نے اٹھا کر انہیں جناح اسپتال پہنچا دیا۔ میں بھی ساتھ ہی مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ ٹیکسی میں ایک بار ضرور انہوں نے مجھے ایک نظر بھر کر دیکھا تھا۔

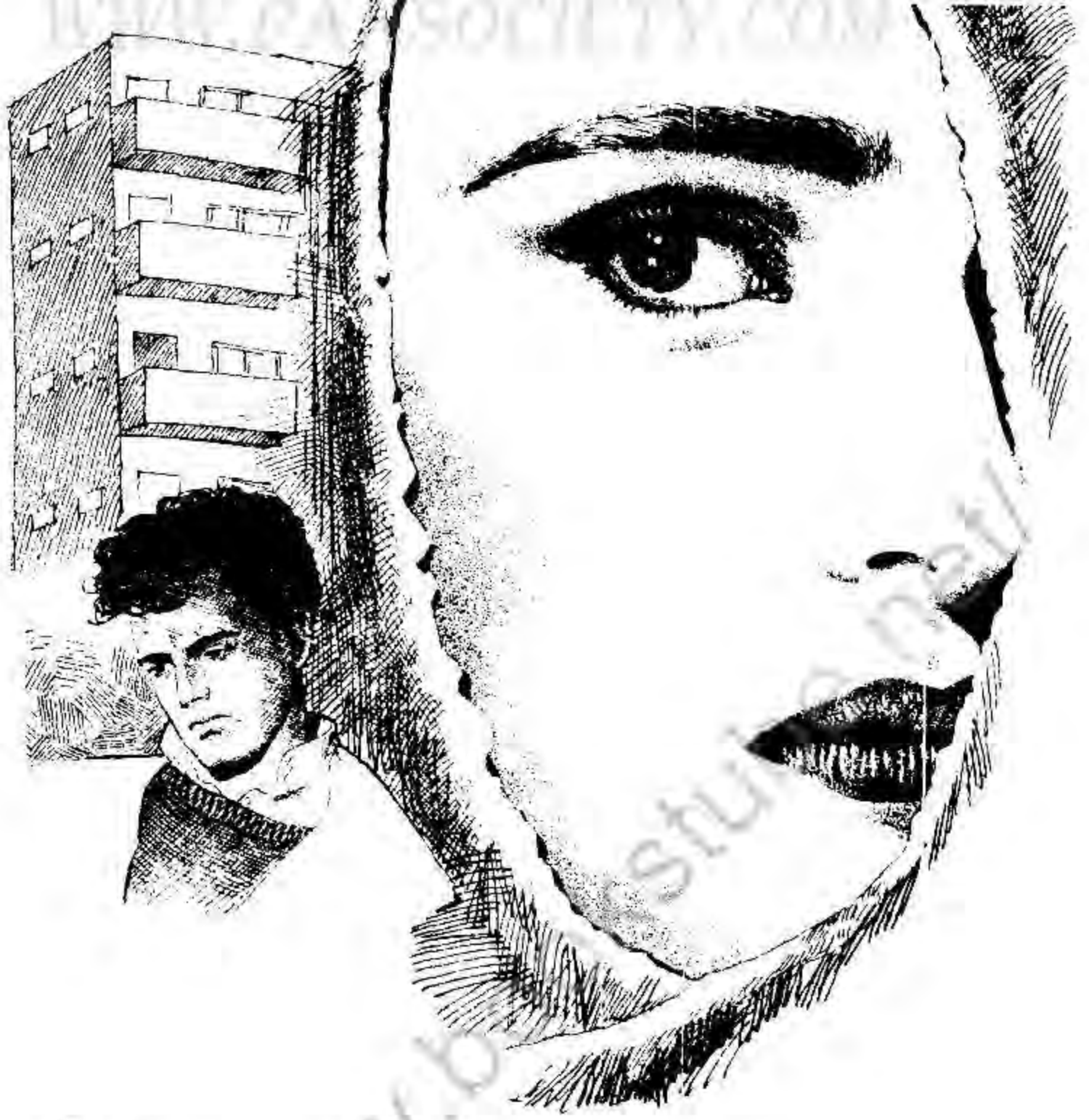
میں نے فوراً فون پر ان کے گھر اطلاع کر دی تھی اور میرے پاس وہاں رکنے اور مسز نعمان کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں تھی۔ میں نکاح نامے کی فائل لے کر اپنے گھر آ گئی۔ میں بہت ہمت کر کے گھر پہنچی تھی۔ میری آواز لرز رہی تھی۔ بامشکل میں یہ بتا پائی کہ نعمان کا ایکسڈنٹ ہو گیا ہے وہ اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ امی نے آگے بڑھ کر مجھے جیسے ہی سینے سے لگایا میں بے ہوش ہو گئی۔

دوسرے دن صبح سویرے جب ہوش آیا تو یاسمین میرے سر ہانے کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ یاسمین مجھے تسلی دیتے ہوئے بولی۔ ”خدا جو کرتا ہے بہتر کرتا ہے۔ تمہارے لیے یہی بہتر ہے۔“ اور میری آنکھوں سے آنسو صاف کرنے لگی۔ نعمان مجھے کبھی اچھے نہیں لگے تھے۔ شادی کا جب سے پیغام دیا تھا تو زہر لگنے لگے تھے مگر نکاح نامے کے بعد میرے دل اور دماغ نے انہیں قبول کر لیا تھا اور اب کئی سال گزرنے کے بعد بھی میں وہ پانچ چھ گھنٹے کی رفاقت نہیں بھولتی۔ کئی سال بعد میری شادی ہوئی۔ میں اپنے شوہر حامد کے ساتھ اپنے فلیٹ میں بہت خوش ہوں۔ مسرت کی بھی ہم نے شادی کر دی ہے۔ امجد ابھی پڑھ رہا ہے۔ اس لیے ساتھ ہے۔ یاسمین اب بھی ملنے آتی ہے اور اب بھی وہ قہقہہ لگا کر کہتی ہے۔ ”زندگی حادثوں کے مجموعے کا نام ہے۔ کچھ ہونہ ہو، نعمان کے نکاح نامے نے تمہیں بہت کچھ دلا دیا۔“



ادا کرنے کے بعد کسی ہوٹل میں لے جاکر پروگرام بنایا۔ نعمان صاحب، کا چہرہ دمک رہا تھا وہ آج کچھ زیادہ خوش دکھائی دے رہے تھے۔ وہ کچھ شوخ بھی ہو رہے تھے۔ وہ مسلسل بولے جا رہے تھے اور میں خاموشی سے سنے جا رہی تھی۔ ہم کورسٹ کی دیوار کے ساتھ ساتھ پیدل چل رہے تھے راستے میں ایک نجومی بیٹھا ہوا نظر آیا۔ نعمان صاحب مجھ سے کہنے لگے۔ ”چلیے اس کو ہاتھ دکھاتے ہیں۔“ میں نے آہستہ سے منع کر دیا۔ تو کہنے لگے۔ ”ان پر یقین نہیں ہے بس سوچا تھا اس بے چارے کی بھی کچھ انکم ہو جائے۔“ وہ میری بات مان گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہی ہم اپنی گاڑی تک پہنچ گئے اور چار منٹوں میں ایک فائو اشار ہوٹل میں موجود تھے۔ نعمان نے اتنے سارے کھانوں کا آرڈر دے دیا تھا کہ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ کھائے جا رہے تھے۔ مجھے بھی مجبور کرتے رہے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت دنوں سے بھوکے ہیں۔ کھانے سے ابھی فارغ ہی ہوئے تھے کہ بولے۔ ”جان! کلفٹن چلتے ہیں کتنا اچھا موسم ہے۔ آسمان پر بادل ہی بادل بھائے ہوئے ہیں۔“

”جی جیسے آپ کی مرضی۔“ پھر وہ جلدی سے اٹھ کھڑے ہوئے، اور بل بے کر کے ہم مختلف سڑکوں سے ہوتے ہوئے کلفٹن پہنچ گئے۔ کلفٹن کا اپنا مزہ ہے۔ یہاں رات کو تو بہت رونق ہوتی ہے۔ دن میں بھی وہ لوگ جو مختلف شہروں سے رشتے داروں کے ہاں آتے ہیں وہ کلفٹن ضرور آتے ہیں اور وہ لوگ زیادہ تر دن میں ہی آتے ہیں۔ اس وقت بھی بہت سی فیملیاں موجود تھیں اور کافی رونق تھی۔ آسمان پر بادلوں کی وجہ سے موسم رنگین ہو گیا تھا۔ ہمیں دیکھتے ہی دو تصویریں بنانے والے کیمرے ہاتھ میں پکڑے ہمارے پاس آئے اور طرح طرح کی بولیاں بولنے لگے۔ نعمان نے دونوں کو ایک ایک رول بنانے کا کہہ دیا۔ وہ مختلف زاویوں سے ہماری تصویریں بنا رہے تھے ہم پانی میں تھوڑی دور تک چلے گئے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ساتھ پانی میں آ گئے۔ ہمارے کپڑے بھی بھگ گئے تھے۔ وہاں کچھ بچے بھی نہا رہے تھے اور ان کے ساتھ اور بھی لوگ تھے۔ بڑا مزہ آ رہا تھا۔ کوئی چار سال پہلے ہم ابو کے ساتھ آئے تھے۔ بچوں کو دیکھ کر مجھے امجد علی اور مسرت یاد آ گئے۔ پھر ابو۔ میری آنکھیں نم ناک ہو گئیں تھیں مگر میں نے جلد ہی خود کو سنبھال لیا اور نعمان کو پتا بھی نہ چلا۔ کیوں کہ پانی کے چھینٹے اڑ رہے تھے اور سمندر کا پانی اس قدر نمکین ہے کہ زیادہ



ساحر

مدیر سرگزشت

سلام تہنیت

یہ سرگزشت خود میں عجیب ہے۔ اگر کسی دوسرے کے ساتھ یہ واقعہ گزرا ہوتا اور وہ مجھے سناتا تو شاید میں اس پر یقین نہ کرتی مگر میں اس سرگزشت کی مرکزی کردار ہوں اس لیے یقین کے ساتھ خود بیٹی سنا رہی ہوں لیکن نام مقام بدل دیا ہے۔

مہر النساء مہرو
(شارجہ۔ یو اے ای)

کی عمر میں مجھ پر اکیلے گھر سے جانے پر پابندی عائد ہو گئی تھی۔ میں امی یا بڑی بہنوں یا بھائیوں کے ساتھ جاسکتی تھی۔ وہ بھی پوری طرح برقع میں۔ باپا اور امی اس معاملے میں اتنے سخت تھے کہ ہم ہمیں اپنے کزنز کے سامنے بھی نہیں جا

مجھے سوائے میرے شوہر کے اور کسی مرد نے نہیں دیکھا تھا۔ میری مراد چہرے سے ہے کیونکہ میرا تعلق جس گھرانے سے ہے وہاں لڑکی کو دس سال کی عمر میں ہی پردے میں بٹھا دیا جاتا ہے۔ مجھے یاد ہے دس یا گیارہ سال

فروری 2015ء

279

ماہنامہ سرگزشت

Copied From Web

چھوٹے دونوں بھائی ابھی پڑھ رہے تھے۔ ہمارا تعلق افغان درانی قبیلے سے ہے اور یہی وجہ تھی کہ ہم سب بہن بھائی گورے پٹنے اور خوب صورت ہیں۔ کیونکہ ہمارے گھر کا ماحول ایسا نہیں تھا کہ ہم بہنیں اپنی جسمانی خوب صورتی پر توجہ دیتیں مگر کبھی کبھی میری بہنیں کہتی تھیں کہ ہم تینوں میں، میں ہی سب سے زیادہ خوب صورت ہوں۔ تو مجھے یہی خیال آتا کہ وہ چہرے کے نقوش کی بابت کر رہی ہیں۔ حالانکہ میرے خیال میں وہ مجھ سے زیادہ خوب صورت تھیں۔ مگر وہ کہتی تھیں۔

”مہر تو بہت زیادہ حسین ہے۔“

میں خود کو آئینے میں دیکھتی تو خود کو اپنے گھر والوں سے زیادہ مختلف نہیں پاتی تھی۔ ٹھیک ہے میرا رنگ گلہبیت لیے ہوئے شہابی تھا۔ پر خمار آنکھیں اور سبک ناک و نقشہ تھا۔ جسم متناسب اور سڈول تھا مگر مجھے اپنا آپ اپنی بہنوں سے مختلف نہیں لگتا تھا۔ میرا دوسری لڑکیوں سے واسطہ بھی کم پڑتا تھا کیونکہ امی اور بابا اس معاملے میں بھی بہت محتاط تھے کہ ہم ایسی لڑکیوں سے بھی نہ ملیں جو ذرا مختلف گھرانوں سے تعلق رکھتی ہوں جہاں دین اور خاص طور سے پردے کا اتنا خیال نہ رکھا جاتا ہو اور لڑکیاں شادی سے پہلے ہی بہت سی باتوں سے واقف ہو جاتی ہیں۔ اگر کبھی اتفاق سے میں ایسی کسی لڑکی کے پاس بھی ہوئی تو امی اور بڑی بہنوں نے مجھے فوراً روک دیا۔ اس لیے ایسی کوئی بے تکلف سہیلی بھی نہیں تھی جو مجھے میرے بارے میں بتاتی۔ ہاں ایک بار ہم اپنی خالہ کی بیٹی کی شادی میں ساہیوال گئے تھے تو شادی کی تقریب کے لیے ہم کزنز ایک ہی کمرے میں تیار ہو رہے تھے اور ایک دوسرے سے ذرا ڈھک چھپ کر کپڑے بھی بدل رہے تھے جب میں کپڑے بدلنے لگی تو میری خالہ کی چھوٹی بیٹی کی نظر مجھ پر پڑ گئی اور اس نے بے ساختہ کہا۔

”مہر تو تیرا بدن تو بہت حسین ہے۔“

”ہوگا۔“ میں نے بے پردائی سے کہا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ نسوانی جسم کی خوب صورتی کیا ہوتی ہے۔ کیونکہ میں نے کبھی اس بارے میں سنا نہیں تھا۔ سچی بات ہے کہ مجھے یا بہنوں کو خود بھی ایسی باتوں سے دل چسپی بہت کم تھی۔ کیونکہ پردے اور دین پر سختی سے عمل کرنے کے باوجود ہمارے گھر کا ماحول گھٹا ہوا نہیں تھا۔ ہمارے ہاں وہ ماہانہ اور ہفتہ وار رسالے بھی آتے تھے جن میں ہماری تہذیب اور شائستگی کو اجاگر کیا جاتا تھا۔ گھر خاصا بڑا تھا اور یہاں

سکتے تھے اور دس سال کی عمر کے بعد ہم سب بہنوں نے تمام نامحرموں سے پردہ کر لیا تھا۔ جب میری بڑی بہنوں کی شادی ہوئی تو میں نے بہنوتیوں سے بھی پردہ کیا اور کبھی ان کے سامنے بے پردہ نہیں گئی۔ اسی طرح میری بہنیں ایک دوسرے کے شہروں سے پردہ کرتی رہیں۔ یہ تو خاندان والوں کا حال تھا باقیوں کے بارے میں آپ سوچ سکتے ہیں کہ اس معاملے میں کتنی سختی ہوتی ہوگی۔ گلی محلے میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اور نہ ہی ہمارا دوسروں سے کوئی تعلق تھا۔ ملتان جیسے صوفیا کے شہر میں ہمارے جیسے سخت مذہبی گھرانے بہت کم تھے۔

عجیب بات ہے ایک طرف ہم پر اتنی سخت پابندی تھی دوسری طرف ہم سب بہنوں نے گریجویٹن تک تعلیم حاصل کی اور یہ ساری کی ساری تعلیم گھر میں ہوئی۔ امی خود گریجویٹ تھیں اور بابا نہ صرف اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے بلکہ وہ دینی علم بھی رکھتے تھے۔ ہم بہنوں نے سب انہی سے پڑھا۔ رواج کے مطابق پہلے ہر بچہ کو قرآن کریم ناظرہ کرایا جاتا تھا۔ اس کے بعد اسکول کی تعلیم کا آغاز ہوتا تھا۔ دین کی تعلیم بابا کے ذمے تھی اور اسکول کا نصاب امی پڑھاتی تھیں۔ بھائی اسکول میں پڑھتے رہے اور ہم بہنوں نے گھر میں پڑھ کر پرائمری کا امتحان دیا۔ اسی طرح ہر سال اسکول کا امتحان دیا اور پھر پرائیویٹ پڑھ کر گریجویٹن بھی کر لیا۔ میری ایک بڑی بہن نے پرائیویٹ ہی اسلامیات میں ماسٹر کیا اور دوسری بہن نے بی ایڈ بھی کیا۔ میں نے بی اے کیا تھا۔ پھر زدینے ہم بھائیوں یا بابا کے ساتھ جاتے تھے۔ ویسے تو بابا نے سول انجینئرنگ کی تھی مگر انہوں نے کاروبار کو ترجیح دی اور ملتان شہر میں ان کی کپڑے کی دکان تھی۔ ماشا اللہ اچھا کاروبار تھا اور ہمارے بڑے سے گھر میں ہر آسائش تھی۔

میری دو بڑی بہنیں، دو بڑے بھائی اور دو چھوٹے بھائی تھے۔ جب میں نے بی اے کیا تو میری دونوں بہنوں اور بھائیوں کی شادی ہو چکی تھی۔ انٹر کے بعد امی نے ہم سب بہنوں سے پوچھا کہ کیا ہماری شادی کر دی جائے یا پھر ہم مزید پڑھنا چاہتی ہیں۔ ہم تینوں نے آگے پڑھانی کا انتخاب کیا۔ میرے دونوں بڑے بھائی بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے۔ سب سے بڑے بھائی نے ماسٹر کے بعد سول سروس کا امتحان پاس کیا اور اب اسلام آباد میں وزارت خارجہ میں جاب کر رہے تھے۔ ان سے چھوٹے نے ایم بی اے کیا تھا اور ابو کے ساتھ دکان پر کام کرتے تھے۔ جب کہ مجھ سے

گھرانوں میں ہوئی تھیں۔ اس لیے میری باری میں بھی اس بات کا خاص خیال رکھا گیا تھا اور جب احسن سرفراز کا رشتہ آیا تو سب سے پہلے یہی دیکھا گیا۔ احسن کے والد سرفراز چچا بابا کے ساتھ کپڑے کے بزنس سے منسلک تھے اور وہ لاہور سے بابا کو کپڑا بیچتے تھے۔ ان کا وہاں کپڑے کا ہول سیل کاروبار تھا۔ دورانِ تعلیم وہ سرفراز چچا کے ساتھ کاروبار میں بھی شامل رہے۔ اور ان کا کئی بار ملتان آنا ہوا تھا۔ اس لیے بابا کی ان سے اچھی واقفیت تھی۔ سرفراز چچا سے ملاقاتیں تو سال میں ایک دو ہوتی تھیں مگر فون پر تقریباً روز بات ہوتی تھی ایک دن بابا نے گفتگو کے دوران میں میرا ذکر کیا اور سرفراز چچا سے کہا کہ اگر ان کی نظر میں کوئی شریف اور دین دار گھرانے کا نوجوان ہو تو بتائیں۔ اس پر انہوں نے احسن کا رشتہ پیش کر دیا۔

”میرا بیٹا حاضر ہے آپ کے خیال میں ہم دین دار گھرانے کے ہیں تو مجھے بہت خوشی ہوگی آپ کی بیٹی کو اپنی بیٹی بنا کر۔ برخوردار نے ایل ایل بی کیا اور اب پریکٹس کر رہا ہے۔ ماشا اللہ کامیاب ہے۔“

ابو خوش ہو گئے۔ انہوں نے کہا۔ ”تجھی کئی سال سے برخوردار یہاں نہیں آئے۔ اس سے اچھی کیا بات ہوگی لیکن میں گھر والوں سے مشورہ کر کے آپ کو بتاتا ہوں تب بات آگے بڑھائیں گے۔“

”بالکل کیوں نہیں آپ مشورہ کریں اور پھر مجھے بتائیں۔“

ابو نے گھر میں مشورہ کیا۔ بھائی بھی احسن سے واقف تھے اور انہیں بھی یہ رشتہ پسند آیا۔ امی نے بابا کو مطمئن پایا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا اور میں نے جواب دیا۔ ”جیسے آپ اور بابا پسند کریں وہی میری پسند بھی ہوگی۔“

یوں سب کی رضامندی سے بابا نے ہاں کر دی۔ سرفراز چچا باقاعدہ رشتہ لے کر آئے۔ ان کی بیگم دنیا سے گزر گئی تھیں اور ان کے چار بیٹے تھے سب سے چھوٹے احسن تھے اور وہ اس وقت ان کے ساتھ رہتے تھے۔ بانی تین بیٹوں کو شادیاں کر کے ان کو الگ گھر لے دیئے تھے البتہ کاروبار میں تین بڑے بیٹے ان کے ساتھ شامل تھے۔ صرف احسن نے دکالت کا پیشہ چنا تھا۔ سرفراز چچا نے بابا سے کہہ دیا کہ احسن بھی شادی کے بعد الگ رہیں گے اور انہوں نے ان کے لیے فلیٹ بھی لے لیا تھا۔ دونوں طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔ رشتہ طے ہونے کے بعد ساری کارروائیاں بہت

تفریح کی کئی سہولتیں تھیں۔ ایک چھوٹا سا بیڈ منٹن کورٹ اور ٹیبل ٹینس کی میز تھی۔ ہم بہن بھائی آپس میں بے تکلف تھے اور شام کے وقت جب سب گھر میں آتے تو بہت مزہ آتا تھا۔ امی اور بابا بیٹے میں کئی بار ہمیں گھمانے پھرانے باہر لے جاتے تھے۔ اگر خود نہیں جا پاتے تو یہ ذمے داری بھائیوں کو سونپ دی جاتی۔ شادی سے پہلے ہم نے ایک بھر پور زندگی گزاری۔ ہم اپنی شاہنگ خود کرتے تھے۔ بس امی یا بھائیوں کے ساتھ جانا ہوتا تھا۔ ہمیں ایک حد میں رہ کر سب کرنے کی اجازت تھی۔ اس لیے امی اور بابا کی پابندیاں بھی ہمارے لیے بوجھ نہیں بنیں۔ ہم بہ خوشی ان پر عمل کرتے تھے اور اسے اپنی ذمے داری سمجھتے تھے۔ ہمیں پسند نہیں تھا کہ کوئی نامحرم ہمیں دیکھے اور نہ ہی ہم نے کبھی اس معاملے میں کوتاہی برنی۔ بہنویوں سے ملنے سلام دعا کرتے مگر پردے میں رہ کر۔

بڑے بھائیوں کی شادیاں ہوئیں تو مکان کے اوپر والے حصے میں دو بالکل الگ پورشن بنا کر بابا نے انہیں وہاں منتقل کر دیا تاکہ وہ اپنی بیویوں کو پردے کے حساب سے رکھ سکیں۔ سزا جب دوسرے بھائی چلے جاتے تو بھابھیاں پیچھے آ جاتیں اور تمام کو جب مرد آنے لگتے تو وہ واپس اپنے پورشن میں چلی جاتیں۔ بہنوں کے جانے کے بعد بھابیوں سے رونق ہونے لگی اور پھر پیچھے ہوئے تو یہ رونق اور بڑھ گئی۔ بابا ہم بہنوں سے زیادہ محبت کرتے تھے اور جب بھی دکان سے آنے لگتے تو پہلے کال کر کے ہم سے پوچھتے کہ ہمارے لیے کیا لائیں۔ اسی طرح جب بھابھیاں آئیں تو بابا ان سے بھی پوچھنے لگے۔ گھر سے متعلق تمام کام امی اور بھابیوں کی مرضی سے ہوتے تھے اور بابا یا بھائی ان میں دخل نہیں دیتے تھے۔ شادی سے پہلے اور اس کے بعد بھی ہم بہنوں کو خصوصی پروٹوکول دیا جاتا تھا۔ جب بابا ہمیں دین کے بارے میں پڑھاتے تو اکثر وہ ہمارے دین میں عورت کی عظمت اور اہمیت کے بارے میں بات کرتے۔

یہی وجہ ہے کہ میری زندگی کے جو بائیس سال امی اور بابا کے گھر میں گزرے وہ میرے لیے ہمیشہ کے لیے یادگار بن گئے۔ جب میں نے بی اے کر لیا تو امی نے میری شادی کی تیاری شروع کی یعنی رشتہ تلاش کرنے لگیں۔ لڑکیوں اور لڑکوں کے رشتوں کے معاملے میں میرے گھر والوں کی اولین شرط دین سے تعلق کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ میری بہنوں اور بھائیوں کی شادیاں دینی اقدار کا خیال رکھنے والے

سے دیکھ رہا ہوں لیکن جی نہیں بھر رہا۔“
 ”اللہ آپ تو مجھے پاگل کر دیں گے۔“ میں نے
 کہا۔ ”دوسرے آنے والے ہوں گے۔“
 ”ہاں کیونکہ تم نے مجھے پاگل کیا ہے۔“ وہ والہانہ
 انداز میں بولے۔ ”میرا تو دل چاہ رہا ہے کہ چند دن کے
 لیے سب ہمیں اکیلا چھوڑ دیں، کوئی نہ چھیڑے ہمیں۔ ہم
 بس ایک دوسرے میں کھوئے رہیں۔“
 میں پھر شرما گئی۔ ”کیسی باتیں کر رہے ہیں دوسرے
 کیا سوچیں گے۔“

”بس یہی تو سوچ کر رہ گیا۔“ احسن نے ٹھنڈی
 سانس بھری۔ ”ورنہ شاید یہی کرتا۔“

شادی کی صبح میں نے پہلی بار غور سے فلیٹ دیکھا۔ یہ
 بہت لگژری قسم کا فلیٹ تھا۔ اس میں دو بیڈ رومز اور ایک
 ڈرائنگ روم کے ساتھ بڑا سالانہ تھا۔ پورا فلیٹ ٹائلز
 سے آراستہ تھا۔ شاندار قسم کے ہاتھ روم اور اثالیٹین کچن
 تھا۔ یہ فلیٹ جس بلڈنگ میں تھا وہ بھی بہت لگژری اور لاہور
 کے پوسٹ ترین علاقے مال روڈ میں تھی۔ اب تک مجھے احسن
 اور اس کی ٹیمپلی کے بارے میں بس یہی معلوم تھا کہ وہ بہت
 کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ کھاتے پیتے تو ہم بھی تھے۔ لیکن یہ
 فلیٹ دیکھ کر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ مالی لحاظ سے ہم سے کہیں
 زیادہ تھے۔ فرنیچر جو پہلے سے تھا وہ کسی طرح میرے جہیز
 کے فرنیچر سے کم نہیں تھا بلکہ بعض چیزیں تو برما ٹیک کی
 تھیں۔ صرف فرنیچر نہیں بلکہ ہر چیز ہی بہت اچھے معیار کی
 تھی۔ کچھ دیر بعد احسن کی بھابھیاں آئیں۔ وہ بھی میری
 تعریف کر رہی تھیں۔ مگر احسن کا انداز ہی کچھ اور ہوتا تھا وہ
 ایسے الفاظ میں تعریف کرتے کہ میں شرما کر دوہری ہو جاتی
 تھی۔ وہ کہتے بھی بہت کھل کر تھے۔ سانچے میں ڈھلا
 بدن..... ایک ایک انگ تراشا ہوا..... رنگ جیسے دودھ میں
 گلاب گھلا ہوا..... وہ اس قسم کے جملے کہتے تھے۔

میرا خیال تھا کہ شاید پہلی رات کا جنون تھا اور وہ
 آنے والی راتوں میں نارمل ہو جائیں گے مگر آنے والے
 دنوں میں بھی ان کا جنون برقرار رہا تھا۔ ایسا لگتا کہ جیسے میں
 کوئی عام لڑکی نہیں ہوں بلکہ آسمان سے اتری کوئی حور پری
 ہوں۔ جب احسن میری اس طرح تعریف کرتے تو میں کہتی
 کہ میں تو عام سے لڑکی ہوں۔ ایک بار انہوں نے کہا۔ ”کیا
 تم نے خود کو آکھنے میں دیکھا ہے۔“
 ”روز دیکھتی ہوں۔“

تیزی سے ہوئیں اور اسی چکر میں کسی کو خیال نہیں آیا کہ وہ
 مجھے احسن کی ایک تصویر ہی دکھا دیتا۔ میں خود شرم کی وجہ سے
 کسی سے کہہ نہیں سکی تھی۔ شادی کے دن قریب آگئے۔
 میں نے بہت آبا شاپنگ خود کی تھی۔ خاص طور سے اپنے
 کپڑے وغیرہ خود لیے تھے۔ زیورات میں ایک سیٹ میں
 نے اپنی پسند کا لیا تھا اور باقی امی نے پسند کیے تھے۔ بھائیوں
 نے میری پسند کا فرنیچر کیٹا گز دکھا کر بھویا تھا۔

شادی کا دن آیا۔ لاہور سے صبح سویرے برات روانہ
 ہوئی اور دوپہر کے بعد برات ہمارے ہاں پہنچی۔ پنجاب
 کے رواج کے مطابق یہ دن کی شادی تھی۔ لیکن میرا اور احسن
 کا نکاح اسی شام میں ہو گیا۔ شادی کی تقریب اگلے دن
 ہوئی اور ظہر کے بعد برات بائی روڈ واپس لاہور روانہ ہوئی
 لیکن میں اور احسن شام کے وقت بائی ائر لاہور گئے
 تھے۔ نکاح کے بعد جب احسن مجھ سے ملنے آئے تو پہلی بار
 میں نے انہیں دیکھا۔ وہ کسی قدر سانولے رنگ کے لیکن
 مناسب نقوش اور جسامت والے شخص تھے۔ مجھے پہلی نظر
 میں اچھے لگے۔ اس مختصر ملاقات میں انہوں نے سلام دعا
 کے بعد بس چند جملے کہے جو سارے کے سارے میری
 تعریفوں میں تھے۔ ہماری سہاگ رات لاہور میں آئی اور
 جب احسن نے پہلی بار مجھے پاس سے دیکھا تو پاگل سے ہو
 گئے تھے۔ ایسی والہانہ محبت اور پیار دیا کہ میں مدہوش ہو
 گئی۔ انہوں نے میری ایسی تعریف کی کہ مجھے مغرور کر
 دیا۔ ہماری شادی کی اولین رات اسی فلیٹ میں گزری جو
 سرفراز چچا نے احسن کے لیے لیا تھا۔ لیکن اس وقت ہم اکیلے
 تھے کیونکہ برات رات گئے واپس لاہور پہنچی تھی اور سب
 اپنے اپنے گھر چلے گئے تھے۔ اس لیے ائر پورٹ سے میں
 اور احسن ہی گھر پہنچے تھے۔ یہاں سے آگے میری زندگی کا وہ
 حصہ شروع ہوا جس کی وجہ سے میں یہ سچ بیانی لکھ رہی
 ہوں۔ ممکن ہے آگے آپ کو میرا انداز بہت کھلا ہوا اور بے
 باک لگے۔ لیکن مجھے اُمید ہے جب آپ اس سچ بیانی کا
 آخری حصہ پڑھیں گے تو سمجھ جائیں گے کہ میں نے اپنی
 ذاتی زندگی کو یوں کیوں بیان کیا ہے؟

☆☆☆

صبح میری آنکھ کھلی تو یہ دیکھ کر میں شرما گئی کہ احسن
 بیٹھے ہوئے مجھے دیکھ رہے تھے۔
 ”ایسے کب دیکھ رہے ہیں؟“
 ”تمہیں دیکھ رہا ہوں۔“ انہوں نے کہا۔ ”بہت دیر

”ایسے نہیں.....“ انہوں نے کہا اور پھر بتایا کہ کیسے دیکھنا ہے۔

”اے کیسی باتیں کر رہے ہیں بھلا کوئی خود کو اس طرح بھی دیکھتا ہے۔“ میں نے سرخ ہو کر کہا۔ ”میں نے آج تک خود کو اس طرح نہیں دیکھا۔“

”تب نیا تو تمہیں معلوم نہیں ہے کہ تم کتنا ہوشربا حسن رکھتی ہو۔“ وہ بولے۔ ”تم سے کہیں کمتر عورتیں خود پر اتنا اتراتی ہیں اور اپنے حسن کا سب سے زیادہ خیال رکھتی ہیں۔ تم تو قدرت کا شاہکار ہو۔“

”یہ تو آپ کو معلوم ہے نا اور آپ کو اچھا لگتا ہے تو میرے لیے یہی بہت ہے۔“

احسن میرے چہرے کے نقوش کی تعریف تو کرتے تھے مگر ان کا زیادہ زور جسمانی خدو خال اور بیچ و خم پر ہوتا تھا۔ جب وہ گھر میں ہوتے اور ہمارے درمیان بات ہوتی تو زیادہ موضوع یہی ہوتا تھا۔ پھر ہم رہتے بھی اکیلے تھے اس لیے ان کو بولنے میں کوئی رکاوٹ بھی نہیں تھی۔ میرے سر سرفراز چچا ہفتے میں ایک دو دفعہ آتے تھے۔ وہ عام طور سے شام کے وقت آتے اور پھر کھانا ہمارے ساتھ کھا کر جاتے تھے۔ یہ ان کا معمول تھا کہ شام کا کھانا کسی بیٹے کے ہاں کھاتے تھے۔ ”ناشتا اور دوپہر کا کھانا وہ اپنے دفتر میں کھاتے تھے۔ اپنے پورے ہفتے کے معمولات وہ بیٹوں سے بات کر کے پہلے ہی طے کر لیتے تھے کہ کس دن کس کے ہاں جانا ہے۔ احسن سیت تمام بیٹوں نے ان سے بارہا کہا کہ وہ ان کے ساتھ رہیں مگر وہ اپنے برسوں پرانے گھر میں رہتے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ وہاں انہیں سکون ملتا ہے کیونکہ وہاں ان کے ماں باپ، بہن بھائیوں اور بیوی کی یادیں تھیں۔ وہ ان یادوں کے درمیان خوش رہتے تھے۔ وہ صبح سے شام تک دفتر میں ہوتے۔ نئے اور شام کو بیٹوں کے ہاں جاتے تھے۔ اس کے بعد نو بجے تک گھر جاتے تھے۔ چھٹی والے دن کوئی بیٹا بیوی بچوں سمیت ان کے پاس چلا جاتا تھا۔ یوں اکیلے ہونے کے باوجود انہیں اکیلے پن کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

ہفتے میں ایک دو بار ہی احسن کے بھائی یا کوئی دوست ملنے آ جاتا تھا۔ اس لیے ہم زیادہ تر اکیلے ہی ہوتے تھے۔ شادی کے شروع نونوں میں مصروفیات بہت تھیں۔ آنا جانا لگا رہا۔ میں ایک ہفتہ امی بابا کے پاس رہ کر آئی پھر دعوتیں ہوتی رہیں۔ دس دن کے لیے ہم شمالی علاقے گئے اور وہاں گھوم پھر کر آئے۔ واپسی پر بھی کچھ رہ جانے والی دعوتیں

دبیر الملک۔ نواب مرزا نوشہ۔ اسد اللہ خان غالب اور نواب مصطفیٰ خان شیفتہ دونوں ہم عصر تھے۔ نہ صرف ہم عصر بلکہ ہم نوالہ و ہم پیالا۔ ہم خیال و ہم ذوق اور ہم سخن و ہم ساز بھی تھے۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ 1809ء دہلی میں پیدا ہوئے۔ فارسی، عربی اور مروجہ علوم کی تحصیل کی۔ شعر و سخن سے آپ کو فطری مناسبت تھی۔ شعرا چمکا کہتے تھے۔ فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے۔ ان کا مشہور شعر ہے کہ۔

شاید اسی کا نام محبت سے شیفتہ
اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

پہلے مومن خاں مومن کے شاگرد ہوئے اور ان کی وفات کے بعد غالب خستہ حال سے مشورہ سخن کرنے لگے۔ 1834ء میں جب کہ شیفتہ کی عمر صرف چھبیس سال تھی انہوں نے گلشن بے خار کے نام سے فارسی زبان میں شعرائے اردو کا تذکرہ مرتب کیا تھا۔ 1869ء میں وفات پائی۔ کہا جاتا ہے کہ غالب کو غزل تخلیق کرتے ہوئے اور پھر اس کو لکھتے وقت۔ نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کے تصور۔ ان کی رائے و تاثر کے اشتیاق اور انتظار سے روکا نہیں جاسکتا تھا۔ غالب کو ان کی داد و تحسین سے جو تقویت و اطمینان حاصل ہوتا تھا اس کا اعتراف غالب نے برملا طور پر کیا۔ دوستوں کی محفل میں دوران گفتگو زبان حال سے بھی اور تحریری طور پر بھی۔ اس کا اندازہ غالب کے اس فارسی مقطع سے بھی ہوتا ہے۔

غالب یہ فن گفتگو نازد بہ این ارزش کہ او
نہ نوشت در دیو غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نہ کرد

یعنی سخن گوئی میں غالب کو اس خوبی پہ ناز ہے کہ جب تک مصطفیٰ خان نے نہ کہہ دیا کہ یہ غزل اچھی ہے میں نے اس غزل کو دیوان میں درج نہیں کیا۔ اس مقطع سے نواب مصطفیٰ خان شیفتہ کی سخن منہی کے کمال کی بھی سند ملتی ہے۔ سخن منہی جو سخن گوئی سے کہیں زیادہ مشکل کام ہے۔

اقتباس: یادوں کی بستی: از محمد ایاز راہی

رات کو جب آتے تو اتنا تھکے ہوتے تھے کہ بس کھانا کھایا
کچھ باتیں ہوئیں یا میرے پاس آئے اور سو گئے۔ میں ان
سے جو بات کرنا چاہتی تھی وہ رہ ہی جاتی تھی۔ ان کی جھکن
محسوس کر کے میں چپ ہو جاتی۔ پھر یہ معمول بن گیا تھا اور
میں تنہائی محسوس کرنے لگی تھی۔ گھر میں صفائی اور کپڑے
دھونے کے لیے کام والی آتی تھی۔ کھانا میں خود بناتی
تھی۔ دو آدمیوں کا کھانا ہی کتنا ہوتا ہے۔ اکثر میں دوپہر
میں کچھ نہیں بناتی تھی اور بس رات کے بچے ہوئے سے
گزارا کر لیتی۔

یہاں ٹی وی تھا مگر مجھے ٹی وی کی عادت نہیں
تھی۔ احسن کو اخبار اور رسائل سے دل چسپی نہیں تھی پھر بھی
انہوں نے میری خاطر لگا دیئے۔ مگر ان سے بھی کتنا وقت
گزرتا۔ باہر جانے کا یہاں بھی وہی حساب تھا کہ احسن کے
ساتھ اور عبائے میں جاتی تھی۔ اکیلے میں کبھی نہیں
گئی۔ احسن مذہبی خیالات رکھتے تھے مگر ان میں وہ سختی نہیں
تھی جو میرے گھر والوں میں تھی کہ عورت کو گھر سے اکیلے
باہر جانے کی اجازت نہیں تھی کسی نہ کسی مرد کا ہونا لازمی تھا۔
صرف چھٹی والادن ایسا ہوتا جب احسن میرے پاس ہوتے
مگر اس دن کی اپنی مصروفیات ہوتی ہیں۔ کہیں نہ کہیں آنا
جانا ہوتا یا کوئی ہمارے ہاں آجاتا۔ وہ کام نمٹانے جاتے جو
کام والے دنوں میں نہیں ہو سکتے تھے۔ اس لیے مجھے وقت
کم ہی ملتا تھا۔ ایک چھٹی والے دن میں نے تنہائی کی
شکایت کی تو وہ بولے۔ ”تم باہر چلی جایا کرو۔ گھر کی جو
شاپنگ کرنی ہے کر لیا کرو اس طرح تمہاری بھی آؤنگ ہو
جائے گی۔“

”اکیلے؟“ میں نے حیرت سے کہا۔

”ہاں تو اس میں کیا ہے۔ بہت سی عورتیں تو مکمل پردہ
کرتی ہیں وہ بھی اکیلی آتی جاتی ہیں۔ تم کہو تو تمہیں ڈرائیونگ
سکھا دوں کار لے دوں گا آس پاس تم خود جاسکو گی۔“
”آپ مجھے ڈرائیونگ سکھائیں گے؟“ میں خوش ہو
گئی کیونکہ جب چھوٹی سی تھی تب سے مجھے ڈرائیونگ کا شوق
تھا۔ ہمارے گھر گاڑی تھی جب میری شادی ہوئی تو دو
گاڑیاں تھیں۔ بابا سے تو نہیں لیکن بھائیوں سے کہا کہ مجھے
ڈرائیونگ سکھا دیں اور انہوں نے بابا سے چھپ کر ایک دو
بار کوشش بھی کی۔ کسی میدان میں لے جا کر اسٹیرنگ میرے
حوالے کر دیا۔ مگر کم عمری تھی اور ڈر بھی لگ رہا تھا اس لیے یہ
تجربہ کامیاب نہیں رہا مگر مجھے یہ حسرت بھی نہیں رہی کہ میں

بھگتا نہیں۔ ان دنوں احسن نے کام سے چھٹی لی ہوئی
تھی۔ وہ دو اور وکیلوں کے ساتھ پارٹنرشپ میں فرم چلا
رہے تھے۔ جب آفس جانا شروع کیا تب بھی وہ چار بجے
چھٹی کر کے گھر آجاتے تھے۔ اس لیے مجھے اکیلے رہنے کا
موقع کم ملتا تھا اور تنہائی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ مگر مجھے معلوم
تھا کہ ایسا ہمیشہ نہیں ہوگا ایک وقت آئے گا جب احسن کا
زیادہ وقت گھر سے باہر گزرے گا مگر اس وقت تک مجھے کسی
بچے کی صورت میں مصروفیت مل جائے گی۔

امی اور بابا نے ہم بہنوں کی پرورش کرتے ہوئے یہ
بات ذہن نشین کرادی تھی کہ ایک عورت کی زندگی کا بنیادی
مقصد اپنی نئی نسل کی درست تعلیم اور تربیت ہے۔ اس کے
لیے ہمیں پہلے خود کو تیار کرنا پڑتا ہے۔ میری دونوں بہنیں
شادی کے اولین سالوں میں ماں بن گئی تھیں اور اب ان
کے ماشا اللہ سب کئی کئی بچے تھے۔ شادی کے بعد میری بھی
یہی خواہش تھی کہ میں جلد ماں بن جاؤں۔ اگرچہ احسن نے
ایسا کوئی اشتیاق ظاہر نہیں کیا تھا مگر بچے انہیں بھی بہت پسند
تھے۔ اپنے بھائیوں کے بچوں سے وہ بہت محبت کرتے
تھے۔ احسن تمام بچوں کے پسندیدہ چاچو تھے اور وہ آتے
یا ہم ان کے ہاں جاتے تو احسن اپنے بچے بچوں میں
گھرے رہتے تھے۔ اس لیے مجھے یقین تھا کہ ایسی کوئی خبر ملی
تو وہ بھی بہت خوش ہوں گے۔ پھر وہ کوئی احتیاط بھی نہیں
کرتے تھے اس سے مجھے لگا کہ انہیں بھی بچوں کی آرزو ہے
بس وہ منہ سے نہیں کہتے ہیں۔ شروع دنوں میں مصروفیت
زیادہ تھیں اس لیے اس بارے میں سوچنے کا موقع کم ملتا
تھا۔ مگر جب ایک مہینے بعد معمول کی زندگی شروع ہوئی تو
مجھے اکثر بچے کا خیال آنے لگا۔

دوسرے مہینے تک ہنی مون پیڈ گزر گیا۔ اگرچہ
احسن کی دیوانگی میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ ان کی محبت میں
اب بھی وہی واہانہ پن اور شدت تھی۔ مگر اب وہ دیر سے
آنے لگے تھے۔ شادی اور پھر ہنی مون کے سلسلے میں جو
چھٹیاں ہوئی تھیں ان کی تلافی بھی کرنا تھی۔ وہ پہلے پانچ چھ
بجے تک آتے۔ پھر اور پھر یہ وقت بڑھ کر سات آٹھ ہو گیا اور
جب سرفراز چچا نے ہمارے ہاں آنا ہوتا تو ان کے ساتھ ہی
آتے تھے۔ اسی طرح پہلے وہ آرام سے گیارہ بجے تک
جاتے تھے مگر اب وہ ناشتا کر کے دس بجے تک روانہ ہو
جاتے تھے۔ صبح کا وقت جو پہلے ہم ڈراگپ شپ کر لیتے
تھے۔ وہ وقت بس ناشتے اور تیاری میں نکل جاتا تھا اور پھر

بس چند ایک بار آنا سامنا ہوا اور انہوں نے بہ مشکل ہی سلام دعا کی۔ بائیں طرف کا فلیٹ خالی تھا۔

سامنے کے تین فلیٹس میں سے ایک میں فیملی رہتی تھی مگر ان کے بچے اسلام آباد میں اپنے دادا دادی کے پاس تھے کیونکہ دونوں میاں بیوی کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں ملازم تھے۔ صبح جاتے اور رات دیر سے آتے تھے وہ بھی کسی سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے تھے۔ دوسرا فلیٹ کسی ایسی فیملی کے پاس تھا جو بیرون ملک تھی اور جب آتی تو یہاں ٹھہرتی تھی ورنہ ان کا فلیٹ خالی رہتا تھا۔ مگر ان تین مہینوں میں، میں نے ایک بار بھی انہیں آتے ہوئے نہیں دیکھا۔ درمیان والا فلیٹ جو ہمارے فلیٹ کے بالکل سامنے تھا۔ اس میں کوئی اکیلا شخص رہتا تھا اور میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ احسن نے بتایا تھا کہ وہ اکیلا رہتا ہے اور عام طور سے فلیٹ میں ہی پایا جاتا ہے اسے باہر آتے جاتے کم دیکھا گیا ہے۔ اتفاق سے ہمارا فلور ہی کچھ غیر آباد تھا ورنہ باقی تمام فلور آباد تھے اور پوری بلڈنگ میں مشکل سے چھ سات فلیٹ خالی تھے۔ ان میں سے تین ہمارے فلور پر تھے۔ ایک صبح میں کچن کا کچھ سامان لینے کے لیے نکل رہی تھی۔ شادی کے بعد میں برقع کی جگہ عبائے پہننے لگی۔ یہ بڑے اسٹائلش عبائے تھے جو احسن نے مجھے اپنی پسند سے لا کر دیئے تھے۔ یہ کام والے اور کسی قدر فننگ لیے ہوئے تھے جس سے جسمانی تناسب ظاہر ہوتا تھا۔ مگر بہت زیادہ بھی نہیں۔

شروع میں مجھے عادت نہ ہونے کی وجہ سے الجھن ہوئی اور میں نے احسن سے کہا بھی کہ میں اس قسم کے عبائے کی عادی نہیں آپ مجھے برقع لادیں۔ مگر انہوں نے اصرار کیا کہ یہ مجھ پر اچھے لگتے ہیں اس لیے میں انہیں ہی پہننے کی عادت ڈالوں۔ اس لیے مجبوراً میں انہیں ہی پہننے لگی اور پھر مجھے سچ سچ عادت ہو گئی۔ اب میں آرام سے عبائے میں باہر آتی جاتی تھی۔ یہ برقع کی نسبت آسان بھی تھے۔ اس وقت بھی میں نے عبایا پہنا ہوا تھا۔ شادی کے چند مہینوں میں میرا بدن فطری طور پر کچھ بھر گیا تھا اور میں جو عبائے استعمال کرتی تھی وہ بری میں آئے تھے یا پھر شادی کے فوراً بعد احسن لائے تھے۔ میں سوچ رہی تھی کہ میں خود اپنے لیے ذرا کھلے عبائے لے لوں۔ نارل میں تو پتا نہیں چلتا تھا مگر اٹھتے بیٹھتے ہوئے یہ جسم سے لگتے تھے اور ساخت نمایاں ہوتی تھی۔

اس دن میں باہر نکلی اور دروازہ لاک کر کے چابی

نے کوشش نہیں کی اور دونا کامیوں کے بعد بھائی نے کہہ دیا کہ میں ڈرائیونگ نہیں سیکھ سکتی اس لیے جب احسن نے کہا تو مجھے خیال آیا کہ اگر میں نے سیکھ لی تو اس بار گھر جا کر گاڑی چلا کر بھائی کو حیران کر دوں گی۔ احسن نے کہا۔

”کیوں نہیں سکھاؤں گا بلکہ آج کے دور میں تو یہ بہت ضروری ہو گیا ہے کہ خواتین بھی ڈرائیونگ سیکھیں۔“ میں راضی ہو گئی۔ احسن نے مجھے پٹھٹی والے دن ڈرائیونگ سکھانا شروع کر دی۔ ان کے پاس چھوٹی کار تھی اس پر مجھے آسانی سے ڈرائیونگ آگئی اور ایک مہینے بعد میں خود کار ڈرائیونگ کرنے لگی تھی۔ نہ صرف عام گلیوں اور سڑکوں پر بلکہ رش والی جگہوں پر بھی آرام اور اعتماد سے ڈرائیونگ کرتی تھی۔ احسن میری سیکھنے کی رفتار سے خوش اور حیران تھے۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ اتنی تیزی سے انہوں نے کسی مرد کو بھی ڈرائیونگ سیکھتے نہیں دیکھا ہے۔ دو مہینے بعد انہوں نے مجھے جدید ماڈل کی چھوٹی نئی کار دلوادی اور ساتھ ہی ڈرائیونگ لائسنس بھی بنا دیا۔ اکیلے باہر میں اسی وقت سے جانے لگی تھی جب احسن نے مجھے اجازت دی تھی مگر کار لینے اور ڈرائیونگ سیکھنے کے بعد مجھے آسانی ہو گئی کہ اب رکشوں میں دھکے کھانے نہیں پڑتے تھے۔ ٹیکسی میں اکیلے نہیں بیٹھتی تھی اور بعض اوقات موقع پر رکشا بہت دیر اور مشکل سے ملتا تھا۔ اب مجھے کہوں جانا ہوتا تو میں آرام سے کار نکالتی اور چلی جاتی تھی۔

جب خود سے لکھنا شروع کیا تو مجھے اپنے آس پاس دیکھنے کا موقع ملا۔ اس بلڈنگ میں کل سات فلور تھے۔ نیچے بڑی شاہیں تھیں اور اوپر چھ فلور پارٹمنٹس کے تھے۔ ہر فلور پر آٹھ ساٹھ تین تین اپارٹمنٹ تھے۔ درمیان میں تقریباً دس فٹ چوڑی راہداری تھی اور اس کے ایک سرے پر لفٹ تھی اور لفٹ سے ڈرائیونگ سیکھنا شروع کیا تو ہم لفٹ استعمال کرتے تھے لیکن جب اکیلے لکھنا شروع کیا تو میں لفٹ سے گریز کرنے لگی کیونکہ لفٹ میں کسی بھی وقت کوئی دوسرا آسکتا تھا اور مجھے اس مختصر سی جگہ کسی دوسرے اجنبی مرد کے ساتھ موجود ہونے کے خیال سے ہی خوف آتا تھا اس لیے میں دو منزل میٹریوں سے چڑھ اتر لیتی تھی۔ ہمارے فلیٹ کے برابر میں ایک معمر جوڑا رہتا تھا ان کے بچے بیرون ملک تھے اور انہوں نے ماں باپ کو یہاں فلیٹ لے کر دیا ہوا تھا۔ وہ کسی سے ملتے جلتے نہیں تھے۔ جب سے میں یہاں آئی تھی

تھی تب بھی اس نے مجھے دیکھا تھا اور یہ احساس یاد کر کے میری حالت مزید خراب ہونے لگی۔ میں میزھیوں سے اترتی اور عقب میں موجود پارکنگ تک آئی جہاں کار کھڑی تھی۔ میں اندر بیٹھ کر گہری سانس لینے لگی اور میں نے چہرے سے نقاب ہٹا دیا تھا کیونکہ چہرے پر پسینا آرہا تھا۔ میں رومال سے اسے صاف کرنے لگی۔ گرمی تھی مگر باہر نکلنے سے پہلے میں نے پانی پیا تھا اس کے باوجود حلق یوں خشک ہو رہا تھا جیسے میں نے نہ جانے کب سے پانی نہ پیا ہو۔ میرے ذہن سے بالکل نکل گیا تھا کہ میں کس مقصد کے لیے گھر سے نکلی تھی۔ بس مجھے اس شخص کی نظریں یاد تھیں۔ عجیب بات تھی کہ مجھے برا نہیں لگا تھا کہ اس نے مجھے اس طرح کیوں دیکھا ورنہ اگر کوئی اور شخص مجھے اس طرح دیکھتا تو لازمی مجھے طیش آتا۔ مجھے اس پر نہیں بلکہ خود پر غصہ آنے لگا کہ مجھے اس پر غصہ کیوں نہیں آرہا تھا؟

کچھ دیر بعد میرا دل اور جسم تو قابو میں آ گیا مگر اب بھی اس شخص کا خیال اور اس کی نظروں کا احساس میرے اندر سے نہیں جا رہا تھا۔ میرا موڈ بدل گیا اور میں نے شاپنگ کا ارادہ بدل دیا۔ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا اور مجھے ڈر تھا کہ میری حالت پھر نہ خراب ہو جائے اور میں تماشابن جاؤں۔ یہاں تو میں گھر کے پاس تھی۔ مگر مجھے اب اوپر جاتے ہوئے ڈر لگ رہا تھا کہ نہیں پھر اس سے سامنا نہ ہو جائے اور میرا خود پر قابو نہ رہے۔ نہ جانے کتنی دیر میں کار میں بیٹھی رہی اور پھر اس وقت چونکی جب سامنے موجود ایک شخص نے تنگی باندھ کر مجھے گھورتا شروع کیا۔ تب مجھے احساس ہوا کہ میرا چہرہ کھلا تھا۔ میں نے جلدی سے نقاب کیا اور آنکھوں پر سن گلاس لگا لیا۔ اس وقت مجھے اس شخص پر اتنا شدید غصہ آیا کہ میرا دل کیا کہ کار اسٹارٹ کر کے اس پر چڑھا دوں۔ اس کے بعد مجھے حیرت ہوئی کہ ایک ہی کام دو افراد نے کیا۔ ایک پر مجھے ذرا غصہ نہیں آیا اور دوسرے پر اتنا غصہ آیا۔

اس شخص کی آنکھوں کی ہوس تھی اور اس کی آنکھوں میں ستائش تھی مگر ساتھ ہی ایک ایسا حاکمانہ انداز بھی تھا جیسے مجھے اپنی مرضی سے دیکھنا اس کا استحقاق ہو۔ شاید اسی چیز نے میری حالت بری کر دی تھی۔ میں کار سے اتر کر اوپر کی طرف بڑھی تو ایک بار پھر میرے قدم لرزنے لگے تھے۔ مگر جب اوپر آئی اور راہداری کو خالی پایا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ شاید وہ اپنے فلیٹ میں چلا گیا تھا یا پھر کہیں باہر گیا

نکلنے لگی تو وہ نیچے گر گئی اور میں جھک کر اٹھا رہی تھی کہ مجھے کچھ محسوس ہوا۔ مجھے لگا جیسے کوئی عقب سے مجھے دیکھ رہا ہے۔ میں جلدی سے سیدھی ہو کر مڑی تو سامنے والے فلیٹ کے دروازے پر ایک کسی قدر طویل قامت آدمی کھڑا تھا۔ اس کے سیاہ کھنکریا لے بال گردن تک آرہے تھے۔ رنگ سرخ و سفید، آنکھیں نملانی اور نہایت دلکش مردانہ نقوش تھے۔ اس نے پتلون شرٹ پہنی ہوئی تھی جس میں اس کی ورزشی جسامت نمایاں تھی۔ سب سے بڑھ کر اس کی ہلکی سرمئی آنکھوں میں ایک عجیب سا سحر تھا۔ وہ مجھے ہی دیکھ رہا تھا اور میں چند لمحے کو نہ ہوت رہ گئی تھی۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ کوئی مرد اس قدر خوب صورت اور پُرکشش ہو سکتا ہے۔ سچی بات ہے ایک عام عورت کی طرح میں نے بھی کبھی مردوں کی ظاہری خوبصورتی کی طرف توجہ نہیں دی تھی۔ حد یہ کہ احسن کے بارے میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ کیسے ہیں۔ بس مجھے یہ پتا تھا کہ وہ میرے شوہر ہیں اور میرے لیے سب کچھ دیتی ہیں۔ مگر جب اس شخص کو دیکھا تو جیسے میں اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھی تھی۔ میرے انداز نے اسے بتا دیا کہ میں اس سے متاثر ہوئی تھی دوسری طرف اس کی آنکھوں میں میرے لیے ستائش اتنی نمایاں تھی کہ میں شرما کر ہوش میں آئی اور پھر تیز قدموں سے سیڑھی کی طرف چل پڑی۔

میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور اس کا ارتعاش جسم تک آیا ہوا تھا جو میری چال میں بھی لڑکھڑاہٹ کی صورت میں نمایاں تھا۔ میزھیوں تک آتے ہوئے مجھے شدید احساس ہو رہا تھا کہ اس کی نظریں میرے وجود کا طواف کر رہی ہیں۔ مجھے یوں دیکھ رہی ہیں کہ اس سے پہلے کسی مرد نے سوائے احسن کے مجھے یوں نہیں دیکھا تھا۔ دیکھا تو اس نے بھی نہیں تھا کہ میں سر سے پاؤں تک چھپی ہوئی تھی۔ نقاب سے صرف میری آنکھیں باہر تھیں اور جب میں کار تک جاتی تو سن گلاسز لگا کر آنکھیں بھی چھپا لیتی۔ مگر مجھے یوں لگا جیسے اس نے مجھے بے لباس دیکھ لیا ہو۔ یہ مشکل میں لڑکھڑاتے قدموں سے سیڑھیاں اتر کر اس کی نظروں سے اوجھل ہوئی تو رک کر خود پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ میرا دل غم مجھے یاد دل رہا تھا کہ میں ایک شادی شدہ عورت ہوں اور میرا سب کچھ میرے شوہر کی امانت ہے اور مجھے کسی بھی مرد سے چاہے وہ کتنا ہی حسین کیوں نہ ہو اس طرح متاثر نہیں ہونا چاہیے تھا۔ مگر دل تھا کہ قابو میں نہیں آرہا تھا۔

پھر مجھے یاد آیا کہ جب میں چابی اٹھانے کے لیے جھکی

میرا شعور میری اس کیفیت کو پسند نہیں کر رہا تھا مگر میرا
لاشعور اس کے خلاف تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں اس سارا
دن اس شخص کے بارے میں سوچتی رہی اور اس دن میں
نے لاتعداد غلطیاں کیں۔ چائے کا پانی رکھ کر دو بار بھولی
اور پانی خشک ہو گیا۔ شام میں کھانا بناتے ہوئے کام خراب
ہوئے اور کھانا بھی ٹھیک سے نہیں بنا۔ اتفاق سے آج
سرفراز چچا نے ہمارے ساتھ ہی کھانا تھا۔ امی نے مجھے اس
وقت سے کھانا بنانے کی ذمہ داریاں سونپی تھیں جب میں
صرف بارہ برس کی تھی اور رفتہ رفتہ بچن کے مختلف کام کرتے
اور ڈشیں بناتے ہوئے میں شادی تک سب کاموں میں
طاق ہو گئی تھی۔ احسن اور سرفراز چچا کو میرے ہاتھ کا کھانا
بہت پسند آیا تھا اس لیے آج جب انہوں نے کھانا شروع کیا
تو ذرا حیران ہوئے تھے۔ کیونکہ اس بار کھانے میں وہ ذائقہ
نہیں تھا مگر انہوں نے کچھ کہا نہیں۔ میں خود ہی شرمندہ ہوتی
رہی اور جب سرفراز چچا کے لیے قہوہ بنا کر لائی تو ان سے
معذرت کر لی۔

”چچا جان میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے آج
کھانا ٹھیک سے نہیں بنا سکا۔“
وہ تو پریشان ہو گئے۔ ”بیٹا کیا ہوا طبیعت کو..... زیادہ
خراب تھی تو احسن کو کال کر دیتیں وہ آکر ڈاکٹر کے پاس لے
جاتا۔“

”نہیں ایسی خراب نہیں تھی بس سر میں درد تھا اور سستی
ہور ہی تھی۔“
”احتیاط کیا کرو بیٹے، آپ یہاں اکیلے ہوتے ہو
ایسی کوئی بھی بات ہو تو احسن یا مجھے فوراً کال کیا
کرو۔“ انہوں نے زور دے کر کہا۔
”جی اچھا چچا جان۔“ میں نے کہا۔

”بلکہ ایسا کرو کہ سارے دن کے لیے ملازمہ رکھ لو،
اکیلی ہوتی ہو تمہارا دل بھی بہلا رہے گا اور خدا نا خواستہ کوئی
مسئلہ ہو تو اکیلی نہیں ہوگی۔ وہ ہمیں بتا سکے گی۔“
اس شام جب احسن ابو کے ساتھ آئے تو ان کا رویہ
کچھ عجیب سا تھا۔ انہوں نے آکر معمولی سے لمبے میں مجھ سے
سلام دعا کی اور پھر کمرے میں چلے گئے۔ میں اپنی ابھن
میں پڑی تھی اس لیے اس وقت زیادہ توجہ نہیں دی میں تو خود
ان سے نظر نہیں ملا پار ہی تھی۔ اس کے باوجود میں نے محسوس
کر لیا تھا۔ سرفراز چچا لاڈ لہجے میں بیٹھے تھے اور میں وہیں کھانا
بن رہی تھی۔ ان سے بات کرتی رہی۔ احسن اندر سے اس

تھا مجھے تو ہوش ہی نہیں تھا کہ کسی کو آتے جاتے دیکھتی۔ میں
نے ذرا اونچی ایڑی کی سینڈل پہنی ہوئی تھی جب میں چلتی تو
اس کی ایڑی بجتی تھی۔ میں ذرا تیز قدموں سے اپنے فلیٹ
کے دروازے تک آئی اور چابی نکال کر لاک کھول رہی تھی
کہ عقب سے بہت دھیمی سی اور جیسے گونجتی سرگوشی میں آواز
آئی۔ ”آپ خوب صورت ہیں..... باخدا بہت خوب
صورت ہیں۔“

شکر ہے نالا کھل گیا تھا ورنہ اس سرگوشی نے میرے
اندر جو حشر برپا کیا تھا اس کا اثر میرے پورے وجود پر آیا
تھا۔ نہ جانے میں کیسے دروازہ کھول کر اندھا دھند اندر آئی
اور کیواڑ دھڑ سے بند کر کے نزدیک موجود کاؤچ پر ڈھیر ہو
گئی۔ پتا نہیں اسے کیسے پتا چلا کہ میں آگئی ہوں اور اس نے
عین اس وقت دروازہ کھول کر وہ جملہ کہا۔ اف۔ اس کی آواز
اس کی آنکھوں سے کم نہیں تھی۔ اتنی تاثر اور احساس سے
بھر پور کہ میں بیان نہیں کر سکتی۔ نہ جانے کتنی دیر میرا جسم بے
اختیار کانپتا رہا اور میں شاید روتی رہی تھی کیونکہ جب میری
اتنی ہمت ہوئی کہ میں اٹھ کر پانی پی سکوں تو مجھے سب دھندلا
نظر آ رہا تھا۔ فرنگ سے بخ پانی کی پوری بوتل حلق سے اتار کر
میں واش روم میں آئی اور منہ دھویا تو میرے حواس کچھ بحال
ہوئے تھے اور میرا پہلی بار اس قابل ہوئی کہ اس واقعے پر
غور کر سکوں۔

ابتدائے جدائی سے آج تک میرے ذہن میں کبھی
کسی لڑکے یا مرد کا خیال نہیں آیا۔ حد یہ کہ میں نے دوسری
لڑکیوں کی طرح کبھی خواب بھی نہیں دیکھے اور نہ ہی جاگتے
ہوئے سپنوں میں آئی کہ میرا ہونے والا شریک سفر ایسا ہوگا
اور نہ ہی مجھے کبھی شادی کے بعد کی زندگی کا خیال آیا۔ پھر
میری شادی ہوئی اور اب میں اپنے شوہر سے پوری طرح
مطمئن تھی۔ احسن سے محبت کرتی اور خود کو پوری طرح ان کی
امانت سمجھتی۔ تب تک شخص کی صرف ایک نظر اور ایک جملے
نے میرا ایسا حال کیوں کیا؟ میرا ردعمل فطری کیوں نہیں تھا
اس کی بجائے میرے ردعمل نے مجھے ہی حیران کر دیا
تھا۔ میں اس کے بے حال کیوں ہوئی جیسے میں کوئی نو عمر لڑکی
ہوں اور اسے کسی نے محبت کی نظر سے دیکھ لیا اور یہ بات
مجھے اچھی بھی لگی ہو۔ بلکہ شاید نو عمر لڑکی کی بھی وہ حالت نہ
ہوتی جو میری ہوئی تھی۔ شاید اس لیے کہ میں شادی شدہ تھی
اور ان تمام نزاکتوں سے شناسا تھی جو ایک مرد اور عورت
کے درمیان ہو سکتی ہیں۔

اس وجہ سے مجھے احسن کا رویہ بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ میں نے سر ہلایا۔

”ٹھیک ہے آپ مجھے ایک ہفتے کے لیے بھیج دیں۔“
 ”میں دیکھتا ہوں کہ کون سی فلائٹ سے جلد ٹکٹ مل جائے گا۔“ احسن جلدی سے بولے۔ ”آج کل رش ہے اس لیے شاید ایک دو دن لگیں۔“

اب میں بھی چاہ رہی تھی کہ ذرا اس ماحول سے نکلوں۔ جہاں سامنے ایک ساحر موجود تھا اور اس نے چند لمحوں میں میری پرسکون زندگی کو تہہ و بالا کر دیا تھا۔ درحقیقت احسن کی موجودگی میں بھی میں اس کے خیال سے پیچھا چھڑا نہیں پار رہی تھی۔ اسی لیے میں مجبور بھی ہو رہی تھی کہ اپنے شوہر کے پاس ہوتے ہوئے بھی دوسرے فرد کی سوچیں میرے دماغ میں آرہی تھیں۔ سرفراز چچا کے جانے کے بعد ہم بیڈروم میں تھے اور مسلسل شرمندگی سے تنگ آکر میں غسل کے بہانے واش روم میں آگئی۔ اس بڑے سے اور بہترین فلکسچر سے آراستہ باتھ روم میں ایک طرف دیوار پر بڑا سا شیشہ لگا ہوا تھا۔ یہ شاور کے دوسری طرف تھا اور اس میں آدمی اپنے آپ کو پورا دیکھ سکتا تھا۔ اس روز پہلی بار شاور لیتے ہوئے میں نے خود کو غور سے دیکھا۔ کیا مجھ میں واقعی ایسی کشش تھی کہ ایک مرد جو خود اس قدر خوبرو اور پُرکشش تھا میری طرف یوں متوجہ ہو، مجھے اس قدر والہانہ انداز میں دیکھے اور بلا خوف و خطر میری خوب صورتی کی تعریف کرے، جب کہ اس نے صحیح معنوں میں مجھے دیکھا ہی نہیں تھا۔

اچانک مجھے احساس ہوا کہ میں آئینے میں خود کو اپنے شوہر نہیں بلکہ ایک غیر مرد کے نقطہ نظر سے دیکھ رہی ہوں۔ اس سے پہلے احسن نے میری کتنی ہی والہانہ تعریف کی اور مجھ سے کہا کہ میں خود کو دیکھوں لیکن میں نے کبھی اس بات پر عمل نہیں کیا۔ مجھے یہ بات اچھی ہی نہیں لگی تھی۔ اللہ نے عورت کا ستر ایسا رکھا ہے کہ خود اس سے بھی چھپا ہوا ہے۔ ہمارے دین میں میاں بیوی کو بھی ایک دوسرے کے ستر کی پردہ پوشی کا خیال رکھنے کو کہا گیا ہے۔ مگر آج ایک اجنبی نے مجھے دیکھا اور میری تعریف کی تو میں خود کو یوں آئینے میں دیکھ رہی تھی۔ یہ خیال آیا تو میں اندر سے کٹ کر رہ گئی۔ میں شریف عورت ہوں یہ مجھے کیا ہو رہا تھا۔ میری آنکھیں ایک بار پھر برسنے لگیں تھیں۔ نہ جانے میں کتنی دیر شاور تلے کھڑی رہی حتیٰ کہ احسن نے دروازہ بجایا۔ ”کیا ہے کتنے لمبے باتھ کا ارادہ ہے؟“

وقت نکلے جب میں نے کھانا لگا دیا اور ان کو آواز دی۔ کھانے کی میز پر بھی وہ سر جھکائے کھاتے رہے اور مجھ سے بس ایک دو باتیں ہی کیں۔ جب میں نے سرفراز چچا کو طبیعت خرابی کا بتایا تب بھی وہ کمرے میں تھے۔ میرا خیال تھا کہ وہ چچا جان کے جانے کے بعد مجھ سے پوچھیں گے کہ آج کھانا ٹھیک سے کیوں نہیں بنا میں نے سوچ لیا تھا کہ ان سے بھی وہی طبیعت خرابی کا بہانہ کروں گی۔

مگر تب چچا جان کے جانے کے بعد میں کمرے میں آئی تب بھی احسن نے مجھ سے کچھ نہیں پوچھا۔ اس کی بجائے وہ ٹی وی دیکھتے رہے۔ رات میں عام طور سے وہ ایک آدھ گھنٹائی وی پر نوز چھٹیل دیکھ لیتے تھے اور ہمارے ہاں ٹی وی بس اتنا ہی چلتا تھا۔ میں مضطرب تھی کہ احسن مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہے ہیں۔ سچی بات ہے میں ان سے نظریں نہیں ملا پار رہی تھی۔ ہم دونوں اپنی اپنی جگہ خاموش بیٹھے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد احسن نے میری خاموشی محسوس کر لی اور بولے۔ ”کیا بات ہے آج چپ چپ سی ہو؟ طبیعت ٹھیک ہے نا؟“

میں اندر سے خود کو سنبھال رہی تھی مگر ان کی بات پر رہ نہ سکی اور پھوٹ کر رونے لگی تو وہ بوکھلا گئے۔ ”کیا ہوا مہرود..... کوئی بات ہے خدا نا خواستہ گھر میں کوئی مسئلہ ہے؟“
 ”نہیں، کوئی مسئلہ نہیں ہے۔“ میں نے انکار کیا تو وہ بولے۔
 ”اگر گمراہ لے یاد آ رہے ہیں تو کچھ دن وہاں رہ آؤ۔“
 میں نے چونک کر انہیں دیکھا اور پوچھا۔ ”آپ رہ لیں گے میرے بغیر؟“

”ہاں رہ ہی لوں گا۔“ وہ میری طرف دیکھے بغیر بولے تو مجھے حیرت ہوئی کیونکہ جب میں شادی کے بعد رہنے گئی تھی تو احسن بھی ساتھ ہی گئے تھے اور مجھے ساتھ ہی لے کر آئے تھے۔ انہوں نے اس وقت صاف کہہ دیا تھا کہ وہ میرے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ اب وہ کہہ رہے تھے کہ میں چاہوں تو امی بابا کے پاس رہ آؤں۔ شادی کے چند مہینے بعد شاید سب ہی شوہر ایسا کرتے ہیں۔ شروع میں وہ جو دعویٰ کرتے ہیں چند مہینے بعد ان سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان کی محبت میں کمی آ جاتی ہے بلکہ یہ فطرت کا اصول ہے کہ کوئی بھی جذبہ اور عمل تادیر ایک سا نہیں رہتا ہے۔ اس میں لازمی کمی آتی ہے۔ مگر ساتھ ہی مجھے خیال آیا کہ آج ان کا رویہ گزشتہ روز سے مختلف تھا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ تہذیبی تو میرے اندر آئی تھی۔ شاید

”آتی ہوں۔“ میں نے جلدی سے آنکھیں صاف کیں مگر جب باہر آئی تو احسن نے غور سے دیکھا۔
”تمہاری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔“

”سر میں درد ہے۔“ میں نے وہی بہانہ کیا۔ ”شام میں کم ہو گیا تھا مگر اب پھر بڑھ گیا ہے۔“

”ایسا کرو ورنہ پین کمر لے کر سو جاؤ۔“ احسن نے کہا اور پھر خود دوا اور پانی بھی لا کر دیا۔ سر میں درد نہیں تھا مگر میں نے دوا لے لی اور لیٹ گئی تاکہ احسن مطمئن ہو جائیں۔ احسن بھی دوسری کمرٹ پر لیٹ کر سو گئے۔ ہماری شادی کے بعد کم ہی ایسا ہوا تھا کہ احسن یوں مجھ سے پہلے سو گئے ہوں ورنہ وہ اکثر میرے بعد سوتے تھے۔ میں شروع سے نیند کی کچی تھی۔ لیٹی اور ڈرا دیر میں سو جاتی۔ مگر اس رات مجھے بہت دیر سے نیند آئی۔ میرے ذہن میں رہ رہ کر وہ نظریں اور وہ لہجہ گھومتا رہا تھا۔ جب احسن نے مجھے اپنے گھر جانے کو کہا تو میں اسی لیے مان گئی کہ میں اس جگہ سے دبا چلی جاؤں گی جہاں یہ شخص میرے گھر کے عین سامنے موجود تھا۔ مجھے تو اس کا نام بھی نہیں معلوم تھا۔

اگلے روز صبح احسن کا رویہ ویسا ہی تھا وہ زیادہ بات نہیں کر رہے تھے اور نہ ہی میری طرف زیادہ دیکھ رہے تھے۔ میرا دل پھر وہ ٹرک اٹھا کہ کیا وہ جان گئے تھے کہ کل کیا ہوا تھا؟ مگر وہ کیسے جان سکتے تھے؟ یہ سب تو میرے اندر ہوا تھا۔ اس وقت احسن کام پر تھے اور کسی نے دیکھا بھی نہیں تھا جو انہیں بتا سکتا اور دیکھ بھی لیا تھا تو کیا بتاتا۔ یہ ظاہر تو کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ احسن کے جانے کے بعد میرے اندر پھر خوف سے آنے لگے۔ مجھے خیال آیا کہ وہ شخص یہاں سے کچھ ہی دور ہے۔ اگرچہ درمیان میں دیواریں تھیں میں اپنے گھر میں محفوظ تھی۔ مگر پھر بھی مجھے اس جادوگر شخص سے خوف آرہا تھا۔ یہ سچ ہے کہ جب میں اس کے بارے میں سوچتی تو مجھے لگتا کہ وہ عام آدمی ہے اس میں کوئی ایسی چیز ہے جو دوسروں کو اپنے ٹرائس میں لے لیتی ہے۔ بے شک اس کی شخصیت نے مجھے بے خود کر دیا تھا مگر یہ کام میں نے کسی اندرونی جذبے سے متاثر ہو کر نہیں کیا تھا۔

کام کرنے والی عام طور سے گیارہ بجے آتی تھی۔ اس لیے گیارہ بجنے میں کچھ دیر پہلے کال بیل بجی تو میں نے یہ سوچ کر پوچھے بغیر دروازہ کھول دیا کہ وہی ہوگی۔ مگر دروازہ کھولتے ہی میں جیسے ٹخمد ہو گئی تھی۔ سامنے وہی کھڑا

تھا۔ میرے بالکل سامنے چند فٹ کے فاصلے پر اور پلک جھپکائے بغیر مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اتنی جرات کرے گا کہ میرے گھر تک آجائے گا۔ میں گرمی کی مناسبت سے لان کے بلکے سوٹ میں تھی اور دوپٹا تھا۔ کسی قدر فٹنگ والی ہاف سلیو شرٹ تھی۔ دوپٹا میرے شانوں پر تھا۔ اس کی نگاہیں میرے چہرے سے شروع ہوئیں اور میرے پورے وجود کو ٹھونکتی ہوئی پاؤں تک گئی تھیں۔ میں ان نظروں کو پوری شدت سے محسوس کر رہی تھی مگر میرا بدن یوں مثل ہو گیا تھا کہ میں اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر پارہی تھی۔ اپنا ہاتھ ہلا کر دوپٹا تک ٹھیک نہیں کر سکتی تھی۔ اس کی نظریں واپس پلٹیں اور دوبارہ اسی طرح پورے وجود کو ٹھونکتی ہوئی چہرے تک آئیں اور میری آنکھوں میں دیکھا تو اس کی آنکھوں میں میرے لیے بے پناہ ستائش تھی۔ اس نے پھر اسی دھیمی اور گونجتی آواز میں کہا۔ ”میں نے ٹھیک کہا تھا نا آپ بہت خوب صورت ہیں۔ یہ آپ کے حسن کو خراج کے لیے.....“

اس نے ہاتھ آگے کیا تو اس میں ایک گلاب کی کلی تھی۔ مگر میں تو انگلی بھی نہیں ہلا پارہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایسی چمک تھی جس نے میرا ذہن ماؤف کر دیا تھا۔ اس نے پھر کہا۔ ”جب میں نے آپ کو دیکھا تو مجھے لگا کہ آپ سے زیادہ حسین اور دلکش عورت اس روئے زمین پر اور کوئی نہیں ہوگی۔ آپ کا ایک ایک انگ جیسے دست خاص سے تراشا ہوا ہے، آپ کے نقوش جیسے سبک ہوانے ترتیب دیئے ہیں۔ آپ کو دیکھنا ہی میری زندگی کی سب سے بڑی خوشی ہے۔“

جواب میں، میں ایک ٹک ایسے دیکھ رہی تھی۔ آج بھی اس نے پینٹ شرٹ پہنی ہوئی تھی اور شرٹ کے کھلے گریبان سے اس کا کشادہ سینہ جھلک رہا تھا۔ اس کے پاس سے عجیب انوکھی اور مسحور کر دینے والی خوشبو آرہی تھی۔ گلاب کی کلی تھا ما اس کا ہاتھ بھرا تھا۔ آستین الٹی ہوئی تھی اور کلائی سے ہلکے بال جھلک رہے تھے۔ پھر میں نے خود کو کہتے پایا۔ ”آپ نے مجھے کب دیکھا میں تو پردے میں تھی۔“

”پردہ عام لوگوں کے لیے ہوتا ہے۔“ اس نے کہا اور ذرا جھک کر بولا۔ ”مجھ جیسے لوگوں کے لیے نہیں، آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ پردے میں بھی میں نے آپ کو کیسے دیکھا۔ بالکل ایسے جیسے رات شاور لیتے ہوئے آپ نے خود

کو آئینے میں دیکھا۔“

تعلق نہیں تھا۔ جو بات صرف مجھے پتا تھی وہ اسے کیسے معلوم ہو سکتی تھی۔ کام والی نے کہا۔ ”بی بی جی آپ لیڈی ڈاکٹر کو دکھائیں، شاید اللہ نے خوشخبری دی ہو۔“

میں چونکی۔ ”نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

اس نے اصرار کیا۔ ”آپ کو نہیں پتا بی بی جی، ان دنوں عورت ایسا ہی محسوس کرتی ہے۔ آپ ضرور ڈاکٹر کے پاس جائیں۔“

”مجھے پانی لا دو۔“ میں نے اپنا سر سہلاتے ہوئے کہا۔ اس نے مجھے پانی لا کر دیا۔ میں جیسے جیسے بہتر ہو رہی تھی مجھے لگ رہا تھا کہ میں نے خواب ہی دیکھا ہے اور میرے اندر کی خلش مٹتی جا رہی تھی۔ میں اٹھ کر کچن تک آئی اور چائے کا پانی رکھا۔ اس دوران میں کام والی نے صفائی شروع کر دی تھی۔ میں اسے دیکھنے آئی کہ لاؤنج میں آتے ہی ٹھنک گئی۔ دروازے کے پاس ریک کے اوپر وہی گلاب کی کٹی رکھی تھی جو وہ شخص مجھے دے رہا تھا۔ مجھے لگا میرا سر پھر چکرار رہا ہے۔ تو وہ سب حقیقت میں ہوا تھا۔ میں نزدیک کاؤچ پر بیٹھ گئی ورنہ کھڑی نہ رہ پاتی۔ یہ گلاب کی کٹی اس حقیقت کا ناقابل تردید ثبوت تھی کہ وہ سچ سچ آیا تھا اور اس نے مجھے اپنے بازوؤں میں اٹھایا تھا لیکن پھر وہ کہاں چلا گیا۔ اسی دوران میں تو کال بیل بجی تھی۔ وہ کام والی کی نظروں میں آئے بغیر کیسے جاسکتا تھا؟ اپنی الجھن دور کرنے کے لیے میں نے کام والی کو آواز دے کر بلایا اور اس سے پوچھا۔ ”پتہ لائی ہو؟“

”نہیں بی بی جی میں نہیں لائی۔“ اس نے انکار کیا۔

”اچھا پھر احسن لائے ہوں گے۔“ میں نے اسے مطمئن کرنے کے لیے کہا کیونکہ وہ ذرا عجیب نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ”رات میری طبیعت خراب تھی تو دینا بھول گئے ہوں گے۔“

مگر شاید یہ میرا احساس تھا ورنہ اسے ذرا بھی پروا نہیں تھی کہ گلاب کی کٹی کہاں سے آئی؟ وہ تو سوال کا جواب دے کر چلی گئی تھی۔ میں ہی اپنے اندرونی احساسات کے تحت اسے صفائی دے رہی تھی۔ وہ اپنے کاموں میں لگ گئی۔ یہ سوچ کر میری حالت پھر خراب ہونے لگی کہ مجھے سچ سچ کسی اجنبی شخص نے چھوا تھا۔ مجھے اپنا آپ برا لگ رہا تھا۔ میں جا کر کمرے میں لیٹ گئی۔ میرا دل تو رونے کو چاہ رہا تھا مگر میں کام والی کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔ اتفاق سے اس دن کپڑے کم تھے اس لیے جب اس نے صفائی کی تو

اس وقت کوئی میرے دو کپڑے کر دیتا تب بھی میرے بدن سے ایک قطرہ خون نہ نکلتا۔ میرا دل رکنے سا لگا تھا اور مجھے لگا جیسے میں بے ہوش ہو جاؤں گی۔ میرا سر چکرانے لگا تھا اور آنکھوں کے آگے اس کا وجود لہرا رہا تھا پھر شاید میں گرے نہ لگی تھی کہ اس نے بڑھ کر مجھے سنبھال لیا۔ میں نے چاہا کہ وہ مجھے نہ چھوئے مگر میں اسے نہ روک سکی۔ اس نے بازوؤں میں لے کر مجھے اٹھایا اور اندر لے جانے لگا۔ میں اسے روکنا چاہتی تھی مگر روک نہیں سکی۔ اس وقت مجھے لگا کہ اگر وہ مجھے اندر بیڈ تک لے گیا تو شاید وہ سب ہو جائے جس کا میں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا۔ میں تو اسے روکنے کی سکت نہیں رکھتی تھی۔ لیکن اگر ایسا نہ بھی ہوتا تو یہ بھی کم نہیں تھا کہ میں ایک غیر مروتی بانہوں میں تھی۔ پھر مجھے احسن کا خیال آیا اور میں تڑپ گئی مگر اس کے بازوؤں سے نہ نکل سکی۔ اسی لمحے کال بیل بجی اور میں جیسے تھم گئی۔ چند لمحے کو میں بالکل بے ہوش سی ہو گئی تھی اور جب دوبارہ کال بیل بجنے پر میں چونکی تو میں نے خود کو لاؤنج میں کاؤچ پر لیٹے پایا اور وہ وہاں نہیں تھا۔ میں نے ہراساں نظروں سے چاروں طرف دیکھا مگر وہ مجھے کم از کم لاؤنج میں نظر نہیں آیا تھا۔ مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرے جسم کے ایک ایک ریشے سے تو اوائی خارج ہو چکی ہو۔ مجھ سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ تیسری بار کال بیل بجی تو میں بہ مشکل لڑکھڑاتے قدموں سے اٹھی اور دروازے تک آئی۔ میرا خیال تھا کہ دروازہ کھلا ہوگا مگر وہ بند تھا۔ اس بار میں نے پوچھا۔

”کون ہے؟“

”میں ہوں بی بی جی۔“ کام والی کی آواز آئی۔

میں نے دروازہ کھولا تو وہ میری حالت دیکھ کر پریشان ہو گئی۔ ”کیا ہوا بی بی جی آپ تو بالکل پیلی ہو رہی ہو۔“

میں نے اپنا چکر اتا سر تھام لیا۔ ”میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

وہ مجھے سہارا دے کر اندر لائی اور بستر پر لٹا کر سوالات کرنے لگی۔ میں نہ جانے کیا جواب دے رہی تھی کیونکہ میں سوچ رہی تھی کہ یہ جو سب ہوا کیا حقیقت میں ہوا یا میں نے کوئی خواب دیکھا تھا؟ اس نے مجھے بتایا کہ میں نے شاور لیتے ہوئے خود کو دیکھا تو اسے کیسے پتا چلا؟ نہیں یہ میرا خواب و خیال تھا۔ اس کا حقیقت سے کوئی

دس منٹ میں کینسر

سائنسدان نے دعویٰ کیا ہے کہ انہوں نے ایک ایسا سستا اور ہاتھ میں تھامنے والا آلہ تیار کر لیا ہے جو کسی بھی قسم کی بیماری مثلاً ٹی بی، بلیریا، ایچ آئی وی انفیکشن یا کینسر کا صرف دس منٹ میں سراخ لگا سکتا ہے۔ q.poc مشین کی قیمت صرف 500 پاؤنڈ ہے۔ یہ مشین ٹیومرز یا رسولیوں کا انتہائی گہرائی تک تجزیہ کر سکتی ہے اور امراض کی جینیاتی شناخت کا پتا چلا سکتی ہے۔ جس کے بعد مریض کے لیے بہترین قسم کی دواؤں کا انتخاب آسان ہو جاتا ہے۔

مرسلہ: انیلہ نعمان خان، کراچی

پلیز آپ مجھے چھوڑ کر مت جایا کریں۔ ورنہ کسی دن میں مر جاؤں گی۔“

انہوں نے پوچھا۔ ”ایسا کیوں کہہ رہی ہو کوئی بات ہوئی ہے؟“

میں نے ان کے سینے میں منہ چھپالیا کہ کہیں میرے تاثرات وہ بات نہ کہہ دیں جو میری زبان کسی صورت نہیں کہہ سکتی تھی۔ میں نے صرف نفی میں سر ہلایا تو انہوں نے محبت سے کہا۔ ”تم اصل میں بھرے پورے گھر سے آئی ہو اور یہاں بالکل اکیلی ہوئی ہو اس لیے تمہیں ایسا لگ رہا ہے لیکن شاید جلد یہ تنہائی دور ہو جائے اور کوئی چھوٹا موٹا کھلونا آجائے تمہارا دل بہلانے کے لیے۔“ احسن کا لہجہ معنی خیز ہو گیا

ان حالات میں بھی میں شرمائی اور خوش ہو گئی۔ ”سچ کہہ رہے ہیں؟“

”ہاں نا۔“ وہ بولے۔ میرا خیال تھا کہ وہ پھر شوخی آمیز بے باکی پر اتر آئیں گے۔ مگر خلاف توقع انہوں نے مجھے خود سے الگ کیا اور بولے۔ ”میں نے کل صبح کی سیٹ بک کرادی ہے اور شاہد (میرے بڑے بھائی) کو اطلاع دے دی ہے وہ تمہیں ملتان الرپورٹ لینے آئے گا۔“

میں نے سکون کا سانس لیا اور پوچھا۔ ”میں کتنے دن ای کے ہاں رہوں؟“

میں نے اس کی چمٹی کر دی۔ ”کپڑے گل آ کر دھولینا۔“
”ٹھیک۔ ہے بی بی جی۔“ وہ خوش ہو گئی پھر اسے خیال آیا۔ ”آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے کھانے کو کچھ بنا دوں۔“

”نہیں میرا دل نہیں چاہ رہا ہے ویسے فریج میں رکھا ہوا ہے۔“ میں نے اسے ٹالنے کے لیے کہا ورنہ فریج میں پکا ہوا کچھ بھی نہیں تھا۔ میں ایک وقت بس اتنا بناتی تھی کہ وہ ایک دن چل جائے اگلے دن بیچ نہ جائے اور اگر بیچ جاتا تو اسے کام والی کو دے دیتی تھی۔ مجھ سے اور احسن سے بھی ایک دن کار کھانہ نہیں کھایا جاتا تھا۔ کام والی کے جانے کے بعد میں نے دروازے کو اندر سے لاک کیا۔ زنجیر چڑھائی اور پھر کنڈی بھی چڑھا دی۔ اس کے باوجود مجھے خوف تھا کہ کہیں وہ شخص پھر نہ آجائے اور میں اس کے سامنے پھر بے بس نہ ہو جاؤں۔ میں سوچ رہی تھی کہ وہ کیا تھا اسے کیسے علم ہوا کہ میں نے خود آئینے میں دیکھا تھا اور اس نے جو تشبیہ دی تھی اسے سوچ کر ہی میں اندر سے کتنے لگی تھی۔ جب وہ مجھے اندر لے کے جا رہا تھا تو کال بیل بجنے پر وہ میری اور کام والی کی نظروں میں آئے بغیر باہر کیسے نکلا؟ جب میں ہوش میں آئی اور دروازہ کھولا تو کام والی نے پورا گھر صاف کیا تھا اور اگر وہ کہیں چھپا ہوتا تو لازمی نظروں میں آتا۔ شاید وہ کسی بگ چھپ گیا تھا اور جب کام والی مجھے سہارا دے کر میرے کمرے تک لائی تو وہ خاموشی سے باہر نکل گیا ہوگا۔ اس وقت بھی مجھے لگا کہ وہ گھر میں موجود ہے۔ میں نے گھوم کر پورا گھر دیکھا ایک ایک جگہ چیک کی اور اس کے بعد مجھے اطمینان نہیں ہوا تو میں نے صبراً اللہ کو یاد کیا۔ ”اے اللہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میری عزت و آبرو کی حفاظت کرنا جو میرے پاس میرے شوہر کی امانت ہے۔ تو جانتا ہے کہ میں ایسی عورت نہیں ہوں جو اپنے شوہر کی امانت میں خیانت کروں۔“

یہ دعا کر کے مجھے ذرا سکون ملا تھا مگر گھر میں اکیلی ہونے کا اطمینان کرنے کے باوجود جب تک شام کو احسن نہیں آگئے میں سہمی رہی اور ذرا سی آہٹ پر اچھل پڑتی تھی۔ احسن آئے اور مجھے دیکھ کر حیران ہوئے تھے۔ انہوں نے بھی کام والی کی طرح کہا۔ ”مہر و تمہیں کیا ہوا ہے تمہارا رنگ پیلا پڑ گیا۔“

شادی کے بعد پہلی بار ایسا ہوا کہ میں خود ان سے لپٹ گئی۔ میں رو دی تھی۔ ”احسن مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے

”جتنے دن تم چاہو۔“ وہ بولے میں پھر حیران ہوئی میرا خیال تھا کہ وہ ایک دودن کی بات کریں گے۔ اگرچہ پہلے میں نے ایک ہفتے کا کہا تھا اور وہ چپ ہو گئے تھے مگر مجھے لگا کہ وہ مجھے جلد واپس بلا لیں گے۔ میں نے پھر پوچھا۔

”آپ رہ لیں گے میرے بغیر؟“

”ہاں رہ لوں گا۔“ انہوں نے پھر آنکھیں چرائیں اور عجیب سے انداز میں ہنس کر بولے۔ ”اب تو ہماری شادی کو پانچواں مہینا ہے۔“

”مجھے اندازہ نہیں تھا کہ آپ کی دیوانگی اتنی جلدی ختم ہو جائے گی۔“ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی شکوہ کیا اور پھر شرمندہ ہو گئی۔ ”سوری میں آپ کو جتنا نہیں رہی تھی۔“

”نہیں تم نے ٹھیک کہا۔“ وہ آہستہ سے بولے پھر کہا۔ ”تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے چل کر ڈاکٹر کو دکھاتے ہیں اور باہر سے ہی کھانے کو کچھ لے آئیں گے۔“

”نہیں ڈاکٹر کو دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔“ میں نے منع کیا مگر انہوں نے اصرار کیا۔

”چلو، اس طرح تمہاری آؤٹنگ بھی ہو جائے گی۔“

میرا دل نہیں چاہ رہا تھا مگر اس خیال سے تیار ہو گئی کہ کل صبح میں چائے جاؤں گی اور جانے سے پہلے میں احسن کی کوئی بات مانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ میرا خیال رکھ رہے تھے۔ میں تیار ہوئی عبایا پہنا اور احسن کے ساتھ باہر آئی۔

میں سامنے والے دروازے کی طرف نہیں دیکھنا چاہ رہی تھی مگر باہر آتے ہی اس طرف نظر اٹھ گئی۔ دروازہ بند تھا اس کے باوجود مجھے اس قدر خوف آیا، یوں لگا جیسے دروازے کے پیچھے وہ نوو موجود ہے۔ احسن کی موجودگی بھی مجھے اطمینان دینے سے قاصر تھی۔ بلکہ مجھے یہ فکر لاحق ہو گئی کہ اگر وہ باہر نکل آیا تو میری حالت پھر خراب ہو جائے گی اور اس بار احسن بھی یہ سب دیکھ لیں گے۔ وہ مرد تھے اور مجھ پر شک کر سکتے تھے۔ اس لیے میں تیز قدموں سے لفٹ کی طرف بڑھ گئی۔ احسن دروازہ لاک کر کے پیچھے آئے اور بولے۔

”کہاں تو تم باہر نہیں جا رہی تھیں اور کہاں اب اتنی جلدی ہے۔“

”بس بند جگہ پر دل گھبرا رہا ہے میں چاہتی ہوں ہم جلدی سے باہر نکل جائیں۔“

میں احسن سے بات کر رہی تھی اور میرا دھیان ان کی

طرف ہی تھا اس لیے میں اسے آتے نہیں دیکھ سکی لیکن جب احسن کا ہاتھ لفٹ کا بٹن دباتے دباتے رک گیا تب میں نے سر اٹھایا اور اسے لفٹ کی طرف آتے دیکھا۔ میرا دل سچ سچ رک گیا اور یوں لگا جیسے جسم سے جان نکل گئی ہو۔ گرنے سے بچنے کے لیے میں نے پشت دیوار سے ٹکائی اور نظریں جھکاتے ہوئے سختی سے فرش پر گاڑ دیں۔ اگر اس وقت لفٹ کا فرش پھٹتا اور میں اس میں گر جاتی تب بھی مجھے گوارہ تھا مگر اس شخص کے ساتھ ایک ہی جگہ ہونا میرے لیے کیسا عذاب بن گیا تھا یہ میں ہی جانتی تھی۔ اوپر سے احسن بھی ساتھ تھے۔ وہ مجھ سے آگے تھے اور وہ شخص ان کے دائیں طرف موجود تھا۔ جب لفٹ چلی تو وہ غیر محسوس انداز میں سرک کر پیچھے آیا اور مجھے ایک بار پھر محسوس ہوا کہ وہ مجھے

ٹوٹتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

میرے بدن میں تھر تھری چھوٹ گئی تھی۔ میں نے ہاتھ سختی سے اپنے ہنڈ بیگ پر باندھ لیے اور منہ دوسری طرف کر لیا آنکھیں بھی بند کر لیں اس کے باوجود اس احساس سے بچھا نہیں چھوٹا تھا۔ یہ اچھی کوالٹی کی تیز رفتار لفٹ تھی اور دو فلورز سیکنڈوں میں گزر جاتے ہیں مگر مجھے ایسا لگا جیسے لفٹ میں وقت تھم گیا ہو وہ گزر کر نہیں دے رہا تھا اور نہ جانے کب لفٹ رکی۔ احسن نے مجھے دوسری بار آواز دی تو میں چونکی پھر انہوں نے کہا۔ ”کیا ہوا تم جو اب کیوں نہیں

دے رہی؟ لفٹ کب کی رکی ہوئی ہے۔“

تب میں نے چونک کر دیکھا لفٹ واقعی رکی ہوئی تھی دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہ شخص اب لفٹ میں نہیں تھا۔ میں نے دیوار سے جدا ہو کر باہر قدم نکالا۔ میری حالت اس وقت بھی اچھی نہیں تھی دل بے طرح دھڑک رہا تھا اور جسم پسینے میں مٹا رہا تھا۔ مگر جسم قابو میں تھا۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ

انہیں آس پاس ہوا تو میں پھر خود پر قابو نہ رکھ سکوں گی مگر اللہ کا شکر ہے وہ کہیں نہیں تھا۔ کار میں بیٹھتے ہی میں نے احسن سے کہا۔ ”پلیز اے سی آن کر لیں اور پہلے کہیں سے مجھے پینے کے لیے کچھ ٹھنڈا لادیں۔“

احسن نے پہلی بار مجھے دیکھا اور فکر مندی سے بولے۔ ”کیا ہوا تمہیں اتنا پسینا کیوں آرہا ہے۔“

میرے چہرے کا نقاب تک پسینے سے بھیگ گیا تھا۔ ”ہاں نہیں میرا دل گھبرا رہا ہے۔“

احسن نے کار ایک کولڈ ڈرینک اسپاٹ پر روکی اور میرے لیے بیسٹن لے آئے۔ اسے پی کر مجھے سچ سچ

فروری 2015ء

دوایا کے کسی بھی گوشے میں اور ملک بھر میں

گھر بیٹھے

رسالے حاصل کیجیے

جاسوسی ڈائجسٹ، سسٹمز ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں، اپنے دروازے پر

ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا رسالہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)

پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے

امریکا، کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 8,000 روپے

بقیہ ممالک کے لیے 7,000 روپے

آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔

یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر ہماری بینک فیس عاید ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔

رابطہ شمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

C-63 فیروز ٹریڈنگ ہاؤس اتھارٹی مین کورنگی روڈ، کراچی
فون: 35895313 ٹیکس: 35802551

بہت سکون ملا تھا۔ میری حالت بہتر ہوئی تو ہم پہلے ایک ریستوران گئے۔ مجھے یہاں کا ماحول پسند تھا کیونکہ یہاں میزیں ایسے رکھی تھیں کہ ایک میز پر بیٹھے لوگ دوسری میز پر بیٹھے لوگوں کو نہیں دیکھ سکتے تھے اور میں یہاں آرام سے نقاب اتار کر بیٹھ سکتی تھی۔ جب ویٹر آتا تو نقاب کر لیتی اور اس کے جانے کے بعد دوبارہ اتار دیتی۔ احسن نے پہلی بار مجھ سے پوچھا: ”مہر و تمہیں کیا ہو رہا ہے تمہاری طبیعت خراب ہے یا دل گھبرا رہا ہے؟“

”ہاں نہیں، شاید دونوں باتیں ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”سبھی چکرا رہا ہے اور دل بھی گھبرا رہا ہے۔“ ”ابھی یہاں سے ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔“ احسن نے کہا اور کھانے کا پوچھنے لگے۔ میں نے مینوبک دیکھی اور انہیں بتانے لگی۔ انہوں نے ویٹر کو بلا کر آرڈر کیا۔ اب میں خود کو مطمئن اور ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی اس لیے میں نے ٹھیک سے کھایا۔ کھانے کے بعد ہم نکلے تو میں نے ڈاکٹر کے پاس جانے سے انکار کیا مگر احسن اصرار کر کے لے گئے۔ اتفاق سے یہ لیڈی ڈاکٹر تھی اور اس نے میری کیفیت سن کر مجھے پریشانی ٹیسٹ کرانے کو کہا۔ میں جانتی تھی ایسی کوئی بات نہیں ہے مگر میں اسے یا احسن کو تو نہیں بتا سکتی تھی اس لیے میں چپ رہی۔ اس نے مجھے لکھ کر دیا اور ساتھ ہی طاقت اور منتر لڑا کچھ دوائیں بھی لکھ دیں۔ جب باہر آئے تو میں نے احسن سے کہا۔

”میں امی کی طرف جا رہی ہوں وہیں یہ ٹیسٹ کرا لوں گی۔“ ”ہاں اب تو وقت بھی نہیں ہے۔“ احسن نے کہا۔ ”لیکن دوائیں میں لے دیتا ہوں تم باقاعدگی سے استعمال کرنا۔“

راستے میں شہر بہت تھا۔ دو تین جگہوں پر جہاں میڈیکل اسٹور تھے وہاں گاڑی پارک کرنے کی جگہ بھی نہیں تھی۔ احسن پریشان ہو گئے تو میں نے کہا۔ ”ہمارے فلیٹس کے نیچے بھی تو ایک میڈیکل اسٹور ہے وہاں سے مل جائیں گی۔“

”ہاں اس کا تو میں بھول ہی گیا تھا۔“ احسن نے کہا۔ ہم بلڈنگ تک آئے اور احسن نے پارکنگ میں گاڑی روک دی۔ ”تم چلو میں دوائیں لے کر آتا ہوں۔“ ”نہیں مگر آپ کے ساتھ ہی جاؤں گی۔“ میں نے انکار کیا۔ مجھے خیال آیا کہ کہیں وہ شخص پھر نہ آن موجود ہو نہ۔

میں لفٹ تک آئی اور اس کا بٹن دبایا۔ لفٹ اوپر تھی وہ نیچے آنے لگی۔ میں ابھی تک اس پاس دیکھ رہی تھی۔ اس لیے جب دروازہ کھلتا تب بھی میری توجہ اس طرف نہیں تھی۔ پھر وہی احساس ہوا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے اور میں چونکی تو لفٹ میں اسے موجود پایا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے اور سینے پر ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔ میں ایک بار پھر شل ہو گئی۔ اسے دیکھ کر چلانے اور مزاحمت کرنے کے تمام خیالات میرے ذہن سے جیسے اڑ گئے تھے۔ میں وہاں سے بھاگ جانا چاہتی تھی مگر میرے پاؤں زمین میں گڑ گئے اور پھر اس نے ہاتھ سے اندر آنے کا اشارہ کیا تو میں جیسے کھینچی چلی گئی تھی۔ میرے اندر آتے ہی وہ گھوم کر عقب میں آیا اور اس نے بٹن دبا کر لفٹ بند کر دی۔ میں سہم کر دیوار سے لگ گئی تھی۔ میں اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہی تھی۔ مگر اس کی نظریں ایک لمحے کو میرے وجود سے نہیں ہٹی تھیں۔ لفٹ اوپر جا رہی تھی۔

”آپ بہت خوب صورت ہیں..... بہت حسین ہیں۔“ اس نے مخصوص گونجتی آواز میں کہا تو میرے بدن میں تھر تھری سی چھوٹ گئی تھی۔

”پلیز۔“ میں نے بہت ہمت کر کے کہا۔ ”مجھے جانے دیں۔“

”میں جانے دوں گا۔“ اس نے سرگوشی کی۔ وہ ایسی آواز میں بولتا تھا جو سرگوشی لگتی تھی مگر جیسے دل و دماغ میں گونجتی تھی۔ ”مگر پہلے میں آپ کو دیکھنا چاہوں گا۔“

مجھ پر طاری لرزہ بڑھ گیا تھا کیونکہ جیسے ہی اس کے منہ سے یہ لفظ ادا ہوئے میں ان کے معنی سمجھ گئی تھی۔

”نہیں۔“ میں نے ایک بار پھر مشکل سے کہا۔ ”میں شریف عورت ہوں..... سوائے شوہر کے کسی نے مجھے نہیں دیکھا۔“

”میں نے دیکھا ہے۔“ اس نے دعویٰ کیا۔ اس وقت نہ جانے مجھ میں کہاں سے اتنی ہمت آگئی۔ میں نے کہا۔ ”اگر تم نے دیکھ لیا ہے تو پھر اب دیکھنے کی بات کیوں کر رہے ہو؟“

”وہ سب میں نے خیال میں دیکھا ہے اب میں سچ سچ دیکھنا چاہتا ہوں۔“

”نہیں۔“ میں نے کہا تو یک دم اس کی آنکھیں خوفناک ہو گئیں اور اس کا لہجہ بدل گیا۔ اس بار وہ غصے سے بولا تھا۔

جانے اسے کیسے اطلاع مل جاتی تھی کہ میں کہاں ہوں اور وہ آن موجود ہوتا تھا۔ اس لیے میں اکیلے جاتے ہوئے ڈر رہی تھی۔ احسن کی موجودگی سے مجھے یہ ڈھارس ہوئی تھی کہ اگر میں بے خود بھی ہو گئی تو وہ مجھے سنبھال لیں گے۔ کوئی غیر مجھے ہاتھ نہیں لگائے گا۔ مگر احسن نے کہا۔

”کم آن یار اتنی گرمی میں گاڑی میں بیٹھی رہو گی شاباش اوپر جاؤ میں جب تک دوامیں لے کر آتا ہوں۔“ احسن نے کہتے ہوئے مجھے چابی پکڑادی اور میں مجبوراً گاڑی سے اتر آئی۔ احسن دکانوں کی طرف چلے گئے تھے اور میں لرزتے قدموں سے بلڈنگ کی انٹرنس میں آئی۔ میں نے سوچ لیا کہ میٹھیوں سے جاؤں گی۔ مگر جب میٹھیوں تک آئی تو وہاں تار کی تھی۔ حالانکہ میں نے بھی وہاں تار کی نہیں دیکھی تھی۔ مگر اس وقت اندھیرا تھا اور اوپر کہیں کسی فلور پر ہلکی سی روشنی جھلک رہی تھی۔ مگر درمیان میں نہ صرف تار کی تھی بلکہ اس تار کی کو دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے اس میں کوئی عفریت چھپا ہوا میرا انتظار کر رہا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ میں تار کی میں جاؤں اور وہ مجھے دبوچ لے۔ ڈر کر میں پیچھے ہٹی اور لابی میں آئی۔ دن میں یہاں ایک گارڈ ہوتا تھا مگر وہ شام کو چلا جاتا اور اس کے بعد انٹرنس کا گیٹ بند کر دیا جاتا۔ تمام لوگ جو یہاں رہتے تھے ان کے پاس گیٹ کی چابی تھی اور وہ اس کی مدد سے اندر جا سکتے تھے۔

مگر ابھی میں آئی تو گیٹ کھلا ہوا تھا۔ میں اتنی خوفزدہ ہوئی تھی کہ وہاں باہر جانے لگی مگر جب گیٹ تک آئی تو اسے بند پایا۔ اندر سے یہ صرف ہینڈل کھمانے سے کھل جاتا تھا۔ میں نے اسے کھمانا چاہا تو وہ سخت ٹکا گھوم ہی نہیں رہا تھا۔ میرا خوف بڑھ گیا کہ میں یہاں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ آنے جانے کا یہی ایک واحد راستہ تھا۔ میں نے ہر اسان نظروں سے چاروں طرف دیکھا اور تب میری نظر لفٹ کی طرف گئی۔ وہاں روشنی تھی۔ اس وقت یہاں سے نکلنے کا واحد راستہ یہی لفٹ تھی۔ اگرچہ مجھے اکیلے لفٹ میں جاتے ہوئے بھی ڈر لگتا تھا مگر اس وقت جو ڈر تھا وہ اس خوف پر حاوی ہو گیا تھا میں بہر صورت اپنے گھر کی محفوظ پناہ گاہ میں جانا چاہتی تھی۔ اس لیے لفٹ کی طرف بڑھی اور ساتھ ہی پلٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی کہ کوئی یا وہ شخص اس پاس تو نہیں ہے۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ وہ نظر آیا تو میں بلا تکلف چلانا شروع کر دوں گی۔ چاہے بعد میں اس کا نتیجہ کچھ بھی نکلے۔ مگر وہ یا کوئی بھی نظر نہیں آیا۔

جلال الدین احسن

(م 740ھ 1339-40ء)

مدورا کا پہلا سلطان۔ اس کے ابتدائی حالات بہت کم معلوم ہیں۔ وہ پنجاب کے قصبہ کیشتل کارہنے والا تھا۔ 725ھ 1324ء میں صوبہ مہاجر میں نائب اقتدار کے عہدے پر فائز تھا۔ سلطان محمد بن تغلق نے اسے صوبیدار مقرر کر دیا۔ تھوڑے عرصے بعد ہی اس نے 735ھ 1334-35ء میں جلال الدین احسن شاہ کا لقب اختیار کر کے مدورا میں جو قدیم پانڈیا سلطنت کا صدر مقام تھا۔ اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ سلطان محمد تغلق نے اسے اس کی غداری کی سزا دینے کے لیے جنوب کی طرف چڑھائی کی جو بیضہ پھوٹ پڑنے کی وجہ سے رک گیا۔ اس وجہ سے سلطان محمد تغلق کی فوج کا دسواں حصہ ہلاک ہو گیا۔ اس کے بعد سلطان دہلی کو ہاتھ سے نکلے ہوئے صوبے پر دوبارہ قبضہ نہ ہو سکا۔ تقریباً پانچ سال حکومت کرنے کے بعد اس کے ایک عامل نے اسے قتل کر دیا۔ اگرچہ جلال الدین احسن مدورا کا پہلا خود مختار سلطان تھا لیکن اس نے کسی حکمران خاندان کی بنیاد نہ رکھی۔ جلال الدین کی اولاد میں دو لڑکیاں تھیں جن میں سے ایک کی سلطان غیاث الدین سے اور دوسری کی شادی ابن بطوطہ سے ہوئی تھی۔

مرسلہ: نعمت اللہ۔ کراچی

نکل آئی۔ عقب میں لفت کا دروازہ بند ہو رہا تھا اور اس نے سرگوشی میں کہا۔ ”آج بیچ گئیں لیکس کب تک؟“ میں یوں دیوانہ وار سانس لے رہی تھی جیسے نہ جانے کب سے میری سانس رکی ہوئی تھی اور میں اب سانس لے رہی تھی۔ مجھے ارد گرد کا پتا نہیں تھا اسی لمحے سیز جیوں کی طرف سے احسن نمودار ہوئے اور انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا اور جھپٹ کر میرے پاس آئے۔ ”مہر دیا کیا ہوا؟..... تمہارا عبا کیا کہاں ہے؟“

میں یہ سوچے بغیر کہ میں کہاں ہوں جھپٹ کر ان سے لپٹ گئی اور پھر مجھے ہوش نہیں رہا۔ آخری احساس بس یہ تھا

”تمہیں میری بات ماننا ہوگی۔ میری طرف دیکھو۔“ میں جو کوشش کر رہی تھی کہ اس کی طرف نہ دیکھوں مگر اس نے اس انداز میں کہا کہ مجھے اس کی طرف دیکھنا ہی پڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہی مجھے لگا جیسے میں ڈوب رہی ہوں۔ میرے حواس گم ہونے لگے اور پھر اس نے سرگوشی نما آواز میں کہا۔ ”یہ اتار دو۔“

اس نے نام نہیں لیا مگر میں سمجھ گئی کہ وہ عبا کی بات کر رہا ہے اور میں کسی معمول کی طرح اس کے حکم پر عبا یا اتارنے لگی۔ اور اس کا رخ تھا جو شانوں کو بھی گور کر رہا تھا اس لیے دوپٹے کی ضرورت نہیں تھی۔ عبا اتر اتو میں صرف سوٹ میں تھی اور وہ بے باکی سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ مجھے پھر ٹٹولنے والی نظروں کا احساس ہوا مگر میں بے بس تھی کچھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اسی لمحے لفت کی تو ہلکا سا جھٹکا لگا اور مجھے لگا جیسے میں ڈوبتے ڈوبتے ابھر گئی ہوں۔ میں نے اتارا ہوا عبا اپنے سامنے کر لیا۔ ”نہیں۔“ اس نے تیز سرگوشی میں کہا۔ ”ہٹاؤ اسے۔“

لفت اب نیچے بارہی تھی شاید اس نے نیچے جانے والا بیٹن دبا دیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی میں پھر سے ڈوبنے والی کیفیت میں آ گئی۔ میں نے عبا یا گرا دیا۔ وہ کچھ دیر مجھے گہری نظروں سے دیکھتا رہا پھر اس نے کہا۔ ”اب یہ اتارو۔“

اس بار بھی میں اس کا مفہوم جان گئی۔ مجھ پر ایک بار پھر لرزہ طاری ہو گیا۔ میرا ذہن شدت سے انکار کر رہا تھا مگر میرا جسم اس کے قابو میں تھا۔ میرے ہاتھ اس کے حکم کی تعمیل کرنے جا رہے تھے۔ نہ جانے وہ کیا چیز تھا جس نے مجھے یوں اپنے بس میں کر لیا تھا۔ یہ اس کی شخصیت کا کماں تھا۔ لیکن نہیں وہ کوئی جادو گر یا ساحر تھا جس نے اپنے عمل سے مجھے قابو کیا تھا۔ ایسے میں جب کوئی سہارا نظر نہیں آیا تو میں نے اس ہستی کو پکارا جو ہر انسان کا آخری اور حقیقی سہارا ہے میں نے اس سے فریاد کی کہ مجھے اس شخص سے بچاؤ فرماتے کے لبادے میں شیطان تھا۔ اسی لمحے لفت کو پھر جھٹکا لگا اور میں ایک لمحے کو سنبھلی۔ میرے اندر کسی نے کہا۔ ”مہر داب یا کبھی نہیں۔“

میں نے ہمت کی اور جھپٹ کر اس کے پاس سے ہاتھ بڑھا کر لفت کا بیٹن بادی اور اس کا دروازہ کھلنے لگا۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے روکے گا مگر خلاف توقع وہ ایک طرف ہوا میں اپنا عبا یا اور اس کا رخ لفت میں چھوڑ کر باہر

مجھے بتائے بغیر کہیں چلے گئے تھے۔ جیسے تیسے تیار ہو کر میں باہر آئی اور ایک کپ چائے بنا کر پی کہ سردرد سے پھٹ رہا تھا اور آنکھیں جل رہی تھیں۔ کچھ دیر بعد احسن آئے۔ انہوں نے میری دواؤں کا سا پر بھی میرے ہینڈ بیگ میں رکھا اور ناشتے کا پوچھا۔ میں نے کہا کہ دل نہیں چاہ رہا۔ ”ٹھیک ہے تم طیارے میں ناشتا کر لینا۔“ وہ بولے۔

میرا دل پھر رونے کو چاہ رہا تھا مگر میں نے خود پر قابو رکھا۔ چنانچہ احسن کے دل میں کیا تھا اور وہ مجھ سے کھل کر کچھ کہہ کیوں نہیں رہے تھے۔ ساڑھے آٹھ بجے ہم گھر سے نکل گئے۔ جب ائر پورٹ کے پاس پہنچے تو میں نے ہمت کر کے پوچھا۔ ”کل آپ کہاں چلے گئے تھے؟“

”اسے دیکھنے جو سامنے والے فلیٹ میں رہتا ہے۔“

میں فکرمند ہو گئی۔ ”آپ نے اس سے جھگڑا تو نہیں کیا احسن وہ بہت خطرناک آدمی لگ رہا ہے جیسے کوئی جادوگر ہو وہ کوئی علم جانتا ہے۔“

احسن کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا مگر انہوں نے صرف اتنا کہا۔ ”وہ گھر پر نہیں تھا یا اس نے جان کر دروازہ نہیں کھولا۔“

میرا خیال تھا کہ وہ گھر پر ہی تھا اور اس نے جان بوجھ کر دروازہ نہیں کھولا۔ وہ جس قسم کا شخص تھا اسے یقیناً معلوم ہو گیا ہو گا کہ باہر کون ہے؟ احسن مجھے ائر پورٹ کے لاؤنج تک چھوڑ کر چلے گئے بورڈنگ کارڈ تیار تھا اور کچھ دیر بعد مسافر طیارے میں جانے لگے۔ وقت پر پرواز ملتان کے لیے روانہ ہوئی اور ایک گھنٹے بعد میں ملتان ائر پورٹ پر تھی وہاں شاہد اور زاہد بھائی دونوں لینے آئے تھے۔ انہوں نے اور گھر آنے پر سب نے کہا کہ میں بہت کمزور اور صورت سے بیمار لگ رہی ہوں۔ خاص طور سے امی بہت پریشان ہو گئی تھیں۔ ”مہرود یہ تجھے کیا ہوا ہے تو خوش تو ہے نا؟“

”امی بہت خوش ہوں۔“ میں نے زبردستی مسکرا کر کہا۔ ”تم چار دن سے طبیعت خراب تھی۔ کل احسن ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے اور اس نے پریکٹس ٹیسٹ کہا ہے۔ میں یہیں کرا لوں گی۔“

”اللہ خوشخبری دے۔“ امی نے خوش ہو کر کہا۔ ”تمہاری شادی کو پانچ مہینے ہو گئے ہیں اور اب تک تمہاری طرف سے خبر نہیں آئی اس لیے میں فکرمند تھی۔ تم لوگ کوئی احتیاط تو نہیں کر رہے ہو؟“

کہ احسن مجھے سنبھالتے ہوئے پکار رہے تھے۔ پھر مجھے ہوش آیا تو میں اپنے فلیٹ میں اپنے بستر پر لیٹی ہوئی تھی اور احسن مشکور سے پاس بیٹھے تھے مجھے ہوش میں آتے دیکھ کر وہ تیزی سے پاس آئے۔ ”اب کیسا محسوس کر رہی ہو؟“

”بہت کمزوری۔“ میں نے نقاہت سے کہا۔ ”پلیز پانی دیر۔“

انہوں نے مجھے سہارا دے کر گلاس سے پانی پلایا۔ میرے حواس بحال ہوئے تو میں نے محسوس کیا کہ وہ فکرمند تو تھے لیکن اس سے زیادہ وہ پرجسس تھے کہ میرے ساتھ کیا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا تو میں خود پر قابو نہ رکھ سکی۔ میں پھوٹ کر رو دی اور ہچکیوں کے دوران میں انہیں سب بتا دیا کہ گزشتہ ایک ہفتے سے میرے ساتھ کیا ہو رہا تھا اور مجھ پر کیا گزر رہی تھی۔ احسن ساکت سے سب سنتے رہے انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ اس وقت وہ خاموش رہے جب آخر میں، میں نے سب کہہ دینے کے بعد ان سے کہا۔ ”احسن میں نے آپ سے کچھ نہیں چھپایا ہے ایک ایک لفظ سچ بولا ہے لیکن خدا گواہ ہے اپنی کیفیت سے مجھے نفرت ہوئی اور میں نے ہمیشہ خود کو آپ کی امانت سمجھا ہے۔ اللہ گواہ ہے عملی طور پر اس میں سے ایک ذرے کی خیانت بھی نہیں ہوئی ہے۔“

احسن میری طرف نہیں دیکھ رہے تھے پھر وہ اٹھ کر کمرے سے چلے گئے اور میں روینے لگی۔ شاید میں نے ان کو بتا کر اپنی ساری کشتیاں جلا دی تھیں۔ اب یہ ان پر تھا کہ مجھے معاف کرتے یا اس تا کردہ گناہ کی مزاد دیتے۔ احسن ساری رات کمرے میں نہیں آئے اور میں ساری رات روئی رہی۔ صبح فلائٹ دس بجے کی تھی۔ احسن سات بجے کمرے میں آئے اور بولے۔ ”تیار ہو جاؤ فلائٹ سے ایک گھنٹا پہلے پہنچنا ہے۔“

میرا دل نہیں چاہ رہا تھا اب مجھے دوسرا خوف لاحق ہو گیا تھا۔ احسن کا رویہ عجیب سا تھا۔ وہ نہ تو میری طرف دیکھ رہے تھے اور نہ انہوں نے مجھ سے کوئی بات کی۔ انہوں نے میری طبیعت بھی نہیں پوچھی اور نہ ہی یہ کہ میں سفر کے قابل ہوں یا نہیں۔ وہ کہہ کر چلے گئے اور میں نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کر تیاری کرنے لگی۔ تیاری تو کل ہی کر لی تھی یعنی سامان اور کپڑے سوٹ کیس میں پیک کر لیے تھے اب ذاتی تیاری تھی میں نے منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدلے اور باہر آئی تو احسن گھر میں نہیں تھے۔ شادی کے بعد پہلی بار ایسا ہوا کہ وہ

”نہیں امی۔“ میں شرمائی۔ ”ہم دونوں کو اولاد کی خواہش ہے۔“

میں نے احسن کو کال کر کے خیریت سے پہنچنے کی اطلاع دی مگر انہوں نے زیادہ بات نہیں کی۔ میں اندر سے اور بھگ گئی تھی اور سچی بات ہے مجھے اپنی ازدواجی زندگی خطرے میں نظر آنے لگی تھی۔ کون شوہر ہوگا جو یہ باتیں برداشت کرے کہ اس کی بیوی کسی اجنبی سے اس حد تک متاثر ہو۔ اگرچہ اس میں میرا قصور نہیں تھا۔ ای اگلے دن ہی مجھے ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ اس نے ٹیسٹ لیا اور نتیجہ اگلے دن بتانے کا کہا تھا۔ اس نے بھی وہی کہا کہ میں کمزور ہو رہی ہوں اور مجھے طاقتور غذا اور منرلز کی ضرورت ہے۔ کیونکہ دوائی میں ساتھ لائی تھی اس نے انہیں ہی کافی قرار دیا۔ احسن نے واپس آنے کے بارے میں کچھ نہیں کہا تھا مگر میں نے گھر میں کہہ دیا کہ میں ایک ہفتے کے لیے آئی ہوں اس لیے میری واپسی کی نشست بک کر ادیں۔ میرا ٹکٹ ریٹرن تھا۔ ای بابا اور سب نے اصرار کیا کہ میں کچھ دن اور رک جاؤں مگر میں ہفتے پر ہی بہ ضد رہی تو مجبوراً ایک ہفتے بعد کی فلائٹ میں بیٹھ آؤں گے۔

اتفاق سے اگلے دن گھر میں مرد در سے آئے اور پھر اس سے اگلے دو دن یہی سلسلہ جاری رہا اس لیے میں ڈاکٹر کے پاس رپورٹ لینے نہیں جاسکی تھی۔ امی کے گھر آنے کے پانچویں دن مجھے یہ موقع ملا اور میں امی کے ساتھ رپورٹ لینے گئی تو ڈاکٹر نے خوشخبری سنائی۔ ”مبارک ہو آپ امید سے ہیں۔“

”سچ۔“ میں خوں ہو گئی اور امی تو خوشی سے کھل اٹھی تھیں۔ انہوں نے اسی وقت رقم نکال کر کلینک کے اسٹاف میں بانٹی۔ مگر جب میں واپس آ رہی تھی اور مجھے احسن کا خیال آیا تو میں بھگ سی گئی۔ ہا نہیں انہیں یہ خبر بھی خوش کر سکتی تھی یا نہیں۔ اس لیے میں نے انہیں کال کر کے اطلاع دینے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور امی کے پوچھنے پر یہی کہا کہ میں خود جا کر انہیں یہ خبر سنانا چاہتی تھی۔ دو دن میں اور امی کے پاس رہی اور اس دوران میں مجھے یہی دھڑکا لگا رہا کہ احسن کی طرف سے کون کال نہ آئے جس میں وہ مجھے مورد الزام ٹھہراتے ہوئے آنے سے منع کر دیں۔ مگر ایسا نہیں ہوا اور میں لاہور واپس پہنچ گئی۔ میں نے روانہ ہونے سے پہلے کال کی تھی اور احسن مجھے لینے آئے تھے۔ میں اتر پورٹ پر ان کو دیکھ کر حیران رہ گئی کیونکہ ان کا شیوہ بڑھا ہوا تھا اور چہرہ

ستا ہوا تھا۔ اپنے گھر میں وہ واحد فرد تھے جو کلین شیوے سے اگرچہ روزے نماز کے پابند تھے۔

”آپ کو کیا ہوا آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟“
”ہاں میں ٹھیک ہوں۔“ وہ بولے۔ ”پچھلے ایک ہفتے میں بہت تکلیف سے گزرا ہوں۔“

”میری وجہ سے نا؟“ میں روہانسی ہو گئی اگر اتر پورٹ نہ ہوتا تو شاید روہانسی۔ مگر گاڑی میں بیٹھتے ہی میرے آنسو بہنے لگے تھے۔ احسن نے وہاں سے گاڑی نکالی اور سڑک پر آتے ہوئے بولی۔

”تمہاری وجہ سے نہیں۔“

”پھر کس کی وجہ سے؟“

”شاید اپنی وجہ سے۔“ انہوں نے گہری سانس لی۔ ”مہر تو تم جانتی ہو میں اپنے گھر والوں سے ذرا مختلف ہوں۔ مطلب میں شیوہ کرتا ہوں اور سچی بات ہے دینی اقدار کا اتنا خیال نہیں رکھتا۔ لیکن اللہ گواہ ہے میں نے جان بوجھ کر اس کے حرام کیے ہوئے کو حلال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ میرا پیشہ بھی ایسا ہے کہ میرا واسطہ زیادہ تر کرپٹ لوگوں سے پڑتا ہے اور ان میں عورتیں بھی ہوتی ہیں۔“

”میں جانتی ہوں۔“ میں نے ان کی بات سمجھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

”میری کلائنٹس میں آج تک جو عورتیں آئیں میں نے کبھی ان کی طرف توجہ نہیں دی۔ مہر تو تم جانتی ہو کہ میں حسن پرست ہوں لیکن مجھے صرف تمہارے حسن سے سروکار رہا ہے۔ میں نے بھی غیر عورتوں کے بارے میں نہ سوچا اور نہ ہی ان کی طرف متوجہ ہوا۔ میں نے دین پر عمل نہیں کیا لیکن اباجی سے اور دوسروں سے اس کے بارے میں جانا بہت کچھ ہے اور یہ ان ہی لوگوں کی تربیت تھی جو میں سمجھنے

شمارہ جنوری 2015ء کی منتخب سچ بیانات
ہماری پیشکش..... آپ کا انتخاب

☆ اول: غم دل..... رشیدی سید..... (لاہور)
☆ دوم: اکیلی عورت..... شاہینہ شانی..... (فیصل آباد)
☆ سوم: فساد عشق..... علی..... (کراچی)

پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ جیتی منتخب کیجئے
ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریچ
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسج کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریچ
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

سے محفوظ رہا۔ کیونکہ میرے پاس آنے والی عورتیں نہ صرف بہت حسین اور دلکش بلکہ آزاد خیال بھی ہوتی ہیں۔ کئی نے مجھے ڈنکے جیسے انداز میں پیکش بھی کی مگر میں ان کی ترغیب میں نہیں آیا مگر آج سے نو دن پہلے.....“

”نو دن پہلے کیا؟“ میں نے بے چینی سے پوچھا۔

”نو دن پہلے میرے دفتر میں ایک عورت آئی۔ میرے کمرے میں آنے تک اس نے برقع پہنا ہوا تھا۔ مگر اندر آنے ہی اس نے بے تکلفی سے برقع اتار دیا اور اس کے نیچے اس نے بہت ہی فیشن ایبل اور کھلی ہوئی ڈریسنگ کی ہوئی تھی۔ مہر وہ بہت حسین تھی۔ ایسی کہ میں تمہاری جیسی بیوی کا شوہر ہوتے ہوئے بھی دنگ رہ گیا۔ اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔ پھر مجھے ہوش آیا اور میں نے اس سے آنے کی اجازت کی۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنے شوہر سے طلاق لینا چاہتی ہے کیونکہ اس کی اپنے شوہر سے نہیں بنتی ہے۔ میں انہیں لفظوں میں اس کی ادا میں اور باتیں نہیں بتا سکتا۔ میں نے فوراً اس کا کیس لے لیا اور فیس تک کا نہیں پوچھا جو ہم وکیلوں کا پہلا اصول ہے۔ جانے سے پہلے اس نے کھل کر پیکش کی کہ اگر میں نے اسے طلاق دلا دی تو وہ نہ صرف میری فیس ادا کرے گی بلکہ اس کی ایک رات صرف میرے لیے مخصوص ہوگی۔“

احسن کی بات سن کر میرے اندر ایک ایسی آگ بھڑکنے لگی تھی جس کی تپش مجھے جلا رہی تھی مگر میں زبان سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔ پتا نہیں احسن مجھے یہ سب کیوں بتا رہے تھے؟ میں نے غیر ارادی طور پر پوچھا۔ ”پھر وہ آپ کے پاس آئی؟“

”نہیں۔“ احسن بولے۔ ”اللہ نے مجھے اس گناہ سے بچایا لیکن مہر وہ میں نے دل میں ارادہ تو کر لیا تھا میں نے اسے ان نظروں سے تو دیکھا جن نظروں سے دیکھنے کا حق صرف تم کو ہے۔“

اس پر مجھ سے برداشت نہیں ہوا۔ ”تب آپ مجھے یہ سب کیوں بتا رہے ہیں بدلہ لینے کے لیے؟“

”نہیں۔“ وہ گہری سانس لے کر بولے۔ ”بدلہ کس بات کا۔ جب ہم بھائی جوان ہو رہے تھے تو اباجی قرآن کی ایک آیت بار بار سناتے تھے کہ نیک مردوں کے لیے نیک عورتیں اور بدکار مردوں کے لیے بدکار عورتیں ہیں۔ اباجی کا مقصد ہمیں سمجھانا تھا کہ جوانی میں ہمارے قدم غلط راہوں کی طرف نکلے تو ہمارے مقدر میں بدکار عورتیں آئیں گی۔ جب

تم میری زندگی میں آئیں تو میں نے خود کو اچھا انسان اور مسلمان سمجھا کہ اللہ نے جسے ایسی اچھی اور نیک بیوی سے نوازا ہے لیکن.....“

”میں اچھی نہیں نکلی۔“ میں نے کھو کیر لہجے میں کہا۔

”نہیں تم اچھی نکلیں اور تم نے مجھے بھی برائی سے بچا لیا۔ مہر وہ تمہارا قصور نہیں تھا یہ میرے گناہ کی نیت تھی جس کا وبال تم پر آیا۔ اب میں اس آیت مبارکہ کا مطلب سمجھا۔ اللہ نے تمہارے توسط سے مجھے بتایا کہ اگر میں گناہ گار بنوں گا تو میں تم کو گناہ گار بننے سے نہیں روک سکوں گا اور اگر میں نیکو کار بنوں گا تو تم خود بہ خود سیدھے راستے پر رہو گی، کوئی انسان یا شیطان تمہیں بہکا نہیں سکے گا۔ اب تم سمجھ گئی ہو گی کہ پچھلا ایک ہفتہ مجھ پر کیوں اتنا سخت گزرا۔“

”ہاں میں سمجھ گئی۔“ میں نے روتے ہوئے ان کے شانے پر سر رکھ دیا۔ ”آپ مجھے قصور وار نہیں سمجھ رہے ہیں لیکن میں ایک بار پھر آپ سے معافی مانگتی ہوں۔“

”میں نے تمہیں معاف کیا اور اب تم بھی مجھے معاف کر دو۔“

میں روتے ہوئے بولی۔ ”ایسی باتیں نہ کریں میرا سب کچھ ہیں، میرے شوہر ہیں اور شوہر بیویوں سے معافی نہیں مانگتے۔ آپ نے ارادے سے توبہ کر لی تو اللہ نے معاف کر دیا ہو گا اس کے بعد میں کون ہوتی ہوں۔“

احسن نے میرے شانوں پر ہاتھ رکھا۔ ”اس کے باوجود میں تمہارا شکر گزار ہوں۔“

گھر قریب آیا تو میرے اندر پھر وہی خوف اٹھا اور میں نے کہا۔ ”احسن یہاں وہ شخص؟“

”وہ اس وقت تھانے میں ہے اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں۔“ احسن نے کار روکتے ہوئے کہا۔ ”اور تم جانتی ہو اس کی بیوی کون تھی وہی عورت جو میرے پاس طلاق کا کیس لے کر آئی تھی۔ یہ شخص صرف اوباش نہیں بلکہ سفلی علوم اور جادو ٹونے کا ماہر بھی ہے۔ ابھی اس کے اور کتوت سامنے آرہے ہیں۔ ورنہ صرف قتل کا یہ کیس اسے تختہ دار پر پہنچانے کے لیے کافی ہے۔“

میں نے اطمینان کا بہت طویل سانس لیا اور سوچا کہ جب میں ان کو باپ بننے کی خبر سناؤں گی تو ان کے دل میں اگر کوئی گرہ باقی رہ گئی ہوگی تو وہ بھی انشاء اللہ کھل جائے گی۔ میری جنت میں کس آنے والا شیطان وضع ہو گیا تھا۔